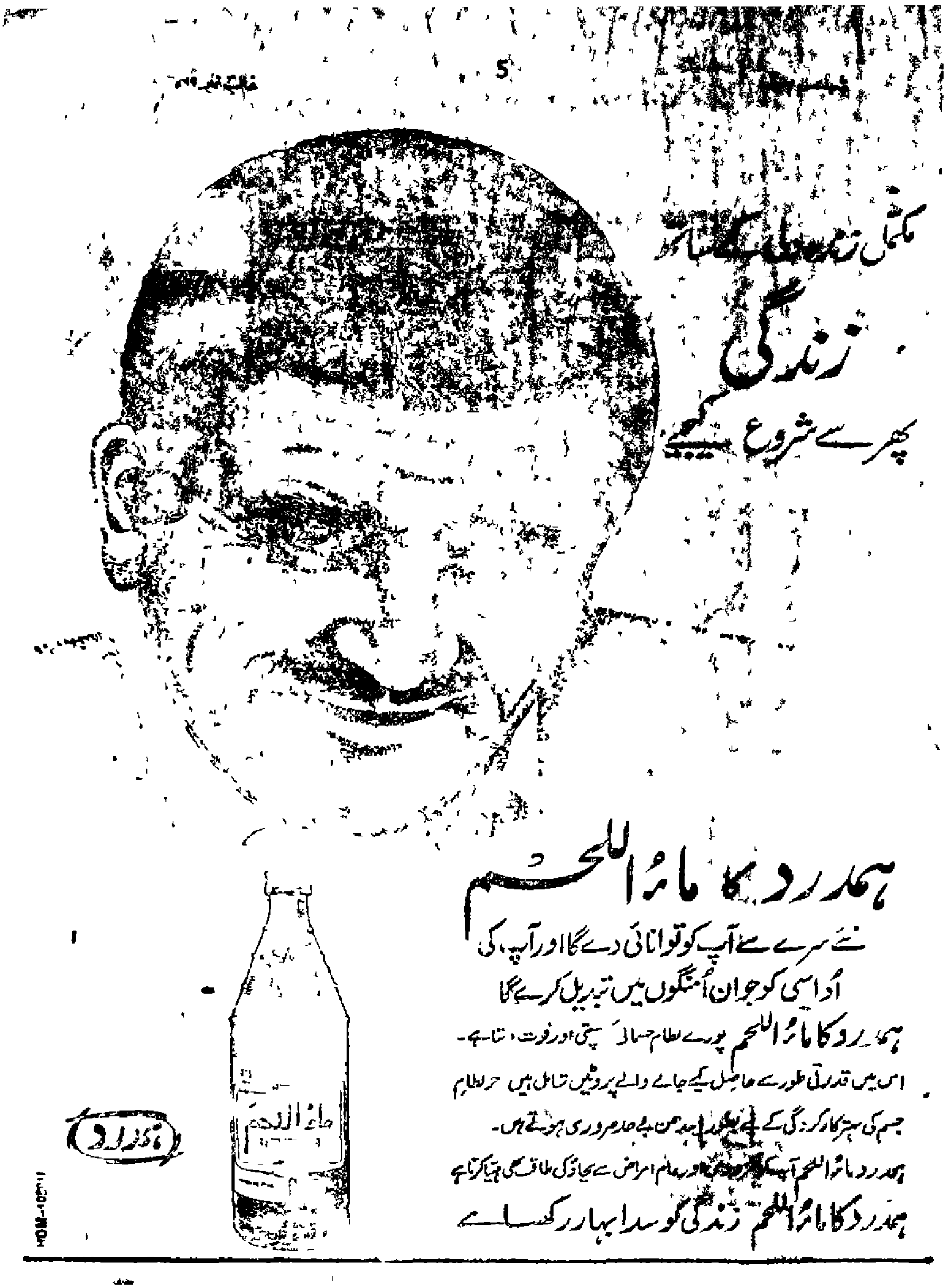


THE MYSORE GOVERNMENT SANDALWOOD OIL FACTORY
MYSORE



ISSUED BY THE DIRECTORATE OF PUBLICITY • MAHARASHTRA • BOMBAY •


زندگی
پھر سے شروع کیجیے
ہمدرد کا ماءُاللحم
نئے سرے سے آپ کو توانائی دے گا اور آپ کی
اُداسی کو جوان اُمنگوں میں تبدیل کرے گا
ہمدرد کا ماءُاللحم پورے نظام جسمانی کو چستی اور قوت دیتا ہے۔
اس میں قدرتی طور سے حاصل کیے جانے والے پروٹین شامل ہیں جو نظام
ہمدرد کا ماءُاللحم زندگی کو سدا بہار رکھتا ہے


An Epic
Episode
Bata


LONDON
14
times a week
via
EUROPE
and of course daily to
NEW YORK
PARIS 5 times a week
FRANKFURT 5 times a week
GENEVA 3 times a week
ZURICH 2 times a week
PRAGUE 2 times a week
BRUSSELS 1 flight a week
MOSCOW 2 flights a week
ROME 4 flights a week
AIR-INDIA
IN ASSOCIATION WITH B.O.A.C. AND QAN


اپنی اور اپنے بچّوں کی صحت برقرار
رکھنے کے لیے لیو ۵۲ استعمال کیجئے۔
یہ جگر کے فعل کو درست رکھتی ہے، بھوک
لگاتی، کھانا ہضم کرتی اور تندرست رکھتی ہے۔
بچّوں کے لیے خوش ذائقہ ڈراپس اور
بڑوں کے لیے ٹکیاں۔
ہر دوا فروش سے دستیاب ہو سکتی ہیں
ہمالیہ ڈرگ کمپنی
۲۵۱، ڈاکٹر ڈی۔این روڈ
بمبئی ۱

صنعتی میدان میں پیش قدمی

ملک کے دوسرے حصوں کے شانہ بشانہ ریاستِ جموں و کشمیر بھی گزشتہ کئی برسوں سے صنعتی میدان میں قابلِ قدر ترقی کر رہی ہے، چنانچہ اس سلسلے میں ذیل میں کچھ نمایاں پیش قدمیوں کا خاکہ درج کیا جاتا ہے:-

- ریاست میں صنعتوں کو بڑھاوا دینے کی خاطر صنعتی بستیوں کا قیام عمل میں لایا گیا۔ ان بستیوں میں زائد از ۱۷۲ شیڈ مختلف صنعتی یونٹوں کو جن کی تعداد ۸۴ ہے، الاٹ کیے گئے۔ یونٹوں میں سے اس وقت چھوٹے پیمانے کے تقریباً ۶ یونٹ کام چلا رہے ہیں۔
- ۱۹۶۶-۶۷ء کے دوران صنعتی بستیوں میں سمال اسکیل یونٹوں نے ۹۰ لاکھ روپے کی مالیت کا سامان تیار کیا ہے اور اُمید کی جاتی ہے کہ حکومتِ ہند کی فراخ دلانہ درآمدی پالیسی کے نتیجہ میں ان یونٹوں کی پیداوار کافی حد تک بڑھ جائے گی، جس سے زیادہ محنت کشوں کو روزگار مہیا ہوگا۔ اس وقت صنعتی بستیوں میں مختلف سمال اسکیل یونٹوں میں بارہ سو سے زائد لوگ کام کر رہے ہیں۔
- وول ٹاپس (WOOL TOPS) پر مبنی SPINING کے چار کارخانے قائم ہو چکے ہیں جن میں تکلوں کی تعداد چھ ہزار ہے۔ ان سے ریاست کی شال انڈسٹری کے لیے تارِ نل کی سپلائی میں اضافہ ہوگا۔ جس کے نتیجہ میں ہزاروں کاریگروں کے لیے روزگار فراہم ہوگا۔

صنعتِ ابریشم ملک کی ایک قدیم ترین صنعت ہے۔ اس وقت ریاست میں ۱۵ ہتھ کھڈیاں چل رہی ہیں۔

- اِن ہتھ کھڈیوں میں استعمال کرنے کے لیے سیری کلچر ڈیپارٹمنٹ ماہانہ ۵۳۰ کلوگرام خام ریشم فراہم کر رہا ہے اور مِل سے چلنے والی ۱۴ کھڈیوں کو ریشم فراہم کیا جا رہا ہے۔ اس کارخانے میں دو ہزار ورکر کام کر رہے ہیں۔ وادی کے مختلف حصوں میں ۳۰ ہزار گھرانے ریشم کو تیار کرنے میں مصروف ہیں۔ کشمیر میں خام ریشم کی پیداوار، جو ۱۹۶۵-۶۶ء میں ۸۵,۵۰۷ پونڈ تھی، اسے ۱۹۶۶-۶۷ء میں ۱۳۶۳۰۱ پونڈ تک بڑھا چکی ہے۔
- سری نگر میں پھلوں اور سبزیوں کو محفوظ رکھنے کے لیے ایک لیبارٹری قائم کی گئی ہے۔ جس کو ان سے ایک سائنسی ڈھنگ پر ڈبوں میں بند کر کے بیچا جائے گا۔
- قالین بافی، لکڑی پر کھدائی کا کام کرنے، پیپر ماشی، کانی شال، اسٹیل کاروِنگ جیسے کاموں میں ۲۰ سے زائد اُمیدواروں کو تربیت دی جا رہی ہے تاکہ ان مختلف دستکاریوں کے لیے کاریگر باقاعدہ طور پر دستیاب ہوتے رہیں۔ آج تک ۵۰ سے زائد اُمیدواروں کو چوتھے پانچ سالہ منصوبے کے دوران تربیت دی جا چکی ہے چنانچہ تجویز ہے کہ منصوبے کے باقی حصے میں مزید دو ہزار سے زائد اُمیدواروں کو تربیت دی جائے۔ زیادہ زور اس بات پر دیا جا رہا ہے کہ دیہی علاقوں میں رہنے والے اُمیدواروں کو تربیت دی جائے تاکہ دیہات میں دستکاری کی صنعتوں کا قیام عمل میں لایا جا سکے۔

—— جاری کردہ ——

محکمۂ اطلاعات حکومت جموں و کشمیر

[redacted] (۱۹۳۰

بانی

[redacted] سیماب اکبرآبادی مرحوم

ماہنامہ بمبئی

شاعر

فروری ـــــ مارچ

۱۹۶۹ء

ادارہ:

اعجاز صدیقی

[redacted] مہندر ناتھ

[redacted]

غالب نمبر

جلد (۴۰) ــــــــــ زرِ سالانہ (۹) روپے ــــــــــ شمارہ ۲-۳

قیمت غالب نمبر (۸) روپے

مکتبۂ قصر الادب، پوسٹ بکس نمبر ۴۵۲۶، بمبئی ۵

ترتیب

غالب نمبر ۱۹۶۹ء

شاعر بمبئی

مزاجِ طبع رواں

نظمیں

کفِ گل فروش

خواتین قلم کاروں کے مضامین

شوخئ تحریر

طنز و مزاح

پردۂ ساز

ڈرامے ——— فیچر

[illegible]

تفہیماتِ غالب

غالب کے کلام کی شرحیں

غالب بہ زبانِ دیگراں

انتظاریہ

نقشِ ہائے رنگ رنگ

اِس انجمنِ تخیل میں

غالب نمبر کے قلمکاروں کا تعارف

غالب نما

(غالب کی تصانیف اور غالب پر کتابیں)

تحتِ مضمون

کتابت:
عبدالرحمٰن
سلام خوشنویس

آرٹسٹ۔
متین
ستار

[redacted]

حرفِ ملت

غالب نمبر

مرزا اسد اللہ خاں غالب کی صد سالہ برسی کی تقریبات جس دھوم دھام سے پورے ملک میں ہوئیں تاریخ میں ایسی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی۔ ہندوستان میں تقریبات کا سلسلہ جاری ہے اور پورے سال جاری رہے گا۔ اُردو حلقوں کی طرف سے شہروں شہروں جتنے شاندار پروگرام اہتمام ہوئے وہ تو اُن کا اپنا فرض تھا۔ ہاں حکومتِ ہند نے جس فراخ دلی سے مرکز میں اس عظیم اُردو شاعر کے جشن کے انعقاد اور اُس کی عظیم الشان یادگار کے قیام کے لئے بے پناہ مدد کی وہ جمہوریت پسندی اور رواداری کی اعلیٰ ترین مثال ہے۔ مرکز کے علاوہ دوسرے صوبوں دوسری زبانوں کے دانشوروں، رسالوں اور اخباروں نے اپنے اپنے طور پر غالب کو جو خراجِ عقیدت و عظمت پیش کیا وہ بھی بے حد فراخ دلانہ اور قومی یکجہتی کا قابلِ فخر واقعہ ہے۔ جشنِ غالب کے ناقابلِ فراموش ہنگاموں نے بعض دشمنانِ اُردو کو فطری طور پر اپنی زبان کی حق تلفیوں کی یاد دلائی۔ پھر بھی وسیع نقطۂ نگاہ سے اگر دیکھا جائے تو جشنِ غالب ایک طرح سے جشنِ اُردو ہی ہے کہ اس حیلے سے بیک وقت پورے ہندوستان میں اُردو زبان اور اُس کے شعر و ادب کا غلغلہ ہو گیا

" ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق "

غالب صد سالہ برسی کے تاریخی موقع پر جو دو اُردو رسائل میں غالب پر بے اندازہ کام ہوا ہے ایسا کام جو پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ محققینِ غالب نے ہمیں گرانقدر تحقیقی سرمایہ دیا تھا لیکن صد سالہ برسی نے غالب کو تحقیق کی حدود سے نکال کر تنقید کی وسیع دنیا میں لا کھڑا کیا۔ شاید ہی کوئی ایسا قابل ذکر ادیب باقی بچا ہو جس نے اس موقع کے لئے غالب کے فکر و فن پر کسی نئے زاویہ سے لکھا ہو۔ غالب پر نئی کتابوں کے علاوہ اُردو اخبارات و رسائل کے غالب نمبر اس کا بین ثبوت ہیں۔

[redacted]

غالب نے اکبر آباد کی خاک اور ہندوستان پر آنکھ کھولی اور اُس کے اُفق سے آفتاب بن کر اُبھرے۔ "شاعر" کا تعلق بھی اُسی سرزمینِ شعر و ادب سے ہے جس نے میرؔ، نظیرؔ، غالبؔ، سیمابؔ اور دوسری مشہور ہستیوں کو جنم دیا (پندرہ روزہ) شاعر" کا اجراء ۱۵ فروری ۱۹۳۰ء کو آگرہ میں ہوا تھا۔ یہی تاریخ مرزا غالب کی وفات کی ہے۔ شاعر کے ابتدائی شماروں کے سرورق پر تصویرِ غالب کی سوبر چھپا کرتی تھی ـــــ اور اب جب کہ ۱۵ فروری ۱۹۶۹ء کو غالب کی صد سالہ برسی کا سیج پیا۔ یہ پرسائی گئی ہے تو ادارۂ شاعر بھی نہ صرف اپنے ادبی فریضے کے احساس اور غالب کی عظیم شخصیت کے پیشِ نظر لکھا ہیں خصوصی ذہنی نسبت کے جذبے سے سرشار ہو کر اپنا نذرانۂ عقیدت غالب نمبر کے روپ میں پیش کر رہا ہے۔

غالب نمبر کا یہ روپ اور اس کی یہ سج دھج آپ کے سامنے ہے۔ جیسے غالب کی عظمت اور انتہائی شاندار و یادگار صد سالہ تقریبات ہی کی طرح مثالی ہے تو اس کے اُس گہری وابستگی کا نتیجہ کہئے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ ماضی قریب میں "شاعر" ہندوستان کے ادبی رسائل کی تاریخ میں کئی خاص نمبر پیش کر کے خاص نمبروں کی جو مثال اور روایت قائم کی تھی، غالب نمبر ملاحظہ ہو تو وہ خود مثالی اس روایت میں ایک ایسے اضافے کی حیثیت رکھتا ہے جسے تاریخ بھلا نہ سکے گی۔ قدم قدم پر حوصلہ شکن رویوں، عدم تعاون کے شکایت دہ سلسلوں، ادارے اور مشکلات و مطالعات کے باوجود صرف تین چار ماہ میں اتنے بڑے منصوبے کا اس حسن و معیار پایہ تکمیل تک پہنچ جانا ہمارے لئے حد درجہ قابلِ شکر ہے۔ [redacted]

ایسی صورت میں جبکہ ہندو پاک کے بہت سے مقتدر معاصر رسائل غالب نمبر نکالنے کا اعلان کر چکے تھے، شاعر کے غالب نمبر کو کسی انفرادی روپ میں پیش کرنا بڑا مشکل کام تھا۔ شخصیت بھی ایک، اور لکھنے والے بھی مشترک۔ غالب پر اچھی اور تازہ تحریریں حاصل کرنا ایک امرِ محال!

[redacted]

غالب نمبر کی نمایاں خصوصیات میں جہاں حسن ترتیب و تزئین کی طرف نگاہیں مرکوز ہوں گی، وہیں شروع سے آخر تک کتابت وطباعت کا یکساں معیار اور سلیقہ بھی اپنی طرف متوجہ کئے بغیر نہ رہے گا۔ ادارتی پیشکش کے علاوہ سب سے اہم اس کا وہ مواد ہے جس سے ادب و تنقید کا ملتہ سے محدود رکھیے، اعلیٰ قاری بھی مطمئن و مسرور ہو سکیں گے یعنی پڑھنے والوں کی اکثریت خاصان ادب کی ہے۔ یہ تمام مضامین نظم ونثر بطور خاص "شاعر" کے غالب نمبر کے لئے لکھے گئے ہیں اور تازہ و غیر مطبوعہ ہیں۔ قلم کاروں نے علم وفکر کی روشنی میں، گہرائی اور گیرائی کے ساتھ غالب کے فکروفن اور اُس کی شخصیت کا جائزہ لیا ہے۔ یہ مضامین سرسری نہیں، بلکہ طویل اور بھرپور ہیں، متنوع اور مترفع ہیں۔

ہمیں افسوس ہے کہ چند اعلان کردہ مضامین "غالب نمبر" میں شامل نہ ہو سکے، جیسے "مذاکرہ بمبئی" کہ شومئی اتفاق سے جن ادیبوں کو اس میں حصہ لینا تھا، وہ بوجوہ ایک وقت میں ایک جگہ جمع نہ ہو سکے۔ یا بعض مقامی رسالوں کے وہ مضامین جو ترجمہ ہو کر آئے اور بدقسمتی سے بمبئی کے پانچ روزہ ہنگاموں میں نذر آتش کئے جانے والے ڈاک کے تھیلوں میں ضائع ہو گئے۔ غالب نمبر کے تمام قلم کاروں کا جتنا بھی شکریہ ادا کیا جائے، وہ کم ہے کہ آپ ہی کے قلمی تعاون نے اِس نمبر کو غیر معمولی وزن و معیار عطا کیا ہے۔ غالب نمبر کا حجم بھی پانچ سو صفحات کے بجائے سوا چھ سو صفحات ہو گیا ہے۔ ہم نے مزید اخراجات کا زبردست بار برداشت کر لیا، لیکن تاخیر سے موصولہ اچھے مضامین کو روکنا گوارا نہ کیا۔ مضامین کی کتابت بھی نہایت خفی قلم سے گٹھی ہوئی کرائی گئی ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ مواد سما سکے۔ چونکہ نمبر کی قیمت کا اعلان ہو چکا تھا، اِس لئے صفحات کے بڑھ جانے کے باوجود قیمت نہیں بڑھائی گئی ہے۔

"شاعر" کا ادارہ "غالب یادگار کمیٹی بمبئی" کا دلی شکریہ ادا کرتا ہے کہ اُس نے غالب نمبر کی پانچ سو کاپیوں کی خریداری کا آرڈر دے کر اِس بڑے کام کی انجام دہی میں تقویت بخشی۔ کمیٹی کے صدر پرنسپل ڈاکٹر رفیق زکریا (وزیر حکومت مہاراشٹر) نے کمیٹی کو اِس حوصلہ افزائی کا مشورہ دیا اور آغاز کار ہی سے اُن کا پُرخلوص اصرار رہا کہ "غالب نمبر" کو "کرشن چندر نمبر" ہی کی طرح، بلکہ اُس سے بھی بہتر نکالا جائے۔ یہ ذکر بھی ضروری ہے کہ غالب یادگار کمیٹی بمبئی نے نہایت سنجیدہ، پُر وقار اور علمی وادبی انداز میں بڑے پیمانے پر غالب صد سالہ تقریبات کا اہتمام کیا۔ اِن تقریبات کے علاوہ دیوانِ غالب (صدی ایڈیشن) "غالب طُعرا" اور غالب کے فکروفن پر علاقائی رسالوں میں کتابوں کی طباعت واشاعت کا بھی انتظام کیا ہے۔ "شاعر" کا "غالب نمبر" بھی کمیٹی کی سرگرمیوں ہی کا ایک حصہ سمجھئے۔

مدیر "شاعر" کے مخلص ترین دوست اور اُردو زبان وادب کے شیدائی جناب شام کشن نگم دہلوی کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری ہے کہ غالب نمبر کی رنگین اور سادہ آفسٹ طباعت اُنہوں نے اپنی خصوصی توجہ کے ساتھ اپنے میٹرو پرنٹنگ پریس میں کرا کے دی۔ بمبئی کے مشہور یونیورسل فائن آرٹ لیتھو ورکس کے مالکان بھی شکریے کے مستحق ہیں، جنہوں نے اتنے ضخیم نمبر کی بہترین طباعت پابندئ وقت کے ساتھ کی۔ آرٹسٹوں میں جناب میعن اور شری ساٹھے، خوشنویسوں میں عبدالسلام صاحب حیدرآبادی اور "شاعر" کے مستقل کاتب میاں عبدالرحمٰن کی کاوشیں بھی داد کی مستحق ہیں کہ اِن چاروں نے اپنی فن کاری سے "غالب نمبر" میں چار چاند لگا دیئے۔

آخری شکریہ بمبئی اور بمبئی سے باہر کے اُن تمام مخلصین کا ادا کرنا ہے، جنہوں نے کسی بھی حیثیت سے غالب نمبر کے سلسلے میں تعاون فرمایا۔

غالب نمبر سے متعلق ارباب نظر کی بے لاگ رائیں ہمارے لئے مسرت و امتنان کا باعث ہوں گی۔

اعجاز صدیقی

[redacted]

۱۰ مارچ ۶۹ء



یہ رنگین شہری تصویر جو مغل فن مصوری کا شاہکار ہے ۱۲۸۲ھ کی بنی ہوئی ہے۔ اصل تصویر دس انچ لمبی ساڑھے آٹھ انچ چوڑی ہے اور نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شیروانی مرحوم کے کتب خانے حبیب گنج (علی گڑھ) میں محفوظ ہے۔ نواب صاحب مرحوم نے ۱۳۱۵ھ میں دہلی میں خریدا تھا۔ اس کا فوٹو سب سے پہلے ۱۹۲۳ء میں مالک رام صاحب نے "ستمبد چین" اور "ذکر غالب" میں چھپوایا تھا۔ اسی تصویر کا عکس ہند سرکار نے ۱۹۵۲ء میں ساڑھے چار آنے والے ڈاک ٹکٹ پر چھاپا تھا۔ یہ مصدقہ تصویر ہے۔ مولانا حسن محمود دوی نے اسے اصلی رنگوں میں پہلی بار اپنے "مُرقّعِ غالب" میں شائع کیا اور شائقینِ غالب ہمارے لیے یہ اُن ہی کی عطا ہے۔

پیغامات

شریمتی محترمہ اندرا گاندھی وزیرِ اعظم ہند

پرائم منسٹرز سیکریٹریٹ۔ نئی دہلی
نومبر ۱۹۶۸ء

غالب ہماری جاوداں ہستیوں میں سے ایک ہیں۔ ان کا دور ہیجانات کا دور تھا۔ ان کی شاعری انسانی ترمی کے ساتھ، اس عہد کے کئی رخوں کی ترجمانی کرتی ہے۔ انسانی دکھ اور خوشی کے امتزاج سے انہوں نے اس عظیم شاعری کی تخلیق کی ہے جو اس وسیع ملک میں بسنے والے لاکھوں انسانوں کی زندگی کا حصہ بن چکی ہے۔ ان کے خوبصورت الفاظ زبان زد ہو گئے ہیں۔ ایک عظیم شاعر کی عظمت کو اس سے بہتر خراج کیا پیش کیا جا سکتا ہے کہ اس کی تخلیقات کی روشنی میں عوام اپنی تہذیب کی سمتیں متعین کریں۔

اندرا گاندھی

آنریبل جی۔ ایم صادق۔ وزیرِ اعلیٰ حکومت جموں و کشمیر

۹ نومبر ۱۹۶۸ء

مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی ہے کہ ماہنامہ "شاعر" غالب کی صد سالہ برسی منانے کے سلسلے میں "غالب نمبر" شائع کر رہا ہے۔ مرزا غالب اردو شاعری کے معماروں میں ایک امتیازی مقام رکھتے ہیں بحیثیت شاعر اُن کی نظر ہمہ گیر تھی۔ انہوں نے انسانیت کے لئے جو پیغام دیا ہے اس میں رنگ و نسل اور مذہب و ملت کی کوئی تخصیص نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی غالب کی یاد ہمارے دلوں میں ہر دم تازہ رہتی ہے۔

میں اس موقع پر ماہنامہ "شاعر" کو اپنی نیک خواہشات بھیجتا ہوں۔

غلام محمد صادق

آنریبل ڈاکٹر رفیق زکریا۔ وزیر صحت و اوقاف حکومت مہاراشٹر
صدر غالب یادگار کمیٹی بمبئی

سچیوالیہ بمبئی

مورخہ ۱۱ مارچ ۱۹۶۹ء

محترمی اعجاز صاحب! یاد دہی کا شکریہ۔

شاعری آپ کے لئے پشتینی پیشہ اور مشغلہ میرے لئے محض ذوق کا جلوہ ہے۔ اگر آپ شاعرِ اعظم غالب پر خاص نمبر نکال رہے ہیں، تو گویا اپنا فرض ادا کر رہے ہیں اور ہم لوگوں کے لیے ایک موقع نکال رہے ہیں لطف اٹھانے کا۔

غالب کو جس طرح ہم نے تلاش کیا ہے، اس کا اندازہ آپ کو میری ادھر کی تقریروں سے ہو گیا ہوگا۔

غالب ایک علامت ہے روشن خیالی اور اس راہ آپ سانے کی،

غالب محض ایک شاعر نہیں ایک گہری سوچ بچار رکھنے والا شاعر ہے جس نے جیتے جی اپنی حسانی اور ذہنی قوت کا بھرپور استعمال کیا

اور کبھی ہار نہیں مانی۔

غالب کی زندگی کتنی ہی مصیبتوں میں کیوں نہ گذری ہو، اُس کی زبان اور خیالات میں ایسی تازگی اور شگفتگی ہے جو ہمیں بھی تازہ دم کرتی ہے۔

غالب ہمارے نوجوانوں کو سوچنے، زندگی کا گہرا مطالعہ کرنے، ہر شورش سے انکار کرنے اور مستقبل پر نظر رکھنے کا پیغام دیتا ہے۔ یہ اس طرح کا پیغام نہیں جیسا سیاسی یا سماجی رہبر دیا کرتے ہیں بلکہ ویسا ہے جیسا والٹیر، روسو یا مالراکس نے دیا۔

غالب کا ایک کمال یہ ہے کہ وہ شاعر پیدا ہوا شاعر جیا، لیکن پختگی کی عمر کو پہنچنے سے پہلے اُس نے شاعری کو نثر کے قریب پہنچا دیا اور نثر کو سادہ بات چیت کے قریب ـــ وہ محض اپنے ادبی مشوروں سے نہیں خطوں کے اسٹائل سے بھی اُردو نثر کے لئے ایک نعمت ہے۔

جب ہم غالب کا جشن کرتے ہیں، اُس کا دن مناتے ہیں، اُس پر تقریریں کرتے ہیں یا نظمیں پڑھتے اور سنتے ہیں تو گویا اُردو زبان اور اُس کے ماحول کو تازگی، زندگی، تفکر اور شعور کے علاوہ گہرے لیکن سادہ، با معنی لیکن مختصر اندازِ بیان کی بھی یاد دہانی کراتے ہیں جو اس نے خود ہم ہی کو نہیں پہنچایا ہے اور یوں وہ شاندار روایت عام ہوتی ہے جو اُردو کے کلاسکی اہلِ قلم نے ہمارے لئے چھوڑی ہے۔

یہ بات بے وجہ نہیں کہ مہاراشٹر کے پورے علاقے میں جا بجا "غالب کا جشن" منایا جا رہا ہے۔ شاید ہی کسی اور ریاست میں غالب پر اتنے جلسے ہوئے ہوں جتنے ہمارے یہاں ہو رہے ہیں۔ آپ کا "غالب نمبر" مجھے یقین ہے کہ اُن تمام لوگوں کے کام آئے گا جو غالب کو جاننا، سمجھنا چاہتے ہیں اور گذشتہ چند نمبروں کے بعد اب یہ غالب نمبر اُردو دنیا کو بھی کا ایک قابلِ قدر تحفہ ثابت ہوگا۔

ہمارے اس شہر میں جو مراٹھی زبان کا مرکز ہے، نہ صرف غالب کے نام و کلام کی دھوم ہے بلکہ اچھے اچھے "غالب شناس" موجود ہیں۔ مثلاً علی سردار جعفری، ظ۔ انصاری، شہاب الدین دسنوی، سیتو مادھو راؤ پگڑی، شری پد جوشی اور وڈیا دھر گوکھلے۔ یہ اہلِ قلم غالب کو عام اہلِ ادب تک حسبِ شان سے پہنچا رہے ہیں، آپ کو بھی اندازہ ہے اور "غالب نمبر" میں آپ نے ان صاحبوں کا تعاون حاصل کیا ہوگا۔ ہم سب اس مقصد میں شریک ہیں۔

دعا ہے کہ خدا آپ کو اپنے مقاصد میں کامیاب کرے۔ فقط۔

رفیق زکریا

(رفیق زکریا)

آنریبل محمد علی۔ وزیر ٹرانسپورٹ، ٹورزم اور ہاؤسنگ حکومت میسور

۲۴ نومبر ۱۹۶۹ء

مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی ہے کہ ماہنامہ "شاعر" (اُردو)، ہندوستان کے ایک عظیم اُردو شاعر کی صد سالہ برسی کے موقع پر غالب نمبر کے نام سے ایک خاص شمارہ شائع کر رہا ہے۔

جشنِ غالب کی تقریبات وسیع پیمانے پر ہندوستان میں ہر جگہ منائی جا رہی ہیں۔

مرزا صاحب نے اپنی زندگی میں اپنے پُر کشش اور خوبصورت اندازِ بیان سے اُردو ادب کو جو رچاؤ اور عظمت بخشی ہے اُس کے ذکر کی ضرورت نہیں۔ اُس عہدِ گذشتہ میں بھی جب کہ سیاسی شعور بُری طرح سے مجروح کیا جا رہا تھا، غالب حالات کے محض تماشائی نہیں رہے۔ اُن کی تخلیقات میں سیاسی حالات کا پرتو نمایاں طور سے نظر آتا ہے۔

میری دلی خواہش ہے "شاعر" کا یہ غالب نمبر نہایت کامیاب ثابت ہو۔

Mohamedal

ڈاکٹر ط۔ انصاری

غالب کی کہانی

(زندگی کے ۷۳ برس)

ہندوستان میں مغل عہد تاریخِ ہند کی دو کروٹوں سے عبارت ہے۔ درباری عہد اپنی ترقی اور شباب کے عروج پر پہنچ چکا تھا جب ایک سمرقندی مغل سپہ سالار ظہیر الدین بابر نے پانی پت کے میدان میں لشکر ڈالا۔ مغلوں کی فتح کے ساتھ وہ نظام پھلا پھولا جو دیسی معیشت کو ملکی معیشت میں تبدیل کرتے آیا تھا اور کوئی سوا دو سو برس بعد جب ۱۷۵۷ء میں پلاسی کے میدان میں مغل صوبیدار کو شکست ہوئی اور مغل شہنشاہ شاہ عالم کو انگریزوں سے مصالحت کرنی پڑی تو یہ صاف ہوگیا کہ پورا ملک اس سیلاب کی رو میں آئے گا جو جنوبی اور مغربی ہند کے ساحلوں سے ہوتا ہوا بڑھ رہا ہے۔ اٹھارویں صدی کے ختم ہوتے ہوتے مغل بادشاہ برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کے گورنر جنرل کا وظیفہ خوار ہوگیا اور دلی کا لال قلعہ ایک ایسے رئیس کی ڈیوڑھی ہو کر رہ گیا کہ اس کا مستقبل اتنا ہی تاریک تھا، جتنا ماضی شاندار۔ سمرقند، بخارا، بلخ، بدخشاں کے علاوہ ایران کے بڑے بڑے شہروں سے کاریگروں، عالموں، فاضلوں، شاعروں، تاجروں اور فوجیوں کی یک طرفہ آمد کئی صدیوں سے جاری تھی اور اب اس کا سلسلہ تمام ہو رہا تھا کہ مرزا غالب کے دادا شاہ عالم کے عہد میں سمرقند سے ہندوستان آئے۔ اُن کی زبان وہ ترکی تھی جس کے اثرات آج بھی ازبک اور تاتاری زبانوں میں پائے جاتے ہیں اور جس میں فارسی عربی کے الفاظ کثرت سے ملتے ہیں۔

مرزا غالب کے دادا قوقان بیگ ایسے وقت میں ہندوستان آئے جب دلی کی مرکزی حکومت کا شیرازہ تیزی سے بکھر رہا تھا۔ سب صوبیدار خود مختار ہو چکے تھے اور مرکز میں ایرانی اور تورانی امیروں کی سخت کشمکش جاری تھی۔ دورِ آخر کا نامور امیر نجف خاں ذوالفقار الدولہ جس کے ہاتھ میں مرکز کی باگ ڈور تھی، خود ایرانی تھا۔ لیکن اُس نے ان نووارد مغل سپاہیوں کی قدر کی اور دلی سے کوئی سو کلومیٹر پر ایک زرخیز پرگنہ پہاسو ان کے اپنے اور رسالے کی تنخواہ کے لئے سرکار سے مقرر ہوگیا۔

قوقان بیگ کے انتقال کے بعد یہ علاقہ اُن کی اولاد سے چھن گیا۔ انہوں نے چار بیٹیاں اور تین بیٹے چھوڑے تھے، جن میں ایک بیٹے نصر اللہ بیگ خاں نے اپنے باپ سے بڑھ کر عزت اور حیثیت پائی۔ ان کی شادی حکومت دلی کے امیر کبیر نواب احمد بخش کی بہن سے ہوئی، جو انگریز کمانڈر انچیف سے خاص تعلقات رکھتے تھے اور دلی کا پولٹیکل ایجنٹ انہیں "چچا" کہتا تھا۔

---

[1] ہندوستان کی سیاست اور سیاسی استحکام کی اس زمانے میں ہر طرف دھوم تھی اور چونکہ تورانیوں اور ایرانیوں کو ولایتی METROPOLITAN سمجھا جاتا تھا۔ انہیں سرکاری عہدوں پر ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا تھا۔



توقان بیگ کے ایک اور بیٹے عبداللہ بیگ خاں تھے جو سنجیدہ مذہبی اور معاملاتِ دنیا میں بھولے آدمی تھے۔ اُن کی شادی آگرہ کے ایک باعزت اور صاحب حیثیت گھرانے میں ہوئی تھی اور عمر کا بیشتر حصہ سسرال میں گزرا۔ بعد میں وہ لکھنؤ چلے گئے اور تین سو سواروں کی جمعیت سے ملازمت کی، لیکن وہاں شیعی ماحول سے ان جیسے سخت مذہبی آدمی کی بنی مشکل تھی۔ ملازمت ترک کر کے حیدرآباد گئے۔ یہاں امیروں کی اندرونی کشمکش میں ان کی سادگی کام نہ آئی اور یہاں سے الگ ہو کر دلی کے نزدیک ایک چھوٹی سی ریاست الور میں چلے آئے۔ ابھی اُن کو باقاعدہ ملازمت نہ ملی تھی کہ ایک اندرونی معرکے میں کام آگئے۔ مرزا غالب انہیں عبداللہ بیگ کے بیٹے تھے۔

اسداللہ بیگ خاں عرف مرزا نوشہ (غالب) آگرہ میں ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء کو پیدا ہوئے اور جب والد کا انتقال ہوا تو اُن کی عمر پانچ چھ برس کی تھی۔ ان کے چچا نصراللہ بیگ خاں کے کوئی اولاد نہ تھی۔ اُنہوں نے بھائی کی اولاد کو اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ اب ایک طرف تو ننھیال دولت مند اور باحیثیت، دوسری طرف چچا باعزت اور باوقار۔ لیکن ابھی مرزا کی عمر آٹھ برس کچھ مہینے کی تھی کہ چچا بھی ایک لڑائی میں ہاتھی سے گر کر ہلاک ہو گئے۔

یہی چچا تھے جن کی وراثت تقسیم ہوتے ہوتے غالب اور اُن کے بھائی کے حصے میں برائے نام آئی۔ چچا کی جاگیر انگریزوں نے لے لی اور نواب احمد بخش خاں کو یہ ذمہ داری سپرد ہوئی کہ وہ نصراللہ بیگ خاں کے وارثین کو دس ہزار روپیہ سالانہ بطورِ خرچ ادا کیا کریں۔ بعد میں نواب نے کسی صورت ریذیڈنٹ سے مل ملا کر دس ہزار کے پانچ ہزار کرا لئے اور پانچ ہزار روپے میں سے غالب کو صرف ۷۵۰ روپے سالانہ ملنا طے ہوا۔ اب گویا گزر بسر ننھیال میں تھی اور اوپر سے محض ۷۵۰ روپے سالانہ جیب خرچ مل جاتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ الور کی ریاست سے بھی جہاں اُن کے باپ میدانِ جنگ میں کام آئے تھے، کچھ روپیہ غالب اور اُن کے بھائی کو ملتا تھا جو بعد میں بند ہو گیا۔

یعنی جب غالب ہوش سنبھال رہے تھے تو اُن کو جو ماحول میسر ہوا وہ مستقبل کی بے یقینی اور حال کی بے ثباتی کا تھا۔ چھوٹی چھوٹی دیسی ریاستیں انگریزوں کی دست نگر رہ گئی تھیں اور ان میں بھی آئے دن انتظام بدلتا رہتا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کا اقتدار مسلّم ہو چکا تھا اور وفاداریاں کمزور اور تقسیم ہوتی رہتی تھیں۔ باپ نے دیسی ریاستوں میں باعزت ملازمت اختیار کرنا چاہی، پر کچھ ہاتھ نہ آیا۔ چچا نے مقامی مرہٹہ سردار بھاؤ راؤ سندھیا کی نوکری کی لیکن انگریزوں سے خفیہ معاملہ کر کے (بقول غالب) قلعہ چھوڑ دیا اور اسی "خدمت" کے اعتراف میں انہیں چار سو سواروں کا رسالہ دار بنایا گیا۔ سترہ سو روپے تنخواہ مقرر ہوئی اور بعد میں دو پرگنے اور انہوں نے جیتے جی جوان کی جاگیر قرار پائے۔ لیکن ان کے مرتے ہی دوسرے عزیزوں نے انگریز افسروں سے سازش کر کے وہ حق مار لیا، جو قاعدے میں مرزا اسداللہ خاں (غالب) کو ملنا چاہیے تھا۔

ننھیال میں اُن کے نانا کی عزت بھی بڑی تھی اور خاندان بھی بڑا۔ ماں تعلیم یافتہ، خانہ نشین اور مذہبی طبیعت کی خاتون تھیں۔ پال پوس ننھیال میں ہوئی جہاں آس پاس کے عالی شان مکانوں میں بڑے بڑے جاگیرداروں کے خاندان آباد تھے، جن میں سے ایک ہم جوار راجہ بلوان سنگھ اور بنسی دھر نامی ہم کو ملتا ہے۔ روپے کی کمی نہ تھی اور روک ٹوک کرنے والا کوئی نہ تھا۔

آئندہ کی زندگی میں جب دولت کے سوتے سوکھ گئے اور غالب کو عزت آبرو پر حرف آتا دکھائی دیا تو وہ بار بار اپنے وقار کی لَو اونچی رکھنے کے لئے گذرے دنوں کی امارت اور عالی نسبی کی آڑ لیا کرتے تھے۔ یہ عالی نسبی اصلی ہو یا فرضی ——— لیکن خاندانِ تیموری کے ہوتے اس کا بھرم باقی تھا۔ چنانچہ جب بہادر شاہ کی فرمائش پر وہ شاہی خاندان کی تاریخ (مہر نیمروز) لکھنے بیٹھے تو ابتدا میں سارا زور اس پر صرف کر دیا کہ خود بھی کسی نہ کسی طور پر اسی سلسلے سے متعلق ہیں۔

چار طرف سے تیرِ ملامت کھا کر اور رسائی کی زندگی بسر کر کے بھی وہ اپنی عالی نسبی پر جو فخر کرتے ہیں تو اپنی کلاہ کج اور نگاہ



بلند رکھنے کے لئے تلمیذ صورت سوال گئے ہیں لیکن یہ بھی حتاتے ہیں کہ میں خود سپاہی دکھانے والوں میں سے ہوں آپ سے مانگتا ہوں تو کیا شرم کہ آپ بھی سپاہیوں کے قبیلے سے ہیں۔[1]

ایسی شجاعت جتانے کی عادت قبائلی نظام زندگی کی یادگار ہے جس نے طویل عمر پائی اور جاگیرداری کی آخری سانس تک چلتی رہی۔ عرب کے قدیم ادب کا بڑا حصہ اسی فخر و مباہات سے بھرا پڑا ہے۔ ہندوستان میں موسمرلی نے معاشی اور سماجی نظم کو مستقل کرنے کے لئے چار وروں کی تقسیم میں سماج کے تیں جو تھائی کو شرافت نسبی کا تاج پہنا دیا۔ مغربی ایشیا میں اسلام نے اس کو شدید کی کوشش کی اور یہاں مدعا از ہستے اس کے خلاف آواز بلند کی۔ غالب خود کو ترک ہندو کہتے نہیں جھکتے، ترکستان کی عظیم الشان تاریخی شخصیتوں سے بغیر کسی تاریخی دلیل کے پدری نسبت بیان کرتے ہیں تو اس میں کسی قدر ہندوستانی مزاج کی نشان دہی بھی ضرور ہوتی ہے۔ اپنے پہلے ہی تخلیقی کارنامے دیوان نظم فارسی (اشاعت ۱۸۴۵ء) کے آغاز میں وہ کئی بار اس کا اعلان کرتے ہیں:

غالب از خاک پاک تورانیم		لاجرم در نسب فرہ مندیم
ترک زادیم و در نژاد ہمی		بہ سترگان قوم پیوندیم
ایبکیم از جماعۂ اتراک		در تمامی زماہ دہ چندیم
فن آبائے ما کشاورزیست		مرزبان زادۂ سمرقندیم
در معنی سخن گزاردہ		خود چہ گوئیم تا چہ و چندیم
فیض حق را کمینہ شاگردیم		عقل کل را بہینہ فرزندیم
ہم بہ تابش بہ برق ہم نفسیم		ہم بہ بخشش بہ ابر مانندیم

فیض حق را کمینہ شاگردیم" (قدرت کے فیض سے ہم کو تھوڑا بہت حصہ ملا ہے) کا مصرع ہمیں ان کے بچپن کے ایک اور اہم پہلو پر بھی متوجہ کرتا ہے اور وہ ہے اُن کی تعلیم۔ تحقیق ہو چکا ہے کہ مرزا کو باضابطہ تعلیم کی پوری مدت نہیں ملی۔ کچھ گھر پر پڑھا اور کچھ مبادی فارسی عربی آگرہ کے ایک لائق مولوی محمد معظم کے مکتب میں سیکھی، لیکن کسی مضمون یا کسی زبان و ادب کی سلسلہ وار تعلیم حاصل کرنے اور اُستاد کی جھڑکی سے آشنا ہونے کا موقع نہیں ملا۔

ان کے محلے میں اور گرد اہل علم کا مجمع تھا۔ "کلاں محل گویا شہر میں فارسی زبان کا مرکز تھا اور ان کے بعد کے خطوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہم محلہ اہل علم سے بڑی عقیدت رکھتے تھے۔ اورنگ زیب کے منشا اور سرپرستی سے فرنگی محل اوادے کے بانی مولوی نظام الدین نے عربی فارسی مدرسوں کے لئے جو کورس تیار کیا تھا (درس نظامی) اس میں منطق، فلسفہ اور ادبیات کو فقہ، حدیث، تفسیر کے ہم وزن رکھا گیا تاکہ جو طلبا ادبی ذوق رکھتے ہیں وہ آگے کی جماعتوں میں اپنے پسندیدہ مضامین کی طرف چلے جائیں اور مذہبی ذوق رکھنے والے عربی اور دینیات کی طرف۔ غالب کی تعلیم کے سلسلے میں یہ حال تاکہ وہ عربی کی شُدبُد رکھتے تھے، دراصل اس کا اظہار ہے کہ فارسی ادب سے ان کا لگاؤ بچپن سے تھا۔ چنانچہ دس برس کی عمر میں فارسی شعر کہہ لیا اور جرأت کے ساتھ استاد کو پیش کرنا ثابت کرتا ہے کہ شروع ہی میں اُن کی طبیعت دینیات سے اور عربی مضامین سے اُچاٹ ہو گئی اور اساتذہ کے کلام کے مطالعے اور احباب کی سخن فہمی اور سخن سنجی کے علاوہ کسی مدرسے میں زانوئے ادب تہہ نہیں کرنا پڑا۔

---

[1] من ہم از خیل کریمانم و خجلت نہ بود گر بہ دریوزہ بہ درگاہ کریمان رفتم۔



غالب نے بعد کی زندگی میں بھی یہ جتایا ہے کہ فارسی زبان کا ذوق اُن کی طبیعت میں ایسے بھرا تھا جیسے فولاد میں جوہر۔ اور مبدأ فیاض (قدرت) کے سوا کسی اور سے علم و ادب کا بنیادی فیض نہیں پہنچا۔

آنچہ در مبدأ فیاض بود آن من است
گل جدا ناشدہ از شاخ بدامان من است

مشرقی چلن میں استاد کی حیثیت روحانی باپ کی ہے اور خدمتِ استاد کو دنیا اور آخرت کی فلاح کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ غالب جس طرح جسمانی باپ کی شفقت اور نگرانی سے محروم رہے اسی طرح روحانی باپ کی جاں سوزی اور گرم نگہی سے بھی بیگانہ گذرے۔ اس سے ان کی منہ زور انفرادیت اور حیرت خانۂ عالم میں پیچ در پیچ راہ ڈھونڈنے کا راز کھلتا ہے۔

بعد میں جب انہوں نے اسلام سے پہلے کی فارسی قدیم کے بعض الفاظ استعمال کئے اور بعض الفاظ و تراکیب کی نئی تاویل کی تو ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا اور لوگوں نے طعنے دیئے کہ یہ ترکیبیں اور یہ تاویلیں خود غالب کی ایجاد ہیں اور وہ خود نے استاد ہیں۔ ان کا منہ بند کرنے کو غالب نے ایک پارسی استاد ہرمزد (عبدالصمد) کا نام مشہور کر دیا اور بتایا کہ دو برس اس نے مرزا کے مکان پر رہ کر انہیں فارسی قدیم کی تعلیم دی اور زبان و ادب کے باریک نکات سے آگاہ کیا۔ ممکن ہے لڑکپن میں انہیں کچھ عرصے کسی ایسے پارسی عالم کی صحبت میسر آئی ہو جس کو قدیم فارسی میں دخل ہو۔ لیکن وقتاً فوقتاً مرزا کے اپنے بیانات اور بعد کی تحقیق سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ ایک فرضی نام تھا، ورنہ اس پردے میں خوداں کی موشگاف طبیعت، دشوار پسند مزاج اور لیک لیک نہ چلنے والے ذوق ہی کی کارفرمائی تھی۔

بارہ تیرہ برس کی عمر میں اُن کا کلام اُردو کے عام لب و لہجہ سے اس درجہ ہٹا ہوا تھا کہ جب اٹھارویں صدی کے عظیم الشان شاعر میر کو دکھایا گیا تو انہوں نے اپنی رائے ظاہر کی کہ

"اگر اس لڑکے کو کوئی کامل استاد مل گیا اور اس نے اس کو سیدھے رستے پر ڈال دیا تو لاجواب شاعر بن جائے گا، ورنہ مہمل بکنے لگے گا۔"

اس صاحب بصیرت کی رائے غالب کی تمام زندگی میں عملی طور پر ثابت ہوتی رہی، کیونکہ جب تک وہ استاد کے فیضِ تربیت سے محروم رہے ایسی راہوں میں بھٹکتے رہے جو انہوں نے آگے چل کر خود رد کر دیں۔ جب ان کو وہ اہل زمانہ اور وہ زمانہ نصیب ہوا جس کے بارے میں کہا گیا ہے: (الدھر خیر المؤدبین) زمانہ بہترین ادب آموز ہے!

گھریلو زندگی:

غالب کی عمر ابھی پورے تیرہ برس کی نہ ہوئی تھی کہ جس نوابی خاندان میں اُن کے چچا نے شادی کی تھی اور جس میں اُن کا کئی سال سے آنا جانا تھا، وہیں اُن کی بھی شادی ہو گئی۔ فیروز پور جھرکہ اور لوہارو ریاستوں کے والی نواب احمد بخش کے چھوٹے بھائی نواب الٰہی بخش معروف مستقل دلی ہی میں رہتے تھے۔ خود ان کی اپنی کوئی جاگیر نہ تھی۔ بڑے بھائی کے ہاتھ میں سب کچھ تھا لیکن شعر و سخن، علم و فضل اور مذہب و تصوف میں ان کی ذات مرکزی حیثیت رکھتی تھی۔ امراؤ بیگم ان کی بیٹی ابھی گیارہ سال کی تھیں کہ غالب سے بیاہی گئیں۔

ان کی بیوی کا مزاج گھر کے ماحول سے بنا تھا۔ وہ عبادت گذار، پاکیزہ شعار اور ایک خاص سانچے میں ڈھلی ہوئی عورت تھیں، جن کا باپ اور بھائی کے بعد کسی مرد سے سابقہ پڑا تو وہ نوجوان، خودرو، خود رائے، خود بیں اور شاعرانہ عادات کا آزادی پسند شوہر تھا۔ ظاہر ہے کہ ازدواج کے تمام بندھنوں کے ہوتے ہوئے اندرونی جاہر تضاد کی بنیاد یہیں سے پڑ گئی اور اگرچہ مرتے دم تک میاں بیوی ساتھ رہے لیکن یہ ساتھ ایک چھت کے نیچے بسر کرنے تک تھا۔ ہم آہنگی کا ماحول کبھی تیار نہ ہو سکا۔

غالب کو آگرے ہی میں دوستوں کے حلقے سے شراب کی چاٹ پڑ چکی تھی۔ بیوی اس برتن کو بھی نہ چھوتی تھی جس میں شرابی نے کھانا کھا لیا ہو وہ ان



کے کنبے سے برسوں الگ تھلگ [illegible] تعلقات سے رفتہ رفتہ دُور ہوتے جاتے تھے اور عمر و تجربہ بڑھنے کے ساتھ بقول خود صرف نصف مسلمان رہ گئے تھے کہ سؤر کا گوشت نہیں کھایا۔ بیوی عقبیٰ کا دنیا سے زیادہ خیال رکھتی تھیں۔ صوم و صلوٰۃ روزہ میں مصروف رہتی تھیں۔ میاں بیوی دونوں امیرانہ ٹھاٹ باٹ کے ساتھ پلے تھے۔ ہر طرح کا عیش آرام میسر رہا تھا۔ مگر وقت گزرتے گزرتے غالب اپنے بزرگوں کی میراث سپہ گری اور باپ اور چچا کے ترکے سے محروم اور روزگار کے وسیلے سے دُور ہوتے جا رہے تھے اور رہن سہن کا طریقہ وہی رئیسانہ تھا کہ گھر کے اندر اور گھر سے باہر کئی کئی ملازم پڑے ہیں۔ بیوی نے اپنے میکے سے سنجیدگی کا ماحول پایا اور اسی کو جزوِ طبیعت بنایا۔ شوہر کا یہ حال کہ مولوی، صوفی، کوتوال، بادشاہ ــــ اور حد یہ کہ خدا سے ٹھٹھول کریں۔ علی جواب سے چھیڑ خانی کی سوجھے۔ غالب کے خسر کی شہر میں وہ آبرو تھی کہ ان کے بڑے بھائی والیٔ ریاست ہونے کے باوجود ادب سے ان کے سامنے بیٹھتے تھے لیکن غالب ان سے مذاق کرنے سے نہ ہچکچاتے تھے۔ بیوی کو سب سے بڑی تسکین اولاد کی ہوتی ہے۔ غالب ایک تو ویسے ہی زن و فرزند کو اپنے شانے پر بوجھ سمجھنے والے۔ دوسرے ان کے ہاں اولاد ہوتی اور دو برس کی ہونے سے پہلے ہی سدھار جاتی اور سب سے بڑی بات شوہر کو مجازی خدا سمجھا اور اسی ایک کو زندگی بھر کے لئے اپنا مطمحِ نظر بنا کر سوئی کی گھنڈی میں پڑا تھا۔ یہی فرض تھا اور یہی سب سے بڑی عبادت۔ لیکن شوہر؟ شوہر کی نظر ہر رنگ میں وا ہو جایا جاتی تھی۔ اسے جلوۂ صد رنگ کا لپکا تھا۔ ایک واقعہ تو شادی کے چند سال بعد ہی پیش آیا کہ غالب نے کسی طرحدار معشوقہ سے ٹوٹ کر محبت کی۔ ایسی محبت جو پردہ داریوں کے باوجود ان کے سخن میں رنگ لے ہی آئی اور اس کی موت پر دو تڑپ کے بھی سنت ہار سے پردے دھرے رہ گئے۔ فارسی کے چند اشعار اور اُردو کی ایک غزل اس پر گواہ ہیں۔ ساری جوانی عشق کے کوچوں میں چھپتے چوری گھومتے رہے۔ دلّی سے باہر نکلے تو صبح بنارس دیکھ کر مچل گئے اور افسوس ہوا کہ سفر خرچ میں بھرپور جوانی ساتھ لیکر نہیں چلے ہیں ورنہ لٹاتے۔

کلکتے پہنچے (۱۸۲۸ء) تو وہاں مشرق و مغرب کی دھوپ چھاؤں تھی حسینانِ گلفام و نازک، بدام کھلے عام لہراتے پھرتے تھے۔ غالب کے سینے میں تیر لگا اور لیا لگا کر جگر کے پار ہوا نہ دل سے نکلا۔ غالب کی جیسی بیوی کو اس سے بڑا اور کوئی صدمہ شوہر کی ذات سے نہ پہنچ سکتا تھا۔

جاگیردارانہ سوسائٹی میں اور وہ بھی ہندوستان کی قدیم جاگیردارانہ اخلاقیات رکھنے والی سوسائٹی میں عورت بنام بیوی کی جو حیثیت رہی ہے وہ ایک سنگین حقیقت ہے جہاں عورت کے اپنے مرد کی لاش کے ساتھ جل جانے کو قابلِ فخر سمجھا گیا ہو وہاں بیوی تعلیمیافتہ، ذی ہوش اور باحیثیت ہو کر بھی خاموش اور اٹل رہنے کو اپنا آئیڈیل سمجھتی ہے۔ خاندانی زندگی میں اس کا پایہ پلنگ کے پائے کی طرح رہتا ہے جو سارا بوجھ گردن پر لے کر بھی خود جامد ہے اور اپنی جگہ سے ہل جانا ہی اس کا سب سے بڑا قصور ہوتا ہے۔ ہماری موجودہ صدی تک شرفا کا رہن سہن یہ رہا ہے کہ دیوان خانہ اور محلسرا الگ الگ ہوتے تھے اور دونوں میں آنے جانے کا راستہ بھی ایک دوسرے سے بے تعلق۔ دن کے اُجالے میں باعزت گھرانے کے مرد صرف مردانے میں رہتے ہیں اور صرف ضرورتاً زنانے مکان میں جاتے ہیں۔ غالب کے زمانے میں شرفا کے لئے یہ قید اور بھی سخت تھی۔

غالب صبح کا کھانا کھا کر محلسرا سے باہر آ جاتے تھے اور رات گئے تک مردانے مکان (دیوان خانے) میں رہتے تھے۔ عمر کے آخری حصے میں جب ان میں دو بار اندر کے مکان میں جانے کی قوت نہ رہی، یہی معمول رہا۔

گھریلو زندگی کی اس کشمکش کا غالب کی زندگی اور ان کے کلام میں گہرا نقش نظر آتا ہے۔ ایک بیزاری اور جھنجھلاہٹ جو فکر کی آگ میں تپ کر اور عالی ظرفی کے سانچے میں ڈھل کر شوخی اور بے زاری میں تبدیل ہو جاتی ہے غالب کے ہاں نمایاں ہے ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں یہ کھرا اعتراف ملتا ہے

"۔۔۔ تاہل میری موت ہے۔ میں کبھی اس گرفتاری سے خوش نہیں رہا۔"

عین جوانی کے زمانے میں اس دکھ میں جہاں بیزاری ہے وہاں ہمدردی بھی ہے۔ مرزا پہلی بار دُور کے سفر پر روانہ ہوئے ہیں، بیوی بچوں کو چھوڑ کر کلکتے جاتے ہوئے بنارس ٹھہرے ہیں اور ۱۶ شعروں میں بنارس کی تعریف کرنے کے بعد انہیں بال بچوں کا خیال آ جاتا ہے ـــ

بکاشی لختے از کاشانہ یاد آر — درین جنت ازاں ویرانہ یاد آر

یہ مثنوی غالب نے عمر کے ۲۸ ویں برس میں لکھی ہے لیکن اس سے اہل و عیال کی دردمندی ٹپکتی ہے۔ شادی کے اوّلیں برسوں



میں دردمندی کا یہ عہد نہ رہا تھا۔ اِس کی جگہ قرار اور ایک خاموش احتجاج نظر آتا ہے۔ مثلاً ان اشعار پر جو پختگی کے زمانے کی یادگار ہیں اور جنھیں غالب نے خود اپنے انتخاب سے خارج کر دیا تھا۔ یہ شعر ہم کو ایک حقیقی بھولی غزل میں ملتا ہے ؎

آرزو سے خانہ آبادی نے ویراں تر کیا — کیا کروں گر سایۂ دیوار سیلابی کرے

گھر اور گھر کی زندگی کے بارے میں ہمیں کہیں بھی خوش گوار تصور کی جھلک نہیں ملتی۔ اور دیکھنے والوں کی زبانی یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ میاں بیوی میں اکثر چپقلش رہتی تھی اور ایک دوسرے کی راہ کاٹا کرتے تھے۔ جس دیوار کی پہلی اینٹ ٹیڑھی رکھی جا چکی تھی، وہ آخر تک ٹیڑھی ہی ہوتی چلی گئی۔ تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ نہ تو اپنی گھریلو ذمہ داریوں سے کبھی غافل ہوئے اور نہ انھوں نے رشتہ تڑانے کی کوشش کی، بلکہ کبھی مسکرا کر اور کبھی کراہ کراہ کر ان سے نباہ کرتے رہے۔ جب تک بار دوش میں دم ؎ گرہ میں مال اور طبیعت میں جولانی اور بے پروائی رہی، اِدھر اُدھر کے تیرنیم کش لبوں سے منہ کا مزا بدلتے رہے اور جب یہ متاعِ عشق بازی بھی کھو گئی تو تھک ہار کر صرف گھر کے ہو رہے اور سارا انہماک کھیل کی جولانگاہ اور شعر کی بارگاہ پر لگ گیا۔ ظاہر ہے کہ یہ خود فن سخن کے لئے مبارک فال تھی۔

ناگواریوں کا سلسلہ۔

غالب نے پندرہ سولہ برس کی عمر سے دلّی ہی میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ اگرچہ انھوں نے کرایہ کے مکان میں رہنا پسند کیا اور ساری عمر مکان بدلتے گذار دی۔ تاہم ابتدا میں ان کے تعلقات انہی بزرگوں سے رہے جو ان کی بیوی کے رشتہ دار تھے۔ نواب احمد بخش اور ان کے بھائی نواب الٰہی بخش معروف کے احباب کے حلقے میں علم و فضل تھا، بزرگانہ شرافت تھی، تربیت یافتہ اشرافیہ کے اخلاقیات تھے اور اونچے درجے کا رہن سہن۔ لیکن اِس سب کو سجانے کے لئے غالب کا اثاثہ اور ان کی اٹھان موزوں نہ تھی۔

انہیں یقیناً اُس پاس کے سربرآوردہ لوگوں کے سامنے اپنی تنگی اور بے جوڑپن کا احساس ہوتا ہوگا۔ جن لوگوں کی سوسائٹی کو انہوں نے چنا، ان میں مولوی فضل حق خیرآبادی اور مفتی صدر الدین آزردہ اور نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ جیسی شخصیتیں تھیں۔ اس وقت کے بکھرتے ہوئے دور میں ایک فلسفہ اور علم کلام کا بلند ستون تھا، تو دوسرا دینیات اور منقولات کے علاوہ فارسی ادب کی سند الاسناد۔ اور تیسرے امیر کبیر ہونے کے علاوہ خود زبردست شاعر اور اپنے زمانے کے نقاد۔ غالب کی اپنی دنیاوی اور علمی حیثیت ان تینوں کے مقابلے میں کمتر تھی۔ غالب کی طبیعت کو فکر اور اختراع سے خوانسبت تھی، اس نے انھیں مجبور کیا ہوگا کہ قدیم نو افلاطونی اور اسلامی فلسفے کے ستون فضل حق کے سامنے سر جھکائیں —— وہ جھکے، اور اپنے شاعرانہ رویّے پر نظرِ ثانی کی۔

مفتی صدر الدین آزردہ یوں تو غالب کے بہی خواہ اور مشکل حالات میں مددگار ثابت ہوئے، لیکن اُن کے ذوقِ شاعری کو غالب کی شاعرانہ خودسری گوارا نہ تھی اور غالب کو یہ بات زندگی بھر کھٹکتی رہی اور وہ ہر پہلو کوشش کرتے رہے کہ اپنے عہد کے اس فاضلِ اجلّ کو کسی طرح قائل کر کے چھوڑیں۔ یہ شعر انھوں نے بڑے درد سے مفتی صاحب کے سامنے پڑھا تھا ؎

تو اے کہ محوِ سخن گستران پیشینی — مباش منکرِ غالب کہ در زمانۂ تست

مصطفیٰ خاں شیفتہ شعرا کے سرپرست بھی تھے اور خود اس درجے کے شاعر اور سخن فہم کہ کہا جاتا ہے، کسی کے کلام پر ان کی خاموشی قدرِ سخن کم کر دیتی تھی اور ان کی داد کلام اور صاحبِ کلام کی منزلت بڑھا دیتی تھی۔ غالب ان کی ترازو کے بڑے معترف تھے۔

غالب بہ فنِ گفتگو نازد بدین ارزش کہ او — ننوشت در دیوان غزل تا مصطفیٰ خاں خوش نکرد

(باقی ۵۸۷ پر دیکھئے)



قاضی عبد الودود

جہانِ غالب

(۱) باغِ دودر: غالب کی نظم و نثر فارسی کا مجموعہ جس کی نثر کلیات نثر فارسی اور نظم کلیات نظم فارسی (ہر دو نولکشوری) سے خارج ہے۔ مگر اس کی نظم کا بہت بڑا حصہ سبد چین میں موجود ہے۔ اس کا واحد قلمی نسخہ جناب سید وزیر الحسن عابدی کی ملک ہے اور میں نے مدت ہوئی اُسے سرسری طور پر دیکھا تھا۔ مطبوعہ نسخہ انہیں کا مرتبہ ہے اور اس کے پیش نظر نسخہ نظم و نثر غالب۔ ص ۲ تا ص ۱۹۱ سے معلوم ہوتا ہے کہ مرتب نے اس کے لیے تعارف، حواشی، تصحیح اور تعلیقات تحقیقی لکھے تھے، اور فہرستیں تیار کی تھیں۔ نسخہ پیش نظر میں تعارف اور تعلیقات تحقیقی مطلقاً نہیں، فہرستیں ہیں، البتہ محققانہ حواشی جن میں صرف اس سے بحث ہے کہ مرتب نے متن میں کیا تبدیلی کی ہے۔ خاتمۂ نوشتۂ کاتب اس پر مُصِر ہے کہ کتاب عنایت علی نے نسخہ ہیرا سنگھ کی فرمائش سے ۱۸۷۰ء میں لکھا تھا۔ کاتب نے کتاب کا نام سبد چین بتایا ہے۔ غالب کا دیباچہ مختصر ہے جو اس بیت سے شروع ہوتا ہے:

دو در دارد ایں بیت آراستہ ‏ ‏ ‏ دروسد از ہر دو در خاستہ

اس کے بعد سبد چین کا ذکر ہے اور آخر میں یہ عبارت ہے:

"ناگہ یاراں سری چند آوردند آں را نیز دریں مجموعہ گنجانیدیم و باغ دو در نامیدیم۔ ادا آنکہ سبد باغ دو در بگہرار و دو صد و ہشتاد و سہ عدد دارد، و از روی حسن اتفاق تا آغاز نگارش ایں صحیفہ مطابق افتادہ ایں نام لطفی دیگر دارد۔"

مرتب نے سرورق میں سال گرد آوری ۱۲۸۳ھ بتایا ہے مگر خود غالب اسے سال آغاز کہتے ہیں۔ اس مجموعہ میں ایک قطعہ ہے جس کے دو ابیات آخر یہ ہیں:

دو عرۂ شعبان چو زمں بادہ گرفتند ‏ ‏ ‏ خود غالب پژمردہ نشانی ز سییں بود

روشن بد ما آرا رمہ شعبان کہ دریجا ‏ ‏ ‏ مقصود من از تحرجہ اللہ ہمیں بود

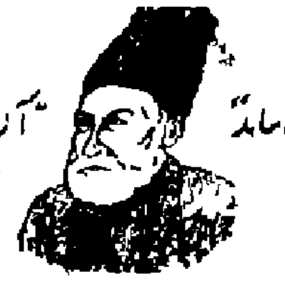
"غالب پژمردہ" = ۱۲۹۱ سے تخرجہ ۶ مادۂ تاریخ نکالا ہے۔ باغ دو در ص ۳۱

نظم کا بہت بڑا حصہ سبد چین میں ہے اور اس کا حال بحث سبد چین سے معلوم ہوگا اس جگہ اس کے متعلق صرف دو باتیں لکھوں گا۔

(۱) صفحہ ۲۸ میں ایک قطعہ کے ۳ مصرعے ہیں چوتھے کی نسبت مرتب نے اطلاع دی ہے کہ "از لحاظ احساسات مذہبی زدہ بود"۔ چوتھا مصرع میں نے اپنی یاد سے لکھا ہے:

تا بود چار عید در عالم ‏ ‏ ‏ بہر تو یا رب خجستہ باد و ہمیر

عید شوال و عید دی الحجہ ‏ ‏ ‏ عید قتل عمر و عید غدیر



صفحہ ۶۲ میں یہ مصرع ہے بہیب فتنہ "آں حریف ستمگری ماند" "آں حریف" کی جگہ "ایجوب" چاہئے جو دو موں حمرہ میں ہے۔
مندرجات حصۂ نثر: (۱ و ۲) دیباچہ اول و ثانی قاطع برہان، پہلا اشاعت ا و ۲ دونوں میں موجود، مگر صرف اشاعت ۲ میں ہے (۳) تقریظ قاطع برہان (مراد از خاتمہ) صرف اشاعت ۱ میں ہے۔ (۴ و ۵) دیباچہ و تقریظ مثنوی ابر گہربار، نولکشوری کلیات میں ہیں، مثنوی الگ سے بھی شائع ہوئی ہے۔ دونوں اسی سے ماخوذ ہیں۔ (۶) تقریظ سفر رنگ دساتیر از محمد علی خاں، کتاب مطبوعہ میں ہے (۷) تقریظ کتاب در گستا از محمد علی خاں مثل ۶۔ (۸) مکاتیب کل ۶۔ بنام جواہر سنگھ جوہر ۱۳، بنام ذکی پھلی ۱، بنام فضل اللہ خاں دیوان راج الور ۱، بنام نبی بخش ۱، بنام علائی ۲، بنام جان جاکوب ۱، بنام مشرف الدولہ مہر ولایت علی ۱، بنام رجب علی خاں ۲، بنام تفضل حسین خاں ۷، بنام تفتہ ۱۱، بنام منشی بالمکند لال وکیل راج بھرت پور ۲، بنام میر احمد حسین میکش ۳، بنام شاہ صاحب ۱، بنام قطب الدولہ ۲، بنام "دوستے" ۱، بنام ہیرا سنگھ ۱،

(۲) **گلستانِ سخن** (تذکرۂ شعرائے فارسی و اردو نام تاریخی) کے مصنف بموجب سرورق مرزا قادر بخش صابر اور مصلح عبارات صہبائی ہیں۔ غالب نے اسے تذکرۂ صہبائی کہا ہے اور اس کا ایک نسخہ انہوں نے شعق کو تحفۃً بھیجا تھا (عود ہندی، مرتبہ جناب فاضل، قاطع برہان (اشاعت ۱، ص ۴۸) میں لکھا ہے کہ ایک معلمی پیشہ شخص جس نے بعض لوگوں کو اپنی فارسی دانی سے متعلق فریب دے رکھا تھا اور خوشیاب و زندہ رود کے نسخے حاصل کئے تھے۔ اپنی تصانیف میں ان کا نام اس لئے لایا کرتا تھا کہ فارسی میں اپنا تبحر ظاہر کرے۔ معلم کا ذکر صیغۂ ماضی میں ہے اور یہ باور کرنے کی نہایت قوی وجہ ہے کہ اس سے صہبائی مراد ہیں مگر ان کی کتابوں میں جو ان کے نام سے شائع ہوئی ہیں اور میری نظر سے گذری ہیں، ان کتابوں کا نام نہیں آیا۔ مقدمۂ گلستانِ سخن صفحہ ۴ میں البتہ ان سے بحث ہے اور قریب بہ یقین ہے کہ غالب کا اشارہ اسی کی طرف ہے۔ راقم کی رائے میں تذکرہ صہبائی کا لکھا ہوا ہے اور شعراء کے حالات و کلام کی فراہمی میں صابر ان کے شریک ہیں (رجوع بمقالۂ راقم متعلق گلستانِ سخن، دہلی کالج میگزین، دہلی کالج نمبر، زمانۂ آغاز و انجام بترتیب ۱۲۷۰ و ۱۲۷۱ھ (ص ۱۷ و ۸۵ ۴)، طبع اول مطبع مرتضوی دہلی ۱۲۷۰ھ، طبع ۲ مطبع نولکشور لکھنؤ ۱۲۹۵ھ (اسی کے صفحات کا حوالہ مقالۂ مذکور میں ہے، اس کا ذکر نہیں) طبع ۳ پاکستان، مطبع ؟ سنہ ؟ مقدمہ میں دہلی کے حسب ذیل شعرائے معاصر کا خاص طور پر نام آیا ہے: احسان، نصیر، ممنون، ذوق، غالب، مومن، شیفتہ، تیر، سور، صہبائی، آزردہ۔ مدح سرائی میں مبالغہ جو عہد صہبائی کا دستور تھا، اس تذکرے میں بھی پایا جاتا ہے۔ اس میں غالب کے .. فارسی اور ۳ اردو اشعار ہیں۔ ترجمۂ غالب:

غالب تخلص، شیر بیشۂ سخنوری، سر بستۂ معنی پروری، یکہ تاز عرصۂ کمال، یگانہ کشور افضال، سیاح زمین سخن، دانائے نوادر فن، زبدۂ کملائے جہاں مرزا اسد اللہ خاں معروف بہ میرزا نوشہ، سخن سنج بے مثل و نظیر، صاحب طرز دلپذیر، اقلیم سخن میں لوائے جہانگیری بلند کیا ہے۔ فضائل اگر اس .. کی ذات پر تکیہ نہ کرتے فضیلت نہ رکھتے اور کمالات اگر اس .. سے مدد نہ لیتے عالم کی تکمیل کا سبب نہ ہوتے۔ ایوان سخن اس کی فکر کی معماری سے آسمان کے ساتھ ہم رفعت .. بزم میں رقاصۂ قلم رقص ناہید کے برابر۔ بیان رزم میں صریر خامہ نعرۂ تیر سے ہمسر۔ مگر اگر حوصلۂ ہمت کے لائق جہد کرے فضائے لامکاں مرحلۂ مقصود کے روبرو دیدۂ مور سے تنگ تر نظر آوے۔ سخن کی فراوانی اور ہجوم معانی اور متانت تراکیب اور رشاقت اسالیب اور شوخیٔ اشارات اور چستیٔ عبارات، گاہ اجمال کی رعایت سے آفتاب کو لباس ذرّہ میں جلوہ دینا اور گاہ تفصیل کے اقتضا سے تخم کو نہال کی صورت میں نشو و نما بخشنا، جدائی کو فصل اور ملاقات کو وصل کے قبیل سے ٹھہرا کر سخن میں بلاغت کے ساتھ ادا اور حشو و زوائد سے نرم کلام میں مثل صحبت نزہا احتساب کرنا اور اسی طرح اور باتیں جو لوازم سخن .. سے ہیں جیسی اس .. مشاہدہ ہوئی ہیں کم کسی میں دیکھی گئیں۔ ہر چند اشعار ریختہ حد حصر سے باہر خارج .. تھے .. لیکن .. اختصار کو لبید کیا اور .. ایک

عالب نمبر ۶۹ء



[illegible] رتب کیا اور مجموعۂ فارسی کا تو دیوان مختصر سے بھی زیادہ ۔ ابیات بلند صدا سے مملو ...
[illegible] میں گاہ گاہ اسد تخلص بھی کیا ہے لیکن غالب غالب، اور بیرطالب اسی نام سے مجدد
[illegible] کے لستان کا طالب ہے ..." اشعار اردو ۲۳، اشعار فارسی ۳۹ ۔

(۳) [illegible] پسر بہادر شاہ ظفر کو بادشاہ کے انتظامی امور میں خاصہ دخل تھا۔ غالب کی رباعی جو دیوان کے ایک سے
[illegible] میں بھی دیوانِ مطبوعہ سے خارج ہے ؛

ای آنکہ بہ ہر نام تو شاہ رخ است ۔ پیوستہ ترا حضرت شاہ رخ است
نازد بتو بسکہ باشد اندر شطرنج ۔ امید ظفر قوی چو بادشاہ رخ است

[illegible] کے ایک خط بنام جوہر نوشتہ ۲۷ اپریل ۱۸۴۷ء میں یہ عبارات ہیں ؛

"[illegible] شاہزادہ شاہ رخ را تسلیل استعداد و استجلاب نوشتن یعنی چہ ؟ مگر بدانست شما مرگ را بر خسروان د
[illegible] دست نیست ۔ بلی، شاہ رخ ہنگام بار گشتن از شکار چون نزدیک میرٹ (میرٹھ) رسید تب بہ رنجور شدہ،
واہم دراں ناحیت مرد۔ جنازہ اورا بہ شہر (دہلی) آوردند و در کلاری باغ پائین مزار پدر ش بخاکش سپردند۔"

اسی مجموعہ میں ایک بنام مشرف الدولہ میر ولایت علی ہے ؛

"[illegible] خدای برس کہ رسیدن شاہزادۂ ماہ لقا و آں ہم بہ جہانگیری شما آرزو کردم ۔ و ہر چند کہ فروغ گوہر...
من ... بدیں فرو گذاشت کہ از سوی پایہ ماشما ساں بمیان آمد از آنچہ بود بکاست اما دانی کہ بہ بہجار باشد
جگر بہ منش را سرافراز باشد ؟ دریں بیش دو بار بدان ہمایوں نشیمن رسیدہ ام ۔ دہر دو بار بود خواندہ اند و دلبر
نشاندہ اند، حاشا کہ دریں بار روش شاہزادہ طبیعی باشد ۔ ہمانا بیتیں از آنکہ من آیم قرار چیاں بود کہ یک پاس در پا سائیم
نشاندہ دما شاہزادہ را بلہو نظارہ صید و تحیہ مشغول بکنند مرا پیشگاہ بخوانند۔ چوں روبروی رسم حضرت صاحب عالم
بسپاس دلنوازی شہید و مرا نشستن بہ دستوری بدہند۔"

اموری ذیل موید ہیں کہ شاہزادے سے شاہ رخ مراد ہیں ؛

"شاہزادہ سا میں اُن کی اہمیت، خط میں اُن کی موت پر رسمی اظہارِ رنج ہی ہیں، حالانکہ یہ جوان اور سفر میں مرے تھے، اس کی وجہ
کدورت ہی ہو سکتی ہے ۔ رباعی کا دیوانِ مطبوعہ سے اخراج ، اس کا باعث بھی یہی ہے بعد کو باغ دو در میں شمول اس وقت ہوا
جب [illegible] کو بہت زمانہ گزر چکا تھا اور احساس میں شدت نہ رہی تھی۔"

(۴) مشرف الدولہ میر ولایت علی کے نام کا ایک خط باغ دو در میں ہے ۔ غالب کی کسی اور تحریر میں اُن کا نام نہیں ملتا۔ خط کی ابتدا
"نفرین خدای" سے ہوتی ہے جو عام روش کے خلاف ہے ۔ خاتمہ یوں ہوتا ہے ؛

"تقریب دیگر است و تحریب دیگر ۔ ما شما را مفرقت میخواستیم ۔ محرت، رخ تو د علط بود آنچہ ما باید داشتیم" ۔ ما فرما برداا
پرستاییم، زباں از کف تیغ آزمای کشور گشایاں ستاییم، مارا بارادہ ی لسیاں چہ جو لستی، دباگستگان چہ پیوند ؟ ما سد کہ ازیں
بستن آں خواہم کہ تسلای گرامند بلکہ مقصود من ہمہ آنست کہ ما سد عالت بمیداند والسلام۔"

زاویہ نشینی بہ بستگی" کا اطلاق مکتوب الیہ پر کس طرح ہو سکتا ہے، یہ نہیں کہا جا سکتا۔

(۵) شاہ شمس خاں سے متعلق عبارتِ ذیل باغ دو در کے ایک خط بنام میکش نوشتہ ۲۱ جنوری ۱۸۴۹ء میں ہے ؛
"احوال شاہ شمس خاں پسر علی محمد خاں رسالہ دار کہ در لکھنؤ رسیدہ از منتسبان رضی الدولہ است دریافتہ رقم میتواں کرد۔"

(۶) گل شاہ ۔ باغ دو در کے ایک خط بنام جوہر مکتوبہ اپریل ۱۸۴۷ء میں جو طاہرا آگرہ گیا ہے، مرقوم ہے ؛



"خیر و سلامت حضرت مولوی گل شاہ صاحب سلمہ آنکہ کارشناسی معنی عظیم بہادر وازدوست جیرم داده اید از جانب من بسیار بسیار درود و سلام رسانید و نیاز مندی ہای مرا عرضہ دارید۔"

غالب کی کسی اور تحریر میں ان کا نام نہیں آیا۔

(۷) **وارث علیخاں** یا شاہ دوواں کے خط بنام نبی بخش حقیر نوشتہ نومبر ۱۸۵۰ء میں ہے :

"این روشن گہر گرامی دودمان حکیم وارث علیخاں کہ ذکرِ وی در زبان کلک شما رفت ۔ غالب ۔ را بمنزلہ حقیقی برادر است و ۔ از جان عزیز تر۔ از یک استاد فیض اندوختہ ایم و در یک دبستان دانش آموختہ اگر ہزار سال ۔ ہم پیوند یم و نامہ و پیام ہمدگر را یاد نکنیم، بیگانگی فراموش خواہد بود و دل از مہر یکجاں کوشش۔ آرزو دارم کہ این نامہ را لوی سانید و از من سلام گوئید تا چہ فرمایند۔"

(۸) صرصرِ ازین پیش طالع یار جان نامہ نامی کس دادہ ومس پاسخ آن ستہ ۔ بدان ستودہ خوی سپردہ ام و ... عمر یا منتہ ام کہ صرصر نامی از مریدان ملازم سرکاری آن نامہ را ٹبرد۔" (خط بنام تفضل حسین خان، تاریخ ندارد)

(۹) شاہ صاحب کے نام کا ایک خط نوشتہ، ۹ ذی الحجہ ۱۲۶۴ھ یا بے تاریخ ندارد میں ہے۔ اس میں ایک شعر کے بعد یہ عبارت ہے :

"جناب شاہ صاحب قبلہ و کعبہ دوجہاں رجوع آوردہ مستمدانہ ناصیہ بر زمین سایم"۔ مطالب ما بعد کا خلاصہ: حضرت چند ماہ قلعۂ دہلی میں رہے لیکن محرومی قسمت کہ "پابوس" کے لئے حاضر نہ ہو سکا، اس کا عقدہ رنج ہو کہا ہے، لیکن "عالم اعیان ثابتہ" میں آپ کی اور میری ہستی ایک ہی "اسم" کی مربوب ہے، لہٰذا صورت شناسی نہ ہونے پر بھی بیگانگی نہیں۔ میرا مجمل حال اس عرضداشت سے اور مفصل میر احمد حسین (میکش) سے معلوم ہوگا۔ اُمید ہے کہ مجھ پر کرم فرمائیں گے۔ میں عہد نصیر الدین حیدر سے سلطنت اودھ کے جوان عطا کا ذلہ خوار ہوں، قصیدہ بوساطت روشن الدولہ پیش ہوا اور ۵ ہزار روپے "مرحمت" ہوئے۔ عہد محمد علی شاہ میں متوسط نہ ملا۔ عہد امجد علی شاہ میں جو گذرا وہ میر احمد حسین سنائیں گے۔ آپ اجازت کا خط لکھیں تو میں مدح واجد علی شاہ کا قصیدہ اور ستائش قطب الدولہ کا قطعہ روانہ کروں۔ قصیدہ پہلے آپ دیکھیں، پھر قطب الدولہ اور بالآخر بادشاہ کی خدمت میں پیش ہو اور میری شاعری، شاگستری اور صلہ یابی کا حال اُن سے کہہ دیا جائے۔ صلہ زیادہ نہ سہی، ۵ ہزار بھی ملا تو اس پر قناعت کر لوں گا۔ ایک خط بنام میکش میں ہے کہ "شاہ صاحب" کا جواب آتے ہی قصیدہ و قطعہ بھیجوں گا۔ کوشش کرو کہ وہ میری عرضداشت کا مضمون قطب الدولہ کو اچھی طرح سمجھا دیں۔ انہیں کے نام کے ایک دوسرے خط نوشتہ اواخر ۱۸۴۸ء میں ہے کہ "شاہ صاحب" کے فرمان کے مطابق خط اور قطعہ قطب الدولہ کو بھیجا۔ شاہ صاحب اُن سے جواب حاصل کر کے روانہ کریں کہ قصیدہ ارسال ہو۔ ان کے نام کے ایک اور خط نوشتہ محرم ۱۲۶۵ء میں یہ عبارت ہے :

"پدید آمد کہ شاہ جی (ظاہراً وہی شاہ صاحب) التفات کمتر کنند، باری از درویشان دُعا کافیست۔"

شاہ صاحب کا تعلق قطب الدولہ سے تھا۔ ان کا نام نامعلوم ہے اور جو کچھ اُوپر مرقوم ہے، اس کے علاوہ اُن کے بارے میں کہنا ممکن نہیں۔ یہ البتہ متیقن ہے کہ یہ شاہ شمس جان نہیں ہیں۔

(۱۰) **میر امام الدین**، میکش کے خسر تھے۔ غالب سے اُن کی پہلی ملاقات کا ذکر خط ۱۲ بنام میکش میں ہے جو لکھو گیا تھا "سرِ سہ شنبہ تیسری دسمبر ہے۔ وہ لڑکا جو کبھی کبھی تمہارے ساتھ آیا کرتا تھا، آیا اور کہنے لگا کہ میرے والد آپ سے ملنا چاہتے ہیں تو پرستش پر نام میر امام الدین بتایا۔ آنے کی وجہ پوچھی تو بولے، میر احمد حسین کا حال دریافت کرنا چاہتا



... جو میرے علم میں تھا، کہا تو بولے کہ میں نے سُنا ہے کہ لکھنؤ میں ایک مالدار عورت سے ... جسے سرکار شاہی سے دو سو پچاس رُوپے ماہوار ملتے ہیں۔ میں نے اس "سودہ" ... "دیکھ کر کہا کہ اگر وہ لکھنؤ گئے ہوتے تو مجھے ضرور مطلع کرتے۔ لکھنؤ جا کر ایک ... کو بہسائیں اور مجھے اس سے آگاہ نہ کریں یہ نا ممکن ہے۔ بے چارے دودل سے ہو گئے اور یہ فیصلہ نہ کر سکے کہ حقیقت ...

خط امام بخش (؟) نوشتہ جنوری ۱۸۴۹ء میں ہے:

"... میر امام الدین نوشتہ بُود بہ مسلّم کہ چلیں ماست و اما رب کہ در دیں دو بار کہ نزد من آمدہ ہر گز شمارا ... سرانگشت نہادہ دانستہ شد کہ صوبہ پڑھائی تو اتم تسلو دیہ"

خط بنام میکش:

"... بادشاہ نے میر امام الدین کو برطرف کر دیا۔ بے چارہ کشاکش روزگار میں ہے اور میں کی پرورش اُس پر ... " (خط باغ دودر)

(۱) میر کرار حسین پدر میکش کا نام گلستان سخن کے ترجمۂ میکش میں آیا ہے اور اُن کے نام کے بعد "مرحوم" لکھا ہے۔ باغ دودر کے خط بنام قطب الدولہ نوشتہ ۱ رجب ۱۲۶۵ھ میں ہے:

"میر کرار حسین سلمہ از عائد سادات والا تبار و رُوستائی شاہ و شہر یار و از جانب فرمان روایان انگلیسیہ مخاطب ... اشرف الوکلا است، پسر (میکش) را بنازو نعمت پروردہ علم و ادب آموختہ۔"

(۲) اکرام الدین۔ خط ۱۳ بنام میکش، نوشتہ ۱ رجب ۱۲۶۵ھ میں ہے:

"مولوی اکرام الدین از جہان رفتند و جہاں جہاں حسرت با خود بُردند ... این ... برای اطلاع محض است" (باغ دودر)

(۳) ظفری بیگم دختر میکش باغ دودر کے خطوط ۷ و ۱۲ میں ہے:

"عرض ظفری بیگم نگاشتۂ کلک میر مہدی در نورد این ورق میرسد" از وی (میر امام الدین) پرسیدم کہ ظفری بیگم خوش است گفت خوش است و ایشان و بپای خود در رہ رفتن میتوانند و میگویند کہ پدرم نا ستگوی ہست و شما ہمہ بدو بگوئی۔ مرا مہر کہ بیک ترقی انگور و چہار رنگترہ و یک انار ولایتی بدان کودک (پسر میر امام الدین) دادم و گفتم اینہا بہ ظفری بیگم دہی ما خود وعدہ دارم کہ اگر دستم رسد کہ لائے صدی ما (کذا) ظفری بیگم و مادرش فرستم"

(۴) یحییٰ۔ باغ دودر کے خط ۱۲ بنام میکش ۱۱ ربیع الثانی و ۷ مارچ میں جو لکھا گیا تھا، یہ عبارت ہے:

"آنچہ از مہر ورزی مشفق منشی محمد یحییٰ علی خان نسبت بخویشتن رقم کردہ اند، محبت آں فرخندہ گہر در دلم جا کرد، انگہ شما را چون من عزیز دارد، من چون عزیز ستش ندارم؟ شفقتی کہ بر شما میکند منتیست کہ بر من مینہد۔ ہم از نوشتۂ شما پدید آمد کہ یحییٰ تخلص میکنند و شعر میگویند۔ سلام من بایشان و کلام ایشان بمن باید رساند۔"

ظاہرا غالب پہلے سے اُن سے واقف نہ تھے۔ اُن کی کسی اور تحریر میں یحییٰ کا ذکر نہیں آیا۔

(۵) فرنگی مل۔ باغ دودر کے خط ۲ بنام جوہر میں ہے۔ (اُس وقت کا ہے جب مہر نیمروز زیر تحریر تھی)

"وای کہ فرنگی مل مرد۔ این داستانہا و دیگر گونہ گوں قماشہا او میاورد و میفروخت"

(۶) مترو نیسرتی (صمیر راحع بہ فرنگی مل) اگرچہ قدم بر قدم بود، نو بدانما آنہا کہ او میاورد، آوردن میتواند (خط ۴ بنام جوہر، باغ دودر)

(باقی صفحہ ۶۳ پر دیکھئے)

عبدالقادر سروری

غالب کی اُفتادِ طبع

جس طرح زندہ انسانوں کی طبیعت کا اندازہ اُن سے ملنے جُلنے اور اُن کے ساتھ معاملت کرنے سے لگا سکتے ہیں، مُصنّفین اور عام طور پر شعرا کی اُفتادِ طبع کا تھوڑا بہت اندازہ اُن کی تخلیقات کے نمایاں رُجحانوں سے ہو جاتا ہے۔ غالبؔ کی طبیعت میں رشک کا جیسا مادہ تھا، اس کا پتہ اُن کے بہت سے اشعار سے چلتا ہے۔ غالبؔ کی شاعری میں یوں تو کئی رُجحان ظاہر ہوتے ہیں۔ مثلاً اپنی آپ اریابی۔ بیگانہ روی وغیرہ۔ لیکن اُن کے اشعار میں رشک کے جذبے کے جیسے نازک اور نفسیاتی پہلو نمایاں ہوئے ہیں، اُن سے یہ نتیجہ اخذ کرنا شاید ناموزوں نہ ہوگا، رشک اُن کی اُفتادِ طبع کا ایک اہم خاصّہ تھا اور ایسے موقع پر بھی اُبھر آتا تھا جب دوسرے عام انسانوں کو موقع کی نزاکتوں کا احساس بھی نہ ہوگا۔ مثال کے طور پر اُن کا یہ مشہور شعر ہے

قیامت ہے کہ ہووے مُدّعی کا ہم سفر غالبؔ   وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

رشک کے جذبے کی کیالش کا یہ نہایت انوکھا موقع ہے۔ ایسے موقع پر جب سفر کو جانے والا محبوب ہی کیوں نہ ہو، اُسے خدا کو سونپنا ایک رسم سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے اور یہ دُعا ہے اور دوست احباب، اعزّا اقارب حتیٰ کہ کسی کو دل و جان سے چاہنے والا بھی محبوب کے لئے خدا سے بہتر اُس کا حافظ اور نگہبان کسی کو نہیں سمجھ سکتا۔ غالبؔ کی رشک پسند طبیعت نے یہاں بھی گنجائش نکال لی۔ اسے محض شاعرانہ مضمون تصوّر نہیں کر سکتے۔ اور اگر شاعرانہ مضمون ہی ہے تو بھی اس کے پیچھے شاعر کا جو نفسیاتی محرک کام کر رہا ہے، وہ نظرانداز ہونے کے قابل نہیں ہے۔

شک اور شکّی رُجحان ایک نفسیاتی اُفتاد ہے جو فطرتِ انسانی میں تین صورتوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ ایقان کی نفی، جب انسان کو کسی چیز کے بارے میں یقین نہیں آتا اور وہ شک اور شبہ میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ یہ ایک ذہنی کرب ہے جو خاصہ تکلیف دہ ہوتا ہے۔ اس کی دُوسری صورت حسد کی ہے، جس میں آدمی دُوسروں کو اچھی حالت میں دیکھ کر تکلیف محسوس کرتا ہے۔ رشک اس کی تیسری صورت عام طور پر یہ ہے کہ انسان کو دُوسرے کی اچھی حالت دیکھ کر اسے بھی یہ خواہش ہوتی ہے کہ میں بھی ایسا ہو جاؤں۔ لیکن شاعری میں رشک کو ایک مخصوص نفسیاتی پہلو ملا ہے۔ محبوب کے ساتھ اپنے سوا کسی اور کو دیکھ نہ سکنے کا جذبہ۔ اس صورت میں یہ ایک فطری جذبہ ہے، لیکن شعرا نے اس میں بھی مبالغہ آرائی کی ہے اور غالبؔ بھی اس معاملہ میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں، تاہم اُن کی فکر کے انداز نے اس میں بڑی بلیغ صورتیں پیدا کی ہیں۔

غالبؔ کی طبیعت میں شک کا مادہ بھی تھا اور رشک کا بھی۔ دراصل اُن کا شک کا مادہ بھی رشک کے جذبات کی افزائش کا باعث ہوتا ہے اور نہایت لطیف نفسیاتی مرقعوں کی تخلیق کا سبب بنتا ہے۔



جنت کے بارے میں ایک سچے مسلمان کا یہ عقیدہ ہے کہ وہ ایک ابدی انبساط کی جگہ ہے جہاں پہنچ کر نیکوکار انسانوں کی روحیں سکون اور چین پاتی ہیں۔ جو نجاتِ حقیقی ہے۔ غالب ایک آزاد فکر انسان تھے اور اس سے شدید۔ یہ کہ انہیں یہ شک کے اظہار کی جرأت بھی تھی جب ہی اُن کے قلم سے ایسے اشعار نکل سکے۔

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

اسی تخیل کی پیش بینی حوریں بھی آگئی ہیں کہ شاید سوائے غالب کے کسی نے اُن کی عمر کا سوال نہیں اُٹھایا ؎

جس میں لاکھوں برس کی حوریں ہوں
ایسی جنت کا کیا کرے کوئی

جنت کے اس مسلم تصور کے مقابلے میں اُن کا اپنا تصور یہ تھا ؎

سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست
لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو

شاعرانہ پہلو سے رشک کا جذبہ غالب کے ذہنی اُفتاد کا ایک خاصہ بن گیا ہے۔ یہ اُن کے جذبے کی شدت کا غماز ہے اس جذبہ در اصل غالب کی چاہت اور محبت پر روشنی پڑتی ہے کہ وہ چاہتے تو ایسی والہانہ سپردگی سے چاہتے تھے کہ اپنے اور چاہت کے درمیان کسی چیز کو حائل نہیں دیکھنا چاہتے تھے خواہ وہ خدا ہی کیوں نہ ہو۔ ایسے چاہنے والے کے لئے رقیب سوہانِ روح ہونا ہی چاہئے اور جب رقیب کو محبوب کی طبیعت میں رسوخ بھی حاصل ہو جائے۔ اس موقع پر وہ کہتے ہیں ؎

رشک کہتا ہے کہ اُس کا غیر سے اخلاص حیف
عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا

یہاں عقل مآل اندیش شاعر کی مدد کو پہنچ کر اُس کے جینے کی صورت پیدا کر دیتی ہے۔

غالب کے رشکیہ مرقعوں میں ایک یہ تصویر ہے کہ محبوب کے نقاب میں ایک تار اُبھرا ہوا ہے، اس پر شاعر رشک اور شبہ کرنے لگتا ہے کہ یہ غیر کا تارِ نظر ہے ؎

اُبھرا ہوا نقاب میں ہے اُن کے ایک تار
مرتا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو

محبوب خوش خرام ہو تو اُسے دیکھنے کی صورت نکل آئے، لیکن سرگرمِ خرام ہونے کی صورت میں پسینے کے قطرے چہرے پر جم جائیں تو عاشق کو اُن پر دیکھنے والوں کے دیدۂ حیراں کا شبہ ہوتا ہے ؎

بدگمانی نے نہ چاہا اُسے سرگرمِ خرام
رُخ پہ ہر قطرہ عرق دیدۂ حیراں سمجھا

اِس جذبے کی انتہا کی بڑی لطیف صورتیں غالب کے یہاں ملتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ عاشق کے محبوب کو دیکھنے کی ایک صورت یہ ہے کہ وہ بالائے بام آئے۔ لیکن ظاہر ہے کہ ایسے موقع پر اُس کا جلوہ عاشق تک محدود نہیں رہ سکتا، ہر راہ چلنے والا اُسے دیکھ سکتا ہے۔ ایسی صورت میں غالب اُس کے نظارے سے بھی باز آتے ہیں ؎

تکلف برطرف نظارگی میں بھی سہی، لیکن
وہ دیکھا جائے، کب یہ ظلم دیکھا جائے ہے مجھ سے

اسی سے ملتا جلتا جذبہ اِس شعر میں بھی ظاہر ہوا ہے ؎

ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے
مرتے ہیں مگر اُن کی تمنا نہیں کرتے

میرے خیال میں رشک کے منتہا کی جیسی عمدہ صورت اس شعر میں ملتی ہے، اُردو اور فارسی میں شاید مشکل سے مل سکے گی۔ شاعر کو یہ بھی گوارا نہیں کہ کسی کی زبان پر محبوب کا نام آئے، یہ مبالغہ معلوم ہوتا ہے لیکن اس میں بہت کچھ حقیقت ہے۔ کہتے ہیں ؎

ذکر اُس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
کیونکر کہوں، لو نام نہ اُن کا مرے آگے

سعید احمد اکبرآبادی

غالب اور حافظ کا ایک تقابلی مطالعہ

غالب ان نادرۂ روزگار شعرا میں سے ہیں جو صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ انہوں نے اپنی نسبت جو یہ دعویٰ کیا ہے کہ

عمرہا چرخ بگردد کہ جگر سوختۂ ۔۔۔ چوں من اندر دودۂ آتش نفساں برخیزد

تو غلط نہیں کیا۔ بڑے شاعر ہمیشہ دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک وہ جو فن پر غالب ہوتے ہیں اور دوسری قسم ان شعرا کی ہوتی ہے جن پر فن غالب ہوتا ہے۔ یہ وہ حضرات ہوتے ہیں جو باکمال صاحب فن اور بلند پایہ شاعر ہونے کے باوجود ایجاد و اختراع کی صلاحیت کم رکھتے ہیں اور اساتذۂ فن نے فن کے لیے جو اصول اور آداب و رسوم مقرر کر دیے ہیں ان پر کاربند رہتے ہیں اور ان سے سرمو انحراف نہیں کرتے۔ لیکن غالب کا تعلق پہلی قسم کے شعرا سے ہے جو ایجاد و اختراع کا مادہ رکھتے ہیں، نئی نئی ترکیبیں اور بندشیں ایجاد کرتے ہیں اور اپنے ذوق کو معیار بنا کر درست اور نادرست کا فیصلہ کرتے ہیں۔ غالب اپنی اس خصوصیت سے بھی ناواقف نہیں تھے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں ؎

ما نبودیم بدیں مرتبہ راضی غالب ۔۔۔ شعر خود خواہش آں کرد کہ گردد فن ما

غالب نے اپنی طبیعت کو "سروش غیبی" کہا ہے اور اسی مناسبت سے کہتے ہیں ؎

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں ۔۔۔ غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے

غالب نے فارسی کے اساتذۂ قدیم کا مطالعہ بڑی وسعت نظر اور دقت نگاہ سے کیا تھا اور ابتدا میں عرفی، نظیری [illegible] طور پر متاثر بھی ہوئے تھے، لیکن جیسا کہ انہوں نے اپنی کلیات نظم فارسی کی تقریظ میں کہا ہے ان کی خود بیں و خود آرا طبیعت تقلید کی اس زنجیر کو زیادہ دنوں تک برداشت نہیں کر سکی اور انہوں نے اس سے آزاد ہو کر اپنا ایک مستقل اسلوب اور رنگ اختیار کر لیا۔ غالب کا فن کمال اور وہ اسلوب و رنگ جس قوت و شدت کے ساتھ ان کے فارسی کلام میں نمایاں اور روشن ہے اردو میں نہیں ہے [illegible] کہتے ہیں ؎

فارسی بیں تا بہ بینی نقشہائے رنگ رنگ ۔۔۔ بگذر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگ من است

لیکن با ایں ہمہ زمانے نے جو ستم ظریفی غالب کے ساتھ کی ہے شاید شعر و ادب کی تاریخ میں کسی کے ساتھ نہیں کی اور ایسے بڑے شاعر اور فن کار ہیں اتنے ہی بڑے مظلوم اور بدنصیب بھی ہیں۔ آج بحیثیت شاعر ان کی شہرت و عظمت کا دار و مدار اردو زبان کی وہ چند غزلیں ہیں جو مختصر سے دیوان میں محفوظ ہیں اور جن کو خود شاعر نے بیرنگ من کہا

اقتضا کیا گیا ہے وہ بس اتنا ہی ہے جتنا کہ اس زبان کے کسی معمولی شاعر کے

ترتیب کے موجودہ اصول و ضوابط کے مطابق



[illegible] چنانچہ متعدد مقالات ضرور لکھے گئے ہیں لیکن اُردو کلام پر جو کچھ لکھا گیا ہے اُس کے مقابلے [illegible] دریا میں چند قطروں سے زیادہ نہیں ہے۔ مولانا شبلی کے لیے موقع تھا کہ جہاں [illegible] شعرائے [illegible] فیضی اور عرفی کا ذکر کیا تھا، غالب کا بھی کرتے اور اگر [illegible] میں انہوں نے فارسی شاعری اور اس کے ارتقا پر مفصل تبصرہ کیا ہے مگر اس ذیل میں غالب کی شاعری [illegible] کا تذکرہ فرماتے۔ لیکن انہوں نے یہ بھی نہیں کیا۔ اگرچہ کہیں کہیں غالب کے ایک دو شعر نقل کر گئے ہیں [illegible] غالب کے فارسی کلام کا مطالعہ اس طرح نہیں کیا جس طرح انہوں نے شعر العجم کی تالیف کے سلسلے میں دوسرے [illegible] کے [illegible] کیا تھا۔ اور اگر کیا بھی تھا تو مولانا نے کلام غالب میں بحیثیت مجموعی کوئی خاص کشش، کوئی غیر معمولی بات محسوس نہیں کی۔ البتہ مولانا حالی نے "یادگارِ غالب" لکھ کر استاد کا حق ادا کرنے کی کوشش کی ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ غالب کی [illegible] شاعری کے متعلق مولانا نے جس بسط و تفصیل سے گفتگو کی ہے اب تک کسی نے نہیں کی۔ لیکن جیسا کہ مولانا نے خود لکھا ہے [illegible] زبان و ادب سے عام بیگانگی اور فارسی شاعری کے نقدانِ ذوق کے باعث غالب کا فارسی کلام جس توجہ اور سیر حاصل تنقید [illegible] تھا مولانا حالی [illegible] کا حق ادا نہ کرسکے۔

بہرحال غالب کی فارسی شاعری کی طرف سے ایک عام بے توجہی (اور وہ بھی فارسی زبان میں) کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ آج ایران [illegible] غالب ایک [illegible] اور نامعلوم شاعر کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہاں شعرا کے تذکروں میں اور ادبیاتِ فارسی کی تاریخوں میں کہیں غالب کا [illegible] ملے گا [illegible] اس میں اہلِ ایران کے لسانی تعصب کا بھی خاصا دخل ہے لیکن ہمارا قصور بھی کچھ کم نہیں ہے۔ ہم نے خود غالب کو اپنا [illegible] کرانے اور اہلِ ایران سے غالب کی عظمت کا اعتراف کرانے کے لئے وہ کچھ بھی نہیں کیا جو ہمیں کرنا چاہئے تھا۔ اس سلسلے [illegible] بات کی تھی کہ فارسی شاعری کی ہر صنف میں غالب کا موازنہ اُس صنف کے سب سے بڑے ایرانی شاعر سے کیا [illegible] کی جو خصوصیات و امتیازات ہیں، اُنہیں دلائل و براہین کے ساتھ وضاحت سے بیان [illegible] حالی نے غالب [illegible] سے کیا ہے، لیکن یہ کافی نہیں ہے۔ حافظِ شیراز کی غزل فارسی تغزل کی معراج ہے۔ اہلِ ایران آج تک [illegible] کا اتنا بڑا غزل گو شاعر نہ پیدا ہوا ہے اور نہ آئندہ ہوگا۔ اس سلسلے میں جہاں تک [illegible] موازنہ حافظ سے ہونا چاہئے تھا، نہ کہ عرفی، نظیری اور ظہوری سے [illegible]

[illegible] کلام [illegible] تاریخ [illegible] اور وفات [illegible]

[illegible] بدیع الاسلوبی یعنی جدت و ندرتِ ادا

[illegible] تنوعِ مضامین

غالب

[illegible] فروغِ بادہ ز عکسِ جمالِ دوست

[illegible] فسردہ اند کہ از آفتاب [illegible]

[illegible] اس طرح بیان کیا ہے ؎

[illegible] ہوا الساں تو مٹ جاتا ہے رنج مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہوگئیں



گھلاوٹ اور صفائی پیدا ہو گئی تھی۔"

حقیقت یہ ہے کہ غالب کو جو معاملہ اُردو شاعری میں پیش آیا، فارسی میں بھی اُن کو اس سے دوچار ہونا پڑا۔ یعنی اوّل اوّل متقدم اساتذۂ سخن کی پیروی کی اور کلام دقیق اور غامض ہوتا تھا۔ الفاظ کی بندش اور اُن کا دروبست پیچیدہ ہوتا تھا، لیکن وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ جب انفرادیت کا رنگ پیدا ہونے لگے اور خیالات میں زیادہ صفائی آ گئی۔ اور عہدِ شباب کی اُپج نے سن و سال میں اضافہ کے بقدر سنجیدگی اور متانت کی صورت اختیار کر لی تو طبعی طور پر کلام میں بڑی روانی، برجستگی اور حلاوت و شیرینی پیدا ہو گئی۔ یہ نشیب و فراز تنہا غالب کی خصوصیت نہیں ہے، بلکہ غالباً ہر دور کی اچھی اور غیر معمولی طور پر ذہین و طباع شاعر اور ادیب کو ان مراحل سے گذرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ خود حافظ شیراز کو بھی آغازِ کار میں یہی معاملہ پیش آیا تھا۔ مولانا شبلی فرماتے ہیں:

" خواجہ (حافظ) صاحب نے غزل گوئی شروع کی تو خواجو کے کلام کو سامنے رکھ کر کہنا شروع کیا۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں:

دارد سخنِ حافظ طرزِ روشِ خواجو"۔ (شعر العجم ج ۲، ص ۲۱۲)

اور ایک خواجو نہیں، بلکہ حافظ نے سعدی اور سلیمان کا بھی تتبع کیا اور اُن کی غزلوں پر غزلیں لکھی ہیں۔ لیکن آخر مشق و تمرین اور پختگیٔ فکر و خیال کے بعد خواجہ حافظ کے اپنے رنگ کا آفتاب جب شعر و شاعری کے مطلع پر طلوع ہوا تو اس آسمان کے چھوٹے بڑے ستارے سب ماند پڑ گئے۔ اگر غالب اور حافظ کے ہم معنی اور ہم مضمون اشعار کا یکجائی مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ اگرچہ حافظ کے یہاں جو سلاست، روانی اور شگفتگی ہے وہ مجموعی طور پر غالب کے ہاں اِس درجے کی نہیں ہے لیکن غالب نے اِسی مضمون کو جس خاص انداز اور تیور سے ادا کیا ہے اُس نے سلاست اور روانی کی جو حافظ کے ہاں ہے تلافی نہیں کی بلکہ خیال اور اُسلوب میں ایک ایسی طرفگی اور ندرت پیدا کر دی ہے کہ ایک صاحبِ ذوق اُسے پڑھتا ہے اور جھوم اُٹھتا ہے۔ مثلاً حافظ اور غالب دونوں کو زمانے کی ناقدری اور گوہرِ سخن کے مرتبہ شناسوں کے فقدان کی شکایت ہے۔

چنانچہ حافظ فرماتے ہیں: ؎ معرفت نیست دریں قوم خدا یا مددے تا برم گوہرِ خود را بخریدارِ دگر

لیکن غالب کہتے ہیں: ؎

بیاورید گر ایں جا بود سخن دانے غریبِ شہر سخن ہائے گفتنی دارد

مضمون بہت طویل ہو جائے گا، اِس لئے ہم خود اپنی طرف سے کسی قسم کی تشریح و توضیح کے بغیر غالب اور حافظ دونوں کے متقابل اشعار نقل کرتے ہیں اور فیصلہ خود اربابِ ذوق پر چھوڑ دیتے ہیں۔

فخریہ

غالب	حافظ
چو نیست کہ در عرصۂ دہر اہلِ دلے نیست	چہ جائے گفتۂ خواجو و شعرِ سلمان ست
در بحر کف و موج و خاشاک و گہر ہم	کہ شعرِ حافظ شیراز بہ ز شعرِ ظہیر

یا

درفن سخن دم مزن از عرفی و طالب
ایں آیہ خاص ست کہ بر من شدہ نازل

انسان کو مصائب و آلام سے گھبرانا نہ چاہیئے۔

حافظ

گرچہ منزل بس خطرناک ست و مقصد ناپدید ہیچ راہے نیست کو را نیست پایاں غم مخور

غالب ص ۲۹۹



غالب: گر بود مشکل مرنج اے دل کہ کار[1]   چوں رود از دست آساں می شود

شیخ و زاہد و واعظ کی ہجو و مذمت عام اور مشترک مضامین ہیں۔ خواجہ حافظ فرماتے ہیں ؎

شراب لعل کش و روئے مہ جبیناں بیں   خلاف مذہب آناں جمال ایناں بیں
بزیر دلق مرقع کمندہا دارند   درازدستی ایں کوتہ آستیناں بیں

لیکن غالب کہتے ہیں ؎

فرصت اگرت دست دہد مغتنم انگار   ساقی و مغنی و شرابے و سرودے
زنہار ازاں قوم نباشی کہ فریبند   حق را بسجودے و نبی را بدرودے

اہلِ باطن کو حقائق کی جو معرفت ہوتی ہے ارباب ظاہر کو نہیں ہوتی ؎

حافظ | غالب

علاج سر سر دار ایں نکتہ خوش سراید   آں راز کہ در سینہ نہانست نہ وعظ است
از شافعی مپرسید امثال ایں مسائل   بر دار تواں گفت و بہ منبر نتواں گفت

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت میں:

حافظ | غالب

غلام نرگس مست تو تاجدارانند   نشاطِ معنویاں از شراب خانۂ تست
خراب بادۂ لعل تو ہوشیارانند   فسونِ بابلیاں فصلے از فسانۂ تست

اسلام اور کفر کیا ہے:

حافظ | غالب

گر مسلمانی اینست کہ حافظ دارد   کارے عجب افتاد دریں شیفتہ مارا
وائے گر در پس امروز بود فردائے   مومن نبود غالب و کافر نتواں گفت

ہجوم آلام و مصائب:

حافظ | غالب

شب تاریک و بیم موج و گردابے چنیں حائل   ہوا مخالف و شب تار و بحر طوفاں خیز
کجا دانند حالِ ما سبکسارانِ ساحلہا   گسستہ لنگر کشتی و ناخدا خفت است

جامِ شراب میں روئے یار کا عکس:

حافظ | غالب

عکسِ روئے تو چو در آئینہ جام افتاد   نازم فروغ بادہ ز عکس جمال دوست
عارف از پرتو مے در طمع خام افتاد   گوئی فشردہ اند بجام آفتاب را

شبِ فراق کی درازی اور طلوعِ سحرِ امید کی آرزو:

---

[1] اسی مضمون کو اردو میں اس طرح بیان کیا ہے ؎
رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج   مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں



حافظ

برآ اے صبحِ روشن دل خدا را
کہ بس تاریک می بینم شبِ ہجر

غالب

درازیٔ شبِ ہجر از حد گذشت بیا
فدائے روئے تو عمرِ ہزار سالۂ ما

عاشق ہجر اور ظلم و ستم سے گھبراتا نہیں، بلکہ اس میں لطف اور مزہ ملتا ہے:

حافظ

ہر دم بجے فرصت مرا ده بگو بیاد
کایں تحفہ از برائے خدا می فرستمت

غالب

یک دو شیوہ ستم دل می شود خورسند
مرگ من اگر سامانِ روزگار بیا[1]

عشق اگر حقیقی ہو تو قرب و بُعد اور ہجر و وصال سب میں ایک خاص لطف محسوس ہوتا ہے:

حافظ

در راہِ عشق مرحلۂ قرب و بُعد نیست
می بینمت عیاں و دُعا می فرستمت

غالب

وداع و وصل جداگانہ لذتے دارد
ہزار بار برو صد ہزار بار بیا

اس تقابل سے ہمارا مقصد یہ جتانا ہرگز نہیں ہے کہ غالب کو تغزل میں حافظ پر فوقیت ہے۔ حافظ بلاشبہ اقلیمِ تغزل کے شہنشاہ اور اس قلمرو کے واحد اور یکتا فرمانروا ہیں۔ ان کی سب سے بڑی خصوصیت ان کا اندازِ بیان، سوز و گداز اور حسن و عشق کی نفسیات شناسی اور ان نفسیات و واردات کو بیان کرنے کا سلیقہ ہے اور یہ وہ خصوصیت ہے جس میں فارسی زبان کا کوئی غزل گو شاعر ان کی ہمسری اور برابری کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ چنانچہ غالب نے بھی عرفی، نظیری، طالب، ظہوری اور ظہیر وغیرہ کا نام لیا اور ان سے مقابلے کا دعویٰ کیا ہے۔ لیکن حافظ کا کہیں نام نہیں لیا، بلکہ ہمارا مقصد صرف یہ دکھانا ہے کہ غالب نے اپنی قوتِ شعر گوئی اور جبلتِ سخن کا بڑا زور قصیدہ گوئی، مثنوی اور نظم نگاری پر صرف کر دیا اور اس میدان میں صناعی طبیعت کی جولانی اور براقی اور زبان و بیان پر قدرت کے وہ وہ جوہر دکھائے کہ بایدو شاید۔ اس میدان سے ہٹ کر جب کبھی وہ غزل گوئی کی طرف متوجہ ہوئے تو ابتدا میں وقت پسند کی افتادِ طبع کے مطابق شروع میں قدیم اساتذۂ فن گو کا اتباع کرتے رہے۔ لیکن وقت جوں جوں گذرتا رہا اور ان کے تجربات کا دامن وسیع ہوتا رہا۔ وہ اُردو کی طرح فارسی میں بھی ہلکے پھلکے، رواں دواں اور شگفتہ اشعار کہنے کی طرف مائل ہوتے رہے۔ ظاہر ہے اس راہ کا سب سے بڑا رہنما جس کا نقشِ قدم غالب کے لیے آئینۂ بصیرت اور سرمایۂ تقلید ہو سکتا تھا۔ وہ بلبلِ شیراز و لسان الغیب ہی ہو سکتا تھا۔ چنانچہ غالب کی فارسی غزلوں میں ایک معتدبہ مقدار ایسے اشعار کی ہے جن کا انداز و ہیئت صاف طور پر اس حقیقت کی غمازی کرتی ہے کہ یہ پھول چمنستانِ حافظ سے مستعار لے کر اپنے گلدستے میں سجائے گئے ہیں مثلاً ایک طرف حافظ کے یہ اشعار پڑھیے۔

دوش وقتِ سحر از غصہ نجاتم دادند
واندراں ظلمتِ شب آبِ حیاتم دادند

بیخود از شعشعۂ پرتوِ ذاتم کردند
بادہ از جامِ تجلیٔ صفاتم دادند

اور اب غالب کے یہ شعر ملاحظہ کیجیے۔

مژدۂ صبح درین تیرہ شبانم دادند
شمع کشتند و ز خورشید نشانم دادند

---

[1] اسی مضمون کو اُردو میں یوں کہتے ہیں:

اسد بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے
تو مشقِ ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر



ما گشتہ در دل ہر ذرہ مرہم بستیم — دل ریزہ ریزہ در دو چشم نگاہم دادند

... دل پر ایک نظر ڈالیئے ؎

ملاقاتِ دیدار ر پیام گر نیتیم — مشتاق تو دیدن نہ شنیدن نشناسد
بے پردہ شو از ناز و میندیش کہ مارا — چوں آئینہ چشمیست کہ دیدن نشناسد

خوش ست آنکہ با خویش جز غم نداند — ولے خوشتر ست آنکہ این ہم ندارد
گلت ما نوا گر گست را تماشا — تو داری بہارے کہ عالم ندارد

اے جمال تو تاراج نظرہا گستاخ — وے خرام تو پامالی سرہا گستاخ
داغ شوق تو بہ آرائش دلہا سرگرم — زخم تیغ تو بہ گلگشت جگرہا گستاخ

سحر دمیدہ و گل در دمیدنست مخسپ — جہاں جہاں گل نظارہ چیدنست مخسپ
مشام را بہ شمیم گلے نوازش کن — نسیم غالیہ سا در وزیدنست مخسپ
ستارہ سحری مژدہ سنج دیدار یست — بہ بیں کہ چشم فلک در پریدنست مخسپ

ہم پھر کہتے ہیں، اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ فارسی تغزل میں حافظ کا کوئی جواب اب تک پیدا نہیں ہوا۔ لیکن مذکورۂ بالا اشعار سے یہ اندازہ کر لینا مشکل نہیں، ہے کہ غالب کی شاعری کے تدریجی ارتقا میں ایک منزل ایسی ضرور آگئی تھی جب کہ وہ تغزل میں حافظ کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کرنے لگے تھے اور اس بنا پر کون کہہ سکتا ہے کہ اگر اس میدان میں تگ و دو کی اُن کو مزید فرصت و مہلت ملتی اور حافظ کی طرح وہ بھی غزل ہی کے ہو کر رہتے اور اپنا سارا جوہرِ کمال قصیدہ اور مرثیہ و مثنوی وغیرہ پر نہ صرف کر چکے ہوتے تو آج فارسی تغزل میں اُن کا مرتبہ بلبلِ شیراز سے زیادہ نہیں تو کم ہرگز نہ ہوتا۔ ▼

نحوستِ طالع

"شیر اپنے بچوں کو شکار کا گوشت کھلاتا ہے، طریقِ صید افگنی سکھاتا ہے۔ جب وہ جوان ہو جاتے ہیں آپ شکار کر کھاتے ہیں۔ تم سخنور ہو گئے، حسنِ طبع خداداد رکھتے ہو۔ ولادتِ فرزند کی تاریخ کیوں نہ کہو۔ نام تاریخی کیوں نہ نکالو۔ کہ مجھ پیرِ غم زدہ دل مردہ کو تکلیف دو۔ علاء الدین تیری جان کی قسم۔ میں نے پہلے لڑکے کا اسم تاریخی نظم کر دیا تھا۔ وہ لڑکا نہ جیا۔ مجھ کو اس وہم نے گھیرا ہے کہ میری نحوستِ طالع کی تاثیر تھی۔ میرا ممدوح جیتا نہیں۔ نصیر الدین حیدر اور امجد علی ایک ایک قصیدہ میں چل دیئے۔ واجد علی شاہ تین قصیدوں کے متحمل ہوئے، پھر نہ سنبھل سکے، جس کی مدح میں دس بیس قصیدے کہے گئے۔ وہ عدم سے بھی پرے ... صاحب دُہائی خدا کی۔ نہ تاریخِ ولادت کہوں گا نہ نام تاریخی ڈھونڈوں گا۔"

—— غالب ——

مہر محمد خاں شہاب مالیرکوٹلوی

غالب اور فنِ شعر

سخن فہمی اور داد گستری اور بے داد

یادگارِ غالب صفحہ ۲-۳ میں مولانا خواجہ الطاف حسین حالی مرحوم فرماتے ہیں کہ:۔

مرزا کی خود شناسی

"مرزا غالب نے اپنی کتاب "مہر نیم روز" میں ایک موقع پر بہادر شاہ کی طرف خطاب کر کے یہ ظاہر کیا ہے کہ شاہ جہاں کے عہد میں کلیم شاعر سیم و زر میں تولا گیا تھا۔ مگر میں صرف اس قدر چاہتا چاہتا ہوں کہ اور کچھ نہیں تو میرا کلام ہی ایک دفعہ کلیم کے کلام کے ساتھ تول لیا جائے۔ اس مضمون کو جو لوگ مرزا کے رتبے سے واقف نہیں ہیں شاید خودستائی اور تعلی پر محمول کریں گے۔ مگر ہمارے (حالی کے) نزدیک مرزا نے اس میں کچھ مبالغہ نہیں کیا بلکہ وہی کہا ہے جو اُن کے زمانے کے اہلِ نظر اور اہلِ تمیز اُن کی نسبت رائے رکھتے تھے۔

اگرچہ زمانے نے اپنی بساط کے موافق مرزا کی کچھ قدر نہیں کی۔ مگر مرحوم بہادر شاہ نے بھی اپنی حیثیت کے موافق خاصی قدر نہ کی۔ مگر جب مرزا کے اس اعلیٰ مرتبے کا جو شاعری و انشا پردازی میں فی الواقع اُنھوں نے حاصل کیا تھا، ٹھیک اندازہ کیا جاتا ہے تو ناچار یہ کہنا پڑتا ہے کہ زمانے کی یہ تمام قدر دانی زیادہ سے زیادہ اُس پیرزال کی سی قدر دانی تھی جو سوت کی ایک انٹی لے کر یوسف کی خریداری کو مصر کے بازار میں آئی تھی۔ سچ ہے کہ مرزا کی قدر جیسی کہ چاہیے یا جلال الدین اکبر کرتا۔ یا جہانگیر و شاہجہان۔ مگر جس قدر اس اخیر دور میں اُن کو مانا گیا اُس کو بھی نہایت مغتنم سمجھنا چاہیے ؎

بکے مفت ہم یاں زمانے کے ہاتھوں   جو دیکھا تو تھی یہ بھی قیمت زیادہ

اگرچہ مرزا کی تمام لائف میں کوئی بڑا کام اُن کی شاعری اور انشا پردازی کے سوا نظر نہیں آتا۔ مگر صرف اسی ایک کام نے اُن کی لائف کو دارالخلافہ (دہلی) کے اخیر دور کا ایک مہتم بالشان واقعہ بنا دیا تھا اور میرا (حالی کا) خیال ہے کہ اس ملک (ہندوستان) میں مرزا پر فارسی نظم و نثر کا خاتمہ ہو گیا اور اُردو نظم و نثر پر بھی اُن کا کچھ کم احسان نہیں ہے۔"

مرزا غالب کو اپنے اس مقام کا یقیناً احساس تھا۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

شعر خود خواہش آں کرد کہ گردد فنِ ما   ما نبودیم بدیں مرتبہ راضی غالب

یا

غریبِ شہر سخنہائے گفتنی دارد   بیاورید گر ایں جا بود سخن دانے



(۲)

غالبؔ کی شعر خوانی | مولانا حالی اپنی اسی کتاب میں مرزا غالبؔ کے اندازِ شعر خوانی کے تذکرے کے سلسلے میں فرماتے ہیں کہ :-

مرزا کا شعر پڑھنے کا انداز بھی خاص تھا۔ خاص کر مشاعروں میں حد سے زیادہ دلکش اور موثر تھا۔ (چنانچہ قلعہ کے مشاعرے میں۔ شہابؔ) اوّل اُردو کی طرح کی غزل اور اس کے بعد فارسی غیر طرح نہایت پُر درد آواز سے پڑھی۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا مجلس میں کسی کو ایسا قدر داں نہیں پاتے اور اس لئے غزل خوانی میں فریاد کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔" (یادگارِ غالب ص۶۲)

(۳)

ظفرؔ کی شعر فہمی کا سخن گسترانہ شکوہ | مولانائے موصوف پھر اپنی اسی کتاب میں فرماتے ہیں :-

" وہ (مرزا غالبؔ) اس خیال سے کہ اُن کے کلام کی قدر کرنے والے بہت کم تھے، اکثر تنگ دل رہتے تھے۔ چنانچہ اس بات کی انہوں نے فارسی اور اُردو نظم و نثر میں جا بجا شکایت کی ہے۔ ایک روز (لال) قلعہ سے سیدھے نواب مصطفےٰ خاں کے مکان پر آئے اور کہنے لگے کہ آج حضور (بہادر شاہ ظفرؔ) نے ہماری بڑی قدر دانی فرمائی۔ عید کی مبارک باد میں قصیدہ لکھ کر لے گیا تھا۔ جب قصیدہ پڑھ چکا تو (شاہی) ارشاد ہوا کہ :-

" مرزا تم پڑھتے خوب ہو۔"

اس کے بعد نواب صاحب (مصطفےٰ خاں شیفتہ) اور مرزا زمانے کی ناقدر دانی پر افسوس کرتے رہے" (یادگارِ غالب ص۸۰) یہ ایسے ہی اسباب تھے کہ مرزا نے "مہر نیم روز" میں جو مغلیہ شاہی خاندان کی تاریخ ہے اور بہادر شاہ ظفرؔ کی فرمائش پر لکھی گئی تھی، شکایت کی ہے کہ میں نے اپنے کمالِ شاعری کو محض قدر ناشناسوں کو مدح سرائی میں صرف کر دیا۔

(۴)

تخلص حقیر مگر سخن فہمی میں امیر بانڈیر | یہ واقعات نقل کرتے ہوئے مولانا حالی کا ارشاد ہے کہ :-

" یہی وجہ تھی کہ جب حُسنِ اتفاق سے اُن کو کوئی شخص سچّا اور سخن فہم میسر آ جاتا تھا تو اُس کو ایک نعمت غیر مترقبہ سمجھتے تھے۔ منشی نبی بخش حقیر تخلص ۔ جو ایک زمانے میں کول (علیگڈھ) میں سر رشتہ دار تھے اور جن کی سخن فہمی اور سخن سنجی کی بڑے بڑے لوگوں سے تعریف سنی گئی ہے۔ کہیں وہ دلّی میں آئے

ؔ مرزا غالبؔ کے اپنی بزرگوار کے نام کے خطوط۔ کراچی سے آفاق حسین صاحب نے "نادراتِ غالب" کے عنوان سے شائع کئے ہیں۔ مؤلف نے خطوط کا مقدمہ لکھے اور غالبؔ کے بعض شاگردوں کے حالات فراہم کرنے اور حواشی لکھے اور غالبؔ کے متعلق مفید معلومات مہیا کرنے میں خاصی محنت کی ہے مگر بدقسمتی سے کتابت، طباعت اور جراب کاغذ اور جلد میں بے احتیاطی کی وجہ سے کتاب بحیثیت مجموعی مصائب حضرت کا مرثیہ معلوم ہوتی ہے۔ بیچارہ مصنف و مؤلف لکھ پڑھ سکتا ہے، معلومات کی فراہمی اور اُن کی ترتیب میں محنت کر سکتا ہے۔ باقی دوسری متعلقہ چیزیں عموماً اُس کے بس کا روگ نہیں ہوتیں۔ شہابؔ



ہیں اور مرزا کے مکان پر ٹھہرے ہیں۔ اُن کی نسبت منشی ہرگوپال تفتہ کو ایک فارسی خط میں لکھتے ہیں جس کا ماحصل یہ ہے کہ "خدا نے میری بےکسی اور تنہائی پر رحم کیا اور ایک ایسے شخص کو میرے پاس بھیجا جو میرے زخموں کا مرہم اور میرے درد کا درماں اپنے ساتھ لایا اور جس نے میری اندھیری رات کو روشن کر دیا۔ اُس نے اپنی باتوں سے ایک شمع روشن کی جس کی روشنی میں میں نے اپنے کلام کی خوبی جو تیرہ بختی کے اندھیرے میں خود میری نگاہ سے مخفی تھی دیکھی۔ میں حیران ہوں کہ اس فرزانہ یگانہ یعنی منشی نبی بخش کو کس درجہ کی سخن فہمی اور سخن سنجی عنایت ہوئی ہے۔ حالانکہ میں شعر کہتا ہوں اور شعر کہا جاتا ہوں مگر جب تک میں نے اس (منشی نبی بخش) بزرگوار کو نہیں دیکھا، نہیں سمجھا کہ سخن فہمی کیا چیز ہے اور سخن فہم کس کو کہتے ہیں۔ مشہور ہے کہ خدا نے حُسن کے دو حصے کیے آدھا یوسف کو دیا، آدھا تمام بنی نوع انسان کو۔ کچھ تعجب نہیں کہ فہم سخن اور ذوقِ معنی کے بھی دو حصے کیے گئے ہوں اور آدھا منشی نبی بخش کے اور آدھا تمام دنیا کے حصے میں آیا ہو۔ گو زمانہ اور آسمان میرا کینا جو ہے حالانکہ میں اس شخص کی دوستی کی بدولت زمانے کی دشمنی سے بےفکر ہوں اور اس نعمت پر دنیا سے قانع ہوں۔" (یادگارِ غالب ص ۹۸)

(۵)

آزردہ اور غالب

قائل داد شعر کی داد دینے میں سچائی اور حق پسندی غالب کا خاص شیوہ تھا۔ بےمعنی شعر کی داد دیتے تھے اور قابلِ تعریف شعر کسی کا بھی ہو بےتکلف جی کھول کر داد دیتے تھے اور اس معاملہ میں کسی قسم کا تحمل روا رکھتے تھے۔ اُن کی اس خصوصیت کی طرف مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی نے اپنے مضمون "یادگار مشاعرہ" میں اشارہ کیا ہے لیکن اس مضمون کو مولانا حالی نے شواہد کے ساتھ پھیلا کر لکھا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ اس بحث کو مولانا حالی ہی کے لفظوں میں نقل کر دیا جائے۔ مولانا فرماتے ہیں:

"نواب ممدوح (نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ) نے مجھ (حالی) سے ایک واقعہ بیان کیا جس سے مرزا کی سخن سنجی کا بڑا ثبوت ملتا ہے۔ مولانا (مفتی صدرالدین خاں) آزردہ نے "دُور نہیں"، "حُور نہیں" اس زمین میں غزل کہی تھی اُس میں اتفاق سے مطلع بہت اچھا نکل آیا تھا۔ مولانا (آزردہ) نے اپنی غزل دوستوں کو سنا کر اُن سے کہا: اگرچہ بحر دوسری ہے مگر اسی ردیف و قافیہ سے نظیری کی بھی ایک غزل ہے۔ جس کا مطلع ہے کہ ؎

عشق عصیاں است اگر مستور نیست کشتۂ تیغ زباں معذور نیست

ظاہر ہے کہ اگر نظیری ہندی نژاد ہوتا اور اسی زمین میں جس میں ہماری غزل ہے اُردو غزل لکھتا تو اس کا مطلع اس طرح ہوتا ؎

عشق عصیاں ہے اگر مخفی و مستور نہیں کشتۂ شمشیر زباں ناجی و معذور نہیں

آؤ آج مرزا غالب کے ہاں چلیں اور بغیر اس کے کہ مائل کا نام لیا جائے۔ اپنا مطلع اور نظیری کے مطلع کا یہی اُردو ترجمہ (جو اُوپر مذکور ہوا) مرزا کو سنائیں اور پوچھیں کہ کون سا مطلع اچھا ہے چونکہ نظیری کا مطلع اُردو ترجمہ سے بہت پست ہو گیا تھا۔ سب کو یقین تھا کہ مرزا نظیری کے مطلع کو ناپسند کریں گے اور مولانا آزردہ کے مطلع کو ترجیح دیں گے چنانچہ مولانا (آزردہ) اور نواب (شیفتہ) اور بعض احباب مرزا کے ہاں پہنچے۔ معمولی بات چیت کے بعد مولانا نے کہا کہ اُردو کے دو مطلع ہیں۔ آپ محاکمہ کیجئے کہ کون سا مطلع اچھا ہے اور بطورِ پیش کے اوّل نظیری کے مطلع کا یہی ترجمہ پڑھا۔ ابھی مولانا اپنا مطلع پڑھنے نہیں پائے تھے کہ مرزا اس مطلع کو سُن کر سر دُھننے لگے اور متحیر ہو کر پوچھنے لگے کہ یہ مطلع کس نے لکھا ہے اور اس قدر تعریف کی کہ مولانا آزردہ کو یہ اُمید نہ رہی کہ اس سے زیادہ داد ملے گی چنانچہ اُنہوں نے اپنا مطلع نہیں پڑھا اور سب لوگ تعجب کرتے ہوئے وہاں سے اُٹھے۔"

(یادگارِ غالب ص ۱۲۶)



غالب و شیفتہ — عظمت بیگ مرحوم نے اپنے مضمون "یادگار مشاعرہ" میں ظفر کے ولی عہد کے تذکرے میں مرزا کی اس صفت کا بھی حوالہ دیا ہے اور مولانا حالی نے "یادگار غالب" صفحہ ۸۸ پر وضاحت سے بیان کیا ہے کہ وہ یک رنگی اور رواداری کے قائل نہ تھے۔ کبھی کبھی بڑے سے بڑے آدمی کے شعر پر بھی لش سے مس نہ ہوتے تھے۔ مگر اس کا شعر ماندار نہ ہوتا تھا۔ لیکن اگر شعر قابلِ تعریف ہوتا تھا تو داد دینے کے لئے بے اختیار ہوجاتے تھے اور اس میں اپنے اور بیگانے کا امتیاز انہیں حق گوئی سے باز نہ رکھتا تھا۔ اس خصوص میں مولانا حالی فرماتے ہیں کہ :-

غالب و ذوق | "مرزا باوجود یکہ ان کی طبیعت نہایت صلح جو واقع ہوئی تھی، شعر کی داد دینے کا جو طریقہ انہوں نے اختیار کیا تھا اس کو وہ کبھی ہاتھ سے نہ دیتے تھے، لیکن جو شعر دل میں چُبھ جاتا تھا اُس کی تعریف بھی ایسی کرتے تھے جو مبالغہ کی حد کو پہنچ جاتی تھی۔ وہ درحقیقت کسی کو خوش کرنے کے لئے ایسا نہیں کرتے تھے، بلکہ ذوقِ سخن اُن کو بے اختیار کر دیتا تھا۔ شیخ ابراہیم ذوق جن کی نسبت مشہور ہے کہ مرزا کو ان سے چشمک تھی (اور یہ شہرت غلط نہیں۔ شہاب) ایک روز جب کہ مرزا شطرنج میں مصروف تھے، منشی غلام علی خاں مرحوم نے اُن کا یہ شعر کسی دوسرے شخص کو سنانے کو پڑھا ؎

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے ‏ ‏ ‏ مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

خان مرحوم کہتے تھے کہ مرزا کے کان میں اس کی بھنک پڑ گئی۔ فوراً شطرنج چھوڑ دی اور مجھ (غلام علی خاں) سے کہا بھیا تم نے کیا پڑھا۔ میں نے پھر وہ شعر پڑھا۔ پوچھا کس کا شعر ہے، میں نے کہا ذوق کا۔ یہ سن کر نہایت متعجب ہوئے اور مجھ سے بار بار پڑھواتے تھے اور سر دُھنتے تھے۔ ہم (مولانا حالی) بھی دیکھتے ہیں کہ مرزا نے اپنے اُردو خطوط میں اس شعر کا جا بجا ذکر کیا ہے۔ جہاں عمدہ شعر کی مثالیں دی ہیں، وہاں اس شعر کو ضرور لکھا ہے۔" (یادگار غالب۔ ۸۸-۸۹)

مرزا کا اس شعر سے متاثر ہونا قدرتی تھا اور یہ جان کر کہ یہ شعر ذوق کا ہے حیران ہونا غالباً اس لئے تھا کہ مرزا اس شعر کو ذوق کی بساط سے بلند خیال کرتے تھے جو معاصرت کا نتیجہ تھا، مگر اس شعر کی تعریف مرزا کی انصاف پسندی کا ثبوت ہے۔

(۷)

اوپر کی عبارت کے ساتھ ہی مولانا حالی لکھتے ہیں کہ :-

مومن و غالب | "اسی طرح جب مومن خاں کا یہ شعر سنا ؎

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا ‏ ‏ ‏ جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

تو اس کی بہت تعریف کی اور کہا: کاش مومن خاں میرا سارا دیوان لے لیتا اور صرف یہ شعر مجھ کو دے دیتا۔ اس شعر کو بھی انہوں (مرزا غالب) نے اپنے متعدد خطوط میں نقل کیا ہے۔"

(۸)

مرزا آزاد اور مرزا غالب | مرزا کا نہ صرف قدما اور مشہور معاصرین کے کلام کے ساتھ یہ طریقہ تحسین تھا بلکہ مبتدیوں اور شاگردوں کو بھی داد دینے میں وسعتِ قلب سے کام لیتے تھے۔ مولانا حالی فرماتے ہیں کہ :

"ایک صحبت میں نواب مرزا خاں داغ کے اس شعر کو بار بار پڑھتے تھے اور اس پر وجد کرتے تھے ؎

٭ اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے "آبِ حیات" طبع دوم ص ۴۶۶ مع حاشیہ کم از کم پڑھ لینا چاہیئے۔ مولانا آزاد نے غالب کا تعارف فارسی کے استاد پہلے اور اُردو کے مصنف بعد میں قرار دے کر ثانوی حیثیت سے اردو شعرا کے تذکرے میں غالب رشیدہ دن ہے۔ شہاب



رخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں[1] اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے

یہ پڑھ کر ایک برادرِ عزیز، محترم اور فاضلِ جلیل نے فرمایا کہ :-

" حال آں کہ (داغ کا) یہ شعر حسن قلی خاں شاداں کے ایک شعر سے سرقہ ہے"۔

شہاب عرض کرتا ہے، اگر یہ ہے تو اکثر و بیشتر اساتذۂ فارسی و اُردو کے دامنِ کمال پر یہ داغ نظر آئے گا، اِس لئے ہمیں سرقہ کی تعریف پر نظرِ ثانی کرنی ہوگی۔

مدت ہوئی (اپریل ۱۹۵۹ء) ایک فرصت میں تبدیلیٔ ذائقہ کے لئے شمس العلما مولانا عبدالرحمٰن مرحوم سابق صدر شعبۂ زبانہائے شرقیہ سینٹ اسٹیفن کالج دہلی کی کتاب "مرآۃ الشعر" دیکھ رہا تھا کہ اتفاقاً ذیل کا مقام سامنے آیا -

" میاں رشیق نے لکھا ہے کہ - میں اپنے ایک شعر کو مدتوں یہی سمجھتا رہا کہ از قبیلِ اِبداع ہے لیکن آخر وہ زعم باطل نکلا۔ ایک مشرقی شاعر حسن کے نام و کلام سے میں واقف تک نہ تھا۔ وہی مضمون تقریباً انہیں الفاظ میں مجھ سے پہلے باندھ چکا تھا۔" (مرآۃ الشعر ص ۱۹۷)

(۹)

غالب و حالی

" بعض اوقات وہ (مرزا) اپنے شاگردوں کے کلام سے اس قدر متاثر ہوتے تھے کہ اُن کی تعریف میں تمام اُن کا دل بڑھانے کو حد سے زیادہ مبالغہ کرتے تھے، انہوں نے اخیر میں اپنے ایک شاگرد کی غزل دیکھ کر اُس کی بے انتہا تعریف کی اور یہ کہا کہ "اگر میں اب رشک کرنے کے قابل ہوتا تو تم محسود ہوتے اور میں حاسد"" (یادگارِ غالب ص ۸۹-۹۰)

یہ خوش قسمت شاگرد کون تھا؟ اگرچہ مولانا حالی نے اس کی تصریح نہیں کی، مگر قرائنِ غالب یہ ہیں کہ وہ شاگرد خود مولانا حالی ہی ہیں۔ کیونکہ موصوف اپنے اور اپنے اُستاد مرزا غالب کے تعلقات کی تفصیل کے ذیل میں اپنی سوانح حیات کے سلسلے میں فرماتے ہیں کہ -

" اُن (مرزا غالب) کی عادت تھی کہ وہ اپنے ملنے والوں کو اکثر فکرِ شعر کرنے سے منع کیا کرتے تھے، مگر میں (حالی) نے جو ایک آدھ غزل اُردو یا فارسی کی لکھ کر اُن کو دکھائی تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ : اگرچہ میں کسی کو فکرِ شعر کی صلاح نہیں دیا کرتا، لیکن تمہاری نسبت میرا خیال یہ ہے کہ اگر تم شعر نہ کہو گے تو اپنی طبیعت پر سخت ظلم کرو گے۔ مگر اس زمانے میں ایک دو غزل سے زیادہ دلّی میں شعر لکھنے کا اتفاق نہیں ہوا" (مقالاتِ حالی جلد اول ص ۲۶۵-۶۶)

مولانا حالی نے "یادگارِ غالب" میں مذکورہ غالب کے شاگرد کا نام نہیں لیا اور اپنے متعلق اس واقعے کی تصریح نہیں کی۔ مگر اب جب مولانا کے دونوں بیانوں کو ملایا جاتا ہے تو بات صاف سمجھ میں آجاتی ہے کہ غالب کے وہ شاگرد خود مولانا حالی ہی تھے۔ اس انکسار

---

[1] نواب مرزا خاں داغ، ذوق کے شاگرد اور نواب شمس الدین خاں مصلوب پسرِ بزرگ نواب احمد بخش خاں والی لوہارو کے فرزند تھے۔ مرزا غالب کے ساتھ اسیری کے بعد جس طرح مرزا غالب سے رشتہ داری و قرابت سے انکار کیا گیا تھا اُسی طرح نواب شمس الدین خاں کے مصلوب ہو جانے کے بعد اُن کی بیوہ کی سرپرستی اور یتیم بچے کی پرورش سے بے اعتنائی برتی گئی۔ داغ کی ماں "چھوٹی بیگم" نے ظفر کے ایک بیٹے سے شادی کرلی تھی، اس طرح داغ کی پرورش و تربیت لال قلعے میں ہوئی۔ باپ کے خاندان والوں نے ہمیشہ داغ کا نام دبا رکھا حتیٰ کہ اس شہرت کو بھی غلط ٹھہرایا کہ داغ شمس الدین خاں کے فرزند تھے (دیکھو نقشِ آزاد) لیکن جب دکن میں داغ کا طوطی بولنے لگا تو نواب سراج الدین خاں سائل جیسے اہلِ خاندان نے بھی داغ کو چچا کہنا شروع کیا، اُن کے شاگرد ہوئے حتیٰ کہ خود کو اُن کی فرزندی میں دے دیا۔ "انقلابات ہیں زمانے کے"۔ داغ کے نام و نسب کے بارے میں ایک اور جگہ میں نے مفصل گفتگو کی ہے۔ شہاب

غالب نمبر ۱۹۶۹ء

[illegible] حالی کی تصنیف اسے نا ہوا تھا، اُن کو یادگار غالب [illegible] حالی پر ہندوستانی کا گمان



[illegible] یں حقیقت بیان کرنے سے روک دیا تھا۔ مگر اب جب نہیں کیا جا سکتا تھا انہوں نے اصل واقعہ جیسا کہ تھا،

(۱۰)

[illegible] فضل حق اور غالب

"مولانا فضل حق خیرآبادی (علامۂ عصر) باایں ہمہ علم و فضل مرزا کو جس رتبے کا شاعر مانتے تھے اس کا اندازہ حکایتِ ذیل سے ہو سکتا ہے۔ مولانا کے شاگردوں میں سے ایک شخص نے ناصر علی سرہندی کے کسی شعر کے معنی مرزا صاحب سے جا کر پوچھے۔ انہوں نے کچھ معنی بیان کیے۔ اس نے وہاں سے آ کر مولانا سے کہا: آپ مرزا صاحب کی سخن فہمی اور سخن سنجی کی تعریف کیا کرتے ہیں۔ آج انہوں نے ایک شعر کے معنی بالکل غلط بیان کیے۔ اور پھر وہ شعر پڑھا اور جو کچھ مرزا نے اس کے معنی کہے تھے، بیان کیے۔ مولانا نے فرمایا کہ پھر ان معنوں میں کیا برائی ہے۔ اس نے کہا، برائی تو کچھ ہو یا نہ ہو، مگر ناصر علی کا یہ مقصود نہیں ہے۔ مولانا نے کہا، اگر ناصر علی نے یہ معنی مراد نہیں لیے جو مرزا نے سمجھے ہیں تو اس نے سخت غلطی کی ہے۔" (یادگارِ غالب۔ صفحہ ۲۱۹)

(۱۱)

مومن اور غالب

"مرزا نے ایک غزل کے مقطع میں اپنے تئیں کم از کم شیخ علی حزیں کے مثل قرار دیا ہے اور وہ مقطع یہ ہے:

تو بدیں شیوۂ گفتار کہ داری غالب — گر ترقی نہ کنم شیخ علی را مانی

مومن خاں مرحوم نے جس وقت یہ مقطع سنا، اپنے دوستوں سے کہنے لگے کہ اس میں بالکل مبالغہ نہیں ہے۔ مرزا کو ہم کسی طرح علی حزیں سے کم نہیں سمجھتے۔" (یادگارِ غالب۔ صفحہ ۲۱۹)

جب ۱۸۵۲ء میں مومن خاں کا انتقال ہو گیا تو مرزا غالب نے اپنے سخن فہم فاضل دوست منشی نبی بخش حقیر کو ۲۱ مئی ۱۸۵۲ء بروز جمعہ لکھا کہ:

"سنا ہوگا تم نے کہ مومن خاں مر گئے۔ آج ان کو مرے ہوئے دسواں دن ہے۔ دیکھو بھائی ہمارے بچے مرے جاتے ہیں، ہمارے ہم عمر مرے جاتے ہیں۔ قافلہ چلا جاتا ہے اور ہم پا در رکاب بیٹھے ہیں۔ مومن خاں میرا ہمعصر تھا اور یار بھی تھا۔ بیالیس تینتالیس برس ہوئے یعنی چودہ چودہ پندرہ پندرہ برس کی میری اور اس مرحوم کی عمر تھی کہ مجھ میں اور اس میں ربط پیدا ہوا۔ اس عرصے میں کبھی کسی طرح کا رنج و ملال درمیان نہیں آیا۔ حضرت! چالیس چالیس برس کا دشمن بھی نہیں پیدا ہوتا۔ دوست تو کہاں ہاتھ آتا ہے۔ یہ شخص بھی اپنی وضع کا اچھا کہنے والا تھا۔ طبیعت اس کی معنی آفریں تھی۔" (نادراتِ غالب۔ حصہ دوم صفحہ ۲۴)

(۱۲)

نواب مصطفیٰ خاں اور نواب ضیاء الدین خاں اور وحشت

نواب مصطفیٰ خاں مرحوم ہمیشہ مرزا کو ظہوری و عرفی کا ہم پایہ کہا کرتے تھے، اور صائب و کلیم وغیرہ سے مراتب برتر و بالا سمجھتے تھے۔ نواب ضیاء الدین خاں کا مرزا کی نسبت یہ قول تھا کہ ہندوستان میں فارسی شعر کی ابتدا ایک ترک لاچین (یعنی [illegible]) سے ہوئی اور ایک ترک ایبک (یعنی مرزا غالب) پر اس کا خاتمہ ہو گیا۔ سید غلام علی وحشت مرزا کی [illegible] کہ اگر یہ شخص عربیہ کی طرف متوجہ ہوتا تو عربی شعر میں دوسرا متنبی یا ابو تمام ہوتا اور انگریزی زبان



کی تکمیل کرتا تو انگلستان کے مشہور شاعروں کا مقابلہ کرتا۔" (یادگارِ غالب ص۲۳)
اتنا عرض کرنے کی تمنا ہے۔ کوئی جرأت کر سکتا ہے کہ عرفی و غالب کے کلام کا اگر تقابلی مطالعہ کیا جائے تو اکبرآبادی و دہلوی مرزا شیرازی عرفی سے کہیں دبتا ہوا نظر نہیں آتا۔ حالانکہ قصیدوں میں دونوں کے ممدوحوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ عرفی کے ممدوح "حقیقت" تھے اور مرزا کے ممدوح "خواب"۔ رہی غزل، یہ میدان دونوں کے لئے برابر تھا۔ "انا" دونوں میں تھی۔ عرفی بڑے بڑوں کو خاطر میں نہ لاتا تھا اور مرزا پیادوں کو شہسوار سمجھ کر تسلیم کرالانے پر مجبور تھا۔ مگر بساط بھر حسبِ موقع آئینہ سب کو دکھا دیا کرتا تھا اور ایسی داد آپ دے لیا کرتا تھا۔

سطورِ بالا میں غالب و عرفی کے ممدوحین کے تقابل میں زبانِ قلم سے ایک کو "خواب" اور دوسروں کو "حقیقت" کہا گیا ہے، اگرچہ موقع و محل کے لحاظ سے یہ بات بالکل صاف ہے مگر جدا جانے کیوں خیال آیا کہ ان دونوں لفظوں کی مزید تصریح و تفصیل کی ضرورت ہے۔ ملاحظہ فرمایئے:

عرفی کے کلیات میں قطعات و ضمنی مدحیہ اشعار کو چھوڑ کر تقریباً پچاس منظومات بعنوانِ مختلف شامل ہیں، جن میں سے ایک توحید باری عزّ اسمہٗ میں ہے اور سات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت میں اور چھ حضرت علیؓ کی منقبت میں۔ اور باقی اکبر و سلیم اور اُمرائے دربارِ اکبری کی مدح و ستائش میں۔ اور اس کے مقابلے میں غالب کے کلیاتِ فارسی میں مدحیہ اشعار اور قطعات سے قطعِ نظر قصائد کے عنوان سے ۶۴ منظومات موجود ہیں۔ ان میں ایک قصیدہ توحید میں اور گیارہ نعت و منقبت میں ہیں۔ انہی گیارہ میں دو حضرت حسینؓ کے بارے میں ہیں۔ اگر غالب کے ۶۴ قصیدوں میں سے ان ۱۲ کو منہا کر دیا جائے تو باقی ۵۲ قصیدے کچھ ہندوستانی شاہِ وقت کی مدح میں ہیں اور زیادہ تر مختلف المدارج انگریزوں کی تعریف میں ہیں۔

یہاں "حقیقت و خواب" کی بحث میں عرفی و غالب دونوں کے مذہبی جذبات کی مظہر منظومات زیرِ بحث نہیں۔

اسی کے ساتھ یہ بات بھی پیشِ نظر رہنی چاہئے کہ عرفی جوانی کی آخری حدوں کو پہنچنے سے پہلے ہی حیات کی آخری منزل پر پہنچ گیا تھا۔ اور مرزا غالب نے عرفی سے تقریباً تگنی یعنی ڈیڑھ سی عمر پائی، اس لئے مرزا غالب کا سرمایۂ کمال نظم و نثر فارسی و اردو میں عرفی سے اگر دوگنا ہو تو حیرت کی بات نہیں۔ گفتگو صرف دونوں باکمال استادوں کے ماحول۔ طبیعت اور افتادِ مزاج اور پیرایۂ بیان۔ تخلیق معانی اور بلند پروازیٔ خیال اور حُسنِ ترکیب سے ہے، اور بس۔ عرفی نے جو کچھ کہا وہ فارسی میں ہے جو اس کی مادری زبان تھی اور غالب نے جو کچھ کہا، وہ ایسی دو زبانوں میں ہے جن میں سے ایک اس کی مادری زبان ہے، یعنی اردو، اور دوسری اس کی اکتسابی زبان ہے یعنی فارسی۔
عرفی مذہبی مقتداؤں اور دنیوی ممدوح مشاہیر کے فرقِ مراتب کے پیشِ نظر ایک جگہ نعت میں کہتا ہے ؎

عرفی متاب ایں رہِ نعت است صحرا — آہستہ کہ رہ بر دمِ تیغ است قدم را
ہشدار کہ نتواں بیک آہنگ سرودن — مدحِ شہِ کونین و مدیحِ کی و جم را

غالب بھی دونوں کے فرقِ مراتب کو پہچانتا ہے، لیکن اس کا خیال ہے کہ نہ صرف دنیاوی مقتدر اربابِ جاہ کی مدح سرائی ہی جلبِ منفعت کے لئے ہوتی ہے، بلکہ دینی پیشواؤں سے بھی بہت سی توقعات وابستہ ہوتی ہیں۔ لیکن عموماً لوگ خدا و رسول سے بھی دو رُوئی کا معاملہ کیا کرتے ہیں اور یہ روش اسے پسند نہیں، اس لئے کہتا ہے ؎

فرصت اگرت دست دہد مغتنم انگار — ساقی و مُغنّی و شرابی و سرودی
زنہار ازاں قوم نہ باشی کہ فریبند — حق را بسجودی و نبی را بدرودی

لیکن مرزا خود کو ایسے دو رُو لوگوں سے الگ ٹھہراتا ہے اور اپنا معاملہ بزرگوں سے بھی لین دین میں صاف رکھنا چاہتا ہے۔ چنانچہ امام حسینؓ کے بیان میں کہتا ہے ؎



گرمه دمگر بحیله روبالا گریستی   خواہد دلم لطالع خود اگریستن
جنس شاعتی سلم میتوان خرید   امروز مایہ ار پئے فردا گریستی
مزد شفاعت بصلۂ صبر وجوبہا   جیرے زکس نخواستہ الّا گریستی

منظم مرہوجہ بیدوفروخت کی ایک قسم کی صورت ہے جس میں بائع کو قیمت پہلے ادا کردی جاتی ہے اور مشتری کو بائع مدتِ مقررہ پر جنس دینے پر مجبور ہوتا ہے۔

(۱۳)

بیانات بالا کے آخر میں خود مرزا کا ایسا بیان جو بڑا ہی دردناک ہے، پڑھنے کے لائق ہے۔ مرزا علاء الدین احمد خان علائی رئیس (لوہارو) مخاطب ہیں۔ مرزا اُن سے ہمدردی کے اظہار کے دوران میں اپنی قسمت کا گلہ بھی کر جاتے ہیں۔ ارشاد ہے کہ۔

"تم کیا دل لے کر آئے۔ کیا زبان لے کر آئے۔ کیا علم لے کر آئے۔ کیا عقل لے کر آئے اور پھر کس روش کو برت سکے۔ کس شیوہ کی داد نہ پائی۔ گویا نظیری تمہاری زبان سے کہتا ہے ؎

جوہر بینش من در تہہ زنگار بماند   آنکہ آئینۂ من ساخت نہ پرداخت دریغ

بھائی! اس معرض میں میں بھی تیرا ہم طالع اور ہم درد ہوں۔ اگرچہ یک فنہ[1] ہوں مگر مجھے اپنے ایمان کی قسم، میں نے اپنی نظم ونثر کی داد باندازۂ بایست پائی نہیں۔ آپ ہی کہا، آپ ہی سمجھا۔"
(خطوطِ غالب مرتبہ مولوی مہیش پرشاد مرحوم ص ۱۳۱)

پیری میں اپنے مجموعۂ اشعار اور اقتضائے مزاج پر اظہارِ خیال

ایسی مرزا علائی نے جب تازہ اشعار طلب کئے تو مرزا غالب اُن کو جواباً تحریر فرماتے ہیں کہ "اشعار تازہ مانگتے ہو کہاں سے لاؤں؟ عاشقانہ اشعار سے مجھ کو وہ بُعد ہے جو ایمان سے کفر کو۔ گورنمنٹ کا بھاٹ تھا۔ مدحتی کرتا تھا۔ خلعت پاتا تھا۔ خلعت موقوف۔ مدحتی متروک۔ نہ غزل۔ نہ مدح۔ ہزل وہجو میرا آئین نہیں۔ پھر کہو کیا لکھوں؟ بوڑھے پہلوان کے سے پیچ بتلانے کو رہ گیا ہوں۔ اکثر اطراف وجوانب سے اشعار آجاتے ہیں، اصلاح پا جاتے ہیں۔" (خطوط غالب مرتبہ مرحوم مہیش پرشاد ص ۳۲۲)

مرزا کی مشکل پسندی اور معاصرین اور مرزا

مرزا کے کچھ معاصر اہل کمال مثلاً صہبائی، علائی اور آزردہ، مرزا کی مشکل پسندی اور ندرتِ خیال کی بنا پر مرزا سے شاکی رہتے تھے مگر ان میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں دکھایا جا سکتا جو مرزا کے علم وفضل اور مہارتِ فنِ شعر وانشا میں کمال کا قائل نہ ہو۔ مرزا اُن کے اعتراضوں کو سنتے تھے جانچتے تھے اور طبیعت پر زور ڈال کر اپنے فن کو ترقی وجلا دینے میں لگے رہتے تھے۔ اس امر کو مولانا حالی نے وضاحت سے یادگارِ غالب میں بیان کیا ہے اور پھر مرزا کے فارسی دیوان کے دیباچے سے مندرجۂ ذیل عبارت بصورتِ ترجمہ نقل کی ہے۔ مرزا غالب فرماتے ہیں کہ
"اگرچہ طبیعت ابتدا سے نادر اور برگزیدہ خیالات کی جویا تھی۔ لیکن آزادہ روی کے سبب زیادہ تر اُن لوگوں کی پیروی

---

[1] مرزا غالب کا خود کو یک فنہ کہنا ہمارے اس بیان کے خلاف نہیں جہاں ہم نے اپنے ایک دوسرے مضمون میں مرزا کو دو زبانوں کی نثر ونظم پر قادر ہونے کے لحاظ سے دو فنہ "یا ذوفنی" کہا ہے۔ یہاں مرزا نظم ونثر اور دو زبانوں پر قدرت کو ایک فن ہی قرار دیتے ہیں۔ تسجاب



پھرتا رہا جو راہ صواب سے بالکل دور تھے۔ آخرش ان لوگوں نے جو اس راہ میں پیشرو تھے، دیکھا کہ میں باوجودیکہ اُن کے ہمراہ چلنے کی قابلیت رکھتا ہوں اور پھر بے راہ بھٹکتا پھرتا ہوں۔ اُن کو میرے حال پر رحم آیا اور انہوں نے مجھ پر مربیانہ نگاہ ڈالی۔ شیخ علی حزیں نے مسکرا کر میری بے راہ روی مجھ کو جتائی۔ طالب آملی اور عرفی شیرازی کی غضب آلود نگاہ نے آوارہ اور مطلق العنان پھرنے کا مادہ جو مجھ میں تھا، اُس کو فنا کر دیا۔ ظہوری نے اپنے کلام کی گیرائی سے میرے بازو پر تعویذ اور میری کمر پر زادِ راہ باندھا اور نظیری نے اپنی خاص روش پر چلنا مجھ کو سکھایا۔ اب اس گروہ والا شان کے فیضِ تربیت سے میرا کلکِ رقاص چال میں کبک ہے تو رنگ میں موسیقار۔ جلوے میں طاؤس ہے، پرواز میں عنقا۔" (یادگارِ غالب ص ۲۲۳)

(۱۶)

اوپر جس قدر واقعات و حقائق نقل کئے گئے ہیں اُن سے یہ بات روشن ہو گئی کہ مرزا نے فن شعر و انشا میں کمال کیسے حاصل کیا۔ اور کیسے کیسے باکمالوں کو بطور اُسوہ اپنے سامنے رکھا۔ وہ لوگ کس درجہ کے شاعر و ادیب و حکیم تھے اور مرزا خود اپنے ہم عصروں کی نظر میں کس قدر بلند نظر، باکمال اور کھلے دل کے خالص فن کار تھے۔ جس کی بات قابلِ تعریف ہوتی بے اختیار اُس کی تعریف کرتے تھے اور جس بات کو صحیح سمجھتے تھے اُسے بے تکلف قبول کر لیتے تھے۔ اسی کے ساتھ آپ نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ وہ شخص جو بادشاہ کی صرف ایک شعر خوانی کی تعریف کو بھی اپنے کمال کی ہتک خیال کرتا ہو، وہ نااہلوں کی مہمل تعریف کو کب خاطر میں لاتا ہوگا۔ اِس حقیقت کو سمجھنے کے لئے چند شواہد حاضر ہیں۔ "یادگارِ غالب" ص ۱۲۷ پر مولانا حالی لکھتے ہیں کہ:-

"ایک صاحب نے جو غالباً بنارس یا لکھنؤ سے دلی آئے تھے (اپنے خیال میں) مرزا کے ایک شعر کی اُن کے سامنے نہایت تعریف کی۔ مرزا نے کہا، استاد تو ہو وہ کون سا شعر ہے؟ انہوں نے میر امانی متخلص بہ اسد شاگرد مرزا رفیع کا یہ شعر پڑھا ؂

اسد اس جفا پر بتوں سے وفا کی — مرے شیر شاباش رحمت خدا کی

چونکہ شعر میں اسد تخلص واقع ہوا تھا، انہوں نے سمجھا کہ مرزا غالب کا شعر ہے۔ مرزا سُن کر بہت جز بز ہوئے اور فرمایا، اگر یہ کسی اور اسد کا ہے تو اُس کو رحمت خدا کی اور اگر مجھ اسد کا شعر ہے تو لعنت خدا کی۔"

(۱۷)

منشی شیو نرائن صاحب نے مرزا سے ایک غزل کی فرمائش کی جو منشی صاحب کے خیال میں مرزا کی تھی۔ مرزا انہیں جواب میں لکھتے ہیں کہ:-

"بھائی جانتا تم جانتا، اگر یہ غزل میری ہو ع "اسد اور لینے کے دینے پڑے" (اس شاعر کو جس نے یہ غزل کہی، میں کچھ کیوں کہوں۔ لیکن اگر یہ غزل میری ہو تو مجھ پر ہزار لعنت۔ اس سے آگے ایک شخص نے یہ مطلع میرے سامنے پڑھا اور کہا قبلہ آپ نے کیا خوب مطلع کہا ہے ؂

اسد اس جفا پر بتوں سے وفا کی — مرے شیر شاباش رحمت خدا کی

میں نے یہی اُن سے کہا کہ اگر یہ مطلع میرا ہو تو مجھ پر لعنت"۔ (اردوئے معلی۔ ص ۳۰۲)

مرزا علاء الدین خاں علائی کو لکھتے ہیں:-

"پچاس برس کی بات ہے کہ الٰہی بخش مرحوم (مرزا غالب کے خسر) نے ایک زمین نئی نکالی۔ میں نے (خسر کے) حسب الحکم غزل لکھی۔ بیت الغزل یہ ہے



پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے　　پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

اسدؔ خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے　　کہا جو اُس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے

اب دیکھتا ہوں کہ مطلع اور چار شعر کسی نے لکھ کر اس مقطع اور اس بیت الغزل کو شامل اُن اشعار کے کرکے غزل بنا لی ہے اور اس کو لوگ گاتے پھرتے ہیں۔ مقطع اور ایک شعر میرا اور پانچ شعر کسی اُلو کے۔ جب شاعر کی زندگی میں گانے والے شاعر کے کلام کو مسخ کر دیں تو کیا بعید ہے کہ شاعر متوفی کے کلام میں مطربوں نے خلط کر دیا ہو۔"

(خطوط غالب صفحہ ۳۴۳ مرتبہ مہیش پرشاد مرحوم)

(۱۸)

نواب مرزا شہاب الدین خاں کے پاس مرزا کا دیوان ہے۔ اُس کے حاشیے پر کاتب غلطی سے یا کسی اور کی غلط فہمی سے کسی غیر کا کلام مرزا کا کلام سمجھ کر لکھ دیا گیا۔ مرزا کو اس دیوان کی نقل بھیجی گئی۔ اُسے دیکھ کر نواب موصوف کو لکھتے ہیں کہ:

"بھائی شہاب الدین خاں!

واسطے خدا کے یہ تم نے اور حکیم غلام نجف خاں نے میرے دیوان کا کیا حال کر دیا ہے؟ یہ اشعار جو تم نے بھیجے ہیں، خدا جانے کس ولد الزنا نے داخل کر دیے ہیں۔ دیوان تو چھاپے کا ہے، متن میں اگر یہ شعر ہوں تو میرے ہیں اور اگر حاشیے پر ہوں تو میرے نہیں ہیں۔ بالفرض اگر یہ شعر متن میں پائے جائیں تو یوں سمجھنا کہ کسی ملعون نے اصل کلام کو چھیل کر یہ خرافات لکھ دیے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ جس مفسد کے یہ شعر ہیں اُس کے باپ اور دادا اور پردادا پر لعنت اور وہ ہفتاد پشت تک ولد الحرام۔ اس کے سوا کیا لکھوں۔ ایک تو لڑکے میاں غلام نجف۔ دوسرے تم۔ میری کم بختی بڑھاپے میں آئی کہ میرا کلام تمہارے ہاتھ پڑا ..... اپنے کاتب کو کہہ دینا کہ یہ خرافات متن میں نہ لکھے۔ اگر لکھ دیئے ہوں تو وہ ورق نکال ڈالنا۔ اور ورق اس کے بدلے لکھوا کر لگا دینا۔ مناسب تو یوں ہے کہ تم کسی آدمی کے ہاتھ وہ دیوان جو تمہارے کاتب نے نقل کیا ہے میرے پاس بھیج دو تاکہ میں اس کو ایک نظر دیکھ کر پھر تم کو بھیج دوں۔"

(خطوط غالب۔ مرتبہ مولوی مہیش پرشاد مرحوم خط نمبر ۴۳)

عبارت بالا سے روشن ہے کہ مرزا بڑھاپے میں بھی چوکس رہتے تھے۔ آئی ہوئی تحریروں کو دیکھتے تھے۔ جواب دیتے تھے۔ غلطی کی گرفت کرتے تھے اور ہلکی بات کی اپنی طرف نسبت کو پسند نہ کرتے تھے اور نااہل کی ستائش کو اپنی ہتک خیال کرتے تھے۔ حالانکہ یہ بات ہمارے علم میں ہے کہ بعض استاد پرست شاگردوں نے اپنی قابلیتوں کے پیوند بھی استاد کے فن کی تکمیل کے پیرہن میں لگائے ہیں اور اس طرح مرحوم استاد کے ساتھ خود کو بھی اہل نظر کے سامنے فنی اعتبار سے قدرتی لباس میں ظاہر کر دیا ہے۔

(۱۹)

انہی نواب شہاب الدین خاں کے نام ایک اور خط میں اُنہی سے خطاب ہے کہ:

"چکیدل، دہیم، رمیدل دہیم۔ یہ غزل نواب علاء الدین خاں کو بھیج چکا ہوں۔ تم علاء الدین خاں کو لکھو کہ بڑی بے تمیزی کی بات ہے کہ "ہر دم آزردگی غیر سبب راچہ علاج"۔ اس غزل کو حافظ کی غزل سمجھتے ہو۔ واہ واہ! "غیر سبب" کہاں کی بولی ہے۔ "از حوادث قرآن گو قاری چہ فائدہ"۔ عیاذاً باللہ! امیر خسرو قرآن کو کہہ سکوں رائے قرشت والف ممدودہ ہے قُرآن بروزن نُوان لکھیں گے۔ یہ دونوں غزلیں دو گدھوں کی ہیں۔ شاید ایک نے مقطع میں حافظ اور ایک نے مقطع میں خسرو لکھ دیا ہو۔" (خطوط غالب مرتبہ مولوی مہیش پرشاد خط نمبر ۳۲)



ریاست دوجانہ میں رئیس کے ہاں شادی تھی مرزا علائی نے کسی مرزا علی حسین خاں بہادر کا خیال لکھا کہ مرزا غالب سے وہاں (دوجانہ میں) ملاقات ہوگی۔ مرزا نے جواباً علائی کو لکھا۔ اوّل تو علائی کو "یار بھتیجے" کے لفظوں سے خطاب کیا ہے۔ گویا اپنے چھوٹے کو بے تکلفی سے بھائی کے قریب سمجھ لیا ہے اور پھر "مولانا علائی" کا خطاب بھی دیا ہے جو بے تکلفی کے ساتھ بھتیجے کے علمی و ذہنی میلان کی طرف اشارہ ہے۔ پھر عبارت ذیل میں اس خیال کی تردید کی ہے کہ:۔

"خدا کی دہائی! نہ میں ویسا ہوں گا جیسا تم نے سمجھا ہے اور تم مجھ کو لکھ چکے ہو یعنی حقانی اور خیال تراش۔ نہ ویسا ہی ہوں گا جیسا کہ مرزا علی حسین خاں بہادر سمجھے ہوں گے۔ ع اے کاش ہر آنچہ ہستم دانند

دوجانے میں میرا انتظار اور میرے آنے کا تقریب شادی پر مدار یہ بھی شعر ہے اور نہیں طعنوں کا جس سے تمہارے چچا کو گمان ہے مجھ پر یعنی کا جاگیردار میں نہ تھا کہ جاگیردار مجھ کو بلاتا۔ گویا میں نہ تھا کہ اپنا سارو سامان لے کر چلا جاتا دکھ، دوجانے جا کر شادی کھاؤں"۔ (خطوط غالب۔ مرتبہ مہیش پرشاد مرحوم صفحہ ۳۳۹)

اس ساری تفصیل کو بنظر انصاف ملاحظہ فرما کر خود ہی داد دیجئے کہ اس مزاج، اس طنطنہ اور اس تمکنت کے انسان کے کلام کا مداح کس درجے اور کس شان کا سخن فہم۔ سخن شناس شخص ہونا چاہیے۔ تاکہ اس کی مدح و ستائش کو وہ اپنے رتبۂ رفیع اور عظمت شان سخن کے ہم سنگ خیال کرے۔ نہ کہ ایسا کہ جس کی ناچہانہ تعریف سن کر معمولی درجے کے انسان کو بھی صائب کا یہ شعر یاد آ جائے ؎

صائب دو چیز می شکند قدر شعر را تحسین ناشناس و سکوت سخن شناس

میکش اکبرآبادی

مرزا غالب کا مذہب

مرزا غالب کا مذہب کیا تھا؟ وہ شیعہ تھے یا سُنی؟ یہ ایک سوال ہے جو اُن کی زندگی میں بھی پیدا ہوا، اُن کی موت کے وقت بھی اور اُن کی وفات کے اتنے زمانے بعد بھی یہ سوال ایسا ہی محتاجِ جواب ہے جتنا اُن کی زندگی میں تھا۔ حالی نے یادگارِ غالب میں جو کچھ لکھا ہے اُس کی بنیاد حالی کا ذاتی علم اور قیاس ہے جو ایک حد تک صحیح مان لینے کے بعد بھی قطعی نہیں ہے۔ حالی لکھتے ہیں:

"اگرچہ مرزا کا اصل مذہب صلح کل تھا مگر زیادہ تر اُن کا میلانِ طبع تشیع کی طرف پایا جاتا تھا اور جناب امیر کو وہ رسولِ خدا کے بعد تمام اُمت سے افضل جانتے تھے۔"

ایک بار مرحوم بہادر شاہ نے دربار میں کہا، ہم نے سنا ہے کہ مرزا اسد اللہ خاں غالب شیعی ہیں۔ مرزا کو بھی اطلاع ہو گئی، چند رُباعیاں لکھ کر حضور کو سنائیں، جن میں تشیع اور رفض سے تحاشی کی تھی۔ ان میں سے ایک رُباعی جو بہت لطیف ہے، مجھ کو یاد رہ گئی ہے، جو یہاں لکھی جاتی ہے

رُباعی

جن لوگوں کو ہے مجھ سے عداوت گہری   کہتے ہیں مجھے وہ رافضی اور دہری
دہری کیونکر ہو جو کہ ہووے صوفی   شیعی کیونکر ہو ماوراء النہری

اس رُباعی کی تشریح کرنے کے بعد خواجہ حالی لکھتے ہیں:

"جو لوگ مرزا کی طرزِ مزاج اور طرزِ کلام سے ناآشنا ہیں، وہ شاید سمجھیں کہ مرزا نے بادشاہ کی حضور میں اپنا رسوخ قائم رکھنے کے لئے اپنا مذہب غلط بیان کیا، لیکن اصل حقیقت یہ ہے کہ یہ سب رُباعیاں صرف بادشاہ کو خوش کرنے اور اہلِ دربار کو ہنسانے کے لئے لکھی گئی تھیں، کیونکہ دربار میں ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جو مرزا کو شیعی یا کم سے کم تفضیلی نہ جانتا ہو۔"[1]

ممکن ہے کہ مرزا غالب نے یہ رُباعیاں بہادر شاہ کے ہنسانے کو کہی ہوں، لیکن مرزا کے مذہب کے بارے میں سارے دربار کی واقفیت کے باوجود بہادر شاہ کی ناواقفیت کا کیا جواز ہے۔ اس طرح بہادر شاہ کا استفسار اور مرزا کی صفائی ایک لطیفہ اور حالی کا بیان تکلفِ طبع کے سوا کیا قرار دیا جائے گا۔

---

[1] یادگارِ غالب ص ۶۹



خواجہ حالیؔ کی مذکورہ عبارت اور تہذیب کے ساتھ خود اُن ہی کی ذیل کی عبارت ملا کر ملاحظہ کیجیے۔

"مرزا کے جنازے پر چونکہ دلّی دروازے کے باہر نماز پڑھی گئی۔ راقم بھی موجود تھا اور شہر کے اکثر عمائد اور مُمتاز لوگ جیسے نواب ضیاء الدین احمد خاں۔ نواب محمد مصطفےٰ خاں۔ حکیم احسن اللہ خاں وغیرہم اہلِ سنت شیعہ اہلِ سُنّت اور امامیہ فرقوں کے لوگ جنازے کی مشایعت میں شریک تھے۔ سید صفدر سُلطان نبیرہ بخشی محمود خاں نے نواب ضیاء الدین احمد خاں مرحوم سے کہا کہ مرزا صاحب شیعہ تھے۔ ہم کو اجازت ہو کہ ہم اپنے طریقے کے موافق اُن کی تجہیز و تکفین کریں مگر نواب صاحب نے نہیں مانا اور تمام مراسم اہلِ سُنّت کے موافق ادا کیے گئے۔ اس میں شک نہیں کہ نواب صاحب سے زیادہ اُن کے اصلی مذہبی خیالات سے کوئی شخص واقف نہیں ہو سکتا تھا مگر ہمارے نزدیک بہتر ہوتا کہ شیعہ اور سُنّی دونوں مل کر یا علاحدہ علاحدہ اُن کے جنازے کی نماز پڑھتے اور جس طرح زندگی میں اُن کا برتاؤ شیعہ اور سُنّی دونوں کے ساتھ یکساں رہا تھا، اُسی طرح مرنے کے بعد بھی دونوں فرقے اُن کی حق گزاری میں شریک ہوتے"۔[1]

اگر خواجہ حالیؔ کا پہلا بیان تسلیم کر لیا جائے کہ دربار میں ایک متنفس بھی ایسا نہ تھا جو مرزا کو شیعی یا کم سے کم تفضیلی نہ جانتا ہو تو اُن کی تجہیز و تکفین کے وقت یہ اختلاف پیدا ہی نہ ہونا چاہیئے تھا لیکن تجہیز و تکفین کے واقعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مرزا صاحب سُنّی تھے کیونکہ بقول مولانا حالیؔ نواب ضیاء الدین احمد خاں سے زیادہ مرزا کے اصلی مذہبی خیالات سے کوئی شخص واقف نہ تھا۔

اِن عبارتوں سے ایک بات ضرور واضح ہو جاتی ہے کہ مرزا غالبؔ نہ ایسے شیعہ تھے جس میں سُنّیت کی گنجائش نہ ہو اور نہ ایسے سُنّی تھے کہ اُن کو قطعیت کے ساتھ سُنّی کہہ دیا جاتے۔ اس موقع پر ایک بات ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ مذہب کے معاملے میں شیعہ اور سُنّی دونوں علاحدہ علاحدہ مزاج رکھتے ہیں۔ سُنّیوں کا مزاج یہ ہے کہ اگر کوئی شخص سُنّیوں کے پورے مذہب کے مطابق ہو اور اُس کے ساتھ حضرت علیؓ کی تعریف و توصیف کے ساتھ جناب امیر معاویہ کے بارے میں اتنا مخلص نہ ہو تو اُس کو قطعیت کے ساتھ شیعہ کہہ دیا جاتا ہے اور اکثر شیعہ ہونے کے لیے صرف حُبِّ علیؓ ہی کافی سمجھی جاتی ہے۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی جو اپنی کتاب تحفۂ اثنا عشریہ کی وجہ سے شیعوں کی مخالفت میں بہت مشہور ہیں۔ خود اپنا واقعہ لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے صرف حضرت علیؓ کے فضائل بیان کیے تو میرا ایک طالب علم ناخوش ہو گیا اور اُس نے مجھے شیعہ سمجھ لیا۔ اس کے برخلاف شیعوں کا مزاج یہ ہے کہ اگر کسی کے کلام میں حضرت علیؓ کی مدح و ستائش ہو اور دوسرے صحابہؓ کا ذکر نہ ہو تو اُسے شیعہ تسلیم کر لیتے ہیں۔

یہ ظاہر ہے کہ مرزا غالبؔ کوئی عالم یا مجتہد نہ تھے جو عقائد و کلام کی جزئیات تک کے متعلق اپنا مسلک متعین یا ظاہر کرتے۔ پھر بھی انھوں نے مختلف مواقع پر جو اپنے عقائد بیان کیے ایک مرتبہ ان سب کا مجموعی طور سے مطالعہ ضروری ہے۔ یہ ضروری اقتباسات "یادگارِ غالبؔ" اور اُن مکتوبات سے پیش کیے جاتے ہیں جو مرزا صاحب نے حضرت حی غمگین دہلوی کو لکھے ہیں:

"میں آدھا مسلمان کہ جس طرح قیدِ کیش و ملت سے آزاد ہوں، اُسی طرح بدنامی و رسوائی کے خوف سے وارستہ ہوں"۔[2]

"لیکن اس میں شک نہیں کہ میں موحّد ہوں، ہمیشہ تنہائی اور سکوت کے عالم میں یہ کلمات میری زبان پر جاری رہتے ہیں: لا الٰہ الا اللّٰہ، لا موجود الا اللّٰہ، لا موثر فی الوجود الا اللّٰہ"۔[3]

"زمانے کے لونڈوں کو پڑھا کر مولوی مشہور ہونا اور رسائل ابوحنیفہ کو دیکھنا اور مسائل حیض و نفاس میں غوطہ مارنا

---

[1] یادگارِ غالبؔ صـ۹ مطبوعہ مطبع فیضِ عام علی گڑھ۔ [2] ایضاً بحوالہ (مکتوب صـ۳۶) [3] ایضاً صـ۹۷، ۹۸



اسی شعر یا شعراء کے کلام سے حقیقت حقہ وحدۃ وجود کو بے دلنشین کر دیا ہے۔ مشرک وہ ہیں جو وجود کو واجب کا شریک جانتے ہیں۔ مشرک وہ ہیں جو مسیلمہ کو نبوت میں خاتم المرسلینؐ کا شریک گردانتے ہیں۔ مشرک وہ ہیں جو نو مسلموں کو ابوالائمہ کا ہمسر مانتے ہیں۔ دوزخ ان لوگوں کے واسطے ہے۔ میں موحد خالص اور مومن کامل ہوں۔ زبان سے لا الٰہ الا اللہ کہتا ہوں اور دل میں لا موجود الا اللہ، لا موثر فی الوجود الا اللہ سمجھا ہوا ہوں۔ انبیاء سب واجب التعظیم اور اپنے اپنے وقت میں سب مفترض الطاعت تھے۔ محمد علیہ السلام پر نبوت ختم ہوئی۔ یہ خاتم المرسلین اور رحمۃ للعالمین ہیں۔ مقطع نبوت کا مطلع امامت اور امامت نہ اجماعی بلکہ من اللہ ہے اور امام من اللہ علی علیہ السلام ہے، ثم حسن ثم حسین۔ اسی طرح تا مہدی موعود علیہ السلام بریں زیستم ہم بریں بگذرم۔ ہاں اتنی بات اور ہے کہ اباحت اور زندقہ کو مردود اور شراب کو حرام اور اپنے کو عاصی سمجھتا ہوں۔[1]

سخن در باب رباعیات می رود یا رب بیاں من مخالف پیر و مرشد نہ شود سہ رباعی کہ در آغاز رقم یافتہ مضمون آں دارد کہ علی خلیفہ بود و ایں عقیدہ دامن ندارم من علی را امام دانم و دیگراں را خلیفہ، خلافت مراد ف سلطنت و ریاست است چنانکہ عرب رئیس و حاکم را خلیفہ گویند اگرچہ معنی لغوی ہماں نیابت است بالجملہ علی بلا فصل بعد از نبی امام است و امامت امر یست ایزدی و علی امام است ہم در عہد خلافت ابوبکر و ہم در عہد خلافت عمر و ہم در عہد خلافت عثمان و ایں کہ مشہور است علی بعد از عثمان خلیفہ شد غلط است اصل ایں است کہ امام بر حق علی مرتضی چون بعد از رسول امام شد ابوبکر صدیق را خلیفہ کردہ امر قضا بوے سپرد تا قطع خطرات مسلمین نماید و بر مومنین فرمانروا باشد و پس از و عمر را برگزید و ازاں بعد عثمان را خلافت داد ایں ہر سہ تن مادام و سپر دند و بہ امام را اطاعت کردند بعد از عثمان ہیچ کس لائق قضا در مسلمین یافتہ نشد و آنکہ آرزو کرد نیز شائستہ ایں کار نبود لاجرم امام وقت کار قضا بعہدہ خود گرفت و خود بہ قطع خصومات اہل اسلام پرداخت شاہ اگر او قاضی کند او را قاضی نگویند ہماں بالجملہ علی امام است در عہد اما خلافت خود بعد از حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بہ بنی امیہ منتقل شد و ازاں گروہ بہ آل عباس رسید و ایں ہر دو گروہ بر عکس خلفائے ثلثہ ستم ہا کردند و خونہا ریختند و امامت علی و اولاد علی را محو کردند و ائمہ را کشتند۔" (مکتوب مرزا غالب بنام حضرت حی علیؑ دہلوی)

ترجمہ:

رباعیوں کے بارے میں بات شروع ہوتی ہے۔ یا اللہ میرا بیان پیر و مرشد کے خلاف مزاج نہ ہو۔ تین رباعیاں جو شروع میں رقم ہوئی ہیں ان کا مضمون یہ ہے کہ علی خلیفہ تھے لیکن، میرا یہ عقیدہ نہیں ہے، میں علی کو امام سمجھتا ہوں اور دوسروں کو خلیفہ۔ خلافت، سلطنت اور ریاست کے ہم معنی ہے۔ عرب کی زبان میں رئیس اور حاکم کو خلیفہ کہتے ہیں۔ اگرچہ خلافت کے لغوی معنی نیابت کے ہیں۔ غرض یہ کہ علی نبی کے بعد بلا فصل امام ہیں۔ امامت خدا کی طرف سے ہے اور علی امام ہیں ابوبکر کی خلافت کے زمانے میں بھی، عمر کی خلافت کے زمانے میں بھی، عثمان کی خلافت کے زمانے میں بھی۔ اور یہ جو مشہور ہے کہ عثمان کے بعد علی خلیفہ ہوئے غلط ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ امام برحق علی مرتضی جب رسول کے بعد امام ہوئے تو انہوں نے ابوبکر صدیق کو خلیفہ کر کے حکومت کا کام ان کے سپرد کر دیا تاکہ مسلمان خطروں سے محفوظ رہیں اور مسلمانوں پر فرمانروائی کریں۔ اس کے بعد عمر کو پسند کیا، ان کے بعد عثمان کو خلافت دی۔ ان تینوں نے اپنے کو سپرد کر دیا اور سی اور امام کی اطاعت کی۔ عثمان کے بعد کوئی شخص حکومت کے قابل مسلمانوں میں نظر نہ آیا۔ جس شخص نے اس کی آرزو کی وہ بھی اس کا اہل نہ تھا۔ مجبوراً امام وقت نے

---

[1] یادگار غالب۔ ص ۱۶۳-۱۶۴



حکومت کا کام بھی خود ہی سنبھال لیا اور اہلِ اسلام کے جھگڑوں کو طے کرنے لگے۔ بادشاہ اگر قاضی کا کام کرنے لگے تو اسے قاضی نہیں کہیں گے۔ علی ہی امام ہیں اپنے عہد میں لیکن خلافت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد بنی اُمیہ کو منتقل ہوئی اور اُن سے آلِ عباس کو پہنچی۔ ان دونوں گروہوں نے خلفائے ثلاثہ کے برعکس بہت سے ظلم کیے اور خون بہائے علی اور اولادِ علی کی امامت کو مٹایا اور ائمہ کو شہید کیا۔"

یہاں تک جو کچھ عرض کیا گیا ہے اُس کا تعلق مرزا غالب کے شیعہ یا سُنی ہونے سے تھا۔ مولانا حالی نے اُن کے متعلق جو لکھا ہے وہ بھی قابلِ توجہ ہے:-

"مرزا اسلام کی حقیقت پر نہایت پختہ یقین رکھتے تھے اور توحید وجودی کو اسلام کا اصل اُصول اور رکن رکین جانتے تھے۔ اگرچہ وہ بظاہر اہلِ حال سے نہ تھے مگر جیسا کہ کہا گیا ہے مَنْ اَحَبَّ شَیْئًا اَکْثَرَ ذِکْرَہٗ" توحید وجودی اُن کی شاعری کا عنصر بن گئی تھی . . اُنہوں نے تمام عبادات اور فرائض و واجبات میں سے صرف دو چیزیں لے لی تھیں۔ ایک توحید وجودی اور دوسرے نبی اور اہلِ بیتِ نبی کی محبت اور اسی کو وہ وسیلۂ نجات سمجھتے تھے۔"[1]

ایک مشہور قول ہے "الصوفی لا مذھب لہ" یعنی صُوفی کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ اس کی تشریح خود صُوفی اس طرح کرتے ہیں کہ صُوفی کسی معین مذہب کا مقلد نہیں ہوتا چنانچہ صُوفی ہر مذہب میں پائے جاتے ہیں اور خود اسلام میں صُوفی مختلف مدرسہ ہائے فقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اصل میں تصوف ایک مخصوص طرزِ فکر اور مخصوص عقیدہ کا نام ہے۔ مذہبی اعمال کو بھی وہ اپنے مخصوص نقطۂ نظر سے دیکھتے اور پرکھتے ہیں۔ چنانچہ ایک ہی سلسلے کے صُوفیوں میں کوئی مالکی ہے کوئی حنبلی کوئی حنفی ہے کوئی شافعی۔ البتہ صُوفیانہ نظریات میں وہ اپنے نظریے سے مخلص اور اس کے پابند ہوتے ہیں۔ مرزا غالب شدت کے ساتھ وحدۃ الوجود کے قائل ہیں اور اپنے مکتوبات بنام ... میں وہ شیخ اکبر ابنِ عربی کے پیرو ہیں لیکن اِسی مسلک میں بھی وہ ابنِ عربی کے نظریۂ اعیان سے اپنا ایک علاحدہ راستہ مقرر کر لیتے ہیں۔ ابنِ عربی کے وہ اس حد تک متبع ہیں کہ وجود کو ایک ناقابلِ تقسیم اکائی مانتے ہیں اور حق کے سوا کسی کو موجود نہیں مانتے۔ لیکن ابنِ عربی کے برخلاف وہ اِس عالم کو وہم اور عدمِ محض سمجھتے ہیں اِس کی تشریح اُنہوں نے اپنے مکتوبات میں بھی کی ہے اور اشعار میں بھی۔

ہم نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور ... جز وہم نہیں ہستیٔ اشیا مرے آگے

ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی ... ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

اس طرح مرزا غالب ابنِ عربی سے زیادہ ویدانت کے نظریے کے متبع معلوم ہوتے ہیں۔ یہ موقع اس کا نہیں ہے کہ ویدانت کے نظریے کی تشریح کی جائے مگر اتنا عرض کر دینا بے محل نہ ہوگا کہ ویدانت بھی پُوری طرح مرزا غالب کا مؤید نہیں ہے اور اس عالم کو لوگ وششٹھ ادویت کی طرح عدمِ محض نہیں مانتا ہے بلکہ اُس کے نزدیک صورتِ عالم دھوکہ ہے جسے نیست کہہ سکتے ہیں نہ ہست۔

خلاصہ یہ کہ مرزا صاحب ایسے صُوفی تھے جو وحدۃ الوجود پر مکمل ایمان رکھتا ہو اور شراب بھی پیتا ہو اور ایسے سُنی تھے جو حضرات ابوبکرؓ و عمرؓ کی خلافت کو حضرت علیؓ کا عطیہ مانتا ہو اور حضرت علیؓ کو ہر حیثیت سے سب سے افضل سمجھتا ہو۔ اِسی طرح وہ ایک ایسے شیعہ تھے جو حضرات ابوبکرؓ و عمرؓ کو خلیفہ تسلیم کرتا ہو اور حضرت علیؓ کو خلیفہ بلافصل نہ مانتا ہو۔ اسطرح وہ درحقیقت آزاد رو تھے اور تقلید کو شاعری کی طرح مذہب میں بھی روا نہیں رکھتے تھے اور اپنی روشِ عام سے ہٹ کر چلنے کی عادت کو مذہب میں بھی نہیں چھوڑ سکتے تھے۔

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم ... ملّتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں ▲

---

[1] یادگارِ غالب۔ ص ٦٥

ڈاکٹر مسیح الزماں

غالب کے طرفدار نہیں

غالب ایک غیر معمولی انسان تھے۔ اُن کے ذہن کی جودت، فکر کی رسائی، نگاہ کی تیزی انہیں روایتوں کو توڑنے اور شعور کے اظہار کے لیے نئی نئی سمتوں کی طرف مائل کرتی رہتی تھی۔ ماحول کے گھیرے سے باہر نکلا۔ ہم نشینیوں کے طعنوں کی طرف سے لاپروا ہو جانا ایسی جرأت کا تقاضا کرتا ہے جیسے گہری خود اعتمادی سے غذا ملی ہو، جو اپنی انا کو سب سے اُوپر رکھتا ہو اور اس شمع کو سینے میں فروزاں رکھ کے اپنے خونِ جگر سے اس کی آبیاری کرتا رہے۔ غالب کی اِس انا کا سارا ورثہ اُن کی فارسی دانی تھی جس پر وہ ہمیشہ فخر کرتے رہے۔ پندرہ سولہ برس کی عمر میں وہ دہلی آگئے اور اپنی سسرال نواب الٰہی بخش خاں معروف کے یہاں رہنے لگے۔ پچیس برس کی عمر تک اُردو میں طبع آزمائی کرتے رہے لیکن کوئی خاص قدر نہیں ہوئی۔ لوگ اُن کے نامانوس اور مشکل کلام کا مذاق اُڑاتے رہے، جس سے اُن کی چوٹ کھائی ہوئی انا اس طرح تلملا اٹھی ؎

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

اور اُن پر مایوسی اور بیزاری کی کیفیت طاری ہوئی تو اس کا اظہار اس طرح ہوا ؎

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالب کہ دل
دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا جل گیا

غالب ز غم روزگار ناکام گشت
از تنگیٔ دل حلقۂ دامم گشت
ہم غیرت سر بزرگی خامم سوخت
ہم رشک شاہ مددی عامم کشت

اُن کی اِس زخمی انا کو پناہ فارسی دانی میں ملی۔ فارسی کی تعلیم انہوں نے کسی مُلّا عبدالصمد سے لی ہو یا خود ہی مطالعہ و مشاہدہ سے کسبِ کمال کیا ہو، بہرحال اِس زبان کے رموز و نکات سے اُن کی گہری واقفیت اور اس پر انہیں اہلِ زبان کی طرح قدرت تھی۔ فارسی کی شاعری میں انہیں اپنی طبیعت کا راستہ ملا اور فارسی نثر میں انہیں امتیاز و افتخار نصیب ہوا۔ اگرچہ یہ بھی حقیقت ہے کہ اہلِ ایران نے اُن کو اس وقت یا اُن کے بعد قابلِ توجہ نہیں سمجھا لیکن ہندوستان کے فارسی دانوں میں انہوں نے نام پیدا کر لیا تھا۔ اسی کے سہارے اُن کی ٹوٹتی ہوئی خود اعتمادی کو توانائی اور حوصلہ ملا اور وہ مسرور ہو کر کہنے لگے ؎

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اُردو کہ بے رنگِ من است

فارسی ہی کی بدولت دربارِ دہلی تک اُن کی رسائی ہوئی اور وہ "مہر نیم روز" لکھنے پر مامور ہوئے۔ ملکۂ وکٹوریہ، وائسرائے اور



دوسرے انگریزوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے بھی انہوں نے جو قصیدے لکھے وہ بھی فارسی ہی میں لکھے۔ غالب کا زمانہ بھی ایسا تھا جس میں فارسی زبان و ادب کو بڑا عروج حاصل تھا۔ دربار کی زبان ہونے کے علاوہ اُس وقت کی علمی زبان یہی تھی۔ یہی ذریعۂ تعلیم بھی، ذریعۂ مراسلت۔ اُردو تو صرف تفریح اور دل بہلاوے کا مشغلہ تھی۔ ایسا کہ جب لوگ غالب سے اُردو نثر میں کچھ لکھنے کو کہتے تو وہ اس پر تیار نہیں ہوتے تھے۔ بلکہ اُردو نثر لکھنا اپنی ہتک سمجھتے تھے۔ مُنشی شیو نرائن کے نام کے خطوط میں یہ جملے اس کے گواہ ہیں۔

"مگر بھائی، غور کرو، اُردو میں اپنے قلم کا زور کیا صرف کروں گا اور اس عبارت میں معانیٔ نازک کیونکر بھروں گا۔"

(خط مورخہ ۱۱ دسمبر ۱۸۵۸ء)[1]

میاں، اُردو کیا لکھوں۔ میرا یہ منصب ہے کہ مجھ پر اُردو کی فرمائش ہو۔"

(خط مورخہ ۴ جنوری ۱۸۵۹ء)[2]

فارسی دانی کے جس جوہر اور زبان و ادب پر عبور کی جس منزل نے اُن کی انا کو سہارا دے کر انہیں اعتماد بخشا تھا، اُسے دہلی سے نکلتے ہی بڑی ٹھیس پہنچی۔ وہ فروری ۱۸۲۸ء میں کلکتہ پہنچے۔ وہاں کے مشاعروں میں شریک ہوئے۔ اس سلسلے میں اُن کی فارسی غزل کے بعض اشعار پر لوگوں نے اعتراضات کئے اور اپنی تائید میں قتیل کا نام لیا۔ جیسا کہ ہم بعد میں دیکھیں گے، قتیل کے کلام یا کسی تحریر سے اُن کی تائید کا پہلو نہیں نکلتا تھا۔ لیکن معترضین نے شاید اپنے اعتراض کو وزن دینے کے لئے اُن کا نام لیا۔ اُس وقت قتیل کے انتقال کو اگرچہ کچھ زمانہ گزر چکا تھا لیکن لکھنؤ، عظیم آباد، کلکتہ سب جگہوں کے فارسی داں بیشتر مرزا محمد حسن قتیل کے شاگرد یا عقیدت مند تھے اور اُن کے تبحرِ علمی اور فارسی دانی کے معترف تھے۔ اس میدان میں غالب چونکہ اپنا ہم پلہ کسی کو نہیں سمجھتے تھے، اس لئے انہیں لوگوں کا یہ اعتراض بہت بُرا لگا۔ اور انہوں نے قتیل اور ان کے ساتھ سارے ہندوستانی فارسی دانوں کو بُرا بھلا کہہ ڈالا۔

عام حالات میں ایسا ہوتا ہے کہ وقتی غصہ فرو ہو جانے کے بعد آدمی خود اُن اسناد کو دیکھتا ہے جن کا حوالہ دوسروں نے دیا ہو اور اس کے بعد اُن کی تردید کرتا ہے۔ لیکن غالب اپنی فارسی دانی اور محاوراتِ اہلِ ایران کی واقفیت پر ایسے نازاں تھے کہ مرزا قتیل کا نام اُن کے سینے میں ناسور بن کر بیٹھ گیا، کیونکہ اسی نام کا سہارا لے کر سخنورانِ کلکتہ نے اُن پر حرف گیری و انگشت نمائی کی تھی۔ اس نام نے اُن کی عظمت کو چوٹ پہنچائی تھی اور اس مینارے کو متزلزل کیا تھا جو اُن کی خود اعتمادی، شہرت اور علمیت کی بنیاد تھا۔ اس کے سوا قتیل کا کوئی قصور نہیں تھا۔ اُن کی ہمہ دانی کو اس نام سے ایسی چوٹ پہنچی کہ انہوں نے کبھی اس کی کوشش نہیں کی کہ قتیل کی کتابوں کو دیکھیں اور اُن کی علمیت کو جانچیں یا پرکھنے کی کوشش کریں۔

ستم بالائے ستم یہ ہوا کہ غالب جس مقصد کو سامنے رکھ کر کلکتہ گئے، اُس کی تکمیل انہیں لوگوں کی سفارش چاہتی تھی جو قتیل کے معتقد اور اُن کے علمی مرتبے کے بہت قائل تھے۔ دہلی میں مالی پریشانیوں سے تنگ آ کر غالب کو یہ راستہ سوجھا تھا کہ کلکتہ جا کر اپنے لئے ایسی کوشش کریں کہ کمپنی کی طرف سے اُن کی پنشن یا وظیفہ میں اضافہ ہو جائے۔ سفر کے اخراجات اُس زمانے میں بہت زیادہ تھے۔ غالب پہلے ہی سے مقروض تھے۔ سامانِ سفر کا انتظام کر کے لکھنؤ، باندہ، بنارس، پٹنہ ہوتے ہوئے گھوڑے پر منزلیں طے کرتے کلکتہ پہنچے جو ایسٹ انڈیا کمپنی کا صدر مقام تھا۔ دہلی میں اُن کی پریشانیوں کا اندازہ محمد اکرام کے اس بیان سے کیا جا سکتا ہے۔

"۱۸۲۶ء کا سال مرزا کے لئے بڑا نامبارک تھا۔ اُن کے خسر مرزا الٰہی بخش معروف جو نواب احمد بخش کے بھائی تھے، اس سال وفات پا گئے۔ . . پنشن کی جو رقم انہیں ملتی تھی، وہ بہت تھوڑی تھی۔ مرزا کی عمر اُس وقت ستائیس سال کی تھی اور تمام

---

[1] خطوطِ غالب مرتبہ مالک رام ص ۲۴۳ [2] ایضاً ص ۲۴۲



عمر عیش و عشرت کا عادی رہنے کے بعد اب عیش و مسرت کا چشمہ خشک ہوتا نظر آتا تھا۔ اس کے علاوہ جن لوگوں نے ابتدائی توقعات پر قرضے دے رکھے تھے وہ اب مفلسی پیش دیکھ کر تقاضے کر رہے تھے غالب کی حساس طبیعت کے لئے ذریعہ معاش کی تنگی۔ بھائی کی بیماری۔ قرض خواہوں کے تقاضے اور دوسری مصیبتیں ناقابلِ برداشت تھیں[1]"

ان پریشانیوں سے رہائی کی جو صورت انہوں نے نکالی تھی اُس میں اب کئی گستاخ باتیں آپڑی تھیں۔ ایک طرف اپنی زبان دانی کا احساس دوسری طرف جن لوگوں کی مدد سے گوہر مراد حاصل کرنا ہے اُن کے ادبی عقائد اور خیالات۔ اس کشمکش اور نفسیاتی ہیجان سے غالب دوچار ہوئے۔ لیکن وہ ایک بڑی حد تک عملی آدمی تھے۔ وضع داری اور بات پر اڑ کر وہ ایسا کام خراب کرنے پر تیار نہیں تھے۔ مصلحت بینی نے اُن کے ہاتھ تھامے اور انہوں نے وقتی طور پر اپنی اُس انا کا گلا گھونٹ دینا ہی مناسب سمجھا جو اُس وقت حصولِ مقصد کے راستے میں دیوار بن گئی تھی۔ چنانچہ انہوں نے کلکتہ کے ممتاز لوگوں کی خاطر سے کم سے کم زبانی قتیل کی بزرگی اور علمیت تسلیم کر لی اور مثنوی "بادِ مخالف" لکھ کر اس کا اعلان کر دیا۔ اس مثنوی کے بعض مقامات یہاں پیش کئے جاتے ہیں ؎

اے تماشائیانِ بزمِ سخن دے مسیحا دمانِ نادرہ فن
اے سخن پروران کلکتہ دے زبان آورانِ کلکتہ
اے عزیزانِ این سوادِ عظیم دے فراہم شدہ رحمتِ اقلیم
ہمچو من آرمیدۂ این شہر بہر کارے رسیدۂ این شہر
اسد اللہ بخت برگشتہ در غم و تیغ جگر سرگشتہ
بہ تظلّم رسیدہ است این جا بہ اُمید آرمیدہ است این جا
کار احباب ساختن رسم است میہماں را نواختن رسم است
آں رہ و رسمِ کار سازی کو شیوۂ میہماں نوازی کو
چہ بلاہا کشیدہ ام آخر کہ بہ اینجا رسیدہ ام آخر
نہ ہمیں نالہ و فغاں بہ لبم تن و جاں آفریں کہ جاں بہ لبم
مو بہ جوں موے کردہ است مرا غصّہ مدح موے کردہ است مرا

ایک طرف سے معافی دے دی اور اپنی صلح جوئی اور انصاف پسندی وغیرہ کا ذکر کرنے کے بعد انہوں نے اس مثنوی میں قتیل کی تعریف بھی کردی ہے۔ اگرچہ جابجا ہجو ملیح کے پہلو موجود ہیں لیکن پھر بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وقت کے تقاضے کو محسوس کرکے غالب نے مصلحت کے مطابق یہ قدم اٹھایا ہے۔ اس حصے کے کچھ شعر یہ ہیں ؎

می شوم خویش را بہ صلح دلیل می سرایم نوائے مدحِ قتیل
تا نماند زمن دگر گلہٗ رسد از پیرواں دے صلہٗ
گرچہ ایرانیش نہ خوانم گفت سعدیٔ ثانیش نہ خوانم گفت
لیک از من ہزار بار بہ است از من و ہمچو من ہزار بہ است
من کفِ خاک و او سپہرِ بلند خاک را کے رسد بچرخ گزند
مرحبا سازِ خوش بیانیٔ او حبذا شورِ نکتہ دانیٔ او

[1] محمد اکرام، حیاتِ غالب ص۶۹



لطفش آب حیات را ماند — در روانی فرات را ماند
نثر او نقش بال طاؤس است — انتخاب صراح و قاموس است
ملا شاہے کہ در علم و حرف — کردہ ایجاد نکتہ ہائے شگرف
علم ہندوئے پارسی دانش — ہندیاں سر خط فرمانش
ایں رقم ہا کہ ریخت کلک خیال — بود سطرے ز نامۂ اعمال
از من نارسائے ہیچ مداں — معذرت نامہ ایست بے یاراں
چو کہ آید بعذر خواہی ما — رحم بر ما دبے گناہی ما

آشتی نامہ و وداد پیام
ختم شد والسلام والاکرام

شورا کلکتہ کی دل دہی کے ساتھ انہیں اپنے دل کو مارنے کی سزا تو بھگتنی ہی پڑی، لیکن کلکتہ میں مستقل کی بہتری اور مقصد میں کامیابی کی توقع نے اُن کی نگاہوں کے اُفق کو مسوّر رکھا۔ کلکتہ میں اُن کے خلاف جو ہنگامے کھڑے ہوئے اُن کے بارے میں وہ اپنی تسلی کے اِس طرح پہلو نکالتے رہے ؎

تھی وطن میں شان کیا غالبؔ کہ ہو غربت میں قدر — بے تکلف ہوں وہ مشتِ خس کہ گلخن میں نہیں

کہتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالبؔ — تم کو بے مہریِ یارانِ وطن یاد نہیں

لیکن حالات سے مجبور ہو کر اپنی مقصد برآری کے لئے انہوں نے جس طرح اپنے غرور کو کچلا تھا، اپنے احساسِ برتری کا گلا گھونٹا تھا، اُس نے اُن کے اندر ایسا نفسیاتی ردِ عمل پیدا کیا کہ قتیل کے نام سے انہیں نفرت ہو گئی۔ اگرچہ غم و غصّہ کا اصل مرکز کلکتہ کے اہلِ علم تھے، لیکن چونکہ اُن کی حیثیت غالبؔ کی نظروں میں حاجت روا کی تھی اِس لئے اُن سے غالبؔ کی انا کو، اُن کی فارسی دانی کے دعوے کو، اُن کی علمی بزرگی و برتری کو جو صدمہ پہنچا تھا، وہ سب قتیل پر منتقل ہو گیا جسے نفسیاتی اصطلاح میں "تبادلۂ مرکز" کہا جا سکتا ہے۔ اِس لئے کہ کلکتہ سے ناکام واپس آنے پر بھی انہوں نے قتیل کو معاف نہیں کیا جو بالواسطہ اُن کے غم و غصّہ کا مرکز بن گئے تھے اور حالات سے مجبور ہو کر جن کی بزرگی کا اعتراف انہیں کرنا پڑا تھا۔

اختلاف و اتفاق علمی دنیا کا معمول ہے اور اِس سلسلہ میں آزادیٔ رائے کو روکنا علم کی ترقی کو مسدود کرنا ہے، لیکن اختلافِ رائے میں سنجیدگی اور متانتِ علمی مباحث کا بنیادی اُصول ہے جس کا مطالبہ ہر اہلِ علم سے کیا جا سکتا ہے۔ علمی اختلافات کو ذاتیات کی سرحدوں میں لے جانا نہ صرف علمیت کی توہین ہے، بلکہ اس سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ معترض کا مقصود علم کی وسعت یا معلومات کی صحت نہیں بلکہ ذاتی عناد کا بخار نکالنا ہے۔ اُوپر جو اسباب بیان کئے گئے، اُن کی بنا پر غالبؔ نے قتیل کو اپنا بہت بڑا دشمن سمجھ لیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جہاں یہ نام آتا ہے وہ اپنی نفرت چھپا نہیں سکتے اور اُبل پڑتے ہیں ؎

"عرض کرتا ہوں کہ لطائف ایسا ہوا کہ جب تک فرید آباد کا کھتری دیوالی سنگھ تخلص بہ قتیل جس کو حضرت نے مرحوم لکھا ہے، اس کی تصدیق نہ کرے تب تک اس کا کلام قابلِ استناد نہ ہو۔ قتیل اساتذۂ سلف کے کلام سے قطعاً آشنا ہی نہیں۔ اُس کے علمِ فارسی کا ماخذ ان لوگوں کی تقریر ہے کہ نواب سعادت علی خاں کے وقت میں ممالکِ مغربی کی طرف سے لکھنؤ میں آئے اور ہنگامہ آرا ہوئے۔ بیشتر سادۂ کشمیری یا کابلی و قندھاری و ہراتی اِحیاناً کوئی عامۂ اہلِ ایران میں سے ہو۔ مانا کہ عظمائے ایران میں سے بھی کوئی ہوگا۔ تقریر اور ہے، تحریر اور ہے۔ اگر تقریر بعینہٖ تحریر میں آیا کرے تو

خواجہ نصیر طوسی سے اور شرف الدین علی یزدی اور ملا حسین واعظ کاشفی اور ظاہر وحید یہ سب نثر میں کیوں خونِ جگر کھایا کرتے۔ وہ سب طرح کی تحریریں خلاف دیوانی سنگھ قتیل ستوفی کے یہ کلیجہ ہیں اور ان لکھی ہیں نہ رقم فرمایا کرتے۔[۱]"



"اہل ہند میں سوائے امیر خسرو کوئی مسلم الثبوت نہیں۔ ... قتیل علیہ ما علیہ نے تباہ کیا۔ رہا سہا غیاث الدین رام پوری نے کھو دیا۔ اُن کی سعی قسمت کہاں سے لاؤں جو صاحبِ عالم کی نظر میں اعتبار پاؤں۔ حاشا بللہ غور کرو کہ وہ خرابِ ناشخص کیا کہتے ہیں اور میں غصہ و درد مند کیا بکتا ہوں۔ واللہ، قتیل فارسی شعر کہتا ہے اور غیاث الدین فارسی جانتا ہے۔ میرا یہ خط پڑھ کر یہ نہیں کہتا کہ خواہی نخواہی پڑھو، قوتِ ممیزہ سے کام لو، ان غولوں پر لعنت کرو، سیدھی راہ پر آجاؤ۔[۲]"

"چار شربت اور غیاث اللغات کو حیض کا لتہ سمجھتا ہوں۔ ایسے گمنام چھوکروں سے کیا مقابلہ کروں گا۔[۳]"

"وہ گدھا گھس اور عبدالواسع ہانسوی ... اور وہ اُلو کا پٹھا قتیل"

یہ عبارتیں کسی ادبی مضمون کا حصہ نہیں بلکہ اُن خطوط کی ہیں جو غالب نے اپنے دوستوں یا شاگردوں کو لکھے اور اگرچہ لکھنے کے وقت اُن کے شائع ہونے کا خیال نہیں تھا لیکن غالب کی زندگی میں اُن کی منظوری لے کر انہیں شائع کیا گیا۔ اس لئے اُن سے غالب کے نفسیاتی ردِ عمل کے متعلق نتیجہ نکالنا غلط نہیں ہے۔

غالب کے غم و غصہ، طنز و تشنیع، سب و شتم کے بعد ان اعتراضات کی نوعیت کا بھی اندازہ کرلینا چاہیئے جنہیں قتیل پر وارد کر کے غالب اُن کی اصلیت کے منکر ہوئے اور خود مذہب سے بڑی حد تک بیگانہ اور اس کے احکام کی خلاف ورزی کرنے کے باوجود قتیل کو دائرۂ اسلام سے خارج کر دینے کے درپے ہو گئے۔ یہاں تک کہ انہیں مرحوم تک لکھنے پر تیار نہیں۔ ایک اعتراض تو اوپر کے اقتباس میں نظر آتا ہے کہ قتیل اساتذۂ سلف کے کلام سے قطعاً نا آشنا ہیں۔ اگرچہ یہ اعتراض مبہم ہے، کیونکہ کسی تحریر کی نشاندہی کر کے یہ نتیجہ نہیں نکالا گیا۔ پھر بھی مرزا محمد حسن قتیل کے علمی مرتبے کے بارے میں عبدالحلیم شرر کی اس عبارت سے اندازہ کیا جا سکتا ہے:

"لکھنؤ کے ابتدائی عروج میں مُلّا فائق اور مرزا قتیل کا نام مشہور ہوا جو ایک تو مسلّم فارسی داں تھے۔ خود مرزا قتیل مذاقاً کہا کرتے تھے کہ 'گوئے کتابِ مرا مسلماں کردی' مگر سچ یہ ہے کہ فارسی کی تعلیم اس کے شوق اور کمالِ فارسی دانی کی آرزو نے انہیں مسلمان ہونے پر مجبور کر دیا۔ انہوں نے محض اپنے شوق میں ایران کا سفر کیا۔ برسوں شیراز و اصفہان اور تہران و آذربائیجان کی خاک چھانی اور ادبِ فارسی کے اُس کمال کو پہنچ گئے کہ خود اہلِ زبان بھی ایسے باکمال زبان داں پر حسد کریں تو تعجب کی بات نہیں۔[۴]"

قتیل کی مشہور تصنیفیں چار شربت۔ نہر الفصاحت۔ شجرۃ الامانی۔ رقعاتِ قتیل وغیرہ شائع ہو چکی ہیں اور عام طور پر ملتی ہیں۔ ان سے بھی ان کی وسعتِ نظر اور فارسی دانی کا اندازہ ہوتا ہے۔ مثلاً نہر الفصاحت سے یہاں ایک مقام پیش کیا جاتا ہے۔ جہاں انہوں نے ہندوستان کے فارسی دانوں کی غلطیاں بیان کی ہیں اور ایران کے مختلف علاقوں کی زبان کے فرق کو

۱؎ عودِ ہندی صفحہ ۳۰ (رام نرائن لال ۱۹۲۹ء) ۲؎ ایضاً صفحہ ۳۱ ۳؎ اردوئے معلی خطوطِ غالب صفحہ ۱۶۴ ۴؎ گذشتہ لکھنؤ صفحہ ۱۱۰



مثالیں دے کر واضح کیا ہے جس سے اُن کے شعور کا پتہ چلتا ہے۔

"در ذکر زبان فارسی می گویم کہ برائے مقلد شعر فارسی ایران و توران ہر دو مستند است و از توران زبان آذر بائیجان بہتر است۔ اہل خراسان و اہل آذربائیجان فصیح ہماند و شیرازیان و اصفہانیان بہ از ہمہ۔ و اشراف و اخلاف و شہرے و کوہے ایران صاحب زبان اند۔ در وقتِ حرف زدن مرزا صائب و غنی کشمیری ہر دو برابر اند و زبان ہر دو شستہ۔ مگر بعضے اہلِ زبان مخرج بعضے حرف ادا نمی نمایند و در ہر فرقہ و ہر صنف یافتہ می شوند کہ بعضے مخرج را ادا نمی دارند۔ درین صورت لفظے کہ از زبان اہل زبان برآید غلط باشد مثل غلطوم فیل بجائے خرطوم فیل یا دیفار بجائے دیوار و کہ بہ دہانے بجائے کاردار یا آرالستیں بجائے آستین یا ستو بجائے شب و کلم بجائے قلم۔ دیگر از شعرائے ایران خطا در بحر یا قافیہ ہم اتفاق ہم شدہ باشد و تصرف ایشان در الفاظ عربی بر وضع خود شان و در الفاظ عجمی بطریق عرب صحیح بود۔ مثل طلبیدن و فہمیدن و رقصیدن در الفاظ عربی و ناسد ستمند و مرلف و مریب و نزاکت و عیران در الفاظ فارسی۔ دیگر لفظے کہ چار شاعر عالی مرتبت استعمال نمودہ باشد سند باشد اگرچہ در اصل غلط بود یا دہ شاعر موزوں طبع ایران اتفاق بران نمایند یا علی العموم تلفظ مآں روا دارند"۔[1]

سند ماننے میں کون سی باتیں ملحوظ رکھنا چاہئیں اور اہلِ زبان کے درمیان کیا فرق ہے' اِن سب کے بارے میں قتیل کی رائے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے فارسی کے کلاسیکی ادب کا غائر مطالعہ ہی نہیں کیا بلکہ کتابوں سے ہٹ کر اُسے ایک زندہ زبان کی حیثیت سے بھی دیکھا تھا اور مختلف علاقوں کے فرق سمجھتے تھے۔ غالب بھی قتیل کے اِس شعور کو جانتے تھے۔ اسی لئے انہوں نے اپنے ایک اقتباس میں تحریر و تقریر کے فرق پر زور دیا ہے اور قتیل کو گرانے کی کوشش میں یہ کہا ہے کہ تقریر اور محاوروں پر قابو ہونا اچھی تحریر لکھنے والے کی پہچان نہیں ہے۔ غالب کے اس خیال میں کتنی سچائی ہے اِسے کہنے کی ضرورت نہیں۔

مرزا غالب چودھری عبدالغفور کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

"کالپی کے نواب زادوں میں سے ایک صاحب قتیل کے شاگرد تھے۔ میں نے ایک رقعہ قتیل کا اُن کے نام دیکھا ہے کہ قتیل اُن کو لکھتا ہے کہ جامہ گزاشتن معنی مردن مسلّم لیکن بہت احتیاط کیا کرو' موقع دیکھ لیا کرو جب لکھا کرو ۔۔۔۔ میں کہتا ہوں کہ احتیاط کیا اور موقع کیا' فلاں مرد یہاں جامہ گزاشت"۔[2]

جامہ گزاشتن کے بارے میں قتیل نے ایک خط میں احتیاط کی تاکید کی ہے جو مطبوعہ رقعاتِ قتیل میں موجود ہے۔ قتیل کے الفاظ یہ ہیں:

"۔ دیگر این کہ در خطِ شما لفظ جامہ گزاشتن در حق شخصے بود۔ آیندہ مذکور او ہیچ نباید نوشت۔ خبرہائے اراجیف از زبان عوام معتبر نیست۔ اگر چیزے دلالت بر عظمت و جبروت او داشتہ باشد مضائقہ ندارد۔ والّا ہر چہ ہر در خصوصاً عبارتے کہ در او لفظ جامہ گزاشتن و مثل آن باشد ہیچ صورت مناسب نیست۔ ہر چند این اصطلاح را کم کسے می داند لیکن بقرینہ دریافت می تواند شد۔ آیندہ اگر ہیچ چیزے بگوش خورد بہتر اینست کہ ننویسید چرا کہ اگر اصلے دارد بعد دو روز شما ہم خواہید شنید و اگر دروغ است نوشتن آن خالی از قباحت نیست۔ و این ہمہ آفت ہا در تصریح نام شخص است۔ اگر بکنایہ باشد ہیچ قباحتے ندارد ۔۔۔۔ با تمام عبارت در ترکی نوشتن بہتر است کہ احدے بران مطلع نمی شود"۔[3]

یعنی آپ نے ایک شخص کے مرنے کی خبر (جامہ گزاشتن) اپنے خط میں لکھی ہے۔ جو خبریں عوام اور کم درجہ لوگوں سے ملیں' اُن پر بھروسہ نہیں کرنا چاہئے۔ اگر بزرگی اور شان و شوکت کی بات ہو تو مضائقہ نہیں لیکن ایسی عبارتیں لکھنا جن میں جامہ گزاشتن یعنی مرنے کا ذکر

۱؎ نہر الفصاحت۔ ص ۲۱ ۲؎ عودِ ہندی ص ۶۶ ۔ ۳؎ رقعاتِ قتیل، رقعہ ۵۱



ہو تو مناسب نہیں۔ اگر یہ اس اصطلاح کو کر لوگ جانتے ہیں لیکن انداز سے تو سمجھا ہی جا سکتا ہے۔ آئندہ اگر ایسی باتیں آپ کے کانوں تک پہنچیں تو بہتر ہے کہ انہیں نہ لکھیں کیونکہ اگر حقیقت ہوگی تو دونوں میں سے کسی کو نہیں لگے گی اور اگر جھوٹ ہے تو اس کا لکھنا قباحت سے خالی نہیں۔ اور یہ تمام زحمتیں اس آدمی کا نام واضح کر دینے کی وجہ سے ہیں۔ اگر کنایہ کے طور پر لکھیے تو کوئی برائی نہیں یا پوری عبارت ترکی زبان میں لکھنا بہتر ہے کہ وہی اور اس سے واقف نہ ہو ۔۔۔ اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ قتیل نے کسی خاص آدمی کے مرنے کی افواہ کے بارے میں احتیاط برتنے کی تاکید کی ہے۔ خامہ گزاشتن کے محل استعمال کے متعلق کچھ نہیں کہا۔ غالباً غالب نے خود یہ خط نہیں دیکھا، بلکہ اس کے بارے میں کسی سے سنا ہے اور اس طرح غلط سمجھ کر انہیں قتیل کی زبان دانی پر چوٹ کرنے کا ایک اور حربہ مل گیا، ورنہ اس اعتراض میں کوئی اصلیت نہیں ہے۔

قتیل پر غالب کا ایک اور اعتراض اس طرح ہے:

"یہ شخص مدعی ہے کہ کدہ کا لفظ سوائے پانچ چار اسم کے اور اسم کے ساتھ ترکیب نہیں پاتا۔ پس آرزو کدہ۔ دیو کدہ۔ نشتر کدہ اور امثال ہزار جگہ اہل زبان کے کلام میں آیا ہے، وہ نادرست ہے۔ میں اور آپ بیٹھیں اور اس کے خرافات پڑھے جائیں اور خوش ہوں کیوں؟ اس پر غور فرمائیں تب معلوم ہو کہ یہ کتنا لغو اور فارسی دانی سے کتنا بیگانہ ہے[1]"

اس اعتراض کی حقیقت جاننے کے لئے پہلے قتیل کی اصل عبارت سے رجوع کرنا مناسب ہوگا۔

"دیگر کدہ معنی خانہ باشد بانیج لفظ ملحق شدہ سوائے آں مسموع نیست۔ بت کدہ وغم کدہ وآتش کدہ و مے کدہ و گلشن کدہ و غیر آں چوں آب کدہ نمی دانم کہ درست است یا نادرست یعنی ایں ہا اصول اند و سوائے ایں ہیچ ایکہ درکلام اساتذہ یافتہ باشد فروغ ایں ہا باشد۔ حصر مقصود نیست و فروع دراصل داخل است چوں حیرت کدہ و سنبل کدہ و ویران کدہ و حسرت کدہ و ماتم کدہ و راحت کدہ و تغافل کدہ و جہنم کدہ و بہشت کدہ و ہر دو در گلشن کدہ داخل است چراکہ گلشن جائے گل معنی بود و ماتم کدہ و عشرت کدہ در تحت غم کدہ داخل اند اول مراد معنی دوم بسبب ضد بودن، نظر برنظیر است[2]"

اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ قتیل کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کدہ کا لفظ صرف انہیں چند الفاظ کے ساتھ لایا جائے بلکہ انہوں نے اصول بتایا ہے کہ اساتذہ نے اصولی طور پر پانچ قسم کے الفاظ کے ساتھ اسے استعمال کیا ہے ان کی یہ بنیاد سمجھ لینے کے بعد اسے اس قسم کے دوسرے الفاظ کے ساتھ ترکیب دیا جا سکتا ہے جیسے حیرت کدہ و سنبل کدہ وغیرہ۔ اس سلسلے میں بھی غالب کے اعتراض کی بنیاد غلط نظر آتی ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے کسی محض سنائی بات پر یقین کر کے قتیل پر فرد جرم عائد کر دی ہے۔

اقسام نثر کے بیان کے سلسلے میں غالب اور قتیل کے بیانات کا فرق بہت واضح ہے۔ اس سلسلے میں غالب نے ایسا غلط پہلو اختیار کیا کہ قتیل کے عقیدت مندوں کا کیا ذکر، غالب کے شاگردوں اور نیاز مندوں کے گروہ میں بھی لوگ ان سے شاکی ہوئے۔ وہ ایک خط میں صاحب عالم کو مخاطب کر کے لکھتے ہیں:

"نثر مرجز کے باب میں پیر و مرشد کو اتنا تامل کیوں ہے۔ یہ جو شرح آپ نے لکھی ہیں سوائے اس نثر کے جس کو آگے لکھوں گا یہ تو سب مسجع ہیں یعنی پہلے فقرے کا ہر لفظ وزن میں موافق ہو دوسرے فقرے کے لفظ سے۔ نظم میں یہ صنعت آ پڑے تو نظم کو مرصع کہیں گے اور نثر میں واقع ہو تو نثر کو مسجع کہیں گے۔ حضرت کہ اس نثر کو مرجز کہتے ہیں یا وہ نثر مسجع کی مثال ہم کو

---

[1] عود ہندی ص۲۱ [2] مہر الفصاحت ص۲۵



وہیں۔ زنہار زنہار یہ نثر مرجز نہیں مسجع ہے۔ ہاں یہ نثر مرجز ہے؛ صاحبا مشفقا شفیقا دلی ربا
الطافکم الی الابد بعد تبلیغ بندگی و سپار ضمیر منیر روشن باد ___ اگر وہ نثر کہ جس کو
میں نے مسجع کہا ہے مرجز ہے تو اس کمت نثر کا کیا نام ہے۔ نہیں وہ مسجع ہے اور یہ مرجز ہے۔
میں تو بہت مختصر مفید لکھ چکا ہوں آپ نہ مانیں تو کیا کروں ___ وزن نہ ہو قافیہ ہو وہ "مقفیٰ" وزن ہو قافیہ نہ ہو
وہ مرجز ہے۔ الفاظ متقابلین وزن میں برابر ہوں وہ مسجع۔ اس صنعت کو متیسّر شر مقفیٰ میں صرف کرتے ہیں اور جا ہو
قافیہ کا التزام نہ کرو۔ بہر رنگ اقسام ثلثہ نثر یہی ہے اس سے زیادہ نہ مجھ کو علم ہے نہ یارائے کلام۔ قتیل لکھنوی اور
غیاث الدین ملائے مکتبی رام پوری کی قسمت کہاں سے لاؤں کہ تم جیسا شخص میرا معتقد ہو اور میرے قول کو معتمد سمجھے[1]
معانی و بیان کی کتابوں میں نثر کی جو تین قسمیں ملتی ہیں ان میں سے ایک نثر عاری ہے یعنی سادہ عبارت۔ یہ قسم غالب کے ذہن سے
اُتر گئی ہے اس لئے وہ "مسجع اور مقفیٰ" کو الگ الگ قسمیں قرار دیتے ہیں حالانکہ دونوں ایک ہی قسم کے دو نام ہیں "مسجع اور مقفیٰ" ایک
ہی قسم ہے۔ اور نثر کے بیانات میں مسجع کو قافیہ کے ہم معنی لکھتے ہیں۔ غالب نے مسجع کی جو تعریف بیان کی ہے کہ الفاظ متقابلین وزن
میں برابر ہوں۔ یہی تعریف نثر مرجز کی بھی بیان کی ہے کہ وزن ہو قافیہ نہ ہو، اس طرح اُن کے یہاں نثر مرجز اور نثر مسجع کی ایک ہی تعریف[2]
ہے۔ شاید یہی بات صاحب عالم نے غالب کو لکھی ہو اور قتیل کا حوالہ بھی دیا ہو جس پر وہ بہت برہم ہو کر لکھتے ہیں:

"اصحاب ثلثہ کی عبارت نثر مرجز کے باب میں آئی ہی ہے: وزن دارد سجع نہ دارد۔ خدا کے واسطے وزن تقطیع شعر کو کہتے ہیں وہ مثال کی نثر میں کہاں ہے۔ سجع اُس کو کہتے ہیں کہ کلمات متقابلین وزن میں برابر ہوں۔ یہ صنعت مثال کی نثر میں موجود ہے۔ جو ہے اس کا سبب جو نہیں اس کا ثبوت کیونکر مانوں۔ کیا آپ کی یہ مرضی ہے کہ الفاظ کے ہم وزن ہونے کو وزن تقطیع شعر کو سجع مان لوں۔ میں تو نہ مانوں گا، آپ کو اختیار ہے .. عبدالواسع پیمبر نہ تھا، قتیل نہ پیمبر تھا، واقف غوث الاعظم نہ تھا، میں یزید نہیں ہوں، شمر نہیں ہوں۔ مانتے ہو مانو نہ مانو تم جانو۔"

اب اقسام نثر کے سلسلے میں قتیل کی عبارت اُن کی مشہور کتاب "چار شربت" سے پیش کی جاتی ہے

"نثر را سہ گونہ بنا گذاشتہ اند۔ عاری و مسجع و مرجز۔ عاری عبارت از نثرے باشد کہ از وزن و قافیہ و دیگر تکلفات معرّیٰ بود و مسجع نثریست کہ آخر فقرۂ آں لفظے آرند و مقابل آں لفظ در فقرۂ دیگر لفظے باشد کہ در روی و ردف و قید و تاسیس و دخیل و حرف وصل و غیراں موافق با ایں لفظ باشد (یعنی ہم قافیہ ہو) و مقید بہ وزنے نہ بود۔ و مرجز نثرے باشد کہ از قافیہ پاک بود اما فقرۂ اولیٰ با فقرۂ ثانی مساوی الوزن باشد"[3]

یعنی عاری وہ نثر جس میں نہ وزن نہ قافیہ۔ مسجع وہ جس میں وزن نہ ہو قافیہ ہو اور مرجز وہ جس میں قافیہ نہ ہو وزن ہو۔ اس واضح تعریف کے سامنے معلوم نہیں وہ کونسی نفسیاتی گتھی تھی جس نے غالب کو اس سے اختلاف کرنے اور اپنی یادداشت کو ٹٹولنے پر مجبور کیا تاکہ قتیل سے ناراض ہو سکیں اور اپنے ایک عقیدت مند کو مطمئن نہ کر سکیں تو اپنے کو کو سے بیزار آئیں۔ حالانکہ چودھری عبدالغفور کے نام ایک خط میں وہ نثر کی قسمیں اسی طرح بیان کر چکے ہیں جس طرح قتیل اور دوسرے علمائے ادب نے لکھی ہیں:

"بندہ کی تحقیقات یہی ہے کہ نثر تین قسم پر ہے۔ مقفیٰ، قافیہ ہے وزن نہیں۔ مرجز، وزن ہے اور قافیہ نہیں۔ عاری نہ وزن ہے نہ قافیہ۔ سجع ہی مقفیٰ ہے کہ دونوں فقروں میں الفاظ ملائم اور مناسب ہمدگر ہوں۔ نظم میں یہ صنعت آ پڑے تو اس کو مرصع کہتے ہیں اور نثر اس صنعت پر مشتمل ہو تو اس کو مسجع کہتے ہیں۔ اس قاعدے کو نہ عبدالرزاق

---

[1] عود ہندی ص ۲۷۔ [2] عود ہندی ص ۲۹۔ [3] چار شربت ص ۵۹

بخل نکلتا ہے نہ صاحب قلم، بہت کار، ادیب　　معرو بخشے[1]

س لیاقت سے واضح ہے کہ سچ اور نقل کو الگ الگ قسمیں　قرار دیتے ہیں غالب بھا علمی پرستے اور قتیل کی مخالفت میں

انہوں نے ایسا [illegible] نظر اپنایا جس نے انہیں اپنے شاگردوں　کی نظروں میں بھی صدی اور سچ تحت ٹھہرایا اور عام قارئین

کو ان کی دل ریاست داری پر شبہ ہوا۔

" تمام عمر اعمالت کی روشنی میں غالب ایسی انا کے ستم زدہ دکھائی دیتے ہیں۔ دہلی سے باہر نکلتے ہی انہیں فارسی کی علمی دنیا پر قتیل طاری نظر آیا۔ اودھ سے بنگالہ تک قتیل کی علمیت کے چرچے تھے، اُن کی کتابوں کا ذکر تھا۔ انجانی ہوئی دہلی میں رہ کر اپنے کو فارسی کا سب سے بڑا عالم سمجھے والا اس نئی دنیا میں اپنے کو غیر اہم نظر آنے لگا، باوجود اس کے کہ اس وقت تک اس کا کل سرمایہ شعر کے چند اجزا پر مشتمل تھا جب کہ قتیل نے متعدد علمی کتابیں تصنیف کی تھیں جنہیں مکتبی پڑھتے تھے۔ ان کے مقابلے میں لوگ غالب کو خاطر میں کیسے لا سکتے تھے۔ پردیس میں ہر جگہ قتیل کے معترف نظر آئے اور حالات نے اُن کو بھی ان کی بزرگی کے آگے سر جھکانے پر مجبور کر دیا۔ غرور کی اس شکست اور شخصیت کے اس کچلے جانے کے احساس نے غالب کے اندر ایسی گتھیاں پیدا کر دیں کہ قتیل کا نام آنے کے بعد وہ دلائل و براہین سے بیگانہ ہو کر حسد و غضب سے کھولنے لگتے اور سنجیدہ رائے دینے کے بجائے قتیل کو گرانے، انہیں کاہل اور حقیر ثابت کرنے کا کوئی پہلو اُٹھا نہ رکھتے تھے۔

غالب محقق نہیں تھے، شاعر تھے۔ قاطع برہان کے علاوہ کسی ادبی موضوع پر انہوں نے کوئی کتاب بھی نہیں لکھی۔ اُن کے جو بیانات اوپر پیش کئے گئے ہیں وہ اُن کے خطوط سے لئے گئے ہیں جن کی نوعیت بھی اور غیر رسمی (CASUAL) تحریروں کی سی ہے۔ قتیل کے خلاف وہ ادھر اُدھر سے جو کچھ سن لیتے اُسے اپنے رنگ میں رنگ کر اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کے لئے لکھ دیتے تھے۔ اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ جہاں تک قتیل دشمنی کا تعلق ہے، غالب علم کی سنجیدہ فضا سے ہٹ کر ایک نفسیاتی مریض کی شکل میں نظر آتے ہیں جو عصبیت کا شکار، اپنی فطرت کے خم و پیچ میں گرفتار ہے۔

[illegible] غالب از ذوق سخن خوش بود اے ارباب دل　مرا لیجئے شکیب دیارهٔ انصاف یاران را

ـــــــــ

[1] عود ہندی ص ۲۲

بقیہ "جہانِ غالب" صفحہ ۱[illegible]

(۱۷) شاہ محمد سے جن کے نام کے قبل غالب نے لفظ "مولوی" لکھا ہے، غالب ناواقف تھے، اُن سے فضل حق خیرآبادی کے یہاں ملاقات ہوئی۔ دورانِ گفتگو میں معلوم ہوا کہ وہ ٹونک جا رہے ہیں اور یا پھر کتاب ہیں۔ غالب نے اُن کی معرفت تفضل حسین خاں کو سلام بھیجا تھا۔ اُن سے غالب کو خبر ملی تھی کہ ارشاد حسین اور میر احمد حسین تفضل حسین خاں کے پاس پہنچ چکے ہیں، یا پہنچنے والے ہیں۔ (خط ۶ بنام تفضل حسین خاں، ۲ جنوری ۱۸۵۴ء، باغ دو در)

(۱۸) بانک: "طالع یار خاں کہ دوست دیرینہ، مست بارگرانی بر دوش من نہاد۔ پارسی ترجمہ کردن ہندی حکایتی کہ بر گذارش آئین تیمارداری بانک مشتمل بود از من خواست و سرانجام این خدمت را در لیۂ خوشنودی نواب، مراد او روائی [illegible]ک) ... وانمود۔ چون زلہ خوار خوان جود آن والا جاہ بودم۔ صحیفہ کہ دیباچہ و خاتمہ تیر دار د، ترتیب دادہ نگار قربانی سپردم و در صد مستی براں افزودم۔ داد خوبی عنوان دیباچہ از شما او لا آوار۔ مولوی ظہور الدین علی ثانیاً میخواہم کہ تا نگرند کہ ممدوح را دوائی دیباچہ نکدامی زبان، و در ستائش بی باک سخن را بکدام پایہ بردہ ام، و با این ہمہ چہ از دیباچہ و چہ دلہ جریدہ نوی طرز نگارش از دست رفتہ، و گفتار بیجان بر روش خاصۂ خویش بر جای ماندہ است۔ با این ہمہ کہ گفتم، دانم کہ بادہ تن من در سحر طرازی این زبان زواست۔ کہ سدگان نواب۔ گفتار مرا پسندند" (خط ۲۔ بنام تفضل حسین خاں، باغ دو در)

ڈاکٹر سہیل بخاری

غالب کے شعروں کی اُردو

مرزا غالب فارسی اور اُردو کے بہت بڑے شاعر ہوئے ہیں اور انہوں نے اپنے پیچھے فارسی شعروں کا ایک کلیات اور اُردو غزلوں کا ایک دیوان چھوڑا ہے۔ پر وہ فارسی کو جی جان سے چاہتے تھے اور اپنی فارسی کو ایرانیوں کے برابر جانتے تھے، اسی لئے انہیں اپنے فارسی شعروں پر گھمنڈ تھا اور اُن کو وہ اُردو کے شعروں سے بہت اونچا سمجھتے تھے، جیسا کہ وہ خود کہتے ہیں:۔

فارسی بیں تا ببینی نقش ہائے رنگ رنگ بگذر از مجموعۂ اُردو کہ بے رنگِ من است

یہ سچ تو یہ ہے کہ غالب نے جو نام پایا وہ اپنی اُردو غزلوں ہی سے پایا۔ اُن کے فارسی کے شعر تو مٹھی بھر لوگوں تک رہے اور اُردو کی غزلیں بچے بچے کی زبان پر جا چڑھیں۔

غالب نے فارسی پڑھی بھی بہت تھی اور انہیں اس کا محاورہ بھی بہت ہو گیا تھا، اسی لئے وہ اس کے رسیا تھے۔ وہ اُردو کو اس کے سامنے بہت چھوٹی سی بولی سمجھتے تھے اور اس میں شعر کہنے کو اپنی جگہ سے بہت گری ہوئی بات جانتے تھے، پر جب انہوں نے عام لوگوں میں فارسی سے اُردو کا چلن بڑھا ہوا پایا تو انہیں اُردو میں بھی شعر کہنے پڑے۔ پہلے پہل کے ان شعروں میں فارسی سے غالب کا لگاؤ اچھی طرح جھلکتا ہے اور ایسا لگتا ہے جیسے غالب فارسی باندھے اُردو میں شعر کہہ رہے ہوں۔ کچھ شعروں میں تو یہ حال ہے کہ بس ردیف کا ایک بول اُردو سے لے لیا ہے باقی پورے کا پورا شعر فارسی کا ہے۔ قصیدوں میں ایسے شعروں کی اتنی بہتات ہے کہ ان پر تو فارسی کلام کا دھوکا ہو جاتا ہے اور ایسے شعروں کی کوئی گنتی ہی نہیں جن میں ایک مصرع فارسی کا ہے اور دوسرے میں بھی فارسی کے کتنے ہی بول آ گئے ہیں۔ یہاں ایسے کچھ شعر غزلوں سے نکال کر لکھے جاتے ہیں، جن میں بس ایک آدھ ہی بول اُردو کا آیا ہے۔

شمارِ سبحہ مرغوبِ بتِ مشکل پسند آیا تماشائے بیک کف بردنِ صد دل پسند آیا
نقشِ پائے بتِ عیار بآغوشِ رقیب پائے طاؤس پئے خامۂ مانی مانگے
بطوفاں گاہِ جوشِ اضطرابِ شامِ تنہائی شعاعِ آفتابِ صبحِ محشر تارِ بستر ہے
نشّہ ہا شادابِ رنگ و سازہا مستِ طرب شیشۂ مے سروِ سبزِ جوئبارِ نغمہ ہے
دل خوں شدۂ کشمکشِ حسرتِ دیدار آئینہ بدستِ بتِ بدمستِ حنا ہے
ساقی بجلوہ دشمنِ ایمان و آگہی مطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے

غالب نے فارسی کے ایسے بھی کچھ بول اپنے شعروں میں برتے ہیں جو فارسی میں ایک خاص معنی دیتے ہیں۔ پر ان معنوں میں اُردو بول چال میں آج تک اُن کا چلن نہیں ہو پایا ہے جیسے مگر (شاید۔ سوائے)، دماغ (برداشت)، تماشا (دیکھنا)، رخصت (اجازت)

ارزانی (لقب)، معلوم (ہیں)۔



کچھ شعر دیکھئے ۔

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالبؔ
شرم تم کو مگر نہیں آتی

کیا بیاں کر کے مرا روئیں گے یار ؟
مگر آشفتہ بیانی میری

ہم فراق میں تکلیف سیرِ باغ نہ دو
مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بیجا کا

تماشا کر اے محوِ آئینہ داری
تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

کچھ تو دے اے فلکِ ناانصاف
آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی

مجھ کو ارزانی رہے تجھ کو مبارک ہو جیو
نالۂ بلبل کا درد اور خندۂ گل کا نمک

کم نہیں وہ بھی خرابی میں پہ وسعت معلوم
دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں

اُردو بول چال میں ان کے معنی دوسرے ہی لئے جاتے ہیں جیسے مگر (پر۔ لیکن)، دماغ (گھمنڈ۔ غرور۔ ذہن)، تماشا (کھیل)، رخصت (چھٹی)، ارزانی (سستا پن)، معلوم (جس کا علم ہو۔ جسے جانتے ہوں)

مرزا غالبؔ کو فارسی کے کچھ بول ایسے بھا گئے تھے کہ وہ انہیں کو اپنے شعروں میں لاتے ہیں اور بار بار لاتے ہیں اور ان کے برابر کے دوسرے بول نہیں چھوتے جیسے بیم۔ نشاط۔ درخور۔ بسکہ۔ ازبسکہ۔ آغوش۔ وداع۔ آئینہ۔ انہوں نے یہ کام بھی اپنے سر لیا تھا کہ لوگوں کو فارسی کی چاٹ لگائیں انہیں فارسی سکھائیں اور فارسی کے کچھ ایسے بولوں کی اصل کا کھوج لگائیں جنہیں عام لوگ غلط بولتے ہیں جیسے حرج (حرج)۔ بیم (بیئم)۔ جاداد (جاداد)۔ ان کے لئے مرزا کے شعر یہ ہیں

نگہ کو گریہ بقدرِ حسرتِ دل ہے
مری نگاہ میں ہے جمع و خرج دریا کا

واں پہنچ کر جو غش آتا پئے ہم ہے ہم کو
صد رہ آہنگ زمیں بوس قدم ہے ہم کو

جاداد بادہ نوشیٔ رنداں ہے شش جہت
غافل گماں کرے ہے کہ گیتی خراب ہے

ان کے شعروں میں فارسی کے کچھ ایسے توصیفی مرکبات بھی ملتے ہیں جیسے یک بیاباں ماندگی۔ یک عربدہ میداں۔ صد گلستاں نگاہ۔ یک بیاباں جلوۂ گل۔ یک عمر ورع۔ یک جہاں زانو تامل۔ جنسِ تماشا دوست۔ دیدۂ عبرت نگاہ۔ بتِ بیداد فن۔ نگار آتشیں رخ۔ قطرہ دریا آشنا۔ ذرہ صحرا دستگاہ۔ وسعتِ صحرا شکار۔ عشقِ خوبانہ مترسب۔ موئے آتش دیدہ۔ شوق عناں گسیختہ۔ ذوق خامہ فرسا۔ گوشِ نصیحت نیوش۔ در از دست رفتہ۔ صید از دام جستہ۔ آب برجا ماندہ۔ دستِ تہِ سنگ آمدہ کچھ خاص قسم کے اسم فاعل بھی دکھائی دیتے ہیں۔ جیسے آتش زیر پا۔ داغ ساماں۔ نشاط آہنگ۔ پا بحنا۔ یا بدامن جنوں جولاں۔

ان کے یہاں فارسی جمعوں کی بھی بہتات ہے جو ہمارے کانوں کو بہت اچھی لگتی ہیں۔ ان میں سے جان کی جمع "جاں ہا" لگانے سے جو ترکیب میں آتی ہے اور جاندار کی جمع "جاناں" سے ملتی ہے کبھی ترکیب میں باندھتے ہیں اور کبھی الگ ہی لے آتے ہیں۔ ان کے لئے کچھ شعر دیکھئے ۔

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

نفس موجِ محیطِ بیخودی ہے
تغافل ہائے ساقی کا گلہ کیا

کیا تنگ ہم ستم زدگاں کا جہان ہے
جس میں کہ ایک بیضۂ مور آسمان ہے

مے پرستاں خمِ مے منہ سے لگائے ہی بنے
ایک دن گر نہ ہوا بزم میں ساقی نہ سہی

سادہ پرکار ہیں خوباں غالبؔ
ہم سے پیمانِ وفا باندھتے ہیں

غالب کے شعروں میں فارسی کی ترکیبوں کا زور ہے۔  کوئی ٹھکانا ہے نہ گنتی جیسے ـــــ مستِ کشِ گلبانگِ تسلی۔ طاقتِ آشوبِ آگہی۔ خارِ کسوتِ عالمِ ہستی۔ ہلاکِ حسرتِ پابوس۔ ماتمِ یک شہرِ آرزو۔ موجِ محیطِ بیخودی۔ خانۂ ویراں سازیٔ حیرت۔ نالۂ لب خونیں نوائے گل۔ جز دستِ نوازش۔ رگِ کشِ تاثیر۔ عشقِ خانہ ویراں ساز۔ بسترِ تمہیدِ فراغت۔ لگدکوبِ حوادث۔ فرصتِ شش جہت انتظار۔ طعمۂ نایافت۔ دودِ شعلہ آواز۔ مائدۂ لذتِ درد۔ حبابِ موجۂ رفتار۔ بیخودیٔ عیش مقدمِ سیلاب۔ بیاباں نوردِ وہمِ وجود۔ براتِ معاشِ جنونِ عشق۔ وسعتِ صحرا شکار۔

پھر ایسی ترکیبیں بھی بہت ملتی ہیں جن میں کوئی عامل (عار) آیا ہے۔ ان میں بھی عامل "بہ" کی گنتی سب سے بڑھی ہوئی ہے۔ جیسے برروئے شش جہت۔ در بولۂ یک نگہہ گرم۔ بہ عیار نگاہ۔ در قفائے گل۔ دل تا جگر۔ مشق از یک نفس۔ جز دمِ شمشیر۔ کم از سیلیٔ استاد۔ بصورتِ مہرِ نیمروز۔ بہ تکرار چاکِ گریباں۔ خالی از ادا۔ زخود رفتۂ بیدائے خیال۔ تا دمِ مرگ۔ بموئے عیر۔ تنگیٔ چشمِ حسود۔ بفیضِ بیدلی۔ بحیرت کدۂ شوخیٔ ناز۔ بخوں غلتیدنِ صد رنگ۔ بمہرِ صد نظر۔ بہ رنگِ عنواں۔ بمقدارِ حسرتِ دل۔ بوہمِ نارِ چشمکہائے لیلی۔ باندازۂ ہمت۔ بدل بہ دمِ سرد۔ بہ ہمِ آب لقا۔ بخوریٔ دل و چشمِ رقیب۔ بروئے سبزہ۔ بہ پیشِ نظر۔ بجلوہ پریٔ بادۂ پرفشانیٔ شمع۔ بزخمِ موجۂ دریا۔ بجانِ اسد۔ بقدرِ لذتِ آزار۔ بآغوشِ رقیب۔ بذوقِ غفلتِ ساقی۔ بحسبِ گردشِ پیمانۂ صفات۔ بقدرِ لب و دنداں۔ بہ پیچ و تابِ ہوس۔

ان کے ساتھ ساتھ غالب نے فارسی کے مصدر بھی بڑی بے تکلفی سے باندھ دیئے ہیں، جیسے گردن۔ سوختن۔ شنیدن۔ نشنیدن۔ شکستن۔ شگفتن۔ تپیدن۔ چکیدن۔ غلطیدن۔ افشردن۔ باختن۔ ان کے لئے بس یہی شعر پیش کیے کہ یہی بہت ہیں۔

رنگ کا عذر آتش زدہ نیرنگ بے تابی | ہزار آئینہ دل باندھے ہے بال یک تپیدن پر
کلفتِ افسردگی کو عیش بے تابی حرام | ورنہ دنداں در دلِ افشردن بنائے خندہ ہے
تا کجا اے آگہی رنگِ تماشا باختن | چشمِ وا گردیدہ آغوشِ وداعِ جلوہ ہے

انہوں نے فارسی کے بہت سے محاورے اُردو میں ڈھال دیئے ہیں۔ ان میں سے کچھ ایسے ہیں جو ابھی تک ہماری بول چال میں نہیں آسکے ہیں، جیسے بار دینا (اُڑانا)۔ تماشا کرنا (دیکھنا)۔ جا گرم کرنا (ٹھہرنا)۔ پرورش دینا (پالنا)۔ انتظار۔ بار۔ خمیازہ۔ حسرت۔ خجالت۔ نالہ۔ رنج اور منت کھینچنا۔ عہدے سے باہر آنا (فرض یا حق ادا کرنا)۔ طرف ہونا (مقابلہ کرنا)۔ گزر کرنا، گذر جانا۔ بروئے کار آنا (سامنے آنا)۔ سر بر ہونا (جیتنا)

اُوپر کی مثالوں سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ غالب کو فارسی کا چسکا پڑا ہوا تھا، اس لئے وہ اس کے بول اُردو میں لے آتے تھے، پر دھیان دینے سے یہ بات کھلتی ہے کہ غالب بہت دنوں تک اُردو کے پورے پورے شعر بھی فارسی ہی میں سوچتے رہے، اسی لئے اُن کے اردو کے شعروں میں بھی فارسی بول چال کا وہ رنگ جھلکتا ہے جو اُردو کے لئے بدیسی ہے۔ ثبوت کے لئے کچھ ایسے شعر نیچے لکھے جاتے ہیں جن میں فارسی کے ڈھنگ پر بات کہی گئی ہے اور جو اردو کے روزمرے سے بہت ہٹی ہوئی ہے۔

ہجومِ گریہ کا سامان کب کیا میں نے | کہ گر پڑے نہ مرے پاؤں پر در و دیوار
آتش کدہ ہے سینہ مرا راز نہاں سے | اے وائے اگر معرضِ اظہار میں آوے
قتل کا میرے کیا ہے عہد تو بارے | وائے اگر عہد استوار نہیں ہے
ہوئے اس مہروش کے جلوۂ تمثال کے آگے | پرافشاں جوہر آئینے میں مثلِ ذرہ روزن میں

(مثلِ ذرہ در روزن کا ترجمہ)



یک الف بیش نہیں صیقل آئینہ ہنوز
چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا
(بیش از یک الف کا ترجمہ)

یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل
گرمیٔ بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک
(بیش از یک نظر کا ترجمہ)

قاتل مرے گماں سے مجھے منفعل نہ چاہ
ہے ہے خدا نکردہ تجھے بے وفا کہوں
(نخواہ کا ترجمہ)

نقش پائے بتِ طناز بآغوشِ رقیب
پائے طاؤس پئے خامۂ مانی مانگے
(خواہد کا ترجمہ)

مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس
زلفِ سیاہ رُخ پہ پریشاں کیے ہوئے
(می خواہد کا ترجمہ)

نہ ہو حسنِ تماشا دوست رسوا بے وفائی کا
بمہرِ صد نظر ثابت ہے دعویٰ پارسائی کا
(رسوائے بے وفائی کا ترجمہ)

بے خونِ دل ہے چشم میں موجِ نگہ غبار
یہ میکدہ خراب ہے مے کے سراغ کا
(خراب مے سراغ کا ترجمہ)

لعل میں [illegible] کی آگ آپ سونے میں کہیں [illegible]
[illegible] اگر تبسم ہائے پنہاں کا
(فعل معطوف و فعل تام کے بغیر)

گر نہیں نکہتِ گل کو ترے کوچے کی ہوس
کیوں ہے گردِ رہِ جولانِ صبا ہو جانا
(اُردو روزمرہ کے خلاف)

دل ہوا کشمکشِ چارۂ زحمت میں تمام
مٹ گیا گھسنے میں اس عقدے کا وا ہو جانا

غالب کے ایسے شعروں پر جن میں اتنی فارسی بھری ہوتی تھی تہمت لے دے ہوتی۔ جو ان کے بیری تھے وہ فارسی بھرے بے معنی شعر گھڑ گھڑ کر ان کے سامنے بھی پڑھنے لگے اور یوں انہیں جتلانے لگے کہ تم ایسے ہی شعر کہتے ہو۔ جو ان کے میت تھے انہوں نے انہیں اکیلے میں سمجھایا کہ آسان اُردو میں شعر کہو جو بہت سے لوگ سمجھ سکیں۔ جو شعر تم کہتے ہو وہ عام بول چال سے بہت ہٹے ہوئے ہیں اور آسان اُردو سے اُن کا مطلب اُس اُردو سے تھا جس میں عربی فارسی کے کم سے کم بول پائے جاتے ہوں۔ اس بات سے غالب کو بہت دُکھ ہوا کہ جس فارسی پر انہیں گھمنڈ تھا، لوگ اسے نہیں سراہتے تو وہ جی کی چوٹ یوں ہونٹوں پر لائے:

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل
سن سن کے اسے سخنورانِ کامل
آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

اُدھر انہوں نے اپنے شعروں میں فارسی گھٹا کر اُردو بڑھائی۔ اس سے یہ ہوا کہ اُن کا وہ اونچا سوچ بچار جو اب تک عام لوگوں کی پہنچ سے اس لیے باہر تھا کہ وہ اتنی فارسی نہیں جانتے تھے۔ اب لوگوں کی سمجھ میں اچھی طرح آنے لگا اور وہ اپنی جنم بولی کا مزہ بھی اُٹھانے لگے۔ ایسے شعروں سے چاروں طرف غالب کی دھوم مچ گئی۔ ایسے ہی کچھ شعر مثال میں نیچے لکھے جاتے ہیں

اُن کو آتا ہے پیار پر غصّہ　　ہم کو غصّے پہ پیار آتا ہے



کہتے ہیں جیتے ہیں اُمید پہ لوگ　　ہم کو جینے کی بھی اُمید نہیں

لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ　　جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی　　موت آتی ہے پر نہیں آتی

یہاں میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں غالبؔ کے اونچے سوچ بچار پر کچھ کہوں۔ میں تو بس یہ بتانا چاہتا ہوں کہ انہوں نے یہ شعر جس اُردو میں کہے شروع کئے وہ دہلی کی اُردو تھی اور دہلی کی اُردو وہ بول چال ہے جو اُردو کے ٹھیٹھ محاورے میں ہریانی بولی کا پُٹ ملانے سے بنی ہے۔ دہلی اور اُس کے آس پاس کی بولی ہریانی ہے، اس لئے جب دہلی میں اُردو آگرے سے آئی تو اس میں وہاں کے باسیوں نے اپنی جنم بولی ہریانی ملا کر ایسی اُردو بول چال بنائی جسے آگے چل کر دہلی کی اُردو کا نام دے دیا گیا۔ یہ اُردو بول چال آگرے کی اُردو سے بہت کچھ الگ تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ غالبؔ کے باپ دادا آگرے کے رہنے والے تھے اور غالبؔ کا جنم بھی آگرے ہی میں ہوا، پر وہ بہت چھوٹی سی (۱۳ سال کی) عمر میں بیاہ رچا کر دلّی میں آ بسے تھے، اس لئے اُن کی زبان پر دلّی ہی کی بول چال چڑھ گئی اور یہ بات اُن کے شعروں سے ثابت ہوتی ہے۔

یہاں مجھے سب سے پہلے اُردو کے چار سُروں (اَے۔ اِے اور اَو۔ اُو) کی بات کرنا ہے جنہیں غالبؔ ایک ہی سمجھتے تھے، اس لئے اُن کی ایک ہی غزل میں کسی قافیے سے اَے کی آواز نکلتی ہے اور کسی سے اِے کی۔ کوئی قافیہ اَو کی آواز دیتا ہے اور کوئی اُو کی۔ ایسا لگتا ہے کہ دلّی کی بول چال میں اِن دو دو آوازوں میں کوئی فرق نہیں مانا جاتا تھا کیونکہ ایسی ہی مثالیں دلّی کے دوسرے شاعروں کے یہاں بھی ملتی ہیں اور انہیں کی دیکھا دیکھی اب اکثر تو پڑھے لکھوں میں یہ سمجھ ہی نہیں رہی کہ اُن کو ٹھیک ٹھیک ڈھنگ سے بول سکیں۔ اس بات کو سمجھنے سے پہلے یہ جان لینا چاہئے کہ صیغہ واحد غائب میں فعل شرطی یا تمنائی یا شکّی کی آخری آواز اَے (زبر سے) نکلتی ہے، جیسے شاید آج چاند نکلے۔ کاش وہ مجھے ملے۔ اگر وہ آجائے تو مجھے خبر کر دینا۔ اس کے سوا "اَے" عنایت بتانے والا لاحقہ بھی ہے جو سنسکرت میں "آئے" کے رُوپ میں ملتا ہے، جیسے واسودیتائے (واسودیتا کے لئے) یہی آواز اُردو کے عنایتی عامل "لئے" کے آخر میں بھی سُنائی دیتی ہے۔ اِے کی آواز جمع مذکر غائب کے فعل ماضی (حالیہ تمام) میں سُنائی دیتی ہے، جیسے لڑکے آئے۔ ہم چلے۔ وہ بہت جُھک کر ملے۔ دل کے ارمان خوب نکلے۔

اسی طرح فعل شرطی یا تمنائی یا شکّی کے صیغہ جمع حاضر کی آخری آواز "اَو" ہوتی ہے، جیسے تم چلو۔ تم آؤ۔ تم کھیلو۔ تم ہو اور ہونا کا مادہ ہو شدّا جیتی سے ہو (اُو) بولا جاتا ہے، جو شرطی یا تمنائی یا شکّی "ہووے" کو چھوٹا کر کے حاصل کیا گیا ہے، جیسے کوئی ہو (ہوئے یا ہووے)۔ اب غالبؔ کے وہ شعر دیکھئے جن میں انہوں نے اِن دو دو آوازوں کو ایک ہی سمجھا ہے۔

الف۔ (۱) ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے　　بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

(۲) ہوئی کشمکش نزع میں ہاں جذب محبت　　کچھ کہہ نہ سکوں پر وہ مرے پوچھنے کو آئے

(۳) اُس انجمن ناز کی کیا بات ہے غالبؔ　　ہم بھی گئے واں اور تری تقدیر کو رو آئے

(۴) تجھ کو بھی ہم دکھائیں کہ مجنوں نے کیا کیا　　فرصت کشاکشِ غم پنہاں سے گر ملے

(۵) لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں　　مانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

(۶) دیا ہے خلق کو بھی تا اُسے نظر نہ لگے　　بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لئے

(۷) زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا　　کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے

(۸) کہوں کیا خوبیٔ اوضاعِ ابنائے زماں غالبؔ　　بدی کی اُس نے جس سے ہم نے کی تھی بارہا نیکی



غمِ دنیا سے گر پائی بھی فرصت سر اٹھانے کی — فلک کا دیکھنا تقریب تیرے یاد آنے کی

(۱) نا تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو — مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

(۲) بچتے نہیں مواخذۂ روزِ حشر سے — قاتل اگر رقیب ہے تو تم گواہ ہو

(۳) کیا وہ بھی بے گنہ کش و حق ناشناس ہیں — مانا کہ تم بشر نہیں خورشید و ماہ ہو

کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو — نہ ہو جب دل ہی سینے میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو

یہ کہہ سکتے ہو ہم دل میں نہیں ہیں پر یہ بتلاؤ — کہ جب دل میں تمہیں تم ہو تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں — سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

جزو نمبر ۱ کے پہلے شعر کے پہلے مصرع میں "نکلے" واحد غائب شرطی اور دوسرے میں جمع مذکر ماضی (حالیہ تمام) ہے شعر ۲ کے دوسرے مصرع میں "آئے" واحد غائب تمنائی اور شعر ۳ کے آخری مصرع میں جمع مذکر ماضی ہے۔ شعر ۴ کے دوسرے مصرع میں "لے" واحد غائب شرطی اور شعر ۵ میں جمع مذکر ماضی ہے۔ شعر ۶ میں "لئے" حال عاقبت ہے جس کے آخر میں آواز "اے" نکلتی ہے پر شعر ۷ میں "لئے" جمع مذکر ماضی ہے۔ شعر ۸ میں "آئے" کو زبر سے بولتے ہیں کیونکہ اردو میں آخری نون کے بعد "اے" کا اثر نہیں بولا جاتا۔ یہ شعر ۹ کے فارسی بول چال "ین نون کے بعد اے" کی آواز نکلتی ہے حروف کے پہلے شعر کی ردیف "ہو" ہونے کا چھوٹا روپ ہے اور پیش سے بولی جاتی ہے۔ پر شعر ۲ اور ۳ میں "ہو" کا تو زبر سے بولا جاتا ہے کیونکہ یہ جمع حاضر کا صیغہ ہے۔ ایسے ہی شعر ۴ کی ردیف "ہو" ہونے کا چھوٹا روپ ہے اور پیش سے بولی جا رہی ہے۔ پر شعر ۵ اور ۶ میں اسے زبر سے بولا جائے گا کیونکہ یہ جمع حاضر کا صیغہ ہے۔

جیسا کہ میں اوپر کہہ چکا ہوں یہ گڑبڑ غالب ہی کے یہاں نہیں دلی کے دوسرے شاعروں کے یہاں بھی ملتی ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ دلی ہی کی بول چال کا یہ حال تھا۔ اس کی دوسری وجہ اردو کی لپی بھی ہو سکتی ہے جس میں واؤ اور یے سے بولوں کے آخر میں لگنے والے دو دو سُر لکھے جاتے ہیں اور ان حرفوں سے بھی ہمارے پڑھے لکھوں کو دھوکا ہو جاتا ہو تو کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے۔

ان سُروں کو چھوڑ کر مجھے غالب کے یہاں دو بولوں (ہتھکنڈے اور سمجھیے) کے سُروں میں بھی گڑبڑ ملتی ہے جسے غلط اچار (تلفظ) بھی کہا جا سکتا ہے۔

تنگی کا تم سے شکوہ کیا کہ یہ — ہتھکنڈے ہیں چرخِ نیلی فام کے

وصع میں اس کو اگر سمجھیے قاف تریاق — رنگ میں سبزہ نو خیز مسیحا کہیے

یوں سمجھیے کہ بیچ سے خالی کئے ہوئے — لاکھوں ہی آفتاب ہیں اور بے شمار چاند

ان شعروں میں غالب نے ہتھکنڈے کے نون کو غنہ کر دیا اور سمجھیے کی میم کو ساکن باندھا ہے۔

غالب نے اردو کے ٹھیٹھ محاورے کے خلاف رہگزر، حبیب، اور جلوہ گاہ کو مذکر اور ناموس کو مونث باندھا ہے اور اس میں انہوں نے دلی کی بول چال کو سامنے رکھا ہے۔ ثبوت میں شعر دیکھیے ۔

زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی — کیوں ترا راہگذر یاد آیا

چپک رہا ہے بدن پر لہو سے پیراہن — ہمارے جیب کو اب حاجتِ رفو کیا ہے

سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست — لیکن خدا کرے وہ ترا جلوہ گاہ ہو

خاک میں ناموسِ پیمانِ محبت مل گئی — اٹھ گئی دنیا سے راہ و رسمِ یاری ہائے ہائے



ان کے اشعار میں ہریانی کی کچھ ضمیریں بھی دکھائی دیتی ہیں، جیسے وو (وہ)۔ تس (اُس)، کسو (کسی)۔ ہر کوئی (ہر ایک)، اور ہم ہی۔ مثالیں یہ ہیں

ہمیں پھر اُن سے اُمید اور انہیں ہماری قدر — ہماری بات ہی پوچھیں نہ وو تو کیونکر ہو

کہتے تو ہو تم سب کہ بت غالیہ مو آئے — یک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ وو آئے

گو میں رہا رہین ستم ہائے روزگار / گوش مہجور پیام و چشم محروم جمال — ایک دل تس پر یہ ناامیدواری ہائے ہائے

کیوں ڈر رہے ہو عشاق کی بے حوصلگی سے — یاں تو کوئی سنتا نہیں فریاد کسو کی

آگ سے پانی میں بجھتے وقت اُٹھتی ہے صدا — ہر کوئی درماندگی میں نالے سے ناچار ہے

پیشے میں عیب نہیں رکھیے نہ فرہاد کو نام — ہم ہی آشفتہ سروں میں وہ جواں میر بھی تھا

دھول دھپا اُس سراپا ناز کا شیوہ نہیں — ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

غالب کے یہاں عاملوں (حروف جار) کے چلن میں بھی ہریانی کا اثر ہے۔ اور یہ بھی ہریانی ہی کا اثر ہے۔

(۱) وہ عامل "کو" بے ضرورت بھی بول جاتے ہیں، جیسے ؎

جو آؤں سامنے اُن کے تو مرحبا نہ کہیں — جو جاؤں واں سے کہیں کو تو خیر باد نہیں

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں — ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

(۲) کبھی "اردو سے" اور میں "کی جگہ بھی "کو" لے آتے ہیں، جیسے ؎

مرتا ہوں اس آواز پہ ہر چند سر اُڑ جائے — جلاد کو لیکن وہ کہے جائیں کہ ہاں اور

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے — کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

(۳) کبھی اُن کے یہاں عامل بولے ہی نہیں جاتے، جیسے ؎

شب خمار شوق ساقی رستخیز اندازہ تھا — تا محیط بادہ صورت خانہ خمیازہ تھا (شب کو)

مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہیے — بھوں پاس آنکھ قبلۂ حاجات چاہیے (بھوں کے پاس)

جس پاس روزہ کھول کے کھانے کو کچھ نہ ہو — روزہ اگر نہ کھائے تو ناچار کیا کرے (جس کے پاس)

(۴) ایک جگہ تو انہوں نے امالے کی بھی پروا نہیں کی ہے۔ دیکھیے۔

دل اُس کو پہلے ہی ناز و ادا سے دے بیٹھے — ہمیں دماغ کہاں حُسن کے تقاضا کا (تقاضے کا)

ان کے شعروں میں دلّی کے کچھ متعلق فعل بھی ملتے ہیں، جیسے خوب وقت (اچھے وقت)، کیونکہ (کیونکر)۔ یہ (اس قدر) آگے (پہلے)۔ یاں (یہاں)، واں (وہاں)۔ پرے (دور۔ الگ) اور "نہیں" کی جگہ "نہ" کا چلن ملتا ہے۔ دہلوی اردو کی سی یہ گڑبڑ لاہوری اردو میں بھی پائی جاتی ہے۔ جیسے

درد منت کش دوا نہ ہوا — میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا

اُردو کی ٹکسالی بول چال میں حالیہ تمام (ماضی) اور مستقبل کے بیانیہ جملوں میں "نہیں" کا بول بولا جاتا ہے اس لئے غالب کے اس شعر کو نثر میں یوں بولیں گے، درد منت کش دوا نہیں ہوا۔ میں اچھا نہیں ہوا تو بُرا نہیں ہوا۔

دِلی کی بول چال میں اردو کے فعل معطوفہ کی علامت "کر" چھوڑ دینے کا بہت چلن ملتا ہے۔ وہاں مادے ہی سے فعل معطوفہ کا کام چلا لیتے ہیں۔ غالب کے یہاں اس کی بھی بہت سی مثالیں ملتی ہیں، جیسے۔

آئینہ دیکھ اپنا سا منھ لے کے رہ گئے — صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا



قیامت ہے کہ سُن لیلیٰ کا دشتِ قیس میں آنا　　تعجب سے وہ بولا یوں بھی ہوتا ہے زمانے میں

غالب کی اُردو میں ہریانی کے بہت سے فعلی رُوپ ملتے ہیں۔ جیسے آوے (آئے)۔ جاوے (جائے)۔ پاوے (پائے)۔ دکھلاوے (دکھلائے)۔ ہووے (ہوئے)۔ کہوے (کہے)۔ کہوں (کہیں)۔ رہوے (رہے)۔ لیجیوے (لے)۔ فرماویں گے (فرمائیں گے)۔ جاویں گے (جائیں گے)۔ آئے ہے (آتا ہے)۔ جائے ہے (جاتا ہے)۔ روکے ہے (روکتا ہے)۔ کھینچے ہے (کھینچتا ہے)۔ ڈھونڈے ہے (ڈھونڈتی ہے)۔ گزرے ہے (گزرتی ہے)۔ دیکھے ہے (دیکھتا ہے)۔ بخشے ہے (بخشتا ہے)۔ دے ہے (دیتا ہے)۔ دوڑے ہے (دوڑتا ہے)۔ نکلے ہے (نکلتا ہے)۔ چلے ہے (چلتا ہے)۔ سمجھے ہے (سمجھتا ہے)۔ مانگے ہیں (مانگتے ہیں)۔ کروں ہوں (کرتا ہوں)۔ پھروں ہوں (پھرتا ہوں)۔ دیجیو (دینا)۔ کھائیو (کھانا)۔ کہیو (کہنا)۔ رکھیو (رکھنا)۔ آئیو (آنا)۔ ہوجیو (ہونا)۔ رہیو (رہنا)۔ آجائیو (آجانا) اور ان کے ساتھ ساتھ دیجیو (دیجئے)۔ کیجے (کیجئے)۔ لیجو (لینا)۔ دیکھا چاہیے (دیکھنا چاہیے)۔ کیا چاہیے (کرنا چاہیے)۔ سنایا چاہیے (سنانا چاہیے)۔

ہریانی کے مطابق غالب بھی تمنائی میں جمع متکلم کے لئے اُردو کے مخاطب تعظیمی کا رُوپ بولتے ہیں اور یہ رُوپ بہاری میں بھی بولا جاتا ہے، جیسے "رہیئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو"۔ رہیئے کا رُوپ ہریانی اور بہاری دونوں بولیوں میں اُردو کے "ہم رہیں" کی جگہ بولا جاتا ہے، جبکہ اُردو میں یہ مخاطب تعظیمی کے ساتھ آتا ہے جیسے آپ رہیئے۔ آپ چلیئے۔ غالب کے یہاں اُردو کا فعل شرطی ہریانی کی طرح فعل حال کی جگہ بولا گیا ہے، جیسے "پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسدؔ"۔ یہاں اُردو میں "ڈرے" کی جگہ "ڈرتا ہے" بولتے ہیں۔ اسی طرح غالب کے اس شعر میں بھی اُردو کے حالیہ یا تمام (ماضی) کی جگہ شرطی رُوپ آیا ہے ؎

سر کھجاتا ہے جہاں زخمِ سر اچھا ہو جائے　　لذتِ سنگ باندازۂ تقریر نہیں

یہاں "اچھا ہو جائے" کی جگہ اُردو میں "اچھا ہو جاتا ہے" بولیں گے۔

غالب کچھ فعلی رُوپوں میں اُردو روزمرہ سے بھی ہٹ گئے ہیں۔ جیسے

۱) تیری نازکی سے جانا کہ بندھا تھا عہد بودا　　کبھی تو نہ توڑ سکتا اگر استوار ہوتا

۲) منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے　　عرش سے اُدھر ہوتا کاش کے مکاں اپنا

۳) اُسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا　　جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دو چار ہوتا

یہاں پہلے شعر میں "تو نہ توڑ سکتا" کی جگہ "تو نہیں توڑ سکتا تھا" یا "تو نہ توڑ پاتا" بولنا چاہیئے۔ دوسرے شعر میں "ہم بنا سکتے" کی جگہ "ہم بنا سکتے تھے" یا "ہم بنا لیتے" کہنا چاہیئے تھا اور تیسرے شعر میں "کون دیکھ سکتا" کی جگہ "کون دیکھ سکتا تھا" یا "کون دیکھ پاتا" ہونا چاہیئے تھا کیونکہ امدادی فعل "سکنا" کے رُوپ ماضی شرطی کے لئے نہیں بولے جاتے۔ غالب کے یہ رُوپ ہریانی کا چلن بتاتے ہیں اور لاہوری اُردو میں بھی اُن کا چلن بہتات سے ملتا ہے۔

اسی طرح غالب نے امدادی فعل "جانا" کے بھی کچھ ایسے رُوپ باندھے ہیں جو اُردو میں نہیں بولے جاتے، جیسے

موجِ خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے　　آستانِ یار سے اُٹھ جائیں کیا

عمر بھر دیکھا کئے مرنے کی راہ　　مر گئے پر دیکھئے دکھلائیں کیا

زندگی میں تو وہ محفل سے اُٹھا دیتے تھے　　دیکھیں اب مر گئے پر کون اُٹھاتا ہے مجھے

یہاں پہلے شعر میں "اُٹھ جائیں کیا" کی جگہ "اُٹھیں کیا" اور دوسرے اور تیسرے شعر میں "مر گئے پر" کی جگہ "مرنے پر" بولا جاتا ہے۔

(۳) غالب نے کتنی ہی جگہ فعل "چھوٹا" کی جگہ "چھٹا" بولا ہے، جیسے ؎



حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد　　　بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا میرے بعد
گو نہ سمجھوں اس کی باتیں گو نہ پاؤں اس کا بھید　　　پر یہ کیا کم ہے کہ مجھ سے وہ پری پیکر کھلا

محرَمِیا ماس مح نے ہم کو قید اچھا یوں سہی　　　یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جاویں گے کیا
جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید　　　مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو

ان میں سے پہلے شعر میں چھوٹنا، دوسرے میں چھوٹ جاویں گے اور تیسرے میں چھوٹنا بولنا چاہیئے تھا۔

(۲) ہریانی روز مرہ میں فعل "پڑنا" کے روپ یوں ہی بولے جاتے ہیں۔ غالب نے بھی ایک شعر میں ایسا کیا ہے۔ دیکھئے ؎

نہ پوچھ بیخودیِ عیشِ مقدمِ سیلاب　　　کہ ناچتے ہیں پڑے سر بسر در و دیوار

غالب نے ایسے شعر بھی کہے ہیں جن میں ایک بھی فعل نہیں آیا ہے۔ اردو کے روزمرے سے یہ ڈھنگ ہمارے کانوں کے لئے اجنبی ہے۔ ایسے شعر غالب کے دیوان میں بہتات سے ملتے ہیں، جیسے ؎

یہ قاتل وعدۂ صبر آزما کیوں　　　یہ کافر فتنۂ طاقت رُبا کیا
نہیں گر سر و برگِ ادراکِ معنی　　　تماشائے نیرنگِ صورت سلامت
تو اور آرائشِ خمِ کاکل　　　میں اور اندیشہ ہائے دُور و دراز
میں اور صد ہزار نوائے جگر خراش　　　تو اور ایک وہ نشنیدن کہ کیا کہوں
فرصتِ کاروبارِ شوق کسے　　　ذوقِ نظارۂ جمال کہاں
لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا　　　لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں
عشرتِ پارۂ دل زخمِ تمنا کھانا　　　لذتِ ریشِ جگر غرقِ نمکداں ہونا

دیوان میں ایک شعر ایسا بھی ملتا ہے جس میں غالب نے فعل "سیکھنا" کو متعدی کی جگہ لازم باندھا ہے اور اس میں "نے" چھوڑ دیا ہے ؎

سیکھے ہیں مہ رخوں کیلئے ہم مصوری　　　تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیئے

ہم سیکھے ہیں کا جمع بھی ہریانی بول چال ہے جو کسی بولی کے ڈھنگ سے ملتی ہے اردو میں اس کی جگہ ہم نے سیکھی ہے بولتے ہیں۔

غالب کے اردو دیوان پر یوں دھیان جمانے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بہت دنوں تک اردو کے نام پر فارسی کو اپنے شعروں میں ٹھونسنے کی کوشش کرتے رہے اور فارسی کے بہت سے روپ باندھ باندھ کر لوگوں پر اپنی فارسی کی دھاک جمانے میں لگے رہے۔ پر جب اپنے پرایوں نے انہیں اچھی طرح یہ سمجھا دیا کہ یہ اردو بول چال نہیں ہے اور لوگ ان شعروں سے مزہ نہیں لے سکتے تو وہ فارسی کم کر کے اردو بڑھانے لگے اور پھر انہیں شعروں سے وہ اتنے مشہور ہوئے کہ آج اردو میں غالب کے نام کا ڈنکا بج رہا ہے، پر اس اردو میں انہوں نے دلی کی بول چال استعمال کی ہے جو اردو کے ٹھیٹھ محاورے میں ہریانی بولی کا پُٹ ملانے سے بنی ہے۔ ▼

ڈاکٹر سلام سندیلوی

غالب کی شاعری میں نرگسیت

دنیا کے ہر ادب میں نرگسیت کی نمود کسی نہ کسی شکل میں ضرور ملتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس موضوع سے اکثر ادیبوں نے بڑی حد تک بے اعتنائی برتی ہے۔ اس کا خاص سبب یہ ہے کہ نرگسیت کا تعلق علم نفسیات سے ہے اور علم نفسیات کا مطالعہ عام نہیں ہے۔ اسی لئے ہمارے اردو ادب میں اس موضوع پر بہت کم مواد ملتا ہے۔

انگریزی میں نرگسیت کو (Narcissiom) کہا جاتا ہے۔ (Narcissiom) کا لفظ Narcissas سے ماخوذ ہے جس کا ترجمہ ہم فارسی میں نرگس کر سکتے ہیں۔ نرگسیت کا تعلق یونانی علم اساطیر سے ہے۔ یونان میں ایک حسین وجمیل نوجوان تھا جس کا نام نارسیسس (Narcissus) تھا۔ وہ دریا کے دیوتا سیفیسس (SEPHISSUS) کا بیٹا تھا اور پری لری اوپی (LEIRIOPE) کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔ اس عہد کے مذہبی پیشوا ٹیری سیاس (TEIRESIAS) نے پیشین گوئی کی تھی کہ یہ بچہ اپنے خط و خال پر نظر نہیں ڈالے گا تو اس کی عمر بہت دراز ہوگی۔

جب نرگس طفلی کی منزلوں سے گذر کر شباب کے گلشن میں پہنچا تو سارے یونان میں اس کے حسن و جمال کی دھوم مچ گئی اور وہاں کی زہرہ جمال اور خورشید وش حسین لڑکیاں اس پر فریفتہ ہونے لگیں۔ خاص طور سے ایکو پری (ECHO) اس کے تیر نظر کا شکار ہو گئی۔ مگر نرگس میں ایک شانِ بے نیازی پیدا ہو گئی تھی، اس وجہ سے وہ کسی کے ناز و غمزہ سے متاثر نہیں ہوتا تھا اسی لئے شاید اس نے پری کی محبت کو قبول نہیں کیا۔ پری نرگس کی محبت میں سلگتی رہی، یہاں تک کہ ایک روز شعلۂ عشق نے اس کو جلا کر راکھ کر دیا، مگر اس کی محبت کے نالے فضا میں گونجتے رہے۔ اس کی گونج کو ہم آج بھی سن سکتے ہیں جس کو ہم آواز بازگشت (ECHO) کہتے ہیں۔ یہ اسی پری کی فریاد و فغاں ہے۔

ایکو کے انتقال نے سارے دیوتاؤں کو مشتعل کر دیا اور وہ نرگس سے بدلہ لینے کی تدبیر سوچنے لگے۔ خاص کر انتقام کی دیوی (NEMISIS) نے انتقام لینے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ چنانچہ ایک روز نرگس کو ایک چشمے کے کنارے لے جایا گیا۔ اس چشمے کے پانی میں نرگس نے اپنے چہرے کا عکس دیکھا اور وہ خود اپنے حسن کا شکار ہو گیا۔ وہ مسلسل پانی میں اپنے چہرے کے عکس کا نظارہ کرتا رہا۔ یہاں تک کہ ایک روز اس کی روح اس کے کالبدِ خاکی سے پرواز کر گئی۔ جس جگہ پر نرگس نے دم توڑا تھا، اس جگہ سے ایک پھول نمودار ہوا، جس کو آج نرگس کے نام سے پکارا جاتا ہے۔[1]

---

[1] چیمبرس انسائیکلوپیڈیا - جلد ۹ - ص ۶۷۳



نرگس کی موت نے ادب کو ایک نیا تصور دیا۔ جب کوئی شاعر یا ادیب اپنے ہی حُسن و جمال اور خط و خال پر عاشق ہو تو اس رُجحان کو نرگسیت کہتے ہیں۔ نرگسیت کی اصطلاح نے ادب سے زیادہ علم نفسیات میں مقبولیت حاصل کی۔ فرائڈ کا قول ہے کہ ۱۸۹۹ء میں پی۔ نیک (P NACKE) نے پہلی بار نرگسیت کو طبابت کی اصطلاح کے لئے استعمال کیا۔ اس نے بتایا کہ جو شخص اپنے جسم سے جنسی طور پر محبت کرتا ہے اُس میں نرگسیت کا رُجحان پایا جاتا ہے۔ وہ اپنے جسم کو گھورنے، چمکارنے اور پیار کرنے میں جنسی لذّت محسوس کرتا ہے۔[1] فرائڈ نے اس رُجحان کو ایک مرض تصور کیا ہے اور ایسے شخص کو گم گشتہ قرار دیا ہے۔

نرگسیت کی اسی طرح کی تعریف رابرٹ ایس۔ وُوڈورتھ نے بھی کی ہے۔ اُس کی نظر میں ہر وہ مرد یا عورت جو اپنی ذات سے محبت کرے، نرگسیت کے مرض میں مبتلا ہے۔ ایسا شخص آئینہ دیکھ کر اپنے حُسن کا جائزہ لیتا ہے اور خوش ہوتا ہے۔ وہ اپنے جسم کو چمکارتا ہے اور پیار کرتا ہے۔ اس کا جنسی رُجحان اسی قسم کا ہوتا ہے جس طرح ایک مرد ایک عورت سے پیار کرے یا ایک عورت ایک مرد سے محبت کرے۔[2]

نرگسیت کے متعلق کیرن ہارنی نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اُس کا قول ہے کہ نرگسیت کی طبّی (CLINICAL) تعریف کرنا دُشوار ہے۔ تاہم اُس کا نظریہ ہے کہ اس رجحان کا تعلق خود اپنی ذات سے ہے۔ دراصل نرگسیت کے مفہوم میں اُلجھاؤ اِس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ نرگسیت کی اصطلاح خالص تولیدی (GENTIC) مفہوم میں استعمال کی جاتی ہے اور اس بات پر زور دیا جاتا ہے کہ ان مختلف پہلوؤں کا تعلق جنسی قوت (LIBIDO) سے ہے۔ اس کے باوجود کیرن ہارنی کا خیال ہے کہ طبّی تعریف کے مقابلے میں نرگسیت کی تولیدی تعریف زیادہ آسان ہے۔ اس صورت میں نرگس ہم اُس شخص کو کہیں گے جو بنیادی طور پر خود اپنی ذات سے محبت کرتا ہے۔ کیرن ہارنی نے گریگوری۔ زِلبورگ (GREGORY ZILBORG) کا نظریہ بھی پیش کیا ہے جس کا قول ہے کہ نرگسیت کا مفہوم محض خود غرضی (SILFISHNESS) اور خود نمائی (EGOCETRICITY) نہیں ہے بلکہ یہ اس ذہنی کیفیت کو بے نقاب کرتی ہے جس کے مطابق ایک انسان دُوسروں کی بجائے خود اپنی ذات ہی کو اپنی محبّت کا مرکز قرار دیتا ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ دُوسروں کو نفرت کی نظر سے دیکھتا ہے، بلکہ داخلی طور پر وہ اپنی ذات سے محبّت کرتا ہے اور ہر وقت ایک ایسے آئینے کی تلاش میں رہتا ہے جس میں وہ اپنی شکل کا نظارہ کر سکے۔

کیرن ہارنی نے نرگسیت کی وسعت پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ نرگسیت کے دائرہ میں خود بینی (VANITY) عُجب و پندار (CONCEIT) طلب جاہ (CRAVING FOR PRESTIG) تمنائے محبوبیت (A DESIRE TO BE LOVED) کنارہ کشی (WITHDRAWAL FROM OTHERS) خودداری (NORMAL SELFESTEEM) تصوریت (IDEALS) تخلیقی خواہشات (CREATIVE DESIRES) شدید فکر صحت (ANXIOUS CONCERN ABOUT HEALTH) شکل و شباہت (APPEARANCE) اور ذہنی صلاحیتیں (INTELLECTUAL FACULTIES) شامل ہیں۔[3]

ہم انہیں نکات کی روشنی میں غالب کی نرگسیت کا جائزہ لے سکتے ہیں مگر اس تحریر میں یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم کیرن ہارنی کی ترتیب پر بھی عمل کریں۔ بلکہ ہم اپنی سہولت کے مطابق کچھ عنوانات قائم کر سکتے ہیں، جن کی روشنی میں ہم غالب کی

---

1 COLLECTED PAPERS BY FREND EDITOD, BY ERNEST JONES, VOL IV, P 30

2 CONTEMPORARY SCHOOLS OF PSYCHOLOGY, BY ROBERT S WOODWORTH P 182

3 NEW WAYS IN PSYCHOANALYSIS, BY HORNEY, P 88



[illegible]گسیت کا مطالعہ کریں گے۔ اِن نکات کی ترتیب اِس طرح ہو سکتی ہے۔
(۱) [illegible] (۲) خودداری (۳) غرور وناز (۴) طلب جاہ وحشمت (۵) دنیا سے کنارہ کشی
(۶) [illegible] متعلق خواہشات۔
ہم اِنہی نکات کی روشنی میں غالب کی نرگسیت کا تجزیہ کریں گے۔

غالب کی خود بینی خود بینی کا تعلق اپنی ذات سے ہوتا ہے۔ انسان اپنے کو پہچاننے کی کوشش کرتا ہے اور اسی عرفان کی روشنی میں اُس کے خیالات اور اعمال کی تشکیل ہوتی ہے۔ ڈیوڈ۔ سی میکل لینڈ (DAVID C MACCLELLAND) کا قول ہے کہ چونکہ انسان ساری کائنات کا علم رکھتا ہے اور انسان کائنات کے اندر شامل ہے، اِس لئے انسان کو اپنی ذات کا بھی علم ہوتا ہے۔[1]

ترجمن نے ھی ذات EGO کے مفہوم کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کا قول ہے کہ انا عمل کے اُصول کے تحت انسان کی اپنی ذات کے بارے میں واقفیت کا نام ہے۔[2] اس نے یہ بھی بتایا ہے کہ "انا" کے تین مفہوم ہیں۔ پہلا مفہوم نفسیاتی اعتبار سے ہے۔ ایسی صورت میں انا قوتوں، عادتوں اور مختلف کاموں کے اتحاد کا نام ہے جس کے ذریعے ایک انسان دوسرے انسان سے پہچانا جا سکتا ہے۔ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ انا انسان کی شخصیت کا دُوسرا رُوپ ہے۔ انا کا دُوسرا مفہوم اخلاقی حیثیت سے ہے جس کو ہم کردار بھی کہہ سکتے ہیں۔ اِس مفہوم کا تعلق دماغ کی بہ نسبت قوتِ ارادی سے زیادہ ہے۔ انا کا تیسرا مفہوم [illegible] الوجود سے تعلق رکھتا ہے۔ قوت۔ عادت۔ شخصیت اور کردار کے وجود کے لئے انسانی جسم کی ضرورت ہے، جس کے ذریعے انا کا اظہار ہوتا ہے۔

سینٹ ٹامس کا قول ہے کہ عقل کو انا کے وجود کا علم اُس کے اعمال کے ذریعے ہوتا ہے، اِس لئے اُس کی نظر میں انا ایک عقلی خصوصیت کی شے ہے کیونکہ عقل اُس کی بلند ترین ملکیت ہے۔ عقل کی مدد سے آزادی حاصل ہوتی ہے جو اُس کو مقدس اور قابلِ احترام بناتی ہے۔ اِس طرح انسان اپنی جگہ پر مفکر اور عامل کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔

انا مطالعۂ باطن (INTROSPECTION) سے بھی کام لیتا ہے۔ لیارڈ ٹرولینڈ (LEONARED TROLAND) نے یہ بات واضح کی ہے کہ انا کسی خاص مسئلے پر غور کس انداز سے سوچتا ہے اور لائحہ عمل تیار کرتا ہے۔ سب سے پہلے وہ کسی چیز کی ان خصوصیات کا مطالعہ کرتا ہے جو حواسِ خمسہ کے اندر ہیں۔ پھر زمان ومکاں کے اعتبار سے ان خصوصیات کو ترتیب دیتا ہے۔ اِس کے بعد جذبات۔ یادداشت۔ خیالات اور نتائج کی روشنی میں حالات کا جائزہ لیتا ہے۔ پھر گذشتہ تجربات کو آئندہ کے نتائج سے وابستہ کرتا ہے۔ آخر میں اِس وابستگی کی مدد سے حالات کے مطابق اعمال کا مظاہرہ کرتا ہے۔

اِسی بحث ومباحثہ سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ انا کا تعلق اپنی ذات یا اپنی شخصیت سے ہوتا ہے۔ بقول جیمس۔ سی۔ گولمین (JAMES C GOLEMAN) شخصیت کی تعمیر میں دو عناصر کام کرتے ہیں۔ پہلا عنصر وراثت (HERECLITY) ہے۔ ہر شخص اپنے آباؤ اجداد سے فطری اور پیدائشی طور پر کچھ خصوصیات ورثے میں پاتا ہے۔ یہ خصوصیات جسمانی بھی ہوتی ہیں اور ذہنی بھی۔ جسمانی صورت میں عضلہ۔ غدود۔ حیاتی اعضا اور اعصاب پر اُس کی نسل اثر انداز ہوتی ہے۔ ذہنی اعتبار سے وراثت کا اثر انسان کے احساسات۔ جذبات اور عقل پر بھی پڑتا ہے۔ اِس طرح ایک انسان وراثت میں اپنے آباؤ اجداد کا دماغ حاصل کر لیتا ہے۔

---

1. PERSONALITY BY DAVID C MACCLELLAND, P 529

2. GENERAL PSYCHOLOGY BY ROBERT EDWARD BRENMAN, P 390



شخصیت کی تعمیر میں دوسرا عنصر ماحول ENVIRONMENT ہے۔ ایک ہی نسل کے دو اشخاص ماحول کی بنا پر کسی نہ کسی حد تک مختلف ہو سکتے ہیں۔ ماحول شخصیت اور کردار کی تشکیل میں معاون و مددگار ثابت ہوتا ہے۔ ماحول کے اثر سے ایک شخص کی زبان مختلف ہو سکتی ہے۔ اُس کے اطوار و افعال میں بھی فرق آسکتا ہے۔ اُس کی اخلاقی قدروں میں بھی تفاوت نظر آسکتا ہے۔ غرض یہ کہ ایک انسان کی زندگی کے مسائل میں ماحول کا زبردست ہاتھ ہوتا ہے[1]

دیگر افراد کی طرح غالب کو بھی اپنی ذات کا عرفان تھا۔ اُن کا انا اُن کے خیالات و احساسات اور عمل و کردار پر غالب نظر آتا ہے۔ اُن کے انا کا تعلق اُن کی نسل سے ہے۔ اُن کے خاندان کا سلسلہ ایران کے بادشاہ تور ابن فریدوں تک پہنچتا ہے۔ یہ خاندان پیشدادیان کہلاتا تھا۔ یہ ایرانی شاہی خاندان شان و شوکت اور سطوت و عظمت میں لاثانی تھا۔ اس خاندان کی بنیاد کیومرس نے ۵۵ قبل مسیح ڈالی تھی۔ سیامک۔ ہوشنگ۔ تہمورس۔ جمشید۔ فریدوں تور۔ منوچہر۔ نوذر۔ افراسیاب اور دارا اس خاندان کے بادشاہ گذرے ہیں۔ کچھ عرصہ کے بعد پیشدادیوں کا زوال ہو گیا اور کیانیوں نے ایران میں اپنی سلطنت قائم کر لی مگر پیشدادیاں خاندان بالکل نیست و نابود نہیں ہوا تھا، بلکہ اُس کے کچھ افراد ترکستان میں آباد ہو گئے۔ اس خاندان کا ایک نامور سردار توقاق گذرا ہے جو مسلمان ہو گیا تھا مگر اس خاندان کو اس کے بیٹے سلجوق نے بہت ترقی دی اور اسی کے نام پر ایران میں سلجوقی سلطنت کی بنیاد پڑی۔ آخرکار سلجوقی سلطنت کو بھی زوال آگیا۔ اس خاندان کے ایک شہزادے ترسم خان نے سمرقند میں اقامت اختیار کی۔ اس کا بیٹا قوقان بیگ خان اپنے باپ سے ناراض ہو کر لاہور آیا اور نواب معین الملک کی ملازمت اختیار کی۔ نواب معین الملک کا ۱۷۵۳ء میں انتقال ہو گیا۔ تب قوقان بیگ دہلی آگئے اور شاہ عالم کے دربار سے وابستہ ہو گئے۔ ان کو پچاس سوار اور نقارۂ شاہی سلطنت سے عطا ہوا۔ اس کے علاوہ پاسو کا علاقہ بھی بخش دیا گیا۔ قوقان بیگ کے بیٹے کا نام مرزا عبداللہ بیگ تھا جو غالب کے پدر بزرگوار تھے۔ اس سلسلہ حسب و نسب سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ غالب کا تعلق ایران کے شاہی خاندان سے تھا، اس لئے غالب نے ورثے میں جسمانی اور ذہنی صلاحیتیں حاصل کی ہیں۔ جسمانی اعتبار سے وہ حسین اور خوش رو تھے اور قد و قامت اور ڈیل ڈول کے اعتبار سے نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ ذہنی اعتبار سے اُن میں خود بینی کا رجحان پیدا ہو گیا تھا اور اُن کو اپنی نسلی برتری پر بہت ناز تھا۔

مرزا غالب کی شخصیت پر اُن کے ماحول کا بھی اثر پڑا ہے۔ اُنہوں نے دولت و امارت کے ماحول میں آنکھ کھولی۔ غالب جب پانچ سال کے تھے تو اُن کے والد کا انتقال ہو گیا۔ وہ بختاور سنگھ راجہ الور کی حمایت میں مارے گئے تھے۔ اس لئے راجہ نے دو گاؤں اور کسی قدر روزینہ غالب اور اُن کے چھوٹے بھائی یوسف کی پرورش کے لئے مقرر کر دیا تھا۔ باپ کے انتقال کے بعد اُن کے چچا مرزا نصراللہ بیگ نے اُن کی پرورش کی۔ مرزا نصراللہ بیگ لارڈ لیک کے ملازم تھے اور اُنہوں نے ہلکر سلطنت کے سپاہیوں سے سونک اور سونسا کے دو علاقے چھین لئے تھے جن کو لارڈ لیک نے اُنہیں کو بخش دیا تھا۔ اس کے ایک سال کے بعد مرزا نصراللہ بیگ ایک معرکہ میں ہاتھی سے گر کر فوت ہو گئے۔ مرزا نصراللہ بیگ کی وفات کے بعد اُن کے سالے نواب احمد بخش نے اُن کے متعلقین کی پرورش کی ذمہ داری لی۔ اُنہوں نے اس کی صورت یہ نکالی کہ لارڈ لیک نے نواب احمد بخش کو اُن کی خدمات کے عوض فیروز پور۔ جھرکہ اور لوہارو کا علاقہ بخش دیا تھا۔ اس کے عوض میں وہ برطانوی حکومت کو ۲۵ ہزار روپے سالانہ ادا کرتے تھے۔ اب نواب احمد بخش نے لارڈ لیک سے یہ طے کیا کہ ۲۵ ہزار روپیہ سالانہ معاف کر دیا جائے اور اب

---

1 ABNOR PSYCHOLOGY AND MODERN LIFE By JAMES C COLEMAN P61



۱۰ ہزار روپیہ سالانہ اپنے فوجی دستے پر خرچ کریں گے اور ۱ ہزار روپیہ سالانہ مرزا نصر اللہ بیگ کے متعلقین پر صرف کریں گے۔ کچھ عرصے کے بعد نواب احمد بخش نے مرزا نصر اللہ بیگ کے متعلقین پر خرچ کی جانے والی رقم کو ۵ ہزار روپیہ سالانہ طے کرا لیا۔ اور اس کا بٹوارہ یوں کیا کہ ۲ ہزار روپے سالانہ خواجہ حاجی کو ملیں اور باقی تین ہزار میں سے ۱½ ہزار روپیہ سالانہ مرزا نصر اللہ بیگ کی ماں اور تین بہنوں کو ملیں اور ۱½ ہزار روپیہ سالانہ مرزا غالب اور مرزا یوسف پر خرچ ہوں۔ اس طرح غالب کو ۷۵۰ روپیہ سالانہ کی رقم بطور پنشن مل جاتی تھی۔

مرزا غالب اپنے ننھیال کی طرف سے بھی کافی مالدار تھے۔ اُن کے نانا خواجہ غلام حسین کمیدان کے پاس آگرہ میں کافی جائداد تھی۔ غالب کا بچپن اُن کے ننھیال ہی میں گذرا، اس لئے اُن کو بچپن میں معاشی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ غرض یہ کہ مرزا غالب کا ماحول امیرانہ اور رئیسانہ تھا۔ در اصل غالب پر اُن کی نسل اور اُن کے ماحول کا گہرا اثر پڑا ہے جس کا اظہار اُن کے مختلف اشعار سے ہوتا ہے۔ مثلاً ایک قطعہ میں انہوں نے اپنی خاندانی برتری کا اظہار کیا ہے ؎

غالب از خاک پاک تورانیم — لاجرم در نسب فرہ مندیم
ترک زادیم و در نژاد ہمی — بہ سترگان قوم پیوندیم
ایبک از جماعۂ اتراک — در تمامی ز ماہ دہ چندیم
فن آبائی ما کشاورزیست — مرزبان زادۂ سمرقندیم
در معنی سخن گشادہ — خود چہ گوئیم تا چہ و چندیم
فیض حق را کمینہ شاگردیم — عقل کل را ہمینہ فرزندیم
ہم بہ تابش بہ برق ہم لفتیم — ہم بہ بخشش بہ ابر مانندیم
بہ تلاشے کہ ہست فیروزیم — بہ معاشے کہ نیست خرسندیم
ہمہ بر خویشتن ہمی گوئیم — ہمہ بر روزگار می خندیم

غالب کی ایک رباعی میں بھی اسی خاندانی برتری کی جھلک موجود ہے ؎

غالب بہ گہر ز دودۂ زادشمم — زاں رو بہ صفائی دم تیغ است دمم
چوں رفت سپہ گری ز دم جنگ بہ شعر — شد تیر شکستۂ نیاگاں قلمم

ایک اُردو شعر میں بھی غالب نے اپنی خاندانی برتری کا اظہار کیا ہے ؎

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری — کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

ان اشعار سے غالب کی خود بینی صاف ظاہر ہوتی ہے۔ خاندانی برتری کے علاوہ انہوں نے اپنی شاعری پر بھی ناز کیا ہے اور اپنے کو ایک عظیم شاعر کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے — کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور
ادائے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا — صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لئے
آج مجھ سا نہیں زمانے میں — شاعر نغز گو و خوش گفتار
ریختے کے تمہیں اُستاد نہیں ہو غالب — کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا
یہ مسائل تصوف، یہ ترا بیان غالب — تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا
گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے — جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے



آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

ہم سخن فہم ہیں، غالب کے طرفدار نہیں
دیکھیں اس سہرے سے کہہ دے کوئی بہتر سہرا

غالب کے ان سادہ اشعار سے خود بینی ظاہر ہوتی ہے۔ ہم اس رجحان کو تعلّی بھی کہہ سکتے ہیں۔ دراصل نرگسی انسان کی توجہ صرف اپنی ذات پر مرکوز رہتی ہے۔ اس لئے وہ اہلِ علم کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھتا ہے۔ نرگسی انسان اپنے جسم سے بھی محبت کرتا ہے اور بعض اوقات خود کو حسین بھی تصور کرنے لگتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ خود کو معشوق قرار دیتا ہے۔ غالب نے بھی اپنے ایک شعر میں معشوق کی ایک ادا چرائی ہے۔ وہ فرماتے ہیں

عاشق ہوں پہ معشوق فریبی ہے مرا کام
مجنوں کو برا کہتی ہے لیلیٰ مرے آگے

عام طور سے معشوق اپنے عاشق کو فریب دیتا ہے مگر یہاں غالب نے اپنے معشوق کو فریب میں مبتلا کر دیا ہے۔

غالب کی خودداری

فرائڈ نے نرگسیت کے زمرے میں خودداری کو بھی شامل کیا ہے۔ دراصل خودداری کا تعلق انا سے ہے۔ یہاں یہ بات قابلِ وضاحت ہے کہ جنسی جبلت اور انانیتی جبلت میں فرق ہے۔ اس لحاظ سے خودداری کا تعلق نرگسی قوتِ جنسی سے ہے۔ فرائڈ کا خیال ہے کہ عموماً عاشق کے ضمیر میں خودداری کا شعلہ مدھم ہوتا ہے مگر معشوق کی ذات میں خودداری کی لو تیز ہوتی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ عاشق فروتنی اختیار کرتا ہے اور معشوق کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اپنی خودداری کو کچل دیتا ہے۔ اس کے علاوہ اگر عاشق اپنی محبت میں ناکام ثابت ہوتا ہے تو اس کی خودداری بالکل پامال ہو جاتی ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جسمانی کمزوری یا دماغی خلل کی بنا پر ایک انسان کی خودداری پر ضرب کاری لگتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ منتقل اعصابی خلل (TRANSFRENCE - NEUROSIS) کے مریضوں میں خودداری کی کمی محسوس ہوتی ہے۔

خودداری اور محبت کے تعلق کو سمجھنے کے لئے دو کیفیات پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ پہلی صورت میں انا اور اس کے معیار میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔ دوسری صورت میں جنسی جذبات کا انسداد ہو جاتا ہے جس کی بنا پر خودداری مجروح ہو جاتی ہے۔ لیکن جب عاشق اپنی محبت میں کامیابی حاصل کرتا ہے اور محبوب بھی اس پر فریفتہ نظر آتا ہے تو خودداری میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

۲ اگر ہم غالب کی شخصیت پر نظر ڈالیں تو ہم کو محسوس ہوگا کہ ان میں بڑی حد تک خودداری موجود تھی۔ اس کا پہلا سبب تو وہی ہے جس کا ذکر اس سے قبل کیا جا چکا ہے۔ یعنی خاندانی برتری نے غالب میں ایک شانِ خودداری پیدا کر دی تھی۔ اس کے علاوہ غالب ایک کامیاب عاشق تھے۔ انہوں نے اپنی ابتدائی عمر میں ایک ڈومنی سے عشق کیا تھا۔ وہ ڈومنی بھی غالب پر شیدا تھی۔ اس طرح غالب کو اپنی محبت کا جواب مل رہا تھا۔ یعنی دونوں طرف آگ برابر لگی ہوئی تھی، اس لیے محبت کے شعلے پھول بن کر برس رہے تھے۔ جب اس ڈومنی کا انتقال ہو گیا تو غالب کو سخت صدمہ پہنچا۔ انہوں نے اس کی موت پر ایک پُر درد غزل کہی جو اُن کے شکستہ دل کی جھنکار معلوم ہوتی ہے۔ اُس کے چند اشعار درج ذیل ہیں

درد سے میرے ہے تجھ کو بے قراری ہائے ہائے
کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری ہائے ہائے

تیرے دل میں گر نہ تھا آشوبِ غم کا حوصلہ
تو نے پھر کیوں کی تھی میری غمگساری ہائے ہائے

کیوں مری غمخوارگی کا تجھ کو آیا تھا خیال
دشمنی اپنی تھی میری دوست داری ہائے ہائے

عمر بھر کا تو نے پیمانِ وفا باندھا تو کیا
عمر کو بھی تو نہیں ہے پائداری ہائے ہائے

گلفشانی ہائے نازِ جلوہ کو کیا ہو گیا
خاک پر ہوتی ہے تیری لالہ کاری ہائے ہائے

PSYCHOLOGICAL THEORY BY FREUD EDITAD BY PHILIP RIEFF ص ۱۸

غالب نمبر ۱۹۶۹ء



خاطر ہمیں

رسوائی سے جا چھپا نقاب خاک میں ختم ہے الفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے

اِن اشعار سے یہ بات منکشف ہو جاتی ہے کہ ڈومنی بھی غالب کی محبت میں گرفتار تھی۔ اس لحاظ سے غالب کا عشق کامیاب تھا۔ اس کامیابی نے غالب کو اور بھی خوددار سا دیا تھا۔ وہ معشوق کے ناز و غمزہ کو برداشت کرنے کے لیے تیار رہتے مگر اپنی خودداری پر آنچ نہیں آنے دیتے تھے۔ چنانچہ وہ معشوق کے سلسلہ میں فرماتے ہیں ؎

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں
سُبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

غالب کسی غیر کا احسان بھی گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں ؎

غیر کی منت نہ کھینچوں گا پئے توقیرِ درد
زخم مثلِ خندۂ قاتل ہے سراپا نمک

غالب کا یہ قول ہے کہ محبوب کے حصول کے لیے رقیب کا احسان لینا عشق پر داغ لگانا ہے ؎

عشق و مزدوریِ عشرت گہِ خسرو کیا خوب
ہم کو تسلیم نکو نامیِ فرہاد نہیں

غالب کی خودداری کا یہ عالم ہے کہ وہ مرض کی حالت میں دوا کا بھی احسان گوارا نہیں کر سکتے ہیں ؎

درد منت کشِ دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا

غالب کی خودداری اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ وہ بے جان اشیا میں بھی خودداری کی جھلک دیکھنا چاہتے ہیں ؎

دیوار بارِ منتِ مزدور سے ہے خم
اے خانماں خراب نہ احساں اُٹھائیے

اِن اشعار سے غالب کی خودداری پر خوبی روشنی پڑتی ہے۔

غالب کا ناز و غرور

خودداری انسانیت کے جسم کا زیور ہے۔ یہ رُجحان انسان کو بلند مدارج و منازل تک پہنچا دیتا ہے۔ دراصل خودداری کا جذبہ خود ادّعائی SELF ASSERTION اور فروتنی SUBMISSION کے توازن سے پیدا ہوتا ہے۔ لیکن جب اس قسم کا توازن ختم ہو جاتا ہے تو خود ادّعائی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اِس کیفیت کو ہم غرور سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ لیکن جب یہ احساس معمولی ہوتا ہے اور اس کا مقصد صرف اطمینانِ قلب ہوتا ہے تو ہم اِس کو ناز VANITY کے نام سے موسوم کر سکتے ہیں۔[1]

غالب کی خودداری نے بھی بعض اوقات آگے قدم بڑھایا ہے اور وہ غرور و ناز تک پہنچ گئی ہے۔ غالب کے یہاں یہ ساری کیفیات خود بینی اور تجربات کی بنا پر پیدا ہو گئی ہیں۔ جب غالب کا انا سر بلند کرتا ہے تو غرور و ناز سے ٹکرا جاتا ہے۔ غالب کے دیوان میں اِس قسم کے اشعار جا بجا ملتے ہیں ؎

ہم کہاں کے دانا تھے، کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہوا غالب دشمن آسماں اپنا

غالب ظاہری طور پر تو یہ کہہ رہے ہیں کہ نہ وہ دانا ہیں اور نہ وہ ہنرمند ہیں مگر دراصل اُن کے کہنے کا مطلب یہی ہے کہ وہ دانائی اور ہنرمندی میں یکتا ہیں ؎

فنا تعلیمِ درسِ بیخودی ہوں اُس زمانے سے
کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ دبستاں پر

اِس شعر میں غالب نے خود کو مجنوں سے بڑا عاشق قرار دیا ہے۔ اگرچہ ایسا نہیں ہے۔ مجنوں نے لیلیٰ کے عشق میں تجرد کی جس قدر خاک چھانی، غالب ڈومنی کے عشق میں دلّی میں اُس کے سرِ عشیر بھی سرگرداں نہیں رہے۔ اِسی قسم کی شیخی غالب کے

[1] AN OUTLINE OF PSYCHOLOGY BY MCDOUGALL P. 446.

غالب ۱۸۶۹ء



شاعرِ جینئی

مندرجۂ ذیل اشعار میں بھی پائی جاتی ہے ۔

قدِ گیسو میں قیس و کوہکن کی آزمائش ہے ۔ جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے ۔ ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

اک کھیل ہے اورنگِ سلیماں مرے نزدیک ۔ اک بات ہے اعجازِ مسیحا مرے آگے

غالب کی طلبِ جاہ و حشمت

نرگسی انسان میں کچھ ایسی خصوصیات پیدا ہو جاتی ہیں جو اُس کو سوسائٹی سے جُدا کر دیتی ہیں ۔ نرگسی انسان کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ اگر دُوسرے لوگ اُس سے محبت نہیں کر سکتے ہیں ، اور اُس کو قابلِ تعظیم نہیں تسلیم کرتے ہیں تو کم از کم اُس کی طرف متوجہ تو ہوں اور اُس کی تعریف تو کریں ۔ اس طرح تعریف محبت کا بدل ثابت ہو سکتی ہے ۔ یہ حقیقت ہے کہ نرگسی انسان ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا کا دیوانہ ہوتا ہے اور جب اُس کو اس معاملہ میں ناکامی ہوتی ہے تو وہ خود کو اپنی شکست کی آواز سمجھنے لگتا ہے ۔ اگر نرگسی انسان کی تعریف میں لب نہیں کھلتے ہیں تو وہ سمجھتا ہے کہ اہلِ دنیا کو اُس کی ضرورت نہیں ہے ۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر رہتا ہے کہ دوستی اور محبت میں تنقید کی بھی گنجائش ہے ۔ وہ تنقید کو عداوت پر محمول کرتا ہے ۔ وہ دُوسروں کے خلوص کو تعریف اور خوشامد کے معیار پر جانچتا ہے ۔ وہ سمجھتا ہے کہ جو لوگ اُس کی تعریف کرتے ہیں وہ نیک اور برتر ہیں اور جو اس کی مدح و ستائش سے گریز کرتے ہیں اُن کو وہ ذلیل و خوار تصور کرتا ہے مگر ایسی تصویر پر اُس کی زندگی کا دار و مدار ہے[1]

اگرچہ نرگسی انسان ہمہ وقت طلبِ ستائش میں سرگرداں رہتا ہے اور بسا اوقات شکستِ دل کی آواز سُنتا ہے ۔ مگر اس کا بھی امکان ہے کہ طلبِ ستائش کی کوشش اُس کو کامیابی سے ہمکنار کر دے ۔ یا اُس میں ایسی خوبیاں پیدا کر دے جو سماج میں اچھی نظروں سے دیکھی جاتی ہیں یا جو انسان کو ہر دل عزیز بنا دیتی ہیں ۔ مگر اس تصویر کا دوسرا رُخ بھی ہے ۔ ایسا شخص گمراہ بھی ہو سکتا ہے ۔ وہ کسی عورت کا انتخاب اُس کے حُسن کی بنا پر نہیں کرتا ہے بلکہ یہ مقصد مدِّنظر رہتا ہے کہ اُس کو ایک ستائش گر مل گیا ہے جس سے اُس کی عظمت میں اضافہ ہوگا ۔

دنیا میں ایسے انسان بہت کم ہیں جو کام کو کام کی حیثیت سے کریں ، بلکہ کام کے پس پردہ تقریباً ہر انسان کا مقصد حصولِ عزت و شہرت ہوتا ہے ۔ یعنی اُس کی نظر میں جوہر کی بہ نسبت عرض کی وقعت زیادہ ہے ، اس لئے اس کا خدشہ ہوتا ہے کہ کہیں تصنع ، بناوٹ اور موقع پرستی تعمیر کا گلا نہ گھونٹ دے ۔ خصوصاً نرگسی انسان کے لئے یہ خطرہ اور بھی بڑھ جاتا ہے ۔ اگر کوئی انسان تصنع کا سہارا لے کر عزت حاصل کر بھی لیتا ہے تو وہ بجا طور پر پریشان رہتا ہے ، کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ یہ صرف چار دن کی چاندنی ہے ۔ بہر حال نرگسیت کے اضافے میں تصنع کا زبردست ہاتھ ہوتا ہے ۔

نرگسی انسان کی پریشانی کو دُور کرنے کا ذریعہ نرگسیت ہی ہے ۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اُس کی نرگسیت میں اضافہ کر دیا جائے تاکہ وہ اُمید کی تتلی کے پیچھے دوڑتا رہے اور وہ شوخ و شنگ حسینہ اُس کے ہاتھ نہ آئے ۔ اس کا بھی امکان ہے کہ وہ کسی دن اُمید کی تتلی کا دامن پکڑ لے ۔ بعض اوقات شکست خوردگی کامرانی کی ضامن بن جاتی ہے ۔ اگر نرگسی انسان مصنف ہے اور اُس کی تصانیف کو مقبولیت حاصل نہیں ہو رہی ہے تو اس کا بھی امکان ہے کہ اُس کے خیالات کا کارواں عام مسافروں سے بہت آگے ہے یا اُس کے احساسات گردِ کارواں میں چھُپ گئے ہوں ۔ اس لئے اہلِ عالم کی نظر سے اوجھل ہوں ۔ اگر کوئی تیز رو رہروؤں کے ساتھ نہیں چل سکتا ہے تو ممکن ہے کہ وہ کوئی نیا اور حسین راستہ تلاش

---

1 NEW WAYS PSYCHOANALYSIS BY KAREN HORNEY P 93

...رہا ہو۔ ایسی صورت میں ہم کو اس کی ذہنی صلاحیتوں (INTELLECTUAL FACULTIES) کا اعتراف کرنا ہوگا۔

غالب بھی دیگر کسی انسانوں کی طرح جاہ و حشمت کے طالب تھے۔ یہ طلب اور جستجو غالب میں اردو کے دیگر شعراء کی بہ نسبت زیادہ پائی جاتی ہے۔ اس کا سبب یہی ہے کہ ان کی رگوں میں ایبک وادیوں اور سلجوقیوں کا خون دوڑ رہا تھا، اس لئے وہ جاہ و حشمت اور عظمت و سطوت میں خود کو بہادر شاہ ظفر سے کم نہیں سمجھتے تھے۔ مگر غالب بے ملک کے بادشاہ تھے۔ وہ صرف اپنے خاندان پر ناز کر سکتے تھے اور سپہ گری جو ان کے آبا و اجداد کی سو پشت سے پیشہ تھی ختم ہو چکی تھی۔

بہرحال غالب کی قدر ان کے زمانے میں حسب خواہ نہیں ہو سکی۔ اس کا سبب یہ بھی ہے کہ ان کے عہد میں سلطنتِ مغلیہ کا انحطاط ہو رہا تھا۔ جب حکومت ہی کا چراغ بجھنے کے قریب تھا تو غالب کو روشنی کیونکر مل سکتی تھی۔ اس کے باوجود مغلیہ حکومت نے حسبِ مقدور غالب کی قدر کی۔ غالب کو بادشاہ کی طرف سے نجم الدولہ، دبیر الملک اور نظام جنگ کے خطابات عطا ہوئے۔ اس کے علاوہ ان کو منصب بھی بخشا گیا۔ مگر غالب اس اعزاز سے مطمئن نہیں تھے۔

بہادر شاہ ظفر کی گرفتاری کے بعد غالب نے انگریزوں کی مدح سرائی شروع کر دی۔ اس میں بھی جاہ و حشمت کی طلب شامل ہے مگر انگریزوں نے غالب کی طرف کوئی توجہ نہیں کی کیوں کہ ان کا خاص مقصد انگریزی حکومت کو مضبوط کرنا تھا۔ اس کے علاوہ وہ اردو شاعری کے رموز و نکات سے واقف نہ تھے۔ اس لئے انگریزی حکومت نے غالب کے ساتھ شاہانہ سلوک نہیں کیا۔ غرض کہ غالب دلی کی آمد سے وفات تک غیر مطمئن رہے اور شکوہ گزاروں میں مصروف رہے۔ ان کے مندرجۂ ذیل اشعار ان کی بے اطمینانی کو ظاہر کرتے ہیں۔

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب — ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے
جسے نصیب ہو روزِ سیاہ میرا سا — وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو
مرے جہان کے اپنی نظر میں خاک نہیں — سوائے خونِ جگر سو جگر میں خاک نہیں
میری قسمت میں غم جو اتنا تھا — دل بھی یارب کئی دیے ہوتے
کیا وہ نمرود کی خدائی تھی — بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا
میں اور بزمِ مے سے یوں تشنہ کام آؤں — گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا
بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب — تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں
ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے اسد — کھلا کہ فائدہ عرضِ ہنر میں خاک نہیں
پُر ہوں میں شکوے سے یوں راگ سے جیسے باجا — اک ذرا چھیڑیے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے
رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی سے معاف — آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے
ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے — بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

ان اشعار سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ غالب واقعی شکووں سے اسی طرح پُر تھے جس طرح راگ سے باجا پُر ہوتا ہے۔ اپنی اس افسردگی اور آزردہ خاطری کو دور کرنے کے لئے انہوں نے قصائد کہے اور جاہ و حشمت کے طالب ہوئے۔ ان کی غزلوں میں بھی کچھ ایسے اشعار نظر آتے ہیں جو ان کی اس طلب پر عکس ریزی کرتے ہیں مثلاً ؎

غالب بھی گر نہ ہو تو کچھ ایسا ضرر نہیں — دنیا ہو یارب اور مرا بادشاہ ہو

...W WAYS IN PSYCHOANALYSIS By KAREN HORNEY P 95



ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا ورنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے
غالب گر اس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی

غالب نے عزت حاصل کرنے کے لئے بہادر شاہ کی تعریف میں قصائد کہے ہیں ۔

قبلۂ چشم و دل بہادر شاہ مظہر ذو الجلال والاکرام
شہسوار طریقۂ انصاف نو بہار حدیقۂ اسلام
جس کا ہر فعل صورت اعجاز جس کا ہر قول معنیٔ الہام
بزم میں میزبان قیصر و جم رزم میں اوستاد رستم و سام

ایک اور قصیدے میں بہادر شاہ ظفر کی تعریف موجود ہے ۔

بادشہ کا نام لیتا ہے خطیب اب علوئے پایۂ منبر کھلا
سکۂ شہ کا ہوا ہے روشناس اب عیار آبروئے زر کھلا
شاہ کے آگے دھرا ہے آئینہ اب مآل سعیٔ اسکندر کھلا
ملک کے وارث کو دیکھا خلق نے اب فریب طغرل و سنجر کھلا

غالب جاہ و حشمت کی حرص میں اس قدر دیوانے ہوگئے کہ اپنے آباؤ اجداد کو بھی بہادر شاہ ظفر سے کمتر قرار دینے کے لیے تیار ہیں۔ ظاہر ہے کہ طغرل اور سنجر سلجوقی حکومت کے اعلیٰ مرتبت بادشاہ گذرے ہیں جن کے سامنے بہادر شاہ ظفر کی کوئی حقیقت نہیں ہے مگر غالب حرص و ہوس کے اسیر ہیں یہاں تک کہ اس موقع پر انھوں نے اپنی نسلی برتری کو بھی فراموش کر دیا ہے۔

بہادر شاہ ظفر کی تعریف کے بعد غالب انگریزوں کی مدح سرائی میں مصروف ہو گئے۔ چنانچہ انھوں نے ایلن براؤن کی تعریف میں قصیدہ کہا ۔

ملاذ کشور و لشکر پناہ شہر و سپاہ جناب عالیٔ ایلن برون والا جاہ
بلند رتبہ وہ حاکم وہ سرفراز امیر کہ باج تاج سے لیتا ہے جس کا طرف کلاہ
وہ محض رحمت و رافت کہ بہر اہل جہاں نیابت دم عیسیٰ کرے ہے جس کی نگاہ
وہ عین عدل کہ دہشت سے جس کی پرسش کی بنے ہے شعلۂ آتش انیس پرۂ کاہ

ایک قصیدہ میکلوڈ کی تعریف میں لکھا ہے ۔

جم رتبہ میکلوڈ بہادر کہ وقت رزم ترک فلک کے ہاتھ سے وہ چھین لیں حسام
سچ ہے تم آفتاب ہو جس کے فروغ سے دریائے نور ہے فلک آبگینہ فام
اخبار لودھیانہ میں میری نظر پڑی تحریر ایک جس سے ہوا جس سے تلخ کام
ٹکڑے ہوا ہے دیکھ کے تحریر کو جگر کاتب کی آستیں ہے مگر تیغ بے نیام
وہ فرد جس میں نام ہے میرا غلط لکھا جب یاد آ گئی ہے کلیجہ لیا ہے تھام
سب صورتیں بدل گئیں ناگاہ یک قلم نمبر رہا نہ نذر نہ خلعت کا انتظام
ستر برس کی عمر میں یہ داغ جاں گداز جس نے جلا کے راکھ مجھے کر دیا تمام

غالب نے یہ قصیدہ ستر سال کی عمر میں کہا۔ اس پیری میں بھی وہ قناعت سے کوسوں دور رہے اور نمبر، نذر اور خلعت کی خواہش کرتے رہے ۔

غالب نمبر ۶۶۹

شاعر [illegible]

[illegible] انسان کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ لوگ اُس کی ستائش میں مصروف رہیں۔ اُس کو اس سے



واسطہ [illegible] کہ وہ کسی رتبے کا اہل ہے کہ نہیں بلکہ وہ ہمہ وقت اپنی شخصیت کی پرستش

[illegible] ہے۔

غالب کی دنیا سے کنارہ کشی

ELEMENTS OF PSYCHOLOGY کے مصنفین نے لکھا ہے کہ مشکلات کے موقع پر انسان دو راستے اختیار کرتا ہے۔ یا تو وہ خطرے کا ڈٹ کر مقابلہ کرتا ہے یا پھر راہِ فرار اختیار کرتا ہے۔ پہلی صورت میں انسان خود نمائی۔ مماثلت۔ معاوضہ۔ عقلمندی اور منصوبہ سے کام لیتا ہے۔ ہماری خواہش ہوتی ہے کہ دنیا ہماری طرف متوجہ ہو اور یہ محسوس کرے کہ ہم بھی دنیا میں سانس لیتے ہیں۔ اس قسم کا جذبہ انسان میں بچپن ہی سے ہوتا ہے۔ بعض بچے توجہ حاصل کرنے کے لئے مختلف شرارتیں کرتے ہیں۔ مثلاً خود نمائی کرنا۔ دوسروں کو پریشان کرنا۔ جھگڑا کرنا اور بڑوں سے گستاخی کرنا۔ کچھ مراقی لوگوں میں اپنی تندرستی پر زیادہ توجہ کرنے کی خصلت پیدا ہو جاتی ہے اور معمولی سے مرض میں وہ آسمان سر پر اٹھا لیتے ہیں۔ غرض کہ وہ دوسروں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں۔

بعض اوقات انسان اپنی ناکامی کے احساس کو چھپانے کے لئے ایسے شخص سے خود کو مماثل کر لیتا ہے جس کے سر پر کامیابی کا سہرا ہوتا ہے۔ جن لوگوں میں احساسِ کمتری کی شدت ہوتی ہے وہ اس حربے کو زیادہ استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً کوئی دماغی مریض خود کو نپولین یا حضرت عیسیٰؑ تصور کرنے لگتا ہے۔ کبھی کبھی کوئی انسان اپنی خامی کی تلافی دیگر ذرائع سے کرتا ہے۔ مثلاً ایک نحیف الجثہ انسان زوردار آواز میں بول کر اپنی کمزوری کو چھپانے کی کوشش کرتا ہے یا ایک ناکام عاشق ادبی کامیابی حاصل کر کے اپنے نقصان کی تلافی کرتا ہے۔ ناکامی کی صورت میں عام طور سے انسان عقل سے کام لیتا ہے اور وہ اپنے دل کو یہ کہہ کر تسکین دیتا ہے کہ اپنی خامیوں کی بنا پر وہ کامیابی حاصل نہیں کر سکا۔ مگر وہ شخص جو دماغی خلل کا شکار ہوتا ہے اس انداز میں نہیں سوچتا ہے بلکہ وہ اپنی ناکامی کے مہمل اسباب پیش کرتا ہے۔

ناکامی کی صورت میں انسان اپنی خامیوں کو دوسری اشیا کی خامی کی طرف منتقل کر دیتا ہے۔ اس قسم کا خیال وہ ایک خاص مقصد کے تحت ظاہر کرتا ہے۔ مثلاً ایک ناکام کھلاڑی خود کے بجائے اپنے بلّے کو موردِ الزام ٹھہراتا ہے۔ دماغی خلل کے لوگ اپنی ناکامی کا سبب اپنے آباؤ اجداد یا دیوتاؤں کی ناراضگی قرار دیتے ہیں[1]۔

انسان کے سامنے ایسے بھی پیچیدہ مواقع آتے ہیں جب وہ اپنے میں تابِ مقاومت نہیں دیکھتا ہے تب وہ مشکلات سے گریز کرتا ہے اور اپنی بزدلی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ ایسی صورت میں وہ گوشۂ خلوت میں زندگی گذارنے لگتا ہے۔ کسی مقابلے کے امتحان میں شرکت نہ کرنا اس کی واضح مثال ہے۔ کیونکہ انسان سوچتا ہے کہ جب وہ مقابلے میں شرکت ہی نہ کرے گا تو شکست کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔

گریز انکار کی صورت میں بھی رونما ہوتا ہے۔ خصوصاً بعض بچے والدین کے حکم کو ٹھکرا دیتے ہیں یا پھر اُن کے حکم کے خلاف کام کرتے ہیں۔ بالغ انسانوں میں بھی یہ رجحان پایا جاتا ہے۔ یہ ایک قسم کی بغاوت ہے جس کے ذریعے انسان مشکل مواقع سے نجات حاصل کر لیتا ہے۔

کنارہ کشی کی ایک صورت مراجعت (REGRESSION) بھی ہے۔ جب بچہ کسی مشکل موقع پر پوری مقابلے کی تاب نہیں دیکھتا ہے تو وہ رونے لگتا ہے۔ اس طرح وہ اپنی طفلی کے دور میں مراجعت کرتا ہے۔ بعض وقت بالغ لوگ بھی

---

1 ELEMENTS OF PSYCHOLOGY By KOTHURKAR AND HAROLIKAR P 193-195



گریہ وزاری شروع کردیتے ہیں اور وہ اس حرکت کا مظاہرہ کرکے اپنے عہدِ طفلی میں واپس جاتے ہیں۔
انسان کنارہ کشی کا ایک اور طریقہ اختیار کرتا ہے۔ وہ واہمہ کی دنیا میں زندگی بسر کرنے لگتا ہے۔ اس کی عادت بچپن ہی سے پڑ جاتی ہے مثلاً ایک چھوٹی بچی ماں بن جاتی ہے اور پھر اُسی کی طرح نقل و حرکت کرنے لگتی ہے۔ اسی طرح ایک چھوٹا بچہ باپ۔ پولیس میں یا حاکم بن جاتا ہے اور اپنے احکام جاری کرنے لگتا ہے۔ اسی طرح بالغ انسان بھی دن کے خواب (DAY - DREAMING) سے جی بہلاتے ہیں اور تصورات میں مختلف شکلیں اختیار کرتے ہیں۔ اس قسم کے ہوائی محل تیار کرنا کسی انسان کے لئے مفید ہے کیونکہ وہ اپنی اصلی غمگین دنیا سے تھوڑی دیر کے لئے نجات پاجاتا ہے اور سکونِ قلب کی دولت حاصل کرلیتا ہے۔

انسان انسداد (REPRESSION) کے ذریعے بھی موقع سے گریز کرتا ہے۔ وہ اپنے بہت سے جذبات کو دبا دیتا ہے اور اس طرح مشکل ماحول پر قابو حاصل کرلیتا ہے۔ اگر انسان اپنے جذبات پر قابو حاصل نہیں کرپاتا ہے تو وہ مشکلات سے دوچار ہوتا ہے اور اس کی زندگی تلخ ہوجاتی ہے۔ اس لئے انسداد بھی دنیا سے کنارہ کشی کا ایک موثر حربہ ہے۔

دنیا سے کنارہ کشی کا رجحان غالب کے یہاں بھی ملتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اُن کو اپنی زندگی میں کئی بار مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ یہی نہیں بلکہ ذلت بھی اٹھانا پڑی۔ مثلاً جائداد کے بٹوارے میں اُن کی حق تلفی کی گئی۔ چوسر کھیلنے کی بنا پر ایک بار اُن کو جیل جانا پڑا۔ "قاطعِ برہان" لکھنے کی وجہ سے اُن پر گالیوں کی بوچھار کی گئی۔ غدر کے زمانے میں اُن کی معاشی حالت بہت خراب ہوگئی۔ ان تمام واقعات میں قید ہونے کا واقعہ اُن پر بہت شاق گذرا جس نے اُن کو دنیا سے کنارہ کشی پر مائل کیا۔ چنانچہ وہ اس سلسلے میں لکھتے ہیں۔

"میری یہ آرزو ہے کہ اب دنیا میں نہ رہوں اور اگر رہوں تو ہندوستان میں نہ رہوں۔ رُوم ہے، مصر ہے، ایران ہے، بغداد ہے۔ یہ بھی جانے دو۔ خود کعبہ آزادوں کی جائے پناہ اور آستانۂ رحمۃ للعالمین دلدادوں کی تکیہ گاہ ہے۔ دیکھئے وہ وقت کب آئے گا کہ درماندگی کی قید سے جو اس گذری ہوئی قید سے زیادہ جانفرسا ہے، نجات پاؤں اور بغیر اس کے کہ کوئی منزل مقصود قرار دوں سر بہ صحرا نکل جاؤں"[1]

غالب کی عبارت بالکل اس بات کو واضح کرتی ہے کہ وہ دنیا سے کنارہ کش ہوجانا چاہتے ہیں۔ اُن کے بہت سے اشعار بھی اس رجحان کے ثبوت میں پیش کئے جاسکتے ہیں ؎

رہئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیئے
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو

پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار
اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

ان اشعار میں تو واضح طور پر کنارہ کشی کی ذہنیت پائی جاتی ہے۔ مگر غالب کے یہاں ایسے بہت سے اشعار ہیں جو اُن کی مراجعت کی غمازی کرتے ہیں ؎

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

تھی وطن میں شان کیا غالبؔ کہ ہو غربت میں قدر
بے تکلف ہوں وہ مشتِ خس کہ گلخن میں نہیں

---

[1] یادگارِ غالب۔ مولانا حالی۔ مرتبہ خلیل الرحمٰن داؤدی ص ۴۲



مانعِ دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں
ایک چکر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں

کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالبؔ
تم کو بے مہریٔ یارانِ وطن یاد نہیں

شوریدگی کے ہاتھ سے سر ہے وبالِ دوش
صحرا میں اے خدا کوئی دیوار بھی نہیں

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

اللہ رے ذوقِ دشت نوردی کہ بعدِ مرگ
ہلتے ہیں خود بخود مرے اندر کفن کے پاؤں

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

اُگ رہا ہے در و دیوار سے سبزہ غالبؔ
ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

بہت سہی غمِ گیتی شراب کم کیا ہے
غلامِ ساقیٔ کوثر ہوں مجھ کو غم کیا ہے

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

ان تمام اشعار سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ غالبؔ دنیا کے شور و شر سے ہٹ کر خلوت کی زندگی گذارنا چاہتے ہیں۔

غالبؔ کی تصوریت

ویلنٹائن کے قول کے مطابق تصوریت (IDEALS) کا مطلب ہے کہ کوئی شخص کیا ہونا پسند کرتا ہے۔ اس کے نظریات کا انحصار عوام پر بھی ہے۔ عوام اس کے بارے میں جو نظریات رکھتے ہیں وہ اس کے کردار کی تشکیل میں معاون و مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ اس طرح وہ ایک انائیتی تصوریت (EGO-IDEAL) کی تعمیر کرتا ہے۔ اسی طرح اس کے ذہن میں ایک سماجی تصوریت (SOCIAL IDEAL) بھی ہوتی ہے مگر یہ ضروری نہیں کہ اس کی یہ تصوریت بہت بلند بھی ہو اس لئے کہ سماجی تصوریت انائیتی تصوریت سے جدا بھی ہو سکتی ہے، یہی نہیں بلکہ یہ اخلاقی تصوریت (MORAL IDEAL) سے بھی مختلف ہو سکتی ہے۔[1]

بہرحال نرگسی انسان کی ایک خصوصیت تصوریت بھی ہے۔ انسان کا انا اپنے گرد تصوریت کا خول تیار کرتا ہے، جس کے اندر وہ سانس لیتا رہتا ہے۔ اس موقع پر اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ تصوریت اور انا کا تعلق انسداد سے ہے دراصل انسداد کا سفر انا سے شروع ہوتا ہے یا یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس کی ابتدا خودداری سے ہوتی ہے۔ ایک انسان جن خیالات، تجربات، جذبات اور خواہشات کو شعوری طور پر اپنے دماغ میں جگہ دیتا ہے دوسرا شخص اُن کو غصہ اور نفرت سے ٹھکرا سکتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ایک انسان نے اپنا ایک نصب العین مقرر کر لیا ہے جس کے ترازو پر وہ اپنی ذات کو تولتا ہے جبکہ دوسرے شخص نے کسی نصب العین کی تعمیر نہیں کی ہے۔ دراصل کسی تصوریت کی تعمیر انسداد کی پہلی شرط ہے۔[2]

جب انسان ایک مثالی انا کی تعمیر کر لیتا ہے تو وہ اس سے محبت کرنے لگتا ہے۔ اس کی اس محبت کی نوعیت تقریباً ایسی ہی ہوتی ہے جیسی محبت اس نے بچپن میں اصلی انا سے کی تھی۔ اب اسی تصوریت کی طرف نرگسیت رجوع ہوتی ہے۔ یہ نرگسیت اس کی طفلانہ نرگسیت سے مشابہ ہوتی ہے جس کو انسان ترک کرنے پر آمادہ نظر نہیں آتا ہے۔ پھر یہی نرگسیت اپنے مالک کی تمام خوبیوں کا مرقع تصور کرنے لگتی ہے اسی بنا پر وہ دوسروں کی ملامت کا نشانہ بنتا ہے۔ اس کے علاوہ اس میں خود تنقیدی شعور بیدار ہو جاتا ہے اور وہ اپنی شخصیت کا جائزہ لیتا رہتا ہے لیکن اپنی کھوئی ہوئی نرگسیت

---

1 PSYCHOLOGY AND ITS BEARING ON EDUCATION BY VALENTINE P. 168, 169

2 GENERAL PSYCHOLOGICAL THEORY BY FREUD, EDITED BY PHILIP RIEFF P. 74



سے وہ انا امن بھی بنا سکتا ہے۔ اب جو خاکہ وہ اپنی آئندہ زندگی کے لئے تیار کرتا ہے وہ گم گشتہ نرگسیت کا احیا ہوتا ہے۔

اِس موقع پر ہم کو تصوّریت کی تعمیر اور ارتفاع (SUBLIMATION) پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے۔ ارتفاع ایک عمل ہے جس کا تعلق جنسی قوت کی تشفی سے ہے اور جس کا مقصد یہ ہے کہ جبلت کو جنسی لطف سے ہٹا کر کسی دوسری طرف رجوع کر دیا جائے۔ اِس طریقے میں زور جنسی موڑ پر دیا جاتا ہے۔

یہ کوئی تعجب خیز بات نہیں ہوگی اگر ہم یہ کہیں کہ ہمارے دماغ میں ایک خاص تنظیم ہوتی ہے جو نرگسی مسرت کو مثالی انا سے بچا لیتی ہے اور اس مقصد کے حصول کے لئے اصلی انا پر نظر رکھتی ہے۔ اِس قسم کی تنظیم کو ہم ضمیر (CONSCIENCE) کہہ سکتے ہیں۔ یہ ضمیر ہم کو قریبِ مشاہدہ کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے یا یوں کہہ سکتے ہیں کہ یہ ضمیر ہم کو آگاہ کرتا ہے کہ لوگ ہم کو دیکھ رہے ہیں۔ یہ علامتیں (PRANOID) مریضوں میں زیادہ ملتی ہیں۔

انسان جب مثالی انا کی تخلیق کرتا ہے اور اُس کا ضمیر اُس کا محتسب بنتا ہے تو وہ اس اثر کو نمایاں کرتا ہے جو بچپن ہی میں اُس پر ثبت کر دیا گیا تھا۔ بچپن میں والدین نے اپنے الفاظ کے ذریعے اُس پر تنقید کی۔ بعد میں اس کے اُستادوں اور معلموں نے اُس کی حرکات و سکنات پر کڑی نظر رکھی۔ جب وہ جوان ہوا تو ماحول میں اُس کو بہت سے نکتہ چیں ملے جن سے غم دل چھپانا مشکل ہو گیا۔ اِن عام اثرات نے اس کو ایک مخصوص سانچے میں ڈھال دیا اور وہ خاص تصوّرات اور احساسات کو اپنے دماغ میں جنم دینے لگا۔ اِس صورت سے ایک انسان کی تصوّریت تعمیر ہوتی ہے۔

غالب کے یہاں بھی تصوّریت کی مختلف شکلیں نظر آتی ہیں۔ سب سے پہلے ہم کو اُن کے یہاں انانیتی تصوّریت ملتی ہے۔ اِس تصوّریت کی تشکیل اُن کے بچپن ہی میں ہو گئی تھی۔ جب اُن کی عمر پانچ سال کی تھی تو اُن کے والد مرزا عبداللہ بیگ کا انتقال ہو گیا اور جب اُن کی عمر آٹھ سال کی ہوئی تو اُن کے چچا نصراللہ بیگ کی وفات ہو گئی۔ اِس لئے بچپن میں اُن کو کوئی سرپرست نہ مل سکا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اُن کی ماں عزت النساء نے اُن کی تربیت کا خاص لحاظ رکھا۔ اس کے باوجود مرزا غالب بچپن ہی سے کچھ آزاد رو تھے۔ انہوں نے آگرہ میں مولوی محمد معظم سے فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ اس طرح وہ علم سے بہرہ ور ہوئے، مگر آزاد منشی کے وہ اسیر رہے۔ غالب نے خود "مہر نیمروز" میں اپنے ابتدائی ایام پر تاسف کا اظہار کیا ہے۔ "نا فرد و فرہنگ بیگانہ و با نام و ننگ دشمن"۔ اِس کے بعد جب غالب کا قیام دلّی میں ہو گیا تو وہ ایک ڈومنی کے عشق میں گرفتار ہوئے۔ اِس طرح اُن کی انانیتی تصوّریت میں عشق کو دخل ہے۔ مگر وہ کبھی محبوب کے غلام نہیں رہے بلکہ عشق میں بھی نسلی برتری کی بنا پر خودداری کے دامن کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔

غالب دہلی کے اُمرا و رؤسا میں شمار کئے جاتے تھے۔ اُن کا تعلق قلعۂ معلّٰی سے بھی تھا۔ اس کے علاوہ وہ دلّی کے ایک مستند اور عظیم شاعر بھی تھے۔ اِن تمام باتوں کا اُن کے کردار کی تشکیل میں ہاتھ ہے۔ اِس طرح انہوں نے سماجی تصوّریت کو بھی جنم دیا۔ یہی وجہ ہے کہ جب چوسر کھیلنے کی بنا پر اُن کو قید ہو گئی تو انہوں نے سخت ذلت محسوس کی۔

غالب نے شستہ اور پاکیزہ ماحول میں زندگی گزاری تھی۔ وہ ایک ذکی الحس انسان تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی اور شاعری دونوں میں اپنے نکتہ چینیوں کو نظر انداز نہیں کیا۔ تعلیم یافتہ طبقے کی عقیدوں نے اُن کو راہِ راست پر لانے میں مدد کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غالب نے اخلاقی قدروں کو نہیں ٹھکرایا۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ اُن کو مے نوشی کی عادت تھی۔ مگر وہ اِس کیفیت میں اپنے ہوش و حواس درست رکھتے تھے۔ شراب نوشی وہ صرف "یک گونہ بے خودی" کی خاطر کرتے تھے۔ غالب اگرچہ روزہ نماز کے بھی پابند نہیں تھے، تاہم اُن کو اِس کوتاہی کا احساس تھا۔ جب مولانا حالی نے نماز پنجگانہ کی فرضیت اور تاکید پر ایک لمبا چوڑا



بزرگوں کے سامنے پیش کیا تو انہوں نے اُن کو جواب دیا۔

"ساری عمر فسق و فجور میں گذری۔ نہ کبھی نماز پڑھی نہ روزہ رکھا نہ کوئی نیک کام کیا۔ زندگی کے چند انفاس باقی رہ گئے ہیں۔ اب اگر چند روز بیٹھ کر یا اشارہ سے نماز پڑھی تو اُس سے ساری عمر کے گناہوں کی تلافی کیونکر ہو سکے گی میں تو اس قابل ہوں کہ جب مروں میرے عزیز اور دوست میرا منہ کالا کریں اور میرے پاؤں میں رسی باندھ کر شہر کے تمام گلی کوچوں اور بازاروں میں تشہیر کریں اور پھر شہر سے باہر لے جا کر کتوں اور چیلوں کو اور کوّوں کے کھانے کو (اگر وہ ایسی چیز کھانا گوارا کریں) چھوڑ آئیں۔ اگرچہ میرے گناہ ایسے ہی ہیں کہ میرے ساتھ اس سے بھی بدتر سلوک کیا جائے لیکن اس میں شک نہیں کہ میں موحد ہوں۔ ہمیشہ تنہائی اور سکوت کے عالم میں یہ کلمات میری زبان پر جاری رہتے ہیں لا الٰہ الا اللہ۔ لا موجود الا اللہ۔ لا موثر فی الوجود الا اللہ"[1]

غالب کی اس گفتگو سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُن کی نظروں میں اخلاقی قدروں کی وقعت تھی۔ اس طرح انہوں نے اخلاقی تصوریت کی بھی تعمیر کر لی تھی۔ اُن کے مختلف اشعار بھی اُن کی تصوریت پر روشنی ڈالتے ہیں۔ مثلاً غالب کے مندرجۂ ذیل اشعار اُن کی ماہیتی تصوریت کو واضح کرتے ہیں۔ غالب نے ایک شعر میں اس بات کا اظہار کیا ہے کہ وہ رسوائی نہیں پسند کرتے ؎

ہوئے ہم جو مر کے رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا   نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

غالب ہر حال میں خودداری کو قائم رکھنے کے قائل ہیں ؎

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم   اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

غالب کی نظر میں اصل ایماں وفاداری بہ شرطِ استواری ہے ؎

وفاداری بہ شرطِ استواری اصلِ ایماں ہے   مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

غالب کے کچھ اشعار اُن کی سماجی تصوریت پر دلالت کرتے ہیں۔ مثلاً غالب کی نظر میں انسانیت کی قدر بہت زیادہ ہے ؎

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا   آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

غالب سماجی حیثیت سے انسان کی قدر کرنا جانتے ہیں ؎

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے   کبھی ہم اُن کو، کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

ہے خبر گرم اُن کے آنے کی   آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

غالب نے ایک شعر میں ابنائے زماں کا شکوہ کیا ہے ؎

کہوں کیا خوبیٔ اوضاعِ ابنائے زماں غالب   بدی کی اُس نے جس سے ہم نے کی تھی بارہا نیکی

غالب سماجی حیثیت سے دولت جمع کرنے کے خلاف ہیں ؎

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم   تُو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے

غالب کے کلام میں اخلاقی تصوریت بھی نظر آتی ہے۔ مثلاً غالب پُرخلوص طاعت کے قائل ہیں ؎

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ   دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

غالب کے ایک شعر سے اُن کی ہمت اور حوصلے کا انکشاف ہوتا ہے ؎

---

[1] یادگارِ غالب۔ مولانا حالی مرتبہ خلیل الرحمٰن داؤدی ص ۷۷، ۷۸

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں ؎ جی خوش ہوا ہے راہ کو پُر خار دیکھ کر

غالب میں عالی ظرفی پائی جاتی ہے ؎

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا ؎ یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

غالب حسد کو معیوب سمجھتے ہیں ؎

حسد سے دل اگر افسردہ ہے گرمِ تماشا ہو ؎ کہ چشمِ تنگ شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو

غالب بے سروسامانی کو امارت پر ترجیح دیتے ہیں ؎

نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا ؎ رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

غالب صبر و تحمل کے قائل نظر آتے ہیں ؎

سفینہ جب کہ کنارے پہ آ لگا غالب ؎ خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہیے

غالب کی فطرت میں غیرت بھی شامل ہے ؎

کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ ؎ ہے یوں کہ مجھے دُردِ تہِ جام بہت ہے

ایک شعر میں غالب نے بتایا ہے کہ جس کی ہمت جتنی بلند ہوتی ہے اُسی کے مطابق اُس کو تائیدِ غیبی حاصل ہوتی ہے ؎

توفیق بہ اندازۂ ہمت ہے ازل سے ؎ آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

مندرجۂ بالا اشعار سے غالب کی تصوریت کے مختلف گوشوں پر روشنی پڑتی ہے۔

غالب کی تخلیقی خواہشات

پی۔ ای۔ ورنن کا قول ہے کہ تخلیق امریکی تعلیمی نفسیات میں سب سے نئی دریافت ہے۔ اس موضوع پر مختلف مصنفین مثلاً گٹزلس اور جیکسن (GETZELS AND JACKSON) ٹورنس (TORRANCE) اور کالون ٹیلر (CALVIN TAYLOR) نے اس تحقیق کے سلسلے میں مختلف کا طریقوں کا انعقاد کیا اور بہت سے امتحانات کا انتظام کیا۔ اس نے یہ محسوس کیا کہ خلاق نوجوان دیگر خلاق کاریگروں سے تعلیمی کامیابیوں یا ذہنی امتحانوں میں زیادہ برتر نہیں ہوتے ہیں بلکہ دونوں گروہوں میں بہت کم فرق ہوتا ہے۔[1]

مختلف اشخاص کی اسی قسم کی جانچ ٹرمین (TERMAN) نے بھی کی ہے۔ اُس نے جانچ کے بعد یہ ثابت کیا ہے کہ نابغہ کو پاگل نہیں کہا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اُس نے یہ بھی نتیجہ اخذ کیا ہے کہ جانچ کے سلسلے میں ذہانت سے زیادہ کردار اور حرکی عناصر اہم ہیں۔ میکینن (MACKINNON) نے جانچ کے بعد یہ تسلیم کیا کہ زیرِ امتحان اشخاص عوام سے زیادہ ذہین ہوتے ہیں مثلاً مصنفوں، سائنس دانوں اور انجینیروں کی تخلیقی قوتیں اعلیٰ ہوتی ہیں۔

اس قسم کی آزمائشوں کے بعد ماہرینِ نفسیات نے یہ سُراغ لگایا ہے کہ خلاق کا بچپن زیادہ تر مصائب و آلام کے ساتھ گذرا ہے۔ دورانِ تعلیم میں زیادہ تر خلاقوں نے اسکول سے بغاوت کی اور اساتذہ سے گستاخی کے مرتکب ہوئے۔ ان ماہرینِ نفسیات نے اس کا سبب یہ بتایا ہے کہ انسان میں ایک قسم کا اندرونی استحکام پایا جاتا ہے اور اُن کو اپنے تخلیقی کاموں کی عظمت پر اعتماد ہوتا ہے۔ ان خلاقوں کو یہ بھی یقین رہتا ہے کہ وہ خیال و عمل کا سہارا لے کر اپنی منزلِ مقصود پر پہنچ جائیں گے۔ اُن کے والدین نے بھی اُن کی آزادی اور خود اعتمادی کی ہمت افزائی کی۔ ان مثالوں سے یہ بھی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ خلاق کی کامیابی کی ضامن لیاقت کی بہ نسبت دلچسپی، رجحان اور سعیِ پیہم زیادہ ہوتی ہے۔

---

1 PSYCHOLOGY IN ACTION, EDITED BY MCKINNEY, ARTICLE OF P E VERNON P 178



غالب میں بھی تخلیقی خواہشات موجود تھیں۔ اُن کے آباؤ اجداد کا پیشہ سپہ گری تھا مگر غالب نے قلم کو تلوار پر ترجیح دی اور اقلیمِ سخن کی حکمرانی پسند کی۔ غالب کی فطرت میں تخلیقی عناصر بچپن ہی سے موجود تھے چنانچہ اُنہوں نے آٹھ سال کی عمر میں پتنگ پر ایک اُردو مثنوی کہی تھی اور دس سال کی عمر سے فارسی شاعری پر طبع آزمائی شروع کر دی تھی۔

غالب اپنے عہد کے نابغہ تھے۔ اُنہوں نے اعلیٰ دماغ پایا تھا۔ دراصل غالب اپنے عہد کے عظیم انسان تھے۔ اُنیسویں صدی کے صدف میں یہ موتی سما نہیں رہا تھا اور اِن گلچیں بہار کو بجا طور پر اپنے دامن سے گلہ تھا۔ مرزا غالب اپنے عہد کے علومِ مروّجہ میں طاق تھے۔ عربی صرف و نحو۔ عروض۔ نجوم اور تصوّف میں وہ کافی دخل رکھتے تھے۔ فارسی تو تقریباً اُن کی مادری زبان تھی۔ اگر ہم عبدالصمد کو ایک فرضی شخص بھی تصوّر کر لیں تب بھی یہ بات طے شدہ ہے کہ غالب کو خاص ایرانی محاورت پر قابو حاصل تھا۔

غالب کی تخلیقی قوتوں نے شاعری کی فرسودہ راہوں سے گریز کرنا پسند کیا، اسی لئے اُنہوں نے بیدل کی پیروی کی۔ ڈاکٹر سید عبداللہ "نقدِ میر" میں فرماتے ہیں کہ غالب کے کلام میں جہاں کہیں طلسم۔ حیرت۔ قفل۔ کلید۔ جوہر۔ جوہرِ آئینہ۔ دود۔ گرداب۔ قفلِ کل۔ لاہوت۔ ہیولیٰ۔ افسوں۔ تمثال۔ نگس۔ عکس۔ تجلی۔ ایجاد۔ سحر۔ تعمیر۔ آگہی۔ عنقا۔ عدم۔ وجود۔ عقدہ۔ کشاکش۔ کشور اور نیرنگ وغیرہ الفاظ نظر آتے ہیں، وہ سب مرزا بیدل کی دین ہیں[1]

بہرحال غالب نے بیدل کی تقلید میں نہایت مشکل اور پیچیدہ اشعار کہے۔ بعض اشعار تو ایسے ہیں کہ اگر اُن میں اُردو فعل کی جگہ فارسی لکھ دیا جائے تو وہ فارسی کا شعر ہو جائے۔ مثلاً ؎

شمارِ سبحہ مرغوبِ بتِ مشکل پسند آیا　　　تماشائے بیک کف بُردنِ صد دل پسند آیا

غالب کی اس قسم کی شاعری پر کافی اعتراضات ہوئے۔ مولوی عبدالقادر نے اُن کی شاعری کا مذاق اُڑایا۔ حکیم آغا جان عیش نے اُن کے کلام کو سمجھنے سے خود کو قاصر پایا۔ غالب کو بھی اس کا احساس تھا، اس لئے اُنہوں نے مولوی فضلِ حق خیر آبادی کا مشورہ قبول کر لیا اور آسان شعر کہنے کی کوشش کرنے لگے۔

اس کے بعد غالب نے طالب۔ عرفی۔ نظیری اور ظہوری کی تقلید شروع کی اور اس نئی وادی میں بھی حسین گل کھلائے۔ غالب نے جب شاعری کا آسان راستہ اختیار کیا تو دہلی میں اُن کی شاعری پسند کی گئی۔ خاص طور سے مولانا حالی نے اُن کی شاعری کو بہت سراہا اور "یادگارِ غالب" جیسی تصنیف لکھ کر غالب کو زندۂ جاوید بنا دیا۔ اس کے بعد دیگر نقادوں نے بھی غالب کی شاعری کو قدر کی نگاہوں سے دیکھا۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری نے "محاسنِ کلامِ غالب" میں اُن کے کلام کی باریکیوں کو پیش کیا اور یورپ کے شعراء سے اُن کا مقابلہ کیا۔ اُنہوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں۔ مقدس وید اور دیوانِ غالب۔ شیخ محمد اکرام نے بھی غالب کو خراجِ عقیدت مندرجہ ذیل الفاظ میں پیش کیا۔

"شاہجہاں کا تاج محل اور غالب کی شاعری فن کی دو مختلف اصناف کے شاہکار ہیں۔ لیکن دونوں کی تہہ میں ایک ہی رُوح کارفرما ہے۔ تخیّل کی سربلندی۔ لطافت۔ تلاشِ حُسن۔ فنی پختگی دونوں میں معراجِ کمال پر ہے۔ فرق اتنا ہے کہ جب مغلوں کے سامنے خزانوں کے مُنہ کھلے ہوئے تھے تو اُن کے سنہرے خواب اور حسین آرزوئیں سنگِ مرمر کے قیمتی لباس میں جلوہ گر ہوئیں، لیکن جب یہ خزانے خالی ہو گئے اور آرزوؤں اور خوابوں پر افسردگی چھا گئی تو اُن کا اظہار حسین و جمیل الفاظ اور حزین و دلگداز اشعار میں ہوا۔"[2]

(باقی صفحہ ۵۹ پر دیکھئے)

---

[1] نقدِ میر۔ ڈاکٹر سید عبداللہ ص ۲۶۷۔ [2] حیاتِ غالب۔ شیخ محمد اکرام ص ۱۱

ماہر القادری

تجزیۂ غالب ـــــ کئی رُخ!

یُونان کے ہومر۔ قدیم چین کے ملک الشعرا طوقو۔ بھارت کے مہاکوی کالیداس۔ جرمنی کے گوئٹے۔ انگلستان کے شیکسپیر جاہلیت عرب کے امرؤ القیس اور ایران کے سعدی و حافظ۔ دنیا کے عظیم ترین شعرا کی فہرست میں مرزا غالب کا نام آتا ہے۔ اُردو شاعری کا ذکر ہوتا ہے تو غالب کا تصوّر سب سے پہلے ذہن میں اُبھرتا ہے۔ غالب کی شاعری اُردو کا سُہاگ ہے اُردو کی آبرو ہے اُردو کا گراں قدر سرمایہ ہے!

عجیب بات ہے کہ اُردو شاعری جو غالب کی شہرت کا سبب قرار پائی اور جس نے مرزا غالب کے نام کو زندۂ جاوید بنایا اس کو وہ "بے رنگِ من است" ہی سمجھتے رہے، اسی لئے اُنھوں نے فارسی شاعری میں جس قدر قوت صرف کی ہے اُتنی قوت اُردو شاعری میں صرف نہیں کی۔ مولانا حالی نے جو یہ کہا ہے ؎

ہے ادب شرط مُنہ نہ کھلوائیں
ہم نے سب کا کلام دیکھا ہے

تو یہ بات اُنھوں نے دراصل اپنے قابلِ فخر اُستاد کی فارسی شاعری کے بارے میں کہی ہے اور یہ حقیقت بھی ہے کہ فارسی غزل کی وادی میں غالب ایران کے بڑے سے بڑے شاعر سے ٹکراتے ہوئے گزرتے ہیں اور کسی سے دبتے ہوئے نظر نہیں آتے۔

فانی بدایونی مرزا غالب کے فارسی کلام کے بہت زیادہ مدّاح تھے اور افسوس کرتے تھے کہ لوگ غالب کا اُردو دیوان تو شوق سے پڑھتے ہیں مگر اُن کے فارسی کلام کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے، چنانچہ فانی مرحوم کے شوق دلانے سے میں نے غالب کے فارسی کلام کا مطالعہ کیا اور اس مطالعہ کے بعد یہ حقیقت مجھ پر واضح ہوئی کہ غالب کی شاعرانہ طبیعت کے جوہر پُوری قوت اور توانائی کے ساتھ فارسی شاعری میں کھُلے ہیں۔

غالب کا فارسی کلام ہموار ہے، اُس میں بھرتی کے شعر بہت ہی کم ہیں، مگر اس کے برخلاف اُردو غزلوں میں بھرتی کے اشعار کہیں کہیں ملتے ہیں۔ مثلاً اُن کے اُردو دیوان کی پہلی غزل کا مطلع اتنا عظیم ہے کہ اُردو، فارسی اور عربی کے کسی شاعر کے دیوان اور مجموعۂ کلام کا مطلع غالب کے مطلع کی برابری نہیں کرسکتا۔ یہ آہنگ ؎

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

تو کسی شاعر کو نصیب ہی نہیں ہوا۔ یہ مضمون تو کسی کو سوجھا ہی نہیں۔ یہ ایک شعر نہیں، فکر و خیال کا دفتر اور مفہوم و معنی کا صحیفۂ قُدس ہے، مگر اس مطلع کے علاوہ پُوری غزل میں اِس شعر ؎

جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہیئے
سینۂ شمشیر سے باہر ہے دَم شمشیر کا



کوچہ نشینی، پستی اشعار معمولی میں جن کو بس گوارا کیا جا سکتا ہے۔
ایک طرف دیوانِ غالب کے مطلع کی بلندی اور وسعت کی کوئی حد و نہایت نہیں، دوسری طرف اُن کی ایک غزل کا یہ مقطع

غالب گُھرا ای ستی سے لیا نہیں مجھے — خوش ہیں چلے اگر نہ ملیح کھائے کشتے کو

کسے مطلع کہیے، غزل میں اور مورد ملخ کا ذکر!؟
حیرت ہوتی ہے کہ وہ اس اُردو شاعری میں "کھوں پاس" (کھوں پاس آنکھ قبلۂ حاجات چاہیے) اور "ہتھکنڈے" (ہتھکنڈے ہیں چرخ نیلی فام کے) تک نظم کر گئے ہیں، یہاں تک کہ

چپک رہا ہے بدن پر لہو سے پیراہن — ہماری جیب کو اب حاجت رفو کیا ہے

کہہ گئے ہیں۔ اس میں "چپک رہا ہے" پر ذوق و وجدان ناگواری محسوس کرتے ہیں اور اُن کی اُردو غزل جس کا مطلع

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے — بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

اس قدر نفسیاتی اور خیال و اظہار کے لحاظ سے بے مثال ہے۔ اسی غزل میں ایسا شعر بھی ملتا ہے

مگر لکھوائے کوئی اُس کو خط تو ہم سے لکھوائے — ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے

بات یہ ہے کہ مرزا غالب کے دل و دماغ پر فارسی کا اس قدر شدید غلبہ تھا کہ وہ اُردو شاعری کو اُس کے مقابلے میں "بے رنگ" سمجھتے تھے۔ اسی لئے قدرتی طور پر انہوں نے فارسی شاعری پر زیادہ توجہ دی اور محنت کی۔ مرزا غالب کی نثر کی کتابیں بھی اُردو کم اور فارسی میں زیادہ ہیں۔ یہی حال اُن کے فارسی قصائد کا ہے۔ فارسی میں وہ خود کو ہندوستان کا خاتم الشعرا سمجھتے تھے۔ انہوں نے خود فرمایا بھی ہے کہ ـــــ فارسی شاعری ترک لاچین (یعنی حضرت امیر خسرو) سے شروع ہو کر ترک ایبک پر ختم ہو گئی ـــــ!

اس تمام فارسی دانی کے باوجود اُردو میں جیسے منتخب اشعار غالب نے کہے ہیں، اُس جوڑ کے اشعار اُن کی فارسی شاعری میں نہیں ملتے۔ مثلاً رشک کے موضوع پر مرزا کا یہ شعر

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں — ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

اور جام و بادہ کے مضمون میں یہ شعر

گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے — رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

اسی معرکے کے شعر ہیں کہ غالب کے فارسی کلام میں ایسے اشعار نظر نہیں آتے!
غالب نے عارف کے مرثیہ میں جو یہ شعر کہا ہے

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے — کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

سیکڑوں نوحوں اور المیہ نظموں پر بھاری ہے۔ مرزا کے اس شعر میں قیامت سمٹ آئی ہے۔
غالب نے اُردو شاعری میں حسن نازک و دقیق فکر کی راہ کھولی ہے اور حسن متفکرانہ تخیل کی طرح ڈالی ہے، اُس کی بھرپور جلوہ آرائیاں علامہ اقبال کے اُردو کلام میں نظر آتی ہیں، اس لئے بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اُردو شاعری میں اگر غالب پیدا نہ ہوتا تو اقبال کا ظہور بھی نہ ہوتا۔
اُردو میں "بادۂ و شاہد" پر کتنی اچھی نظمیں کہی گئی ہیں، مگر یہ تمام نظمیں مرزا غالب کے اس مصرع

چہرہ فروغ مے سے گلستاں کئے ہوئے



کی "صدائے بازگشت" یا یوں کہیے اس حسین احساس کی رنگین تعبیر معلوم ہوتی ہیں۔
غالب نے اُردو شاعری کو رعنائیِ فکر۔ رنگینیِ خیال برکت اظہار اور ساتھ ہی شان و شوکت اور جلال و طنطنہ عطا کیا
دیا ہے۔ غالب اُردو شاعری کی مملکت کا شہنشاہ ہے۔ اُس کی درباری قدر کا یہ عالم ہے کہ بڑے بڑے شعرا غالب
کے سامنے بونے نظر آتے ہیں۔ زمانے کی قدر ناشناسی دیکھیے کہ "ملک الشعرائی" کا تاج کسی دوسرے کے سر پر رکھ دیا گیا اور غالب
اس اذیت کو برداشت کرتا رہا۔

مرزا غالب کی فارسی شاعری کے مقابلہ میں اُن کی اُردو شاعری کو جس طرح قبولِ خواص و عوام حاصل ہوا اِسی طرح اُن کی فارسی نثر پر اُن کی اُردو نثر غالب آ گئی۔ کتنے ہیں جنہوں نے دستنبو۔ پنج آہنگ۔ مہر نیم روز۔ درفش کاویانی اور قاطع برہان کو پڑھا ہے۔ اِس ہمارے زمانے میں تو بعض خاصے لکھے پڑھے لوگ غالب کی فارسی کی بعض کتابوں کے نام سے بھی شاید واقف نہ ہوں۔ جو شاعر اُردو میں ایسے فارسی آمیز شعر کہتا ہو

آفرینش کو ہے واں سے طلبِ مستیِ ناز　　عرضِ خمیازۂ ایجاد ہے ہر موجِ غبار
زبسکہ مشقِ تماشا، جنوں علامت ہے　　کشاد و بستِ مژہ سیلیِ ندامت ہے
سرشکِ سر بہ صحرا دادہ نور العینِ دامن ہے　　دلِ بے دست و پا افتادہ برخوردارِ بستر ہے

اُس کے اُردو خطوط میں قیامت کی سادگی پائی جاتی ہے۔ مرزا نے اِس انداز میں خط لکھے ہیں جیسے وہ اپنے مخاطب اور مکتوب الیہ سے بالمشافہ گفتگو کر رہے ہیں۔ حیرت ہے کہ مرزا غالب اپنی اُردو غزلیات و قصائد میں ___ استظہار۔ خمیازہ عرضِ صورت دُردِ یک ساغرِ غفلت۔ فشارِ تنگیِ خلوت۔ موئے شیشہ۔ آذر فشاں۔ جوہرِ تیغِ عکس اور سرِ دلیالی ___ جیسی مغلق تراکیب استعمال فرماتے ہیں مگر اُردو خطوط میں اُن کا اندازِ نگارش اور اُسلوبِ تحریر انتہائی سہل۔ آسان اور عام فہم ہے۔ اگر غالب کی جگہ کوئی والیِ ملک۔ رئیس۔ حاکم یا دولت مند شخص ہوتا تو ناقدین اِس پر طنز کرتے کہ یہ کلام اور خطوط ایک شخص کے ہو ہی نہیں سکتے۔ مرزا کی اُردو شاعری میں بھی جہاں اُن کے خطوط کا رنگ آ گیا ہے، وہاں سادگی کو معراج میسر آئی ہے، فرماتے ہیں ؎

نہ تھا تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا　　ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

"خدا" کے علاوہ تمام الفاظ ٹھیٹ اُردو کے ہیں۔ وجود و عدم اور ہستی و نیستی کی عربی و فارسی اصطلاحات کی جگہ "ہوتا اور نہ ہوتا" استعمال ہوا ہے اور پھر لطف یہ ہے کہ ایک شعر میں چار بار "ہوتا" آیا ہے مگر اس تکرار نے شعر کے لطف کو کم نہیں ہونے دیا، بلکہ دوبالا کر دیا ہے اور شعر کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔

یہ غالب کا کمال تھا یا اُردو کی کرامت تھی کہ خود شاعر جسے "بے رنگ من است" سمجھتا تھا وہی زبان (اُردو) اُس کی بقائے دوام کا سبب بنی اور اُسی زبان نے غالب کو "علیٰ کلِّ غالب" بنایا۔ اِس لئے بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ اُردو پر غالب کا احسان ہے اور غالب کی شخصیت بھی اُردو کی احسان مند ہے۔

غالب نے شروع شروع میں مشکل پسندی، ابہام۔ ژولیدگی اور اغلاق کا رنگ اختیار کیا، اُن کا یہ رنگ اربابِ ذوق کو پسند نہیں آیا۔ مرزا پر چوٹیں ہونے لگیں۔ اُن کی رباعی

گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

اِسی تنقید و احتساب کا ردِّ عمل ہے، وہ خوش قسمت تھے کہ ہندوستان کے سب سے بڑے فلسفی عالم مولوی فضلِ حق خیرآبادی اور فخرِ اسلاف مفتی صدر الدین آزردہ جیسے اکابرِ علما اور اربابِ نظر کی ہم نشینی اور دوستی انہیں میسر آئی جن کے مشورے



غالب نے اپنے رنگ شاعری اور طرزِ سخن کو بدل دیا، ورنہ اُن کی شاعری "پائے طاؤس پئے خامۂ مانی مانگے" کی بھول بھلیاں" بن کر رہ جاتی۔

زندگی کی جھلکیاں غالب کی شاعری اور اُن کے فن کو پوری طرح سمجھنے کے لئے اُن کے حالاتِ زندگی سے واقف ہونا ضروری ہے۔ غالب میں جو "انا" پائی جاتی ہے وہ علامہ اقبال کی "خودی" اور یونانی فلسفے کی "ایگو" سے قدرے مختلف ہے۔ انہوں نے اپنی "انانیت" کے باوجود انگریزوں کی شان میں قصیدے بھی لکھے ہیں۔ شاہ عالم کے اختیار و اقتدار اور دورِ حکومت کے بارے میں کسی نے خوب کہا ہے ع

"حکومت شاہِ عالم از دلی تا پالم"

مگر سراج الدین شاہ ظفر کی تو اتنی حیثیت بھی نہ تھی وہ تو انگریزی حکومت کے وظیفہ خوار تھے۔ ابونواس کو ہارون الرشید، رودکی کو نصیر الدین احمد سامانی۔ ظہیر فاریابی کو قزل ارسلان۔ عنصری کو محمود غزنوی۔ فیضی کو اکبر۔ عرفی کو جہانگیر اور ابوطالب کلیم کو شاہ جہاں جیسے عظیم بادشاہ اور خود مختار سلاطین کی مدحت و منقبت اور قصیدہ گوئی کے مواقع میسر آئے ان ممدوحین نے اپنے مداح شعرا کی قدر دانی بھی کی۔ کسی کا مُنہ بیش قیمت موتیوں سے بھر دیا۔ کسی کو چاندی میں تلوا دیا۔ کسی پر اکرام و انعام کی بارش کی گئی۔ کسی کو جاگیر اور منصب عطا ہوا، مگر وہ جو اُردو کی کہاوت ہے کہ ننگی نہائے گی کیا اور نچوڑے گی کیا، تو مرزا غالب کے ممدوح شاہ ظفر بس نام کے بادشاہ تھے۔ انگریزوں کے وظیفے سے خود انہیں کا پورا نہیں پڑتا تھا، قصائد کا صلہ کہاں سے دیتے۔ تھوڑے بہت انعام اور پنشن کی امید میں غالب نے شاہ ظفر کو شہنشاہ فلک سطوت تک کہا

اے شہنشاہِ فلک منظرِ بے مثل و نظیر
اے جہاں دارِ کرم شیوۂ بے شبہ و عدیل

مرزا غالب کی احتیاج کی یہ نے اتنی بڑھی کہ شاہ ظفر کو قیصر و جم کا ہم پلہ قرار دیا، بلکہ طغرل و سنجر سے بھی بڑھا دیا ـــــ

پہلے دارا کا نکل آیا ہے نام
اس کے سرہنگوں کا جب دفتر کھلا

مگر غالب بھی کیا کرتے، وقت و زمانہ نے جس طرح کا بادشاہ انہیں دیا، اس کی انہوں نے مداحی کی۔ شاہ ظفر کو جہاں گیر اور شاہ جہاں بنا دینا تو اُن کے بس میں نہ تھا۔

مرزا غالب خوش پوشاک اور خوش خوراک تھے۔ گرمی میں برفاب اور حسحانے کی تمنا رکھتے تھے۔ غم غلط کرنے کے لئے انہیں بے خودی بھی چاہیے تھی۔ اس کے لئے وہ دیسی شراب نہیں، ولایتی شراب ـــــ اولڈ ٹام اور کاس ٹیلس پیتے تھے۔

غالب مس وخدا کہ شرانجام برشگال
عیار شراب و ابہ و برفاب و قند نیست

گھر میں ایک چھوڑ کئی کئی نوکر۔ گھر سے باہر ہوادار میں نکلتے۔ آب سرد اور میوہ ہائے شیریں کے شوقین۔ آمدنی کم۔ خرچ زیادہ۔ اس قسم کا عیش و تنعم، راحت و آسودگی، بلکہ مُسرفانہ زندگی کے لئے مرزا صاحب کو "انانیت" کی بلندی سے بھی اتر نا پڑا۔

مرزا کی انانیت اور خودداری کا یہ عالم ہے کہ در کعبہ بھی وا نہ ہو تو وہاں سے اُلٹے پھر آتے ہیں۔ دوسری طرف وہ اس سطح پر آ کر اپنی محبوبہ کی خدمت میں گذارش کرتے ہیں ــ

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو
مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

. پہلا شعر نواب شیفتہ، مفتی صدر الدین آزردہ۔ مولوی فضلِ حق خیرآبادی کی صحبت و ہم نشینی کا آئینہ دار ہے اور دوسرے



شعر میں جو وہ اپنی محبوبہ سے یہ عرض کرتے ہیں کہ غیر سے جو تمہاری رسم و راہ اور معاملت و تعلقات ہیں اُس کا میں بُرا نہیں مانتا، اُس میں تمہاری مرضی پر چھوڑتا ہوں ــــ ہاں میری بس اتنی گزارش ہے کہ مجھے بھی پوچھ لیا کرو ــــ غالبؔ کے یہ خیالات اُس صحبت کا ثمرہ ہیں جب وہ قمار بازوں کے ساتھ اُٹھتے بیٹھتے تھے!

غالبؔ کے رہنے سہنے، کھانے پینے اور ملنے جُلنے میں خاص سلیقہ پایا جاتا تھا۔ منشی جواہر سنگھ جوہرؔ سے ایک خط میں لُنگی کی فرمائش کی ہے:

"لیکن ایسی لُنگی ہو کہ اُس کے رنگ شوخ اور انگشت نما نہ ہوں، حاشیہ سُرخ نہ ہو کام اگرچہ بارک اور لطیف ہو، لیکن سونے چاندی کے تار اس میں نہ صرف ہوتے ہوں۔ ابریشم سیاہ اور سبز اور خاکستری اور زرد اس کے تار و پود میں استعمال ہوا ہو۔"

اِسی سلیقے اور خوش ذوقی کی جھلکیاں اُن کے کلام میں ملتی ہیں۔ شعر کس قدر سجا کر کہتے ہیں، اور لفظوں کے نگینے کس چابکدستی سے جڑتے ہیں۔

مرزا غالبؔ بہت خوبصورت اور خوش رنگ تھے۔ ناک نقشہ دلکش و دیدہ زیب۔ جوانی میں وہ مسّی بھی لگایا کرتے تھے جسین و خوبرو شاعر کا معاملہ دُوسرے شاعروں سے مختلف ہوتا ہے، یعنی وہ مُحب بھی ہوتا ہے اور محبوب بھی، ناز و نیاز ساتھ چلے۔ اُن کے اِس قسم کے شعروں سے

عشق و مزدوریٔ عشرت گہہِ خسرو کیا خوب ــــ ہم کو تسلیم نکو نامیٔ فرہاد نہیں

یہی رنگ جھلکتا ہے۔ وہ عاشق بھی ہیں اور ساتھ ہی معشوق فریبی بھی اُن کا شیوہ ہے اور

غافل اِن مہ طلعتوں کے واسطے ــــ چاہنے والا بھی اچھا چاہیئے

عاشق و معشوق دونوں خوبرو ہوں تو اِس قسم کے حُسن و محبت کے معاملات عجیب ہوتے ہیں۔

غالبؔ میں "انانیت" کے باوجود دُوسرے شاعروں کے احترام و قدر شناسی کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ میر تقی میرؔ سے عقیدت کا اظہار کس خلوص کے ساتھ کیا ہے

آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میرؔ نہیں

نظیری نیشاپوری کو خراجِ عقیدت اِن لفظوں میں پیش فرماتے ہیں

جواب خواجہ نظیری نوشتہ ام غالبؔ ــــ خطا نمودہ ام و چشم آفریں دارم

غالبؔ کی طبیعت کی بے نیازی اور دنیا کے ہنگاموں کو کم حیثیت سمجھنے کا وہ عالم کہ ۱۸۵۷ء کا آشوب قیامت گذر جاتا ہے اور اُن کا شاعرانہ احساس حرکت میں نہیں آتا۔ دُوسری طرف جوانی کے دَور میں جب اُن کی شاعری منزلِ آغاز میں تھی تو طبیعت کے گداز اور معمولی سے واقعات کا اثر قبول کرنے کی یہ کیفیت کہ اُن کی پالتو بلّی مر جاتی ہے تو اُس پر قطعہ کہتے ہیں۔ شاعر کا دل پھول کی پتّی کے لگنے سے ہل جاتا ہے اور دُوسری طرف زلزلے بھی اُسے متاثر نہیں کر سکتے۔ کون بتائے کہ وہ کب کس عالم میں ہوتا ہے۔

مذہب کے بارے میں مرزا غالبؔ کی دو معنویت اور ابہام کی یہ کیفیت

بکس غیر حیدرؔ نہ پرداختم

مگر اِس کے برعکس یہ بھی فرماتے ہیں

ستیغی کیونکر ہو ماورا الہٰی



بھی غالب ... کا شعر ہے ؎

مطلع جو گوئی، بہ علیؑ بارگرائے
بہ جائے نشیں مہر با شد بہ نجوم

حضرت علیؑ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جانشین مانتے ہوئے مرزا غالب نے صحابۂ کرامؓ کو نجومؓ سے تشبیہ دی ہے۔ کما قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم اصحابی کالنجوم (میرے صحابہ ستاروں کے مانند ہیں)

شاعری مرزا غالب کا سرمایۂ کمال اور ان کی عزت و ناموری کا سبب ہے مگر وہ اس شرف کی بھی نفی کرتے ہیں ؎

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

اور فارسی میں تو اُن کی آبا بیت یہ تک کہہ گئی ہے کہ میں شاعری کا مرتبہ و منصب قبول کرنے کے لئے رضامند کب تھا شاعری خود میرے پیچھے پڑ کر میرا حصہ بن گئی۔

مقالہ کے آغاز میں کہا جا چکا ہے کہ غالب اُردو کو "بے رنگ من است" کہتے تھے مگر تجربے کے بعد اُن پر یہ حقیقت روشن ہو گئی کہ ؎

جو یہ کہے کہ ریختہ کیونکر ہو رشکِ فارسی
گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اُسے سنا کہ یوں

مرزا غالب بے حد ذہین اور طباع تھے۔ بالغ وقت! اُن کی شاعری پر "ترقی پسندی" کا صحیح اطلاق ہوتا ہے۔

خاتمہ — اس ذہانت و قابلیت اور کمال فن کے ساتھ وہ اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے تھے۔ شعر و ادب کا کمال اور ترقی انہیں الحاد کی طرف نہیں لے گئی۔ اپنے بعض خطوں کو انہوں نے "لاموجود الا اللہ" پر ختم کیا ہے۔ مرنے سے پہلے غالب کے ورد زبان یہ شعر ورد زبان رہتا ہے ؎

دمِ واپسیں بر سرِ راہ ہے
عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

اللہ تعالیٰ کی شمیم رحمت اُن کی قبر کو سدا بہار رکھے۔ (آمین) ▲

بقیہ "غالب کی شاعری میں نرگسیت" ۹۵

غرض کہ غالب نے عام مقبولیت اور ہمہ گیر شہرت اپنی ذہانت اور تخلیقی قوت کی بنا پر حاصل کی۔

مندرجۂ بالا صفحات میں غالب کی نرگسیت پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے اور سہولت کے لئے نرگسیت کو مختلف خانوں میں بانٹ دیا گیا ہے، مگر اس حد بندی میں سخت گیری نہیں ہے۔ بہت سے اشعار ایسے ہیں جو مختلف خانوں میں رکھے جا سکتے ہیں، اس لئے نرگسیت کی مختلف راہوں کے درمیان حدِ فاصل قائم کرنا مشکل ہے۔

یہاں ایک امر کی وضاحت اور ضروری ہے۔ فرائڈ نے نرگسیت کو ایک مرض قرار دیا ہے لیکن ہمارے سماج میں ایسے افراد بے شمار ہیں جن میں کسی نہ کسی حد تک نرگسیت جھلکتی ہے چونکہ شعراء ذکی الحس ہوتے ہیں اس لئے اُن کے یہاں نرگسیت اور زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی قابلِ تسلیم ہے کہ غالب کی ذات اور شخصیت میں خاص کر ایسی خصوصیات موجود ہیں جن پر نرگسیت کا اطلاق کیا جا سکتا ہے۔ غالب کا جذبۂ برتری۔ اُن کی خودداری۔ اُن کی آزادروی۔ اُن کا غرور و پندار۔ اُن کی کنارہ کشی۔ اُن کی تصوریت اور اُن کی تخلیقی قوت اُن پر نرگسی انسان کی چھاپ لگا دیتی ہے نرگسیت کی جھلک نے غالب کی شخصیت میں آب و تاب پیدا کی اور ان کی شاعری میں آئینے جڑ دیئے ہیں۔ غالب کے گلشنِ شاعری میں جو پھول کھلائے ہیں وہ بے وہ سدا بہار ہیں۔ جو بادِ سموم کے جھونکوں سے مرجھا نہیں سکتے ہیں۔ انہوں نے اپنی فارسی انشا کی کتاب "پنج آہنگ" میں صحیح فرمایا ہے ؎

تھے ظہوری و عرفی و طالب
اپنے اپنے زمانے میں غالب
نہ ظہوری ہے اور نہ طالب ہے
اسد اللہ خاں غالب ہے

ڈاکٹر ابو محمد سحر

کچھ نسخۂ حمیدیہ کے بارے میں

غالب کی شاعرانہ عظمت کا انحصار تو اُسی متداول دیوان پر ہے جس کے متعلق دہلی کے ایک دل جلے شاعر نے کہا تھا کہ

ڈیڑھ جز پر بھی تو ہے مطلع و مقطع غائب　　　غالب آسان نہیں صاحب دیواں ہونا

لیکن ایک تو اُن کے قصرِ عظمت کے کچھ کنگرے اُن کے قلمزد کلام میں دنیا کی نظروں سے اوجھل ہو گئے تھے۔ دُوسرے اس کے مدارج تعمیر کی مکمل داستان بھی اُن کے قلمزد کلام میں پنہاں تھی۔ دیوانِ غالب کے جتنے نسخے طبع ہوئے اُن میں نسخۂ حمیدیہ کی اہمیت اسی لئے زیادہ ہے کہ اس کے ذریعہ سے پہلی مرتبہ اُن کی اُردو شاعری کے ابتدائی دور کا تقریباً سارا قلمزد کلام منظرِ عام پر آیا۔ اس کے علاوہ اس نسخے کے توسط سے متداول دیوان کے اس کلام کا بھی پتہ چلا جو ابتدائی دور کی تخلیق تھا اور ترمیم و اضافہ کی وہ گوناگوں کیفیتیں بھی آئینہ ہوئیں جو خود غالب نے اپنے کلام میں خوب سے خوب تر کی جستجو میں روا رکھی تھیں۔

غالب کے ابتدائی اُردو کلام کے سلسلے میں تین مخطوطے خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ سب سے قدیم معلوم قلمی دیوان مکتوبۂ ۱۲۳۷ھ (۱۸۲۱ء) جو پہلے نواب فوجدار محمد خاں کے ذاتی کتب خانے میں اور پھر بھوپال کے ریاستی کتب خانے میں محفوظ رہا، نسخۂ بھوپال کے نام سے موسوم ہے۔ دوسرا قلمی دیوان جو نسخۂ بھوپال کی اصلاح پذیر اور ترقی یافتہ شکل ہے، تقریباً ۱۲۴۲ھ (۱۸۲۶ء) میں مرتب ہوا چونکہ یہ حافظ محمود خاں شیرانی کے پاس رہ چکا ہے، اس لئے نسخۂ شیرانی کہلاتا ہے۔ تیسرا قلمی نسخۂ گلِ رعنا اُردو و فارسی کلام کا مختصر انتخاب ہے جو غالب نے ۱۲۴۴ھ (۱۸۲۹ء) کے لگ بھگ مرتب کیا تھا۔ ان قلمی نسخوں میں زمانۂ ترتیب، ابتدائی کلام کی نوعیت و مقدار اور بعد کے اضافوں وغیرہ کے اعتبار سے نسخۂ بھوپال سب سے زیادہ اہم تھا۔ دیوانِ غالب جدید المعروف بہ نسخۂ حمیدیہ کی ترتیب و اشاعت اسی قلمی نسخے کی دریافت کی رہینِ منت تھی۔ بعض محققین نے جن میں مولانا امتیاز علی عرشی اور مالک رام صاحب شامل ہیں اپنی تحریروں میں نسخۂ بھوپال کو نسخۂ حمیدیہ کی اصل قرار دیا ہے یا یہ لکھا ہے کہ نسخۂ بھوپال ہی نسخۂ حمیدیہ کے نام سے شائع ہوا لیکن حقیقت یہ ہے کہ غالب کا یہ دیوان نسخۂ بھوپال، متداول دیوان اور اُن کے کچھ دوسرے مطبوعہ کلام کا مجموعہ ہے جسے مفتی انوار الحق ڈائرکٹر تعلیمات بھوپال نے مرتب کیا تھا اور جو ۱۹۲۱ء میں مفید عام پریس آگرہ میں طبع ہو کر شائع ہوا۔

نسخۂ بھوپال کی دریافت اور نسخۂ حمیدیہ کی ترتیب و اشاعت کے ساتھ کچھ ایسے حالات وابستہ رہے اور ان کے اظہار میں مفتی انوار الحق نے کچھ اتنے رمز و ایما سے کام لیا کہ چند ضروری اُمور جو مرتب کے معمولی بیانات سے واضح ہو سکتے تھے بظاہر عقدۂ لاینحل بن کر رہ گئے۔ صحیح معلومات اور تاریخ تک رسائی نہ ہونے کی وجہ سے بعض محققین نے اُن کے بارے میں اتنی قیاس آرائیاں کی ہیں کہ ان سب کا جائزہ غیر ضروری طوالت کا باعث ہوگا۔ اس لئے بہتر معلوم ہوتا ہے کہ ان امور سے بحث کرنے میں صرف فیصلہ کن شواہد کو پیش نظر رکھا جائے۔



نسخۂ بھوپال کی دریافت کے بارے میں نسخۂ حمیدیہ طبع اوّل کی تمہید میں یہ الفاظ ملتے ہیں۔
"زمانے نے بقائے اصلح کے اصول کو شعر و سخن میں بھی ثابت کر ہی دیا اور غالب کے انتقال کے پورے پچاس برس کے بعد اس صحیفے کو دنیا میں روشناس کیا جو پوری ایک صدی سے گوشۂ خفا میں پڑا تھا[1]۔"

اس بیان کے پہلے ٹکڑے سے نسخۂ بھوپال کی دریافت کا سال ۱۹۱۹ء قرار پاتا ہے اور دوسرے ٹکڑے میں پوری ایک صدی کی اصطلاح اگر نسخۂ بھوپال کی تاریخ کتابت یعنی ۱۸۲۱ء سے شمار کی جائے تو ۱۹۲۱ء کی طرف رہنمائی ہوتی ہے۔ ایک واقعہ کی دو تاریخوں کو تسلیم کرنے میں جو قباحت ہے وہ ظاہر ہے۔ اگر ۱۹۱۹ء کو صحیح تاریخ فرض کر لیا جائے تو اس میں ایک دوسری دقت سامنے آتی ہے مفتی انوار الحق نے اپنی تمہید میں تو اس کا ذکر نہیں کیا لیکن "عبد الرحمٰن بجنوری مرحوم" کے عنوان سے انہوں نے جو تعزیتی تعارف سپرد قلم کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نسخۂ حمیدیہ کی طباعت کا اہتمام ڈاکٹر بجنوری کر رہے تھے لیکن موت نے ان کو اس کی تکمیل کا موقع نہ دیا۔ مفتی انوار الحق رقمطراز ہیں۔

"آہ کیا انقلاب لیل و نہار ہے، کیسی گردش روزگار ہے کہ یہ کتاب جسے محترم جناب ڈاکٹر عبد الرحمٰن صاحب بجنوری مرحوم ایسے شوق سے چھپوانے کی تیاری کر رہے تھے، آج ان کی یادگار کے طور پر شائع ہو رہی ہے اور یہ ورق جو اُن کے رشحات قلم سے زرکشی گلکار ہونے والا تھا، اِس وقت معناً اُن کا کتابۂ مزار ہے[2]۔"

ڈاکٹر بجنوری کا انتقال ۷ نومبر ۱۹۱۸ء کو ہوا۔ اگر وہ نسخۂ حمیدیہ کے چھپوانے کی تیاری کر رہے تھے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ نسخۂ بھوپال اس سے پہلے دستیاب ہو چکا تھا اور اس کی دریافت کی وہ پہلی تاریخ بھی جو مفتی انوار الحق کے قول سے نکلتی ہے، غلط ہے۔ لیکن یہ محض مفتی انوار الحق کا سہو ہے کہ انہوں نے ایک ایسا پیرایۂ بیان اختیار کیا جو واقعے کے خلاف تھا۔ اِس سے یہ شبہ کرنا صحیح نہیں کہ انہوں نے حقیقت پر پردہ ڈالنے کے لئے نسخۂ بھوپال کی دریافت کا سال قصداً غلط بتایا ہے کیونکہ حقیقت کا اظہار تو انہوں نے خود اپنے دوسرے بیان میں صاف طور سے کر دیا ہے۔ مفتی صاحب مرحوم کے دوسرے بیان کی تائید کچھ اور شواہد سے بھی ہوتی ہے۔ مثلاً معارف بابت ستمبر ۱۹۱۸ء کے شذرات سے یہ اطلاع ملتی ہے کہ نو دریافت نسخۂ بھوپال اس زمانے میں ڈاکٹر بجنوری کے مطالعے میں تھا۔ مولوی عبد الحق محاسن کلام غالب طبع اوّل (۱۹۲۱ء) کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

"انجمن ترقی اردو کا ایک مدت سے ارادہ تھا کہ مرزا غالب کے اردو دیوان کا ایک نفیس ایڈیشن طبع کرے۔ چنانچہ بڑی کوشش اور تحقیق سے یہ دیوان مرتب کیا گیا۔۔۔ میری درخواست پر ڈاکٹر عبد الرحمٰن بجنوری مرحوم نے اس کے لئے بطور مقدمہ غالب کے کلام پر تبصرہ لکھنا شروع کیا۔۔۔ اس اثنا میں اتفاق سے بھوپال کے سرکاری کتب خانے میں میرزا صاحب کے قدیم دیوان کا مکمل نسخہ نکل آیا جس میں وہ تمام نظمیں درج تھیں جو بعد میں خارج کر دی گئیں تھیں۔ علمی لحاظ سے یہ ایک بڑی نعمت اور بیش بہا خزانہ تھا۔ مرحوم نے انجمن کے لئے اسے ترتیب دینا شروع کیا لیکن افسوس اجل نے اتنی مہلت

---

[1] نسخۂ حمیدیہ، تمہید از مفتی انوار الحق ص ۳

[2] مفتی انوار الحق کی اس عبارت کی روشنی میں مولانا امتیاز علی عرشی کا یہ قول صحیح نہیں ہے کہ "انہوں نے کہیں اس کا اظہار نہیں کیا کہ نسخۂ بھوپال بجنوری کی زندگی میں دستیاب ہو چکا تھا، بلکہ اُن کی عبارتوں سے اِس کے خلاف مترشح ہوتا ہے"۔ دیکھئے نسخۂ حمیدیہ اور بجنوری از امتیاز علی عرشی، مطبوعہ نیا دور لکھنؤ مئی ۱۹۶۱ء، ص ۸

[3] بحوالہ نسخۂ حمیدیہ اور بجنوری از امتیاز علی عرشی، نیا دور لکھنؤ مئی ۱۹۶۱ء ص ۸۔ عرشی صاحب نے یہ اطلاع اور ڈاکٹر بجنوری کی تاریخ وفات ڈاکٹر مختار الدین آرزو کے توسط سے فراہم کی ہے۔



نہ دی کہ اس کی تکمیل ہو جاتی۔"

جہاں تک نسخۂ حمیدیہ کا تعلق ہے، اس تحریر سے مفتی انوار الحق کے قول پر بس اتنا ہی اضافہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری نے نسخۂ بھوپال کو انجمن ترقی اُردو کے لئے ترتیب دینا شروع کیا تھا۔

مفتی انوار الحق نے نسخۂ بھوپال کی ترتیب کے سلسلے میں تو ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کے کام کی تفصیل نہیں بیان کی لیکن انجمن ترقی اُردو کے لئے دیوان غالب کی ترتیب کے بارے میں اُنہوں نے اُس کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

"جب انجمن ترقی اُردو نے دیوان غالب اُردو کی ایک نئی اشاعت کا ارادہ کیا تو نظرِ انتخاب مرحوم ہی پر پڑی اور اُنہوں نے بھی اس ننگی اور ادبی خدمت کو لطیب خاطر قبول کیا

مرحوم نے بڑے اہتمام سے اس کے سرانجام کا قصد کیا۔ سب سے پہلے دیوانِ غالب کے مختلف اور متداول نسخے بہم پہنچا کر نہایت احتیاط سے اس کی تصحیح کی اور اس کے ساتھ ہی غالب کی شاعری پر ایک صحیح اور بسیط تبصرہ لکھنا شروع کیا۔"[۱]

اگرچہ مولوی عبدالحق نے اپنی اس تحریر میں جس کا اقتباس اس سے پہلے گزر چکا ہے۔ انجمن ترقی اُردو کے دیوانِ غالب کے مرتب کا نام ظاہر نہیں کیا لیکن یہ مفتی انوار الحق کے بیان کی تردید کے لئے کافی نہیں ہو سکتا کیونکہ ڈاکٹر بجنوری اپنی وفات سے قبل کسی نہ کسی حیثیت سے دیوانِ غالب کی تدوین میں مصروف تھے۔ محاسنِ کلامِ غالب میں اُن کے ایک خط کے کچھ حصے کا جو عکس شائع ہوا ہے، اُس میں یہ عبارت موجود ہے:

"تکیہ والی غزل پوری لکھ کر بھیجتا ہوں۔ سید ہاشمی نے جو دیوان کا ایڈٹ کیا ہوا نسخہ مجھے دیا ہے اُس میں یہ غزل نواب صاحب کے حوالے سے درج ہے۔ اس کی تحقیق نواب صاحب سے مقصود ہے۔ جہاں تک میں میرزا صاحب کے کلام اُردو سے واقفیت رکھتا ہوں، ''میں آسماں ٹل جائیں'' لیکن یہ اُن کا کلام نہیں ہو سکتا۔ اس کی تحقیق سخت ضروری ہے۔ اگر یہ غزل ان غزلوں میں جو بعد میں حاشیے پر اضافہ کی گئی ہیں موجود ہے تو یہ دیکھنا چاہئے کہ کسی شخص کے خط میں لکھی ہوئی ہے اور وہ خط تحقیق ہوتا ہے یا نہیں۔ دوسرے نواب صاحب کو اس کے بارے میں ذاتی علم کیا ہے۔ تیسرے نواب صاحب کی اس کے بارے میں رائے کیا ہے۔ طائرِ دل جو قطعہ ہے، وہ بھی مرزا کا نہیں ہو سکتا۔ اس کے بارے میں بھی نواب صاحب سے جو کچھ مطابق یا مخالف معلوم ہو سکے، نوٹ کر لیجئے گا۔"[۲]

اِس خط کے مکتوب الیہ کے نام و مقام اور تاریخ کتابت وغیرہ کے متعلق عکس سے کوئی واقفیت حاصل نہیں ہوتی لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی ایسے صاحب کے نام لکھا گیا ہے جو اس وقت دہلی میں تھے۔ نواب صاحب سے مُراد نواب ضیاءالدین احمد خاں نیّر و رخشاں کے صاحبزادے اور غالب کے شاگرد نواب احمد سعید خاں طالب دہلوی ہیں، کیونکہ "تکیہ" کی ردیف کی غزل انہیں کی قلمی بیاض سے منقول ہے اور اُن کا انتقال ۱۹۲۵ء میں ہوا۔ وہ کلام جس کے متعلق ڈاکٹر بجنوری نے اس خط میں استفسارات کئے ہیں، نسخۂ بھوپال کا نہیں ہے۔ نسخۂ حمیدیہ میں بھی اُس کا وجود نہیں۔ تاہم اُن کی یہ تحریر متداول دیوان کے سوا غالب سے منسوب کلام کے بارے میں اُن کی چھان بین کا ثبوت ہے۔ غالب کے نودریافت کلام کو متداول دیوان کے نسخوں کے ساتھ شامل کرنے کا اس زمانے میں عام رجحان تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ انجمن ترقی اُردو نے ۱۹۱۳ء یا ۱۹۱۴ء میں دیوانِ غالب کا ایک عمدہ ایڈیشن شائع کرانے کا فیصلہ کیا تھا اور یہ کام پہلے پہل سید ہاشمی کے سپرد کیا گیا تھا۔ اُنہوں نے ۱۹۱۵ء تک اس کا مسودہ تیار کر لیا تھا۔ اس دوران میں لطافتی ترمیں

---

[۱] عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم از مفتی انوار الحق نسخۂ حمیدیہ ص ۲۸۔ [۲] عکس تحریر مطبوعہ محاسنِ کلامِ غالب طبع ششم انجمن ترقی اُردو (ہند) علیگڑھ



...وں سے دیوانِ غالب کا نیا ایڈیشن شائع ہوگیا اور انجمن ترقی اُردو کا منصوبہ سرد پڑگیا۔ لیکن اسی زمانے میں ڈاکٹر بجنوری ولایت سے واپس آئے۔ انہوں نے اس منصوبے سے اتنی دلچسپی دکھائی کہ انجمن ترقی اردو نے یہ کام اُن کے سپرد کردیا۔ نسخۂ حمیدیہ پر تبصرہ کرتے ہوئے سید ہاشمی جو ان امور سے براہِ راست واقفیت رکھتے تھے، لکھتے ہیں

"انجمن ترقی اُردو نے اوّل ہی اوّل ۱۳ء یا ۱۴ء میں دیوانِ غالب کا ایک نسخہ چھاپنے کا ارادہ کیا تھا۔ تجویز یہ تھی کہ دیوان غالب کو عُمدہ کاغذ پر خوشخط اور صحیح طبع کرایا جائے اور جہاں تک ممکن ہو مرزا صاحب کا غیر مطبوعہ یا گمشدہ کلام بھی تلاش کیا جائے . . .

دیوان کو صحیح اور جدید اصول تحریر کے مطابق لکھوانے اور غیر مطبوعہ کلام کو جمع کرنے کی خدمت راقم الحروف کے سپرد ہوئی تھی اور ۱۹۱۵ء تک کتاب کا مسودہ تیار ہوگیا تھا۔

انجمن کی تجویز اسی منزل پر تھی کہ نظامی پریس بدایوں سے دیوانِ غالب کا نیا نسخہ چھپ کر شائع ہوا۔ صحت و حسنِ طبع کے اعتبار سے یہ ایسا نہ تھا جیسا کہ انجمن چھاپنا چاہتی تھی لیکن مروّجہ نسخوں سے کہیں بہتر تھا۔ لہذا اس کی اشاعت نے انجمن کے ولولۂ طبع کو سرد کردیا اور اگر اسی زمانے میں ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم ولایت سے تشریف نہ لاتے تو غالباً انجمن کی تجویز نسیاً منسیاً ہوجاتی، مگر ان مرحوم کو کلامِ غالب سے اس درجہ عقیدت تھی کہ بہت سی مصروفیتوں کے باوجود وہ انجمن کی تجویز کی عملی تکمیل پر آمادہ ہوگئے اور انجمن نے بڑی خوشی سے یہ کام اس (ان) کے سپرد کردیا"[1]

ڈاکٹر بجنوری کے عکسِ تحریر مطبوعہ محاسنِ کلام غالب پر سید ہاشمی کے الٹ گئے ہوئے نسخے کا جو ذکر ہے اس سے دیوانِ غالب کا وہی نسخہ مراد ہے جسے سید ہاشمی نے انجمن ترقی اُردو کے لئے مرتب کیا تھا۔ اس نسخے اور دوسرے نسخوں کی مدد سے ڈاکٹر بجنوری متداول دیوانِ غالب مرتب کرچکے تھے کہ نسخۂ بھوپال دستیاب ہوگیا۔ سید ہاشمی لکھتے ہیں:

"ڈاکٹر بجنوری مرحوم نے کلامِ غالب پر جو تبصرہ لکھا ہے وہ رسالۂ اُردو میں شائع ہوچکا ہے اور اُن کے علمی کمالات کی ممتاز یادگار رہے گا لیکن اسے بھی مرحوم کے شوقِ مخلصانہ کا مساحب اللہ العام سمجھنا چاہئے کہ جس وقت وہ غالب کے متداول دیوان کی طبع کا انتظام کررہے تھے حسنِ اتفاق سے خود بھوپال میں مرزا صاحب مرحوم کا وہ گمشدہ کلام دستیاب ہوگیا جسے مرزا نے خود اپنے دوستوں کے مشورے سے تلف کردیا تھا"[2]

نسخۂ بھوپال کے مل جانے کے بعد ڈاکٹر بجنوری دیوان غالب کو نئے طریقے سے چھپوانا چاہتے تھے۔ اُمید تھی کہ وہ اپنے تبصرے میں کچھ ضروری اضافے کریں گے لیکن اُن کی مرگِ ناگہاں نے اس کی مہلت نہ دی۔ اس کی تفصیل سید ہاشمی نے یوں بیان کی ہے۔

"ڈاکٹر بجنوری مرحوم اس غیر مطبوعہ نسخے کو قدیم دیوان کے ساتھ اس طرح طبع کرانا چاہتے تھے کہ کتاب کے ایک صفحے پر قلمی نسخے کے اشعار ہوں اور مقابل کے صفحے پر متداول دیوان کی وہی غزلیں جن کے اشعار جا بجا سے مرزا صاحب نے خارج کردیے تھے مگر اس قلمی نسخے میں چھوڑ دیے گئے تھے۔ اور مطبوعہ یا قلمی نسخے کی وہ غزلیں جو صرف ایک ہی میں پائی جاتی ہیں اُن کے سامنے کا صفحہ سادہ چھوڑ دیا جاتا کہ دیکھنے والے کو بلا دقّت قدیم و جدید کلام کا فرق اور بعد کی اصلاح و ترمیم کا حال معلوم ہوجائے"

[1] نسخۂ حمیدیہ، تبصرہ از سید ہاشمی، مکتبہ دارالترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی، اُردو، اکتوبر ۱۹۲۲ء، ص ۳ ۔ ۴ ۔ ۷ ۔
[2] نسخۂ حمیدیہ، تبصرہ از سید ہاشمی، مکتبہ دارالترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی، اُردو، اکتوبر ۱۹۲۲ء، ص ۴ ۔ ۷ ۔



یہ بھی اُمید تھی کہ ڈاکٹر عبدالرحمٰن اِس نئے کلام کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار اور پہلے تبصرے میں بہت کچھ اضافہ فرمائیں گے، لیکن دیوان کی کتابت کا ابھی آغاز ہوا تھا کہ اُن کا تپ دِق میں انتقال ہوگیا اور وہ سب اُمیدیں جو مرحوم کی ذات سے وابستہ تھیں خاک میں مل گئیں۔[1]

نسخۂ بھوپال ڈاکٹر بجنوری کی وفات سے کچھ پہلے دستیاب ہوچکا تھا۔ اُنہوں نے نہ صرف یہ کہ اُسے دیکھا تھا بلکہ متداول دیوانِ غالب کے اشتراک کے ساتھ اس کو طبع کرانے کا ایک مخصوص خاکہ بھی بنا لیا تھا اور اس کے مطابق دیوان کی کتابت بھی شروع کرادی تھی۔ اُنہوں نے غالب کے کلام پر اپنا تبصرہ صرف متداول دیوان کو پیشِ نظر رکھ کر لکھا تھا۔ قابلِ قبول خارجی شواہد کے علاوہ اس کی سب سے بڑی داخلی شہادت یہ ہے کہ اِس میں اُنہوں نے نسخۂ بھوپال یا غالب کے ابتدائی طرزِ کلام کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں لکھا۔ چونکہ یہ تبصرہ طوالت کے باوجود ابھی ناتمام تھا اور اسی اثنا میں نسخۂ بھوپال مل گیا، اِس لئے یہ غلط فہمی پیدا ہوگئی کہ اُنہوں نے یہ تبصرہ نسخۂ بھوپال کے دستیاب ہونے کے بعد لکھا تھا۔[2] حالانکہ جب اُنہوں نے اِس میں کسی جگہ سے نسخۂ بھوپال کا ذکر نہیں کیا تو یہ غلط فہمی بے بنیاد ہی نہیں بے نتیجہ بھی تھی۔ توقع تھی کہ نسخۂ بھوپال کی روشنی میں ڈاکٹر بجنوری اپنے تبصرے پر نظرِ ثانی کریں گے، لیکن قبل اِس کے کہ اُن کے ارادے پُورے ہوتے یا کسی قدر آگے بڑھتے، اُنہوں نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ اُن کی وفات کے بعد ریاست بھوپال نے نسخۂ بھوپال کی ترتیب پر مفتی انوار الحق کو مامور کیا اور اُنہوں نے اُسے اپنے طریقے سے سرانجام دیا۔ قطع نظر اِس کے کہ اُنہوں نے ڈاکٹر بجنوری کے مجوزہ اندازِ ترتیب کی کیفیت نہیں لکھی، اُن کے تمام بیانات اپنی تشنگی یا اُلجھاؤ کے باوجود صداقت پر مبنی ہیں۔

نسخۂ حمیدیہ پر ڈاکٹر بجنوری کی مرگِ ناگہانی کا سب سے بڑا اثر تو یہی پڑا کہ یہ دیوان اُن کی ترتیب و تنقید سے محروم رہ گیا لیکن اُن کی بے وقت اور نہایت افسوسناک موت اس دیوان کی اشاعت پر کچھ اور حیثیتوں سے بھی اثر انداز ہوئی۔ اس دیوان کو بطور پر اُن کی یادگار بنانے کا ارادہ کیا گیا۔ لیکن ڈاکٹر بجنوری کے اعزّا و احباب کے عدم تعاون کی وجہ سے مفتی انوار الحق کو اُن کے حالاتِ زندگی فراہم کرنے میں بڑی دقّت پیش آئی۔ اور دیوان کی اشاعت میں کئی سال کی تاخیر کے باوجود اِس سلسلے میں کوئی خاص نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ چنانچہ ڈاکٹر بجنوری پر جو مضمون اُنہوں نے لکھا ہے، وہ اُن کے سوانح کے بجائے اُن کے اعزّا اور احباب کی شکایتوں سے لبریز ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر بجنوری کے اِس طویل تبصرے کو بھی نسخۂ حمیدیہ کا مُقدمہ بنایا گیا جو صرف متداول دیوانِ غالب سے متعلق تھا۔

ڈاکٹر بجنوری کا تبصرہ رسالۂ اُردو بابت جنوری ۱۹۲۱ء میں "محاسن کلام غالب" کے عنوان سے شائع ہوچکا تھا۔ اس کے بعد اسی سال انجمن ترقی اُردو نے اُسے کتابی صورت میں بھی شائع کردیا تھا۔ چنانچہ بقول سید ہاشمی "اِس تبصرے کو نسخۂ حمیدیہ میں شامل کرنا غیر ضروری بلکہ کسی قدر ناموزوں ہوا۔"[3] لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ نسخۂ حمیدیہ کے مرتب نے اسے ایسے طور پر شامل کیا تھا۔

---

[1] نسخۂ حمیدیہ، تبصرہ از سید ہاشمی رکنِ دارالترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی، اُردو، اکتوبر ۱۹۲۲ء ص ۷۰۴ – ۷۰۵

[2] پروفیسر سید احتشام حسین صاحب کے پاس نسخۂ حمیدیہ کی ایک جلد ہے جو غالباً محمد احتشام الدین دہلوی کے پاس رہ چکی ہے۔ اِس پر ڈاکٹر بجنوری کے مقدمے کے آخر میں محمد احتشام الدین دہلوی نے ۱۱ مئی ۱۹۲۷ء کو لکھا ہے کہ "یہ غلط ہے کہ بجنوری مرحوم نے یہ دیباچہ غالب کے نسخۂ دیوانِ معدوم کی دستیابی سے پہلے لکھا تھا۔ نہیں، بلکہ دستیاب ہونے پر اُن کو مکمل کلامِ غالب کے شائع کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ اور یہ مقدمہ اس ارادہ کی پیروی میں لکھا گیا۔ اِس کے لکھنے کے بعد وہ ایک بار علی گڑھ آئے اور راقم کے پاس دو ایک روز مہمان رہے۔ یہ مقدمہ پنسل سے لکھا ہوا کاپی پر تھا۔ اُن کے پاس موجود تھا اور اُنہوں نے خود اپنی زبان سے اس کو پڑھ کر سنایا اور طباعت کے متعلق مشورے کئے۔" دیکھئے پروفیسر سید احتشام حسین کا مراسلہ مطبوعہ ہماری زبان، علی گڑھ، یکم مارچ ۱۹۶۱ء

[3] نسخۂ حمیدیہ، تبصرہ از سید ہاشمی، اُردو، اکتوبر ۱۹۲۲ء، ص ۷۰۵۔



نسخۂ حمیدیہ میں اس قصیدے کا کوئی عنوان نہیں ہے اور یہ قصیدہ اس مقطع پر ختم ہو جاتا ہے ؎

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی

آتے ہے بے کسیِ عشق پہ رونا غالبؔ
کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد

جبکہ محاسن کلام غالبؔ میں اس کے بعد نو صفحات اور ہیں۔ مزید یہ کہ نسخۂ حمیدیہ میں مسئلۂ وحدت الوجود پر ڈاکٹر بجنوری کے خیالات سے شدید اختلاف ظاہر کرتے ہوئے مفتی انوار الحق نے ایک اتنا طویل حاشیہ لکھا ہے کہ وہ اس موضوع پر اچھے خاصے مقالے کی شکل اختیار کر گیا ہے۔

بعض شواہد سے اس دیوان کی طباعت و اشاعت کے مراحل میں بھی کچھ پیچیدگیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ مثلاً اس کے ایک ہی ایڈیشن کے تین سرورق ملتے ہیں۔ دو سرورق مفید عام اسٹیم پریس آگرہ کے چھپے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک سرورق میں جسے پہلا سرورق کہنا چاہیے" دیوان کے نام کے بعد صرف

"بہ تدوین
خاکسار ضیاء العلوم مفتی انوار الحق ایم اے منشی فاضل
ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم
بھوپال"

لکھا ہوا ہے۔ مقدمۂ دیوان اور ڈاکٹر بجنوری کا ذکر نہیں ہے۔ دوسری خاص بات یہ ہے کہ مطبع کے اندراج میں اسٹیم کے اوپر قلم سے ۱۹۲۱ درج ہے۔ اس سطر کے نیچے داہنی طرف "قیمت مجلد ہے"۔ بائیں طرف "قیمت غیر مجلد ۸/۱۲" اور درمیان میں "منتظم امور کتابت کور" لکھا ہوا ہے لیکن مفید عام اسٹیم پریس آگرہ کے دوسرے سرورق میں دیوان کے نام کے نیچے

" مع مقدمۂ دیوان –
مرقومہ جناب ڈاکٹر عبد الرحمٰن صاحب بجنوری مرحوم بی اے ایل ایل بی
بیرسٹرایٹ لا۔ ڈی۔ جے "

کا اضافہ کیا گیا ہے اور اس کے بعد

مرتبہ
خاکسار ضیاء العلوم مفتی انوار الحق ایم اے منشی فاضل
ڈائرکٹر تعلیمات ریاست بھوپال

لکھا گیا ہے مطبع کے اندراج میں ۱۹۲۱ء مذارد ہے اور مجلد کی قیمت پانچ روپے اور غیر مجلد کی چار روپے ہو گئی ہے۔

تیسرے سرورق میں "مفید عام اسٹیم پریس آگرہ میں با اہتمام محمد قادر علی خاں صوفی طبع ہوا" کے بجائے "صرف ٹائٹل گورنمنٹ پریس بھوپال میں طبع ہوا" درج ہے اور کاتب کا نام نصیر الدین لکھا ہے۔ دیگر اندراجات مفید عام پریس آگرہ کے دوسرے سرورق کے مطابق ہیں۔ یہ سرورق تو محض سرورق کم پڑ جانے کی بنا پر بھوپال میں چھپوا لیا گیا ہوگا۔ لیکن مفید عام پریس آگرہ کے دوسرے سرورق کے چھپوانے کا سبب قیمت کے تغیر کے علاوہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے سرورق میں ڈاکٹر بجنوری سے متعلق اندراج نہ تھا جس کا ہونا بعد میں ضروری سمجھا گیا۔[1]

---

[1] نسخۂ عرشی طبع اوّل کے دیباچے میں عرشی صاحب نے نسخۂ حمیدیہ کی اشاعت کی تقریبی تاریخ ۱۹۲۸ء لکھی ہے (ص ۱۱۶) لیکن اس کے بعد انہیں آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ۱۹۲۱ء کے سرورق والا نسخہ مل گیا جس کا ذکر انہوں نے اپنے مراسلے مطبوعہ "ہماری زبان" علی گڑھ ۸ اگست ۱۹۶۱ء میں کیا ہے۔ تاہم چونکہ انہوں نے اسکو نظر انداز کر دیا کہ اس سرورق پر ڈاکٹر بجنوری کا نام نہیں ہے؛ اس لئے دوسرا سرورق چھپوانے کے اس سبب کی طرف بھی ان کا خیال نہیں گیا۔



سُوءِ اتفاق کہ اِس ردّوبدل میں دیوان کی تاریخِ طباعت نہیں برقرار رکھی گئی اور چونکہ کسی دُوسری جگہ بھی اس کا ذکر نہ تھا اِس لئے ایک بڑا نقصان یہ ہوا کہ نسخۂ حمیدیہ کی اکثر جلدوں سے اس کی تاریخِ طباعت کا پتہ چلنا ناممکن ہو گیا۔

اِس میں تو کوئی شک نہیں کہ اِس نسخے کی تمام جلدیں مفیدِ عام پریس آگرہ میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوئیں، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ حذف تغیر و تبدّل کا عمل متن کی طباعت میں بھی جاری رکھا گیا ہے اور اِس طرح ایک ہی ایڈیشن کی جلدوں میں کہیں کہیں معمولی سا فرق ہو گیا ہے۔ اِس کی دو پیشِ نظر جلدیں اس کا ثبوت فراہم کرتی ہیں۔ ان میں سے ایک جلد میں صفحہ ۱۹۱ پر آخری مصرع کے داہنی طرف "مطبوعہ" لکھا ہوا ہے لیکن دوسری جلد میں یہ اندراج غائب ہے۔ اس صفحے کے بعض خطوط کی کشش میں بھی دونوں جلدوں میں فرق ہے۔ اسی طرح صفحہ ۱۹۲ کے حاشیے کی عبارت میں بھی دونوں جلدوں میں لفظی اختلاف موجود ہے۔ اگرچہ یہ تغیرات معمولی ہیں اور شاید بہت کم کئے گئے ہیں لیکن کسی تحقیقی کتاب میں بغیر اظہار کے اِس طرح کی تبدیلیاں سخت غلط فہمی کا باعث ہو سکتی ہیں کیونکہ کوئی محقق کسی مطبوعہ کتاب کے تمام نسخوں کا جائزہ نہیں لے سکتا۔

تصویروں کی اشاعت میں بھی نسخۂ حمیدیہ کچھ ایسی ہی صورتِ حال پیش کرتا ہے۔ مفتی انوار الحق نے ڈاکٹر بجنوری پر اپنے مضمون میں تذکرتاً لکھا ہے کہ اُن کی ایک تصویر جو نہیں دی گئی تھی وہ بھی اُن سے واپس لے لی گئی تھی جس کی وجہ سے اس دیوان کو تصویروں سے مزیّن کرنے کا خیال چھوڑا جاتا رہا۔ لیکن دراصل اس دیوان میں غالب، ڈاکٹر بجنوری اور نسخۂ بھوپال کے ایک صفحے کی تصویریں شائع کی گئیں۔ اِس کے باوجود مرتب نے نہ تو اس سلسلے میں اپنے بیان پر نظرِ ثانی کی اور نہ کسی اور طرح تصویروں کی شمولیت کا اظہار کیا۔ اب اگر کسی کو اِس دیوان کا کوئی ایسا نسخہ ملے جس میں سے تصویریں غائب کر دی گئی ہوں اور آج کل عموماً اس کے ایسے ہی نسخے دیکھنے میں آتے ہیں تو مرتب کے بیان کے مطابق وہ یہی سمجھے گا کہ اِس دیوان میں تصویریں سرے سے شامل ہی نہیں کی گئیں، بلکہ اس کو اِس پر تعجب بھی ہوگا کہ مرتب کو ڈاکٹر بجنوری کی تصویر سے مستقلاً محروم رکھا گیا، حالانکہ یہ باتیں خلافِ واقعہ ہوں گی۔ حقیقت یہ ہے کہ اِس قسم کی بے احتیاطیاں نسخۂ حمیدیہ کے ہر متجسس قاری کو بڑی اُلجھن میں ڈالتی ہیں اور اس کے لئے معاملات کی تہہ تک پہنچنا آسان نہیں رہتا۔ ▼

شرعی قسم

"سنو صاحب، حُسن پرستوں کا ایک قاعدہ ہے کہ وہ امرد کو دو چار برس گھٹا کر دیکھتے ہیں۔ جانتے ہیں کہ جوان ہے، لیکن بچّہ سمجھتے ہیں۔ یہ حال تمہاری قوم کا ہے۔ قسم شرعی کھا کر کہتا ہوں کہ ایک شخص ہے کہ اُس کی عزت اور نام آوری جمہور کے نزدیک ثابت و متحقق ہے اور تم صاحب بھی جانتے ہو مگر جب تک اس سے قطعِ نظر نہ کرو اور اس شہرے کو گمنام و ذلیل نہ سمجھ لو، تم کو چین نہ آئے گا۔ پچاس برس سے دلّی میں رہتا ہوں، ہزارہا خط اطراف و جوانب سے آتے ہیں۔ بہت لوگ ایسے ہیں کہ محلہ نہیں لکھتے۔ بہت لوگ ایسے ہیں کہ محلۂ سابق کا نام لکھ دیتے ہیں۔ حکام کے خطوط فارسی و انگریزی یہاں تک کہ ولایت کے آئے ہوئے صرف شہر کا نام اور میرا نام۔ یہ سب مراتب تم جانتے ہو اور ان خطوط کو تم دیکھ چکے ہو اور پھر مجھ سے پوچھتے ہو کہ اپنا مسکن بتا۔ اگر میں تمہارے نزدیک امیر نہیں، اہلِ حرفہ سے بھی نہیں ہوں کہ جب تک محلہ اور تھانہ نہ لکھا جائے، ہرکارہ میرا پتہ نہ پائے۔ آپ صرف دہلی لکھ کر میرا نام لکھ دیا کیجئے۔ خط کے پہنچنے کا میں ضامن۔"

عصمت جاوید

غالبؔ کی عملی سُوجھ بُوجھ فنؔ کے آئینے میں

فن اور شخصیت کا باہمی رشتہ بڑا ہی پیچ در پیچ اور سلسلہ در سلسلہ رشتہ ہے جسے ریاضی کے فارمولوں میں ڈھالا نہیں جا سکتا۔ شخصیت اور ذہنِ تخلیق دونوں ایسی ہی بڑی پُراسرار حقیقتیں ہیں جن کا تعلق نفسیات سے زیادہ "ماورائے نفسیات" PARAPSYCHO سے ہے۔ انسان کو کسی طور پر ایسے حیوان سے تعبیر کیا گیا ہے جس کے عمل اور ردِّ عمل کے متعلق کوئی پیش گوئی نہیں کی جا سکتی۔ پھر فن کار کی شخصیت تو اور بھی پیچیدہ ہوتی ہے۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے شاعری سے متعلق غیر شخصی نظریے کو دنیائے ادب ابھی تک مکمل طور پر قبول نہیں کر سکی ہے۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے اپنے نظریے کے جواز میں جو قیاس (ANOLOGY) پیش کیا ہے اس کی بڑی آسانی سے تردید کی جا سکتی ہے۔ اُس نے ایک مخصوص استحالۂ کیمیادی (CATALYSIS) کی مثال پیش کی ہے جس میں پلیٹنم کی موجودگی میں دو قسم کی گیسیں آکسیجن اور سلفر ڈائی آکسائڈ ایک نئے کیمیادی مرکب یعنی سلفیورس ایسڈ میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ اور اس عمل سے پلیٹنم میں بظاہر کوئی تبدیلی رونما ہوتی ہے اور نہ اس نئے کیمیادی مرکب میں پلیٹنم کا شائبہ تک ہوتا ہے۔ اسی طرح شاعر کا ذہن بھی پلیٹنم کا ٹکڑا ہے جو تخلیقی عمل کے دوران غیر متاثر اور غیر متبدل رہتا ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جس طرح پلیٹنم کی موجودگی میں دو خاص گیسیں مل کر ہمیشہ سلفیورس ایسڈ ہی میں بدل جاتی ہیں کیا اسی طرح ہر شاعر کے ذہن میں دو احساسات مل کر ہمیشہ ایک ہی جیسے جذبے کی تخلیق کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کا جواب نفی میں ہے۔ بہرحال ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کا غیر شخصی نظریہ بوفاں BUFFON کے نظریۂ "اسلوب ہی شخصیت ہے" کا شدید ردِّ عمل ہے۔ اور حق تو یہ ہے کہ عمل اور ردِّ عمل دونوں میں ادھوری حقیقتیں پوشیدہ ہوتی ہیں اور فن اور شخصیت کے باہمی رشتے کو سمجھنے میں ان دونوں نظریوں سے مدد ملتی ہے۔ سیرت جو شخصیت کے لیے استوانے کا کام دیتی ہے اپنے اظہار میں بڑی حد تک مستقل خد و خال کی حامل ہوتی ہے اور ایک شخص کا بار بار دُہرایا جانے والا طرزِ عمل اُس کی سیرت کو متعین کرنے میں مدد دیتا ہے لیکن شخصیت بڑی پیچیدہ چیز ہے۔ یہ وہ حریمِ خاص ہے جہاں تک انسانی ذہن کی رسائی بڑی مشکل سے بلکہ قریب قریب ناممکن ہوتی ہے۔ اس میں "ناکردہ گناہوں کی حسرت" بھی ہوتی ہے اور "دُردِ تہِ جام" کو چوری چھپے للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھنے کا شدید جذبہ بھی ہوتا ہے۔ اور یہ دبی دبی خواہشیں اور نا آسودہ تمنائیں جب فن کا رُوپ دھارتی ہیں تو کچھ کا کچھ بن جاتی ہیں۔ ہر فن کے اپنے حدود اور مطالبے اور اُس کے کچھ ہیئتی زاویے، فن کاروں کے مختلف تجربے ہوتے ہیں۔ ہر فن کار کا ایک تہذیبی ورثہ، مخصوص سماجی روایات اور فکری پس منظر ہوتا ہے اور ماحول کے مطالبات، اُس کا دباؤ اور کھنچاؤ اُس پُراسرار قوت سے مل کر جسے عبقریت کہا جاتا ہے، اُس کی تخلیق کا چہرہ مہرہ متعین کرتے ہیں۔ ایسی صورت میں غالبؔ کی سی ہمہ دار اور ہمہ جہت شخصیت کا تجزیہ اور ان میں اُس کے اظہار کی تلاش کرنا ممکن ہے ایک ناروا جسارت ہو۔ اس راہ میں بڑے سخت مقام آتے ہیں اور پھر غزل میں یہ تلاش اس لیے اور بھی مشکل ہو جاتی ہے کہ اس میں فن کار کی شخصیت سترِ محاکات میں چھپی ہوتی ہے لیکن شخصیت کا کوئی پہلو اتنا طاقتور ہو کہ وہ اپنے ظاہر یعنی سیرت کی تشکیل ایک خاص ڈھنگ سے کرے تو یہ پہلو فن کے محاکات میں چھپا رہنے کے باوجود اپنے انداز و قد سے پہچانا جا سکتا ہے اور اس صورت میں غیر شعوری طور پر شاعر کا قلم ایک رنگ کے مضمون کو سو رنگ سے باندھتا ہے اور وہ بھی اس طرح کہ ہر مضمون ایک نئے تجربے کا اظہار



شاعر ۔ دہلی

خوش قسمتی سے غالب کی شخصیت کا ایک پہلو ایسا توانا اور جاندار ہے کہ اس کی جھلکیاں غزل کے آئینے میں صاف دکھائی دیتی ہیں۔ یہ غالب کی عملی سوجھ بوجھ (PRACTICAL WISDOM) ہے لیکن اس تلاش سے قبل مناسب ہوگا اگر ہم اُن کی (ملکہ) اُس کے اثرات کا جائزہ لیں۔

ہر عظیم فن کار کی شخصیت کے بنیادی عنصر یعنی انانیت اور فن پر جس طرح ہر عظیم فن کار کی تہہ میں انانیت کا شدید جذبہ کارفرما ہوتا ہے اُسی طرح غالب کے فن کا محرک بھی یہی قوی جذبہ ہے جس کا اظہار اُن کے ادبی سفر کے آغاز ہی سے ہوتا ہے جب وہ "بیدل زدہ" ہو جاتے ہیں۔ اردو غزل میر کی جذباتی معصومیت سے ہوتی ہوئی مختلف نشیب و فراز سے ہو کر جب غالب کے عہد تک پہنچی تو وہ صفائی زبان، محاورہ بندی اور رعایت لفظی کی سطح پر آ چکی تھی۔ غالب کے پیش نظر ابتدا ہی سے فارسی کے اس عہد کا کلام تھا جب حالی کے مقابلے میں "خیالی" مضامین، تشبیہوں اور استعاروں کی جدت اور خیال بندی شاعری کی معراج سمجھی جانے لگی تھی جس کی نمائندگی عہد عالمگیری کے شعرا اور بہترین نمائندگی مرزا عبدالقادر بیدل کر رہے تھے۔ غالب نے ابتدا ہی سے شاعری کو معنی آفرینی سمجھا تھا۔ اگرچہ بہت بعد میں انہوں نے ہرگوپال تفتہ کے نام ایک خط میں لکھا "شاعری معنی آفرینی ہے قافیہ پیمائی نہیں"۔ اور قاضی عبدالجمیل کے نام ایک خط میں تحریر فرمایا: "اسد اور شیر ... اور خدا ... خدا اور دامیری طرز گفتار نہیں"۔ گیارہ سال کی عمر سے لے کر جب مرزا نے فارسی میں شعر و شاعری کا آغاز کیا تھا، اٹھارہ بیس سال کی عمر تک جب وہ آگرے میں تھے ایسا تو زمانہ نہیں جب کسی کا ادبی ذوق پختہ ہو جائے۔ اس لئے ادبی مذاق کی ناپختگی کے اس زمانے میں مرزا کی مشکل پسند طبیعت نے معنی آفرینی کے اس سطحی تصور کو فوراً معیاری سمجھ لیا جسے بیدل نے اپنے فارسی کلام میں پیش کیا تھا اور بیدل کو جس کی تعریف میں نسخۂ حمیدیہ میں اُن کے کئی اشعار ملتے ہیں شاعری کی معراج سمجھ کر اردو شاعری پر جب انہوں نے نظر ڈالی ہوگی تو انہیں ایک چٹیل میدان نظر آیا ہوگا اور انہوں نے یہ سوچا ہوگا کہ کیوں نہ بیدل کی تقلید میں اردو شاعری کو نئی بلندیوں سے آشنا کیا جائے۔[1] انہوں نے اردو شاعری کی تاریخ پر نظر ڈالے بغیر فوراً طرز بیدل میں ریختہ گوئی شروع کر دی یا پھر رنگ بیدل کو جس کی

اسد ہر جا سخن نے طرح باغ تازہ ڈالی ہے
مجھے رنگ بہار ایجادی بیدل پسند آیا

[illegible] اور ساتھ ہی ساتھ اردو شاعری میں اپنے لئے ایک نئی راہ نکال کر اپنے احساس برتری کی تسکین کا سامان بھی مہیا کیا جائے جو اُن کے "خاک پاک توران" سے ہونے کے شدید احساس کا لازمی نتیجہ تھا۔ اس زمانے میں اُن کی خود اعتمادی کا یہ عالم تھا کہ جب اہالیان آگرہ نے اُن کے ریختے میں فارسی کے بڑے بڑے پیوند دیکھ کر اور الفاظ کی ثقالت اور تخیل کی غرابت سے گھبرا کر اُن کے کلام پر اہمال کا الزام لگایا تو وہ ان اعتراضات سے اثر قبول کرنے کے بجائے اپنی دشوار پسندی پر فخر کرنے لگے اور ایک فارسی رباعی میں انہیں جاہل تک قرار دیا۔ اگرچہ یہی "جاہل" نظر ثانی کے بعد شعور کامل ہے، لیکن اُن کی انانیت نے انہیں بیدل کی خیالی دنیا میں زیادہ عرصے تک بھٹکنے نہیں دیا اور جب اُن کی نظر عالمگیری عہد کے شعرا سے آگے بڑھ کر اکبری عہد کے شعرا پر پڑی تو اُن کا دائرہ افق وسیع ہوا اور ادبی ذوق کی پختگی کے ساتھ ساتھ جب دلّی میں اُن کے باذوق دوستوں کے مشوروں نے انہیں اپنا اسلوب بدلنے پر مجبور کیا تو انہیں اپنی ادبی بے راہ روی کا احساس ہوا اور انہیں یہ کہنا پڑا: "پندرہ برس کی عمر سے پچیس برس کی عمر تک مضامین خیالی لکھا کیا۔ دس برس میں بڑا دیوان جمع ہو گیا۔ آخر جب تمیز آئی تو اس دیوان کو دور کیا۔

اوراق یک قلم چاک کئے۔ دس پندرہ اشعار واسطے نمونے کے دیوان حال میں رہنے دیئے۔" (خط بنام عبدالرزاق شاکر)

اُن کی انانیت کا اظہار ہندوستانی فارسی گویوں اور فرہنگ نویسوں کو حقارت کی نظر سے دیکھنے میں بھی ملتا ہے۔ شیخ علی حزیں تو تازہ ولایت تھے [illegible] اس لئے اُن کے لسانی تعصب اور ہندوستانی فارسی سے نفرت کی توجیہہ آسانی سے ہو سکتی ہے لیکن غالب ہندوستان میں پیدا ہونے کے باوجود ہندوستانیوں کی فارسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ مُلّا غیاث الدین رامپوری آبادی اور محمد حسین اُن کی نظروں میں جاہل فرہنگ نویس [illegible] قتیل (دکھتری بچہ)

---

[1] نسخۂ حمیدیہ کے مطالعہ سے صاف پتہ چلتا ہے کہ ابتدائی دور کے اکثر اشعار میں جنہیں غالب نے اپنے منتخبہ دیوان میں شامل کیا ہے، اردو شاعری انتہائی بلندیوں کو چھوتی ہے۔ یہ اشعار اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ شاعر کی صلاحیت آگے چل کر بیدل کے سحر سے آزاد [illegible]



اس رخصت پسندانہ طرزِ عمل کی توجیہہ بھی اُن کی انانیت پسندی و خود بینی ہی سے کی جاسکتی ہے۔ وہ خود کو اہلِ زبان کی فارسی کا جائز وارث سمجھتے تھے اور کیا عجب کہ ایک محرک لاشعوری طور پر یہ بھی ہو کہ مستند قرار دیئے میں "ترک ایک" کی انانیت نے اپنے لئے اور اسی "ترک" (یعنی امیر خسرو) کی فارسی کو رد کر دیا ہو۔ اوّل تو اُن کا ادبی ذوق فارسی ہی کا ساختہ پرداختہ تھا اور پھر فارسی بہرحال حکمرانوں کی زبان رہ چکی تھی۔ اور اُس وقت کے علمی حلقوں میں بھی یہی شستہ ادبی مذاق کی علامت سمجھی جاتی تھی، اِسلئے غالب کو صائبؔ، عُرفیؔ، نظیریؔ اور طالبؔ آملی سے سبقت لے جانے کی دُھن تھی۔ اگرچہ فارسی میں بھی اِس "غریبِ شہر" کو زبان داں کی تلاش رہی اور جو "تماش" مگر غالب کہ در زمانہ "گُست" کہہ کر وہ رحم طلب نظروں سے اہلِ ذوق سے داد حاصل کرنے کے طلبگار رہے، پھر بھی اُن کی انانیت اسی زبان میں "نقش ہائے رنگ رنگ" پیش کر کے اس توقع پر جیتی رہی کہ امتدادِ زمانہ سے جب اُن کی شرابِ فارسی کہنہ ہو کر تیز و تند ہو گی تو آنے والی نسلوں پر اُس کا اثر ظاہر ہو کر رہے گا۔ لیکن اگر غالب صرف فارسی کے شاعر ہوتے تو شاید انہیں وہ شہرت نصیب نہ ہوتی جو آج انہیں اُردو کی بدولت حاصل ہے۔ اگرچہ آج ہندوستان میں کلاسکی فارسی شاعری کا مذاق باقی نہیں رہا۔ اور خود غالب کے زمانے میں ہندوستان سے یہ مذاق رُخصت ہونا شروع ہو گیا تھا لیکن آج بھی ایران میں غالب کے اہلِ زبان کی سی فارسی میں کہے ہوئے اشعار کو وہ مقام حاصل نہیں جو انہیں اُردو کے طفیل میں ہندوستان میں حاصل ہے۔ اس کی وجہ ممکن ہے یہ ہو کہ وہ فارسی میں اُس مقام سے آگے نہ بڑھ پائے ہوں جہاں علی حزیںؔ، صائبؔ، عُرفیؔ اور نظیریؔ تھے جو اُن کے بہرحال پیرانِ معنوی تھے اور سعدیؔ و حافظؔ اُن سے بمراحل آگے ہوں۔ سچ تو یہ ہے کہ اُردو شاعری ہی نے اُن کے اصل مزاج کو پہچانا اور اُن کی پوشیدہ فنی صلاحیتوں کا سُراغ لگا کر اور انہیں اُبھار کر خود بھی انتہائی بلندیوں پر پہنچی اور اس عظیم شاعر کی پیش گوئی کو جو در اصل اُس کی فارسی شاعری کی نسبت تھی اِس شان سے سچ کر دکھایا کہ وہ آج اِس دور میں کلاسکی عظمت کا مستحق اور بین الاقوامی شہرت کا مالک بن گیا ہے اور دنیا کے بیشتر مُلکوں میں اُس کے جشنِ صد سالہ کی تیاریاں دھوم دھام سے ہو رہی ہیں۔

غالب کی انانیت داخلی نہیں بلکہ خارجی نوعیت کی تھی۔ یہ واقعہ ہے کہ شعور کی پختگی کے ساتھ اُن کی انانیت بھی معاملہ فہم ہوتی گئی ——— اور خود اعتمادی سے سرشار ہو کر قصرِ تشدید میں اسیر ہونے کے بجائے اُن کی انانیت نے اساتذۂ فن اور دوستوں کے مُفید مشوروں سے اِستفادہ کیا۔ اور اُن کی شاعری معنی آفرینی کی اعلیٰ سطح پر پہنچ گئی۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ غالب کی فطرت میں اعلیٰ سُوجھ بُوجھ کی خداداد صلاحیت تھی اور وہ خارجی شخصیت کے مالک یعنی ایکسٹروورٹ (EXTROVERT) تھے اُن کی شخصیت جس قدر دلآویز اور اُن کی زندگی جتنی ہنگامہ آرا اور ہنگامہ پرور رہی ہے، اُردو کے کسی اور قدیم شاعر کی زندگی میں شاید ہی اس کی مثال ملے۔ کبھی وہ کشمیری والے کٹڑے کے ایک کوٹھے پر راجہ بلوان سنگھ سے پتنگ لڑاتے ہوئے نظر آتے ہیں، کبھی کسی ستم پیشہ ڈومنی کے تیرِ نظر کے گھائل دکھائی دیتے ہیں، کبھی پنشن کی بحالی کے لئے دوڑ دھوپ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور کلکتے کا سفر اختیار کرتے ہیں۔ اثنائے راہ میں لکھنؤ اور بنارس میں قیام کرتے ہیں۔ کبھی بنارس کے حسینانِ شوخ و شنگ یاد آتے ہیں اور کبھی کلکتے کے بُتانِ خود آرا۔ پنشن حاصل کرنے میں ناکامی کے بعد کبھی وہ قرض کی مے پیتے ہیں اور قرض خواہوں سے مُنہ چھپاتے پھرتے ہیں۔ کبھی عدالت سے اُن کے خلاف ڈگری ہوتی ہے تو گرفتاری سے بچنے کے لئے خانہ نشین ہو جاتے ہیں، کبھی انگریز ممدوحوں کی مدح خوانی میں مصروف ہیں، کبھی ولیم فریزر کے قتل میں اُن پر مُخبری کا الزام عائد ہوتا ہے دہلی کالج کی پروفیسری کو ٹھکرایا جا رہا ہے کبھی شہزادگانِ تیموریہ کے مشاعروں میں شریک ہو رہے ہیں کبھی قمار بازی کے جرم میں قیدِ بامشقّت کی سزا ہوتی ہے، کبھی نجم الدولہ دبیر الملک بن کر شاہانِ تیموری کی تاریخ لکھنے میں مصروف ہیں۔ اور آخری عہدِ سلطنت کے اُستاد اور ذوق کی وفات کے بعد اُستادِ شاہ مقرر ہوتے ہیں۔ کبھی کونسل "سے کی فکر لاحق ہے، کبھی ایامِ غدر میں غدر کے حالات لکھنے میں منہمک ہیں اور "قریح" کے لئے سرِ بسر رہے ہیں اور کبھی آخری عُمر میں "بُرہانِ قاطع" پر اعتراض کر کے بھڑ کے چھتے کو چھیڑتے ہیں عدالت میں [illegible] عرفی کا مقدمہ بھی دائر کرتے ہیں۔ مختصر یہ کہ اتنی مصروف اور گوناگوں زندگی شاید ہی کسی عہدِ قدیم کے شاعر نے گزاری ہو۔ غالب کی [illegible] کا ایک بڑا ثبوت یہ بھی ہے کہ وہ کثیر الاحباب تھے۔ اُن کے ملنے جلنے والوں میں ہندو، مسلمان، انگریز سبھی تھے۔ دوستوں [illegible] دوستوں کے معاملے میں ادبی، غیر ادبی تخصیصوں کی تخصیص نہ تھی۔ وہ اپنے ذوقِ انجمن آرائی کی تسکین مراسلے کو مکالمہ بنا کر



بھی کرتے تھے۔ خطوط نویسی کا شوق جتنا غالب کو تھا، شاید ہی کسی اور شاعر کو رہا ہو خطوں کے جواب لکھنے کا بھی بڑا شوق تھا۔ انہیں کے الفاظ میں ادھر خط پڑھا، ادھر جواب لکھا" پر سختی سے عمل تھا۔ ملنے جلنے والوں اور قریبی دوستوں کے علاوہ نادیدہ دوستوں کو بھی اسی چاؤ سے خط لکھتے تھے۔ بقولِ حالی بیماری اور تکلیف کی حالت میں بھی وہ خطوں کے جواب لکھنے سے باز نہ آتے تھے۔"

اُن کی شخصیت کے مطالعے سے جو ایک اہم خصوصیت ہمارے سامنے اُبھر کر آتی ہے وہ یہ ہے کہ غالب کو زندگی سے بڑا پیار تھا۔ وہ اُس کے لئے بڑے سے بڑا اُصول قربان کرنے کو تیار رہتے تھے زندگی سے پیار ہی اُن کی زندگی کا سب سے بڑا اُصول تھا۔ اس لئے وہ اُصولوں کے لئے اپنا سر کٹا کر نیزے پر رکھوانے کے قائل نہیں تھے جیؔ "خود سرساں کی خواہم"۔ ظرافت، بذلہ سنجی اور زندہ دلی ایسے ہتھیار ہیں جن کی مدد سے غمہائے روزگار کو شکست دی جاسکتی ہے۔ غالب کی زندگی گوناگوں مشکلات اور مالی پریشانیوں کا شکار تھی جس کے باعث اُن کے کلام میں حزن و ملال کا رنگ بھی بعض وقت کافی گہرا ہوجاتا تھا۔ لیکن وہ مشکلات کو ہنسی میں ٹالنے کا حوصلہ رکھتے تھے۔ طبعاً باغ و بہار بلکہ حالی کے الفاظ میں حیوانِ ظریف تھے۔ اُن کا غم ایک صحت مند آدمی کا غم تھا وہ میر کی طرح کبھی مراقی نہیں بنے اور نہ مومن کی طرح کم نُما رہے۔ غالب کی انانیت "خود بیں" بھی تھی اور "خود نُما" بھی۔ مومن صرف خود بیں تھے اِس لئے غالب کے مقابلے میں کم نُمار ہے۔ میر کی انانیت میں تلخی اور مایوسی اور مومن کی انانیت میں قناعت تھی لیکن جیسا کہ کہا جاچکا ہے غالب کی انانیت ابتدائی دَور سے قطع نظر بڑی معاملہ فہم تھی۔ وہ ہمیشہ کھلا ذہن رکھتے تھے۔ زمانے کو پہچاننے کی دُھن میں ہر تیز رَو کے ساتھ تھوڑی دُور چلتے تھے فارسی میں کبھی شیخ علی حزیں کو رہنما بنایا، کبھی عرفی شیرازی کی عصب آلود نگاہوں نے اُن کی آوارگی کو ٹوکا، کبھی ظہوری نے "بازو پر تعویذ" اور "کمر پر زادِ راہ باندھا" اور کبھی نظیری نے اپنی خاص رَوش پر چلنا سکھایا حتیٰ کہ آخری عمر میں قصیدہ نگاری میں قاآنی نے اُن کی رہنمائی کی اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ فطری طور پر عملی انسان تھے عملی سے یہ مُراد ہرگز نہیں کہ وہ باعمل یا فعال (ACTIVE) تھے بلکہ عملی سوجھ بوجھ PRECTICAL WISDOM کے مالک تھے۔ اُن کی زندگی میں عمل پسندی کی کئی مثالیں ملتی ہیں جو اُن کے فن کا اندر بھی نکھار اُس کا سب سے بڑا ثبوت ہے کلکتے کا واقعہ بھی اُن کی عملی سُوجھ بُوجھ پر روشنی ڈالتا ہے۔ حامیانِ قتیل سے جھگڑا مول لینے کے بعد اُنہوں نے اپنے دوست نواب اکبر علی اور مولوی محمد حسن کے مشورے سے مثنوی "بادِ مخالف" لکھی جس میں اپنی طبیعت پر جبر کرکے قتیل کی تعریف کی گئی ہے اور حامیانِ قتیل کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا گیا ہے۔ جب سہرے کے مقطع میں سخن گسترانہ بات آپڑی اور حریف نے بھی جواباً مقطع میں برابر کی چوٹ کی تو اُنہوں نے شاہ کے تیور دیکھ کر جواب الجواب لکھنے کی بجائے اعتذار پیش کر دیا۔ اور اس طرح معاملہ رفع دفع ہوگیا۔ اگرچہ غالب نے اپنے کلام میں افلاطونی محبت کا تصور بھی پیش کیا ہے لیکن اُن کے صحیح نظریۂ محبت کا اندازہ تو اُس خط سے لگایا جاسکتا ہے جس میں اُنہوں نے حاتم علی مہر کو شہد کی نہیں بلکہ مصری کی مکھی بننے کا مشورہ دیا ہے اور ایک جگہ پر ملا تو دکو لے در لیعاؤ رند شاہد باز کہہ کر یاد کیا ہے وہ زکوٰۃ کو عقائد پر بھی ترجیح دیتے تھے اس کا اندازہ عقیدۂ امتناع النظیر خاتم النبیین سے متعلق اُس واقعے سے لگایا جاسکتا ہے۔ جس کی تفصیل یادگارِ غالب میں درج ہے۔ ممکن ہے آج کے دور میں یہ بات بظاہر معمولی دکھائی دے لیکن یہ واقعہ اُس زمانے کا ہے جب مذہبی عقیدے کی بنیاد پر بھائی بھائی کا، باپ بیٹے کا اور دوست دوست کا جانی دُشمن ہوجاتا تھا۔ غدر کے بعد اپنی جان بچانے کے لئے اُنہوں نے ایک انگریز افسر کے سامنے جو خود کو "آدھا مُسلمان" ظاہر کیا تھا تو اس کی تہہ میں بھی حفظِ جان کا قوی جذبہ تھا۔ یہ اُن کی دُور رَس نگاہ اور عمل پسند طبیعت ہی کا نتیجہ تھا کہ اُنہوں نے مردہ پروری کو "نامبارک عمل" قرار دیتے ہوئے آئینِ اکبری پر صاحبانِ انگلستان کے آئین کو ترجیح دی تھی اور وہ بھی اُس شخص کے سامنے اور اُس کی ناراضگی مول لے کر جو آگے چل کر مغربی معاشرت کا سب سے بڑا مُبلغ بننے والا تھا۔

شخصیت اور فن کے باہمی تعلق کا سرسری جائزہ لیتے ہوئے یہ بتایا جاچکا ہے کہ شخصیت میں اگر کوئی توانا عنصر ہو تو وہ فن کی نقاب (MASK) اوڑھنے کے باوجود غور سے دیکھنے کے بعد صاف پہچانا جاسکتا ہے۔ غزل کے ظاہری روایتی اُسلوب میں کلامِ غالب کی جہاں اور خصوصیتیں مثلاً شوخی اور ظرافت کی چاشنی اُن کی وسیع المشربی، مابعدالطبیعاتی عناصر، نفسیاتی ژرف نگاہی، فلسفیانہ گہرائی، انسان کی عظمت کا شعور، خود اعتمادی حد نہ رشک کی کارفرمائی، دہر سے عبرت نہ حاصل کرنے کا دم خم، دونوں جہان کو ناکافی اور بزمِ امکاں کو ایک نقشِ پا کے برابر سمجھنے کا حوصلہ اور دیگر عناصر اپنا جلوہ دکھاتے ہیں، وہاں ایک جگہ پر گہرا سا

شاعر



جو اُن کے کلام کی رنگا رنگ سطح کے نیچے بہتی ہے اور دنیا سے بیگانہ ہو کر صرف اپنے وجود کو سوچتی ہے بلکہ کبھی کبھی آس پاس کی مظاہر موجوں پر بھی حاوی ہو جاتی ہے، عملی شعور جو اُن کا وہ توانا عنصر ہے جو اُن کی شخصیت کا اہم ترین پہلو بھی ہے اور جس کے واضح نشان اُن کے کلام میں دکھائی دیتے ہیں۔ اب ہم یہ دیکھیں گے کہ اُن کے آئینے میں اُن کی شخصیت کا یہ پہلو کس طرح اُجاگر ہوتا ہے۔ اس میں صرف اردو غزل سے لی گئی ہیں۔

غالب زود شناس خلق تھے، اور زود شناسی خلق ہی کو زندگی کی علامت سمجھتے تھے۔ وہ ایسی حیاتِ ابدی کے قائل نہیں تھے جو مردم گریزی پر مجبور کرے، اسی لیے حضرت فرماتے ہیں ۔

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر　　نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لیے

زندگی جو انسان کے لیے متاعِ گراں بہا ہے جس کے بیت جانے کا غم وہ شدت سے محسوس کرتے ہیں ۔

ملتا ہے وقت فرصتِ ہستی کا غم کوئی　　عمرِ عزیز صرفِ عبادت ہی کیوں نہ ہو

اگر یہ زندگی غم و آلام کا مجموعہ ہو تو کیا، اِس صورت میں بھی اِس کی قدر کرنی چاہیئے کیونکہ ایک وقت ایسا بھی آئے گا جب ہم اِس سے بھی محروم ہوں گے ۔

غم ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیئے　　بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن

اس لیے سخت سے سخت واقعہ کی تاب لانا اور زندگی سے توافق پیدا کرنا سخت ضروری ہے ۔

تاب لائے ہی بنے گی غالب　　واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

غالب کو زندگی سے بے پناہ پیار ہے اور اس پیار کو نبھانے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی میں عملی شعور کار فرما ہو۔ غالب کی عملی شعور جو جامِ جم جیسی نادرہ کے مقابلے میں جامِ سفال کو صرف اس لیے ترجیح دیتی ہے کہ اگر یہ ٹوٹ گیا تو پھر بازار سے خریدا جا سکتا ہے۔ وہ جنت کے وجود کو خیالی سمجھ رہے ہیں، کیونکہ انہوں نے اُسے اپنی آنکھوں سے دیکھا نہیں۔ اور تو اور اگر وہ قدِ یار کا عالم اپنی آنکھوں سے نہ دیکھتے تو قیامت کے وجود سے بھی انکار کر دیتے ۔

عشق کو نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالم　　میں معتقدِ فتنۂ محشر نہ ہوا تھا

اُن کا نظریۂ محبت بھی ارضی اور سراسر عملی ہے۔ کبھی کبھی بلندی پر پہنچ کر وہ برق کی عبادت تو کرتے ہیں اور سراپا رہینِ عشق ہو جاتے ہیں۔ لیکن لذتِ ہستی اُن کے لیے ناگزیر ہے، اس لیے جب یہ بجلی اُن کے خرمنِ ہستی کو جلا ڈالتی ہے تو انہیں اس کا افسوس بھی ہوتا ہے۔ اس لیے محبت کے معاملے میں اُن کے قدم اکثر لوقات زمین ہی پر پڑتے ہیں۔ اُن کا محبوب اِسی دنیا سے تعلق رکھتا ہے جس کے وصال کی تمنا ہمیشہ انہیں بے قرار رکھتی ہے اور عالمِ وصل میں بھی معشوق شوخ کے قائل ہیں۔ ایسا وصل اُن کی نظر میں ہجر سے کم نہیں جس میں ایک طرف محبوب سمٹا سمٹا بیٹھا ہو اور دوسری طرف عاشق بھی ضبط سے کام لے ۔

ہے وصل ہجر، عالمِ تمکین و ضبط میں　　معشوق شوخ و عاشقِ دیوانہ چاہیئے

معشوق اگر بے حوصلہ ہو، بیباک نہ ہو، دخول و حیا نہ کرے تو غالب جیسا عملی عاشق اُسے کیوں پسند کرے گا ۔

خوئے تری افسردہ کیا وحشتِ دل کو　　معشوقی و بے حوصلگی طرفہ بلا ہے

اس لیے وہ کبھی کبھی خود ہی ہنسی دستی کر بیٹھتے تھے اور کبھی عدم دستی رکھ کر اُسے چھیڑ بھی دیتے تھے۔ اُن کی عمل پسندی کا یہ عالم تھا کہ ... معشوق کی ... اجازت پر رکھی تھی۔ نزاکت بڑی اچھی ہے سہی لیکن حد سے زیادہ نازک محبوب بھی کس کام کا ... ہاتھ آئیں تو انہیں ہاتھ لگائے نہ بنے ... تو ایسے وصل کا قائل ہے جس میں محبوب کی زلفیں عاشق کے بازو پر بکھر جاتی ہیں۔ اسی لیے تو وہ حدِ شوق کو پرستش قرار دینے والوں کو ... قرار دیتے ہیں ۔

خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار　　کیا پوجتا ہوں اُس بتِ بیداد گر کو میں



اور یہ جذبۂ شوق کا پرستار اور خواہش پرست عاشق بے قرار ہو کر کہہ اٹھتا ہے ؎

مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس   زلفِ سیاہ رُخ پہ پریشاں کئے ہوئے
چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو   سُرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کئے ہوئے
اک نوبہارِ ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ   چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کئے ہوئے

یہی وجہ ہے کہ وہ "شوقِ فضول" اور "جرأتِ رندانہ" کے قائل ہیں۔
زندگی فانی سہی لیکن اگر معشوقوں کی صحبت میسّر آجائے تو اسے غنیمت سمجھنا چاہیئے ؎

عشرتِ صحبتِ خوباں ہی غنیمت سمجھو   نہ ہوئی غالبؔ اگر عمرِ طبیعی نہ سہی

وہ زلیخا کی طرح خواب میں وصالِ محبوب کے قائل نہیں ؎

ابھی آتی ہے بُو بالش سے اُسکے زلفِ مشکیں کی   ہماری دید کو خوابِ زلیخا عارِ بستر ہے

اس لئے جب کلکتے کے "نازنینِ بتانِ خود آرا" کی یاد آتی ہے تو ہائے ہائے پکار اُٹھتے ہیں۔ وہ کبھی کبھی تو اپنے محبوب کا وصل ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ حتیٰ کہ اُن کا جذبۂ رشک بھی مدھم پڑ جاتا ہے۔ دیکھئے کس قدر عملی نقطۂ نظر ہے ؎

تم جاؤ تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو   مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

کبھی کہتے ہیں ؎

مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس وقت   میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے ؎

گئے وہ دن کہ نادانستہ غیروں کی وفاداری   کیا کرتے تھے تم تقریر ہم خاموش رہتے تھے
بس اب بگڑے پہ کیا شرمندگی جانے دو مل جاؤ   قسم لو ہم سے گر یہ بھی کہیں کیوں ہم نہ کہتے تھے
ہم بھی تسلیم کی خُو ڈالیں گے   بے نیازی تری عادت ہی سہی

وہ اپنے محبوب کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے خواہشمند ہیں۔ خط جو نصف مُلاقات کا درجہ رکھتا ہے محبوب کے حجاب کی تلافی نہیں کر سکتا ؎

غلط نہ تھا ہمیں خط پر گماں تسلّی کا   نہ مانے دیدۂ دیدار جو تو کیونکر ہو

وہ صرف دیدار سے بھی مطمئن نہیں ہوتے، بلکہ مُلاقات کے لئے بات چیت کو بھی انتہائی ضروری سمجھتے ہیں ؎

کھلی اک کو نہ گئی آنکھوں کے آگے تو کیا   بات کرتے کہ میں لبِ تشنۂ تقریر بھی تھا

جب دوست احباب اُن کے محبوب کا ذکر چھیڑ دیتے ہیں تو وہ اس خالی خُولی تذکرے سے مُطمئن نہیں ہوتے۔ یہ تذکرہ تو اُس وقت اُن کے نزدیک پُر لطف بن سکتا ہے جب غالبؔ کے احباب اُن کے محبوب کو آتے ہوئے دیکھ کر گھبرا جائیں اور گھبرا کر کہہ اُٹھیں "وہ آئے!"

کہتے تو ہو تم سب کہ بتِ غالیہ مو آئے   اک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ وہ آئے

عاشق ہوتے ہوئے بھی معشوق فریبی اُن کا کام ہے۔ یہاں تک کہ خود لیلیٰ اُن کے آگے مجنوں کو بُرا کہتی ہے۔ وہ معشوق ہی کو فریب نہیں دیتے، بلکہ رقیب کو بھی دامِ تزویر میں گرفتار کر لیتے ہیں ؎

تا کرے نہ غمّازی، کر لیا ہے دشمن کو   دوست کی شکایت میں ہم نے ہمزباں اپنا

محبوب کی نگاہِ غلط انداز تو اُنہیں زہر لگتی ہے اس لئے کہتے ہیں کہ جان کر کیجے تغافل کہ کچھ اُمید بھی ہو
ناامیدی کی صورت ہی میں وہ محبوب سے شکایت کرنا پسند کرتے ہیں، ورنہ

جب توقع ہی اُٹھ گئی غالبؔ   کیا کسی سے گلہ کرے کوئی

رہی نہ طاقتِ گفتار اور اگر ہو بھی   تو کس امید پہ کہیے کہ آرزو کیا ہے

غالب کا جذبۂ رشک اپنی جگہ مسلّم۔ جب یہ جذبہ اُن پر طاری ہوتا ہے تو اپنے محبوب کو خدا تک کو سونپنے سے ہچکچاتے ہیں لیکن جب اُن میں عمل پسند غالب جاگ اُٹھتا ہے جو ہر عمل کا تجربہ کرنا چاہتا ہے تو وہ کہہ اُٹھتے ہیں کہ عشق کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا۔ اُن کی عمل پسندی ملند سطح پر پہنچ کر اُن سے کہلواتی ہے ؎

جان تم پر نثار کرتا ہوں   میں نہیں جانتا دُعا کیا ہے

رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل   جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

عمل پسند آدمی دید کو شنید پر ترجیح دیتا ہے۔ اسی لئے وہ اپنے محبوب کو اپنا حالِ دل لکھ کر سنانے کی بجائے اپنے دردِ دل کا ٹھوس ثبوت پیش کرنا چاہتے ہیں ؎

دردِ دل لکھوں کب تک جاؤں اُن کو دکھلاؤں   اُنگلیاں فگار اپنی خامہ خونچکاں اپنا

کوہکن اُن کے نزدیک عمل عاشق نہ تھا اسی لئے ناکام رہا کیونکہ تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسد۔ سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

اُن کی نامیت بڑی سے بڑی شخصیت کو خاطر میں نہیں لاتی کیونکہ اُن کی عمل پسندی کا یہ تقاضا ہے کہ اس عظمت کا کوئی ٹھوس ثبوت بھی ہو۔ وہ خضر کو رہبری میں جس کی کافی دھوم ہے تسلیم نہیں کرتے۔ کیونکہ سکندر کے ساتھ انہوں نے جو کچھ کیا ظاہر ہے۔ وہ تو اپنے محبوب کی مسیحا النفسی کو بھی اسی وقت ماننے کے لئے تیار ہیں جب اُن کے دُکھ کا علاج کیا جائے عملی ثبوت پیش کیا جائے ؎

ابنِ مریم ہُوا کرے کوئی   میرے دُکھ کی دوا کرے کوئی

ایک وجہیت پسند انسان کو اپنے گھر اور وطن سے گہری محبت ہوتی ہے۔ یہاں وطن سے مُراد مقامِ پیدائش ہے۔ غالب کے زمانے میں وطن کا یہی محدود تصور تھا۔ لیکن چونکہ غالب عمل پسند تھے اس لئے سعدی کی طرح انہیں اپنے وطن سے ایسی گہری محبت نہ تھی کہ وہ کسی حال میں اُسے ترک کرنے پر آمادہ ہی نہ ہوتے سعدی نے کہا تھا ؎

سعدیا حُبِّ وطن گرچہ حدیثِ ست صحیح   نتواں مرد بہ سختی کہ من اینجا زادم

ذوق کو باہر سے بلاوا آیا تو وہ یہ کہہ کر کہ "کون جائے ذوق اب دلی کی گلیاں چھوڑ کر" ترکِ وطن کا ارادہ نہ کر سکے۔ لیکن غالب تو دلی ہی کو اپنا وطنِ ثانی تھا، چھوڑنے پر مائل تھے "ہم نے یہ مانا کہ دلّی میں رہیں کھائیں گے کیا"۔ اثنائے سفر میں جب انہیں "ٹھہری یارانِ وطن" یاد آئی تو وہ عزت کی صورتوں کو ہنس ہنس کر جھیل گئے۔

اسی عمل پسندی نے اُن میں فلسفیانہ بصیرت پیدا کی اور اُن کی ژرف نگاہی نے کثافت کی بنیادی اہمیت کو بھی دیکھ لیا ؎

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی   چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا

غالب نے شراب پر جتنے اچھے اشعار کہے ہیں اُس کی مثال اُردو میں مشکل ہی سے ملے گی۔ ریاض کے یہاں صرف ڈھول دھمکا ہے۔ غالب کے یہاں شراب سے والہانہ شیفتگی کا جو اظہار ملتا ہے وہ ریاض کے یہاں کہاں، خیام و حافظ کے علاوہ اور کہیں نہیں ملے گا۔ یہاں صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ اُن کی عمل پسند شخصیت شراب کے مضمون میں کیا کیا گُل کھلاتی ہے۔ جامِ سفال کی افادیت کا تو ذکر ہو ہی چکا ہے یہ تو بہر حال طرب ہے لیکن وقت پڑنے پر ایک عمل پسند آدمی ظروف کو طرف پر بھی ترجیح دیتا ہے ؎

پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے   پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

اُن کی نظر میں ساقی کی حیثیت بھی ثانوی ہے۔ اگر کسی دن بزم میں ساقی نہ ہوا تو اُس سے کیا ہوتا ہے ؎

ایک دن گر نہ ہوا بزم میں ساقی نہ سہی   مے پرستاں خُمِ مے مُنہ سے لگائے ہی بنے

ظاہر ہے کہ ایسا عمل پسند آدمی شرابِ طہور کو کیا خاطر میں لائے گا جس کا نام ہی نام ہے ؎



واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمہاری شرابِ طہور کی

کبھی کبھی اُن کی عمل پسندی پر اُن کی معاشرتی حیثیت SOCIAL STATUS غالب آجاتی ہے، اِس لیے وہ اُن کے اکثر گناہ ناکردہ رہ جاتے ہیں۔ اُن کے ذوقِ مے خواری کا تقاضا تو یہ ہے کہ وہ ساقی سے دُردِ تہِ جام بھی طلب کریں۔ لیکن انہیں ساقی سے یہ کہتے ہوئے حیا آتی ہے۔ لیکن وہی ساقی جس نے انہیں کبھی شراب نہیں دی تھی جب ایک جام پیش کرتا ہے تو وہ چونک اُٹھتے ہیں ؎
"ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں"

مذہبی معاملات میں بھی اُن کی عمل پسند طبیعت اوامر و نواہی سے ابا کرتی ہے، اِس لیے ثوابِ طاعت و زہد جاننے کے باوجود اُن کی طبیعت ادھر نہیں آتی، کیونکہ ؎ "رہرو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر"۔ روزہ رکھنا اور کھولنا بھی غالب کو اُسی وقت لطف دیتا ہے جب خس خانہ بھی ہو اور برفاب بھی۔ چونکہ وہ عمل پسند تھے، اِس لیے دوسروں پر خصوصاً فرشتوں پر بھی بھروسہ نہیں کر سکتے تھے۔ وہ یک طرفہ کارروائی کے قائل نہیں تھے، اِس لیے نامۂ اعمال کی نگرانی کے لیے دمِ تحریر اپنا آدمی چاہتے تھے۔

مختصر یہ کہ غالب سائنٹفک فطرت بھی تھے، واقعیت پرست اور عمل پسند بھی۔ ؎ "مفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے" کے وہ قائل تھے۔ ؎ "کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مآل اچھا ہے"۔ اُن کی زندگی کا شعار (MOTTO) تھا۔ اُن کا عمل پسند احساس یہ بھی جانتا تھا کہ بڑے سے بڑے آدمی کے مرنے سے دنیا کا کاروبار نہیں رُکتا۔ ؎ "غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں"۔ آج غالب کو مرے ہوئے سو سال ہو رہے ہیں۔ دنیا کا کاروبار بند تو نہیں ہوا۔ یہ وہ عروس ہے جو کبھی آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہوتی، لیکن غالب نے جدید نسل کو بہت کچھ دیا ہے۔ اس کی یاد تازہ نہ کرنا بہت بڑا ظلم ہوگا۔ غالب نے اُردو شاعری کو فلسفیانہ ذہن دیا۔ ارضیت کا تصور دیا۔ زندگی سے پیار کرنا سکھایا۔ اگرچہ وہ فلسفۂ وحدت الوجود کے چکر سے باہر نہیں نکلے۔ عالم کو حلقۂ دامِ خیال سمجھتے رہے۔ اس تصور نے صدیوں تک ہمارے اسلاف کے ذہنوں کو متاثر کیا ہے، کیونکہ اسے مخصوص سماجی حالات اور سائنسی معلومات کی کمی سے غذا ملتی رہی ہے۔ غالب بھی اس کے سحر سے نہ بچے، اور کبھی کبھی انہوں نے قناعت پسندی اور بے عملی کا درس بھی دیا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ چونکہ عمل پسندی اُن کے خمیر میں تھی، اِس لیے ارضیت کا قوی رجحان بھی اُن کے یہاں ملتا ہے اور ہمیں اسی سے غرض ہے۔

ممکن ہے یہاں یہ اعتراض ہو کہ ہم نے غالب کے احساسِ عمل پسندی کو غزل میں تلاش کرنے کے سلسلے میں اُن کے اشعار جس ترتیب سے پیش کیے ہیں اُس ترتیب سے وہ لکھے نہیں گئے تھے۔ پھر انہیں ایک خاص من مانی ترتیب میں پیش کرنا کہاں تک مناسب ہے۔ تو عرض یہ ہے کہ یوں بھی غزل کے اشعار میں ترتیب تلاش کرنا فعلِ عبث ہے۔ ہر شعر اپنی جگہ مکمل جذبے کا اظہار ہوتا ہے۔ اِس خاص ترتیب سے، جسے بغیر نقصان پہنچائے بدلا بھی جاسکتا ہے، خاص مقصد یہ ہے کہ غالب کا یہ مخصوص رجحان اُبھر آئے۔ دوسرا اعتراض یہ بھی ہو سکتا ہے کہ غالب کا کلام بڑا تہ دار اور اُن کا ہر لفظ گنجینۂ معنی کا طلسم ہے۔ اُن کی ایک بظاہر سادہ بات میں نہ جانے کتنی تہیں پوشیدہ ہوتی ہیں۔ مثلاً اُن کے اسی شعر کو لیجیے ؎ "پکڑے جاتے ہیں .. الخ" اس شعر میں غالب کی عمل پسندی ہی کا اظہار نہیں، بلکہ ملکوتی اور انسانی فطرت کے فرق کی طرف بھی لطیف اشارہ ہے۔ گناہ سرشتِ آدم ہے۔ انسان کن حالات میں گناہ کرتا ہے، فرشتے اس کی تہہ تک نہیں پہنچ سکتے۔ لطیف اور مجبور گناہوں کا فرق وہ نہیں جانتے اور نہ انہیں یہ معلوم ہے کہ گناہ کا تصور بھی مدارِ عمل رہتا ہے۔ اِس شعر سے یہ پہلو بھی نکلتا ہے کہ فرشتے احساسِ کمتری کا شکار ہیں اور شاید یہ پہلو بھی نکلتا ہو کہ غالب اس شعر میں کراماً کاتبین کے تصور ہی کو غلط قرار دے رہے ہوں وغیرہ وغیرہ۔ جواب یہ ہے کہ غالب کا کلام یقیناً پہلو دار ہے۔ لیکن اول تو ہر شعر میں یہ خصوصیت نہیں ہوتی۔ اور پھر اگر موضوع کے پیشِ نظر صرف ایک ہی پہلو کو سامنے رکھا جائے تو اِس میں کیا قباحت ہے۔ اِس سے دوسرے پہلوؤں کی تکذیب تو نہیں ہوتی۔ اور نہ اِس دعوے کی کہ غالب کے احساسِ عمل پسندی کے نقوش اُن کی غزلوں میں بھی ملتے ہیں اور تواتر سے سامنے آتے ہیں۔ ▲

ڈاکٹر مغنی تبسم

غالب کا آہنگِ شعر
اور بحروں کا استعمال

"آہنگ سے مراد صوتی گروہوں کا تسلسل ہے جو انہیں باہم مربوط کرنے والے کسی لسانیاتی اصول کے مطابق تخلیق کیا گیا ہو۔" آہنگ نثر میں بھی ہوتا ہے اور شعر میں بھی۔ نثری آہنگ مندرجۂ ذیل عناصر سے ترتیب پاتا ہے:۔

(۱) لفظوں کا صوتی ڈھانچہ اور اُن کا معیاری تلفظ۔
(۲) جملوں میں لفظوں کی صرفی ترتیب اور زور اوقاف۔
(۳) لفظوں اور فقروں کا نحوی دروبست۔

گفتگو میں لہجہ اور آہنگ سلسلہ وار ادا کی جانے والی آوازوں کے چار امتیازات سے پیدا ہوتا ہے

(۱) دَوران
(۲) زور
(۳) زیر و بم
(۴) لحن کی وہ کیفیت (QUALITY) جو گفتگو کرنے والے کی آواز اور اس مخصوص احساس یا حالت سے پیدا ہوتی ہے جس کا وہ اظہار کرتا ہے[۲]۔ جہاں تک ادب اور شاعری کا تعلق ہے (۱) اور (۲) کی بنیاد پر آہنگ کا تجزیہ کیا جا سکتا ہے۔ (۳) اور (۴) دراصل (۲) کے متبادل رُوپ ہیں۔

(۱) جملوں کی ادائیگی کا دَوران اُمور پر منحصر ہوتا ہے۔[۳]
أ۔ انفرادی طور پر لفظ میں چھوٹے اور لانبے مصوتوں کا باہمی تناسب کی ...
أأ۔ مصوتوں کی ادائیگی کے انفرادی طریقے۔
أأأ۔ جملوں کی ادائیگی میں مختلف لفظوں اور فقروں کے درمیان دیئے جانے والے وقفے۔

---

[۱] RICKERT, EDITH, RYTHM, New Methods for study of Literature P 146

[۲] Ibid. P 149

[۳] اردو زبان کے مصوتے VOWELS دس ہیں ان میں تین چھوٹے اور سات لانبے مصوتے ہیں۔
چھوٹے مصوتے۔ (۱) ـَ (کَب۔ دَم) (۲) ـِ (دِل۔ جِن) (۳) ـُ (تُم۔ دُر)۔
لانبے مصوتے۔ (۱) ـی (تیر۔ بیس) (۲) ـے (کھیل۔ جیل) (۳) ـَے (خیر۔ فیض) (۴) ـَو (لَور۔ طَور)
(۵) ـو (گول۔ نوک) (۶) ا۔ آ (پاس۔ آج) (۷) ـُو (عُود۔ دُوج)



رسو اور قافیہ سے قائم کیے جانے والے وقفوں کے علاوہ بھی کلام میں چھوٹے چھوٹے وقفے بھی آتے ہیں جو کبھی معنوی تلازمے کو، سدس اور کبھی اصوات کے مخارج اور اُن کی ادائیگی کے طریقوں کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔

(۱) کلام میں انفرادی طور پر بعض لفظ یا لفظوں کے بعض گروہ زیادہ زور یا جھٹکے کے ساتھ ادا ہوتے ہیں اور بعض نرمی اور آہستگی سے۔ یہ فرق بالعموم لفظوں میں مُصوتوں کی نوعیت اور اُن کے اندراج کی حالت کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اِس سلسلے میں مُندرجۂ ذیل مشاہدات قابلِ توجہ ہیں:۔

i۔ چھوٹے مصوتے کے بعد اور اُس سے مُتصل لانبا مُصوتہ آئے تو چھوٹا مصوتہ کسی جھٹکے اور زور کے بغیر ادا ہوگا جیسے چُنا۔ سُنو۔ گُمی۔

ii۔ چھوٹے مصوتے کے بعد ساکن مصوتہ (CONSONANT) آئے تو اُس کی ادائیگی میں زور پیدا ہوگا۔ اگر مصمتہ بندشی (PLOSIVE) ہو تو زور زیادہ ہوگا۔ جیسے: رَتْ۔ رُکْ۔ جَگْ۔ غیر بندشی یا نیم بندشی مصمتہ آنے پر زور کم ہوجائے گا، جیسے: دَسْ۔ کَشْ۔ غمْ۔

iii۔ ساکن مصمتہ کے بعد آنے والا لانبا مصوتہ زور کے ساتھ ادا ہوگا جیسے۔ جھٹکا۔ اکلا۔ لیکن ساکن مصمتہ غیر بندشی ہو تو اتنا زور نہیں رہے گا جیسے: رستہ۔ اصلی۔

iv۔ دو لانبے مصوتے مُسلسل آئیں تو اُن میں سے ایک مصوتہ زیادہ زور سے ادا ہوگا۔ بشرطیکہ دونوں کی ادائیگی کے درمیاں وقفہ نہ دیا جائے۔

v۔ لانبے مُصوتے کے بعد ساکن مُصوتہ آئے تو مصوتہ زیادہ کھینچ کر بڑھا جائے گا جیسے: کول۔ میر۔ کول۔

کلام موزوں اور نثر کے آہنگ میں فرق یہ ہوتا ہے کہ کلام موزوں میں اصوات کی ترتیب اور تعداد ایک مقررہ اور مخصوص نظام کے مطابق ہوتی ہے جسے ہم وزن کہتے ہیں۔ گویا وزن نثر کے آہنگ کے لئے ایک ڈھانچہ فراہم کرتا ہے۔ بحر کے اجزائے ترکیبی دو ہیں (۱) مُصوتوں کا انتخاب (۲) مُصوتوں کی ترتیب۔

اِس انتخاب اور ترتیب میں جو بنیادی اُصول کام کرتا ہے وہ دَوراں اور تناسب ہے۔ ہر بحر اور اُس کے ہر وزن کا ایک مخصوص آہنگ ہوتا ہے جو چھوٹے اور لانبے مصوتوں کے باہمی تناسب، اُن کی تنظیم اور درمیانی وقفوں سے ترکیب پاتا ہے۔ ہر وزن کی ایک صَوتی مقدار ہوتی ہے جس میں کمی بیشی صرف زحاف کی تبدیلی کی صُورت میں ممکن ہے۔ کسی وزن کی صَوتی مقدار کو ناپنے کی اکائی اگر چھوٹا مصوتہ قرار دی جائے اور اس کی مقدار = ۱ فرض کی جائے تو لانبے مُصوتے کی مقدار = ۲ ہوگی۔ کسی ساکن مصمتے سے قبل چھوٹا مصوتہ آئے تو اِس مصوتے اور مصمتے کی مجموعی مقدار ایک لانبے مصوتے کے برابر ہوگی۔ (لا اور لَن ہم وزن آوازیں ہیں۔) اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ساکن مصمتے کی اپنی کوئی صَوتی مقدار ہوتی ہے۔ ایسی صُورت میں ہوتا صرف یہ ہے کہ ایک مخرج سے دُوسرے مخرج تک پہنچنے میں چھوٹے مصوتے کا دَوراں کسی قدر بڑھ جاتا ہے اور اُس کی مقدار قریب قریب ۲ ہوجاتی ہے۔ ساکن مصمتے کی ادائیگی میں خفیف سی حرکت پیدا ہوتی ہے جس کی صَوتی مقدار اُردو کے معیاری لہجے میں مختلف مصمتوں کے مخارج اور طرزِ ادائیگی کے فرق کے ساتھ ½ تا ¾ ہوتی ہے۔ بہر حال چھوٹے مصوتے اور ساکن مصمتے کی مجموعی ادائیگی کا دَوراں ایک لانبے مصوتے کے دَوراں کے مساوی ہوتا ہے۔ اِسی طرح لانبے مصوتے کے بعد اگر ساکن مُصمتہ آئے تو وہ زیادہ لانبا ہوجائے گا اور اُس کے دَوراں میں ایک چھوٹے مصوتے کے ہم مقدار اضافہ ہوجائے گا۔ اِس لمبائے ہوئے مصوتے کی مقدار = ۳ ہوگی۔ اِسی اُصول کے تحت چھوٹے مصوتے کے بعد مسلسل دو ساکن مصمتے آئیں جیسے دَشت تو اِن اصوات کی مجموعی مقدار بھی = ۳ ہوگی اور لانبے مصوتے کے بعد مسلسل دو ساکن مصمتے آئیں جیسے کاشت تو اِن کی مجموعی صَوتی مقدار = ۴ ہوگی۔



اس پیمانے کو کام میں لاتے ہوئے کسی وزن کے توازن اور اُس کی صوتی مقدار کو معلوم کیا جا سکتا ہے مثال کے طور پر بحر ہزج کے سالم وزن کو لیجئے۔ اس کے ایک مصرع میں رکن مفاعیلن کی چار بار تکرار ہوتی ہے اور درمیان میں تین ادی وقفے آتے ہیں۔ وقفوں کی کوئی صوتی مقدار مقرر نہیں کی جا سکتی۔ قرأت میں ان کا دورانیہ کم یا زیادہ ہو سکتا ہے۔ لیکن تمام وقفوں کا دورانیہ مساوی ہونا ضروری ہے۔ رکن مفاعیلن ایک چھوٹے مصوتے اور تین لانبے مصوتوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس رکن کی آخری صوت "لُن" اگرچہ ایک چھوٹے مصوتے اور ایک ساکن مصمتے پر مشتمل ہے لیکن دراصل یہ ایک لانبے مصوتے کی نمائندگی کرتی ہے۔ اسے "لا" بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ ذیل کے چارٹ میں اس وزن کی صوتی تنظیم اور اس کے وقفوں کو ظاہر کیا گیا ہے۔



اس چارٹ میں ریشی خطوط (ـ) چھوٹے مصوتوں کو اور اُفقی خطوط (—) لانبے مصوتوں کو ظاہر کر رہے ہیں۔ عمودی خطوط [ا] چھوٹے اور لانبے مصوتوں کو ملانے کے لئے کھینچے گئے ہیں تاکہ اُن کا تسلسل ظاہر ہو۔ اس وزن میں ایک چھوٹے مصوتے کے بعد مسلسل تین لانبے مصوتے لائے گئے ہیں، اس کے بعد وقفہ دے کر اسی تنظیم کو دوہرایا گیا ہے۔ اس چارٹ میں وزن کی صوتی مقدار بیک نظر معلوم کی جا سکتی ہے۔ اس میں ۱۲ لانبے مصوتے ہیں جن کی مقدار = ۲۴ ہے اور ۴ چھوٹے مصوتے ہیں جن کی مقدار = ۴ ہے۔ گویا اس مصرع کی صوتی مقدار ۲۴+۴ = ۲۸ ہے۔ اس طرح بحر ہزج کے سالم وزن کی مقدار ۲۸ × ۲ = ۵۶ ہوگی۔ اس وزن میں جو بھی شعر کہا جائے ضروری ہے کہ اس کی صوتی مقدار ۵۶ ہو اور وہ ۸ وقفوں کے ساتھ ۸ ہم مقدار صوتی گروہوں میں تقسیم ہو سکے۔ اسی تقسیم کو عروض کی اصطلاح میں "تقطیع" کہا جاتا ہے۔ دو بحروں یا دو مختلف اوزان کی صوتی مقدار مساوی ہو سکتی ہے لیکن اُن کی صوتی تنظیم میں فرق ہوگا۔ بحر رمل کے سالم وزن کی صوتی مقدار ہزج سالم کی صوتی مقدار کے مساوی یعنی ۵۶ ہے لیکن اس کی صوتی تنظیم جدا گانہ ہے۔



صوتی تنظیم اور صوتی مقدار کے اعتبار سے ہر وزن ایک مخصوص آہنگ رکھتا ہے۔ اس آہنگ سے خاص سماعی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور وہ خاص جذبات کے ابھار میں معاون ہو سکتا ہے۔ بعض اوزان اپنی صوتی تنظیم میں ایک دوسرے سے مشابہ ہوتے ہیں۔ ایک دائرے سے تعلق رکھنے والی بحروں کے آہنگ میں خاص رشتہ ہوتا ہے۔ اُن کے آہنگ ایک دوسرے میں مدغم ہو سکتے ہیں مثلاً بحر رمل سالم کے ارکان فاعلاتن فاعلاتن فا کو ابتدائی رکن "فا" کے حذف کے ساتھ پڑھا جائے اور آخری رکن کے بعد "فا" کا اضافہ کر دیا جائے اور قرأت میں وقفہ "تن" کے بجائے "فا" کے بعد دیا جائے تو علاتن فا علاتن فا .. یہ وزن مفاعیلن مفاعیلن پڑھا جائے گا اور ہزج سالم کا وزن نکل آئے گا۔ ان بحروں کے آہنگ میں فرق دراصل ابتدائی صوت کے اختلاف کے سبب پیدا ہو گیا ہے جس کی وجہ سے وقفوں کے درمیان مصوتوں کی ترتیب بدل گئی ہے۔ اس سے بحر کے آہنگ میں وقفوں کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے یعنی وقفے کی تبدیلی بحر کے آہنگ کو بدل دیتی ہے۔ اس کے علاوہ بحر یا وزن کے پہلے رکن کی صوتِ اول اس کے مجموعی آہنگ پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اس نقطۂ نظر سے تمام سالم اوزان کو دو گروہوں میں بانٹا جا سکتا ہے۔

۱۔ لانبے مصوتے یا سبب سے شروع ہونے والے اوزان جیسے :

فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن

ایسے اوزان کا آہنگ زیادہ بلند اور پُر زور ہوتا ہے۔

۲۔ چھوٹے مصوتے (وتد یا فاصلہ) سے شروع ہونے والے اوزان جیسے :

مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن

متفاعلن متفاعلن متفاعلن متفاعلن



اِن اوزان کا آہنگ نرم اور دھیما ہوگا۔

مرکب بحروں اور اوزان میں وتد (چھوٹا مصوتہ + لمبا مصوتہ) یا فاصلہ (چھوٹا مصوتہ + چھوٹا مصوتہ + لمبا مصوتہ) رکھنے والے ارکان جتنے زیادہ ہوں گے اور مسلسل آئیں گے، اُن کا آہنگ اُسی قدر ڈھلا ہوا اور سبک رَو ہوگا۔ ارکان کا چھوٹا اور بڑا ہونا اور وقفوں کی کمی بیشی بھی وزن کے آہنگ کو تیز یا سُست بناتی ہے۔ چھوٹے ارکان کے اوزان میں وقفے جلد جلد آتے ہیں جس کی وجہ سے آہنگ تیز اور آصوات مُرتعش ہو جاتی ہیں۔

اب تک ہم نے جو گفتگو کی وہ بحور اور اوزان کے آہنگ سے متعلق تھی۔ ہم یہ بھی دیکھ آئے ہیں کہ مختلف اوزان اپنے آہنگ کے اعتبار سے مختلف کیفیات کے حامل ہوتے ہیں۔ شاعر (اگر کوئی مجبوری یا التزام نہ ہو تو) شعوری یا غیر شعوری طور پر ایسی بحر اور وزن کا انتخاب کرے گا (۱) جس کا آہنگ اُسے پسند ہو (۲) جو تخلیقِ شعر کے وقت اُس کے مزاج کی خاص کیفیت اُس کے احساس یا موڈ سے مناسبت رکھتا ہو۔ وزن کا انتخاب شاعر کے انتخابِ الفاظ، شعر میں الفاظ کی ترتیب اور اس واسطے سے شاعر کے لہجے اور اسلوب کی تعمیر میں اپنا حصّہ ادا کرتا ہے لیکن یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ شاعر کا اسلوب اور اُس کا آہنگِ شعر بالکل ہی بحروں اور اوزان کے تابع ہوتا ہے۔ اچھا شاعر بحر کی رَو میں بہہ نہیں جاتا، بلکہ اُس کو اپنی گرفت میں لے کر اُس کے آہنگ سے استفادہ کرتا ہے۔ وہ جب اپنا نغمہ گاتا ہے تو ساز کی دُھن اور تال کی آواز پس منظر میں چلی جاتی ہے۔ وہ تال سے بظاہر بے نیاز رہ کر تال پر قائم رہتا ہے۔ وزن کے دیئے ہوئے صوتی ڈرائنگ میں شاعر جب اپنے لہجے اور آہنگ کو سمونے کی کوشش کرتا ہے تو اُس کو اپنے انتخابِ الفاظ اور لفظوں اور فقروں کی ترتیب میں ردّ و بدل بھی کرنا پڑتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اُس کی یہ بھی کوشش ہوتی ہے کہ وہ بحر کو اپنے لہجے اور انتخابِ الفاظ اور ترتیبِ کلام کے تابع رکھے، اس کے لئے وہ:

ا۔ مصوتوں کے انتخاب اور اُن کی ترتیب میں ردّ و بدل کی گنجائش سے استفادہ کرتا ہے۔ ہر وزن میں لانبے مصوتوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد معیّن ہوتی ہے، بحر ہزج سالم یا بحر رمل سالم کے ایک مصرع میں زیادہ سے زیادہ ۱۲ لانبے مصوتے لائے جا سکتے ہیں لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر مصرع میں لازماً ۱۲ لانبے مصوتے ہوں۔ لانبے مصوتے کی بجائے ایک چھوٹا مصوتہ اور ایک ساکن مصمتہ لایا جا سکتا ہے، ایسی صورت میں صوتی مقدار برقرار رہے گی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی شعر میں ایک بھی لانبا مصوتہ نہ آئے۔ اِس طرح شعر میں جتنے لانبے مصوتے کم کیے جائیں گے، اُتنے ہی چھوٹے مصوتوں اور ساکن مصمتوں کا اضافہ کرنا ہوگا۔

اا۔ وزن کے صوتی نظام میں چھوٹے مصوتے کے مقام اندراج پر ساکن مصمتہ آئے تو وہ عروض کے قاعدے کی رُو سے متحرک ہو جائیگا لیکن یہ عمل اُردو زبان کے مزاج کے خلاف ہے۔ یہ ضرور ہے کہ کبھی ساکن مصمتہ کی ادائگی میں ہلکی سی حرکت ظاہر ہوتی ہے لیکن یہ حرکت اتنی خفیف ہوگی کہ اسے چھوٹے مصوتے کا ہم وزن نہیں سمجھا جا سکے گا، اِس لئے شاعر جب چھوٹے مصوتے کے مقام پر ساکن مصمتہ لے آتا ہے تو اس کے نتیجے میں دَوران کو قائم رکھنے کے لئے ساکن مصمتے سے قبل کا مصوتہ قرأت میں زیادہ لمبا کر دیا جاتا ہے۔ اِس عمل سے صوتی مقدار بھی قائم رہتی ہے اور تلفظ بھی نہیں بگڑنے پاتا۔

ااا۔ شعر کے رموزِ اوقاف بالعموم اس مقام پر نہیں آتے، جہاں وزن میں وقفہ آتا ہے۔ شعر میں ایسے فقرے اور الفاظ کے ایسے مجموعے آتے ہیں جو باہم کسی معنوی تلازمے سے مربوط ہوتے ہیں۔ اِن فقروں یا الفاظ کے مجموعوں کو وقفے کے بغیر مسلسل ادا کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اگر اِن کے درمیان وزن کا وقفہ آجائے تو شعر کی معیاری قرأت کا تقاضہ یہ ہوگا کہ اس وقفہ کو نظر انداز کرتے ہوئے شعر اِس طرح پڑھا جائے کہ شاعر کا لہجہ ٹوٹنے نہ پائے۔ شعر کی معنویت مجروح نہ ہو اور تال اور دَوران کا احساس بھی قائم رہے۔

مندرجہ بالا اُمور کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ہم غالب کے آہنگِ شعر میں بحروں کے انتخاب اور استعمال کا جائزہ لیں گے۔ غالب نے اپنی اُردو شاعری میں جو بحریں اور جو اوزان استعمال کئے ہیں، اُن کی تفصیل یہ ہے۔



بحر	اوزان	تعداد اشعار
منکسر		
	مثمن سالم [مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن]	۵۱۶
ہزج	مثمن اخرب سالم [مفعول مفاعیلن مفعول مفاعیلن]	۲۵
[illegible]	مثمن اخرب مکفوف محذوف الآخر [مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن]	۲۰۱
	مثمن اشتر سالم [فاعلن مفاعیلن فاعلن مفاعیلن]	۳۱
	مثمن اخرب مقبوض محذوف الآخر [مفعول مفاعلن فعولن]	۴
	مسدس محذوف الآخر [مفاعیلن مفاعیلن فعولن]	
	اوزان رُباعی (رُباعیات)	
رَجز	مثمن مطوی مخبون [مفتعلن مفاعلن مفتعلن مفاعلن]	
رمل	مثمن محذوف [فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن]	
	مثمن مخبون (محذوف / محذوف مسکن / مسکن مقصور) [فاعلاتن فعلاتن فعلاتن] فعلن / فعلن / فعلن / [illegible]	
	مسدس محذوف فاعلاتن فاعلاتن فاعلن	
	مسدس مخبون (محذوف مسکن / مسکن مقصور) [فاعلاتن فعلاتن] فعلن / فعلان)	
	مربع مشکول (دو چند) [فعلات فاعلاتن فعلات فاعلاتن]	
متقفر		
متقارب	مثمن سالم الآخر [فعولن فعولن فعولن فعولن]	
	مثمن (محذوف الآخر و مقصور الآخر) [فعولن فعولن فعولن] (فعل / فعول)	
	مثمن اثرم (دو چند) [فعل فعولن فعل فعولن فعل فعولن فعل فعولن]	
مستقیم و متواطقہ		
مضارع	مثمن اخرب [مفعول فاع لاتن مفعول فاع لاتن]	۳۶
	مثمن اخرب مکفوف (محذوف و مقصور) [مفعول فاع لات مفاعیل] (فاعلن / فاعلان)	۶۲۸
منسرح	مثمن مطوی مکفوف [مفتعلن فاعلن مفتعلن فاعلن]	



دائرہ و بحر	اوزان	تعداد اشعار
	مثمن مطوی مخبون [مفتعلن فاعلات مفتعلن فع]	۷
مشتبہ	مثمن مخبون (محذوف/ مسکن/ مقصور) [مفاعلن فعلاتن مفاعلن (فعلن/ فعلن/ فعلان)]	۳۹۹
متقاربہ		
خفیف	مسدس مخبون (محذوف۔ مسکن/ مسکن مقصور) [فاعلاتن مفاعلن] (فعلن/ فعلان)	۳۲۰

غالب کی شاعری میں بحروں اور اوزان کے اس جائزے سے حسب ذیل نتائج برآمد ہوتے ہیں۔

(۱) غالب نے سب سے زیادہ اشعار بحر مضارع کے اوزان مثمن اخرب مکفوف (محذوف و مقصور) میں کہے ہیں۔ محذوف اور مقصور کا فرق صرف رکن آخر سے متعلق ہے۔ اس کا اثر وزن کے مجموعی آہنگ پر نہیں پڑتا۔ اس وزن کی یہ خصوصیت ہے کہ یہ لانبے مصوتے سے شروع ہوتا ہے، اس لئے اس وزن میں جو شعر کہا جائے گا، اس کی ابتدا ہی ایک زور اور جھٹکے سے ہوگی۔ اس وزن میں موجودہ صورت میں کہیں وقفہ نہیں پایا جاتا، اس لئے کہ اس وزن کا کوئی رکن بھی لانبے مصوتے پر ختم نہیں ہوتا، اسی وجہ سے اس وزن کے آہنگ میں سُرعت اور تسلسل پائے جاتے ہیں، البتہ لانبے مصوتوں کے اندراج اور مجموعی آہنگ میں فطری وقفوں کے مقامات کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسی وزن کو یوں ظاہر کیا جا سکتا ہے، فعلن مفاعلن فعلاتن مفاعلن۔ اس وزن کے ایک مصرع میں ۵ چھوٹے مصوتوں کے مقابلے میں ۸ یا ۹ لانبے مصوتوں کے لانے کی گنجائش ہے۔ وزن کی صوتی مقدار "محذوف" کی صورت میں = ۴۲ اور "مقصور" کی صورت میں = ۴۶ ہوگی۔

(۲) غالب کے کلام میں کثرت استعمال کے لحاظ سے دوسرے نمبر پر وزن رمل مثمن مخبون مختلف ذیلی زحافات کے ساتھ آتا ہے۔ یہ زحافات وزن کے بنیادی آہنگ کو متاثر نہیں کرتے، اس لئے انہیں جُداگانہ اوزان کی بجائے ایک ہی وزن سمجھنا مناسب ہوگا۔ یہ وزن بھی طویل مصوتے سے شروع ہوتا ہے۔ اگرچہ اس کی گنجائش رکھی گئی ہے کہ رکن اوّل فاعلاتن کو فعلاتن سے بدلا جائے۔ رمل مثمن سالم کے مقابلے میں اس وزن میں ارکان کے اختصار کے سبب درمیانی وقفے قریب تر ہو گئے ہیں اور آہنگ تیز ہو گیا ہے۔ اس وزن کے ایک مصرع میں ۵ یا ۷ چھوٹے مصوتوں کے مقابلے میں ۸ یا ۹ لانبے مصوتے لائے جا سکتے ہیں۔ وزن کی صوتی مقدار زحافات کی تبدیلی کے ساتھ ۴۵ تا ۴۹ ہوگی۔

(۳) تیسرے نمبر پر رمل مثمن محذوف آتا ہے۔ یہ وزن بھی لانبے مصوتے سے شروع ہوتا ہے، بلکہ اس کا ہر رکن لانبے مصوتے سے شروع ہو کر لانبے مصوتے پر ختم ہوتا ہے۔ اس کے آہنگ سے اگر پوری طرح استفادہ کیا جائے تو شعر میں لہجے کی صلابت اور زور کا اظہار ہو سکتا ہے۔ اس وزن کی صوتی مقدار ایک مصرع میں = ۲۶ ہوگی اور ۴ چھوٹے مصوتوں کے مقابلے میں ۱۱ لانبے مصوتے لائے جا سکتے ہیں۔ لانبے مصوتوں کی گنجائش سے فائدہ اٹھایا جائے تو شعر میں بے حد روانی پیدا ہو جائے گی۔

(۴) غالب نے رمل مثمن محذوف سے کچھ کم ہزج مثمن سالم کا استعمال کیا ہے۔ اس وزن کا آہنگ متذکرۂ بالا تینوں اوزان



بنیادی طور پر مختلف ہے اس لئے کہ اس میں ہر رکن کی ابتدا "وتد" سے ہوتی ہے۔ یہ وزن سب سے زیادہ غنائیت کا حامل ہے۔ دھیمے لہجے میں لطیف جذبات اور نازک احساسات کے اظہار میں معاون ہوتا ہے۔ لانبے مصوتوں کی گنجائش سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس وزن کو تیز رو اور بلند آہنگ بھی بنایا جا سکتا ہے۔ اس وزن کی صوتی مقدار مصرع میں ۳۲ ہے۔ اس میں چھوٹے اور لانبے مصوتوں کا تناسب ۱:۳ ہے۔

(۵) مجتث مثمن مخبون (محذوف، مسکن / مقصور) میں بھی اشعار کی تعداد قابلِ لحاظ ہے۔ اس وزن کی ابتدا بھی وتد سے دھیمے میں ہوتی ہے اور تقریباً ہر رکن میں وتد کا اندراج ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دوسرے اوزان کے مقابلے میں اس کا آہنگ زیادہ مسکت اور ٹھہراؤ لئے ہے۔ اس کے ایک مصرع کی صوتی مقدار بہ تبدیلی (حاف ۳۲ یا ۳۳ ہے اور اس میں چھوٹے اور لانبے مصوتوں کا تناسب ۱۱:۲/۱۱ ہوگا۔

(۶) غالب نے بعض اوزان اپنی شاعری کے ابتدائی دور ہی میں استعمال کئے اور غالباً ان کے آہنگ سے طبعی مناسبت نہ پاکر انہیں ترک کر دیا۔ مثلاً:

ا۔ متقارب مثمن اثرم (دوچند)۔ اس وزن میں میر نے سب سے زیادہ کامیاب غزلیں کہی ہیں اور یہ وزن میر سے مخصوص ہو گیا۔ غالب نے اس وزن میں اور میر ہی کی ایک مشہور زمین میں صرف پانچ اشعار کہے ہیں۔

اا۔ منسرح مطوی مکفوف۔ اس وزن میں غالب نے ابتدائی دور میں تین غزلیں کہی تھیں۔

(۷) بعض اوزان غالب کی شاعری کے ابتدائی دور میں نہیں ملتے بعد کے دور میں بھی ان اوزان کا استعمال کم ہی ہوا ہے مثلاً:

ا۔ ہزج مسدس اخرب مقبوض محذوف الآخر = ایک غزل

اا۔ مجتث مثمن مخبون = ایک غزل

(۸) چند اوزان غالب نے کم استعمال کئے ہیں۔ یہ اوزان اردو شاعری میں بھی کم مستعمل ہیں، لیکن غالب نے ان میں اتنی کامیاب غزلیں کہی ہیں کہ یہ اوزان انہیں سے مخصوص ہو گئے ہیں۔

ا۔ ہزج مثمن سالم

(۱) کہتے ہو نہ دیں گے ہم دل اگر پڑا پایا

(۲) ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا

اا۔ منسرح مثمن مطوی منحور

(۱) آہ کہ مری جان کو قرار نہیں ہے

کسی شاعر کے کلام میں بحور کے استعمال کا جائزہ لیتے ہوئے حسبِ ذیل امور کو ملحوظ رکھا جائے تو یہ جائزہ نتیجہ خیز ہو سکتا ہے۔

(۱) ہر وزن لانبے مصوتوں کے اندراج کی ایک معین گنجائش فراہم کرتا ہے۔ اس گنجائش سے جس قدر زیادہ استفادہ کیا جائے گا، شعر میں اسی قدر روانی اور نغمگی پیدا ہوگی۔

(۲) لانبے مصوتے کے اندراج کے سلسلے میں وہ مقام زیادہ اہمیت رکھتا ہے، جہاں رکن ختم ہوتا ہے اور وزن میں وقفہ پیدا ہوتا ہے۔ اس مقام پر اگر لانبا مصوتہ آئے تو شعر کا آہنگ وزن کے آہنگ سے قریب تر ہو جائے گا۔ لیکن شاعر اپنے مخصوص لہجے میں کوئی بات کہنا چاہتا ہے اور وہ اس آہنگ کے التزام سے وہ لہجہ قائم نہیں رہتا تو وہ وزن کے مقررہ آہنگ سے انحراف کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

(۳) جہاں شعر میں مصوتوں کے تناسب میں کمی بیشی سے شاعر کے لہجے کی نشان دہی ہوتی ہے، وہیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ



تخلیقِ شعر کے سلسلے میں اُس کا رویّہ کیا ہے۔ بعض شاعر صفائیِ بیان اور روانی کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں، اُن کے کلام میں لانبے مصوتوں کا تناسب زیادہ ہوتا ہے۔ الفاظ کا انتخاب اور جملوں کی ساخت بھی اِس تناسب میں کمی بیشی کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ جملے مفرد اور مختصر ہوں، بول چال کی سادہ زبان اور مکالماتی فقرے استعمال کیے جائیں تو لانبے مصوتوں کا تناسب بڑھ جائے گا۔ اس کی بہترین مثال داغ اور امیر مینائی کی شاعری ہے۔ لانبے مصوتوں کا تناسب میر کے کلام میں بھی زیادہ ہے۔ اس کا سبب اُن کے لہجے کی نرمی اور گداختگی کے علاوہ اُن کی مخصوص فرہنگِ شعر ہے جس میں لانبے مصوتوں والے الفاظ کی کثرت ہے۔ دیکھا یہ گیا ہے کہ فکری شاعری میں جہاں شاعر موضوع اور خیال کو اوّلیت دیتا ہے، یہ ممکن نہیں ہوتا کہ شعر زیادہ صاف اور رواں ہو اور خیال بھی پوری طرح ادا ہو جائے۔ اچھا شاعر یہ کوشش ضرور کرے گا کہ صوتی تنافر اور بے آہنگی پیدا نہ ہو۔

غالب کے کلام میں لانبے مصوتوں کا اوسط تناسب دریافت کرنے کے لیے قریب ایک ہزار اشعار کا تجزیہ کیا گیا۔ اوزان کی فراہم کردہ گنجائش کے مقابلے میں یہ تناسب بالعموم دو تہائی تا تین چوتھائی کے حدود میں رہتا ہے۔ مثلاً ؎

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے　　حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

اس شعر میں ۱۲ لانبے مصوتے لائے گئے ہیں جب کہ وزن کی فراہم کردہ گنجائش ۱۶ لانبے مصوتوں کی ہے۔ یہی تناسب قدیم دَور کے کلام میں بھی پایا جاتا ہے جسے غالب نے دیوان کی طباعت کے وقت خارج کر دیا تھا۔ ابتدائی دَور کے ایسے کلام میں جب غالب طرزِ بیدل کے دلدادہ تھے اور جس میں فارسی الفاظ اور تراکیب کی بہتات ہے، کہیں کہیں لانبے مصوتوں کا تناسب بہت کم ہو گیا ہے۔ مثلاً

نفسِ قیس ضبطِ جوش تو بہار تر
دل در گدازِ نالہ نگاہ آبیار تر

اس وزن میں ۱۶ لانبے مصوتے لائے گئے ہیں۔ اس شعر میں صرف ۸ لانبے مصوتے لائے گئے ہیں۔ غالب کے بعض ایسے اشعار میں جو روانی کے ساتھ پڑھے جا سکتے ہیں، لانبے مصوتوں کی کمی پائی جاتی ہے۔ ان اشعار کے تجزیے سے پتہ چلتا ہے کہ غالب نے لانبے مصوتوں کی کمی کی دوسرے طریقوں سے کس طرح تلافی کی ہے:

دل تا جگر کہ ساحلِ دریائے خوں ہے اب
اِس رہ گزر میں جلوۂ گل آگے گردِ تھا

اِس شعر میں صرف ۷ لانبے مصوتے ہیں اور وزن میں لانبے مصوتوں کی فراہم کردہ گنجائش ۱۶ ہے۔ شعر کی قرأت میں دقّت اِس لیے پیش نہیں آتی کہ وزن میں لانبے مصوتوں کی بجائے دو مقامات پر /ر/ کی ارتعاشی صوت اور دو مقامات پر /ل/ کی پہلوی صوت مندرج ہوئی ہے۔ اِن مصوتوں کی ادائیگی میں بندشی مصمتوں ک، ٹ وغیرہ کی طرح رکاوٹ نہیں ہوتی۔

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

یہ شعر کافی رواں ہے لیکن اِس میں لانبے مصوتوں کا تناسب وزن کی گنجائش کا صرف نصف ہے۔ روانی کا سبب یہ ہے کہ ہر رکن کے ختم پر زیادہ تر لانبے مصوتے آئے ہیں، صرف ایک جگہ /س/ آیا ہے۔ یہ صفیری مصمتہ ہے۔ اس کی ادائیگی میں سانس رکتی نہیں بلکہ منہ سے رگڑ کے ساتھ باہر آتی ہے۔ دوسری جگہ ارتعاشی مصمتہ /ر/ آیا ہے اور یہ بھی اپنی ادائیگی کے وقت سانس کے اخراج میں حائل نہیں ہوتا۔ اِس شعر میں شاعر کے لہجے اور معنویت کے اعتبار سے وقفے قائم کیے جائیں تو معلوم ہوگا کہ ان وقفوں



امیر حسینی

معام پر بھی زیادہ تر مصوتے آئے ہیں ؎

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارماں لیکن پھر بھی کم نکلے

ایک جگہ مصمتہ /ن/ آیا ہے جو اگرچہ سدشی مصمتہ ہے لیکن اس کی ادائیگی میں سانس ناک کی راہ سے خارج ہوتی ہے۔ اس سے پہلے لا مامصمتہ آیا ہے جس کی وجہ سے /ن/ کی سدشیت کم ہوگئی ہے۔

شعر کی معیاری قرأت تقطیع کے مطابق اور وزن کے ارکان کے تابع نہیں ہوتی۔ وزن کے ارکان کو ملحوظ رکھتے ہوئے شعر پڑھا جائے تو اکثر صورتوں میں اس کی معنویت مجروح ہو جاتی ہے اور سارا تاثر غارت ہو جاتا ہے بلکہ بعض صورتوں میں تو شعر مضحکہ خیز بن جاتا ہے۔ غالب کا یہ شعر اگر تقطیع کے حساب سے پڑھا جائے تو قرأت کے اس طریقے کی خامی ظاہر ہو جائے گی۔

آہ کو چا ہیے اک عُم رَ اثر ہو نے تک
کون جیتا ہَ تری زُل فَ کے سر ہو نے تک

شعر سے صحیح طور پر لطف اندوز ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی قرأت میں وزن کے معینہ وقفوں کے بجائے حسب ذیل امور کا خیال رکھیں:

۱۔ باہم معنوی تلازمے سے منسلک کلموں کو ایک ساتھ ادا کیا جائے۔

۲۔ وقفے رموز اوقاف کے مطابق قائم کئے جائیں۔

۳۔ تعقید لفظی کی وجہ سے اگر ایسے کلموں کے درمیان فصل آجائے جنہیں ایک دوسرے سے متصل رہنا چاہیے تو ایسے ٹکڑے کی ادائیگی کے بعد ہلکا سا وقفہ دیا جائے۔

۴۔ لفظ میں دو ساکن مسلسل آئیں تو کسی مصمتے کو ساقط نہ کیا جائے گا اگرچہ کہ تقطیع میں ایسا کیا جاتا ہے۔ ایسی صورت میں تال کو قائم رکھنے کے لیے اس لفظ سے قبل یا بعد کے لانبے مصوتے کی ادائیگی کا دورانیہ ذرا سا کم کر دیا جائے۔ ان کے پیشِ نظر غالب کے مندرجہ بالا شعر میں وقفے حسب ذیل قائم ہوں گے۔

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

اس شعر میں:

۱۔ "آہ" کی الف کو کھینچ کر پڑھا جائے تو /ہ/ ساکن ہو جائے گی۔

۲۔ "عمر" کی /ر/ ارتعاشی مصمتہ ہونے کی وجہ سے پوری طرح ساکن نہیں ہوگی لیکن "عُم" کی ادائیگی کے دوران میں کسی اضافہ کیا جائے تو /ر/ کا ارتعاش کم ہو جائے گا۔ /م/ انفی مصمتہ ہے۔ اس کی ادائیگی کے دوران کو کم یا زیادہ کیا جا سکتا ہے۔

۳۔ "کون" کی /ن/ کو ساکن کرنے کے لیے "کَو" کے لانبے مصوتے کو زیادہ دیر تک ادا کیا جائے۔ اس تلفظ کی وجہ سے جو ابھرے گا، وہ شعر کے مفہوم، اس کے احساس اور شاعر کے موڈ کو پوری طرح ظاہر کرے گا۔

۴۔ "زلف" کا لفظ اس طرح ادا کرنا چاہیے کہ ساکن مصمتے /ل/ اور /ف/ کی آوازیں مخلوط ہو جائیں اور /ف/ کی آواز ساقط نہ ہونے پائے۔ تال کو قائم رکھنے کے لیے "زلف" سے قبل آنے والے لفظ "تری" کے لانبے مصوتے /ی/ کو مختصر کر دیا جائے۔

۵ ـ دوسرے مصرع میں تقطیع کے اعتبار سے "ہے"



"ہَ" پڑھا جائے گا۔ اس کو یوں ادا کیا جانا چاہیے کہ ادائیگی کے دوران چھوٹے مصوتے سے کسی قدر زیادہ اور لانبے مصوتے سے کسی قدر کم ہو اور لفظ "حِنا" کے لانبے مصوتوں کی ادائیگی کے دوران کو متناسب طور پر کم کر دیا جائے۔ اس قرأت میں شعر کا وزن اور اس کی صوتی مقدار دونوں برقرار رہیں گے۔ ہم نے چھوٹے مصوتے کی مقدار = ۱ اور اسی تناسب سے لانبے مصوتے کی مقدار = ۲ فرض کی تھی۔ چھوٹے مصوتے کو کسی قدر لانبا کیا جائے یا لانبے مصوتے کو کسی قدر دبا دیا جائے تو اس مصوتے کی مقدار دوران کے اعتبار سے ۱ ۱/۴ ، ۱ ۱/۲ یا ۱ ۳/۴ قرار دی جا سکتی ہے۔

معیاری قرأت کے ان اصولوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہم غالب کے اشعار کے اصل آہنگ کو پا سکتے ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے غالب کے کلام کا جائزہ لیا جائے تو اُن کے آہنگِ شعر کی بعض ایسی خصوصیات سامنے آتی ہیں جن کا شمار غالب کے اسلوب کے اوصاف میں ہو سکتا ہے۔

غالب کے کلام میں اشعار کی قابلِ لحاظ تعداد ہم رتبہ مرکب جملوں پر مشتمل نظر آتی ہے۔ ان میں ہر مصرع عموماً ایک مفرد جملہ ہوتا ہے جو دوسرے مصرع سے حروفِ وصل، حروفِ تردید، حروفِ استدراک یا دیگر حروفِ عطف کے ذریعے مربوط ہوتا ہے کبھی یہ حروف حذف کر دیے جاتے ہیں۔

واں خود آرائی کو تھا موتی پرونے کا خیال
یاں ہجومِ اشک سے تارِ نظر نایاب تھا

ایسے اشعار میں ہر مصرع کے دو اجزا ہوتے ہیں، مبتدا اور خبر اور اُن کے درمیان ایک وقفہ آتا ہے۔ بعض یوں بھی ہوتا ہے کہ مبتدا یا خبر کی توسیع کا کوئی جزو یا اجزا اپنے مقررہ مقام سے دُور ہو جاتے ہیں۔ ان اجزا میں معنوی ربط قائم رکھنے کے لیے مزید ایک یا دو وقفے قائم کرنے پڑتے ہیں۔ یہ تعقید کبھی ضرورتِ شاعری کی پابندی کی وجہ سے ہوتی ہے اور کبھی اُس کا مقصد کسی صفت یا ضمیر یا کسی اور جزوِ کلام پر زور دینا ہوتا ہے۔ کبھی ردیف کی صرفی حیثیت اس تعقید کا باعث ہوتی ہے:

مرے جہاں کے ـــ اپنی نظر میں ـــ خاک نہیں
سوائے خونِ جگر ـــ سو ـــ جگر میں خاک نہیں

فسونِ یک دلی ہے ـــ لذتِ بیداد ـــ دشمن پر
کہ وجدِ برق ـــ جوں پروانہ ـــ بال افشاں ہے ـــ خرمن پر

غالب کے کلام میں شعر کی تعمیر کی دوسری صورت وہ ہے جہاں ایک مصرع اصل جملہ ہوتا ہے اور دوسرا مصرع ایک یا ایک سے زیادہ تابع جملوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ ان مصرعوں میں بھی مبتدا اور خبر کے درمیان ایک ایک وقفہ آتا ہے اور تعقید کی بنا پر یا کسی جزوِ کلام پر زور دینے کے لیے مزید وقفے لائے جاتے ہیں۔

تُہمت ـــ رُسوائیِ اندازِ استغنائے حسن
دست، مرہونِ حنا ـــ رُخسار، رہنِ غازہ تھا

غالب کے شاعرانہ آرٹ کا ایک خاص وصف یہ ہے کہ وہ جملوں اور فقروں کے مخصوص دروبست سے شعر میں ایک سے زیادہ معنوی تلازموں کی گنجائش فراہم کرتے ہیں جس کی وجہ سے شعر پہلودار اور کثیر المعانی ہو جاتا ہے۔ ہر مفہوم اور تاثر وقفوں اور لہجے کی تبدیلی کے ساتھ ایک نئے اندازِ قرأت کا طالب ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ شعر وقفوں کی تبدیلی کے ساتھ مختلف طریقوں سے پڑھا جا سکتا ہے۔



افسونِ یک دلی ہے   لذّتِ بیداد دشمن پر
کہ وجدِ برق جوں پروانہ   بال افشاں ہے خرمن پر

[illegible] سے قائم کئے جاسکتے ہیں۔

افسونِ یک دلی ہے۔ لذّتِ بیدادِ دشمن پر
افسونِ یک دلی ہے، لذّتِ بیداد ۔ دشمن پر

[illegible] مصرع کی قرأت بھی مختلف طریقوں سے ہو سکتی ہے۔ ہر قرأت میں توجہ مصرع کے کسی خاص پہلو پر مرکوز ہوگی۔

کہ وجدِ برق، جوں پروانہ ۔ بال افشاں ہے، خرمن پر
کہ وجدِ برق ۔ جوں پروانہ بال افشاں ہے ۔ خرمن پر
کہ وجدِ برق ۔ جوں پروانہ ۔ بال افشاں ہے ۔ خرمن پر

یعنی ۔ وجدِ برق جو رقصِ پروانہ کی مانند ہے، خرمن پر بال افشاں ہے۔
[illegible] ۔ خرمن پر برق کا وجد پروانہ کی مانند بال افشاں ہے۔
[illegible] ۔ خرمن پر برق کا وجد جو پروانے کی مانند ہے، بال افشاں ہے۔

غالب کے اشعار میں اصوات کی ادائیگی کے دَوران سے لہجے کی تبدیلی ہی نئے معانی اور کیفیات کے دروازے کھولتی ہے۔

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق
ہے مکرّر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

اس شعر میں لفظ "مکرّر" کی توضیح نہیں ہوسکتی۔ اگر پہلے مصرع کو دو بار دو مختلف لہجوں میں نہ پڑھا جائے۔ پہلی بار مصوتوں پر زور دیتے ہوئے مصرع کو اونچی آواز میں پڑھا جائے گا۔ لہجے میں تحکمانہ انداز میں سوال کی کیفیت شامل رہے گی۔ دوسری قرأت اس کے بالکل ہی برعکس دھیمے اور افسردہ لہجے میں ہوگی۔ لہجے کی اِس تبدیلی سے مصوتوں کی ادائیگی کا دَوران بھی بدل جائے گا۔ مثلاً "کون" کے بعد لفظ "ہوتا" میں دو لانبے مصوتے "و (ہ) اور آ (ہ) آتے ہیں۔ پہلی قرأت میں "ہو" کی ادائیگی کا دَوران "تا" کی ادائیگی کے دَوران سے کم ہوگا اور "تا" کھینچ کر اور زور دے کر پڑھا جائے گا۔ دوسری قرأت میں دونوں مصوتوں کا دَوران مساوی ہوگا۔

غالب کی شاعری کے صَرفی اور نحوی مطالعے سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ابتدائی دَور میں اسنادِ خبری (ہے۔ ہیں۔ تھا۔ تھے وغیرہ) کا استعمال زیادہ ہوا ہے اور بہت سے اشعار بیانیہ (STATEMENT) ہیں۔ ان اشعار کا لہجہ بھی بیانیہ ہوگا۔ بعد کے دَور میں بھی اسنادِ خبری اور حروف (کا۔ میں۔ سے۔ پر وغیرہ) والی ردیفوں کا استعمال جن غزلوں میں ہوا ہے، زیادہ تر اسی نوعیت کے جملے ملتے ہیں۔ دوسری طرف غالب کی شاعری کا ایک معتدبہ حصّہ خطاب یا مکالمے کی صورت میں ہے۔ ان اشعار میں مکالماتی لہجہ نمایاں ہے۔ غالب نے اپنے مکالماتی لہجے کو نمایاں کرنے کے لئے اوزان کے آہنگ سے خاطر خواہ استفادہ کیا ہے اور اکثر صورتوں میں اپنے لہجے کو وزن کے مقررہ آہنگ پر حاوی کر دیا ہے۔ اِس مکالماتی لہجے کی تشکیل میں خطابیہ فجائیوں، حروفِ استفہام، حروفِ تخصیص اور مکالماتی فقروں کے استعمال سے شعر میں وقفوں کی تنظیم بھی متاثر ہوتی ہے۔ ذیل میں غالب کے کثیر الاستعمال اوزان کی غزلوں سے چند منتخب [illegible] پیش کئے جاتے ہیں۔ ان اشعار میں مصوتوں کی تنظیم اور وقفوں کے اندراج کو چارٹ کے ذریعے واضح کیا گیا ہے۔ اِس چارٹ میں بیک نظر یہ دیکھا جاسکتا ہے کہ غالب نے مختلف اوزان کے ڈرائنگ میں اپنا لہجہ سمو کر ایک نیا آہنگ کس طرح پیدا کیا ہے:

مضارع مثمن اخرب مکفوف [محذوف / مقصور]   [illegible]



اے آرزو شہیدِ وفا! خوں بہا نہ مانگ
جز بہرِ دست و بازوئے قاتل دعا نہ مانگ

مسجد کے زیرِ سایہ خرابات چاہیے
بھوں پاس آنکھ قبلۂ حاجات چاہیے

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اٹھیے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی

دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں
خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

رمل مثمن مخبون (محذوف / محذوف مسکن / مسکن مقصور)

پھر وہ سوئے چمن آتا ہے خدا خیر کرے
رنگ اڑتا ہے گلستاں کے ہوا داروں کا

بوئے گل ۔ نالۂ دل ۔ دودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا، سو پریشاں نکلا

نکتہ چیں ہے غمِ دل، اس کو سنائے نہ بنے
کیا بنے بات، جہاں بات بنائے نہ بنے

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق
لبِ ساقی پہ مکرر ہے صلا میرے بعد

رمل مثمن محذوف

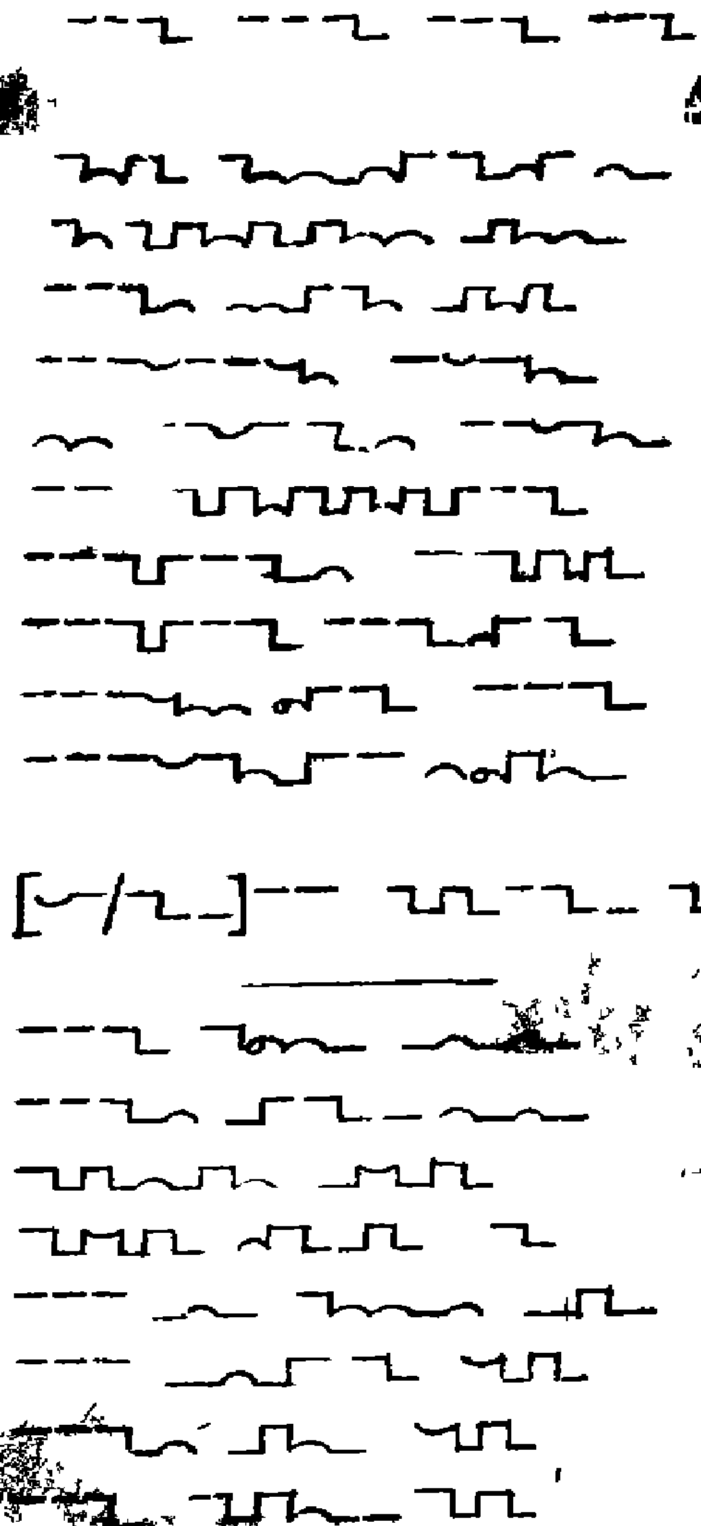
تا کجا افسوسِ گرمی ہائے صحبت اے خیال
دل بہ آتش خیزیِ داغِ تمنا جل گیا

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آ جائے ہے
میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

حضرتِ ناصح اگر آئیں دیدہ و دل فرشِ راہ
کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائیں گے کیا





[illegible] وارستگاں کو سنگِ تہمت ہے خداوندا
[illegible] شعلے سے اور لب ہائے عاشق سے صدا گم ہو
[illegible] دیا ہے گریہ [illegible] فرصت سر اٹھانے کی
فلک کا دیکھنا تقریب تیرے یاد آنے کی
[illegible] کرتا کاش نالہ مجھ کو کیا معلوم تھا ہمدم
کہ ہوگا باعثِ افزائشِ دردِ دروں وہ بھی
نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا
[illegible] کیا [illegible] عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
[illegible] سنگِ دل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

[illegible] مثمن مخبون محذوف (مسکن / مقصور)

خبر نگہ کو نگہ چشم کو عدو جانے
وہ جلوہ کر کہ نہ میں جانوں اور نہ تو جانے
وہ آئے خواب میں تسکینِ اضطراب تو دے
ولے مجھے تپشِ دل مجالِ خواب تو دے
دیا ہے دل اگر اُس کو بشر ہے کیا کہیے
ہوا رقیب تو ہو نامہ بر ہے کیا کہیے
[illegible] جو نہ [illegible] کہیے
[illegible] کہ جو تم یوں کہو تو کیا کہیے

اشارے

صوتی مقدار

(زمینی خط) — = [illegible]
(زمینی قوس) ⌒ [illegible] مصوتہ + ساکن [illegible]
(زمینی [illegible]) [illegible] چھوٹا مصوتہ + دو ساکن [illegible]
[illegible] (افقی قوس) ◡ = لا با مصوتہ
(افقی [illegible]) [illegible] = [illegible]
[illegible] اور افقی مصوتوں کو ملا لے اور اُن کے تسلسل [illegible]
اِس [illegible] واضح ہو جاتی [illegible]
لہجے کا متقاضی [illegible]

شاعر۔ مصحفی

وقفوں کا التزام رکھا جائے۔ ایک شعر کے تجزیے سے ہم اس خیال کی وضاحت کریں گے۔



لیا ہے۔ دل اگر اس کو۔ بشر ہے۔ کیا کہیے

ہوا رقیب۔ تو ہو۔ نامہ بر ہے۔ کیا کیجے

اِس شعر کا سارا حُسن اُس کے لہجے میں ہے۔ شعر کی توضیح یوں کی جا سکتی ہے کہ نامہ بر شاعر کا رقیب بن گیا ہے شاعر کا دوست یا کوئی شخص اس کا ذکر چھیڑ کر شاعر کے احساسات کو کریدتا ہے۔ شاعر کو یہ گوارا نہیں ہے کہ نامہ بر رقیب بن کر اُس کی ہمسری کرے لیکن وہ جانتا ہے کہ نامہ بر بھی دل سے مجبور ہے۔ محبوب کا حُسن ہی ایسا ہے کہ جو اُسے ایک نظر دیکھ لیتا ہے عاشق ہو جاتا ہے۔ شاعر، نامہ بر کو اتنا کم رُتبہ جانتا ہے کہ وہ اُس سے اِس بارے میں گفتگو کرنا بھی پسند نہیں کرتا اور نہ یہ گوارا ہوتا ہے کہ کوئی شخص اُس کے سامنے نامہ بر کا ذکر اِس عنوان سے کرے اور نامہ بر کو اُس کا رقیب سمجھے۔ بات جب چھڑ گئی تو وہ اُس کو حقارت کے ساتھ ٹال دیتا ہے۔ شعر کے لہجے سے توہین کے احساس اور حقارت کے جذبے کا اظہار کوبی ہو رہا ہے۔ "کیا کہیے" اور "کیا کیجے" میں "کیا" ایک خاص لہجے سے جھٹکے کے ساتھ ادا ہو رہا ہے۔ یہ لہجہ اُسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جب اِن الفاظ سے پہلے وقفہ ہو۔ "کیا" کو "بشر ہے" اور "نامہ بر ہے" فقروں کے ساتھ ملا کر پڑھیں تو یہ بات پیدا نہ ہو گی۔ دُوسرے مصرع میں "تو ہو" سے قبل وقفہ دیا جائے اور "رقیب" کی /ب/ کو ساکن رکھا جائے تو "تُ ہو" جھٹکے کے ساتھ پڑھا جائے گا اور اِس لہجے سے ظاہرانے بیزاری کی تہہ میں جھنجھلاہٹ اور تحقیر کا جو جذبہ موجود ہے، نمایاں ہو جائے گا۔ "تو ہو" کے بعد وقفہ دیں تو "نامہ بر" کا "نا" زیادہ کھینچ کر اور جھٹکے کے ساتھ ادا ہو گا۔ "نامہ بر" میں "مہ" کا اندراج چھوٹے مصوتے کی جگہ ہوا ہے، اِس لئے وہ صرف "مَ" پڑھا جائے گا۔ اِس لہجے میں "نامہ بر" کہیں تو تحقیر کا انداز آ جاتا ہے۔

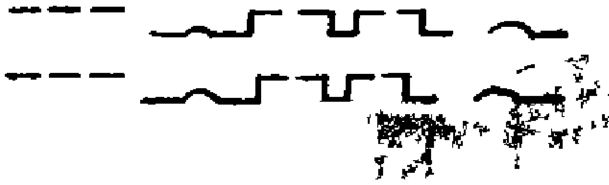
غالب نے مختلف اوزان میں مصوتوں اور وقفوں کی تبدیلی سے آہنگ کے بہت سے تجربے کئے ہیں۔ تفصیلی تجزیے سے اِن تجربوں کی طویل فہرست مرتب ہو سکتی ہے۔ ذیل میں نمونتاً چند شعر پیش کئے جاتے ہیں ؎

(۱) تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں
تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے



دونوں مصرعوں کی ابتدا میں صوتی ڈیزائن کی تکرار ہوتی ہے۔ مصرعوں کی ابتدا، وسط یا آخر میں اِس نوعیت کی تکرار غالب کے کئی اشعار میں ملے گی۔ بعض اشعار میں تو پہلے مصرع کے مکمل صوتی ڈیزائن کی تکرار دُوسرے مصرع میں ہوتی ہے۔

(۲) حسد سزائے کمالِ سخن ہے کیا کیجے
ستم بہائے متاعِ ہنر ہے کیا کیجے



(۳) فضائے خندۂ گل تنگ و ذوقِ عیش بے پروا
فراغت گاہِ آغوشِ وداعِ دل پسند آیا



مصرعِ اوّل میں لفظ "تنگ" کا اندراج ایسے مقام پر ہوا ہے کہ اُسے زیادہ کھینچ کر اور زیادہ زور دے کر پڑھا جائے گا۔ اِس طرزِ ادائیگی سے جو وا لہجہ تنگی اور تنگی سے بیزارگی کی کیفیت کو نمایاں کرے گا۔ "خندۂ گل تنگ" کے الفاظ میں چھوٹے مصوتوں کے اجتماع سے تنگی کی فضا پیدا ہو گئی ہے، جب کہ اِن الفاظ سے قبل اور بعد آنے والے الفاظ اور فقروں "فضائے" ____ "ذوقِ عیش بے پروا" میں لمبے مصوتوں کی فراوانی سے وسعت اور کشادگی کا تاثر اُبھر رہا ہے۔ دُوسرے مصرع میں "آغوش [آغوشے]" کو مسلسل تین لانبے مصوتوں کے اندراج نے صوتی اعتبار سے بھی "فراغت گاہ" بنا دیا ہے۔

(۴) نہ چھین لے دریا لو میدِی جاوید آساں ہے





کشاکش کو پہلا مقصدہ مشکل پسند آیا

پہلے مصرع ... دل" کی "ے" کھینچ کر پڑھی جائے گی اور "عشق" کی اصوات (دو مصرع میں لاتا صورت ہے) کسی قدر ڈوب جائے گی۔ اس لہجے سے ے دلی' کا احساس نمایاں ہوگا۔ اسی طرح "جاوید" میں "دی" کو کھینچ کر پڑھیں گے اور "د" قریب قریب ساکن ہو جائے گی۔ "دے" کی لاہی صوت سے ہمیشگی کا تاثر ابھرے گا۔

قرأتِ شعر میں ایک لسانیاتی اصول یہ کارفرما رہتا ہے کہ مصرعِ اولیٰ کے ابتدائی رکن کو جس لہجے اور جس قوت سے ادا کیا جاتا ہے وہی اندازِ قرأت پورے شعر پر حاوی ہو جاتا ہے۔ اگر وہ شعر مطلع ہو تو اس کا لہجہ ساری غزل میں سرایت کر جائے گا۔ اس کی ایک عمدہ مثال غالب کی یہ غزل ہے جس کا آہنگ اسی وزن میں کہی گئی دوسری بہت سی غزلوں کے آہنگ سے مختلف ہے ؎

دیا یاروں نے بے ہوشی میں درماں کا فریب آخر
ہوا سکتے سے میں آئینہ دستِ طبیب آخر

ہزج مثمن سالم کا آہنگ وتدی ابتدا، طویل مصوتوں کی کثرت، چار اصواتی ہم وزن ارکان اور ان میں درمیانی وقفوں کے اندراج کی وجہ سے بہت زیادہ سُبک رَو ہوتا ہے بشرطیکہ اس ڈرائن کی زیادہ سے زیادہ پابندی کی جائے۔ دوسری طرف اس وزن میں اتنی لچک ہے کہ اندازِ قرأت کی تبدیلی کے ساتھ وہ تیز رَو اور بلند آہنگ ہو جاتا ہے۔ غالب کے اس مطلع کے ابتدائی رکن میں "یا" کی تکرار اس طرح ہوتی ہے کہ اس کی واضح طور پر قرأت کے لیے کسی ایک "یا" کو جھٹکے اور زور کے ساتھ ادا کرنا ہوگا۔ "دیا" کی "یا" کو جھٹکے کے ساتھ ادا کریں تو رکن کی آخری صوت کو بھی اسی قوت سے ادا کرنا ہوگا۔ آہنگ اور تال میں یکسانیت پیدا کرنے کے لیے مصرع کے باقی تین ارکان بھی اسی لہجے میں ادا کیے جائیں گے۔ مطلع کے آہنگ کی متابعت غزل کے دیگر اشعار میں بھی کی جائے گی۔ غالب نے دوسرے اوزان کے آہنگ کو بھی اسی طرح قوتِ اختراع سے کام لے کر اپنے لہجے کے تابع کر دیا ہے۔ ▲

غالب

"جہاں تک میری نظر کام کرتی ہے، ہم ہندوستانی مسلمانوں میں سے اگر کسی نے مسلمانی سیاست میں مستقل اضافہ کیا ہے تو وہ فارسی کے مشہور شاعر مرزا غالب ہیں۔ وہ دراصل اُن شاعروں میں سے ہیں جنکے ادراک اور تخیل کی بلندی انہیں عقیدے اور ملت کے حدود سے بالاتر مقام عطا کرتی ہے۔ انکی قدرشناسی کا دَور آنے والا ہے۔"

(اقبال)

(Stray Reflections) ۱۹۱ء

نادم سیتاپوری

غالب کے کلام میں تحریف و تصرّف

غالب کے اُردو کلام پر جس کثرت کے ساتھ غیر معتدل تنقیدیں کی گئیں اُس سے کہیں زیادہ ترمیمات و تحریفات۔۔۔ اصلاحیں بھی دی گئیں اور الحاقی کلام کو بھی اُن کی جن کارانہ عظمت میں سمونے کی کوشش کی گئی۔ یہاں تک کہ آج غالب کا ایک ایک شعر اور ایک ایک مصرع مشکوک و مشکوک ہو کر رہ گیا۔ شارح غالب نواب حیدر یار جنگ نظم طباطبائی (وفات مئی ۱۹۳۳ء) نے اپنے ایک مختصر سے مراسلے میں ایک ایسی ہی مثال پیش کی ہے، جو کتابت کی ایک معمولی سی غلطی کی وجہ سے بہت دنوں تک معمّہ سی رہی۔ تحریر فرماتے ہیں

(۱) "میرے دوستوں میں ایک صاحب دیوانِ غالب کا نسخۂ "حمیدیہ" لئے ہوئے میرے پاس آئے اور اس مطلع کے معنی مجھ سے پوچھنے لگے ؎

خوں گرم انتظار و مآلِ تمنائی کمند آیا — سویدا تا بلب زنجیرِ سے "دود سپند آیا"

شعر کے الفاظ سے یہ سب باتیں پیشِ نظر ہو گئیں کہ "سپند" کو سویدائے دل سے تشبیہ دیتے ہیں، لیکن "سویدا تا لب زنجیر" کیا معنی؟ اور پھر زنجیر سے "دود سپند آیا" کیا معنی؟ اس کے ساتھ ہی یہ خیال پیدا ہوا کہ شاعر یہ بات کہنا چاہتا ہے کہ سویدا لبوں تک آگیا، یعنی کلیجہ منہ کو آگیا۔ "آیا" اگر سویدا کے ساتھ ہے تو پھر "دود" کے ساتھ اُسے تعلق نہ ہونا چاہیے۔ مگر کاتب کا تعرّف تو اس میں نہیں ہے؟ گمان غالب ہوا کہ ضرور تصرف ہے۔ اب سے پچاس ساٹھ برس پیشتر یائے معروف و مجہول کا فرق کتابت میں نہ تھا۔۔۔ یقین ہو گیا شاعر نے یوں کہا تھا ؏

سویدا تا بلب "زنجیریٔ" دودِ سپند آیا

"ی" کو اس طرح لکھئے کہ اس پر "سی" کا شبہ ہو سکے۔ اب شعر کے معنی کھل گئے۔ یعنی "سویدا دود سپند" کا زنجیری ہو کر لب تک آیا۔ اس میں شاعر نے "دودِ سپند" کو زنجیر سے تشبیہ دی ہے۔

اب میں نے دعویٰ کے ساتھ یہ کہہ دیا کہ جس طرح میں پڑھتا ہوں یہی صحیح ہے۔ غرضیکہ بھوپال میں لکھا گیا کہ اصل نسخہ (نسخۂ حمیدیہ) سے مقابلہ کیا جائے۔ اس کا جواب بھوپال کے ناظم تعلیمات کی طرف سے انہیں میرے عنایت فرما کے نام آیا کہ اصل نسخہ (میں) "زنجیریٔ دود سپند" ہے (زنجیر سے) کاتب کی غلطی ہے۔"

(صفحہ ۳ - کالم ۲/۳ اودھ پنچ لکھنؤ - ۱۹ اگست ۱۹۲۵ء جلد ۵۱ شمارہ ۳۱)

یہ مثال نہ اصلاح کی ہے نہ تحریف و ترمیم کی۔۔۔ لیکن مروّجہ دیوانوں کی ایسی ہی غلطیوں کا سہارا لے کر تحریف جیزی کی ایک پوری تحریک کو جنم دے دیا اور جس طرح شرح غالب کے پردے میں مولانا عبدالباری آسی مرحوم (وفات ۱۹۴۶ء) نے بہت سا اپنا کلام شیر و شکر کر کے

۱ ملاحظہ ہو "غالب کے کلام میں الحاقی عناصر" شائع کردہ ادارہ فروغ اُردو لکھنؤ ۱۹۶۵ء



البیانہ کے نام سے منسوب و موسوم کر دیا، بالکل اسی طرح مجدد السنۂ مشرقیہ شوکت میرٹھی مرحوم اس سے بہت
ل غالب کے اُردو کلام کو تحریف و ترمیم کا نشانہ بنا چکے تھے جو ش یار جنگ سید ناظر الحسن ہوش بلگرامی مرحوم نے اپنے
مضمون "دیوانِ اُردوئے غالب اور حضرت شوکت میرٹھی" میں تحریر فرمایا ہے:

(۲) "جب تک حضرت شوکت میرٹھی نے دیوانِ غالب کی ایک نامکمل شرح نہیں چھاپی تھی اُس وقت تک نسخوں میں ہندو مسلمانوں کی طرح اختلاف نہ تھا۔ اُن کا اپنے اجتہادِ شاعری پر اعتماد کر کے شرح کو چھپوانا تھا کہ دیباچۂ شاعری میں اختلاف پھیل گیا۔ جناب شوکت غالب کے شعروں میں تصرف ہی کر کے خاموش نہیں ہوئے، بلکہ اس حد تک اصلاح دی کہ غالب کو مرنے کے بعد اپنے تلمذ ہونے کا خود ہی شرف بخش دیا۔ پھر دو ایک جگہ کے سوا کہیں یہ بھی ظاہر نہیں فرمایا کہ مطبوعہ نسخوں میں یہ لفظ تھا۔ میں یہاں پر دوسرا لفظ مناسب سمجھتا ہوں۔ یہ اخلاقی جرم اگر غالب کی رُوح معاف کر دے تو شاید معاف ہو جائے۔ اس قسم کی جسارتوں سے واقف ہو کر اجتہاداتِ شوکت کا پردہ مقلدینِ غالب کے لیے اُٹھانا پڑا تاکہ غالب پرست "میرٹھی اجتہاد" پر ایمان نہ لے آئیں"۔

غالب مرحوم کا صحیح کیا ہوا نسخہ جس کے آخر میں وہ فرماتے ہیں کہ ـــــ "اس کے پروف اور کاپیاں سب میری نظر سے گذرے ہیں" ، پیدا کیا اور شوکت صاحب کی شرح بھی قیمتاً منگوا کر اپنی مالیات پر بلا قصور جرمانہ کیا۔ اوّل سے آخر تک معمولی نسخوں کو ملایا اور مقابلہ کیا، جس نے یہ ثابت کر دیا کہ شوکت صاحب نے جو خود ساختہ "تحریفیں کی ہیں" وہ ۱۸۵۷ء کے میرٹھی نسخہ کے سوا کسی میں نہیں پائی جاتیں۔ ان تحریفوں کے جواب دہ قوم کے سامنے حضرت شوکت ہی ہو سکتے ہیں، مگر دلدادگان اُردو کو کیا غرض کہ وہ اجتہاداتِ شوکت میں دخل دے کر اپنی شاعری کا ایمان بگاڑیں۔

دیوانِ غالب کے کئی نسخے اس وقت میرے پیشِ نظر ہیں اور وہ سب کے سب اپنے اتحاد و مطابقت سے بغلگیر ہیں۔

اُمید ہے ناظرین ان تحریفوں کو ملاحظہ فرما کر شوکت صاحب کی "رُوحِ شاعری" پر ماتم پڑھیں گے"۔

(صفحہ ۴۷-۴۸ "عروسِ ادب" مطبوعہ نگار مشین پریس لکھنؤ ۱۹۲۷ء)

ا۔ سید احمد حسن شوکت میرٹھی اپنے دَور کی ایک عہد آفریں "شخصیت تھے۔ رواجِ زمانہ کے مطابق "مجدد السنۂ مشرقیہ" کو اپنے کا جزو بنانے میں انہوں نے کبھی جھجک محسوس نہیں کی اور "امیر اللغات" کے اُن تمام ادبی ہنگاموں میں ہمیشہ پیش پیش رہے جو "طوطیِ ہند" ۔۔۔ اودھ پنچ اور ریاض خیرآبادی کے "ریاض الاخبار" میں چل رہے تھے۔ یہ سلسلہ برسہا برس جاری رہا، یہاں تک کہ ماہنامہ ۔۔۔ وار "میرٹھ میں ایک ایسا تنقیدی سلسلہ شروع کر دیا گیا، جس کی زد سے ریاض تو جیر کیا بچتے، مولانا شوکت کھل کر غالب پر آگئے ۔۔۔ سید عقیل احمد جعفری نے لکھا ہے:

"مجددالوقت جناب شوکت میرٹھی نے اپنے رسالہ پروانہ" میں ایک بار حضرت امیر مینائی مرحوم اور مرزا اسد اللہ خاں غالب مغفور کی چوری پکڑی تھی۔ اس کے بعد داغ اور جلال کے کلام کو مہمل بتلاتے ہوئے حضرت ریاض (خیرآبادی) کی ۔۔۔ کو قابلِ اصلاح قرار دے کر تحریر فرمایا تھا . . . ."

(صفحہ ۱۸۱ نثر ریاض خیرآبادی۔ مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن)

۔ کے کلام میں تحریف و تصرف کا آغاز شوکت میرٹھی کی "حلِ کلیاتِ غالب" سے ہوا جو غالب کی باضابطہ شرحوں میں دوسری شرح کہی ۔۔۔ ہے۔ اس سے قبل نظم طباطبائی کی شرح غالب شائع ہو چکی تھی ـــ لیکن جہاں تک کلامِ غالب کی شرح کاری کا تعلق ہے، اس ابتدا طباطبائی سے بہت پہلے سید محمد مرتضیٰ بیاں یزدانی میرٹھی (وفات مارچ ۱۹۰۰ء) کر چکے تھے۔ مرحوم ماہنامہ العصر لکھنؤ ۔۔۔ پہ ایک اِداراتی نوٹ میں لکھا ہے:



(۳) "(رسالہ) لسان الملک (میرٹھ ــ اجرا ۱۸۸۷ء) میں ایک عرصے تک "حل المطالب" کے نام سے ایک سلسلۂ مضامین نکلتا رہا ہے۔ یہ حضرت بیان کی شرح دیوانِ غالب ہے۔ غالباً یہ شرح کتابی صورت میں آج تک شائع نہیں ہوئی ہے، ورنہ ادب اُردو میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہوتا۔"

(ماہنامہ العصر لکھنؤ بابت اگست و ستمبر ۱۹۱۳ء)

مولانا سید عبدالرزاق راشد مرحوم حیدر آبادی کا بیان ہے :

"حلِ غالب مصنفہ سید مرتضیٰ بیان یزدانی میرٹھی ۔ بیان رسالہ "لسان الملک" نکالتے تھے ۔ اشعارِ غالب کا حل چیدہ چیدہ اس رسالے میں شائع ہوتا تھا ۔ شرح پوری ہوئی یا ادھوری اس کا علم نہ ہو سکا۔" (صفحہ ۵۷ ۔ اصلاحاتِ غالب ۔ مطبوعہ اعجاز پرنٹنگ پریس حیدر آباد دکن ۱۹۶۹ء)

بیان میرٹھی کی یہ شرح غالباً نامکمل ہی رہی ۔ اس کے کچھ سرسری حدود حال کا پتہ چل سکا، جس کا ذکر میں نے اپنے مضمون "دیوانِ غالب کی ابتدائی شرحیں" (مطبوعہ ماہنامہ "صبح نو" پٹنہ ستمبر ۱۹۶۲ء میں کر دیا ہے۔

اگرچہ اس کا کوئی تحریری ثبوت نہیں ملتا لیکن قیاس یہی کیا جا سکتا ہے کہ ۱۸۹۱ء میں جب شوکت رام پور سے ترکِ سکونت کر کے میرٹھ پہنچے تو انہیں میرٹھ کا ایک رچا بسا ادبی ماحول مل گیا اور وہ سید محمد مرتضیٰ بیان کے ساتھ مل جل کر ادبی سرگرمیوں میں کھو گئے۔ اخبار طوطیٔ ہند میرٹھ اور رسالہ "لسان الملک" کے فائل کمیاب ہی نہیں، تقریباً نایاب ہو چکے ہیں اس لئے قطعی طور پر تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ شوکت کا براہِ راست تعلق اُن کے ادارۂ تحریر سے تھا مگر ماضی کے ادبی معرکوں میں جب طوطیٔ ہند ۔ ریاض الاخبار اور اودھ پنچ کا نام لیا جاتا ہے تو شوکت میرٹھی کا ذکر ضرور آ جاتا ہے اور ماضی کے دھندلکوں سے ایک ایسی شخصیت جھانکتی ہوئی نظر آتی ہے جس کا ہلکا سا عکس مولانا راشد مرحوم کے اِن الفاظ میں موجود ہے

"شرحِ غالب ۔ مصنفہ سید احمد حسین شوکت میرٹھی جو اپنے آپ کو "مجددُ السنۂ مشرقیہ" لکھا کرتے تھے، کسی رسالے کے ایڈیٹر تھے ۔ اُس زمانے کے اخباروں اور رسالوں میں آپ کے بلند بانگ دعوے شائع ہوتے تھے کہ اُن کے مانند کوئی شخص عرفی، خاقانی اور غالب کے اشعار کو نہیں سمجھ سکتا۔

اِس شرح (غالب) میں بہت سے اشعار حذف کئے ہیں اور کلامِ غالب پر غلط اصلاحیں دی ہیں۔

(صفحہ ۵۷ ۔ اصلاحاتِ غالب)

بیان میرٹھی آخری عمر میں مراق اور مالیخولیا کا شکار ہو کر دہنی توازن کھو بیٹھے تھے ۔ جب تک سورج کی شعاعیں رہتیں، وہ اندھیرے میں چھپے رہتے تھے ۔ بیان کیا جاتا ہے کہ شوکت اُن کے مقربینِ خاص میں ممتاز مقام رکھتے تھے اور "حل المطالب" کا جو کام بیان نے ادھورا چھوڑ دیا تھا، "حلِ کلیات" کی شکل میں انہیں کے ہاتھوں پایۂ تکمیل تک پہنچا اور "حلِ کلیاتِ غالب" جو بیان میرٹھی کی زندگی میں خود شوکت نے اپنے شوکت المطابع میرٹھ سے اکتوبر ۱۸۹۹ء میں شائع کیا تھا ۔ اس کا ابتدائی تصور بیان میرٹھی کی فکرِ رسا کا رہینِ منت ہے ــــ مگر حقیقت یہ ہے کہ اسے بیان میرٹھی کی شرح سے دُور کا علاقہ نہ تھا ــــ بلکہ اس عہد کے علمی و ادبی ماحول میں اسے شرح کا درجہ بھی نہیں دیا گیا اور جب شوکت نے ایک اعلان کیا تو اُس کا ردِّ عمل بہت ہی سخت ہوا ۔ ہوش بلگرامی لکھتے ہیں

(۴) "شوکت صاحب نے غالب مرحوم کے کلام میں جو تحریفیں کی تھیں اُن کا ظاہر کر دینا تو مجھ پر فرض تھا، اِس لئے کہ صلائے عام (دہلی) اور مخزن (لاہور) وغیرہ میں شوکت صاحب نے "انجمن ترقی اُردو" کو مخاطب کر کے اِس امر کا اظہار کیا ہے کہ ابھی سو شعر غالب کے اور ہیں جو غلط چھپ گئے ہیں اور ہم نے اپنی شرح میں یہ سمجھ کر چھوڑ دئے ہیں کہ دیکھیں کوئی سمجھتا ہے یا نہیں ــــ ؟" (صفحہ ۶۳ ۔ عروسِ ادب)



شوکت [illegible] معنوں میں محقق تھے نہ نقاد ـــــ "مجدّدِ السنۂ مشرقیہ" ہونے کا دعویٰ بھی اُن کا ایک طرح سے خود ستائی تھی، کیونکہ اس شرح میں انہوں نے جا بجا غلط اور بے سروپا حکایتیں بیان کر کے اپنی کم فہمی کی پردہ پوشی بھی کی ہے اور "مجدّدِ لساں" بننے کے لیے لغت کی غلط اور مہمل تعبیرات کی ہیں۔ غالب کے اس شعر کی شرح کرتے ہوئے شوکت نے ایک عجیب و غریب حکایت (بلا کسی حوالے کے) پیش کی ہے ؎

میں مضطرب ہوں وصل میں خوفِ رقیب سے　　ڈالا ہے تم کو وہم نے کس پیچ و تاب میں

فرماتے ہیں اِس سلسلے میں:

(۵) "ہم کو معلوم ہوا ہے کہ جب مرزا غالب نے یہ شعر مشاعرے میں پڑھا تو ختمِ مشاعرہ کے بعد مولوی امام بخش صہبائی مرحوم نے جو ایک مقدس اور متورع بزرگ تھے، مرزا صاحب سے پوچھا کہ آپ نے اِس شعر میں کیا معنی پیدا کیے ہیں۔۔۔؟ مرزا صاحب نے کہا۔۔۔ مولانا آپ اِس شعر کے کیا معنی سمجھیں گے۔ نہ آپ نے کبھی رنڈی بازی کی ۔۔۔ نہ حاتگی بازی نہ امرد بازی کی، نہ فاعل بنے نہ مفعول۔ میں نے تو ایسا ایک واقعہ لکھا ہے۔ یعنی حسن "مسماۃ" پر میں فریفتہ تھا، بڑی بڑی تدبیروں اور چالوں سے اُس کو کسی "کھدرے" میں ڈھب پر چڑھایا۔ مگر اس خوف سے کہ کوئی آ کھڑا ہو گا۔۔۔ "رجولیت" چوہے کے بل میں گھس گئی۔ "مسماۃ" سمجھی کہ۔۔۔ "غالب محض نامرد اور عنین ہے"۔ میں نے معذرت میں یہ شعر پڑھا" (صفحہ ۸۸ ۔ حلِ کلیاتِ مرزا غالب اُردو دہلوی۔ مطبوعہ شوکت المطابع میرٹھ ۱۸۹۹ء)

اب سے چالیس پچاس سال اُدھر اِس قسم کی مبتذل۔ رکیک اور اہانت آمیز حکایت سازی بعض ادبی محفلوں کی جان سمجھی جاتی تھی پھر غالب کی "خوش طبعی" تو اِس انداز سے کی گئی کہ "ناطقہ سر بگریباں ہے ۔۔" یاس یگانہ چنگیزی (وفات ۱۹۵۶ء) نے چراغِ سخن (رسالۂ عروض و قوافی) میں بلا کسی حوالے کے ایک اِسی قسم کی حکایت تحریر فرمائی ہے:

"غالب نے کیا؟ کتنے ہی ہونہار شاعر اس قوتِ متخیلہ کی آزادی اور مطلق العنانی کی بدولت، گمراہ ہو گئے اور بعضے جو گمراہ ہوئے وہ اُس وقت تک راہ پر نہیں آئے جب تک قوتِ ممیزہ کو تخیل پر حاکم نہ بنایا۔ میر تقی میر کیا جوہری شخص تھا مرزا غالب کے شعر سن کر صاف کہہ دیا کہ "اِس لڑکے کو اگر کوئی اُستادِ کامل مل گیا اور سیدھے راستے پر لگا دیا تو لاجواب شاعر بن جائے گا، ورنہ مہمل بکنے لگے گا۔

وہی ہوا کہ غالب نے نہ کسی کو اُستاد بنایا اور نہ راہِ راست پر آئے۔ چنانچہ غالب کے کسی بے تکلف دوست نے یہ مطلع پڑھ کر ازراہِ تمسخر اُن کی بہت تعریفیں کیں ؎

پہلے تو روغنِ گل بھینس کے انڈے سے نکال　　بعد اس کے حُر و گُل بھینس کے انڈے سے نکال

غالب نہایت آزردہ ہوئے ۔۔۔ اور کہا نہ معلوم کس مسخرے نے یہ مطلع میری طرف منسوب کر دیا ہے۔ اِس پر اُن کے مہربان نے فرمایا کہ بھئی بُرا کیوں مانتے ہو، تمہارے شعر تو ایسے ہی ہوتے ہیں ۔۔۔"

(صفحہ ۳۹ ۔ چراغِ سخن مطبوعہ نولکشور لکھنؤ دسمبر ۱۹۲۱ء)

شوکت میرٹھی اور بیان میرٹھی میں بُعد المشرقین تھا۔ یہ اپنے زعمِ خودستائی میں کسی کی ہجو سے بھی دریغ نہیں کرتے تھے اور وہ (بیان) غالب کے پرستاروں میں تھے۔ غالب کے تتبع اور اُن کی [illegible] عظمتوں کو وہ اپنے فکر و فن کی جان سمجھتے تھے۔ غالب کے رنگ میں کہتے تھے اور خوب کہتے تھے ۔۔۔ اُن کے بعض اشعار کا ایک ایک لفظ پکار پکار کر کہتا ہے کہ اگر غالب زندہ ہوتے تو اپنے اِس معنوی شاگرد کو سینے سے لگا لیتے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

اُن کا محلۂ اربابِ وفا ہو جانا　　میرے نزدیک ہے بندے کا خدا ہو جانا



سر شوریدہ بپائے دست بپیا، تمام ویراں تھا — کبھی گھر تھا بیاباں میں، کبھی گھر میں بیاباں تھا

گئے تھے رو بدے دل کو لیے بیٹھے ہیں پہلوؤں کو — فروزِ رگ میں نشترِ پنہاں نفس نفس میں پیکاں تھا

گردشِ آسماں خلاص ہے — آدمی سنگ میں ڈھلنے کے

لیکن شوکت معنی سرشت کے انسان تھے۔ زمانے کے ساتھ چلنے میں اپنی توہین سمجھتے تھے۔ ہمیشہ عام روش سے ہٹ کر چلے جو ان کے نزدیک اُن کی انفرادیت کی رُوح تھی، اسی لئے غالب کی جو شرح انہوں نے لکھی، اُس کا ابتدائی تصور تو شاید میرٹھی کے ذہن و فکر کی پیداوار کہا جا سکتا ہے، اِس کے علاوہ جو کچھ بھی اِس شرح میں ہے، وہ از اوّل تا آخر خود شوکت ہی کی خودتِ طبع کا شاہکار ہے۔

شوکت میرٹھی "طوطیٔ ہند" (ہفت روزہ) کے علاوہ میرٹھ ہی سے ایک ادبی ماہنامہ "پروانہ" بھی نکالتے تھے۔ اُن کی شرح "حلِ کلیاتِ اُردو مرزا غالب دہلوی" سب سے پہلے "پروانہ" میں بالاقساط چھپی تھی۔ میرے پاس "پروانہ" کے کئی شمارے تھے افسوس کہ سب ضائع ہو گئے، صرف ایک بوسیدہ صفحہ تلاش سے ملا ہے جس پر "پروانہ" جلد ۱ تحریر ہے۔ غالباً آخری صفحہ ہے۔ اس کی چند سطروں میں یہ اعلان ہے

"صاحبو ـــــ اس لئے حلِ کلیاتِ غالب" (جو آج تک لغز اور چیستاں سے کم نہیں سمجھا گیا اور کسی نے آج تک اس کے حل کا ارادہ نہیں کیا) بطور کتاب کے معہ جدید طرز کی تحقیق لغت کے شائع ہوتا رہے گا بمنصر ناظرین خود نگاہِ انصاف سے ملاحظہ فرمائیں گے"۔

شوکت کی اس شرح (حلِ کلیاتِ اُردو مرزا غالب دہلوی) میں خماسات سو اشعار کی شرح کی گئی ہے۔ سرِورق پر "شارح" کا نام اِس التزام کے ساتھ دیا گیا ہے:

"شہنشاہِ اقلیمِ سخن۔ مجددِ السنۂ مشرقیہ۔ الواد رلیس۔ مولینا حافظ احمد حسن صاحب شوکت مالک و مدیر اخبار شحنۂ ہند و طوطیٔ ہند و پروانہ ـــــ"

شرح کی ضخامت ۱۴۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ اہتمام پر چودھری گھنشیام سنگھ جلّا "رئیس جید سپنا" کا ایک فارسی قطعۂ تاریخ ہے جس کا آخری شعر ہے ـــ

سالِ تاریخ "جاد" نکتہ شناس
گفت ـ حلِ دقائق الغالب

۱۳۱۷ھ

شوکت ایک خالص کاروباری قسم کے آدمی تھے، جس کا ہلکا سا عکس آپ کو اِس "اعلانِ عام" میں نظر آئے گا جو اس شرح کے آخری صفحے پر شائع کیا گیا ہے:

"جن حضرات کو اُردو۔ فارسی۔ عربی شاعری کی تکمیل کا شوق ہو اور اصنافِ سخن پر قادر ہونا چاہتے ہوں وہ حضرت

ـــــــــــــــــــــــ

۱ ناؔدم صاحب نے یہ صفحہ مضمون کے ساتھ بھیج دیا ہے، افسوس کہ اِس کا عکس یا بلاک پیش کرنا ممکن نہیں۔ (ادارہ)

۲ اس کا ایک نسخہ پروفیسر سید مسعود حسن ادیب (لکھنؤ) کے کتب خانے میں موجود ہے۔ (ناؔدم سیتاپوری)

شاعرِ بیسیؔ



مہتمم لمعۂ مشرقیہ مولانا شوکت کی جانب رجوع لائیں۔
جس پایہ کا شاعر بننا چاہیں گے، کامیاب ہوں گے اور جس درجے کا کلام ہوگا، اُسی درجے کی اصلاح ہوگی انشاء اللہ تعالیٰ۔
یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ شعرائے ہند تکمیلِ فن سے غافل ہیں۔ ہر شخص اپنے حال میں مست ہے اور اپنے کو کامل سمجھتا ہے۔ 1
ہاں۔ ایسے بھی حضرات یقیناً موجود ہیں جن کو تشنگی طلب ہے۔ پس وہ آئیں اور "چشمۂ تحدید" سے سیراب ہوں۔"
(شحنۂ ہند۔ میرٹھ)

ماہنامہ "پرواز" کے جس بوسیدہ صفحے کا ذکر کیا گیا ہے اُس میں شوکت کی ایک غزل بعنوانِ ذیل شائع ہوئی ہے:

"از مجدد الوقت شوکت بجواب غزل حضرت غالب دہلوی"

اس میں پندرہ اشعار ہیں اور تین کالم لکھوائی گئی ہے۔ ثانی اور اولیٰ مصرعے سب گڈمڈ ہو گئے ہیں۔ ہر سطر میں سیدھے سیدھے تین مصرعے ہیں۔ درمیان میں ثانی۔ بیشتر اشعار بے روح اور صرف الفاظ کا مجموعہ ہیں۔ چند اشعار لطور نمونہ پیش کیے جا رہے ہیں ؎

جلوہ افگن ہے مرقع حسنِ عالمگیر کا — آئینہ حیرت سے منہ تکتا ہے ہر تصویر کا
پردہ اے مانی کھلا پیشانیٔ تحریر کا — تابِ رُخ سے جل اُٹھا جو دیر تھی تصویر کا
بند ہے محشر میں ہر شو سلسلہ تقریر کا — شور گوشِ صُور تک پہنچا مری زنجیر کا
لذتِ دستِ نگاہ کے ہوئے دونوں شہید — چل رہا ہے میرے دم کے ساتھ دم شمشیر کا

وسعتِ وحشت سے شوکت تنگ ہے یہ کس قدر
دامِ صحرا بن گیا حلقہ مری زنجیر کا

اُس وقت جب اُس کی شاعرانہ اہمیت "پر سوال آچکا تھا اور ذی علم بزرگ اسے صرف مسخرہ ہیں" سمجھتے تھے، کیونکہ اس کی عبارتوں کا سیاق و سباق اتنا عامیانہ تھا، جو تنقید کیا؟ اس زمانے میں بھی "تنقیص" کے حدود سے متجاوز سمجھا جاتا تھا۔ ہوش بلگرامی نے ایسے ہی متذکرہ مضمون میں جا بجا اس بازاری اور عامیانہ اصطلاحات کا تذکرہ کیا ہے۔ چند نمونے ملاحظہ ہوں

لیتا ہوں مکتبِ غمِ دل میں سبق ہنوز — لیکن یہی کہ رفت گیا اور بُود تھا

شوکت نے اس کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے:

"دل غمِ عشق کا ایک مکتب ہے مگر مجھے اب تک پورا علمِ عشقِ الٰہی حاصل نہیں ہوا۔ ابھی تو "ایرا پھیری" کر رہا ہوں۔ اور درحقیقت یہی بات ہے، کیونکہ ہر شخص کا دل محبتِ الٰہی کی جانب راغب ہونے کی ہدایت کرتا ہے، مگر نفس "اڑان گھائی" بتا دیتا ہے۔ (اجی۔ ابھی تو دودھ کے دانت بھی نہیں جھڑے۔ بڑھاپے میں دیکھ لیا جائے گا) بس غالب اسی کا رونا رو رہا ہے۔" (صفحہ ۶۴۔ عروسِ ادب)

کیا بدگماں ہے مجھ سے کہ آئینے میں مرے — طوطی کا عکس سمجھے ہے زنگار دیکھ کر

شوکت نے اس کی شرح ان الفاظ میں کی ہے:

"یعنی ــــ میں تو اُس کے غم میں کسی قابل نہیں رہا اور وہ بھی بدگماں ہے۔ غالب نے میرے جلانے کو اپنے پاس کوئی "مشٹنڈی" رکھ چھوڑی ہے۔" (صفحہ ۶۵۔ عروسِ ادب)

ہے کس قدر ہلاکِ فریبِ وفائے گُل — بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گُل

شاعر۔ ممبئی



شوکت نے اس مطلع کی شرح کاری کرتے ہوئے لکھا ہے:

" پھول حدہ رل ہیں کہ "ڈھڈو" میرے قریب کا "عیا"، کھا گئی۔ بھلا گُل نے کہیں بُلبل سے وفا کی ہے۔" (صفحہ ۶۵۔ عروسِ ادب)

اِن چند مثالوں سے ظاہر ہے کہ شوکت میرٹھی کی شرح ادبی اور تنقیدی زاویۂ نگاہ کی ترجمان نہیں کہی جاسکتی۔ جہاں تک تحریف و تصرف کا تعلق ہے، غالب کے ابتدائی شرح کاروں میں ایسی بہت سی مثالیں ملتی ہیں کہ جن اشعار کے وہ معنی نہ سمجھ سکے، اُن میں اپنے ذہن و شعور کے سہارے تحریف و تصرف کر کے معنی پہنا دیے۔ شوکت کے یہاں یہ کمزوری عام ہے ــــ اور بعض جگہ تو اُن کے تصرفات اتنے مہمل اور بے معنی ہو گئے ہیں کہ اصل شعر کی ہئیت ہی تبدیل ہو گئی ہے۔

ذیل میں "تحریفات" کی وہ مثالیں پیش کی جا رہی ہیں جنھیں ہوش بلگرامی نے اپنے مجموعۂ مضامین (عروسِ ادب) میں نقل کیا۔

مانعِ وحشت "خرامی" ہائے لیلیٰ کون ہے ــــ خانۂ مجنونِ صحرا گرد بے دروازہ تھا

شوکت نے وحشت خرامی کو "وحشت سرائی" میں بدل دیا ہے۔ تحریر فرماتے ہیں:

" حالی نے اس غزل کو بے معنی لکھ دیا۔ اُن کو شرم نہ آئی کہ اپنے اُستاد کو مہمل قرار دے دیا۔ ہمارے شعرا میں ان کے کلام سمجھنے کی لیاقت نہیں۔"

مولانا حالی کے انتقال کے بعد رسالہ "نظارہ" (میرٹھ) میں تحریر فرماتے ہیں:

" ہم نے حضرتِ حالی کو اسی غزل کی شرح دکھائی۔ حیرت میں رہ گئے اور عذر و معذرت کرنے لگے۔" (صفحہ ۱۸۴)

نہ دیتے "نامے" کو اتنا طول غالب مختصر لکھدے ــــ کہ "حسرت سنج" ہوں عرضِ ستمہائے جدائی کا

شوکت نے مصرعِ اولیٰ میں "نامے" کے بجائے "نالے" اور مصرعِ ثانی میں "حسرت سنج" کو "حیرت سنج" بنا دیا ہے۔

تجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا ــــ بات "کرتے" کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

اس شعر میں صرف ایک نقطہ کم کر کے "کرتے" کو "کرتے" میں تبدیل کیا گیا ہے جس سے پورا شعر مہمل ہو گیا ہے۔

مقصد ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو میں "کام" ــــ چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر

مصرعِ اولیٰ میں "کام" کو بدل کر "نام" تحریف کیا گیا ہے۔

ہے بارِ معلساں زر از دستِ رفتہ پر ــــ "ہوں" گل فروشِ شوخیِ داغِ کہن ہنوز

مصرعِ ثانی میں "ہوں" کی جگہ پر "ہوں" کر دیا گیا ہے۔

ترے خیال سے رُوح "اہتزاز" کرتی ہے ــــ بہ جلوہ ریزیِ باد و بہ پرفشانیِ شمع

مصرعِ اولیٰ کے "اہتزاز" کو "احتراز" میں تحریف کر کے شعر کا مفہوم خبط کر دیا گیا ہے۔

تماشا "کہ" اے محوِ آئینہ داری ــــ تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

اِس شعر کے مصرعِ اولیٰ کو اس طرح پر تبدیل کیا گیا ہے:

" تماشا کر" اے محوِ آئینہ داری

یعنی "کہ" کی جگہ پر "کر" کا تصرف کیا گیا ہے۔

"رَو" میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے

عشق و مزدوریِ "عشرت گہ" خسرو۔ کیا خوب؟

اِن دونوں مصرعوں میں تحریف کی گئی۔ "رَو" کو "رو" ـــ "عشرت گہ" کو "عشرت کدہ" میں تبدیل کر دیا گیا۔



بس کہ روکا میں نے اور سینے میں اُبھریں پے بہ پے
میری آہیں" بخیۂ چاکِ گریباں ہو گئیں

شوکت کی تحریف کے بعد شعر اس صورت میں تبدیل ہو گیا۔

بس کہ روکا میں نے اور سینے میں اُبھریں پے بہ پے
میری "آنکھیں" بخیۂ چاکِ گریباں ہو گئیں

یعنی (آہیں اور آنکھیں) میں جو "ہلکا سا" معنوی فرق تھا، شوکت نے اُسے دُور کر دیا۔

دیتے ہیں جنت حیاتِ دہر کے بدلے
نشہ بہ اندازۂ خمار نہیں ہے

"دہر" کو "عبادتِ دہر" میں بدل کر مصرع ناموزوں کر دیا گیا۔

نہ "پوچھ" سینۂ عاشق سے آبِ تیغ نگاہ
کہ زخمِ روزنِ در "سے" ہوا نکلتی ہے

مصرع میں "پوچھ" کو "پوچھو" اور دُوسرے مصرع میں "سے" "کو" "ہے" میں بدلا گیا ہے۔

غنچہ تا شگفتنہا برگِ عافیت معلوم
باوجودِ دل جمعی خوابِ گُل پریشاں ہے

شوکت میرٹھی نے مصرعِ اُولیٰ میں "تا شگفتنہا" کا ایک نقطہ اُڑا کر اُسے "ناشگفتنہا" سا دیا اور اس کی شرح یہ بیان فرمائی ہے:
"یعنی - کھلنے کا نام ہی غنچہ ہے، لیس سامانِ آسائش کہاں۔" (صفحہ ۵۵ - عروسِ ادب)

اصلاح - تحریف - تصرف! اور وہ بھی غالب کے کلام میں!! یقیناً صحت مند تنقید کے تقاضوں کو پُورا نہیں کرتی۔ غلطیاں غالب نے بھی کی ہیں اور میر نے بھی۔ مصحفی نے بھی۔ سودا نے بھی۔ آتش کے یہاں بھی اِس کی مثالیں ملیں گی اور ناسخ کے یہاں بھی۔ ... کا دامن اغلاط سے پاک ہے نہ دبیر کا ___ لیکن "جدید تنقید" اُصولی حیثیت سے اِس زاویۂ نگاہ سے اتفاق نہیں کرتی کہ تنقید نگاری میں اصلاح کاری کے فن کو سمو دیا جائے۔ پھر شرح نگاری میں "اصلاح کاری" کے معنی کمالات کا مظاہرہ کرنا ایک طرح سے ادبی اور علمی خیانت کا درجہ رکھتا ہے ___ اور شوکت میرٹھی کی شرح اِس معیار پر پُوری نہیں اُترتی بلکہ اُس کے ایک ایک لفظ سے غالب کی عظمتِ فن پر "تحریف" کی چوٹ پڑتی ہے۔

غالب نے اپنے اِس شعر کے معنی "عودِ ہندی" میں بیان کئے ہیں۔ علامہ نظم طباطبائی نے اِس سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ لکھا ہے ___ "میں جب دیوانِ غالب کی شرح لکھ رہا تھا تو یہ شعر دیکھ کر مجھے فکر ہوئی کہ یہ کوئی نسخے کا طرز نہیں ہے، اس میں ضرور تحریف ہوئی ہے۔ خیال میں یہ بات آگئی کہ مرزا غالب "تا" کا استعمال اس طرح بھی کرتے ہیں ع "دیدۂ تا دل اسد آئینۂ یک پرتوِ شوق"۔ وہی "تا" یہاں بھی ہے یعنی ___ غنچہ تا شگفتنہا ___ میری شرح چھپ کر نکل چکی ہے۔ میں مرزا داغ سے بیٹھا ہوا باتیں کر رہا ہوں۔ ایک عنایت فرما یادش بخیر نواب سائل دہلوی دُوسرے کمرے سے اُٹھ کر وہیں آ بیٹھے! وہ شوکت میرٹھی کی شرح میں شاید یہ فقرہ دیکھ چکے تھے۔ "غنچہ کیا ہے ناشگفتنہا ہے"۔ داغ مرحوم کے سامنے حضرت سائل نے اس شعر کو یوں ہی پڑھا "غنچہ ناشگفتنہا" ! مرزا داغ نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا۔ پھر سر اُٹھا کر میری طرف دیکھنے لگے کہ ___ دیکھوں اُس نے (دیکھی) تو شرح لکھی ہے۔ یہ کیا کہتا ہے ___؟ میں نے شعر کو صحیح کر کے پڑھ دیا۔ اس پر جناب سائل نے مجھ سے پُوچھا ہی تھا کہ "ناشگفتنہا" کے کیا معنی ___! کہ مرزا داغ مرحوم بول اُٹھے کہ ___ "تا شگفتنہا" پڑھو"۔

(صفحہ ۳ - اودھ پنچ لکھنؤ شمارہ نمبر ۳۱ جلد نمبر ۱ بابت ۱۹ اگست ۱۹۲۵ء)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

غالب ــــ شاعرِ امروز و فردا

اُردو شاعری کا ایک دَور وہ تھا کہ غزل کو معاملاتِ حسن و عشق اور مسائلِ تصوّف کے بیانات تک محدود سمجھا جاتا تھا اور غزل گوئی بالعموم ایک فرد کی ذوقی خوش فعلیوں سے زیادہ اہمیت نہ رکھتی تھی۔ لیکن انیسویں صدی کے وسط میں جب مرزا نوشہ اور اسد اللہ خاں غالب نے یہ آواز بلند کی کہ شاعری قافیہ پیمائی نہیں معنی آفرینی ہے، محدود کی لڑ نہیں، مطلب و مقصد سے ہم آہنگی ہے، لڑکوں کا کھیل نہیں، دیدۂ بینا کی کسوٹی ہے۔ حمزہ کا قصہ نہیں، قطرہ میں دجلہ کی سمائش ہے۔ قد و گیسو کی آرائش نہیں، دار و رسن کی آزمائش ہے۔ بادہ و ساغر کا تذکرہ نہیں، مشاہدۂ حق کی گفتگو ہے تو اُردو شاعری عموماً اور اُردو غزل خصوصاً ایک نئے جہانِ معنی سے آشنا ہوئی۔ اِس جہانِ معنی کی تعمیر کے لئے غالب کے بعد حالی سامنے آئے۔ حالی کے بعد اقبال اور پھر یہ سلسلہ ایسا چل نکلا کہ اُردو غزل حسن و عشق اور مسائلِ تصوّف سے آگے بڑھ کر سارے افکارِ سنجیدہ اور جملہ مسائلِ حیات کی ترجمان بھی بن گئی۔

غالب کی شاعری اور شخصیت کا مطالعہ بتاتا ہے کہ زندگی اور فن کے بارے میں اُن کے سوچنے کا انداز اور تاریخ ادب کی روش اپنے معاصرین اور اپنے عہد کے مروّجہ اصول و اقدار سے بہت مختلف تھی۔ اُن کا مشاہدہ تیز، ادراک ہمہ گیر اور نگاہ دُور رس تھی۔ ایک وسیع عہد کا نیا تہذیبی دھارا کس طرف جانے والا ہے یا اُسے کس طرف جانا چاہیئے اور آئندہ اُس کے امکانات و اثرات کیا ہوں گے، اُس کے متعلق وہ فیصلہ کُن نتیجے پر بہت پہلے پہنچ گئے تھے۔ اُن کی اِس دُور بینی اور تہذیبی بصیرت کا اندازہ کئی باتوں سے ہوتا ہے۔

غالب کا عہد کہنے کو تو مسلمانوں کا عہد تھا اِس لئے کہ دلی اور لکھنؤ دونوں جگہ مسلمان حکمراں موجود تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ لکھنؤ اور دلی کے مسلمان حکمراں عملاً ایک مدت سے انگریزوں کی نگرانی میں تھے۔ اُن کی آزادی محض دکھاوے کی تھی۔ معاشی و عسکری ڈھانچہ اس قدر کمزور ہوگیا تھا کہ ایک نہ ایک دن انہیں انگریزی سلطنت کا جُزو بننا ہی تھا لیکن کچھ تو تعصّب، تنگ نظری اور کھوئی چیزوں سے بے سبب نفرت اور مرلیضانہ احساسِ برتری نے انہیں خود اپنا اور اپنے مدِمقابل کا صحیح جائزہ لینے اور وقت کے اشاروں کو سمجھنے سے معذور رکھا۔ سیاسی رہنماؤں، فوجی ماہروں اور فلسفیوں سے اس وقت ہمیں سروکار نہیں۔ لیکن اُردو کے بڑے شاعروں میں غالب کے سوا کوئی ایسا نظر نہیں آتا جس نے اس صورتِ حال کو اتنی جلد بھانپ لیا ہو یا کھوکھلی انانیت کے خول سے ذرا دیر کے لئے باہر نکل کر خارجی حقائق پر غور کیا ہو۔ غالب کے یہاں بدلتے ہوئے سیاسی حالات کا احساس اور وقت کی بدلتی ہوئی کروٹوں کا شعور اوائلِ عمر ہی سے ملتا ہے۔ غالب ۱۸۲۸ء میں تقریباً اکتیس بتیس سال کی عمر میں اپنی پنشن کے قضیے میں کلکتہ گئے تھے۔ یہ انگریزی عملداری کا مرکز تھا۔ آپ کا عروج اس کا معاشرتی نظام، اُس کی تہذیبی زندگی اور اُس کے اداروں کی



رونق دلی اور لکھنؤ سے بہت مختلف تھی۔ ہر چند کہ غالب کو کلکتہ کے قیام میں ادبی معرکوں کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ کلکتے کے اکثر شعرا اُن کے حریف بن گئے اور اس سلسلے میں وہ کچھ دنوں تک ذہنی اُلجھن میں بھی گرفتار رہے اور پنشن کی بحالی کا کام بھی نہ ہو سکا۔ پھر بھی وہ کلکتے کی نئی تہذیبی زندگی سے بدگماں نہیں ہوئے۔ بلکہ ایک وسیع النظر فرد کی حیثیت سے وہاں کی سیاسی و معاشرتی تنظیم کے متعلق اچھے خیالات و تاثرات لے کر واپس ہوئے اور ایک فارسی خط میں مولوی سراج الدین احمد کو یہاں تک لکھ دیا کہ —

"اگر میں عنفوانِ شباب میں وہاں گیا ہوتا اور شادی و خانہ داری کی ذمہ داریاں میری راہ میں حائل نہ ہوتیں تو مدت العمر کے لئے کلکتے ہی میں رہ جاتا۔"

غالب کے یہ اشعار بھی اسی سفر کلکتہ کی یادگار ہیں ؎

کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں　　اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے
وہ سبزہ زار ہائے مطرا کہ ہے غضب　　وہ نازنیں بُتانِ خود آرا کہ ہائے ہائے
صبر آزما وہ اُن کی نگاہیں کہ حف نظر　　طاقت رُبا وہ اُن کا اشارا کہ ہائے ہائے
وہ میوہ ہائے تازہ و شیریں کہ واہ واہ　　وہ بادہ ہائے ناب گوارا کہ ہائے ہائے

غالب رسیدہ ایم بہ کلکتہ و رسے　　از سینہ داغ دوریٔ احباب شستہ ایم

یہ تو محض اُن کے تاثرات ہیں لیکن یہی تاثرات آگے چل کر اُن کا نقطۂ نظر بن گئے۔ چنانچہ ۱۸۴۷ء میں جب انیسویں صدی کے سب سے بڑے تجدد پسند اور ترقی پسند مفکر و ادیب سر سید احمد خاں نے آئینِ اکبری کو نئے ڈھنگ سے مرتب کیا اور غالب سے اس پر تقریظ لکھنے کی فرمائش کی تو انہوں نے سر سید کے اس کام کو اُن کی رجعت پسندی اور مُردہ پروری سے تعبیر کیا۔ مثنوی کی صورت میں تقریظ تو لکھ دی لیکن ان کے انداز نظر پر انہیں یہ کہہ کر ٹوکا بھی کہ "ابھی آپ پرانے آئین جہاں بانی کی ترتیب و تصحیح میں لگے ہوئے ہیں حالانکہ زندگی کا نیا آئین کلکتے تک پہنچ گیا ہے اور بہت جلد وہ پاک و ہند کی ساری زندگی کو اپنی گرفت میں لے لیگا۔" چنانچہ انہوں نے اپنی منظوم فارسی تقریظ میں سائنس کی بہم پہنچائی ہوئی بعض سہولتوں مثلاً دخانی انجن۔ ریل گاڑی۔ تار ڈاک کے نظام۔ جہاز رانی۔ ماچس کی تیلی۔ گراموفون۔ بجلی کی روشنی۔ ٹیلیفون۔ چھاپہ خانہ اور کاشت کاری و صنعت کے نئے آلات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نئی تہذیب کی آمد کا مژدہ سنایا اور پرانے بادشاہوں کے نظامِ حکمرانی کی اشاعت و ترویج کو نامستحسن قرار دیا۔ اس تقریظ کے چند اشعار دیکھئے ؎

گر ز آئیں می رود با ما سخن　　چشم بکشا و اندریں دیر کہن
صاحبانِ انگلستاں را نگر　　شیوہ و اندازِ ایناں را نگر
تا چہ آئیں ہا پدید آوردہ اند　　آنچہ ہرگز کس ندید آوردہ اند
زیں ہنرمنداں ہنر بیشی گرفت　　سعی بر پیشینیاں پیشی گرفت
حق ایں قوم است آئیں داشتن　　کس نیارد ملک بہ زیں داشتن
داد و دانش را بہم پیوستہ اند　　ہند را صد گونہ آئیں بستہ اند
آتشے کز سنگ بیروں آورند　　ایں ہنرمنداں زخس چوں آورند



تا چہ افسوں خواندہ اند ایناں کہ آب — دود کشتی را ہمی راند در آب
گہ دخاں کشتی بہ جیحوں می برد — گہ دخاں گردوں بہ ہاموں می برد
نغمہ ہا بے زخمہ از ساز آورند — حرف چوں طائر بپرواز آورند
ہاں نمی بینی کہ ایں دانا گروہ — در دو دم آرند حرف از صد گروہ
رو بہ لندن کاندراں رخشندہ باغ — شہر روشن گشتہ در شب بے چراغ
کاروبارِ مردمِ ہشیار بیں — در ہر آئیں صد نو آئیں کار بیں
پیش ایں آئیں کہ دارد روزگار — گشتہ آئینِ دگر تقویم پار
مردہ پروردن مبارک کار نیست — خود بگو کاں نیز جز گفتار نیست

یہ خیال کرنا کہ یہ باتیں وہ کسی مصلحت سے کہہ رہے تھے، درست نہ ہوگا۔ حق یہ ہے کہ اُن میں زندگی کی نئی قدروں کو خوش آمدید کہنے اور انہیں اپنی زندگی کا محور و سانچہ بنانے کا خاص مادہ تھا۔ اس وقت قومی زندگی کا آغاز نہ ہوا تھا کہ وہ اقبال کی طرح یہ نصیحت کرتے کہ

آئین نو سے ڈرنا طرزِ کہن پہ اڑنا — منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

لیکن اس سے انکار نہیں کہ اُن کی رجائی طبیعت زندگی کے مستقبل سے کبھی مایوس نہیں ہوئی، تبھی تو کہتے ہیں

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب — آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی

وہ یہ سمجھتے تھے کہ فرد ماحول کا مخلوق اور پروردہ ہوتا ہے اور زندگی کی مروجہ اقدار و روایات سے یکسر قطع نظر کر کے زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ لیکن ساتھ ہی وہ یہ بھی جانتے تھے کہ کارِ پیمبری کا منصب جو کہ صرف انسان کا مقدر ہے، محض تقلید و پیروی سے میسر نہیں آتا۔ اس کے لئے ماحول سے ستیزہ کاری اور بغاوت ناگزیر ہو جاتی ہے۔ چنانچہ زندگی کے اس نکتے کو وہ ہمیں اور آپ کو حضرت ابراہیمؑ کی مثال دے کر سمجھاتے ہیں

با من میاویز اے پدر فرزندِ آذر را نگر — ہر کس کہ شد صاحب نظر دینِ بزرگاں خوش نکرد

اس سے بھی انکار نہیں کہ دوسروں کی طرح غالب بھی ماحول کے پابند رہے پر بہت کچھ مجبور ہے اور اُن کی شخصیت اور فن میں کہیں کہیں ماحول کے زیرِ اثر تقلیدی رجحانات بھی ملتے ہیں۔ لیکن اُن کی شخصیت اور شاعری کا قوی ترین رجحان وہی ہے، جسے ہم روایت سے بغاوت اور ماحصر سے بے اطمینانی اور تقلید سے بیزاری کا نام دے سکتے ہیں۔ اس رجحان کے نشانات اُن کے کلام اور زندگی دونوں میں جگہ جگہ ملتے ہیں، اس کی ایک دو مثالیں دیکھئے۔ نواب انوار الدولہ شفق کے نام ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک مرتبہ شاعر کی حیثیت سے اس کے قائل ہیں کہ

"اساتذہ کے کلام کے مشاہدے میں اگر کوئی رہے تو ہزار ہا بات نئی معلوم ہوتی ہے اور انسان کی نظر میں واقعی ادبی وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔"

لیکن کسی کے رنگِ کلام کی تقلید سے انہیں سخت نفرت ہے، چنانچہ قدر بلگرامی کو لکھتے ہیں۔

"تحریر میں اساتذہ کا تتبع کرو نہ مغل بچے کا۔ بچے کا تتبع بھانڈوں کا کام ہے نہ کہ دبیروں اور شاعروں کا۔ ایسے تتبع کو میرا سلام۔"

ہر چند کہ شروع میں انہوں نے خود بیدل، شوکت اور اسیر کا تتبع کیا۔ لیکن بہت جلد اس سے تائب ہو گئے اور اردو شاعری میں ایک بالکل منفرد لہجے کو جنم دیا۔ اس انفرادی لہجے کی تخلیق و استواری میں وہ کسی کی تقلید سے کسی حد تک بچنے کی کوشش



شاعری [illegible]

کرتے تھے۔ اس کا اندازہ تفتہ کے نام ایک خط سے لگایا جا سکتا ہے۔ لکھتے ہیں:

"کیا ہنسی آتی ہے کہ تم مانند اور شاعروں کے مجھ کو بھی یہ سمجھتے ہو کہ استاد کی غزل یا قصیدہ سامنے رکھ لیا یا اس کے قوافی لکھ لیے اور ان قافیوں پر لفظ جوڑنے لگے۔ لاحول ولا قوۃ"

اس کے برعکس وہ نئی چیزوں کو اپنانے اور انہیں کلام میں راہ دینے کے لئے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ الفاظ اور خیالات دونوں کو اپنانے میں یہ روش قائم تھی۔ چنانچہ انگریزی عملداری اور مغربی علوم و فنون کے زیر اثر جب اردو میں بعض نئے الفاظ و اصطلاحات کا دخل ہوا اور بعض رجعت پسندوں نے ایسے الفاظ کو ٹکسال سے باہر قرار دیا تو قدر بلگرامی کو ایسا نقطۂ نظر اس طور پر لکھ کر بھیجا:

"جیالی لغت انگریزی ہے۔ اس رسالے میں اس اسم کا شعر میں لانا جائز ہے بلکہ مزا دیتا ہے۔ تار بکلی اور روحانی جہاز کے مضامین میں نے اپنے یاروں کو دیئے ہیں۔ اوروں نے بھی باندھے ہیں۔ رنگکاری اور طلبی۔ وضعداری اور سررشتہ داری خود یہ الفاظ میں نے باندھے ہیں۔"

فرسودہ خیالات و روایات سے دامن بچا کر چلنے اور تازہ ترین میلانات و اقدار کو اپنا لینے کی اس روش خاص کا یہ اثر ہوا کہ ان کی سخن گوئی کا انداز بہ لحاظ مضامین و اسلوب اپنے عہد کے مروجہ انداز غزل گوئی سے بہت الگ ہو گیا، اتنا الگ کہ وہ اپنے دور کے لئے بڑی حد تک غیر مانوس اور اجنبی ہو گیا۔ اتنا اجنبی کہ بعض نے اپنی کوتاہ نظری سے انہیں مہمل گو قرار دیا اور بعض نے انہیں طرز بیدل کا ناکام مقلد ٹھہرایا۔ مولوی عبدالقادر رام پوری نے کبھی یہ شعر سنا کر

پہلے تو روغن گل بھینس کے انڈے سے نکال
پھر دوا جتنی ہے گل بھینس کے انڈے سے نکال

ان کی شاعری کا مذاق اڑایا۔ حکیم آغا جان عیش نے اس قسم کے اشعار کے ذریعے

زبان میر سمجھے اور زبان میرزا سمجھے
مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

ان کے کلام کو لغو اور بے معنی گردانا۔ لیکن اپنی ذات و صفات کا اعتماد و عرفان انہیں ہر قسم کی مخالفت سے آگے لے گیا۔ اور وہ اپنے حریفوں کو بڑی بے نیازی سے اس قسم کا جواب دیتے رہے کہ

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

اور اس ادعا کے ساتھ کہ ان کے کلام کو بہرحال قبول عام حاصل ہوگا، آج نہ سہی کل سہی۔ زندگی میں نہ سہی مرنے کے بعد

کوکبم را در عدم اوج قبولے بودہ است
شہرت شعرم بگیتی بعد من خواہد شدن

اس جگہ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ آج ہم اور آپ غالب کی جس شاعری کو عربی، فارسی اور دوسرے علوم مشرقی سے ناواقفیت کے باوجود سمجھ لیتے ہیں اور لطف اندوز ہوتے ہیں اور اس کے نکات و امکانات کا حسب مقدور جائزہ بھی لیتے ہیں، آخر اس کے عہد کے لوگ اس کی داد کیوں نہ دے سکے اور اس فراخ دلی سے اس کے کمالات کا اعتراف کیوں نہ کر سکے جس کے وہ مستحق تھے۔ یہ کہنا کہ وہ علم و فضل میں ہم سے، آپ سے یا خود غالب سے کمتر درجے کے لوگ تھے درست نہیں ہے۔ وہ اپنے عہد کے علوم متداولہ سے خوب واقف تھے۔ عربی، فارسی۔ قواعد، عروض۔ منطق و نجوم۔ علم بیان و بدیع و فلسفہ و ملت کی تعلیم اس زمانے کے نظام تعلیم میں عام تھی اور کم و بیش ہر شخص ان سے واقف تھا۔ ان علوم کی علمی اصطلاحات و عادات پر ان کی نظر گہری تھی اور اس لحاظ سے فکر و فن کی جن باریکیوں کو وہ دیکھ سکتے تھے ہم آپ اس کا دعویٰ بھی نہیں کر سکتے۔ جب یہ سب کچھ تھا تو پھر آخر وہ کون سے اسباب تھے کہ غالب کے معاصرین ان کو اور ان کی شاعری کو سمجھنے سے



قاصر رہے۔ مجھے اس کے اعصابی کے دو سبب نظر آتے ہیں۔ ایک یہ کہ مکروض کے باب میں غالب کا سا شعور اپنے اکثر معاصرین سے ذرا مختلف تھا اس سے بڑھ کر یہ کہ وہ اس شعور کے اظہار میں حد درجہ بے باک واقع ہوئے تھے اور اسی بے باکی نے ان کے اکثر احباب و معاصرین کو ان سے بدگمان و ناراض کر دیا۔ ہندو پاک و ہند میں کیسے کیسے عربی و فارسی کے فاضل علما اور شعرا گذرے ہیں لیکن غالب کسی کو تسلیم نہ کرتے تھے۔ تفتہ کو لکھتے ہیں کہ:-

"اہلِ ہند میں سوائے خسرو دہلوی کے کوئی مسلّم الثبوت نہیں میاں فیضی کی بھی کہیں کہیں ٹھیک نکل جاتی ہے۔"

سرور کو لکھتے ہیں کہ:-

"حضرت کو یہ معلوم ہے کہ میں اہلِ زبان کا پیرو اور ہندیوں میں سوائے امیر خسرو دہلوی سب کا منکر ہوں۔"

نواب انوار الدولہ شفق کو ممتاز ترین فارسی شاعروں، لغت نگاروں اور انشا پردازوں کے متعلق ایک خط میں یہاں تک لکھ دیا کہ

"یہ لوگ راہِ سخن کے غول ہیں۔ آدمی کے گمراہ کرنے والے فارسی کو کیا جانیں، ہاں طبع موزوں رکھتے تھے، شعر کہتے تھے۔"

اسی قسم کی رائے کا اظہار صاحب عالم مارہروی کے نام ایک خط میں کیا ہے۔ لکھتے ہیں:-

"اصلِ فارسی کو اس کھتری بچے قتیل علیہ و ما علیہ نے تباہ کیا۔ رہا سہا غیاث الدین رامپوری نے کھو دیا۔ واللہ نہ قتیل فارسی شعر کہتا ہے نہ غیاث الدین فارسی جانتا ہے۔ اس کھتری بچے اور اس معلّم سے مجھ کو کمتر جانو۔ غور کرو، سمجھو، عبدالواسع پیغمبر نہ تھا۔ قتیل ولی نہ تھا۔ واقف غوث الاعظم نہ تھا۔"

صاحب "برہانِ قاطع" کو اس سے بھی زیادہ برے الفاظ میں یاد کیا ہے، لکھتے ہیں کہ وہ

"لغو ہے، پوچ ہے، پاگل ہے، دیوانہ ہے۔ وہ تو یہ بھی نہیں جانتا کہ یائے اصلی کیا ہے اور یائے زائدہ کیا ہے۔ حیران ہوں کہ اس کی حساب داری میں فائدہ کیا ہے۔"

اس کے برعکس فارسی زبان اور شاعری کے سلسلے میں اپنے متعلق اکثر جگہ یوں اظہار کیا ہے:-

(۱) "مبدا فیاض کا مجھ پر احسانِ عظیم ہے۔ ماخذ میرا صحیح اور طبع سلیم ہے۔ فارسی کے ساتھ ایک مناسبتِ ازلی و سرمدی لایا ہوں۔"

(۲) "فارسی میں مبدا فیاض سے مجھے وہ دستگاہ ملی ہے کہ اس زبان کے قواعد و ضوابط میرے ضمیر میں اس طرح جاگزیں ہیں جیسے فولاد میں جوہر۔"

(۳) گر شعر و سخن بہ دہر آئیں بودے		دیواں مرا شہرت پرویں بودے
غالب اگر ایں فن سخن دیں بودے		آں دیں را ایزدی کتاب ایں بودے

ریختہ گوئی کے سلسلے میں بھی وہ اپنے معاصرین پر چوٹ کرنے سے ہرگز نہ چوکتے تھے۔ استاد شیخ محمد ابراہیم ذوق پر انہوں نے ایک دفعہ اس انداز سے حملہ کیا۔

بنا ہے شہ کا مصاحب، پھرے ہے اتراتا		وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

غالب نمبر ۶۹ء

شاعر



بہادر شاہ ظفر کے ... سہرے کا یہ مقطع

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں
دیکھیں کہہ دے کوئی اس سہرے سے بڑھ کر سہرا

دلّی اور ... بہادر شاہ دونوں کو ناراض کیا۔ ایک فارسی قصیدے میں ذوق کی بزرگی کو اس طور
طنز کا نشانہ بنایا ہے

اے کہ در بزم شہنشاہ سخن رس گفتہ ای | کہ بہ ہیرگوئی فلاں در شعر ہم سنگ من است
نیست نقصاں یک دو جزو است از سواد ہمیتہ | کاں دو رم برگے ز نخلستان فرہنگ من است
در سخن چوں ہم زباں و ... ایں من نہ | چو دلت را ہیچ و تاب از رنگ آہنگ من است
راست می گویم من و از راست سر نتوانی کشید | ہرچہ در گفتار فخر تست آں ننگ من است

... اور شعر کے سلسلے میں غالب کی متذکرہ باتوں نے اُن کے زمانے کے بیشتر علما و فضلا اور شعرا ... کو اُن سے ناراض کر دیا ... برصغیر پاک و ہند کے ایک بہت بڑے حلقے نے اُن کے کمالات فن کے بارے میں سکوت اختیار کر لیا۔ قدیم تذکروں سے لے کر مولانا محمد حسین آزاد کی آبِ حیات تک اُن کا ذکر آیا ہے، لیکن اس اہتمام و التزام سے نہیں جس کے وہ مستحق تھے۔ اُن کے بعض معاصر شعرا خصوصاً شیخ ابراہیم ذوق اور مومن وغیرہ اُن سے بہتر الفاظ میں یاد کئے گئے ہیں۔

لیکن اپنے عہد میں غالب کی نامقبولیت کا صرف یہی ایک سبب نہیں تھا۔ جہاں اُن کے حریفوں اور مخالفوں کا بڑا گروہ تھا وہاں اُن کے شاگردوں اور قدر دانوں کا حلقہ بھی خاصا وسیع تھا۔ اُن کے ذاتی مراسم و روابط ہر علاقے کے نامور افراد سے تھے اور شاعر کی حیثیت سے نہ سہی شخصی حیثیت سے بہت سے افراد اُن سے تعلق خاطر رکھتے تھے۔ سچ بات یہ ہے کہ اُن کی نامقبولیت میں دراصل اُن کے اسلوب اور فکر کا بھی بڑا ہاتھ تھا۔ بات یہ ہے کہ زندگی اور ادب دونوں کے بارے میں ... کا ذہنی رویّہ اور فنی برتاؤ اپنے معاصرین کے مقابلے میں کچھ اتنا مجدّدانہ اور اپنے عہد سے اتنا آگے تھا کہ اُن کے زمانے کے لوگ اُن کے فکر و فن کی قیمت کا صحیح اندازہ بروقت نہ کر سکے۔ جن لوگوں نے غالب کی شخصیت اور کلام کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ تجدد پسندی غالب کے مزاج کا خاصہ تھی۔ روشِ عام سے ہٹ کر چلنے اور ہر بات میں ایک نئی بات پیدا کرنے کا، اور زندگی و ادب کے سلسلے میں مروّجہ اصول و رسوم کے مقابلے میں اختراع و بغاوت سے کام لینے کا رجحان اُن میں طبعی تھا۔ ... اسی رجحان کے طفیل جتنی دُور تک وہ اپنے عہد اور اپنے عہد کے پیچھے کی طرف دیکھ سکتے تھے اُس سے کہیں زیادہ دُور تک وہ اپنے عہد کے آگے بھی دیکھ سکتے تھے۔ گویا اُن کی نظر صرف ماضی و حال پر نہ تھی بلکہ اس سے آگے بڑھ کر مستقبل کو بھی دیکھ لینے کے لئے بے تاب تھی۔ مولانا حالی نے اُن کی اس عہد آفریں صلاحیت اور ابداعی قوت کو اور جدت کو ... کا نام دیا ہے اور اُن کے نزدیک اور جدت کا مدعی صرف ایسا شخص ہو سکتا ہے جو زندگی کے ہر شعبے میں شارع عام سے ہٹ کر اپنے لئے نیا راستہ بنانے اور اپنے عہد کو ایک راستہ دکھانے کی کوشش کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس نئے راستے کا تعلق عموماً ماضی و حال سے نہیں، مستقبل ہی سے ہوتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو پھر اسے نیا راستہ کہنا مشکل ہوگا۔ غالب چونکہ اُردو شاعری میں ایک بالکل نئی راہ کے مخترع ہیں، اس لئے یہی کہنا پڑتا ہے کہ وہ صرف اپنے عہد کے شاعر نہیں بلکہ شاعر امروز و فردا بھی ہیں اور آج اُن کی جتنی قدر دانی ہو رہی ہے امکان اس کا ہے کہ کل اس سے بھی زیادہ ہوگی۔

غالب کا یہ اسلوب جس نے انہیں اپنے دَور میں عموماً نامقبول و نامطبوع رکھا اور جس نے سو سال بعد انہیں اُردو کے سارے غزل گو شعرا سے بلند و ممتاز کر دیا، زبان و خیال اور مواد و موضوع ہر لحاظ سے اُردو میں یکسر ابداعی و مجددانہ ہے۔ اس سے پہلے ہم بیان کر چکے ہیں کہ شعر و سخن سے غالب کا مقصود قافیہ پیمائی نہیں، معنی آفرینی تھا۔ اسی لئے اُن کے



یہاں بعض دوسرے شعراء کی طرح معانی الفاظ یا زبان کے پابند نہیں رہتے، بلکہ اقبال کی طرح ان کی زبان ہمیشہ خیالات و موضوعات کی پابند ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صرف خیال و فکر کے اعتبار سے نہیں بلکہ زبان کے نئے برتاؤ یا ڈکشن کے لحاظ سے بھی غالب اپنے عہد اور مابعد کے سارے شاعروں سے بالکل الگ ہیں۔ انہوں نے نہ کبھی طرح پر غزل کہنے کو اختیار سمجھا اور نہ قافیوں کو سامنے رکھ کر شعر جوڑنے کو کمالِ شاعری جانا۔ نہ تو اردو شاعری کی مقبول ترین روش رعایتِ لفظی یا دوسری صنعتوں کو حسنِ کلام میں شمار کیا اور نہ کسی رنگِ کلام کی پیروی کو تخلیقِ فن کے لئے مستحسن و مفید قرار دیا۔ اس کے باوجود ان کے یہاں زبان و بیان کی ساری خوبیاں موجود ہیں۔ بعض خوبیاں صنائع لفظی و معنوی کے تحت بھی آتی ہیں۔ لیکن حق یہ ہے کہ یہ چیزیں ان کے یہاں شعوری نہیں لاشعوری ہیں۔ مصنوعی نہیں فطری ہیں۔ اسی لئے اوّل تو ہمیں اُن کے اشعار میں اس قسم کی صنعتوں کا احساس تک نہیں ہوتا اور احساس ہوتا ہے تو یہ احساس شعر کو کچھ اور معنی خیز و لطف انگیز بنا دیتا ہے۔ چنانچہ غالب نے یہ جو دعویٰ کیا ہے

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے — جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

بے سبب نہیں کیا۔ ان کا سارا کلام اسی خوبی کا مصداق ہے۔ ذیل کے دو تین اشعار دیکھئے۔

شورِ پندِ ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا — آپ سے کوئی پوچھے تم نے کیا مزا پایا

عرض کیجے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں؟ — کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

تم ایسے کہاں کے تھے کھرے داد و ستد کے — کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور

پہلے شعر میں "شور" کا لفظ دو معنی میں ہے۔ شور بمعنی شور و غل سے پندِ ناصح کی ناخوشگواری کا پہلو نکلتا ہے اور شور بمعنی کھاری پن سے زخم پر نمک چھڑکنے کا جواز پیدا ہوتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو شعر نامربوط اور غیر مدلل ہوتا۔ ظاہر ہے کہ شعر میں یہ حسن "شورِ پندِ ناصح" – زخم اور نمک چھڑکنا کی باہم رعایتوں سے پیدا ہوا ہے، لیکن یہ لفظی رعایتیں نہ کلام کا عیب بنی ہیں اور نہ قاری کو ان کا فوری احساس ہوتا ہے۔ ہاں جس وقت شعر کے معنی اور الفاظ کے تلازم پر غور کیا جاتا ہے تو لفظ و معنی کی یہ حسین پیوستگی ذوقِ شعر و نقد کو خود بخود گدگدانے لگتی ہے۔ یہی کیفیت دوسرے اور تیسرے شعر کی ہے۔ "عرض" کا لفظ "جوہر" کی رعایت سے لایا گیا ہے۔ غالب نے جہاں کہیں اس لفظ کو استعمال کیا ہے جوہر کی رعایت ملحوظ رکھی ہے لیکن اس انداز سے کہ قاری عموماً اس کی موجودگی سے بے خبر رہتا ہے، لیکن معنی پر غور کرنے سے "جوہر" کی رعایت شعر کے معنی کو تہہ دار بنا دیتی ہے۔ تیسرے شعر میں "تقاضا" کے لفظ کے ساتھ "داد و ستد" اور "کھرے" کے الفاظ نہ ہوتے تو اردو کے روزمرّہ کے لحاظ سے اس کا استعمال بر محل اور مفید مطلب نہ ہوتا، لیکن جہاں بھی غالب نے الفاظ کے التزام کو اس طرح برتا ہے کہ قاری کی نظر پہلے صنعتِ الفاظ پر نہیں جاتی، بلکہ معنی پر غور کرنے کے بعد اس کا احساس ہوتا ہے۔ غالب کی شاعری کو گنجینۂ معنی کا طلسم بنانے میں اس کو بڑا دخل ہے۔ وہ کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معنی بھر دینے کی خاص شعریت رکھتے ہیں اور اس صلاحیت سے اکثر کام بھی لیتے ہیں۔ یہ مانا کہ ایجاز نویسی کا یہ وصف دوسروں کے یہاں بھی نظر آتا ہے اور ہر شاعر کے یہاں دس پانچ شعر ایسے مل جاتے ہیں جن پر الفاظ قلیل اور معنی کثیر کا اطلاق ہوتا ہے لیکن غالب کا تو گویا سارا اردو دیوان اسی مخصوص صفت کا حامل ہے۔ اور یہ ہے کہ وہ اپنے کلام میں اکثر جگہ

[illegible]



پورے پورے فقرے اور بعض لمبی لمبی عبارتیں محذوف کر جاتے ہیں اور اس خاص انداز سے کہ قاری یا سامع کا ذہن خود بخود اس خلا کو پُر کر لیتا ہے۔ طرزِ بیان کی اِس خوبی کا نام اصطلاح میں "مقدّر" ہے۔ غالب نے اپنی اِس خوبی کا ذکر [illegible] اس طور پر کیا ہے۔

"میرا فارسی دیوان جو دیکھے گا، وہ جانے گا کہ جملے کے جملے مقدّر چھوڑ جاتا ہوں۔"

اُن کے اِس قول کا اطلاق صرف اُن کے فارسی دیوان پر نہیں، اُردو دیوان پر بھی ہوتا ہے۔ صرف دو تین شعر بطور مثال دیکھئے ؎

مجھ تک کب اُن کی بزم میں آتا تھا دورِ جام   ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی، نہ طور پر   دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم   گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

اِن اشعار میں بہت سی باتیں مقدّر ہیں لیکن اس خوبی کے ساتھ کہ قاری کا ذہن انہیں اپنی طرف سے اخذ کر لیتا ہے۔

زبان و بیان کی اور کئی خصوصیات غالب کو دوسروں سے ممتاز کرتی ہیں۔ مولانا حالی نے یادگارِ غالب میں ان خصوصیات سے بحث کرتے ہوئے غالبؔ کی ندرتِ تشبیہ و استعارہ، اشعار کے دو معنوی لہجے، ان کی ایجاز نویسی کو خاص طور پر سراہا ہے لیکن غالبؔ کے اختراعی لہجے میں اُن کے طنزیہ اور استفہامیہ طرزِ کلام کو بھی بڑا دخل ہے۔ یہ دونوں چیزیں اُن کے کلام پر حاوی ہیں اور انہیں کی بدولت ان کا کلام فلسفیانہ طرزِ فکر کی گیرائی اور گہرائی اور ظریفانہ اسلوب کی چاشنی و شوخی سے ہم آہنگ ہوا ہے۔ ہم اُن کے استفہامیہ لب و لہجہ اور طنزیہ پہلو پر الگ الگ مقاموں میں مفصّل بحث کر چکے ہیں، اس لئے ان کی تفصیل میں جانا اس جگہ مناسب نہیں، لیکن زبان و بیان کی یہ خوبیاں ہی سب کچھ نہیں ہیں۔ اِس طرح کی خوبیاں تو شاید تلاش کے بعد دوسرے شعرا کے یہاں بھی مل جائیں گی۔ اِن سے بڑھ کر جو چیز غالبؔ کو اُردو غزل کا مجددِ اعظم کہلواتی ہے اور جس میں کوئی دوسرا اُن کا شریک و سہیم نظر آتا نہیں وہ اُن کے فکر و خیال کی تازگی و ندرت ہے۔ ایسی تازگی اور ایسی ندرت جو گردشِ ماہ و سال اور کہنگی کے اثر سے نہ صرف محفوظ ہے بلکہ امکان اس کا ہے کہ جیسے جیسے انسانی شعور بالغ و پختہ ہوتا جائے گا، افکارِ غالبؔ کی تازگی اور ان کے اسلوب کی رعنائی کچھ اور نکھرتی محسوس ہوگی۔ افسوس کہ مضمون کی طوالت تفصیل میں جانے سے منع کرتی ہے اس لئے ان کے تجددِ فکر کے ثبوت میں بلا تبصرہ کچھ اشعار نقل کئے جاتے ہیں ؎

بسکہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیرِ پا   موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

ہوائے سیرِ گل، آئینۂ بے مہریِ قاتل   کہ اندازِ بخوں غلطیدنِ بسمل پسند آیا

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسد   سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا



غنچہ پھر لگا کھلنے آج ہم نے دل اپنا
خوں کیا ہوا دیکھا، گم کیا ہوا پایا

سادگی و پرکاری، بیخودی و ہشیاری
حسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

دہر میں نقشِ وفا وجہِ تسلی نہ ہوا
ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

ہوگا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا
حبابِ موجۂ رفتار ہے نقشِ قدم میرا

جلوہ پیدا کر بہار سکی
یمیں زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا
میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

کرگیا ناصح نے ہم کو قید اچھا یوں سہی
یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا
بحر گر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے اُدھر ہوتا کاش کہ مکاں اپنا

دردِ دل لکھوں کب تک جاؤں اُن کو دکھلا دوں
انگلیاں فگار اپنی خامہ خونچکاں اپنا



نفس نہ انجمنِ آرزو سے باہر کھینچ — اگر شراب نہیں انتظارِ ساغر کھینچ

حُسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد — بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا میرے بعد

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں — جی خوش ہوا ہے راہ کو پُرخار دیکھ کر

تماشائے گلشن تمنائے چیدن — بہار آفرینا گنہگار ہیں ہم

شوریدگی کے ہاتھ سے ہے سر وبالِ دوش — صحرا میں اے خدا کوئی دیوار بھی نہیں

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود — قبلے کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں — کافر ہوں گر نہ ملتی ہو لذت عذاب میں

دیر و حرم آئینۂ تکرارِ تمنا — واماندگیٔ شوق تراشے ہے پناہیں

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں — موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم — گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

یعنی بحسبِ گردشِ پیمانۂ صفات — عارف ہمیشہ مستِ مئے ذات چاہئے

رونے سے اور عشق میں بے باک ہو گئے — دھوئے گئے ہم ایسے کہ بس پاک ہو گئے

تب نازِ گراں مایگیٔ اشک بجا ہے — جب لختِ جگر دیدۂ خوں بار میں آوے

[illegible]ت گر ناموس نہ ہو گر ہوسِ زر — کیوں شاہدِ گل باغ سے بازار میں آوے

رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل — جو آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب — آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی

(باقی صفحہ ۱۵۲ پر دیکھئے)

ڈاکٹر سید حامد حسین

نسخہ حمیدیہ کے مرتب ۔ مفتی محمد انوار الحق

ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری کی بھوپال میں آمد کے بعد پہلی بار اس حقیقت کا احساس ہوا کہ بھوپال میں محفوظ دیوانِ غالب کے مخطوطہ میں غالب کا ایسا کلام بھی شامل ہے جسے غالب نے طباعت کے لئے اپنا دیوان مرتب کرتے وقت حذف کر دیا تھا۔ اس کلام کی تدوین کا منصوبہ ڈاکٹر صاحب نے بنایا تھا اور ۱۹۱۸ء میں اس کے اچانک انتقال کی وجہ سے پورا نہ ہوسکا۔ ڈاکٹر بجنوری کے انتقال کے بعد غالب کے اس نادر سرمایۂ شعر کی ترتیب کی ذمہ داری مفتی انوار الحق صاحب نے قبول کی اور اس کلام کو متداول کلام کے ساتھ شامل کر کے، اس وقت کی تحقیق کی حد تک غالب کا ایک مکمل دیوان نسخۂ حمیدیہ کے نام سے ۱۹۲۱ء میں شائع کیا۔ مفتی صاحب اس وقت ریاست بھوپال میں ناظم تعلیمات تھے اور اپنے علم و فضل، ذوق تصنیف و تالیف، غالب کے کلام سے شغف اور ڈاکٹر بجنوری سے قربت کے لحاظ سے "نسخۂ حمیدیہ" کی ترتیب کے لئے اس وقت بھوپال میں ان سے زیادہ موزوں کوئی دوسری شخصیت متصور نہیں ہوسکتی تھی۔

مفتی محمد انوار الحق صاحب ہندوستان کے مشہور محدث شمس العلما مفتی محمد عبداللہ صاحب ٹونکی کے صاحبزادے تھے۔ محمد عبداللہ نے ۷ نومبر ۱۹۲۳ء کو بھوپال میں انتقال کیا۔ ان کی وفات پر علامہ سید سلیمان ندوی نے ایک جگہ تحریر کیا ہے

"مفتی صاحب مرحوم عربی درسگاہوں کی قدیم تعلیم کا بہترین نمونہ تھے۔ ہندوستان کے مشاہیر علما میں ان کا شمار تھا۔ وہ ادب میں مولانا فیض الحسن صاحب اور دینیات میں مولانا احمد علی صاحب محدث کے شاگرد تھے۔ مولانا فیض الحسن صاحب کے انتقال کے بعد اورینٹل کالج لاہور کی پروفیسری جگہ ان کو ملی اور ان کی عمر کا بڑا حصہ اسی درسگاہ میں گذرا۔ اخیر زمانے میں وہ دارالعلوم ندوہ کے مدرس اعلیٰ مقرر ہوئے تھے اور اس کے بعد مدرسہ عالیہ کلکتہ کے صدر مدرس ہوئے اور وہیں سے بیمار ہو کر اپنے صاحبزادے جناب مفتی انوار الحق صاحب ایم۔ اے ناظم و مشیر تعلیمات بھوپال کے پاس گئے تھے، جہاں انہوں نے وفات پائی۔ عالباً وفات کے وقت مفتی صاحب مرحوم کی عمر ستر کے قریب ہوگی۔ تعلیمی خدمات کے علاوہ مفتی صاحب کا شاندار کارنامہ انجمن مستشار العلما لاہور ہے جو ایک قسم کا دارالافتا ہے۔ مرحوم نے بعض عربی کی درسی کتابوں پر حواشی بھی لکھے تھے"[1]

مفتی انوار الحق ٹونک میں ۸ جون ۱۸۸۵ء کو پیدا ہوئے۔ بعد میں اپنے والد مفتی محمد عبداللہ کے ساتھ لاہور گئے۔ وہیں انہوں نے تعلیم کے سارے مراحل طے کئے اور پہلے منشی فاضل اور پھر فارسی میں ایم۔ اے کیا۔ ان امتحانات میں کامیابی کے بعد راولپنڈی کے گورڈن کالج

---

[1] "یادِ رفتگاں" مطبوعہ کراچی ۱۹۵۵ء۔ ص ۴۴



چارہ نہیں ہے۔ اس تصنیف کے بھی زیادہ تر مضامین مختلف انگریزی کتابوں سے اخذ کئے گئے ہیں، لیکن خاص
حافظ آرام اسٹرانگ کی انگریزی کتاب (GOD AND SOUL)
دُوسری کتاب اخلاق و کردار کے موضوع پر ایک مختصر رسالہ ہے جس کا عنوان "رسالۂ قوتِ خیال
ملقب، بہ تہذیب الخصائل" ہے اور یہ رالف و'الڈو ٹرائن کی انگریزی کتاب CHARECTER BUILDING کا ترجمہ ہے۔
اس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ انسان جیسا چاہے بن سکتا ہے اُس کے عادات و اخلاق خود اُسی کے دماغی خیالات کا نتیجہ ہوتے ہیں۔
اگر وہ اپنے خیالات پر قابو رکھے اور انہیں پراگندہ نہ ہونے دے تو وہ جو چاہے بن سکتا ہے۔
۱۹۱۔ء میں مفتی صاحب نے "تاریخ ابوالبشر" کے نام سے امریکی پروفیسر رِڈپاتھ کی سترہ جلدوں پر مشتمل (UNIVER
SAL HISTORY OF WORLD) کے پہلے حصے کا ترجمہ شائع کیا۔ یہ جلد نوعِ انسانی کے آغاز سے بحث کرتی ہے
اور اس میں مختلف علوم کی مدد سے کرۂ ارض پر انسانی وجود کے عرصے اور انسان کے مولد کا تعین کیا گیا ہے۔ اس ترجمہ کی اشاعت
کا مقصد خالصتاً علمی ہے، چنانچہ مفتی صاحب نے دیباچے میں اس کی وضاحت کی ہے
"صرف آغازِ انسان کے زمانے کی تعیین میں ۹ متفرق علموں کے ذریعے سے نتیجے اخذ کئے ہیں اور یہ سب علم ایسے ہیں کہ
ابھی تک یہاں کے انگریزی تعلیم یافتہ اصحاب بھی حال حال ہی ان سے واقف ہوں گے۔ مجھے ان حوالات کے صحیح یا غلط
ہونے سے بحث نہیں۔ میرا مطلب ان کو اہلِ ملک کے سامنے پیش کرنے سے صرف یہ ہے کہ یہاں والے بھی ان مختلف
علوم کے موضوع اور مبحوث فیہ مضامین سے کسی قدر آگاہ ہو جائیں اور جس طرح علمی ترقیوں میں نئی نئی ایجادوں کا
نام سنا کرتے ہیں، اُسی طرح علمی تحقیقات اور فلسفیانہ معلومات میں بھی ان کے کان ان کو بھی اور ان کسی باتوں
سے ناآشنا نہ رہیں اور ان کو کم سے کم اتنا تو معلوم ہو جائے کہ دُوسری قومیں کیا کچھ کر رہی ہیں۔"[1]
جن علوم سے اس مسئلے کی چھان بین میں مدد لی گئی ہے، وہ ہیں ASTRONOMY, GEOLOGY,
ARCHEOLOGY, PALENTOLOGY, ANTHROPOLOGY, ETHNOLOGY,
ETHNOGRAPHY, TRADITION, HISTORY AND CHRONOLOGY.
جن کا مفتی صاحب نے علی الترتیب یہ ترجمہ کیا ہے علم ہیئت۔ طبقات الارض۔ آثارِ قدیمہ۔ علم سالاتِ قدیمہ۔ تشریح الانسان۔
علم الاقوام۔ تہذیب الاقوام۔ قصص سوانح۔ علم تاریخ اور علم التسنین[2]۔ رِڈپاتھ نے پہلے ان علوم کا مختصر خاکہ پیش کیا ہے اور پھر ان کی مدد
سے انسانی زندگی کے آغاز کی گتھی سلجھانے کی کوشش کی ہے۔ مفتی صاحب کا یہ ترجمہ اس لحاظ سے اہم ہے کہ انہوں نے ایسے
دقیق علمی مسائل کو اُس وقت اردو میں منتقل کرنے کی کوشش کی جب کہ اُردو نثر ابھی تک ایسے موضوعات کی متحمل نہیں تھی۔ سب
سے بڑی دقت اُردو میں علمی اصطلاحات کی کمیابی تھی۔ چنانچہ مفتی صاحب نے خود ان اصطلاحات کو وضع کیا[3]۔ اور جہاں موضوع
مزید وضاحت کا متقاضی تھا، وہاں انہوں نے حاشیوں کی مدد سے ضروری معلومات فراہم کی ہے۔
۱۹۱۵ء کے قریب مفتی صاحب کی ایک اور تصنیف "حقائقِ اسلام" شائع ہوئی، جس کا مقصد اُن اسلامی تعلیمات سے
بحث کرنا تھا جو اسلام کو دنیا کے دُوسرے مذاہب سے ممتاز کرتی ہیں۔ کتاب چار حصّوں میں تقسیم کی گئی ہے۔ پہلا حصّہ عقائد
سے بحث کرتا ہے اور اس میں توحید۔ تصدیق۔ رسالت۔ ایمان بالقدر، حشر و نشر اور معجزات کے مسائل پر بحث لائے گئے ہیں۔

---

[1] تاریخ ابوالبشر۔ ص ۴۔ [2] کتاب مذکور ص ۵۔ [3] مفتی صاحب نے ان اصطلاحات کو کتاب کے آخر میں (صفحات
۱۹۷ تا ۲۰۱) ایک ضمیمہ کی شکل میں یکجا کر دیا ہے۔



دوسرے حصّے کا تعلق اعمال و عبادات سے ہے اور اس میں نماز روزہ زکوٰۃ اور حج کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے تیسرے حصّے میں آداب و معاملات کے تحت علم اخلاق ۔ اخوتِ اسلامی ۔ رعایتِ حقوق ۔ صنفِ ضعیف کی جانب اسلامی نقطۂ نظر ۔ قانون ا رواج ۔ سُود خواری اور غلامی کے مسائل کو موضوعِ بحث بنایا گیا ہے آخری حصّہ میں اسلامی تیوہاروں ۔ رسوم ۔ طعامِ اہلِ اسلام ۔ اسلام اور رُوحانیت اور مسلمانوں کی موجودہ حالت کو زیرِ غور لایا گیا ہے ۔ مفتی صاحب کا انداز حسبِ معمول منطقیانہ ہے عقلی دلائل کو انھوں نے اپنی بحث کی بنیاد بنایا ہے اور قرآنی حوالوں کے ساتھ ساتھ جا بجا مغربی مصنفین کی رایوں اور تحریروں سے بھی نتائج اخذ کئے ہیں ۔ اِس تصنیف کا امتیاز اُس کا سُلجھا ہوا پیرایۂ بیان ہے جس کی جانب مولوی عبدالحق نے بھی اشارہ کیا ہے[1] اور جس کے بارے میں اکبر الہ آبادی نے لکھا ہے :

"میں اِس زمانے میں اُردو زبان میں کسی مصنف کا بیان ایسا صاف اور بے تکلف باوجود اس کے پُر جوش اور دلکش نہیں پاتا ۔ مصنفین کا خیال ہوتا ہے کہ اپنی انشا پردازی کی استعداد ظاہر کریں ، وسعتِ معلومات کا جلوہ دکھائیں ۔ اِس سبب سے عموماً تحریر میں پیچیدگی پیدا ہو جاتی ہے ۔ میں نے آپ کی دونوں کتابوں میں جو میں نے پڑھیں یعنی "حقائقِ اسلام" اور "تذکرۃ الحبیب" آپ کی تحریر کو صاف اور بے جھول پایا ۔ کیوں نہ کہوں علمہ البیان کا مصداق آپ ہیں ۔ اگر ایسا لکھ سکتا بہت کام کرتا ۔ آپ کا دل نورِ ایمان سے منوّر ہے ۔ آپ کے بیان میں فطری جوش پایا جاتا ہے ، اِسی سبب سے بیان ایسا صاف اور مُسلسل ہے کہ ہر شخص آسانی سے سمجھ سکتا ہے اور دل لگا کر سُن سکتا ہے"[2]

"تذکرۃ الحبیب" مفتی صاحب نے پہلی بار ۱۳۳۶ھ (۱۸-۱۹۱۷ء) میں شائع کی ۔ یہ کتاب رسولِ خدا صلعم کے اُسوۂ حسنہ سے متعلق مستند روایات کا مجموعہ ہے ۔ سادہ زندگی ۔ حُسنِ معاشرت ۔ خوش خلقی ۔ شجاعت ۔ ثبات و استقلال ۔ حلم اور تحمّل ۔ عفو و رحم ۔ صبر و شکر ۔ سخاوت ۔ ایثار و حُسنِ سُلوک ۔ محبت و شفقت ۔ عدل و انصاف ۔ وقار و متانت ۔ زندہ دلی و شگفتہ مزاجی وغیرہ عنوانات کے تحت احادیث و واقعات کو یکجا کیا گیا ہے ۔ اِس تالیف میں مفتی صاحب کی دُوسری تصانیف کی طرح منطقی استدلال کے لئے گنجائش نہیں تھی لیکن اُسلوبِ تحریر میں جوشِ عقیدت اور متانت حسبِ معمول نمایاں ہے ۔

۱۹۲۶ء میں مفتی صاحب نے رابندر ناتھ ٹیگور کے مشہور ڈرامے THE KING OF THE DARK CHMBER کا اُردو ترجمہ "جیستانِ عالم" کے نام سے شائع کیا ۔ یہ ترجمہ مفتی صاحب نے تقریباً دس سال قبل مکمل کر لیا تھا ، لیکن اُس وقت اس کی اشاعت کا انتظام نہیں ہو سکا ۔ ۲۲ جنوری ۱۹۲۶ء کو مفتی صاحب کے چودہ سالہ صاحبزادے انصار الحق کی اچانک موت نے اُن پر بہت گہرا اثر کیا اور اس حالت میں "دل بہلانے کے لئے خیال اور بہت سی بھُولی بسری باتیں یاد آئیں ، وہیں اِس فراموش شدہ مسودے پر بھی نظر پڑی"[3] اور اُس کی اشاعت کی جانب توجہ کی ۔ موضوع کے اعتبار سے ٹیگور کا ڈراما مفتی صاحب کے ذوق سے مطابقت رکھتا تھا اور اس میں راضی بہ رضائے الٰہی ہونے کا جو رمز ہے ، اُس کی جانب بیٹے کی موت کے حادثے کے بعد مفتی صاحب کا خیال جانا بالکل فطری تھا ۔ مفتی صاحب نے ڈرامے کا آزاد ترجمہ کیا ہے اور اکثر مناسب حذف و اضافہ سے کام لیا ہے اور کوشش کی ہے کہ اصل کی برجستگی اور علامت پسندی قائم رہے لیکن

---

[1] مولوی عبدالحق کے خط کا ایک اقتباس "تذکرۃ الحبیب" کے آخر میں درج ہے ۔ ص ۱۳۲ ۔ (چوتھا ایڈیشن)
[2] صفحۂ آخر "تذکرۃ الحبیب" ۔ (چوتھا ایڈیشن) ۔ [3] تمہید "جیستانِ عالم" ۔ بلا نمبر صفحہ ۳



دراصل ڈراما معنی صاحب کا میدان نہ تھا اور اسی لیے کہیں کہیں مکالموں میں اُن کے اسلوب کی ثقاہت کرداروں کے حسبِ حال نہیں رہتی اور مکالمے اور محاورے کے ذریعے کرداروں کے طبقاتی فصل کا احساس نہیں ہو پاتا۔ اصل ڈرامے میں کئی گیت بھی شامل ہیں۔ ان میں سے چند کا معنی صاحب نے منظوم ترجمہ کیا ہے، لیکن اکثر یہ ترجمہ اصل سے صرف دُور کی مطابقت رکھتا ہے۔ اس کے باوجود معنی صاحب کے قطعات ڈرامے میں پوری طرح کھپ جاتے ہیں۔ معنی صاحب ایک شُستہ ذوقِ شعر رکھتے تھے۔ سخن فہمی اور سخن سنجی کا مادّہ اُن میں فطری تھا۔ چنانچہ مذہبی موضوعات پر اپنی تصانیف میں بھی جابجا انہوں نے حسبِ موقع فارسی اور اُردو شعر نقل کئے ہیں، لیکن خود شعر گوئی کی جانب اُنہوں نے بہت کم توجہ کی۔ اس کے باوجود "چیستانِ عالم" میں جو منظوم ترجمے شامل ہیں، وہ اپنے اندر اصل جیسی بےساختگی ہی نہیں رکھتے، بلکہ اُن میں ایک ایسی پختگی کا بھی احساس ہوتا ہے جو ایک ترقی یافتہ ذوقِ شعر اور طویل مشقِ سخن کا نتیجہ ہوتی ہے۔ جیسے ؎

تری بزم میں رسائی میرے دل کی آرزو ہے　　ترے در پہ جبہہ سائی مری عینِ آبرو ہے
تجھے دیکھنا بھی مشکل ہے، نہ دیکھنا بھی مشکل　　کہ نظر میں تو ہی تو ہے، دل و جاں میں تو ہی تو ہے
مرا کیا قصور تیرا میں اگر پتہ نہ پاؤں　　کہ ترا حجاب اکبر، مرا شوق جستجو ہے
میں اگر ترا ترنم نہ سُنوں تو کیا تعجب　　ترا تارِ نغمہ پرور مری ہی رگِ گلو ہے
کہیں تو ہے خندۂ گل، کہیں نالۂ عندلیب　　کہیں عشق جا لِفرا ہے، کہیں حسن شعلہ جو ہے
کوئی کیا کہے کہاں ہے تو عیاں کہاں نہاں ہے　　جدھر آنکھ اُٹھ گئی ہے، وہ ہی جلوہ روبرو ہے [1]

جس سمت نظر کر دیکھے ہیں، اُس دلبر کی پھلواری ہے　　کہیں سبزے کی ہریالی ہے، کہیں پھولوں کی گلکاری ہے
دل رات مگن، خوش بیٹھے ہیں اور آس اسی کی بھاری ہے　　بس آپ ہی وہ داتاری ہے اور آپ ہی وہ بھنڈاری ہے
جب اُمڈا دریا اُلفت کا، ہر چار طرف آبادی ہے
ہر رات نئی اک شادی ہے، ہر روز مبارکبادی ہے

ہے چاہ فقط اک دلبر کی، پھر اور کسی کی چاہ نہیں　　اک راہ اُسی سے رکھتے ہیں، پھر اور کسی سے راہ نہیں
یاں فکر ترددو رنج نہیں، ہم ایک سے بھی آگاہ نہیں　　کچھ مرنے کا کھٹکا نہیں، کچھ جینے کی پرواہ نہیں
ہر آن ہنسی، ہر آن خوشی، ہر وقت امیری ہے بابا
جب عاشق مست فقیر ہوئے، پھر کیا دلگیری ہے بابا [2]

محکمۂ تعلیمات سے وابستگی کے دوران معنی صاحب نے کئی کتابیں درسی ضرورتوں سے لکھیں۔ انتظامِ خانہ داری پر چار کتابوں کا ایک سلسلہ "ڈومیسٹک اکانومی" کے نام سے ۱۹۱۳ء میں شائع ہوا، جس کی پہلی تین جلدوں میں معنی صاحب نے چند کردار وضع کرکے نیم ڈرامائی انداز میں لڑکیوں کی ضرورت کے کئی موضوعات پر بُنیادی معلومات فراہم کیں۔ چوتھی جلد میں انہوں نے بیانیہ انداز اختیار کیا ہے اور غذا اور لباس کے بارے میں زیادہ تفصیلی معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ اسی طرح بچوں کی تعلیم کے لئے

---

[1] منظر دوم "چیستانِ عالم"۔ ص ۲۷ — [2] منظر سوم "چیستانِ عالم"۔ ص ۴۰



ایک اور کتاب "مذہب کی باتیں" تحریر کی، جس میں انتہائی سادہ انداز میں مذہب کے بارے میں بنیادی باتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان کتابوں کے علاوہ مفتی صاحب نے بعض اور درسی کتب اور عام معلومات کی کتابیں تیار کیں جنہیں ریاست کی طرف سے سرکاری طور پر چھاپا گیا اور اس لئے ان کتابوں پر مفتی صاحب کا نام درج نہیں ہے۔[1]

مفتی صاحب کی تصانیف کا ایک بڑا حصہ اس طرح افادی نوعیت کا ہے۔ گو اُن کو شروع ہی سے ادب سے دلچسپی رہی، لیکن ابتداءً مذہب کی جانب اُن کے خصوصی رجحان اور بھوپال آنے کے بعد فرائضِ منصبی کے تحت درسی کتابوں کی تالیف نے اُن کو اتنا موقع نہ دیا کہ وہ اپنے ادبی میلانات کا پوری طرح اظہار کر سکیں۔ چنانچہ بھوپال میں ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کی آمد مفتی صاحب کے ادبی ذوق کے لئے بڑی مفید ثابت ہوئی۔ بھوپال میں کیونکہ ڈاکٹر بجنوری کو مشیرِ تعلیمات کی حیثیت بھی حاصل رہی اس لئے مفتی صاحب کا، جو کہ اُس وقت محکمۂ تعلیمات کے ڈائرکٹر تھے، ڈاکٹر بجنوری سے فوری ربط پیدا ہونا یقینی تھا۔ مفتی صاحب کے ذوقِ تالیف اور مغربی علوم سے واقفیت نے اس رابطے کو مزید مضبوط بنا دیا۔ مفتی صاحب اس وقت "تذکرۃ الحمید" کا مسودہ تیار کر رہے تھے۔ چنانچہ ڈاکٹر بجنوری نے اُس مسودہ پر نظر ڈالی اور تحقیقی اندازِ تحریر کی ضروریات کو مدِنظر رکھتے ہوئے مفتی صاحب کو بعض مشورے دیے۔ چنانچہ مفتی صاحب نے کتاب کے حاشیے پر اس کی جانب اشارہ کیا ہے:

"مشہوری طور پر کتابوں کے حوالے تو میں نے پہلے بھی ہر ایک روایت کے ساتھ دے دیے تھے، مگر اپنے فاضل اور مکرم دوست جناب ڈاکٹر عبدالرحمٰن صاحب بجنوری بالقابہم کے ایماسے میں نے صفحات کے نشان بھی دے دیے ہیں اور یہاں اُن خاص کتابوں کے سال و مقامِ طبع وغیرہ بھی لکھے دیتا ہوں تاکہ اگر اربابِ ذوق تصدیق کرنا چاہیں تو اُن کو آسانی ہو۔"

ڈاکٹر بجنوری کی آمد کے بعد بھوپال میں شعر و سخن کی محفلوں، فن و ادب پر گفتگو، مغربی اور مشرقی میلانات پر مباحثوں میں ایک نئی سرگرمی پیدا ہو گئی۔ ان حالات میں مفتی صاحب کے اس ادبی رجحان کو جسے دُوسری مصروفیتوں کی بنا پر واضح اظہار کا موقع نہیں ملا تھا، تقویت پہنچی۔ ٹیگور کے ڈرامے کا "چیستانِ عالم" کے عنوان سے مفتی صاحب کا ترجمہ اُسی زمانے کی یادگار ہے۔ چنانچہ [illegible]ے کی تمہید میں انہوں نے لکھا ہے:

"میں نے یہ ترجمہ دس برس ہوئے اپنے مکرم دوست ڈاکٹر عبدالرحمٰن صاحب بجنوری مرحوم کی فرمائش پر کیا تھا اور یہ اُسی زمانے میں مکمل ہو کر اُن کی نظر سے گذر بھی چکا تھا، لیکن اس کے چھپنے کا انتظام نہیں ہوا تھا کہ یکایک مرحوم کا انتقال ہو گیا اور یہ مسودہ بھی طاقِ نسیاں میں رکھ دیا گیا۔"[2]

اس کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر بجنوری سے ربط نے مفتی صاحب کی کلامِ غالب سے اپنی دلچسپی کے اظہار کے لئے [illegible] کام کیا ہوگا۔ مفتی صاحب زمانۂ طالب علمی ہی سے غالب سے شغف رکھتے تھے۔ چنانچہ اُن کی ایک بیاض میں (جو کہ صاحبزادے جناب احسان الحق صاحب کے پاس محفوظ ہے اور جسے مفتی صاحب نے ۱۹۰۶ - ۱۹۰۵ء میں تحریر کیا ہے) جہاں ولی۔ قائم۔ امانت۔ اسیر۔ ذوق۔ شیفتہ۔ داغ وغیرہ کے متفرق اشعار درج ہیں، وہیں تین چوتھائی سے زیادہ بیاض غالب کی مکمل غزلوں سے بھری ہوئی ہے۔ اسی طرح مفتی صاحب نے اپنی تصانیف میں جابجا جو اشعار نقل کئے ہیں، اُن میں سب سے زیادہ

---

[1] بحوالہ سید ساجد علی صاحب۔ [2] "تذکرۃ الحمید"۔ (چوتھا ایڈیشن) ص ۲۴ ایڈیشن ۱۳۴۱ھ غالباً موصوف ہوگا۔ ادارہ)

[2] "چیستانِ عالم" ملاحظہ صفحہ ۳۔



تعداد غالب کے فارسی اور اُردو اشعار کی ہے۔ ڈاکٹر بجنوری جیسے غالب کے پرستار کی قربت نے مفتی صاحب کی غالب سے وابستگی کو جو تقویت پہنچائی ہوگی، وہ ظاہر ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی واضح ہے کہ مفتی صاحب نے غالب سے اپنی دلچسپی کے اظہار میں ڈاکٹر بجنوری کی طرح غلو سے کام نہیں لیا۔ چنانچہ ڈاکٹر بجنوری کے کلامِ غالب پر اس مقدمے کے بارے میں جو کہ مفتی صاحب نے "نسخۂ حمیدیہ" میں بھی شامل کیا ہے[1]، لکھتے ہوئے تحریر فرمایا ہے،

"میں یہ نہیں کہتا کہ اُنہوں نے جو کچھ لکھا، وہ بلا چوں وچرا تسلیم کر لیا جائے۔ نہیں، بعض جگہ خود مجھ کو بھی اِس سے ایک گونہ اختلاف ہے[2]۔"

اس کے باوجود مفتی صاحب نے ڈاکٹر بجنوری کے مقدمے کو بڑی قدر کی نظر سے دیکھا ہے اور بڑے جوشِ عقیدت کے ساتھ اس کو اپنے مرتب کئے ہوئے "نسخۂ حمیدیہ" کے ساتھ شائع کیا ہے۔

ڈاکٹر بجنوری کے بھوپال میں قیام کے دَوران جو سب سے اہم واقعہ پیش آیا۔ وہ غالب کے اُس نادر مجموعۂ کلام کی دریافت تھی، جس میں غالب کا محذوف کلام بھی موجود تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اِس کلام کی اشاعت کا ایک منصوبہ بنایا تھا، لیکن عمر نے وفا نہ کی اور نومبر ۱۹۱۸ء میں اُن کے اچانک انتقال سے یہ کام نامکمل رہ گیا۔ مفتی صاحب اس کام کی نوعیت سمجھتے تھے اور اس کی اہمیت کا اُنہیں خوب اندازہ تھا۔ چنانچہ اس کو پورا کرنے کی ذمہ داری اُنہوں نے سنبھالی۔ اِس کلام کو نئی ترتیب دی۔ اس کا متداول کلام سے مقابلہ کیا اور اُس وقت تک دریافت شدہ سارے کلامِ غالب کے ساتھ اُنہوں نے ۱۹۲۱ء میں "نسخۂ حمیدیہ" کے نام سے غالب کا ایک مکمل دیوان شائع کیا۔ مفتی صاحب کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ دیوان ۱۹۲۱ء سے قبل ہی مرتب ہو چکا تھا، مگر اس کی اشاعت میں تاخیر اِس سبب سے ہوئی کہ وہ اس دیوان کو ڈاکٹر بجنوری کی ایک یادگار کی حیثیت سے شائع کرنا چاہتے تھے اور اُن کی خواہش تھی کہ وہ دیوان کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر صاحب مرحوم کی زندگی کے حالات بھی پیش کریں[3] مگر افسوس ہے کہ مفتی صاحب کو اِس سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب کے اعزّہ اور احباب سے کوئی مدد نہ ملی۔ اِس سے مفتی صاحب کو صدمہ پہنچا۔ چنانچہ اس کا اظہار مفتی صاحب نے ڈاکٹر بجنوری پر اُس مختصر مضمون میں کیا ہے جو اُنہوں نے اپنی تمہید کے ساتھ "نسخۂ حمیدیہ" میں شامل کیا ہے۔ مفتی صاحب نے ڈاکٹر صاحب سے اپنی دوستی کو ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا اور ڈاکٹر صاحب کے بارے میں ہر موقع پر انتہائی پُرخلوص جذبات کا اظہار کیا اور تصانیف کے بارے میں اُن کے ہر مشورے کی جانب بڑی دیانت داری کے ساتھ اشارہ کیا ہے[4]۔ "نسخۂ حمیدیہ" گو موجودہ شکل میں مفتی صاحب ہی کی ترتیب کا نتیجہ ہے، پھر بھی اُنہوں نے اس کا امتیاز (کریڈٹ) خود نہیں لینا چاہا، بلکہ اس نسخے میں شامل ڈاکٹر صاحب پر مضمون کا آغاز ہی اِن الفاظ سے ہوتا ہے۔

"آہ! کیا انقلابِ لیل ونہار، کیسی گردشِ روزگار ہے کہ یہ کتاب جسے مرحوم جناب ڈاکٹر عبدالرحمٰن صاحب بجنوری مرحوم ایسے شوق سے چھپوانے کی تیاری کر رہے تھے، آج اُن کی یادگار کے طور پر شائع ہو رہی ہے اور یہ ورق جو اُن کے رشحاتِ قلم سے رَوکش گلزار ہونے والا تھا، اِس وقت محض اُن کا کتابۂ مزار ہے[5]۔"

غالب کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام کی اشاعت کا ابتدائی خاکہ ڈاکٹر بجنوری ہی کی فکر کا نتیجہ تھا۔ ڈاکٹر صاحب یہ چاہتے تھے کہ ایسی غزلوں کو جو بعض اختلافات کے ساتھ مطبوعہ اور غیر مطبوعہ دونوں نسخوں میں مشترک تھیں، علاحدہ علاحدہ صفحات

---

[1] نسخۂ حمیدیہ۔ صفحات ۳۳ تا ۱۳۹۔ یہ مقدمہ اب آخر میں چند صفحات کے اضافے کے ساتھ انجمن ترقی اُردو نے "محاسنِ کلامِ غالب" کے نام سے علاحدہ بھی شائع کر دیا ہے۔ [2] نسخۂ حمیدیہ صفحات ۲۸ و ۲۹۔ [3] نسخۂ حمیدیہ۔ ص ۲۶۔ [4] مندرجۂ بالا "تذکرۃ الحبیب" اور "جلستانِ عالم" سے لئے گئے اقتباسات ملاحظہ ہوں۔ [5] نسخۂ حمیدیہ۔ ص ۲۵۔



پر بالمقابل درج کیا جائے اور جہاں ایسی مشترک غزلیں موجود نہ تھیں، وہاں مطبوعہ یا غیر مطبوعہ حصے سے متعلق جیسا مناسب ہو، ایک صفحہ سادہ چھوڑ دیا جائے۔[1] مفتی صاحب نے اس کی بجائے ایک دوسری ترتیب اختیار کی۔ انہوں نے ہر ردیف کے کلام کو تین حصوں میں تقسیم کیا۔ پہلے حصے میں وہ غزلیں شامل کیں جو مطبوعہ اور غیر مطبوعہ نسخوں میں مشترک تھیں۔ دوسرے حصے میں وہ غزلیں رکھیں جو صرف قلمی نسخے میں موجود تھیں اور تیسرے میں اُن غزلوں کو جگہ دی جو قلمی نسخے میں موجود نہ تھیں لیکن متداول مطبوعہ نسخوں میں ملتی تھیں۔ پہلے حصے کے مشترک غزلوں کے لئے یہ ترتیب رکھی کہ پہلے قلمی نسخے کی غزل تحریر کی گئی۔ اگر اس غزل کے کچھ اشعار مطبوعہ غزل میں مشترک ہوئے تو ان اشعار کے محاذ میں "م" کا نشان بنا دیا گیا اور اگر قلمی اور مطبوعہ اشعار میں کہیں کوئی جزوی اختلاف ہوا تو اختلافی مصرعوں کو تلے اوپر ساتھ ساتھ لکھ دیا گیا اور جو اشعار صرف مطبوعہ غزل ہی میں موجود ہیں، انہیں جدا گانہ تحریر کر دیا گیا۔ اس طرح مفتی صاحب کی ترتیب ڈاکٹر بجنوری کی مجوّزہ ترتیب سے بالکل مختلف ہو گئی۔ اس سے یہ ضرور ہوا کہ ہر طرح مطبوعہ اور غیر مطبوعہ غزلیں ساتھ ساتھ شائع ہو گئیں اور مشترک اشعار کا اعادہ نہیں ہوا۔ لیکن اس ترتیب کی وجہ سے مخطوطہ کی اصل ترتیب برقرار نہیں رہ پائی اور غزلیں الگ الگ حصوں میں منتشر ہو گئیں۔ گو ڈاکٹر بجنوری کی ترتیب میں اس صورتِ حال کے پیدا ہونے کا امکان نہ تھا، لیکن طباعت کے نقطۂ نظر سے سادہ صفحات اور مشترک اشعار کا اعادہ بھی موزوں نہیں تھا۔

مفتی صاحب نے بہرحال جا بجا قلمی نسخے میں کی گئی اصلاحات یا اشعار کے متن، حاشیے میں اضافوں کے بارے میں حوالے دیے ہیں اور اس طرح انہوں نے مخطوطہ کی اصل کیفیت کو ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن کہیں کہیں یہ حوالے نظر انداز بھی ہو گئے ہیں اور کئی ایسی غزلوں کو صرف مطبوعہ ظاہر کیا گیا ہے جو قلمی نسخے کے حاشیے پر درج ہیں یا مخطوطہ کے آخر میں تحریر ہیں۔[2] ان میں ایک غزل تو ایسی بھی شامل ہے جو قلمی نسخے کے اس صفحے کے حاشیے پر درج ہے جس کا عکس "نسخۂ حمیدیہ" میں شامل کیا گیا ہے۔ ان بعض کوتاہیوں کے باوجود مفتی صاحب نے دیوان کو زیادہ سے زیادہ مکمل بنانے کی کوشش کی ہے اور کہیں کہیں حاشیوں میں غالب کے کلام پر مختصر تبصرہ بھی کیا ہے۔

"نسخۂ حمیدیہ" میں شامل مفتی صاحب کی تمہید[3] تین حیثیتوں سے اہم ہے۔ اوّلاً مفتی صاحب نے اس میں مخطوطہ کی کیفیت بیان کی ہے۔ دوم اس میں شامل تبصرہ غالب کے محذوف کلام پر سب سے پہلا تبصرہ ہے۔ سوم اس میں مفتی صاحب نے اپنے مخصوص مدلّل انداز میں مخالفت کے باوجود غالب کے اس نظر کئے ہوئے کلام کی اشاعت کے جواز سے بحث کی ہے۔ تمہید کے بعد "عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم" کے عنوان سے وہ مضمون شامل ہے جس کا ذکر اُوپر کیا جا چکا ہے۔[4] یہ مضمون مفتی صاحب کی ڈاکٹر صاحب مرحوم سے دلی وابستگی کی ترجمانی کرتا ہے اور جہاں یہ ایک عزیز دوست کی جُدائی کا ماتم ہے وہیں ایک فاضل ادیب کی موت کا مرثیہ اور ساتھ ہی ساتھ ابنائے زماں کی بے توجہی کا گلہ بھی ہے۔ اس کے بعد کلام غالب پر ڈاکٹر بجنوری کا مشہور مقدمہ شامل کیا گیا ہے۔[5] باوجود اس جوشِ خلوص کے، جس کے ساتھ مفتی صاحب نے اس مقدمے کو شائع کیا ہے، مفتی صاحب نے ڈاکٹر صاحب کے خیالات کی کورانہ تائید نہیں کی ہے۔ چنانچہ مقدمے کے دسویں حصے میں جہاں ڈاکٹر بجنوری نے غالب کے مسئلۂ وحدت الوجود سے دلچسپی سے بحث کی ہے، مفتی صاحب نے ڈاکٹر صاحب کے

---

[1] تبصرہ "نسخۂ حمیدیہ" از جناب سید ہاشمی مطبوعہ رسالہ "اُردو" اکتوبر ۱۹۲۲ء۔ [2] جناب امتیاز علی عرشی نے اپنے مرتبہ "دیوانِ غالب" (نسخۂ عرشی) میں "اختلافِ نسخ" کے تحت "نسخۂ حمیدیہ" کی ان کوتاہیوں کی جانب اشارہ کیا ہے۔ [3] نسخۂ حمیدیہ۔ صفحات ۳ تا ۲۴۔ [4] نسخۂ حمیدیہ۔ صفحات ۲۵ تا ۳۱۔ [5] نسخۂ حمیدیہ صفحات ۳۲ تا ۱۳۹۔

شاعر نمبر

بعض تاریخ سے اختلاف کیا ہے اور ۱۰ صفحوں پر مبسوط، حاشیے میں درج، ایک مضمون میں عقیدۂ وحدت الوجود کی حقیقت سے تفصیلی بحث کی ہے۔ اس مضمون، ورمہید میں مفتی صاحب کا امتیاز اُن کی معروضیت ہے، جو کہ ڈاکٹر بجنوری کی 'محاسن' نگاری سے قطعاً مختلف ہے۔ مفتی صاحب نے ہر جگہ استدلال سے کام لیا ہے اور رائے کا توازن برقرار رکھا ہے۔



غالب کے اس ابتدائی دَور کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اِس کی تاریخ کتابت بتا رہی ہے کہ جب یہ نسخہ لکھا گیا تھا، اُس وقت اُن کی عمر ۲۵ سال کی تھی، اِس لئے کلام میں اُس روانی اور پختگی کی توقع نہیں کی جا سکتی جو بعد کی غزلوں کا مابہ الامتیاز ہے اور کہیں کہیں بندش کی چستی اور مضمون کی پستی مذاقِ سلیم کی نظروں میں کھٹکتی ہے۔ تاہم بحکم عموم ترکیبوں کی جدت۔ تشبیہوں کی ندرت۔ خیالات کی بلند پروازی اور آسماں پیمائی اِس میں بھی ویسی ہی نمایاں ہے جیسی بعد کے کلام میں۔ فرق فقط اتنا ہے کہ بیدلؔ اور ناصر علی اور نازک کلامانِ ایران کے رنگ نے اِن شعروں کو اور مشکل بنا دیا ہے"۔ ؎۲

"نسخۂ حمیدیہ" کے مرتب کی حیثیت سے مفتی انوار الحق نے اُردو ادب کی ایک اہم خدمت سرانجام دی ہے۔ اگر ڈاکٹر بجنوری کے انتقال کے بعد مفتی صاحب اِس کلام کو نہ سنبھالتے تو وہ کلام جو غالب کی وفات کے پچاس سال بعد تک پردۂ خفا میں پڑا رہا، پتہ نہیں کب تک دلدادگانِ ادب کی نظروں سے پوشیدہ رہتا ـــــ یا پھر جس طرح اصل مخطوطہ ریاست کے انضمام کی افراتفری میں غائب ہوگیا، اس کے ساتھ ہی ساتھ غالب کا یہ نادر کلام بھی ہمیشہ کے لئے ضائع ہو جاتا۔ مفتی صاحب کے مرتبہ "نسخۂ حمیدیہ" میں اب یہ کلام ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو چکا ہے اور یہ نسخہ اِس طرح نئی تحقیقات کے لئے دروازے کھولتا ہے اور غالب کی شاعری کے نئے محاکموں کے لئے دعوتِ فکر دیتا ہے۔ ▲

؎۱ "نسخۂ حمیدیہ" صفحات ۸۴ تا ۹۸۔ ؎۲ "نسخۂ حمیدیہ" صفحات [illegible]

بقیہ "غالب شاعر امروز و فردا" صفحہ ۱۴۳

دو گیسوؤں میں قیس و کوہکن کی آزمائش ہے
جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

جوں بوئے گل چمن سے ٹپکا نہیں اتنک
رہنے دے مجھے یاں کہ ابھی کام بہت ہے

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

یہ اور اس قسم کے دُوسرے اشعار آج ہماری آپ کی زندگی اور اُس کے معاملات و رجحانات سے جس قدر ہم آہنگ ہیں، تمام اس سے پہلے کی زندگی سے ہم آہنگ نہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جو اشعار اپنے وقت کے آگے کی آواز ہونے کے سبب انیسویں صدی میں نامانوس و عجیب قرار پائے تھے، وہ آج بیسویں صدی میں ہمارے آپ کے ضمیر کی آواز معلوم ہوتے ہیں۔ یہ آواز جو رنگ و نسل اور زمان و مکاں کی مصنوعی سرحدوں سے آگے بڑھ کر ذہن و نفس انسانی کے اجتماعی خواص و خصائص پر حاوی ہو گئی ہے اسلئے یقین ہے کہ جس نسبت سے ذہنِ انسانی آگے بڑھتا جائیگا اور عصباتِ انسانی کی گرہیں انسان پر کُھلتی جائیں گی اُسی نسبت سے غالب اور کلامِ غالب کی مقبولیت کا حلقہ وسیع سے وسیع تر ہو جائے گا۔ ـــــ ▲

پنڈت گووند داس خموش سرحدی

غالب اور اُردو خطوط نویسی

خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھیے؟
ناطقہ سر بہ گریباں، کہ اسے کیا کہیے؟ (غالب)

"آئینۂ غالب" میں ایک مقالہ "غالب اور اُردو خطوط نویسی" کے عنوان سے پڑھ کر حیرانی اور کسی حد تک اذیت ناک مایوسی ہوئی، اس لئے کہ یہ تحقیقی مقالہ اُردو زبان کے نامور محقق پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی مرحوم کا لکھا ہوا ہے، جس میں "تکلف برطرف" نہ زبان و ادب کے تقاضوں سے انصاف کیا گیا ہے اور نہ ہی مرزا غالب کی ذات سے۔ حالانکہ فاضل مقالہ نگار سے پوری توقع تھی کہ وہ فنِ تحقیق و تنقید کے مسلمہ اُصولوں کے تحت انصاف کریں گے۔

یہ مقالہ "آئینۂ غالب" کے صفحہ ۱۳۳ تا ۱۱۱ پر ۱۹۶۳ء میں شائع ہوا ہے۔ لیکن "غالبیات" کے تبصرہ نگاروں نے یہ کوشش نہیں کی کہ ان غلط فہمیوں کو تاریخی شواہد، اسناد کی روشنی میں دُور کیا جائے، جو فاضل مرحوم جیسے محقق کی کسی تحریر سے پیدا ہو سکتی ہیں۔ یقیناً ہمارے اس تبصرے کا یہ مقصد نہیں کہ کیفی صاحب مرحوم کی شان کے خلاف خامہ فرسائی کی جائے، یا اُن کے مرتبہ و مقام سے مذاق کیا جائے، البتہ ہم یہ ضرور چاہتے ہیں کہ اس اہم موضوع پر اربابِ تحقیق کو صلائے عام دی جائے تاکہ اُن غلط فہمیوں کا ازالہ ہو سکے جو مرحوم کے مقالۂ زیرِ نظر سے پیدا ہو گئی ہیں۔ اس سے یہ بھی فائدہ ہوگا کہ مرحوم غالب کی زندگی کے اُن پہلوؤں سے بھی پردہ اُٹھ سکے گا جو ابھی تک محتاجِ تحقیق ہیں۔

کیفی صاحب نے اپنے مقالے کی تمہید میں فنِ تنقید کے کچھ اصولوں سے مختصراً بحث کرتے ہوئے مشرقی ذہنیت پر یوں تبصرہ کیا ہے:۔

"ہمارے مشرقی ملکوں میں اخلاقِ عامہ کی تحلیلِ نفسی کی جائے تو ثابت ہوگا کہ قدامت پرستی کا عنصر ہماری تحقیق میں لاحد حادی اور عامل ہے۔ اسے کبھی پاسِ وضع" کا نام دیا جاتا ہے اور کبھی "شاہ" اور "اعتقادی استقامت" کا سہرا اُس کے سر باندھا جاتا ہے۔ اور جگہ یہ حالت نہیں ہے اور اسی لئے وہ نئی نئی حقیقتیں اور قوانینِ قدرت دریافت کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ الخ" (آئینۂ غالب۔ ص)

مگر مذکورہ صدر موضوع پر خود کیفی صاحب مرحوم کا اندازِ تنقید اُن اصولوں سے مطابقت نہیں رکھتا، جن کا انہوں نے ذکر کیا ہے۔ بے جا نہ ہوگا (مرحوم کی رُوح سے معذرت کے ساتھ) اگر کہا جائے کہ اُنہوں نے اپنی تنقید میں "پاسِ وضع" اور "شاہ" سے تو واقعی دامن بچا لیا ہے، لیکن وہ اعتقادی استقامت اور مخالفت برائے مخالفت کی دعوتوں سے عہدہ برآ



نہیں ہو سکے۔ کاش وہ تحت الشعور کے مطالعہ جدیدوں پر دسترس حاصل کر سکتے اور غیر جانبدارانہ کھوج سے صحیح نتائج مرتب کرتے۔

غالب کی اُردو خطوط نویسی پر تنقید کا آغاز اُنہوں نے ان الفاظ سے کیا ہے:

"عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ مرزا غالب اُردو خطوط نویسی میں نئے طرزِ تحریر کے موجد ہیں۔ اُنہوں نے مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ مرزا خود اس ایجاد کا دعویٰ کرتے ہیں اور اسی دعویٰ پر اعتقادی نظر ڈالنا مقصود ہے۔"

ان سطور کے بعد کیفی مرحوم نے مرزا حاتم علی مہر کے نام غالب کے ایک طویل خط کی پوری نقل دے کر بطور نتیجہ اخذ کیا ہے کہ یہ خط ۱۸۵۸ء کا لکھا ہوا ہے۔ جب کہ مرزا غالب نے اپنی کتاب "دستنبو" کے چھپوانے کا کام مرزا حاتم علی مہر اور منشی شیو نرائن کو سونپ رکھا تھا۔ اس خط میں مرزا غالب لکھتے ہیں:

"میں نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ ہزار کوس سے بزبانِ قلم باتیں کیا کرو اور ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔" (اُردوئے معلیٰ)

کیفی مرحوم کو مرزا غالب کے دعویٰ ایجاد پر اعتراض ہے اور وہ اُنہیں اس نئے اندازِ تحریر کا مُوجد نہیں مانتے۔ اُن کا خیال ہے کہ غالب نے ۱۸۵۲ء سے اُردو زبان میں خط و کتابت کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ اس سے پہلے وہ فارسی زبان میں خط و کتابت کیا کرتے تھے۔ کیفی صاحب فرماتے ہیں:

"راقم نے اپنے دوستوں ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اور مسٹر مالک رام سے بھی مشورہ کیا، مگر کچھ حاصل نہ ہوا۔ یہ امر کہ مرزا نے اُردو میں خط کب سے لکھنا شروع کیا؟ ایک مسئلہ ہے جو اب تک حل نہ ہو سکا۔" (آئینۂ غالب۔ ص ۱۶)

پھر کیفی صاحب خواجہ حالی مرحوم کی "یادگارِ غالب" کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"خطوط کے مجموعوں سے جہاں تک پتہ چلا، یہ معلوم ہوا کہ غالب کے خطوط ۱۸۵۳ء تک مُسلسل طور پر پہنچے ہیں اس کے آگے مطلع تاریک ہے۔"

اب "آئینۂ غالب" کے اسی صفحہ کی سترہویں سطر ملاحظہ کیجئے، کیفی صاحب اپنے غالب کی فہم و ذکا کا کرشمہ بتاتے ہوئے ان کے دعویٰ ایجاد پر فیصلہ دیتے ہیں:

"مختصر یہ کہ کسب۔ اخذ اور ترقی کی غیر معمولی استعداد "غالب" کی طبیعت میں موجود تھی۔ مگر ایجاد کوئی اور چیز ہے۔ کامیاب تقلید یا ترقی کو ایجاد نہیں کہہ سکتے۔"

گویا مرزا غالب کا یہ دعویٰ محض "شاعرانہ تعلّی" اور "سخن گسترانہ" بات ہے اور اسے کامیاب تقلید یا ترقی سے زیادہ مرتبہ نہیں دیا جا سکتا۔ اس کے بعد فاضل مقالہ نگار ہماری اس مشکل کو بھی بہ آسانی حل کر دیتے ہیں کہ اُردو میں نئے اندازِ تحریر کا حقیقی مُوجد کون تھا، جس کی تقلید کی سعادت مرزا مرحوم کو نصیب ہوئی۔ چنانچہ وہ پوری تفصیل کے ساتھ اپنی محققانہ و مؤرخانہ رائے کا اعلان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"سنہ ۱۸۳۷ء میں دہلی کا مطبع پریس قائم ہو گیا تھا اور دہلی سے دو اخبار بھی نکلنے لگے تھے۔ لوگوں کی رغبت نئی باتوں اور نئے طریقوں کی طرف ہوتی جاتی تھی۔ لوگ جو کچھ مغربی تعلیم سے حاصل کرتے تھے، اُسے تبرک سمجھ کر اپنے وطن تک پہنچانے کی کوشش کرتے تھے۔" (آئینۂ غالب)

لیکن ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگِ آزادی کا خونیں المیہ مرحوم کیفی کی اس رائے کی تائید نہیں کرتا۔ اگر ۱۸۳۷ء ہی سے عوامی شعور ہندوستان میں مغربی تہذیب و تعلیم کے اثرات قبول کر چکا ہوتا، یا تبرک سمجھ کر اس کی تبلیغ و اشاعت پر کمربستہ ہو گیا ہوتا تو ۱۸۵۷ء میں انگریزوں



کے خلاف ملک گیر بغاوت کے شعلے بھڑک اٹھتے ۔ تاریخی لحاظ سے یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ایک اجنبی تہذیب سمندر پار سے آئی ہوئی ایک قوم کی سرپرستی میں تیزی کے ساتھ پھیلنے کے لئے بے قرار تھی اور ایرانی تہذیب، جس میں ابھی تک مزاحمت و مدافعت کی کچھ طاقت موجود تھی، اُسے تیکھی نظروں سے گھور رہی تھی۔ لازمی تصادم کا نتیجہ یہ ہوا کہ زوال پذیر قدیم تہذیب جدید حکمت عملیوں کا مقابلہ نہ کر سکی اور کھیا کھ جون ریزی کے بعد اُسے شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اس ہلاکت خیز انقلاب سے اگرچہ مغربی تہذیب و تعلیم کا راستہ صاف ہو گیا، لیکن صرف چند سال کے لئے۔ چونکہ مشرقی تہذیب و تمدن کی صالح قدریں مضبوط بنیادوں پر استوار کی گئی تھیں، اس لئے بیس برس کی قلیل مدت میں شکست خوردہ اور گھائل قوم کے شعور نے پھر اجتماعی طور پر انگڑائی لی اور ہندوستانی قوم از سرِ نو تحریکِ آزادی کے لئے منظم اور مستعد عمل ہو گئی۔ کیفی صاحب کا یہ خیال خلافِ حقائق ہے۔ البتہ اس میں اس قدر صداقت ضرور ہے کہ ۱۸۳۶ء میں نشر و اشاعت کے کچھ ذرائع ترقی پذیر تھے چھاپہ خانوں اور اخبارات کا رواج ہونے لگا تھا، ورنا سائے وطن اِن ذرائع سے استفادہ بھی کرنے لگے تھے۔ مرزا غالب اس بحرانی دَور کے اُن دکی الحس اور مستقبل شناس اربابِ قلم میں سے تھے جنھوں نے بدلتے ہوئے حالات اور تغیر و انقلاب کی کروٹوں کو وقت کے پردوں میں دیکھ لیا تھا، جیسا کہ اُن کے اُس زمانے کے بیشتر خطوط سے ظاہر ہوتا ہے۔ چنانچہ اُردو اور فارسی زبان و ادب میں حالات کے تقاضوں کے زیرِ اثر "اصلاح و ترمیم" کی کوششیں شروع ہو چکی تھیں۔ اُردو شعر و ادب میں میر تقی میر اور فارسی نظم و نثر میں مرزا غالب مرحوم کی اصلاحی کوششیں ادبی انقلاب کا پیش خیمہ تھیں، جیسا کہ میر مرحوم کی غزلیات اور غالب مرحوم کی فارسی تخلیقات نظم و نثر سے واضح ہوتا ہے۔ اسے ایجاد کہا جائے یا ادبی انقلاب کا ناگزیر نتیجہ، مورخ اس کا سہرا مرحوم مرزا غالب کے سر باندھنے پر مجبور ہے۔ اگرچہ نعرۂ میر دَور کی تنہائی کی پُرسوز آواز تھا جو اپنی لطافتوں کے ساتھ سماعتوں کی نذر ہو کر رہ گیا۔ لیکن غالب نے مصافِ ادب میں آتے ہی پُوری قوت کے ساتھ نقارے پر چوٹ لگائی اور محفل کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ اُن کی "تلخ نوائی" پُوری انجمن کی بے حسی کے خلاف احتجاج کی چیخ تھی جس کے لئے حالات نے اُنہیں مجبور کر دیا تھا اور یہ کرب ناک آواز مُردہ سماعتوں کو بے طرح جھنجھوڑتی چلی گئی۔ لیکن اس حقیقت کے باوجود کیفی صاحب مرحوم یہ کہنے پر مُصر ہیں:-

"مرحوم دہلی کالج کے ماسٹر رام چندر اُن لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے اس قدیم زمانے میں اُردو کے تمول کی ترقی میں اور لوگوں کو اصلاح و ترمیم کی طرف توجہ دلانے میں نمایاں کام کیا ہے۔ وہ برسوں تک کئی اُردو رسالے نکالتے رہے یہاں صرف ایک رسالہ "محبِ وطن" سے استفادہ کیا جائے گا۔ اس رسالے کی جلد ۲۹ بابت دسمبر ۱۸۴۹ء و جنوری ۱۸۵۰ء اِس وقت میرے سامنے ہے۔ اِس نمبر کے صفحہ ۱۰۹ سے جو عبارت نیچے نقل کی جاتی ہے، ہر مفکر و بے تعصب ادیب کے غور و فکر کی مستحق ہے۔"

عبارت ملاحظہ فرمایئے:

"تتمۂ علوم مدرسات تو تہمات و رسوم طریقۂ خط و کتابت۔

یہ ظاہر ہے کہ جب دو آدمی آپس میں باتیں کرتے ہیں اور اپنا مطلب ایک دوسرے سے بیان کرتے ہیں، اس میں سوائے مطلب کی باتوں کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ کسی کو یہ کہتے نہیں دیکھا کہ ۔۔ بعد گزارش تسلیمات فراواں و کورنشاتِ بے پایاں ۔ اشتیاقِ ملازمتِ کثیر المباحث و ملاقات مسرت ساعت، فلاں کتاب مجھ کو دے دو ۔۔ الخ"

(آئینۂ غالب ص ۱۰۸ ۔ ۱۱۰)

اس طویل مضمون کے آخر میں ماسٹر رام چندر کی تان اِن الفاظ پر ٹوٹتی ہے:



"جس کو علیحدہ تقریر کا اختیار کیا گیا ہے ، رکھ دفتر واسطے انشاپردازی و اخلاق و عبارات و صناعات واستعارات کے ۔ جس کا فارسی والوں کو نہایت مرتبے میں خبط ہو گیا ہے ۔۔ تحریر میں دس سطریں لکھنی، جس میں نصف مطلب صرف ایک سطر میں ہو، تضیعِ اوقات ہے ۔" (صفحہ ۱)

"محبِّ ہند کے مندرجۂ صدر اقتباس کے مطالعے کے بعد مرحوم کیفی صاحب اپنے قیاس کے مطابق فرماتے ہیں کہ رسالہ "محبِّ ہند" قلعے میں ضرور جاتا ہوگا ، کیوں کہ اس کے ہر نمبر میں بادشاہ ظفر کی غزلیں چھپا کرتی تھیں ۔ اسی رسالہ میں بھی جس میں خطوط نویسی کے متعلق ماسٹر صاحب موصوف کا مضمون شائع ہوا ، بادشاہ ظفر کی دو تین غزلیں "غزلیاتِ شاہ جہاں پناہ" کے عنوان سے چھپی ہیں ۔ قلعے والے اس رسالے کو ضرور پڑھتے ہوں گے ۔ چنانچہ مرحوم غالب کی نظر سے بھی یہ رسالہ ضرور گزرا ہوگا اور ان کی طبع وقاد نے ضرور اس سے اثر لیا ہوگا ۔" (آئینۂ غالب)

اب اس طرح غالب کے بارے میں کیفی صاحب کا فیصلہ ملاحظہ فرمائیے ، کہتے ہیں :

" اب رہی یہ بات کہ ۱۸۵۸ء میں وہ (غالب) خطوط نویسی میں موجد ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں ، جیسا کہ انہوں نے مرزا تفتہ کے خط میں لکھا ، اس کو محض ان کی انانیت اور خود بینی کہنا چاہیے ۔ مرزا غالب ابن الوقت تھے ۔ جیسا موقع دیکھا ، ویسی بات کہہ دی ۔ سہرے کے وقت میدان صاف دیکھا تو بے تامّل پکار اٹھے ۔

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرف دار نہیں   دیکھیں اس سہرے سے کہہ دے کوئی بڑھ کر سہرا

بعد مقطع کیفی صاحب مرحوم نے مرزا بے چارے پر جو تیکھے تیر و نشتر برسائے ہیں ، وہ ایک علاحدہ موضوع ہے جسے کسی اور فرصت پر چھوڑ دینا چاہیے ، لیکن ان کا یہ ارشاد کہ

" یعنی اگر شاعری ذریعۂ عزت نہیں ہے تو اسے چھوڑ کیوں نہیں دیتے اور اپنے آبا کے قدیم سپہ گری پیشے کو کیوں نہیں اختیار کر لیتے ؟ "

کہاں تک صحیح ناقدانہ مذاق کا مظہر ہو سکتا ہے ؟ تاہم اس تحریر سے یہ بات ضرور صاف ہو جاتی ہے کہ مرحوم کیفی صاحب کے دل میں مرزا غالب کے خلاف شدید جذبہ موجود تھا جس کے لئے نہ جانے وہ کب سے منتظر تھے کہ موقع ہاتھ آئے اور وہ دل کی بھڑاس نکالیں ۔ خیر اس سے ہمیں کوئی واسطہ نہیں ، اس لئے کہ دونوں بزرگ اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں ۔ سوال صرف یہ ہے کہ مرزا غالب خطوط نویسی میں نئے اندازِ تحریر کے واقعی موجد ہیں یا اُن کا دعویٰ بقول کیفی مرحوم محض ان کی انانیت ، خود بینی اور ابن الوقتی کا نتیجہ ہے ؟ مزید برآں یہ کہ مرزا غالب نے ماسٹر رام چندر کے مضمون مطبوعہ "محبِّ ہند" سے استفادہ کیا ہے ؟ کیوں کہ کیفی صاحب کے خیال میں مرزا مرحوم نے اس مضمون کے دو یا تین برس بعد یعنی ۱۸۵۲ء میں اردو خط و کتابت کا سلسلہ شروع کیا ۔ اب یہی وہ غلط مفروضہ ہے جس کے زیرِ اثر کیفی صاحب ماسٹر رام چندر کو نئے اندازِ نگارش کا موجد اور غالب کو کامیاب مقلّد قرار دیتے ہیں ۔ مگر تعجب ہے کہ ان کے دوستوں (عبدالستار صدیقی صاحب اور مسٹر مالک رام) نے بھی اس معاملے میں اُن کی کوئی دستگیری نہیں کی ، حالانکہ یہ دونوں فاضل حضرات غالب نگاری میں خاص مقام رکھتے ہیں ۔ یہی نہیں ، بلکہ اگر ذرا سی زحمتِ تحقیق گوارا کر لی جاتی تو مرزا غالب کے فارسی مکاتیب سے بھی تمام شکوک رفع ہو سکتے تھے ۔ یہ بات پوشیدہ نہیں کہ اس زمانے کے مروجہ دستور کے مطابق غالب بھی فارسی زبان میں خط و کتابت کیا کرتے تھے ۔ اگرچہ ایجاز اور مراسلہ کو مکالمہ بنا دینے کا دعویٰ انہوں نے ایک اردو خط میں کیا ہے ۔ فارسی والوں کے "خط" سے بھی وہ بے بہرہ نہیں تھے اور فنِ مراسلت کے رموز و اسرار بھی حسبِ استعداد اُن پر فاش ہو چکے تھے اور وہ جانتے تھے کہ قدیم رواج کے مطابق بڑے بڑے آداب و القاب ، خیریت جوئی و عافیت گوئی کے طول طویل جملے ۔ الفاظ کی شان و شوکت ۔ لا یہ و سوگیری کی دھوم دھام علمائے وقت کے لئے



امتیازِ خصوصی کا نشان بن چکے ہیں، جس سے اس فن شریف کی مقصدیت و افادیت مجروح ہوتی جاتی ہے۔ چونکہ مرزا غالب کو اردو اور فارسی دونوں زبانوں پر زبردست دسترس حاصل تھی، اس لئے انہیں معلوم تھا کہ فارسی زبان کے تسلط سے اُردو زبان بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی کیونکہ اس عہد میں اُردو زبان کو نظم و نثر کی ہر صنف میں فارسی سے بقدرِ ضرورت مدد مل رہی تھی، اور اس نوخیز زبان کے رنگ روپ، رس اور لوچ کو نکھارنے کے لئے ضروری تھا کہ فارسی زبان و ادب کے سلسلے میں ترمیم و اصلاح کے نظریے سے کام لیا جائے۔ چنانچہ مرزا غالب نے سب سے پہلے ۲۶-۱۸۲۵ء میں اپنی فارسی تحاریر و مکاتیب پر یہ اصلاحی عمل شروع کر دیا تھا اور غالباً یہی وہی سلسلۂ ترمیم و اصلاح تھا جس کا ذکر مرحوم غالب سے پچیس برس بعد ماسٹر رامچندر نے رسالۂ "محبِ ہند" میں تفصیل کے ساتھ کیا۔ یہ [illegible] کہ ترمیم و اصلاح کی مستحق اُس زمانے میں پہلے فارسی زبان تھی یا اُردو؟ حالات شاہد ہیں کہ اعلیٰ تعلیم و تدریس کا مروّجہ ذریعہ ہونے کی حیثیت سے فارسی زبان حقدار تھی کہ یہ تجربہ پہلے فارسی پر کیا جائے۔ چنانچہ بعدہٗ غالب نے یہی اندازِ نگارش اپنی فطری شوخ نگاری کے ساتھ اُردو مکاتیب کے لئے بھی اختیار کر لیا اور ظاہر ہے کہ مرحوم کا یہ تجربہ نہ صرف کامیاب ثابت ہوا، بلکہ ان کی زندگی ہی میں مقبولِ خاص و عام بھی ہو گیا، اس لئے کہ ؎

اہلِ خواص سے غالب ہوا تھا نکتہ سرا صلائے عام بھی یارانِ نکتہ داں کے لیے

بہتر ہوگا کہ اس مرحلے پر مرزا کے "پنج آہنگ" کا بھی حوالہ دے دیا جائے تاکہ ثابت ہو سکے کہ "ترمیم و اصلاح" کی اہمیت کی طرف مرزا غالب نے کب اور کس حالت میں توجہ مبذول کی۔ اس کے دیباچے میں مرقوم ہے کہ:

"۱۲۴۱ ہجری مطابق ۱۸۲۵ عیسوی میں انگریزی فوجوں نے ریاست بھرت پور پر حملہ کیا تھا۔ اس میں نواب احمد بخش خاں مرحوم کے دستے کے ساتھ مرزا غالب اور مرزا علی بخش خاں رنجور بھی تھے۔ رنجور نے غالب سے درخواست کی: آداب و القاب رسمیہ بروئے ہم ریختہ و الفاظ شکر و شکوہ و شادی و غم باہم آمیختہ برائے نامہ نگاراں دستور العمل موجزے ساختہ آید۔"

مرزا غالب نے رنجور کی فرمائش کے مطابق پنج آہنگ حصّۂ اوّل میں آداب و القاب۔ حصّہ دوم میں فارسی لغات کے مصادر و مصطلحات اور حصّہ سوم میں اپنے دیوان سے منتخب اشعار جمع کر دیے تاکہ کاتبِ خط اس مجموعے سے استفادہ کر سکے، لیکن برسبیلِ تذکرہ وہ اپنے اندازِ نگارش کے متعلق کہتے ہیں:

"ہنجارِ من در نگارش این است کہ چوں کلک و ورق بکف گیرم، مکتوب الیہ را بہ لحظے، کہ فراخورِ حالت اوست، در سر آغازِ صحیفہ آواز دہم و در سرمہ سخن مدعا گردم۔ آداب و القاب خیریت جوئی و عافیت گوئی حشو و زوائد را حسب ہمچناں حشو و زوائد را دریغ نہ بینم۔" لیکن خاطرِ مبارک بر تو بہ دہ (مرزا رنجور) عزیز بود۔ فرمائش از راہِ گوش بہ دل دریافت۔" (کلیاتِ نثرِ فارسی)

مرزا غالب کے کم و بیش تمام تبصرہ نگار اس بات پر متفق نظر آتے ہیں کہ فارسی خط و کتابت میں اُن کا عام انداز اُلجھا ہوا تھا لیکن جو کچھ وہ لکھتے تھے، بلا تکلف لکھتے تھے اور خیریت جوئی و عافیت گوئی اور آداب و القاب کو حشو و زوائد سمجھتے تھے۔ "پنج آہنگ" میں اگر کچھ بھی باتیں قدیم روایات کے مطابق ملتی ہیں تو وہ محض مرزا رنجور کی خوشنودی اور پاسِ خاطر کے طور پر تحریر کی گئیں، ورنہ ان کا اندازِ نگارش جو کہ صدر عبارت سے واضح ہے۔ مختصر یہ کہ حسنِ ترمیم و اصلاح کی طرف ماسٹر رامچندر نے ۱۸۵۰ء میں اربابِ نظر کو توجہ [illegible] کی، اس پر مرزا غالب اور اُن کی رہنمائی میں اُن کے معتقدین و تلامذہ کا وسیع حلقہ پچیس برس پہلے عمل پیرا [illegible] کی بات یا تو اس کا فیصلہ غیر جانب دار مبصر و محقق اور اہلِ ذوق خود کر سکتے ہیں ــــ بے جا نہ ہوگا، اگر [illegible] کو کسوٹی پر کسنے کے لئے مرزا کے اُردو مکاتیب سے بھی استفادہ کیا جائے تاکہ شک و شبہ



کی مزید کوئی گنجائش باقی نہ رہے اور "سخن فہمی" پر "طرفداری" کا الزام نہ آنے پائے۔ بقول مرحوم غالب

نظر بہ نقص گدایاں کمال بے ادبی ہے
کہ خار خشک کو بھی دعویٔ چمن نسبی ہے

سوال متنازع یہ ہے کہ مرزا غالب نے کب سے اُردو میں خطوط لکھنا شروع کیا؟ اس مسئلۂ متنازع پر مختلف رائیں ہو سکتی ہیں لیکن پچھلے چند سال میں مرزا مرحوم پر اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ مشکل ہی اُن کی زندگی کا کوئی پہلو تشنۂ تحقیق رہا ہوگا۔ پہلے ہی جناب کیفی کے لیے "آگے منظر تاریک" سہی، مگر جستجو و ادراک کی راہیں مسدود نہیں اور پھر ع

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب؟

لیجئے، اب اس بارے میں مرحوم خواجہ حالی اپنے قیاس کے مطابق کہتے ہیں:

"مرزا غالب ۱۸۵۰ء تک فارسی میں خط و کتابت کرتے تھے۔ سنہ مذکور میں جب کہ وہ تاریخ نویسی کی خدمت پر مامور کئے گئے اور ہمہ تن "مہر نیمروز" لکھنے میں مصروف ہو گئے، اُس وقت اُن کو اُردو میں خط و کتابت کرنی پڑی .... قیاس چاہتا ہے کہ انہوں نے ۱۸۵۰ء کے بعد سے اُردو زبان میں خط لکھنے شروع کئے ہیں۔" (یادگارِ غالب)

کیفی صاحب مرحوم کو ۱۸۵۲ء سے آگے "منظر تاریک" آتا ہے۔ (آئینۂ غالب)

"مکاتیبِ غالب" کے فاضل مولانا امتیاز علی عرشی رامپوری اپنی تصنیف میں مولانا حالی مرحوم کے بیان کی تائید و توثیق کرتے ہیں، لیکن نادر خطوطِ غالب کے مرتب کو اصرار ہے کہ غالب نے ۱۸۵۱ء میں پہلا اُردو خط اپنے جدِ اعلیٰ سید کرامت حسین ہمدانی بہاری مرحوم کے نام لکھا۔ یہ خط پہلی جنوری ۱۸۵۱ء کو لکھا گیا جس کی عبارت یہ ہے:

"شاہ صاحب! (سید کرامت حسین ہمدانی مرحوم) کو غالب ناتواں کا سلام پہنچے۔ یہ پہلا خط ہے جو تمہیں اُردو زبان میں لکھ رہا ہوں۔"

اسی بات پر مولانا غلام رسول مہر "غالب" میں اعتراض کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"غالب کی مندرجۂ صدر عبارت سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت کرامت ہمدانی کے نام یہ پہلا اُردو خط تھا۔ یہ کیونکر ثابت ہو گیا کہ اُردو زبان میں غالب کا پہلا خط یہی تھا؟" (غالب ص ۳۹۶)

استدلال سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا مہر کی رائے وقیع ہے۔ غالب مکتوب الیہ (شاہ صاحب مرحوم) کے ساتھ فارسی میں خط و کتابت کرتے تھے اور یہ پہلا خط تھا جو انہیں خلافِ دستور اُردو زبان میں لکھا گیا۔ خدا جانے مولانا رسا ہمدانی نے اسے مرزا کا اُردو زبان کا پہلا خط کیونکر فرض کر لیا؟ مولانا مہر کا یہی خیال ہے کہ غالب مرحوم اس سے پہلے بھی اُردو زبان میں خط و کتابت کیا کرتے تھے اور اُن کے اس خیال کی تصدیق منشی جواہر سنگھ جوہر (شاگردِ غالب) کے نام ایک خط سے ہوتی ہے جس میں اُن سے لنگی کی فرمائش کی گئی ہے۔ فارسی کے اس خط پر دسمبر ۱۸۴۸ء کی تاریخ ثبت ہے۔ اس کی چند سطور یہ ہیں:

"کلبۂ ادیوست بزہ داشتم۔ آں را کرم خورد و سرم بے کلاہ ماند۔ اگرچہ کلاہ (کلہ) نمی جویم۔ لنگ ابریشمی چنانکہ در پشاور و ملتان سازند و اعیان آں قلمرو بر سر پیچیدہ خواہم۔" (پنج آہنگ حصہ پنجم)

اور پھر انہیں منشی جواہر سنگھ جوہر کے نام اسی مضمون کا ایک خط اُردو زبان میں ملتا ہے، جس میں مکتوب الیہ سے مطلوبہ لنگی کا مکرر تقاضا کرتے ہوئے مرزا غالب لکھتے ہیں:

"کیوں صاحب! اب تک ہماری لنگی کیوں نہیں آئی، بہت دن ہوئے تم نے لکھا تھا، اسی ہفتے بھیجوں گا۔" (اُردوئے معلیٰ)

ظاہر ہے کہ یہ خط بھی اسی زمانے ۱۸۴۸ء ہی کا ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اس مقام پر شک و شبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی اور یہ مسئلہ صاف ہو جاتا ہے کہ مرحوم غالب نے اُردو زبان میں خط و کتابت کا سلسلہ ۱۸۴۸ء سے پہلے شروع کر دیا تھا۔ یہ ادبیات

(بقیہ صفحہ ۱۷۱ پر)

سید منظور الحسن برکاتی

مرزا غالبؔ کے ایک باکمال دوست ـ میر تفضل حسین خاںؒ

مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ نہ صرف کثیر الاحباب انسان تھے، بلکہ وہ "مرجعِ کرام و ثقات" بھی تھے اور اس اعتبار سے بڑے خوش نصیب واقع ہوئے تھے کہ وہ اپنی زندگی ہی میں قبولیت و شہرت کے اُس مقام رفیع تک پہنچ گئے تھے، جہاں پہنچنے کے بعد انسان "محسودِ روزگار" بن جایا کرتا ہے۔

مولانا حالیؔ مرحوم "یادگارِ غالبؔ" کے دیباچے میں اُس دور کی دہلی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اگرچہ جس زمانے میں کہ پہلی بار راقم کا دلی جانا ہوا، اس باغ میں پت جھڑ شروع ہو گئی تھی۔ کچھ لوگ دلی سے باہر چلے گئے تھے اور کچھ دنیا سے رخصت ہو چکے تھے، مگر جو باقی تھے اور جن کے دیکھنے کا مجھے ہمیشہ فخر رہے گا وہ بھی ایسے تھے کہ نہ صرف دلی سے بلکہ ہندوستان کی خاک سے پھر کوئی ویسا اُٹھتا نظر نہیں آتا۔ کیونکہ جس سانچے میں وہ ڈھلے تھے وہ سانچہ بدل گیا اور جس ہوا میں انہوں نے نشوونما پائی تھی، وہ ہوا پلٹ گئی۔

زمانہ دگرگونہ آئین نہاد   شد آں مرغ کو بیضہ زریں نہاد

علی الخصوص مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ جن کی عظمت و شان سب سے بالاتر تھی۔" (یادگارِ غالبؔ ص ۱ و ۲)

یہی وجہ ہے کہ جوں جوں زمانہ گزرتا جا رہا ہے اُن کی شاعری اور اُن کے ادبی کارناموں کے جوہر کھلتے جا رہے ہیں اور اُن کی عظمت و اہمیت کا دائرۂ اعتراف وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا ہے اور بقول مولانا مہرؔ:

"مرزا غالبؔ کے احوال و سوانح اور شعر و ادب پر اتنی کتابیں ترتیب پا چکی ہیں کہ اگر انہیں یکجا رکھا جائے تو ایک چھوٹا سا کتب خانہ بن جائے۔ شعرا کو تو چھوڑ دیجئے، اس سرزمین کے شاید ہی کسی ممتاز و مشہور فرد کو تحریر و نگارش اور تحقیق و کاوش میں اعتنا و توجہ کا وہ مقام حاصل ہوا ہو، جو مرزا غالبؔ کے حصے میں آیا۔" (آئینۂ غالبؔ ص ۱۵)

لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس سب کے باوجود آج بھی جب غالبؔ پر کام کرنے والے اس موضوع پر لکھنے کا ارادہ کرتے ہیں تو کوئی نہ کوئی گوشہ انہیں ایسا ضرور مل جاتا ہے جو اب تک زیرِ پردہ خفا میں تھا، یا پوری طرح منظرِ عام پر نہ آ سکا تھا۔

آج کے دور میں جہاں غالبؔ کی نثر و نظم، اُن کے خطوط، اُن کے مُنہ سے نکلے ہوئے ایک ایک لفظ کی دریافت اور اُن کی زندگی کے معمولی سے معمولی پہلو کے بارے میں ادنیٰ سی تحقیق بھی ایک تاریخی انکشاف کی حیثیت رکھتی ہے، وہاں اُن کے احباب، تلامذہ، قدردان، محسنین اور مکتوب الیہم سے متعلق تحقیق و تنقید کی بہت اہمیت رکھتی ہے اور اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی سمجھی جاتی ہے۔



چنانچہ وہ تمام شخصیتیں جنہیں غالب سے کبھی نہ کبھی اور کسی نہ کسی قسم کا تعلق رہا ہے محققینِ غالب کی توجہات کا مرکز ہیں۔ وہ اُن کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکال رہے ہیں اور حسنِ ترتیب و تہذیب کے حُلے لوازمات سے آراستہ کرکے دنیا کی مشتاق نگاہوں کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔

زیرِ نظر مضمون بھی اسی قسم کی ایک کوشش کا نتیجہ ہے۔ یوں تو مرزا غالب کے احباب، تلامذہ، اُن کے معتقدین و محسنین اور مکتوب الیہم میں "تفضل حسین خاں" نام کی کئی شخصیتیں پائی جاتی ہیں

مرزا تفضل حسین خاں۔ تفضل حسین خاں کوکب۔ نواب تفضل حسین خاں نگش۔ تفضل حسین خاں ابن غلام علیخاں۔ اور میر تفضل حسین خاں۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اس نام کی کسی ایک شخصیت کے بھی تفصیلی حالات منظر تک منظرِ عام پر نہ آسکے ہیں اور ان میں کی اکثر شخصیتیں تشنۂ تحقیق ہیں۔

چونکہ ان میں سے بعض کا تعلق راجستھان کی مشہور مسلم ریاست ٹونک سے بھی رہا ہے اور مرزا غالب کے ٹونک، اور والیانِ ٹونک سے مراسم و تعلقات پیدا کرنے میں اُن کی سعی کو بڑا دخل رہا ہے۔ اس لیے میں ایک عرصے سے ان شخصیتوں کے بارے میں تحقیق و جستجو میں مصروف تھا اور چھان بین کر رہا تھا۔ "جوئندہ یابندہ" خدا کا شکر ہے کہ میں اپنی اس سعی میں ایک حد تک کامیاب ہوا ہوں اور مجھے آخرالذکر شخصیت "میر تفضل حسین خاں" کے تفصیلی حالات دستیاب ہوئے ہیں جو پیشِ نظر مضمون کے ذریعے ہدیۂ ناظرین ہیں۔

"میر تفضل حسین خاں" ایک اعلیٰ اور علمی خاندان کے ممتاز فرد تھے۔ اُن کا آبائی وطن نوچیرآباد تھا، لیکن یہ اُس دور میں رؤسائے ٹونک کے دامنِ دولت سے وابستہ تھے اور ریاستِ ٹونک کی جانب سے "سفیرِ ریاست" کی خدمات جلیلہ انجام دے رہے تھے۔ ان کی اعلیٰ قابلیت، فہم و فراست کی اُس وقت نہ صرف ٹونک میں بلکہ ہندوستان کی تمام دیسی ریاستوں میں شہرت تھی، حتیٰ کہ صاحبانِ انگریز بھی اُن کے مشوروں کی قدر کیا کرتے تھے۔

چنانچہ مولانا احمد علی شوق ٹونکی اپنی کتاب "محامدِ علیہ" میں رقم طراز ہیں

"این سید تفضل حسین خاں مردے بود مقرر، دولتِ بے بدل، معاملہ فہم، نکتہ شناس کہ حُلہ و کلاء حاضر باشِ دربار ریذیڈنسی در مہمات مصالحت و صلاحت دیدا، و عائر المرام می شدند و در ہر ریاست راج واڑہ عقلا اہدیا رقائل او بودند۔ احدے را پیش او مجالِ دم زدن نہ بود حتیٰ کہ اکثر صاحبانِ انگریز او را بمشاورت بالاتر نشاسیدندے و کارہائے سرکاری را چنان بوضع خوش و طرحِ خرم سرانجام میداد کہ دیگر سرآمد آں والا و حیراں"۔

(محامدِ علیہ قلمی ص ۱۸۰)

اور رسالہ ہفدہ سالہ امیر و بست سالہ وزیر میں ہے۔

"سفیران و فرستادگان، مدبر مارا بسیار شدہ اما از آنجا ایلچیان با مور و عقیل و سفیران دانشور جلیل رائے نزبکی لالہ لوذ و بعد از و سید تفضل حسین خاں سراپا کمال و در خجستہ فکری و خوش تقریری بے مثال۔"

(رسالہ ہفدہ سالہ قلمی۔ مؤلفہ مولوی دیوان شمس الدین)

اسی رسالے میں ایک اور جگہ ہے

"میر تفضل حسین خاں۔ ساکن خیرآباد متعلقہ ریاست لکھنؤ کہ سید موصوف در علم و دانش و فضل و بینش و تحریر و تقریر بہرۂ وافر و حظ متکاثر داشتہ بودند۔"

میر تفضل حسین خاں کا تعلق ریاست ٹونک سے بہت قدیم ہے۔ یہ اگرچہ بانیٔ ریاست نواب امیرالدولہ محمد امیر خاں بہادر کے عہد



ہلکے ریاست کی خدمات حفاظت انجام دے رہے تھے لیکن رائے رگھن لال وکیل کی برطرفی کے بعد ۸ صفر ۱۲۵۳ ہجری کو بعہد نواب وزیرالدولہ محمد وزیر خاں بہادر اس منصب پر ان کا باضابطہ تقرر عمل میں آیا تھا۔

رسالہ "حالاتِ رئیسانِ ٹونک" مؤلفہ منشی فیض احمد صاحب مرحوم، میں ہے کہ:

"۸ صفر ۱۲۵۳ ہجری کو رائے رگھن لال وکیل حاضرباش ریذیڈنسی کو موقوف کیا جا کر سید تفصل حسین خاں کو وکیل مقرر کیا گیا، جو پیشتر نواب امیرالدولہ کے زمانے میں کبھی ہمراہ رگھن لال، کبھی ہمراہ محمد عمر خاں کے کبھی تنہا بھی وکالتوں میں رہے تھے" (صفحہ)

نواب وزیرالدولہ بہادر ٹونک کے دوسرے فرماں روا تھے۔ ۱۸۳۴ء مطابق ۱۲۵۰ھ میں مسندنشینِ ریاست ہوئے تھے۔ وزیرالدولہ بہادر فطرتاً بڑے شجاع واقع ہوئے تھے اور ذاتی بہادری و سپہ گری کے ساتھ ساتھ ان کو علم و ادب کا بھی خاص ذوق تھا۔ زمانے کے مشاہیر علما اور کامل الفن اساتذہ سے عربی فارسی کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی تھی۔ زمانۂ ولیعہدی میں بطور یرغمال دہلی میں قیام پذیرہ چکے تھے، اس لئے انہیں دہلی کے اربابِ کمال سے قریبی تعلق تھا اور بہتوں سے دوستانہ مراسم بھی پیدا ہو گئے تھے۔

مولانا عبدالقدوس ہاشمی "دائرۂ زبانِ اردو" میں لکھتے ہیں:

"اگرچہ معین الدین محمد اکبر شاہ ثانی اور سراج الدین بہادر شاہ کی دہلی شاہ جہاں و عالمگیر کی دہلی نہ تھی، مگر اس عہد وقت میں بھی دہلی میں اربابِ فن کا مجمع تھا۔ وہ کون سا فن تھا جس کے ماہرین دہلی میں موجود نہ تھے۔ شاعر، انشاپرداز، خطیب اور مورخ۔ سادہ کار اور مصور۔ غرض فقیہ و محدث سے لے کر سرودیوں تک جو تھا، اپنے وقت کا یگانۂ روزگار تھا۔ نواب وزیر خاں سے اُن میں سے اکثر کی ملاقاتیں دربار، گھر اور مشاعرے میں ہوا کرتیں' خود نواب بھی سنجیدہ اور دانش مند امیر تھے۔ کسی قدر لپستہ قد۔ لمبی داڑھی۔ بھرا بھرا سا بدن۔ رعب دار چہرہ اور متین گفتگو۔ شرفائے دہلی کے آداب نشست و برخاست نواب اور اُن کے گھرانے میں مدت تک محفوظ رہے۔ شاعروں میں سے ذوق۔ مومن۔ عارف اور غالب وغیرہ سے اُن کی صحبتیں رہیں" (دائرۂ زبانِ اردو صفحہ ۱۴۱)

قدرت نے وزیرالدولہ کو ایک خاص قسم کا دل و دماغ عطا فرمایا تھا۔ اُن کی ذات مختلف قسم کی قابلیتوں کا حیرت انگیز مجموعہ تھی۔ وہ بڑے مردم شناس اور اربابِ علم و فن کے بڑے قدرداں تھے۔ ہر ایک قسم کے اہلِ کمال اُن کے دربار سے وابستہ تھے۔ مولوی سید اصغر علی آبرو کا بیان ہے

"شہنشاہ اکبر کے نورتنوں کی طرح نورتن ہی نہیں بلکہ سیکڑوں یگانۂ روزگار اور باکمال ہستیاں دربارِ وزیری میں جمع ہو گئی تھیں اور آں کی بارگاہ سلیماں جاہ مرجعِ اربابِ فضل و کمال و مجمع دانایانِ روزگار و یکتہ کارانِ باوقار تھی" (تاریخ ٹونک صفحہ ۳۲)

میر تفصل خاں کی ہستی بھی ایسی ہی ایک یگانۂ روزگار ہستی تھی۔ نواب وزیرالدولہ اُن کی بڑی تعظیم و تکریم فرماتے تھے اور اُن کے خاندان کے اکثر افراد کو ریاست کے مختلف عہدوں پر سرفراز فرما رکھا تھا۔

مرزا غالب سے بھی میر تفصل حسین خاں کے تعلقات و مراسم یگانگت کے تھے نواب وزیرالدولہ کے دربار سے غالب کو قریب کرنے اور زمانۂ ولیعہدی کے تعلقات میں تجدید اور استواری و استحکام پیدا کرنے میں ان کا بڑا ہاتھ رہا تھا۔

چنانچہ عید الضحیٰ ۱۲۶۷ ہجری کی تقریب پر مرزا غالب نے نواب وزیرالدولہ کی مدح میں جو ذیل کا قصیدہ ارسال کیا تھا



وہ انہی تفضل حسین خاں کے توسط سے ارسال کیا تھا۔

عیدِ اضحیٰ بہ سرآغازِ زمستاں آمد   وقت آراستن حجرہ و ایواں آمد
گرمی از آب بروں رفت و حرارت ز ہوا   محمل مہر جہاں تاب بہ میزان آمد
زاہی کا ہدوست لاست دو فر انتر زدنے   موسم دیر عمودن بہ شبستان آمد
آمد از فرو خرد اطلس و سیفور بدوز   مہر بہ میرود ایک بہ آسماں آمد
ہند در فصل خزاں نیز بہار دارد   گو بہ گوں سبزہ حلی بہ خیاباں آمد
دی و بہمن کہ در اقلیم دگر تیغ ببرد   اندریں ملک گل و سبزہ فراواں آمد
نے شگر لشکر صف آراست بکوہ نسیم   گفت جائیست دگر سرزدہ توقاں آمد
نخل نارنج نہ بینی کہ ز بار میوہ و شاخ   گوئے و چوگاں بہ کف آورد و بمیداں آمد
تا برد داغ ز ہجر شقائق مدلش   گل صد برگ بہ دلجوئی دہقاں آمد
گر بہ ایں گرمی ہنگامہ تماشہ دارد   از چہ نرگس پئے نظارہ بہ بستاں آمد
رقم از خویش و گل و لالہ فراموش کردم   رانکہ بستاں ہمہ بر صورت بستاں آمد
سخن از قدرہ در فرہنگ خداوندارم   داستاں گل و گلزار بیاباں آمد
ذاتی آں کیست کہ مستور نکو نامی را   نام نیکوئے وے آرائش عنواں آمد
صورت معنی اسلام وزیر الدولہ   کہ دلش آئینہ صورت ایماں آمد
مہر و مہ را بتر ایں اوج فیض آورد سپہر   ایں تماشا گاہ حسیں سود بہ روداں آمد

مرزا نے اس قصیدے کے صلے کی وصولی پر جو رسید مرقومہ ۱۴ صفر ۱۲۶۸ھ بطرز عرضداشت نواب وزیر الدولہ کی خدمت میں ارسال کی تھی، اس میں اس توسط کا ذکر کیا ہے۔ مرزا لکھتے ہیں :

"عرضداشت بندۂ درگاہ اسد اللہ۔
بحضور مکرمت ظہور بندگان دالادرمان حضرت نواب صاحب قبلہ و کعبہ دو جہاں
قلزم فیض و محیط احسان دام اقبالہٗ !
محوی براین کہ روزے چند ازیں پیش عرضداشتی با قصیدہ کہ در تہنیت عید سعید ذی الحجہ در ریختہ

کلک بیان صریر بود، بتوسط خاں صاحب الطاف نشاں میر تفضل حسین خاں ارسال یافتہ۔ امروز کہ چہاردہم صفر ۱۲۶۸ھ است، خاں صاحب مشفق طالع یار خاں مستور کراتے کہ مہر بہر شعاع خدائے گاں بر عنواں داشت بمن سپردند و مبلغ چہار صد و پنجاہ و سہ روپیہ سکۂ انگریزی کہ دریں قلمرو رواج دارد نیز حوالت کردند، سپاس یاد آوری و شکر درویش پروری بجا آوردم، یارب ولی نعمت را عمر و دولت و جاہ و مکنت فراواں، و لفظ امیر المومنین مترف نامہ اقبال خداداد بلا ریب عنواں باد"

مُہر   نجم الدولہ دبیر الملک
اسد اللہ خاں غالب نظام جنگ



[illegible] صاحب طالع یار خاں کے ایماء اور فرمائش پر فن مالک پر فارسی میں ایک رسالے کا ترجمہ کیا اور اس پر دیباچہ و خاتمہ لکھ کر نواب وزیر الدولہ کی بارگاہ میں پیش کرنے کے لئے طالع یار خاں کو سپرد کیا تو ضروری سمجھا کہ میر تفضل حسین خاں کو بھی اس خدمت سے باخبر کر دیا جائے۔

چنانچہ مرزا اپنے ایک خط میں تفضل حسین خاں کو لکھتے ہیں

"این بار طالع یار خاں کہ دوست دیرینۂ من است بار گرانی بر دوش من نہاد یعنی بپارسی ترجمہ کردن ہندی عبارتی را کہ سہ گونہ آئین بیجاپور مالک مشتمل بود، از من خواست و سرانجام این خدمت را دریعۂ خوشنودی خاطر خطیر حضرت نواب معلی القاب علی جناب والاجاہ چون ریزہ خوار خوان والاجاہ بودم و سپاس می بایست گزارد و توسن خامہ را بدان گزرگاہ تنگ جولان آوردم و سعیہ کہ دیباچہ و خاتمہ بر دارد ترتیب دادہ سرکار فرما سپردم تا روائی آرد و بیئے ورد توقیع را بہانہ تواند بود"

"اب کی مرتبہ طالع یار خاں نے کہ میرے دیرینہ دوست ہیں، ایک بار گراں میرے کندھوں پر رکھ دیا، یعنی مجھ سے کہا کہ اردو کی ایک عبارت کا ترجمہ فارسی میں کر دو۔ جو مالک کے بیجوں اور گروں پر مشتمل تھی اور اشارہ کیا کہ یہ خدمت غالب معلی القاب عالی جناب (والی ٹونک) کی خوشنودی کا باعث ہوگی۔ چونکہ میں اس والاجاہ کے مائدۂ کرم کا زلہ خوار ہوں اور شکر گذاری میرا فرض ہے اس لئے میں نے اپنے توسن قلم کو اس تنگ وادی (یعنی ترجمہ) میں چلایا اور ایک رسالہ جس میں میری طرف سے دیباچہ اور خاتمہ بھی ہے تیار کرکے اس کے سپرد کیا، تاکہ یہ نواب صاحب کی خوشنودی کا ذریعہ بن سکے۔

(مضمون مالک رام ذکر غالب۔ رسالہ آج کل فروری ۶۳ء صفحات ۱ و ۱۱)

سنہ ۱۲ھ میں میر تفضل حسین خاں کا انتقال ہوا اور اُن کی جگہ اُن کے بھائی مولوی سید ارشاد حسین اور اُن کے فرزندان سید صامن حسین و حافظ سید احمد حسین مختلف ریاستوں کے لئے سفیر مقرر ہوئے۔

رسالہ ہفدہ سالہ امیر والست سالہ دریر" میں ہے کہ،

"چون سید موصوف در سن یک ہزار و دو صد و ہفتاد ہجری (سنہ ۱۲۷۰ھ) بیک نام و ہا ایمان از جہان درگذشت ولیس ارو برادرش سرایا ارشاد و دیگر فراست بہادر سید ارشاد حسین و پسران کلاں سید تفضل حسین خاں مولوی حافظ سید صامن حسین و حافظ سید احمد حسین اند کہ بعنایت تعالیٰ ہموارہ ملازم در بار رزیڈنسی انگریزی حاضر بودہ کارہای امور ملک و دولت آقا و کارفرمائیے خود را انتظام و حسب انتظام داہد و مید ہند ہستند"

مرزا غالب کو جب ان کے انتقال کی خبر ہوئی تو بہت صدمہ ہوا اور انہوں نے اپنے تلمیذ رشید مرزا تفتہ کو لکھا۔

"اب جب کہ اس خط کا جواب تمہارے پاس سے آئے گا، تمہارے اشعار تم کو بھیجیں گے۔ ہائے ہائے میر تفضل حسین خاں ہائے ہائے

دحی و مراجر بہ کردی سر کیسم لطرنہ کردی

شغلِ ہمیں

یہاں پہنچ گیا ہے کہ سید احمد حسین اور تفضل حسین بدستور بحال رہے۔
اسد اللہ ۔ ۲۳ فروری ۱۸۵۴ء ۔



عالمگیر ۱۸۶۹ء
پڑا بیٹا اُن کا اُن کے کام پر مقرر ہوا اور سعید

(اُردوئے معلیٰ ص ۵۳)

اس کے بعد مرزا نے ذیل کا قطعہ تاریخ وفات کہا ہے

چوں تفضل حسین خاں کہ بود | کس نظیرش بشیوهٔ و ہنجار
آنکہ او را ہمی تواں گفتن | مردمِ دیدهٔ اُولوالابصار
آنکہ او را روا بود خواندن | گوہرِ بحرِ حیدرِ کرار
آنکہ اندرائے روشنش در دہر | مہر را بود گرمیٔ بازار
بود کرم گستری لطیف نہاد | در وفا پیشگی شگرف آثار
داشت اندر شکنجِ راحت و رنج | داشت اندر نوردِ لیل و نہار
تیزی ہوش موشگافی فکر | خوبیٔ خوئے و شوخیٔ گفتار
جاں بجاں آفریں سپرد و گذشت | زیں گذرگاہ تنگ ناہموار
نے غلط گفتہ ام کی میرد | ایں چنیں مرد زندہ دل ہشیار
تا شود محرم سرائے سرور | زیں جہاں دُژم گرفت کنار
جستم از سالِ رحلتش اثرے | گفت غالب کہ خود دریں ہنجار
از بروجِ سپہر جوئے مآت | عشرات از کواکبِ سیار
گیرم آحاد گفت شرمت باد
از خدا و ندِ واحدِ القہار

۱۲۷۱ھ

(کلیاتِ غالب نثر ص ۴۵ و ۴۶ مطبوعہ نولکشور قطعہ ۵۷)

"تاریخ محامد علیہ" میں مولانا احمد علی سیماب لکھتے ہیں:

"درہمیں سال واقعہ وفات تفضل حسین خاں سپہرِ نظیر و مصاحب خجستہ تدبیر ملتی سحر نگار، مقرر فصاحت آثار جہانیاں سراکدورت اندوه و غم و الم گرد اسید،
اقبال وزیری بود کہ ایں کسال را کہ مبارک و ماعی بوئے گل گراں آمدیے دریں رنگستان سنگلاخ افگند،
اسد اللہ خاں غالب، قطعۂ وفات او نوشتہ ہمہ پُرسوز و گداز ست، مادۂ تاریخ نوشتہ میشود حالی از لطف نیست۔

قطعہ

از حساب بروجِ گردوں ... | عشرات از کواکبِ سیار
گیرم آحاد گفت شرمت باد | از خدا وند واحد القہار (ص ۲۴)

مشہور محقق غالب جناب مالک رام اپنے ایک مضمون میں جو "ذکرِ غالب" کے عنوان سے شائع ہوا ہے "سرِ جیں" اور "داغ دود" کے تذکرے کے ذیل میں رقم طراز ہیں:
"اس کا حصۂ نظم اور ٹیل کالج میگزین لاہور کے اگست ۱۹۶۰ء کے اور حصۂ نثر اگست ۱۹۶۱ء کے شمارے میں



— منشی تفضل حسین — خاں کے نام بھی ہیں۔ (رسالہ آجکل فروری ۶۳ء ص۱)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میر تفضل حسین خاں اور مرزا میں — خط و کتابت اور مراسلت کا سلسلہ برابر جاری رہتا

میر تفضل حسین خاں کے انتقال کے بعد بھی مرزا غالب کے تعلقات نواب وزیر الدولہ سے قائم رہے۔ مرزا کے احباب میں سے مولانا نجف علیخاں جھجروی، استاد طالع یار خاں، مولوی سید سراج احمد اور دوسری کئی ایسی شخصیتیں ٹونک میں موجود تھیں ان تعلقات کی استواری و استحکام کا باعث بنی رہیں اور مرزا کی دامن وزیری سے وابستگی کو آخر دم تک باقی رکھنے میں معاون ثابت ہوئیں۔

جیسا کہ اوپر گذر چکا میر تفضل حسین کے بعد ان کے فرزند حافظ سید صادق حسین و حافظ سید احمد حسین عہدۂ سفارت پر مامور ہوئے۔ یہاں یہ واضح کر دینا غیر مناسب نہ ہوگا کہ حافظ سید احمد حسین مشہور امام فلسفہ علامہ فضل حق خیرآبادی کے داماد تھے اور کلام اللہ کے جید حافظ ہونے کے ساتھ ساتھ عربی فارسی کی اچھی استعداد رکھتے تھے۔ شعر و سخن کا بھی ذوق تھا۔ رسوا تخلص فرماتے تھے۔

خوش قسمتی اور حسن اتفاق سے آپ کو رفیقۂ حیات جو ملیں وہ ایک مخر روزگار عالم کی دختر ہونے کے ساتھ ساتھ خود بھی بڑی فاضلہ اور صالحہ خاتون تھیں اور شعر و شاعری کا نہایت ستھرا اور پاکیزہ مذاق رکھتی تھیں۔ حرماں تخلص تھا۔ ذیل کا مشہور شعر ان ہی کی فکر عالیہ کا نتیجہ ہے ؎

غمزۂ یار کا کیا تم کو پتہ بتلاؤں — جیسا مشتاق ہو، سردیک بھی ہے دوڑھی ہے

حافظ سید احمد حسین خاں کے بعد ان کے بڑے فرزند حافظ سید محمد حسین (جو دبیلے شاعری میں بسمل خیرآبادی کے نام سے مشہور ہیں اور جناب نادم سیتاپوری کی تحقیق کے مطابق مرزا غالب کے چہیتے شاگرد بھی رہ چکے تھے) منصب سفارت پر مامور ہوئے۔

سنہ ۱۳۱۳ھ مطابق سنہ ۱۸۹۵ء میں امین الدولہ نواب محمد ابراہیم علیخاں بہادر نے میر منشی دربار مولوی سید زین العابدین شکر فی کے انتقال پر اُن کی جگہ حضرت بسمل خیرآبادی کو "میر منشی" کے معزز اور ذمہ دار عہدے پر سرفراز فرمایا۔ بعد ازاں مئی ۱۸۹۶ء میں امین الدولہ بہادر نے "ملک الشعراء لسان الملک" کے موقر خطاب سے حضرت بسمل کو معزز فرما کر اپنا "استاد سخن" مقرر فرمایا۔

امین الدولہ بہادر نے مسند نشین ریاست ہونے کے بعد شعر و سخن کا مشغلہ بھی شروع فرما دیا تھا۔ خلیل تخلص فرماتے تھے۔ ابتداءً نواب سلیمان خاں اسد لکھنوی مشیر سخن تھے۔ آپ کے دور میں مشاعروں کی بڑی گرم بازاری تھی۔

حضرت بسمل کی وفات کے بعد اُن کے چھوٹے بھائی سید افتخار حسین مضطر خیرآبادی نواب صاحب کے مشیر سخن مقرر ہوئے۔ حضرت مضطر اس سے پہلے سفارت، نظامت اور دوسرے مختلف عہدوں پر فائز رہ چکے تھے۔

میر تفضل حسین خاں کے بھائی مولوی ارشاد حسین خاں بھی اپنے وقت کے یگانۂ روزگار عالم تھے اور نواب وزیر الدولہ کے عہد حکومت میں وکیل دربار کے عہدے پر فائز تھے۔ تیسرے والی ریاست نواب محمد علیخاں بہادر نے انہیں "معتمد خاص" کا موقر خطاب عطا فرمایا تھا۔

مولوی ارشاد حسین خاں کو فارسی شعر و ادب کا بڑا گہرا ذوق تھا۔ ٹونک کے محلہ قافلہ میں اُن کا بالا خانہ تھا۔ جہاں فردوسی، نظامی، انوری، سعدی، حافظ اور جامی و خسرو کے کلام پڑھے جاتے تھے اور اردو فارسی کے مشاعروں کی محفلیں منعقد ہوتی رہتی تھیں۔ ارباب فضل و کمال کا مجمع رہتا تھا۔ جس میں اہل ٹونک کے علاوہ دہلی، لکھنؤ اور اودھ کے فضلا اور شعرا بھی اکثر شریک ہوتے تھے۔

(باقی صفحہ ۱۷۸ پر دیکھئے)

عطا محمد شعلہ

غالب اور تصورِ محبوب

غالب کا مطالعہ اس حیثیت سے بھی دلچسپی کا باعث ہے کہ اُس کے کلام میں محبوب کی صورت اور سیرت کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے وہ اپنے سے پہلے شاعروں کے محبوب جیسا ہوتے ہوئے بھی اُس سے کچھ خاص باتوں اور خصوصاً سیرت کی تفاصیل میں قطعاً مختلف ہے، مگر اُردو کی شاعری جس طرح ایک خاص روایتی انداز پر کافی دنوں چلی ہے اسی طرح اس زبان کے تنقید نگار بھی ایک خاص ڈھرّے پر چل رہے ہیں۔ بہت کم لوگ ہیں جو اس خاص ڈھرّے سے ہٹ کر بھی تھوڑا بہت سوچ سکتے ہوں۔ اصل میں ہمارے یہاں تنقید نگاری وجود میں آتے ہی کچھ ایسے لوگوں کے ہتھے چڑھ گئی جو اس کو ایک آرٹ کی طرح استعمال کرنے لگے۔ کسی فنی یا علمی اور سائنسی تحقیق کا انداز اختیار کرنے میں تو خوب جگر خون کرنا پڑتا؟ ہاں اِدھر اُدھر کی دو چار رائیں پڑھیں، کچھ چٹکلے اور چونکا دینے والے جملے تراش کر اِدھر اُدھر چپکا دیے، چٹخارا پن پیدا کرنے کے لیے کوئی اَن مِل بے جوڑ بات گڑھی، کچھ تمہید اور کچھ خاتمے کے لیے عمدہ جملے اپنی ذہانت کے بل پر تیار کیے، ابتدا اور انتہا کے لیے کچھ خطیبانہ انداز اختیار کیا اور لیجیے تنقیدی مضمون تیار ہو گیا۔ چند ایسے مضامین جمع ہو گئے تو کتاب بن گئی۔ اب کچھ بزرگ تنقید نگاروں کی خوشامد درآمد کر کے چند چلتی ہوئی رائیں جمع کر لیں جن کو وہ بزرگ تنقید نگار ایک آدھ لفظ یا جملے کی تبدیلی سے ہر نوجوان مصنف کی تعریف و توصیف کے لیے پھر اس طرح ازبر کیے رہتے ہیں کہ جہاں چاہا فٹ کر دیا اور اس طرح اُن نوجوان مصنفوں کی مدح سرائی کے سہارے خود بزرگ تنقید نگار بنے رہتے ہیں۔ غرض کہ "من ترا حاجی بگویم تو مرا ملّا بگو" کا ایک حلقہ ادب کے اُفق کو اِس طرح گھیرے رہتا ہے کہ اب کسی ایمان دار تنقید نگار کے لیے جو کھری اور سچی بات کہتا ہو، ادب میں کوئی جگہ باقی رہتی ہی نہیں۔ یہ طریقہ یوں تو شاید دنیا کی دیگر زبانوں میں بھی رائج ہے اور انگریزی جیسی عظیم الشان زبان کے ادیبوں میں بھی یہ وبا پائی جاتی ہے مگر وہاں یہ طریقہ اعلیٰ ادیبوں اور تنقید نگاروں میں کم اختیار کیا گیا ہے۔ ہاں دُوسرے تیسرے درجے کے ادیب اِس مرض میں ضرور مبتلا ہیں، مگر اُردو میں تو اعلیٰ قسم کا ادیب اور درجۂ اول کا نقاد کہلانے کے لیے بھی اس طریقے کے علاوہ کوئی دُوسرا طریقہ ہے ہی نہیں۔ ہاں تو اِس مرض کی بدولت اُردو ادب کے طالب علموں اور نئے تنقید نگاروں کے لیے ہر طرف سامانِ گمراہی کے علاوہ کچھ ہے ہی نہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر عبداللطیف اور عندلیب شادانی ہی نہیں بلکہ وہ لوگ بھی جو تعمیری نقاد کہلاتے ہیں، غالب کے متعلق یہی رائے رکھتے ہیں کہ اُس کا محبوب بھی اُردو شاعری کا وہی روایتی شاہد بازاری ہے اور اس کے علاوہ کچھ ہے ہی نہیں۔ مثال میں ذیل کے اشعار اور ان جیسے دُوسرے اشعار اُن کی خدمت میں ہاتھ باندھے کھڑے ہیں:

لو وہ بھی کہہ رہے ہیں کہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں



ڈھول دھپّا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں ہم ہی کر بیٹھے تھے غالبؔ پیش دستی ایک دن

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے

ہم سے کھل جاؤ بوقتِ مے پرستی ایک دن ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذرِ مستی ایک دن

میں گیا بھی واں تو اُن کی گالیوں کا کیا جواب یاد تھیں جتنی دعائیں صرفِ درباں ہو گئیں

وغیرہ وغیرہ۔

مگر مندرجۂ بالا اشعار ہی وہ اشعار ہیں کہ جن کی بنا پر میں کہتا ہوں کہ غالبؔ کا محبوب غالبؔ سے پہلے شاعروں کے روایتی محبوب سے قطعاً مختلف ہے اور اس کو شاہدِ بازاری کسی طرح نہیں کہا جا سکتا۔ اس کے برعکس وہ ایک نہایت شریف اور پاسِ عزت کا احساس لیے ہوئے ایک آدرش محبوب ہے کہ جس پر ہم بجا طور پر ناز کر سکتے ہیں۔ آیئے ان اشعار کا تجزیہ کر کے دیکھیں کہ یہ رائے کہاں تک صحیح ہے۔ پہلے شعر کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ محبوب غالبؔ کو بے ننگ و نام اور کم حیثیت شخص بتاتا ہے اور اس لیے اس کی طرف متوجہ نہیں ہے۔ غالبؔ کو افسوس ہے کہ اُس نے کیوں اپنا مال و متاع راہِ عشق میں لٹا دیا کہ آج اُسے یہ طعنے کو ملا اور وہ بھی ایسے شخص سے جس کی خاطر وہ برباد ہوا۔ یہ درست ہے کہ شاہدانِ بازاری ہمیشہ مال و متاع والے شخص کی تلاش میں رہتے ہیں اور کم مایہ شخص کی طرف توجہ نہیں کرتے یا کم کرتے ہیں لیکن میں پوچھتا ہوں کہ انسان کی ابتدا سے آج تک عام طور پر ہندوستانی سماج کا طرزِ عمل کیا اس سے مختلف ہے؟ شادی بیاہ ہی میں نہیں بلکہ عام سوسائٹی میں ملنے جلنے اور دوستی کے تعلقات میں بھی سماجی اور اقتصادی برابری کا لحاظ کیا جاتا ہے اور عام طور پر ایک سطح کے اقتصادی و سماجی حیثیت والے ہی آپس میں میل جول اور تعلقات رکھتے ہیں یا پھر اپنے سے بڑے کی طرف اُن کی نگاہ لگی رہتی ہے۔ اپنے سے کم حیثیت والے سے لوگ ہمیشہ ہی عام طور پر زیادہ ربط و ضبط اور میل جول کے قائل نہیں رہے۔ اب رہا لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد اور ہیر رانجھا کے معاملات، تو یہ اتفاقات زمانہ ہیں۔ ان کو زندگی کا معمول آج تک کسی بھی طبقاتی سماج میں نہیں مانا گیا۔ پھر ہم یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ غالبؔ بھی ایک طبقاتی سماج ہی کا نمائندہ ہے جس کی گرفت سے ہم آج تک (یعنی سو برس مزید گزر جانے پر بھی) باہر نہیں نکل سکے۔ غالبؔ نے اپنے اس شعر کے ذریعے مثالیت سے ہٹ کر عام سماجی حالات پر ایک لطیف اور نازک چوٹ کی ہے جس سے ہمیں لطف لینا چاہیے اور اس حیثیت سے اگر ہم اس شعر پر غور کریں تو غالبؔ ہم لوگوں سے بڑا ترقی پسند نظر آتا ہے، شاید اسی لیے کہ ہم اُس کی قدر و قیمت کو گھٹانا چاہتے ہیں۔

اب دیکھیے دوسرے شعر کا تجزیہ کریں۔ اس میں ڈھول دھپّا کا لفظ غزل کی روایتی زبان اور روایتی مزاج کے خلاف نظر آ رہا ہے۔ اسی وجہ سے کوئی بھی شخص اس شعر کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ بڑے سے بڑا تنقید نگار معذرت خواہ ہے کہ "ہاں صاحب محبوب تو غالبؔ کا بھی شاہدِ بازاری ہے اور وہ بھی ادنیٰ درجے کا۔ مگر کیا کہا جائے اس زمانے کا ماحول ہی ایسا تھا کہ غالبؔ بھی ایسے اشعار کہنے پر مجبور ہوا مگر غالبؔ کے یہاں ان اشعار کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے، ہمیں ان اشعار کی بنا پر غالبؔ کے ان گھٹیا اور پوچ اشعار کو برداشت کرنا ہے یا ان سے درگزر کرنا ہے۔" قربان جایئے اس ناقدانہ فہم کے اور اس معذرت خواہی کے۔ معلوم ہوتا ہے کہ غالبؔ نے یہ شعر کہہ کر اردو شاعری ہی کو گندہ کر دیا۔ لیکن کوئی یہ سوچنے اور سمجھنے کو تیار نہیں کہ غالبؔ نے کہا کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس کے سراپا ناز محبوب کو ڈھول دھپّے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔



وہ غلطی ایسی ہی تھی، اِس لئے کہ ہم اُسے بے تکلف جان کر ایک دن پیش دستی کر بیٹھے تھے، جس کے نتیجے میں وہ دھول دھپے پر اُتر آیا۔ یعنی اُن کا محبوب اِس قدر باکردار، باحیا اور پاسِ ناموس و عزت رکھنے والا ہے کہ جب ہم نے موقع غنیمت جان کر پیش دستی کی تو اُسے یہ حرکت ایک تابیہ بھی گوارا نہ ہوئی اور جواباً اُس نے ہماری تواضع دھول دھپے سے کر ڈالی۔ یعنی محبوب نہ صرف یہ کہ پاکباز ہے بلکہ اُس میں ایک مضبوط قسم کا احساسِ خود اعتمادی بھی ہے، ورنہ اُس زمانے میں تو عورتیں ایسی بدتمیزیوں پر دل ہی دل میں کڑھ کر رہ جاتی تھیں اور رُسوائی کے خوف سے نہ کوئی احتجاج کر پاتی تھیں اور نہ کسی سے شکوہ یا گلہ۔ مگر غالب اپنے محبوب یا محبوبہ میں وہ اوصاف دیکھ رہے تھے جو اُن سے ایک صدی بعد بھی خال خال ہی ملتے ہیں۔ کیا ایسے محبوب کو شاہدِ بازاری کہنے کی ہمت کی جا سکتی ہے؟ شاہدِ بازاری کا الزام ایسے محبوب پر وہی تراش سکتے ہیں جنھوں نے اِس شعر کا مطالعہ کرتے وقت اپنے دماغ کی کل کھڑکیاں بند کر لی ہوں اور جو محض چند تنقید نگاروں کی رائے پر آنکھیں بند کر کے ایمان لے آئے ہوں۔

غالب کا محبوب، ایک باپردہ، باحیا اور ننگ و ناموس کا پاس کرنے اور پاس رکھنے والا محبوب ہے۔ وہ تو تیسرے شعر کے مطابق ایک ایسے گھر میں رہتا ہے جہاں پاسبان بھی ہے اور جو سرپھرے عاشقوں کی تواضع گوش مالی سے کرتا ہے۔ محبوب تک جانے کی اجازت دینا تو درکنار، چوتھے شعر کے مطابق غالب مے پرستی کے وقت بھی اُس سے کھلنے کی ہمت نہیں پاتے۔ ہاں طرح طرح کی دھمکیاں دے کر اُسے اپنے ساتھ بے تکلف کرنا چاہتے ہیں اور پانچویں شعر میں پھر وہی دربان موجود ہے کہ جس نے باوجودِ کمالِ منت و زاری بھی محبوب تک رسائی نہ ہونے دی۔ یہاں تک کہ دربان کے تیور دیکھ کر ہی غالب اپنی ہمت ہار بیٹھے۔ ایسا صاحبِ سیرت اور عفت و عصمت رکھنے والا محبوب اُردو شاعری میں ڈھونڈنے سے کم ملتا ہے۔ غالب اِس حیثیت سے بھی اُردو کے قدیم غزل گو شعرا میں نرالے ہیں۔ غالب سے پہلے ولی کے یہاں تو حیا و شرم والا محبوب ملتا ہے، مگر ولی سے غالب تک پھر کسی دوسرے محبوب کو غالب کے محبوب سے آنکھ ملانے کی ہمت نہیں ہوتی۔ یقین نہ ہو تو آیئے، دبستانِ اُردو کی سیر کریں اور دیکھیں کہ غالب سے پہلے کے مشہور شعرا کے محبوبوں کے تیور کیسے ہیں؀

غنیمت بوجھ ملنے کے ولی سے ‎ ‎ ‎ نگاہِ پاکبازاں کیمیا ہے

ہر اک وقت مجھ عاشقِ پاک کوں ‎ ‎ ‎ پیارے تری بات پیاری لگے

کیا ہوں ترک نرگس کا تماشا ‎ ‎ ‎ طلب گارِ نگاہِ باحیا ہوں

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ولی کا محبوب تو باحیا ہے ہی، مگر اُس پر وہ اپنی پاکبازی کا سکّہ بٹھا کر محبوب کو عشق کے دام میں پھنسانا چاہتے ہیں اور اِس لئے وہ بار بار اپنی پاکبازی کے گیت گا رہے ہیں۔ یہ اِس بات کا ثبوت بھی ہے کہ ولی صوفیا کی پاک محبت کے تصور کے قائل ہیں، جس میں معاملہ صرف دل و نظر تک محدود رہتا ہے۔ اِس کے برخلاف میر تقی میر کا محبوب کچھ اِس سطح سے نیچے اُترتا ہے؀

مہر و وفا و لطف و عنایت اک سے نہ واقف اِن میں سے ‎ ‎ ‎ اور تو سب کچھ طنز و کنایہ، رمز و اشارہ جانے ہے

ولی کے محبوب کے مقابلے میں میر کا محبوب کچھ چٹکیلا ہے، لیکن ہے باعصمت، کیونکہ وہ جانے اور پہچانے تو سب کچھ لگا ہے مگر ابھی عاشق کو باتوں سے آگے بڑھنے کی اجازت نہیں دیتا۔ لیکن سودا چونکہ نشاطیہ لے کے پہلے نے لواروں میں ہیں اُن



کا محبوب کچھ اور بھی چھبیل چھبیلا نظر آتا ہے۔

گل پھینکے ہے اوروں کی طرف اور ثمر بھی　　　اے خانہ بر انداز چمن کچھ تو ادھر بھی

[illegible] یہ تھا کہ وہ لطف و عنایت کا انداز جو غیروں کے ساتھ روا رکھا جا رہا ہے، اس کا عشر عشیر بھی اُن کے ساتھ بھی روا رکھا جاتا۔ لیکن پھر بھی ابھی جسم کی شاعری زیادہ نہیں آئی۔ ابھی محبوب صحیح معنوں میں ارضی نہیں ہوا۔ ابھی وہ کچھ دور دور ہے۔ اگرچہ ولی کے برخلاف وہ نظر آتا ہے اِسی دنیا کا باشندہ اور گوشت پوست کا بنا ہوا انسان۔ یہ ولی کی پاک محبت کے تصور سے ایک گریز ہے جو صاف اور صریح طور پر اُردو شاعری میں نظر آ رہی ہے یہاں تک کہ مصحفی نے اس کو اور بھی زیادہ عملی اور پھر انشا و جرأت نے اسے سراسر عالمِ خاک کی چیز بنا دیا۔ مصحفی نے تو جسم کی نزاکت اور اُس کے رنگ کی لطافت ہی کے ذکر سے اپنے ایوانِ دل و دماغ کو سجایا تھا، مگر جرأت و انشا نے اس سے آگے کی منزل بھی طے کر ڈالی۔ اب رُوح کا واسطہ ہی نہ رہا۔ جسم ہی جسم رہ گیا اور عشق کا کام رہ گیا کام و دہن کی تشنگی بجھانے کا۔ مثال میں ذیل کے اشعار کا مطالعہ فرمائیں ؎

میں ہوں اور خلوت ہے اور پیشِ نظر معشوق ہے　　　ہے تو بیداری ولے کچھ دیکھتا ہوں خواب سا　(مصحفی)

کیا کہوں حُسن لطافت جامۂ شبنم سے ہائے　　　نکلا ہی پڑتا ہے وہ گورا بدن مہتاب سا

اتنا بھی حال و خط کا بنا ماہے کیا میاں　　　بس رکھو آئینہ کہاں مکھڑا سنور چکا

سویا تھا لپٹ کر میں اس سانولے لیکن　　　پہلو سے مرے پہلو تا صبح جدا رکھا

ملی رہتی تھیں نظریں غلبۂ اُلفت سے آپس میں　　　نہ خوف اس کو کسی کا تھا نہ ہم لوگوں سے ڈرتے تھے　(جرأت)

کفِ افسوس ملتے ہیں کہ ہم جرأت نہیں اس جا　　　نہیں تلوے تو سہلاتے گھڑی دو چار کیا کیجے

دل ملے پر بھی ملاپ ایسی جگہ ہوتی رہی　　　ہم ادھر تڑپا کئے اور وہ اُدھر تڑپا کیا

انگلیاں پاؤں کی اب اپنے وہ دَلوائے ہے　　　کچھ تو اے پاسِ ادب ہاتھ بڑھانے دے مجھے

چھیڑنے کا تو مزہ تب ہے کہو اور سنو　　　بات میں تم تو خفا ہو گئے لو اور سنو　(انشا)

ہاں پھر تو کہیو ہائے وہ کسطرح ہو غضب　　　انشا نہ چھیڑ۔ تجھ کو مری جان کی قسم

مل مجھ سے اے پری تجھے انسان کی قسم　　　دیتا ہوں تجھ کو تختِ سلیمان کی قسم



رات وہ بولی مجھ سے ہنس کر عشق میاں کچھ کھیل نہیں
میں ہوں ہنسوڑ اور تو ہے مقطع میرا تیرا میل نہیں
(انشاء)

(انشا کی "قسم" کی ردیف والی غزل تو ایک غزل مسلسل ہے جس کا تتبع آگے چل کر جوش ملیح آبادی نے کیا۔ اس میں انواع و اقسام کی قسمیں ہیں اور ان سب قسموں میں وہی تواتر اور الفاظ پر وہی قابو ہے کہ جس رنگ کو بعد میں جوش نے انتہائے کمال کو پہنچا دیا)

دیکھا آپ نے کہ محبوب کی سیرت ولی سے لے کر جرأت و انشا تک کتنی تبدیل ہوئی اور اب وہ یقیناً شاہد بازاری جیسی ہوتی جا رہی ہے مگر اس درمیان میں درد نے اس سلسلے کو کسی قدر بدلا اور وہ ایک بار پھر عشق مجازی میں عشق حقیقی کی روح پھونکنے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔ مگر یہ کوشش انہیں پر ختم ہو گئی ان کے محبوب پر کسی ارضی محبوب کا گمان ہو ہی نہیں سکتا۔ اس کے اوصاف وہی ہیں جو باری تعالیٰ کے ہیں اور ان کے یہاں محبوب سے مطلب وہی ذات حقیقی ہے۔ ذیل کے اشعار اس کے ثبوت میں حاضر ہیں ؎

ہم نہ جلے پائے ماہر آپ سے درد وہ ہی آڑے آ گیا جیدھر چلے

شب و روز اے درد درپے ہوں اس کے کسو نے جسے یاں نہ سمجھا نہ دیکھا

یہاں تک کہ اگر ان کے یہاں عشق مجازی بھی ہے تو محض نظر بازی کے چسکے تک۔ کہتے ہیں ؎

درد کے ملنے سے اے یار برا کیوں مانا
اس کو کچھ اور سوا دید کے منظور نہ تھا

اور پھر اس کے بعد مثنوی کے میں نے تو عشق مجازی میں وہ کھیل کھیلا کہ شرم و حیا بالائے طاق رکھ دی۔ میر حسن کی مثنوی "گل بکاؤلی" اور پھر گلزار نسیم" و "زہر عشق" میں وصل جسمانی کا وہ کون سا پہلو ہے کہ جو بیاں ہونے سے رہ گیا ہو اور وہ کون سی بے حجابی ہو کہ جو خیال کے دائرے میں آتی ہو اور اس میں اس کا مرقع نہ کھینچا گیا ہو۔ آہستہ آہستہ محبوب میں وہ سب اوصاف آتے ہیں کہ جنہیں سماج میں آج تک معیوب سمجھا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ غزل میں بھی ایسے ایسے شعر نظر آنے لگے کہ جیسے ؎

آرام حسن تبھی تو ہو گا
اس لب سے لب اپنے جب ملینگے (حسن)

نظیر نے تو ان سب سے آگے بڑھ کر ایک ایسے محبوب کو لا کھڑا کیا جس سے عاشق بھی پناہ مانگنے لگے۔ یقین نہ ہو تو سنیے اور دیکھئے کہ ان کا محبوب کس غضب کا ڈھیٹ ہے ؎

جو گھر سے نکلے تو یہ قیامت کہ چلتے چلتے قدم قدم پر
کسی کو ٹھوکر، کسی کو جھڑکی، کسی کو گالی بیٹ لڑاکا
یہ راہ چلتے میں جھلاہٹ کہ دل کہیں ہے نظر کہیں ہے
کہاں کا اونچا، کہاں کا نیچا، خیال کس کو قدم کی جا کا
گلے لپٹنے میں یہ شتابی کہ مثل بجلی کے اضطرابی
کہیں جو چمکا چمک چمک کر کہیں جو لپکا تو پھر چھپا کا
نظیر ہٹ جا، پرے سرک جا، دل لے صورت چھپا کہ منہ کو
جو دیکھ لیوے گا وہ ستمگر تو یار ہو گا ابھی جھگڑا کا

توبہ توبہ! اس ادا کا محبوب ہو تو عاشق کی روح کیوں نہ تھرانے لگے اور اس جھڑاکے سے کترا کر کیوں نہ نکل جانا چاہے گا؟ مومن کا محبوب پھر بھی احتیاط کا تھوڑا سا پابند ہے۔ اس میں جوتے وفا ملتی ہے مگر مومن میں خود کوئی جوتے وفا نہیں ہے۔ وہ تو محبوب سے بھی بلیک میل سے کام لینے کا عادی ہے۔ لیکن خیر یہاں ہم شاعروں کے کردار کو نہیں، بلکہ ان کے محبوبوں کے کردار کو جانچ رہے ہیں۔ دیکھئے مومن فرماتے ہیں ؎

شعر

وہ مجھ کو ... نہ مانتا کسی بات کا  وہ نہیں نہیں کی ہر آن ادا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

مومن و غالب کے ہم عصر ذوق نے تو محبوب کو ایک واقعی قاتل ہی کے رنگ میں لا کھڑا کیا۔ ملاحظہ ہو ؎

اس صید مضطرب کو تامل سے ذبح کر داماں و آستیں نہ لہو میں لتھیڑ تو

اس کے بعد داغ کے محبوب نے باقاعدہ جسم عاشق کے ٹکڑے اور بوٹیاں کر ڈالیں۔ فرماتے ہیں ؎

قرینے سے عجب آراستہ قاتل کی محفل ہے جہاں سر چاہیے سر ہے، جہاں دل چاہیے دل ہے

کھوئی سی ہیں، خنجر ہاتھ میں ہے، تن کے بیٹھے ہیں کسی سے آج بگڑی ہے جو وہ یوں بن کے بیٹھے ہیں

غرض کہ محبوب کا کردار اردو شاعری میں برابر گرتا چلا آ رہا ہے۔ اس طوماں بلاخیز میں جب ہم غالب کے محبوب کو دیکھتے ہیں تو وہ یقیناً ہمیں اپنے سے پہلے اور کچھ بعد کے شعرا کے محبوبوں سے علاحدہ کھڑا نظر آتا ہے جس میں اعلیٰ کردار کے نقوش ملتے ہیں۔ رہا یہ کہ وہ بھی خود پسند و جفا کار ہے۔ وہ بھی ستمگر اور ایذا رساں ہے تو اس میں شک نہیں کہ یہ تصور غالب کو اپنے سے قدیم شعرا سے وراثت میں ملا تھا۔ ساتھ ہی اس کے معاصرین اور اس کے زمانے کے سماج کا رنگ ہی ایسا تھا۔ محبوب کی رفاقت کا جو تصور ان زمانہ پایا جاتا ہے وہ ان لوگوں کے لئے ایک بیگانہ اور اجنبی تصور تھا۔ مگر غالب کا محبوب دوسرے شعرا کے محبوبوں سے مماثلت رکھتے ہوئے بھی اپنے کردار کے اعتبار سے الگ پہچانا جا سکتا ہے اور اپنی شرافت و کردار کے لحاظ سے یقیناً قابل وقعت ہے۔ اس کو ادنیٰ درجے کا شاہد بازاری کہنا حقیقت سے آنکھیں چرانا ہی نہیں بلکہ حسن کے ساتھ عدم الانصافی ہے، کیونکہ غالب ہی وہ پہلا اردو شاعر ہے جس نے شاہدانِ بازاری سے اردو داں حلقے کی نظر ہٹا کر زندگی کے بنیادی مسائل کی طرف متوجہ کرنا چاہی ہے اور محبوب کو بھی مہذب اور شریف الطبع سماج کے ایک رکن کی حیثیت سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ▼

بقیہ "غالب اور اردو خطوط نویسی" صفحہ ۱۸۵

ہے کہ اس زمانے کے اردو خطوط کو محفوظ نہ کیا گیا ہو، کیونکہ اردو مکاتیب نویسی کو اس وقت تک اہمیت حاصل نہیں تھی۔ بقول مولانا مہر جب "اردو کا رواج بڑھ گیا تو غالب نے بھی اردو ہی کو مدار مکاتیب بنا لیا" (غالب) اور قرینِ قیاس بھی یہی بات معلوم ہوتی ہے۔ لیکن مرزا غالب کے اس خط سے کم از کم یہ مسئلۂ متنازع قطعی طور پر حل ہو جاتا ہے کہ ماسٹر رام چندر کے مضمون مطبوعہ دسمبر ۱۸۴۹ء و جنوری ۱۸۵۰ء سے مرزا نے کوئی استفادہ نہیں کیا" راسے بیکی مرحوم کی جوش بھی یا سینہ زوری کہنا چاہیے۔ بہر حال اس استدلال سے نہ تو ماسٹر رام چندر کو موجد کا مقام و مرتبہ دیا جا سکتا ہے اور نہ مرزا غالب پر تقلید ترک کی تہمت لگائی جا سکتی ہے۔ رہی یہ بات کہ مرزا غالب اس الوقت تھے۔ جیسا موقع دیکھتے تھے ویسی بات کہہ جاتے تھے "ستائش کی تمنا" اور "صلے کی پروا" سے بے نیاز مرزا غالب کا جواب یہ ہے ؎

غالب بُرا نہ مان جو واعظ بُرا کہے ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

▲

ذکاء الدین شایاں

غالب کی غزلیہ شاعری میں شہر دِلّی کا سماجی پس منظر

شاعری میں شاعر کا ماحول طرح طرح کے عکس بدل کر ظاہر ہوتا رہتا ہے شاعر جس ملک شہر یا جگہ کا باشندہ ہوتا ہے وہاں کی تہذیب، رسم و رواج اور معاشرت کا پروردہ ہوتا ہے اور یہی خارجی عوامل اس کی شاعری پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ شعوری اور لاشعوری طور پر وہ ان سے اثر قبول کرنے پر مجبور ہے۔

غالب اپنے دور کے نمائندہ شاعر تھے۔ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ دلّی میں گزرا۔ انہوں نے اپنی آنکھوں سے اس شہر کی تباہی اور بربادی کو دیکھا ۱۸۵۷ء کے غدر کی تباہ کاریوں کا مظاہرہ انسانیت کے قتل و خون کا ڈرامہ ان کے سامنے ہوتا رہا۔ سلطنتِ مغلیہ کا زوال اور انگریزوں کا عروج غالب کی دانست میں "بازیچۂ اطفال" ہی رہا۔ اور یہ تماشا "شب و روز" کا تھا۔ پرانی روایتوں کی بیخ کنی اور گزشتہ اقدار کی شکست و ریخت بھی جاری تھی۔ خارجی ماحول کی یہ تمام تاریخی حقیقتیں ایسی نہ تھیں کہ غالب ان سے متاثر نہ ہوتے۔ انہوں نے اپنے "خطوط" میں بڑی بے باکی سے اپنے اردگرد کے حالات و واقعات اور محسوسات کو یکجا کر دیا ہے۔ ان میں فراغت، عشرت اور خوش حالی کے بیتے ہوئے ان نشاطیہ لمحوں کو بھی اسیر کر لیا گیا ہے جو زمانے کی دست بُرد سے بچ رہے تھے اور جو انسانیت کے ہاتھ لگ گئے تھے۔ اصل میں غالب کے خطوط ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں جس میں اس دور کے کرب و اضمحلال اور نشاط و کیف کی تمام پرچھائیاں آ گئی ہیں۔ یہ وہ پرچھائیاں ہیں جو غالب کے ذہن و دماغ پر ایک عمر تک مسلّط رہی ہوں گی۔

ان خطوط سے قطع نظر غالب کی غزلیہ شاعری جب زیرِ بحث آتی ہے تو عام طور پر کہہ دیا جاتا ہے کہ چونکہ یہ غزل کی شاعری ہے اس لئے اس میں غالب کے دور کا مکمل عکس تلاش کرنا بے سود ہے۔ اس رائے میں کسی حد تک صداقت بھی ہے۔ غزل واقعی ایسی صنف ہے جو زندگی کی متحرک حقیقتوں اور خارجی مظاہر و عوامل کو مکمل طور پر قبول نہیں کرتی۔ اگر قبول کرتی بھی ہے تو ان کو موضوع نہیں بنا سکتی۔ غزل میں شاعر کے ماحول اور خارجی فضا کا عمل دخل علامتوں اور اشاروں میں اس طرح ہوتا ہے کہ عام نگاہیں دھوکہ کھا جاتی ہیں۔ غزل کے علاوہ مثنوی، قصیدہ یا دوسری اصناف کا معاملہ بالکل مختلف ہے۔ مثنوی یا قصیدوں میں اتنی گنجائش اور وسعت ہوتی ہے کہ وہ اپنے عہد کی زندگی کا بے کم و کاست احاطہ کر سکتے ہیں۔ معاشرت، تہذیب، مذہب، سیاست، رسم و رواج اور طور و طریق سب ان اصناف میں سما سکتے ہیں لیکن غزل میں ایسا ہونا ممکن نہیں۔ اس میں کسی بات کو مفصل یا واضح طور پر بیان نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں رموز و علائم، اشاریت اور ایمائیت کا کھیل ہوتا ہے۔ مصوّر کے موقلم کی طرح غزل بھی اپنے ہلکے اور گہرے "شیڈس" سے کام لیتی ہے۔ یہ "شیڈس" صرف اشارے ہوتے ہیں۔ ان کے اندر تہہ در تہہ جو دنیائیں پوشیدہ ہوتی ہیں ان کا پتہ لگانا خاصا مشکل کام ہے۔ انہیں دنیاؤں میں بہت اندر ڈھکی چھپی ایک ایسی دنیا مل سکتی ہے جس میں خارجی ماحول کی عکاسی کو دریافت کیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غزل اپنے اس عمل Treatment میں بہت محدود سمجھی جاتی رہی ہے اور شاید اسی لئے اس کے مطالعے کے حدود بھی قائم کرلئے گئے ہیں۔ اور کچھ مفروضے بنالئے گئے ہیں یعنی غزل میں ان باتوں کا ذکر ہونا چاہئے ان کا نہیں یا اس میں یہ باتیں سما سکتی ہیں یہ نہیں وغیرہ وغیرہ۔ انہیں چند مفروضوں میں ایک یہ بھی ہے کہ غزل میں شاعر کے ماحول کی نشاندہی صحیح طور پر نہیں ہو سکتی کیونکہ اس پر اتنے پردے پڑے ہوتے ہیں کہ اصل حقیقت تک پہنچنا ممکن [illegible] ان مفروضے کے پیشِ نظر اگر سنجیدگی سے کلاسکی شعرا کے کلام کا مطالعہ کیا جائے تو نتیجہ بہت کچھ مختلف نکلے گا۔ ہمارے یہاں مثنوی اور قصائد وغیرہ کے مقابلے



میں غزل کا سرمایہ کمیت میں زیادہ ہے لیکن غزل کو یہ کہہ کر نظرانداز نہیں کیا جا سکتا کہ اس میں اپنے عہد کی واضح عکاسی نہیں ہے۔ غزل کے غائر مطالعہ سے یہ بات ثابت ہو سکتی ہے کہ اس میں اپنے عہد کے خارجی عوامل کی کارفرمائی ہے اور اس کے ذریعے سے بھی ہم اُس دور کی پرچھائیوں کو محسوس کر سکتے ہیں۔

خطوط والے غالب اور غزل والے غالب دونوں ایک ہوتے ہوئے بھی اتنے الگ نہیں ہو سکتے کہ خطوط میں تو خارجی ماحول کا بھرپور عکس ملے اور غزل میں اس کا کوئی پرتو نہ ہو۔ اس نقطۂ نظر سے جب میں نے غالب کی غزلیہ شاعری کو دیکھا تو اندازہ ہوا کہ اس میں بھی غالب کے ماحول کا زندہ اور حقیقی عکس ہے۔ شہر دلی کی زندگی، رسم و رواج، روایات و تہذیب اور معاشرت و مذہب وغیرہ کے بکھرے بکھرے مگر بڑے تیکھے نقوش ملتے ہیں۔ اگر ان نقوش کو ـــ جو اشاروں اور علامتوں کے چھوٹے چھوٹے ہالوں میں سمٹے ہوئے ہیں ـــ پھیلا دیا جائے تو غالب کے عہد کی بڑی زندہ تصویریں بن سکتی ہیں اور ہم آسانی سے سمجھ سکتے ہیں کہ غالب کے زمانے میں کون کون سے رسوم و عقائد کی پابندیاں تھیں؟ بادشاہوں اور امراء کے محلوں میں زندگی کا کیا رنگ تھا؟ عوام اور بازاری طبقے کا کیا حال تھا؟ خانقاہوں، میخانوں، شاہراہوں اور حویلیوں میں ادبی اور اعلیٰ انسانیت کے کیا آداب تھے؟ غدر ۱۸۵۷ء کی تباہیاں کس طرح اثر انداز ہو رہی تھیں؟ جشن خانہ کے مواقع و اہم موقعوں پر زندگی اپنے عشرت کدوں کو کس کس طرح آراستہ کرتی تھی؟ اور رنگ رلیوں کے کیسے کیسے سامان مہیا کئے جاتے تھے۔ متصوف، مذہب اور علم وغیرہ کے شعبے کیا کام انجام دیتے تھے وغیرہ وغیرہ۔

اُس عہد میں سماج کے چار نمایاں ادارے تھے ـــ

(۱) مذہبی ادارہ (۲) تعلیمی ادارہ (۳) خانقاہی ادارہ (۴) ان سب سے الگ آزاد منش لوگوں کا گروہ

دلی کی تاریخ شاہد ہے کہ شہر کے اوّل الذکر تین ادارے سماجی حیثیت سے بڑے اہم فریضے انجام دیتے تھے۔ قاضی، مفتی اور محتسب وغیرہ مذہب کی اشاعت پر مامور تھے اور بادشاہِ وقت کے فرمان کو عام کرتے تھے۔ تعلیمی اداروں میں مولویوں کے سپرد درس و تدریس کا کام تھا۔ اور خانقاہوں میں تصوف اور تزکیۂ نفس کی تعلیم دی جاتی تھی۔ خانقاہی اداروں کے طور و طریق اور آداب مذہبی اور تعلیمی اداروں سے کچھ اتنے مختلف تھے کہ بادی النظر میں شبہ ہوتا تھا کہ شاید وہ ان کی ضد ہیں لیکن حقیقت میں ایسا نہ تھا۔ خانقاہوں میں مذہب کی "ظاہریت" کو ختم کرکے اس کی روح کو حاصل کرنے کی تلقین کی جاتی تھی۔ اس میں مذہب اور شریعت کی جکڑ بندیاں اور پابندیاں نہیں تھیں۔ اپنے مقاصد کے اعتبار سے یہ تینوں ادارے الگ الگ ہوتے ہوئے بھی ایک ہی سمت رواں تھے اور وہ سمت تھی فلاحِ انسانیت۔ لیکن ان اداروں کے علاوہ ایک مخصوص نوعیت کا ایک ادارہ (ویسے اس کو ادارہ کہنا مناسب نہیں) اور بھی تھا جو اُن لوگوں کی نمائندگی کرتا تھا جو مذہب، تعلیم اور خانقاہ تینوں کی پابندیوں سے بیزار تھے۔ اس طبقے میں آزاد منش لوگ شامل ہوتے تھے جن کا مقصد آزادروی اور ناؤ نوش کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ دلی کی سماجی زندگی انہیں خانوں میں بٹی ہوئی تھی۔ مذہب کی علامت "مسجد" تھی۔ تعلیم کی "مدرسہ"، تصوف کی "خانقاہ" اور آزاد منش لوگوں کی تربیت کے لئے "میخانہ" کا اشارہ استعمال ہوتا تھا۔ غالب اپنے مزاج اور مسلک کے اعتبار سے آزاد روش لوگوں کے گروہ میں شامل تھے۔ انہیں مذہب کے جامد اصول بالکل پسند نہ تھے اور نہ وہ خانقاہ اور مدرسے کی زندگی سے مطمئن تھے۔ جب [illegible] کے چھٹے اور بادل [illegible] زندگی بسر کرنے کا ایسا اشارہ ملتا ہے جس سے اُن قدروں کی تصویر سامنے آ جاتی ہے۔

[illegible]

[illegible]

مستقلات



گلیوں میں میری نعش کو کھینچے پھرو کہ میں — جاں دادۂ ہوائے سرِ رہگزار تھا

مقتل کو کس نشاط سے جاتا ہوں میں کہ ہے — پُرگل خیالِ زخم سے دامن نگاہ کا

عجب نشاط سے جلاد کے چلے ہیں ہم آگے — کہ اپنے سائے سے سر پاؤں سے ہے دو قدم آگے

اُس زمانے میں لوگ جب کسی کے یہاں کسی خوش خبری کے سلسلے میں مبارک باد دینے جاتے تھے تو ایک خاص انداز سے "مبارک" اور "سلامت" کے الفاظ ادا کرتے تھے۔ غالب نے ایک شعر میں اس منظر کو پیش کیا ہے ۔

علی الرغم دشمن شہیدِ وفا ہوں — مبارک مبارک سلامت سلامت

ہرچند کہ اس شعر میں علامت کا دخل ہے لیکن دوسرے مصرع کے ڈھلے ہوئے محاورے میں دلی کی اُس زبان کا انداز ہے جسے وہاں کے لوگ ایسے موقعوں پر بولا کرتے تھے۔

"پینس" شہر دلی کی مخصوص سواری تھی جس میں پردے والی عورتیں اور شرفا کے گھرانوں کی زنانہ سواریاں ایک محلے سے دوسرے محلے آیا جایا کرتی تھیں۔ اس کو چار کہار اپنے کاندھوں پر اُٹھاتے تھے۔ تقریبات کے موقعوں پر ملنے ملانے کے وقت عورتیں اسی سواری کو کام میں لاتی تھیں۔ ان پر رنگ برنگ کے کپڑے اور پردے پڑے رہتے تھے۔ اور جب گلی کوچوں میں یہ نکلتی تھیں تو عجیب سماں پیدا ہو جاتا تھا۔ ان کے اندر بیٹھی ہوئی عورتیں دھیمے لہجے میں کہاروں کو ہدایت دیتی جاتی تھیں کہ اب اس طرف چلو، اب اُدھر یا تیز چلو یا آہستہ۔ شاید ایسا ہی کوئی منظر ہوگا جس نے غالب کو یہ شعر کہنے پر مجبور کیا ہوگا ۔

پینس میں گزرتے ہیں جو کوچے سے وہ میرے — کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے

موسمِ گرما کی تپش اور لُو کے تھپیڑوں سے بچنے کے لئے پہلے لوگ شہروں میں دوہرے دالانوں کے بعد بہت اندر کی طرف ایسے کمرے اور مکان بنواتے تھے جو کافی ٹھنڈے رہتے تھے۔ ان کمروں میں روشن دان وغیرہ کا خاص اہتمام ہوتا تھا۔ غالب نے علامتی پیرائے میں اس کا ذکر کیا ہے ۔

کی اُس نے گرم سینۂ اہلِ ہوس میں جا — آوے نہ کیوں پسند کہ ٹھنڈا مکان ہے

شہر میں اُمرا کے دو خاص شوق مشغلے تھے۔ یا تو وہ اپنے عشرت کدوں میں شرابیں پیتے اور شطرنج اور گنجفے وغیرہ کی بساط جماتے۔ دوستوں کی محفلیں سجتیں اور پھر کھیل ختم ہونے یا مات ہو جانے پر یہ محفلیں برہم ہو جاتیں۔ یا لوگ شراب پیتے اور جُوا کھیلنے کی غرض سے قمار خانے آباد کرتے اور وہاں اپنی دولت لٹاتے۔ غالب نے دلی شہر کے ان مشغلوں کو ان اشعار میں محفوظ کرلیا ہے ۔

محفلیں برہم کرے ہے گنجفہ بازِ خیال — ہیں ورق گردانیِ نیرنگِ یک بتخانہ ہم

ہم سے چھوٹا قمار خانۂ عشق — واں جو جائیں گرہ میں مال کہاں

کلاسکی شاعروں نے "بازار" کی علامت سے بہت سے مضامین نظم کئے ہیں۔ غالب نے بھی اس علامت کو برتا اور اس میں اپنے شہر کی جیتی جاگتی سانس لیتی ہوئی فضا کو اسیر کرلیا۔ مثلاً ۔

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا — ساغرِ جم سے مرا جامِ سفال اچھا ہے



تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم جب اُٹھیں گے
لے آئیں گے بازار سے جا کر دل و جاں اور

اس شعر کو پڑھ کر ہماری آنکھوں کے سامنے غالب کے شہر اور اُس کے بازار کا نقشہ آجاتا ہے اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہم خود اس بازار میں پھر رہے ہیں۔

ہاتھ کی اُنگلیوں میں انگوٹھیاں پہننے کا رواج اُس زمانے میں عام تھا۔ بعض کے ساتھ چھلے بھی پہنے جاتے تھے۔ ویسے تو ان چیزوں کو خصوصاً عورتیں ہی بطور زیور استعمال کرتی تھیں لیکن مرد بھی اِن کو پہننا جائز سمجھتے تھے۔ (آج بھی پیروں اور گدڑیوں میں انگوٹھی اور چھلے کا رواج ہے) آرائش اور زیبائش کے علاوہ ان کے دو اہم مقصد اور بھی تھے۔ ایک تو یہ کہ جب دو شخص (مرد اور عورت کی تخصیص نہیں) آپس میں اپنی محبت کا اقرار کرتے یا عہد اور قول و قسم کے ذریعے اس میں استواری پیدا کرتے تو ایک دُوسرے کی انگوٹھی یا چھلا بدل کر پہن لیا کرتے تھے تاکہ اس طرح دونوں کو اپنی محبت کا عہد یاد رہے۔ چنانچہ چھلا اور انگوٹھی یادگار یا نشانی کی علامت بھی تھی۔ انشا نے ایک جگہ اس کا ذکر کیا ہے ؎

اِن اُنگلیوں میں قول کے چھلے نظر پڑے
واللہ تم تو سخت چھلے نظر پڑے

"قول کے چھلے" اس سلسلہ میں ایک اصطلاح بن گئی تھی۔ لوگ جب کسی کی انگلیوں میں دُوسرے کی انگوٹھی یا چھلا دیکھتے تو سمجھ جاتے کہ اس شخص کا کسی سے عہد و پیماں ہوا ہے۔ اور یہ اُسی کی نشانی ہے۔ انگوٹھی اور چھلے کا دُوسرا مقصد یہ تھا کہ جب کوئی شخص سفر کو جاتا اور اپنے عزیز یا محبوب سے جدا ہوتا تو یادگار کے طور پر انگوٹھی بدل لی جاتی اور اس کو نشانی کی طرح رکھا جاتا۔ غالب نے اس رسم کو علامت کے پردے میں ایک شعر کا اساس بنایا ہے جس میں دکھایا ہے کہ رخصت کے وقت چونکہ محبوب کے ہاتھ میں کوئی چھلا نہیں ہے لیکن وہ اپنے عاشق کو محبت کی نشانی (چھلا) دینے کے لئے بےقرار بھی ہے تو ایسے موقع پر وہ خالی انگلیوں کو دکھا دیتا ہے۔ اور اپنی ناداری، کشمکش اور خلوص کا اظہار کرتا ہے ؎

کافی ہے نشانی ترے چھلے کا نہ دینا
خالی مجھے دکھلا کے بوقت سفر انگشت

غالب نے ایسے کچھ اشعار میں عدالتی زبان کی اصطلاحات کو علامتوں میں ظاہر کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شہر کی مختلف عدالتوں کی کارروائیوں اور قاضی شہر، مفتی یا جج وغیرہ کے فیصلوں سے بخوبی شناسائی رکھتے تھے۔ در عدالت باز۔ فوجداری۔ سررشتہ داری۔ گواہ۔ حکم جاری کرنا۔ مقدمہ اور روبکاری وغیرہ الفاظ علائم کے پیرایے میں داخل غزل کر دینا غالب کا وہ دلدار ہے جو یہ ثابت کرتا ہے کہ غزل جیسی محدود صنف میں بھی طبع آزمائی کرتے وقت وہ اپنے شہر و ماحول کی بکھری ہوئی حقیقتوں سے بیگانہ نہ تھے۔ جیسے ؎

پھر کھلا ہے در عدالت ناز
گرم بازار فوجداری ہے

ہو رہا ہے جہان میں اندھیر
زلف کی پھر سررشتہ داری ہے

پھر ہوئے ہیں گواہ عشق طلب
اشکباری کا حکم جاری ہے

دل و مژگاں کا جو مقدمہ تھا
آج پھر اُس کی روبکاری ہے

غالب نے اپنے خطوط میں پھول والوں کے میلے کا ذکر بڑی دلچسپی کے ساتھ کیا ہے۔ اُن کی شاعری پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں پھولوں سے بہت شوق تھا۔ جگہ جگہ اُن کے اشعار میں پھول اور اُس کے رنگ کی علامتیں ملتی ہیں۔ دلی کے بازاروں میں پھولوں کی خرید و فروخت کا منظر غالب کے لئے قابل دید رہا ہوگا۔ پھولوں کا اس طرح بک جانا انہیں پسند نہ آتا ہوگا تب ہی تو کہا ہے ؎

غارتگر ناموس نہ ہو گر ہوس زر
کیوں شاہد گل باغ سے بازار میں آوے

اور پھر پھول بیچتے وقت پھول بیچنے والے کے ہاتھوں پر غالب کی نظر جاتی ہے تو اس کی رنگینی سے وہ متاثر ہو جاتے ہیں اور "کف گلفروش" کی ترکیب میں اس معنی کو قید کر لیتے ہیں ؎

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
داماں باغباں و کف گلفروش ہے

شہر دلی کے در و بام، گلی کوچے، بازار اور وہاں کی چلتی پھرتی زندگی سے غالب اپنی غزلوں کا خام مواد فراہم کرتے ہیں اور استعاروں میں نظم کر دیتے ہیں۔ انہیں



سڑکوں اور دکانوں پر تجارتی ہنگامہ آرائی کی تصویریں ملتی ہیں۔ مختلف صنعت اور پیشے کے لوگ دکھائی دیتے ہیں۔ کہیں "گلفروش" نظر آتا ہے تو کہیں "گوہر فروش"۔ کہیں خریدار، کہیں دکاندار کہیں جنس سر راہ کا جلوہ ہے تو کہیں بام پر رہا بازاری کی تجلیاں۔ غالب سب کا مشاہدہ کرتے ہوئے گذر جاتے ہیں اور جب وہ غزل کہنے بیٹھتے ہیں تو ان کی پرچھائیوں سے اپنے خیال کی محفل سجا لیتے ہیں، مثلاً ؂

گوہر کو عقدِ گردنِ خوباں میں دیکھنا
کیا اوج پر ستارۂ گوہر فروش ہے

گھر کے کرتے ہیں بازار میں وہ پرسشِ حال
کہ یہ کہے کہ سرِ رہگذر ہے کیا کہیے

دل و دیں نقد لا ساقی سے گر سودا کیا چاہے
کہ اس بازار میں ساغر متاعِ دستگرداں ہے

جو ہے تجھے سرِ سودائے انتظار تو آ
کہ ہیں دکانِ متاعِ نظر در و دیوار

مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس
چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کیے ہوئے

پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب
عرضِ متاعِ عقل و دل و جاں کیے ہوئے

چشمِ دلّالِ جنسِ رسوائی
دل خریدارِ ذوقِ خواری ہے

فنِ عمارت اور نقاشی کے پہلو بہ پہلو مغلوں نے فنِ مصوری کو بھی کافی ترقی دی۔ اس زمانے میں شہروں میں مصوروں کی خاصی تعداد ہوتی تھی یہ بیرونی مناظر اور اشیاء ہی کی تصویریں نہیں بناتے تھے، بلکہ ان کا مخصوص مشغلہ انسانوں کی مختلف کیفیات کی عکاسی تھا غالب کے عہد میں مصوری کا فن تقریباً اپنے عروج پر پہنچ چکا تھا اور انسانوں کے MODEL بنائے جانے لگے تھے۔ شاعری کی طرح چونکہ مصوری کا فن بھی جمالیات کے دائرے میں آ جاتا ہے، اس لئے اس وقت کے مصور عورتوں اور حسین پیکروں کی MODEL تصویریں خاص طور پر بناتے تھے۔ ان کے شائقین جانے صرف تصویروں ہی سے کھچے ہوئے نہ رہتے تھے بلکہ خوبصورت لڑکیاں اور عورتیں بھی وہاں موجود رہتی تھیں گویا مصوری کے فن کا ایک اہم مقصد یہ بھی تھا کہ یہ بہانے "مہ رخوں" سے "تقریب" حاصل ہو جاتی تھی۔ غالب کے اس شعر میں اس کا پورا عکس ہے ؂

سیکھے ہیں مہ رخوں کے لیے ہم مصوری
تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیے

ایک دوسرے شعر میں کہتے ہیں ؂

نقش پر اس کے مصوّر کو بھی کیا کیا ناز ہیں
کھینچتا ہے جس قدر اتنا ہی کھنچتا جائے ہے

عہدِ غالب میں منشی، کاتب اور رقعہ نویس شہر میں خاصی اہمیت رکھتے تھے۔ تعلیم کم ہونے کی وجہ سے عوام کو ان کی اکثر ضرورت رہتی تھی۔ کوئی ان سے اپنے بزرگوں کو خط لکھواتا، کوئی عزیزوں کو اور کوئی اپنے محبوب کو۔ یہی لوگ قبالے، بیع نامہ اور رسیدیں بھی لکھتے تھے۔ صبح ہوتے ہی یہ اپنے قلمدان لے کر کان پر قلم رکھ کے، شہر کی سڑکوں پر نکل جاتے اور اپنے ضرورت مندوں کو تلاش کرتے۔ یہی فن ان کا ذریعۂ معاش تھا۔ غالب کا یہ شعر اسی سماجی حقیقت کا آئینہ دار ہے ؂

گر لکھوائے کوئی اس کو خط تو ہم سے لکھوائے
ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے



غالب کی غزلوں کے مطالعے سے ایک بات یہ بھی ظاہر ہوتی ہے کہ دلی شہر میں سماع کی محفلوں کا انعقاد اکثر ہوتا تھا۔ صوفیائے کرام کے حلقوں اور خانقاہوں میں مجالس سماع آراستہ کی جاتی تھیں جن میں بلا تفریق مذہب و ملت لوگ شریک ہوتے تھے۔ ان محفلوں کے علاوہ امرا اور رؤسا کے عشرت کدوں میں موسیقی اور رقص و سرود کا شغل بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ غالب بنیادی طور پر نغمہ پرست تھے۔ ان کے اشعار میں اس کی جھلک نمایاں ہے ـــ

جاں کیوں نکلنے لگتی ہے تن سے دمِ سماع   گر وہ صدا سمائی ہے چنگ و رباب میں

حالِ مطرب ترانۂ ہل من مزید ہے   لبِ پردہ سنجِ زمزمۂ الاماں نہیں

ڈھونڈے ہے اس مغنیِ آتش نفس کو جی   جس کی صدا ہو جلوۂ برقِ فنا مجھے

غالب کی دلی اور اس کی سماجی سرگرمیوں کی تصویر نامکمل رہ جائے گی اگر چند چیزوں کا ذکر اور نہ کیا گیا۔ مثلاً شہر میں غالب کی شراب نوشی، دوستی، رنگ اور نکہتوں کے دائرے میں اپنے شبستاں میں غالب کی مصروفیتیں، آئینہ خانے میں ان کے محبوب کی سجاوٹیں اور حسن کے مظاہرے، غالب کا قید کی صعوبتیں جھیلنا، شہرِ دلی سے برگشتگی، شکوۂ زمانہ، وطن سے جدائی کا غم، بادشاہِ وقت سے وابستگی اور اسی کے ساتھ خلوت میں محبوب کی ملاقات سے مسرت کا سامان بہم پہنچانا وغیرہ۔ غالب نے غزل کے اشعار میں ان باتوں کی طرف صاف صاف اشارے کئے ہیں جیسے ـــ

صرفِ بہائے مے ہوئے آلاتِ میکشی   تھے یہ ہی دو حساب سو یوں پاک ہو گئے

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں   رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

بے خودی بسترِ تمہیدِ فراغت ہو جو   پُر ہے سائے کی طرح میرا شبستاں مجھ سے

ابھی آتی ہے بو بالش سے اس کی زلفِ مشکیں کی   ہماری دید کو خوابِ زلیخا عارِ بستر ہے

خوشا اقبالِ رنجوری عیادت کو تم آئے ہو   فروغِ شمعِ بالیں طالعِ بیدارِ بستر ہے

دل خود آرائی کو تھا موتی پرونے کا خیال   یا ہجومِ اشک میں تارِ نگہ نایاب تھا

کیا آئینہ خانے کا وہ نقشہ تیرے جلوے نے   کرے جو پرتوِ خورشید عالم شبنمستاں کا

شب کہ وہ مجلس فروزِ خلوتِ ناموس تھا   رشتۂ ہر شمع خارِ کسوتِ فانوس تھا

ہے اب اس معمورہ میں قحطِ غمِ الفت اسد   ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں کھائیں گے کیا؟



کیا رہوں غربت میں خوش جب ہو حوادث کا یہ حال
نامہ لاتا ہے وطن سے نامہ بر اکثر کھلا

دائم الحبس اس میں ہیں لاکھوں تمنائیں اسدؔ
جانتے ہیں سینۂ پرخوں کو زنداں خانہ ہم

غالبؔ بھی گر نہ ہو تو کچھ ایسا ضرر نہیں
دنیا ہو یا رب اور مرا بادشاہ ہو

مرے شاہِ سلیماں جاہ سے نسبت نہیں غالبؔ
فریدون و جم و کیخسرو و داراب و بہمن کو

غالبؔ وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا
وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

علاوہ عید کے ملتی ہے اور دن بھی شراب
گدائے کوچۂ میخانہ نامراد نہیں

مدعا محوِ تماشائے شکستِ دل ہے
آئینہ خانے میں کوئی لئے جاتا ہے مجھے

چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو
سرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کئے ہوئے

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

سچ کہتے ہو خود بین و خود آرا ہوں نہ کیوں ہوں
بیٹھا ہے بتِ آئینہ سیما مرے آگے

غرضیکہ غالبؔ نے اپنی غزلوں میں شہرِ دلی کی تمام زندگی، معاشرت اور طور و طریق کو رموز و علائم کے پردوں میں چھپا دیا ہے اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ خطوط کی طرح ان کی غزلیں بھی دلی کی تہذیبی، معاشرتی اور کاروباری فضا کی پوری طرح آئینہ دار ہیں۔ ▲▲

بقیہ مرزا غالبؔ کے ایک باکمال دوست مرزا تفضل حسین خاں صفحہ ۱۶۵

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ میر تفضل حسین خاں کی شخصیت جہاں اس اعتبار سے ایک تاریخی اور اہم شخصیت کی حیثیت رکھتی ہے کہ انہیں مرزا غالبؔ سے قربِ خاص حاصل تھا اور وہ مرزا کے ان خصوصی احباب و محسنین میں داخل تھے جن کی مرزا بہت زیادہ عزت و تعظیم اور قدر و منزلت کیا کرتے تھے اور جن سے مرزا کی فارسی زبان میں مراسلت بھی رہا کرتی تھی، وہاں وہ اپنے تبحرِ علمی، قابلیت و صلاحیت، خدمتِ علم و ادب اور خاندانی عزت و وقار کے اعتبار سے بھی ایک قابلِ قدر اور لائقِ تذکرہ شخصیت تھی۔ ان کے خاندان کا ہر ہر فرد دبستانِ علم و ادب اور شعر و سخن میں آفتاب و مہتاب ہو کر چمکا۔

والیانِ ٹونک سے بھی اس خاندان کے تعلقات و روابط نسلاً بعد نسلٍ ایک طویل مدت تک قائم رہے اور نواب وزیر الدولہ سے لے کر نواب ابراہیم علیخاں بہادر خلیل تک ہر آنے والے حکمراں نے اس خاندان کے افراد کو ہمیشہ خلعت و انعام اور منصب و جاگیر سے نوازا اور عزت و تکریم کی۔ ▲

عبدالقوی دسنوی

یار محمد خاں شوکت ۔ غالب کے ایک شاگرد

"راقم الحروف نے ان کو اپنے بچپن اور ان کی پیرانہ سالی میں بارہا اس انداز سے دیکھا کہ روزانہ شام کو وہ پیدل بازار میں ایک چکر لگاتے تھے ۔ ایک ملازم یا مصاحب بھی ساتھ رہتا تھا۔ ہر روز نئے انداز کا لباس زیب تن ہوتا۔ پائجامہ کبھی تنگ مہری کا پہنے، کبھی چوڑے پائچوں کا، کبھی چوڑی دار گھٹنا، کبھی پتلون، کبھی برجس کبھی پائجامے کا ایک پائنچا سرخ کاسنی، ایک ہرا تو ایک اودا یا پیلا ۔ انگرکھے کے آستینوں میں چاک ۔ ایک سلیم شاہی جوتا پلے مخمل کا تو ایک لال مخمل کا۔ ایک ہرا تو ایک سرخ ۔ اسی طرح موزے بھی دو رنگے، ایک سیاہ اور ایک سفید وغیرہ۔ کبھی سر پر پگڑی، کبھی عمامہ، کبھی کامدار گول مخمل کی ٹوپی، کبھی سنہری لیس لگی ہوئی، کبھی ریشمی کام کی، کبھی رامپوری کشتی نما، کبھی دو پلی، کبھی چوگوشیا، کبھی کرکھی ۔ داڑھی چڑھی ہوئی، کبھی مہندی کے خضاب سے سرخ، کبھی گول مقطع اور کبھی گل مچھے والی، جسم چھریرا ۔ قد میانہ ۔ چہرہ تقریباً آفتابی، ناک قدرے چوڑی اور رنگ گورا تھا۔"

یہ یار محمد خاں شوکت کی تصویر ہے جس کے نقاش علامہ محوی صدیقی ہیں۔ بھوپال کی نواب سکندر جہاں بیگم حسن کی علم نوازی اور ادب پروری مشہور ہے، ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے ہنگامے میں مرزا اسد اللہ خاں غالب کو بھوپال بلانے کی کوشش کی اور اُن کے اخراجات کی تمام تر ذمہ داری اپنے سر لے لینے کا وعدہ کیا۔ لیکن مرزا غالب دلّی چھوڑنے پر کسی طرح راضی نہیں ہوئے۔ تاہم کبھی کبھی نواب سکندر جہاں بیگم اپنے ماموں فوجدار محمد خاں کو مرزا غالب کی خدمت میں بھیجے اور نذرانے کے ساتھ بھیجا کرتی تھیں۔ اسی آمد و رفت اور تعلقات کا نتیجہ تھا کہ مرزا غالب نے فوجدار محمد خاں کی خدمت میں اپنے اصل دیوان کا قلمی نسخہ اپنے ہاتھ سے تصحیح کر کے پیش کیا تھا۔ یہی قلمی دیوان جسے نسخۂ فوجدار محمد خاں کہنا چاہیئے اور جو اُن کے ذاتی کتب خانے میں محفوظ تھا۔ ۱۹۲۱ء میں "نسخۂ حمیدیہ" کے نام سے شائع ہوا جس کی وجہ سے بھوپال کو کافی شہرت ملی۔

انہیں فوجدار محمد خاں کے بیٹے یار محمد خاں شوکت تھے جو بڑے رئیس، علم نواز اور ادب پرور تھے۔ خود بھی اچھے شاعر اور نثار تھے۔ ۱۶ جولائی ۱۸۲۳ء (۲۷ صفر ۱۲۳۹ھ) کو پیدا ہوئے اور بہت ناز و نعم میں پرورش پائی۔ جب تعلیم حاصل کرنے کی عمر پہنچی تو مختلف اساتذہ سے عربی فارسی، فن ادب و آداب، سیف زنی، اسپ سواری اور فن شاعری کی تعلیم حاصل کی۔ کتب درسیہ عربی و فارسی وغیرہ مولوی سید عبداللہ صاحب متوطن قصبہ خوش آب پنجاب، شاگرد مفتی شرف الدین صاحب رامپوری اور مفتی احمد علی مرحوم خلف ملا اسمٰعیل صاحب متوطن سرونج سے پڑھی۔ منشی احمد علی کے بارے میں خود یار محمد خاں شوکت "انشائے نورچشم" میں تحریر کرتے ہیں:

"منشی احمد علی صاحب خلف ملا محمد اسمٰعیل صاحب خطِ نسخ شکستہ و نستعلیق کے ماہر اور منشی زبردست شاعر



ہیں۔ والد کے میر منشی تھے اور میرے اُستاد ہیں ایسے وقت کے میر عماد ہیں۔" (التنابے نور رحیم ص ۵۳)

فنونِ ادب و آدابِ مجلس و طبابت و آئینِ سیف زنی میر اکبر علی خاں خلف میر بابر علی خاں نبیرۂ میر حیدر خاں غازی دہلوی سے حاصل کی اور قاعدۂ سواریِ اسپ و فیل سکندر محمد خاں رسالدار، رسالدارِ دلی خاص حضور سرکار سے حاصل کی۔ فنِ شاعری میں پہلے مرزا غالب اور بعد کو مولانا محمد عباس رفعت سے اصلاح لی۔ اس طرح ماہر اساتذہ۔ طبیبوں۔ شاعروں اور سپاہیوں کی صحبت میں رہ کر علوم و فنون میں مہارت حاصل کی۔

نواب سکندر جہاں بیگم ۱۸۶۱ء میں لارڈ صاحب سے ملنے آگرہ گئی تھیں اُن کے ساتھ شوکت بھی تھے۔ یہ قافلہ آگرہ سے سیر کے لئے ۲۳ نومبر ۱۸۶۶ء کو ریل گاڑی سے شاہجہاں آباد پہنچا، جہاں یار[1] محمد خاں شوکت کو مرزا غالب سے ملنے کا موقع ملا۔ مرزا غالب نے اُنہیں اپنا شاگرد بنالیا اور اُن کا تخلص شوکت رکھا، لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی کہا

"آپ میرے شاگرد ہوئے۔ اگر چندے یہاں رہنے کا اتفاق ہوتا تو فنِ شاعری میں آپ کو مہارتِ کلی حاصل ہو جاتی مگر قیام ممکن نہیں۔ بھوپال میں مولانا محمد عباس رفعت شیروانی میرے دوست مردِ فاضل، ادیبِ کامل موجود ہیں۔ فارسی زبان اُن کی نہایت فصیح اہلِ زبان سے ملتی ہے۔ بارہا اپنا کلام میرے پاس بھیج کر مولانا نے مجھ سے اصلاح لی ہے۔ اُن سے بہتر دوسرا شخص مجھے وہاں نظر نہیں آتا۔ آپ کو میں اجازت دیتا ہوں کہ آپ اُن سے اصلاح اپنے کلام میں لے کر میرے پاس بھیجا کریں۔" (شہنشاہ نامہ۔ ص ۱)

چنانچہ شوکت نے اپنے اُستاد مرزا غالب کے ارشاد پر عمل کیا اور رسالہ "گلدستۂ نرگس" اور چند غزلیں اُستادِ محترم کے پاس اصلاح کے لئے بھیجیں اور مرزا نے حسبِ ضرورت اصلاح دی۔

مرزا غالب کی وفات کے بعد یار محمد خاں شوکت نظم و نثر مولانا عباس رفعت کو دکھایا کرتے تھے۔ چنانچہ شہنشاہ نامہ میں شوکت نے اُن کا ذکر اس طرح کیا ہے۔

شفیقِ کرم گستر و مہرباں — ابوالفضل عباس روشن رواں

سخن داں، سخن سنج، مردِ جہیہ — مرے ہیں وہ اُستاد لاریب فیہ

زبانِ اور تازی و فارسی دکن — ہے اُردو زباں اُن کی جوں آرسی

تخلص ہے رفعت سخن ارجمند — طبیعت رسا فکر معنی بلند

شہنشاہ نامہ ہوا جب تمام — سنا کر میں نے کیا یہ کلام

ضیائے قمر ہیگی از آفتاب — مناسب ہے اصلاح اسکی جناب

یہ فرمایا مجھ سے بہت خوب ہے — خدا کی قسم جملہ مرغوب ہے

سراسر ہے شیریں تمہارا کلام — بہت خوب ہے نظم کا انتظام

(شہنشاہ نامہ ص ۱)

اپنے ایک اُستاد میر اکبر علی خاں کے انتقال پر اِس طرح اظہارِ غم کرتے ہیں

"دنیائے دو روزہ فانی ہے۔ دل کا لگانا نادانی ہے۔ شادی و غم توام ہے۔ بہار و خزاں باہم ہے۔ گُل نے خار ہیں کسی کو ثبات و قرار نہیں۔ خدا کی عجب شان ہے۔ عقل حیران ہے۔ طائرِ قدس کے پَر جلتے ہیں۔ دانش مند

---

[1] ڈاکٹر سلیم حامد رضوی اپنی کتاب "اُردو کی ترقی میں بھوپال کا حصہ" میں لکھتے ہیں کہ نوجدار محمد خاں نے شوکت کو غالب سے ملایا تھا۔

غالب نمبر ۱۹۶۹ء

شاعر ...

بہت تاسف ملتے ہیں۔ صبر و شکر کا مقام ہے۔ بندگی اسی کا نام ہے۔ سیہور میں شفیق
استاد کا انتقال ہوا۔ مجھ کو نہایت رنج و ملال ہوا۔ خدا غریقِ رحمت کرے اور اُن کو
داخلِ جنت کرے۔ واللہ اس واقعے سے جی اُداس ہے۔ تاریخ اُن کی رحلت کی طبع زاد
مولانا عباس ہے:



سیدِ عالی نسب اکبر علی ... از طفیلِ مصطفےٰ مغفور باد
رفت از دنیا بسوئے آخرت ... زیرِ طوبیٰ ہمنشینِ حور باد
گفت عباسِ حزیں تاریخِ او ... با امامِ متقیں محشور باد

۱۲۷۷ھ

(انشائے نورچشم صفحہ ۱۸)

"تذکرہ فرح بخش" میں اپنے متعلق اس طرح لکھتے ہیں:۔

"نیازمندِ درگاہ حضرت سبحان کمترین بندگان خالق یار وجنت یار محمد خان متخلص بہ شوکت شروع سنِ تمیز سے علوم و فنون کا بہ دل راغب ہے۔ ہمیشہ اربابِ کمال کی خدمت میں نہایت شوق سے کسبِ کمالاتِ سیف و قلم کا طالب ہے۔ مظہر کمالات بے حساب مولوی سید عبداللہ صاحب متوطن جوش آپ جامع فضائل صوری و معنوی اخوند مفتی احمد علی خلاصہ خاندان بی بخاری سید علی اکبر عارفی یزاوح شہرہ ذاتی مولانا محمد عباس شروانی خسرو ملکِ سخن ماہرِ زبانِ دری و پہلوی نجم الدولہ دبیر الملک مرزا نوشہ نواب اسد اللہ خان غالب دہلوی جناب والد ماجد رفیع القدر عظیم الشان امیر کبیر نوجدار محمد خان صاحب جنت مکان وغیرہ چند اہلِ کمال کی بدولت مجھ کو فنون و علوم شتا سے آشنائی حاصل ہوئی۔ بعنایتِ الٰہی اس ذرہ بے مقدار کو ہر طرح حاصلِ دولت و دانائی ہوئی۔ یہ خاکسار کا کلام ہے، جو دادِ سخن دیوے اُس پر ہمیشہ سلام ہے۔" (تذکرہ فرح بخش صفحہ ۲۸)

یار محمد خان شوکت "انشائے نورچشم" میں غالب سے متعلق تحریر کرتے ہیں:

"نجم الدولہ دبیر الملک مصنف مہرِ نیمروز۔ ماہِ نیم ماہ۔ پنج آہنگ۔ دستنبو۔ دیوان فارسی۔ دیوان اردو۔ قاطع برہان۔ تیغِ تیز۔ عودِ ہندی۔ درفشِ کاویانی۔ گوہرافشاں۔ قادرنامہ۔ سبدِ چین۔ روانِ شیریں۔ اردوئے معلّیٰ، ثانیٔ ظہوری و ظہیر تھے۔ دوم ذی قعدہ ۱۲۸۵ھ دہلی میں راہیٔ ملکِ بقا ہوئے۔ جناب ممدوح کے صدہا شاگرد رشید ہیں۔ سب سے کمتریہ راقم آثم ہے۔ جناب ممدوح نے ایک قصیدہ جو دیوان فارسی میں مرقوم ہے، وزیر الدولہ امیر الملک نواب وزیر نوجدار محمد خان صاحب بہادر مرحوم رئیس ٹونک کی مدح میں لکھ کر ممدوح کے پاس بھیجا۔ نواب صاحب نے ارسالِ صلہ قصیدہ میں عمداً یا سہواً دیر کی۔ مرزا صاحب نے ایک خط منظوم لکھ کر بھیجا۔ نواب صاحب نے بعد ملاحظہ ہزاروں روپیہ بطریقِ جائزہ روانہ کئے۔ چند سال وفات سے پہلے میرزا صاحب نے خطوط اردو میں لکھنا اختیار کیا تھا۔ مولانا محمد عباس رفعت نے بھوپال سے مرزا صاحب کو لکھا کہ میں فارسی عنایت نامہ کا مشتاق ہوں۔ جناب نے اون کو خط فارسی تحریر فرمایا، جو کہ ہر دو خط منظوم و منثور، کلیات دیوان و انشائے جناب موصوف میں میری نظر سے نہیں گذرے اور وہ میرے پاس موجود تھے۔ بمراد اشاعت کلام استاد و استفادۂ ادبائے نقاد احقر العباد نے تبرکاً اسے اپنی انشا میں رقم کیا۔" ("انشائے نورچشم" ص ۳۶)

"تذکرہ فرح بخش" میں وہ غالب کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:۔



"فردوس آرام، ارم خسرو، بزم کلیم، کلام نظامی نظام الملک، متخلص بہ غالب دہلوی علیہ الرحمۃ مشاہیر جناب نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خاں صاحب متخلص بہ غالب نامی سے تھے۔ تعریف و توصیف ان کی بیان سے مستغنی ہے اور دیوان اردو اور کلیات فارسی جناب ممدوح مشہور آفاق ہیں۔ اس سلسلہ صرف ایک شعر تبرکاً لکھتا ہوں ۔

لوٹے گل بالائے نور چراغ محفل — جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

آخر ۱۲۸۵ھ شہر شاہجہاں آباد میں سال ممدوح کا انتقال ہوا تو تاریخ انتقال اکثر شعرائے نامور نے لکھی ہیں۔ ازاں جملہ یہ تاریخ جناب مولانا محمد عباس رفعت کی مجھ کو یاد ہے قابل تحسین و داد ہے۔

حاں ارباب سخن غالب علی ہمت — ناظم سحر بیاں ناثر و الا فطرت
رشک عرفی و خاقانی و عالی و کمال — ثانی خسرو و سعدی و حزیں شوکت
امر مدارکمالات و فرات دانش — ماہر علم معانی و بیان و حکمت
از جہاں کرد سفر سوئے ریاض رضوان — گفت عباس کہ شایان سپر جنت

(تذکرہ فرح بخش۔ ص ۶۶)

شوکت کو عنفوان شباب ہی سے شعر و شاعری سے بڑی دلچسپی تھی اور علم و ادب سے لگاؤ تھا۔ چنانچہ "تذکرہ فرح بخش" میں وہ رقم طراز ہیں کہ،

"یار محمد خاں شوکت گذارش کرتا ہے، مدعائے دل نگارش کرتا ہے، مجکو عنفوان شباب سے شعر و سخن کا شوق ہے" (ص)

چنانچہ اس کا عملی ثبوت انہوں نے اپنی تصانیف سے دیا اور اس طرح انہوں نے علم و ادب کی بڑی خدمت کی۔ اہل علم حضرات کا ان سے تعلق رہا کرتا تھا اور وہ مختلف طریقوں سے ان کی مدد کیا کرتے تھے۔ بقول ڈاکٹر سلیم حامد رضوی ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ "ہفتہ وار مشاعرے منعقد کیا کرتے تھے اور بہترین غزل پڑھنے والے شعرا کو بڑی عزت و احترام کے ساتھ انعام و اکرام سے سرفراز فرماتے رہتے"

مولانا ارشد تھانوی "بھوپال کی مصائے شعری" میں لکھتے ہیں

"۱۹۰۵ء سے نواب صاحب کے مشاعروں میں شریک ہو رہا ہوں۔ مجھے ان کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع بھی ملا۔ آپ نہایت قدیم معاشرت اور وضع کے امیر تھے۔ آپ کا شمار بھوپال کے بلند پایہ جاگیرداروں میں تھا جس وقت میں نے پہلی بار آپ کو دیکھا، اس وقت ان کی عمر ۷ سال کی تھی مگر معمولات جو ابتدائی عمر میں تھے، وہی آخر تک قائم رہے۔ ان کا معمول تھا کہ صبح ۱۱ بجے سے ۲ بجے تک اور شام کو ۷ بجے سے ۱۲ بجے تک اپنے دیوان خانے میں بیٹھتے تھے۔ جہاں بھوپال کے شعرا، علما اور مختلف علوم کے ماہرین جمع ہوتے تھے۔ نواب صاحب مصیبت زدہ شرفا اور مفلس اہل جوہر کی مدد اور سرپرستی کے لئے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ نہ معلوم کتنے لوگ ان کی ذات سے وابستہ تھے۔ ان میں ایک امیر الامراء نواب سید ذوالفقار علی خاں بہادر وزیر بادشاہ دہلی کے نواسے محمد علی خاں عرف میر نواب بھی تھے جو ہنگامۂ غدر کے بعد بھاگ کر بھوپال آ گئے تھے"۔ (اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ، ص ۲۵)

نواب یار محمد خاں شوکت کی دادو دہش ہی کی وجہ سے کئی صاحب تصنیف حضرات کی کتابیں شائع ہو سکیں جس کا نتیجہ یہ تھا کہ اگرچہ وہ بڑے جاگیردار تھے، لیکن اکثر مقروض رہا کرتے تھے۔

نواب صاحب کے پوتے سلطان محترم محمد خاں بیان کرتے ہیں کہ کھانے پینے کی چیزیں اکثر وہ خود تیار کرتے تھے۔ پہلے

[illegible] لمسی

[illegible] سے [illegible] دال تیار کرتے تھے جو بہت لذیذ ہوتی تھی لیکن اسے زیادہ نہیں کھاتا [illegible] میٹھی چیزیں بھی انہیں پسند تھیں جانوروں اور پرندوں سے بھی انہیں بڑی [illegible] کبوتر پال رکھے تھے۔ پتنگ بازی کے شیدائی تھے۔ اکثر پتنگ اور مانجھے خود تیار کرتے تھے۔ شام کے وقت سیر کے لئے نکلا کرتے تھے۔ انگریزی تعلیم انہیں قطعی پسند نہ تھی۔ ۸، راگست ۱۹۱۲ء کو [illegible] میں ان کا انتقال ہوا۔



تصانیف :۔ انشائے نورچشم۔ شہنشاہ نامہ (ڈاکٹر سلیم ا صفوی صاحب کا کہنا ہے کہ یہ مولانا عباس رفعت کی لکھی ہوئی ہے)، تذکرۂ فرح بخش۔ مسدسِ رحمت۔ ہفت خوان شوکت۔ قرابادینِ شوکتی۔ مراسلاتِ شوکت۔ دیوانِ شوکت۔ ساز نامہ۔ میل نامہ۔ فرس نامہ۔ گلدستۂ نرگس۔ چار باغ۔ عیدگاہِ شوکتی گلدستۂ رحمت وغیرہ۔

کلام :۔

دل جو بلبل کا تڑپ کر تہہ خنجر نکلا
طائرِ روح رواں کھولے ہوئے پر نکلا

بوا ہر اک کو جیدٔ سفاک سے باہر نکلا
کوئی بسمل کوئی، کوئی مضطر نکلا

چھوڑ کر آج جو وہ زلفِ معنبر نکلا
حرفِ ناگن تھا، نہ گھر سے کوئی باہر نکلا

نوکِ ابرو کے تئیں دیکھا جو ہم نے رخسار
سمجھے ہم شاخ یہ آہو کے، گل تر نکلا

ہو گیا صبح کا عالم شبِ وصلت اے ماہ
چھپ کے زلفوں میں جب اوسکا رخِ انور نکلا

تری رخساروں کی تعریف جو کاغذ پہ لکھی
پھوٹ کر شاخِ قلم سے گلِ احمر نکلا

پھک گیا سینے میں یوں دل کہ نہ آئی آواز
شعلۂ سینہ کا گھر سے نہ باہر نکلا

آنسوؤں سے اُسے دھویا مگر حیف اے یار
آئینہ دل کا جو دیکھا تو مکدر نکلا

ہو گیا آج مسیحا کا گذر کوچہ سے
مری تربت پہ لگاتا ہوا ٹھوکر نکلا

آ گئی موت مگر ہم کو یہ حسرت ہی رہی
دم نہ بیمار کا عیسیٰ کے قدم پر نکلا

تھم گئی جوں سے مری تیغ کے ہونٹوں پہ دھڑی
یوں لگاتے ہوئے حلقوم سے خنجر نکلا

کوئی آمد سے ترے آزاد نہ دیکھا ہم نے
جس کو ڈھونڈھا وہ گرفتارِ مقدر نکلا

شبِ بدمست جو آیا تو پئے استقبال
دختِ رز دوڑی، قدم لینے کو ساغر نکلا

ہو گیا صور کی آواز یہ نالے کا گماں
پھاڑ کر وحشی ترا، دامنِ محشر نکلا

نہ ہوئی سرد کبھی آتشِ غم سینے میں
گرچہ سو بار بجھانے کو سمندر نکلا

دیکھیں رکھتا ہے گلا کون تہہ تیغ دودم
گھر سے کہتا ہوا قاتل یہی باہر نکلا

غل ہوا مارے ٹکڑے کیا بلبل کا قفس
توڑ کر تیر جو تیرا تنِ لاغر نکلا

ابر نیساں ہے عمل تیرے قلم سے شوکت
حرف جو نکلا وہ موتی سے بھی بہتر نکلا

(آثار الشعراء۔ ص ۱۴۲)

مست ہر شخص اپنے رنگ میں ہے
شیخ تسبیح، رند بنگ میں ہے

حال ہے اوس کے روئے تاباں پر
حبشی جلوہ گر فرنگ میں ہے

دل سے کرتے ہو جلوہ آنکھوں میں
راہ در پردہ کیا سرنگ میں ہے



ہست اور نیست میں جو سکو کلام
دیکھیے کس کا خوں ہوتا ہے
گورے سے کالوں پر کوں مرتا ہے
وہ کلی کچھ کم نہیں ہے، تم سے
تیر مژگاں کا جو اثر دیکھا
نہیں جاتی کدورت خاطر
عشق میں کس کو رنج رسوائی
خوب کہتے ہو شعر اے شوکت

عقل حیراں دہاں تنگ میں ہے
آبِ شمشیر اس کی جنگ میں ہے
زندگی حسن سرمہ رنگ میں ہے
خندۂ زر کی جو ترنگ میں ہے
توڑ ایسا کہاں حد تک میں ہے
حیف آئینہ ایسا رنگ میں ہے
کب کوئی فکر نام و ننگ میں ہے
طرز تازہ تمہارے ڈھنگ میں ہے

(تذکرہ فرح بخش۔ ص ۳۱)

جو رسد آہ مرے دل سے گزر نکل جاوے
اسیر زلف صنم کا ہوں ایک مدت سے
جو گذرے گورِ غریباں میں وہ مسیحا دم
بجائے کاہ دمیدہ ہو کیمیا کی جڑی
مدام عیش میں رکھا الٰہی شوکت کو

پھٹے زمیں کا جگر آسماں دہل جاوے
ہمارے دل کا بھلا کس طرح سے بل جاوے
لحد سے مردہ سراک زندہ ہو نکل جاوے
ہوائے خور جو میرے چمن میں چل جاوے
اگرچہ دورِ فلک سو طرح بدل جاوے

(تذکرہ فرح بخش۔ ص ۴۴)

کیا جوش پہ یہ دیدۂ پرآب ہے واللہ
فرہاد کا خوں دامنِ کہسار میں کیا خوب
ہر لحظہ جگر اشک کے دریا میں ہمارے
کیونکر نہ ادب ہو مجھے ابروئے صنم کا
ہو رشک کماں دل تجھے کہتا ہے لب بام
مت کاکلِ پرتاب کو دے پیچ بہت دل
کہتے ہیں دُرِ اشک کو شوکت ترے اب لوگ

سیلاب ہے سیلاب ہے سیلاب ہے واللہ
سحاب ہے سحاب ہے سحاب ہے واللہ
سرخاب ہے سرخاب ہے سرخاب ہے واللہ
محراب ہے محراب ہے محراب ہے واللہ
مہتاب ہے مہتاب ہے مہتاب ہے واللہ
بیتاب ہے بیتاب ہے بیتاب ہے واللہ
خوش آب ہے خوش آب ہے خوش آب ہے واللہ

(تذکرۂ فرح بخش۔ ص ۳۵)

تم نے حرام یار جو لے دل ربا کیا
یاں ملکِ جان و دل تہ و بالا ہوا کیا
دل پہ جگر پہ جان پہ کوہِ الم گرا
جوں جوں ترقیوں پہ رہی واں بہار حسن
پھونکا ہے سوزِ غم میں دل بیقرار کو
شوکت نہ کیوں ملے مصدر ہوا کیجے

ہر ہر قدم پہ فتنۂ تازہ بپا کیا
واں آج دامِ زلف چلیپا بہ دعا کیا
اوس بیوفا سے دل کو لگایا برا کیا
یاں دل پہ اپنے داغ جنوں کا بڑھا کیا
یارب کو قائم آگ پہ یہ نام صدا کیا
خالق نے تم کو صاحبِ فکرِ رسا کیا

گل گریباں چاک ہے رخسارِ جاناں کے سبب
لعل خونی دل ہے اونکے لعلِ خنداں کے سبب
مرغ تاباں ہے تمہارے روئے رخشاں کے سبب

نرگس حیراں ہو رہی ہے چشمِ فتاں کے سبب
درِ غلطاں زرد ہوا ہے درِ دنداں کے سبب
ابر گریاں ہے ہماری چشمِ گریاں کے سبب

خسیر بہوروی

کچھ رنگین تصویر کے بارے میں

یہ تصویر نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے کتب خانے حبیب گنج ضلع علی گڑھ کی زینت ہے۔ مجھ نواب صاحب مرحوم کے فرزند الحاج نواب عبیدالرحمٰن خاں صاحب شروانی نے چند دنوں کے لیے عنایت فرمائی تھی۔ جب میرا قیام علیگڑھ میں تھا اور میں غالب انسائیکلوپیڈیا کا ایک باب مکمل کر رہا تھا جو مرزا غالب کی تصویروں سے متعلق ہے۔ یہ باب "مرقع غالب" کے نام سے ۱۹۶۹ء میں غالب اکاڈمی بنارس طبع کر چکی ہے۔

نواب صاحب مرحوم کے کتب خانے کی تصویر ۱۲۸۲ھ کی بنی ہوئی ہے جو دس انچ لمبی اور سات انچ چوڑی ہے۔ تصویر کے [illegible] درج ہے:

"تصویر دلپذیر اسد اللہ خاں موسوم بہ مرزا نوشہ معروف بہ غالب دہلوی"

اس عبارت سے ملی ہوئی سطر میں سیاہ روشنائی سے کچھ اور لکھا ہوا تھا جو کسی مصلحت کی وجہ سے کھرچ دیا گیا ہے۔ یہ تصویر صدر یار جنگ مرحوم نے ۳ ذی قعدہ ۱۳۱۵ ہجری مطابق ۱۸۹۶ء کو دہلی کے ایک بازار سے خریدی تھی۔ اس تصویر کو میں نے اس کے اصلی رنگوں کے ساتھ سب سے پہلے ۱۹۶۹ء میں بڑے اہتمام سے "مرقع غالب" میں شائع کیا تھا۔ اس کا عکس مرقع غالب کے ہندی ایڈیشن غالب چتراولی میں بھی شائع ہوا ہے جو چتراولی ۱۹۶۹ء میں چھپی تھی۔

اس تصویر کا فوٹو پہلے پہل ۱۹۳۵ء میں مالک رام صاحب نے "ذکر غالب" اور "سبد چیں" میں چھپایا تھا اور ۱۹۵۲ء میں حکومت ہند نے ساڑھے چار آنے والے ڈاک کے ٹکٹ پر طبع کیا تھا۔ اس تصویر کے بارے میں مالک رام کی رائے ہے کہ مصدقہ ہے جیسا کہ انہوں نے مرقع غالب کے پیش لفظ میں لکھا ہے:

"جناب خسیر بہوروی نے خوب کیا کہ آج تک غالب کی جتنی تصویریں مختلف جگہ پر شائع ہوئی ہیں اصلی اور نقلی ان سب کو مرقع غالب میں یکجا کر دیا۔ انہوں نے ہر ایک تصویر کے ساتھ توضیحی اشارے بھی لکھ دیے ہیں۔ ان سے یہ معلوم ہو جائے گا کہ اس تصویر کا ماخذ کیا ہے اور یہ کہاں تک مصدقہ ہے۔ اب تک یہ محقق ہے کہ غالب کی چار تصویریں ایسی ہیں جن سے متعلق ہم پورے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ اصلی ہیں۔ ان کی تفصیل یہ ہے

۱۔ وہ تصویر جو کلیات فارسی کی دوسری اشاعت ۱۸۶۳ء میں شامل تھی۔
۲۔ عجائب گھر لال قلعہ دہلی کی رنگین تصویر۔
۳۔ کتب خانہ حبیب گنج کی رنگین تصویر۔

۴۔ فوٹو کیمرا کی تصویر "



مگر بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم کو اس سے اختلاف ہے۔ وہ اپنے ایک مکتوب گرامی میں تحریر فرماتے ہیں۔

عزیزم خیر بہوروی سلمہ اللہ تعالیٰ۔

مرقع غالب پہنچا۔ سبحان اللہ کیا کام کیا ہے، تمہارے حسنِ ذوق۔ تلاش اور محنت کی داد نہ دینا سخت ناانصافی ہوگی۔ تم نے "غالب اِن سائیکلو پیڈیا" کا کام اپنے سر لیا ہے۔ یہ بڑا مشکل اور ذمہ داری کا کام ہے، مگر مجھے یقین ہے کہ تم اسے تکمیل کو پہنچا کے رہوگے۔ تم تو نہیں رہو گے مگر تمہاری یہ یادگار ہمیشہ زندہ رہے گی اور اصحابِ ذوق کو تمہاری یاد دلاتی رہے گی۔

سرورق پر جو تصویر دی گئی ہے وہ غالب کی نہیں محض اس وجہ سے کہ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے دلّی کے ایک بازار میں خریدی تھی غالب کی مصدقہ تصویر کیسے ہو سکتی ہے؟

غالب کی اصل تصویر وہی ہے جو میرے رسالہ اُردو میں شائع کی تھی۔ سب سے آخر میں جو تصویر ہے وہ لکھنؤ کے کسی رئیس زادے کی معلوم ہوتی ہے۔ اسے غالب سے منسوب کرنا بدذوقی کی دلیل ہے۔ جو تصویر میرے ایک دوست امریکہ لے گئے وہ وہی ہے جو "اُردو" میں شائع ہوئی تھی۔ مصور نے اصل تصویر سامنے رکھ کر بنائی تھی اور اصل میں جو رنگ مٹے ہوئے تھے اُن نے اپنی تصویر میں اُجاگر کر دیے تھے۔ افسوس وہ واپس نہیں آئی۔ باقی دو تصویریں جو میرے پاس ہیں وہ وہی ہیں جو تمہارے مرقع میں موجود ہیں۔"

نومبر ۱۹۶۹

کل پاکستان انجمن ترقی اُردو۔ اُردو روڈ۔ کراچی۔ ۱

پچھلے دنوں مالک رام صاحب لکھنؤ لائبریری ہاؤس میں تشریف لائے تھے تو میں نے اُن کو وہ فوٹو دکھایا تھا جو مرزا غالب کے انتقال سے تقریباً چھ ماہ قبل علائی مرحوم نے کھنچوایا تھا اور مرزا صاحب کو مشکل سے اُٹھا کر کرسی پر بٹھا دیا تھا۔ وہ ان کی انتہائی پیرانہ سالی اور بیکاریٔ اعضا کا زمانہ تھا۔ مرزا غالب کے اس فوٹو پر گفتگو کرتے ہوئے مالک رام صاحب نے یہ خبر سنائی تھی کہ
"جو رنگین تصویر حبیب گنج کے کتب خانے کی زینت تھی، وہ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ میں آ گئی تھی۔ وہاں سے غائب ہو گئی۔"

میں نے اس تصویر کا رنگین فوٹو دہلی میں بنوایا تھا جو میرے پاس محفوظ ہے۔ ملک پُرانے ہو گئے ہیں۔ کام نہ آ سکیں تو رنگین فوٹو بھیج دوں۔ غالب کو عشق نے نکما کر دیا تھا۔

عشق نے غالب نکمّا کر دیا ۔۔۔ ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

مجھ کو امراض نے کسی کام کا نہیں رکھا، ورنہ شاعر کے "غالب نمبر" کے لئے "غالب اِن سائیکلو پیڈیا" کا ایک باب غالب کے اُردو دواوین کا خلاصہ آپ کی نذر کرتا اور اس دیوان پر درد انگیز تفصیل سے لکھتا جو ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم نے مرتب کرایا تھا۔
اس دیوان کا قلمی نسخہ میرے ذخیرۂ نادرات میں محفوظ ہے۔ اس میں متداول دواوین سے الگ پہلی غزل کے اشعار یہ ہیں:

نہ رہی شرم ہے نازِ منصب سوخی اہتمام اُس کا ۔۔۔ نگیں میں جوں شرارِ سنگ ناپیدا ہے نام اس کا
مسی آلودہ ہے مہر نوازش نامہ ظاہر ہے ۔۔۔ کہ داغ آرزوئے بوسہ دیتا ہے پیام اُس کا
بامید نگاہِ خاص ہوں، محمل کشِ حسرت ۔۔۔ مبادا ہو عناں گیر تغافل لطفِ عام اُس کا

[illegible]



ان اشعار کے بعد ایک خط کھنچا ہوا ہے اور حسب ذیل دو شعر لکھے ہوئے ہیں

عقدہ کو آج اس کے ماتم میں سیہ پوشی ہوئی — وہ دل سوزاں کہ کل تک شمع ماتم خانہ تھا
شکوۂ یاراں غبار دل میں پنہاں کر دیا — غالب ایسے گنج کو شایاں یہی ویرانہ تھا

ان پانچ شعروں کے بارے میں ہاشمی صاحب نے لکھا ہے کہ یہ پانچوں شعر مولانا فضل الحسن حسرت موہانی نے کل رعنا سے لئے ہیں۔ اور اپنی شرح دیوان غالب کے آخر میں انہیں بہ حوالۂ مذکور درج کر دیا ہے۔ ہم نے یہ اور دیگر اشعار جو متداول دواوین میں موجود نہیں، اپنے اپنے موقع سے نقل کئے ہیں اور ان کے بارے میں کسی قدر تفصیل سے دوسری جگہ بحث کی ہے۔ غزل ۲۲ کے خارج شدہ اور دو شعر بھی یادگار غالب صفحہ ۱۱ پر مولانا حالی مرحوم نے تحریر کئے ہیں لیکن نہ وہ موجودہ دیوان میں ہیں نہ گل رعنا میں۔ لہذا انہیں شامل دیوان کرنا درست نہ ہوگا۔ وہ دو شعر یہ ہیں ؎

موسم گل میں مئے گلگوں حلال میکشاں — عقد وصل دختِ رز انگور کا ہر دانہ تھا
ساتھ جنبش کے بہ یک برخاستن طے ہو گیا — تو کہے، صحرا غبار دامن دیوانہ تھا

بعض دوسرے اشعار پر بھی فرید آبادی مرحوم کے ہاتھ کے لکھے ہوئے اشارے درج ہیں۔ یہ اشارے نواب علاء الدین احمد خاں علائی مرحوم کے پاس مرزا غالب کا جو قلمی دیوان تھا، اس سے لئے گئے ہیں۔ جس دیوان کا یہ ذکر ہے اس کے سلسلے میں بھوپالی مرحوم کے ایک خط کا اقتباس ملاحظہ کیجئے:

"جس دن سے وہ نسخہ دیوان غالب کا میرے پاس آیا ہے، شہر کے علمی طبقے میں ایک ہلچل سی ہے۔ آدھا بھوپال میرے خلاف ہے۔ بعض یہ کہتے ہیں کہ اچھا ہوا مجھ کو ملا۔ مولوی سلیمان ندوی صاحب نے بھی ایک حملہ فرمایا تھا۔ لیکن میں علی الاعلان نوٹس دے چکا ہوں کہ خواہ کھڑے کھڑے بھوپال سے نکلنا پڑے خواہ جان جائے، نسخہ اب نہیں جاتا انشاء اللہ۔

. . . جب ہاشمی صاحب آویں گے تو ایک مفصل تحریر پیش کروں گا" (بھوپال ۲۰ راگست ۱۹۱۸ء۔ بنام بابائے اردو مرحوم)

آپ مناسب سمجھیں تو ان سطروں کو غالب نمبر میں شامل کر لیجئے۔ اس طرح میری شرکت بھی ہو جائے گی اور آپ کے حکم کی تعمیل کی سعادت سے بھی محروم نہ رہوں گا۔

وہی ایک حور!

"مرزا صاحب ہم کو یہ باتیں پسند نہیں۔ پینسٹھ برس کی عمر ہے۔ پچاس برس عالم رنگ و بو کی سیر کی۔ ابتدائے شباب میں ایک مرشد کامل نے نصیحت کی ہے کہ ہم کو زہد و ورع منظور نہیں، ہم مانع فسق و فجور نہیں۔ پیو کھاؤ، مزے اڑاؤ مگر یاد رہے کہ مصری کی مکھی بنو، شہد کی مکھی نہ بنو، سو میرا اس نصیحت پر عمل رہا ہے۔ کسی کے مرنے کا وہ غم کرے جو آپ نہ مرے۔ کیسی اشک افشانی، کہاں کی مرثیہ خوانی۔ آزادی کا شکر بجا لاؤ، غم نہ کھاؤ اور اگر ایسے ہی اپنی گرفتاری سے خوش ہو تو چنا جان نہ سہی منا جان سہی۔ میں جب بہشت کا تصور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر مغفرت ہو گئی اور ایک قصر ملا اور ایک حور ملی، اقامت جاودانی ہے اور اسی ایک نیک بخت کے ساتھ زندگانی ہے۔ اس تصور سے جی گھبراتا ہے اور کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ ہے ہے وہ حور اجیرن ہو جائے گی۔ طبیعت کیوں نہ گھبرائے گی۔ وہی زمردیں کاخ اور وہی طوبیٰ کی ایک شاخ۔ چشم بد دور، وہی ایک حور۔ بھائی ہوش میں آؤ، کہیں اور دل لگاؤ ؎

زن نو کن اے دوست در ہر بہار — کہ تقویم پارینہ ناید بکار

(مرزا حاتم علی بیگ کی محبوبہ کی موت پر خط)

--- جاری ہے ---

سید مبارک علی

عروض اور غالب

نثر اور نظم میں اگر کوئی معیاری فرق ہے تو وہ صرف وزن اور قافیہ کا ہے۔
"شعر در منطقیاں مخیل موزوں ہے اور تنگ نہیں اگر قید موزوں کی نہ ہو تو نثر بھی نظم میں داخل ہو جائے کہ کوئی کلام تخیل سے خالی نہیں، نظم ہو خواہ نثر" (نصیر الدین معیار الاشعار)

اس سے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ شعر یا نظم کی اصل معیار وزن ہی ہے — اور بغیر وزن و قافیہ کے کسی نظم و شعر کا تصور نہیں کیا جا سکتا ہے۔ وزن سے یہاں ہماری مراد حرکات اور اسکان کا وہ تلازمہ ہے جو کسی لے یا دھن کو متعین کرتا ہے — دوسرے لفظوں میں اسے موزونیتِ کلام کہہ لیجئے — جب موزونیت الفاظ کا روپ اختیار کر لیتی ہے تو شعر کہلاتی ہے۔ یہی موزونیت شعر کی خالق ہے — یہ موزونیت جید انسانی طبائع کا خاصہ ہوتی ہے اور ایک ایسی شے ہے جو کسی کسب و کمال سے کم ہاتھ آتی ہے یعنی ؎

این سعادت بزورِ بازو نیست — تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

جن لوگوں میں موزونیت فطری طور پر پائی جاتی ہے وہ بلا تکلف شعر کہتے ہیں اور کسی علمی اور فنی ضرورت کی محتاجی محسوس نہیں کرتے اسی سے یہ خیال بندھا کہ ؎

طبعِ موزوں را عروض و قافیہ درکار نیست

اور یہ کہ ؎

عمدگی میرے شعر کی اب حیا — تم رٹو نہ فاعلاتن فاعلات

یا مولانا روم کا یہ شعر ؎

شعر می گویم بہ از آبِ حیات — من ندانم فاعلاتن فاعلات

یہ طرزِ فکر گمراہ کن ہے اور ع "دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے" کے سوا کچھ نہیں۔ یہ تسلیم کہ عروضی واقفیت کسی شخص کو شاعر نہیں بنا سکتی ہے لیکن یہ بھی اپنی جگہ صحیح ہے کہ عروضی واقفیت اور شعور کے بغیر بڑا سے بڑا موزوں طبع شاعر مشکل اور پیچیدہ بحروں میں بے نقص و بے عیب شعر نہیں کہہ سکتا — علم عروض کی غرض و غایت یہی ہے کہ وہ موزوں اور ناموزوں کے امتیازی شعور کو برقرار رکھے —

اگر کلام پرکھنے کا اس قسم کا میزان نہ ہو تو کوئی کلام افراط و تفریط کے اثر سے خالی نہ ہوگا اور کلام میں بے راہ روی اور ابتری پیدا ہو جانے کے امکانات وسیع ہو جائیں گے



سید احتشام حسین نے شاعر [illegible] کی تھی وہ اسی طرف اشارہ کرتی ہے کہ جگر تقاضی بحروں میں اکثر سہو ہو جاتا ہے کہ ایک مصرع کسی بحر میں اور دوسرا کسی بحر میں

پڑھنے کو سب ہو یا غزل، وہ غزل ہے — بحر ہزج میں ڈال کے بحرِ رمل چلے

وجہ یہ ہے کہ کسی صوتیاتی گروپ کو حافظے میں رکھنا بہت ہی مشکل کام ہے جس کا ہر شخص متحمل نہیں ہو سکتا ـــــ کسی لے کو کانوں میں کب تک مقید کیا جا سکتا ہے ـــــ عروضی ارکان کا استخراج اسی ضرورت کے مدِ نظر کیا گیا کہ صوتیاتی تموّج لفظوں کی گرفت میں آ جائے۔ اور اس طرح صوتیاتی پیمانہ مجرد لفظوں کی شکل میں ہمارے سامنے موجود رہے تاکہ کسی لے کو ہم ناپ تول سکیں۔ جگر مراد آبادی بلاشبہ غزل گو شعرا میں ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ زبردست موزوں طبع تھے لیکن اسی مناسبت سے ان کا عروضی شعور پختہ نہ تھا۔ ایک طرحی مشاعرے کا ذکر ہے[1] جس کا مصرع طرح بحرِ متقارب اثرم سالم میں تھا مگر جگر نے سہواً بحرِ متدارک مخبون مسکن پر قیاس فرما کر غزل کہی جس کا یہ شعر بہت مشہور ہے ـــ

اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کا کام نہیں — فیضانِ محبت عام تو ہے عرفانِ محبت عام نہیں

اس دور میں اکثر مغالطہ ہو جاتا ہے کیونکہ خاص طور سے فعولن کے بجائے فعلن، فعلن بہ سکونِ عین متبادل ارکان ہیں اور اختلاط ان کا جائز ہے مگر یہی فعلن متدارک کا بھی ایک مزاحف رکن ہے اور صوتیاتی ہم آہنگی کے لئے فعلن بہ سکونِ عین اور فعِلن بہ کسرِ عین کا اختلاط بحرِ متدارک میں جائز ہے جو متقارب میں درست نہیں ـــــ یہی ایک حدِ فاصل دونوں اور ان کے درمیان ہے۔

اس سلسلے میں یہ ذکر خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ چند ماہ قبل کسی اردو ماں اختر صاحب نے خلیل الرحمٰن اعظمی کی ایک غزل کے حسبِ ذیل میں مصرعوں کو خارج از بحر بتاتے ہوئے صاحبِ غزل کی توجہ اس طرف دلائی کہ اُن کے یہ مصرعے خارج وزن ہیں؛

۱۔ سونا لینے جب نکلے تو ہر ہر ڈھیر میں مٹی
۲۔ سوکھی دھرتی سُن لیتی ہے پانی کی آوازوں کو
۳۔ چاندی کے سے جن کے بدن تھے سورج کے سے مکھڑے

جواب میں لکھا گیا کہ دو مصرعوں میں "تھی" اور "تھے" کا اضافہ کر لیا جائے اور ایک مصرع اس طرح پڑھا جائے

سوکھی دھرتی سُن لیتی ہے پانی کی آوازوں کو

لیکن اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے بعض عجیب باتیں عروض کے متعلق بھی کہیں کہ فلاں بحر کا آہنگ عربی و فارسی موسیقی کی طرح کسا ہوا نہیں بلکہ ہندوستانی موسیقی کی طرح ڈھیلا اور لچک دار ہے اس لئے دانستہ یا نادانستہ ایک ہی بحر کی غزل میں بعض مصرعے ایسے آ جاتے ہیں جن میں ایک سبب یا آدھے رکن کی کمی ہو جاتی ہے ـــ جن پر نیم عروضیوں کے کان کھڑے ہوتے ہیں اور یہ لڑکھڑاہٹ میر، سودا، شاد عظیم آبادی سے لے کر یگانہ اور فراق تک میں ملتی ہے۔" لڑکھڑاہٹ چاہے میر و سودا کے یہاں پائی جاتی ہو یا فراق کے یہاں، بہرحال لڑکھڑاہٹ ہے۔

یہ بے راہ روی کسی نیم عروضی کی کھوج نہیں بلکہ عروضی نقطۂ نظر اس کی تائید کرتا ہے ـــــ اور ان کا متحمل ہونا اور بات ہے اور

---

[1] یہ مشاعرہ ڈیکوکنسل کانفرنس منعقدہ آگرہ کا ہے۔ جگر صاحب اس میں شریک ہوئے تھے۔ سیماب اکبرآبادی نے بھی طرح پر غزل کہی تھی لیکن وہ بوجوہ مشاعرہ میں شریک نہیں ہوئے تھے۔ اُن کی غزل کا ایک شعر یہ ہے ـــ

پھولوں سے اب رسم نہیں ہے راہ نہیں تاروں تک — صبح ہماری صبح نہیں ہے شام ہماری شام نہیں

سیماب اور جگر دونوں کی غزلوں کی بحروں کا فرق ظاہر ہے۔



ایک ہولناک دوسری بات۔ بحر متقارب "سویا چھند" کے مماثل ضرور ہے لیکن متقارب اور "سویا چھند" ایک ہی بحر نہیں ہیں۔ جن عربی بحروں کو ہندی عروض سے ماخوذ بتایا جاتا ہے وہ خیال اب جدید تحقیق کی روشنی میں بے بنیاد نظر آتا ہے۔ چنانچہ ملاحظہ ہو

"اس ضمن میں اب ہمارے نتائج یوں ہیں کہ اُردو کے صوفیوں کے ذریعے مستعمل بعض اوزان کی لَیَیں، رائج الوقت ہندی بحروں کی بعض لَیَوں سے کچھ مطابقت تو ضرور رکھتی ہیں۔ لیکن انہیں باقاعدہ ہندی کی بحریں نہیں کہا جا سکتا۔ کیوں کہ ان میں ماترک یا ورنک باقاعدگی نہیں ہے اور نہ ہی ان میں عربی و فارسی کی باقاعدگی ہے گویا یہ ایک طرح سے ان لَیَوں میں آزادہ رَوی کی مثالیں ہیں۔ اُردو کے کلاسکی شعرا میر و سودا کے یہاں بھی چند ایسی لَیَیں مل جاتی ہیں تو بعض ہندی کی بحروں سے مطابقت رکھتی ہیں لیکن ان کے تجزیے سے وہی نتائج برآمد ہوتے ہیں جو صوفیوں کی بعض ہندی نما منظومات کے تجزیے سے نکلے ہیں۔ ... اس معاملے میں چند مستثنیات کے لئے گنجائش چھوڑ کر ڈاکٹر مسعود حسین خاں صاحب کی یہ رائے قابلِ قبول ہے کہ عربی اور ہندی کی ایسی بحروں کا ایک دوسرے سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں۔"

(کتاب۔ اپریل ۶۸ء)

سطورِ بالا سے یہ وضاحت کرنی مقصود تھی کہ عروضی شعور بہت ضروری شے ہے اور ہم کسی طرح عروض کی اہمیت کو نہیں گھٹا سکتے۔ مرزا غالب کا جہاں تک تعلق ہے وہ بے مثال شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین عروضی شعور رکھتے تھے اور عروض کی اہمیت کا انہیں بخوبی اندازہ تھا۔ مرزا غالب تقطیع کو شعر کا لباس قرار دیتے ہیں

"تقطیع شعر کا لباس ہے۔" غالب۔ (نگار، غالب نمبر)

اس مختصر سی بات میں بڑی گہرائی اور وسعت ہے کہ تخیل اور وزن کی حیثیت شعر میں جسم و لباس کے تعلق جیسی شے ہے اگر جسم کو لباس نہ ملے تو جسم برہنہ قابلِ دید نہیں ہے۔ اسی طرح بے وزن شعر قابلِ سماعت نہیں ہے

"بے وزن و بحر شعر کا گھورے پہ ہے مقام" (اعجاز صدیقی)

کسی شعر کا آہنگ جس قدر دل آویز ہوگا، اسی تناسب سے تخیل کی قدر و قیمت بڑھ جائے گی اور اس کی تاثیر کا درجہ بلند ہو جائیگا۔ ہمارے شعری ادب میں جو یہ تخصیص و تقسیم ملتی ہے کہ فلاں موضوعِ فکر کے لئے فلاں بحر موزوں اور مقرر ہے، رُباعی بحرِ ہزج کے ۲۴ اوزان میں کہی جائے اور مثنوی متقارب اور رمل مسدس کے سات اوزان میں، وہ اسی عروضی تفہیم اور شعور کا نتیجہ ہے ——— کیوں کہ بعض اوزان نہایت ہلکے، سُبک اور رواں ہیں جو بہ آسانی نظم ہو جاتے ہیں۔ یا یہ قسم کے موضوع کے لئے یہ کارآمد ہیں۔ کچھ اوزان شکستہ ہیں۔ ان میں کلام کی چُستی اور زور مشکل پیدا ہوتا ہے۔ اس میں عام طور پر چھوٹی بحریں شامل ہیں اور دراصل چھوٹی بحریں ہی وہ میزان ہے جس سے کسی شاعر کی قوتِ شعرگوئی و لطفِ سخن کا صحیح صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ بعض اوزان ایسے ہیں جن میں خاص قسم کا صوتیاتی لطف ملتا ہے اور بھرپور غنائیت و موسیقی پائی جاتی ہے جو عاشقانہ طرزیاں اور غزل کے لئے نہایت مناسب ہیں ——— بہرحال موضوعِ فکر اور اوزان میں ہم آہنگی بہت ضروری ہے بعض اوقات موضوعِ فکر اور اوزان میں مطابقت نہ ہونے کے باعث مقصودِ فکر کا تاثر ہی قائم نہیں ہوتا اور کلام کی سحر انگیزی مجروح ہو جاتی ہے۔ اس سلسلے میں فیض احمد فیض کی نظموں اور ان کی منتخبہ بحروں کے تعلق سے جو کچھ ن۔م۔ راشد نے "نقشِ فریادی" کے دیباچے میں کہا ہے وہ قابلِ لحاظ ہے:

"۔ اِن نظموں کے مصرعے رینگ رینگ کر چلتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ نظموں کا تار و پود مکڑی کے جالے سے زیادہ استوار و کارآمد نہیں۔ ہر لفظ پر احساسات کا ایک بوجھ ایک کابوس بن کر چھایا ہوا ہے۔ اس زمانے میں

...ہیں

فیض نے جو بحر (فاعلاتن مفاعلن فعلن) سب سے زیادہ استعمال کی ہے وہ تمام بحروں سے زیادہ



کا استعمال اور جواب آتا ہے۔"

...کی کامیاب ادائیگی کے لئے بہر حال ضروری ہے کہ صحیح بحر کا انتخاب کیا جائے۔ دراصل اسی انتخابی شعور پر شاعر کی کامیابی اور ناکامیابی منحصر ہے۔

جب ہم اس نقطۂ نظر سے کلامِ غالب کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ غالب کا عروضی شعور نہایت بلند تھا۔ مرزا نے اپنی فکری صلاحیت اور موضوعِ فکر کی مناسبت سے انہیں بحروں کا انتخاب کیا جو ان کی طرزِ ادا کی متحمل تھیں، جو ان کے اندازِ فکر و سخن کو بخوبی سمو سکتی تھیں۔ مرزا غالب کا اندازِ فکر فلسفیانہ۔ دقیق۔ طرزِ بیاں مشکل اور انتہائی پیچیدہ تھا اور خود مرزا کو اس کا احساس تھا کہ ؎

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل   سُن سُن کے اسے سخنورانِ کامل
آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش   گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

مرزا کی اس مشکل پسند طبیعت کی جلوہ ریزی بحروں کے انتخاب میں بھی نظر آتی ہے اور ہمیں اس انتخاب میں اس شعر کی رُوح کارفرما نظر آتی ہے کہ ؎

رُکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور   پلتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے

مرزا کا تجربہ بڑا عمیق تھا اور وہ اس نفسیاتی نکتے سے بخوبی واقف تھے کہ جس قدر آہنگِ شعر مشکل اور دقت طلب ہوتا ہے، اسی قدر فکری پیچیدگی بڑھ جاتی ہے اور شاعر کو کافی سوچنا پڑتا ہے اور یہ چیز بطور مہمیز طبیعت پر اثر انداز ہوتی ہے جس سے طبیعت کی روانی اور بھی بڑھ جاتی ہے — یہ مرزا کا ذاتی تجربہ ہی نہیں بلکہ نفسیاتی حقیقت ہے۔

مرزا نے عام طور پر ان بحروں کو منتخب کیا جو دقت طلب، مشکل اور قدرے ثقیل ہیں۔ حالانکہ ان کے یہاں متوسط بحریں بھی ہیں لیکن کم۔ علاوہ ازیں مرزا نے ایک دو بحریں ایسی بھی استعمال کی ہیں جو دوسرے شعرا کے یہاں شاید ہی ملیں گی اور ان میں ... کہا ہوئے شعر لانے سے کم نہیں۔

۱۔ بحر منسرح مثمن مطوی منحور
۲۔ بحر ہزج مثمن اشتر
۳۔ بحر رمل مثمن مشکول

دوسرے شعرا کے یہاں بہت کم دیکھنے میں آتی ہیں — مجموعی طور پر مرزا غالب کے اردو دیوان میں آٹھ بحریں ملتی ہیں جو سالم اور مزاحف صورتوں میں ہیں — ان آٹھ بحروں میں ۴ بحریں مفرد ہیں اور ۴ مرکب۔ ہزج۔ رمل۔ رجز۔ متقارب۔ مفرد ہیں۔ مضارع۔ مجتث خفیف اور منسرح مرکب۔ بحر منسرح میں صرف ایک غزل پورے دیوان میں ہے۔ بحر متقارب اور بحر رجز میں ایک ایک میں تین تین غزلیں ہیں — یہ تعداد برائے نام ہے۔ اس طرح آٹھ بحروں کی یہ تعداد گھٹ کر ۵ رہ جاتی ہے — دراصل غالب کا کہا ہوا زیادہ تر حصہ انہیں پر مشتمل ہے۔ جو ترتیب وار یہ ہیں رمل۔ ہزج۔ مضارع۔ مجتث اور خفیف — الٹ پھیر کر غالب نے انہیں بحروں کو استعمال کیا ہے۔ کہیں مثمن کہیں مسدس۔ کبھی سالم۔ کبھی مزاحف — ان بحروں میں بحر رمل میں غزلیں سب سے زیادہ ہیں۔ تقریباً تیس فیصد گفتۂ غالب رمل پر مشتمل ہے۔ مضارع دوسرے نمبر پر ہے جس میں ۱۸ تا ۲۰ فیصد کلام ہے۔ یعنی دیوانِ غالب نصف انہیں دو بحروں میں ہے — اور بحر ہزج کا درجہ تیسرا ہے۔ جہاں تک بحر رمل کے زیادہ استعمال کا تعلق ہے وہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ تمام اردو شعرا کے یہاں یہ بحر زیادہ استعمال ہوئی ہے بلکہ شمس الرحمٰن فاروقی

شاعر۔ سعید   غالب ۱۸۶۹ء



صاحب (دشت جنون) کا قیاس ہے کہ ترقی پسند شعرا کی کم و بیش پچاس فیصد تخلیقات رمل میں ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آج کل بھی یہ بحر عام ہے۔ اس لحاظ سے غالب کے یہاں رمل کا سب سے زیادہ استعمال کوئی تعجب کی بات نہیں۔

لیکن جہاں تک بحر مضارع کے کثرت سے استعمال کا تعلق ہے وہ ضرور غالب کی دقتِ طبع اور مشکل پسندی کا اعلامیہ ہے۔ کیوں کہ بحر مضارع ثقیل بحروں میں سے ہے

"بحر مضارع ... لوجہ ثقالت کامل مستعمل نہیں ہوتا، مگر زحافات کے ساتھ۔" (فیروز اللغات۔ فیروز الدین صاحب)

ان مذکورہ آٹھ بحروں کو غالب نے کس کس طرح استعمال کیا ہے، اس کی تشریح حسب ذیل ہے:

بحر رمل = فاعلاتن۔ فاعلاتن۔ فاعلاتن۔ فاعلاتن۔

بحر رمل سالم اردو شعرا شاذ و نادر ہی استعمال کرتے ہیں، کیوں کہ اس کا آہنگ ہمارے لب و لہجہ سے مطابقت نہیں کرتا۔ لہٰذا مرزا نے بھی اس کا استعمال نہیں کیا۔ مرزا نے بحر رمل کے حسب ذیل مزاحف اوزان یا بحریں استعمال کی ہیں۔

۱۔ رمل مثمن محذوف ـــ فاعلاتن۔ فاعلاتن۔ فاعلاتن۔ فاعلن

۲۔ رمل مثمن مقصور ـــ " " " فاعلات

یہ دونوں اوزان ایک شمار کئے جاتے ہیں اور یہ جائز ہے کہ ایک مصرع رمل مثمن محذوف میں ہو اور دوسرا رمل مثمن مقصور میں۔ یہاں ایک بات قابل ذکر ہے کہ بعض عروضی فاعلاتْ کو فاعلان سے بدل لیتے ہیں۔ اس میں حرج بھی نہیں ہے لیکن یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ یہاں نون ساکن ہے اعلان شمار ہوگا، کیوں کہ نون غنہ کا تقطیع میں شمار نہیں ہے اور تقطیع میں اس کی جگہ کوئی ساکن حرف ملفوظی لانا چاہیئے

ع سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں = فاعلاتن۔ فاعلاتن۔ فاعلاتن۔ فاعلان

ع خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں = " " " "

رمل مثمن مقصور۔ (فن شاعری۔ اخلاق دہلوی)

میرے خیال میں یہ غزل رمل مثمن محذوف میں شمار ہونی چاہیے۔

رمل مثمن محذوف:

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا   کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

رمل مثمن مقصور:

آمد خط سے ہوا ہے سرد جو بازار دوست   دودِ شمع کشتہ تھا شاید خطِ رخسار دوست
اے دلِ ناعاقبت اندیش ضبطِ شوق کر   کون لا سکتا ہے تابِ جلوۂ دیدار دوست

اس میں تیسرا مصرع رمل مثمن محذوف میں ہے اور چوتھا رمل مثمن مقصور میں۔

۱۔ بحر رمل مثمن مخبون محذوف مقطوع = فاعلاتن۔ فعلاتن۔ فعلاتن۔ فعْلن۔ (فعلن بہ سکون عین)

۲۔ بحر رمل مثمن مخبون محذوف = فاعلاتن۔ فعلاتن۔ فعلاتن۔ فعلن۔

۳۔ بحر رمل مثمن مخبون مقصور = " " " فعلات۔

۴۔ بحر رمل مثمن مخبون مقطوع مسبغ = " " " فعْلان۔

یہ اوزان ایک ہی غزل میں جمع ہو سکتے ہیں اور ان کا وزن ایک ہی شمار کیا جاتا ہے۔



تیری تحریر ہے ممنوعِ اشاراتِ کثیر — فاعلاتن ۔ فعلاتن ۔ فعلاتن ۔ فعلات ۔ ۱۰
تیری تعبیر رقم آموزِ عباراتِ قلیل — ״ ״ ״ ״ ۔ ۲
تیری دانش مری اصلاحِ مفاسد کی رہین — ״ ״ ״ ״ ۔ ۶
تیری بخشش مرے انجاحِ مقاصد کی کفیل — فاعلاتن ۔ فعلاتن ۔ فعلاتن ۔ فعلات ۔ ۶
ماہ نے چھوڑ دیا ثور سے جانا باہر — ״ ״ فعلاتن ۔ فعلن ۔ ۵
میرے ابہام پہ ہوتی ہے تصدق توضیح — فاعلاتن ۔ فعلاتن ۔ فعلاتن ۔ فعلان ۔ ۳
میرے اجمال سے کرتی ہے تراوش تفصیل — ״ ״ ״ ״

غالب نے یہ زحاف بحرِ مسدس میں بھی استعمال کی ہیں ۔

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے — فاعلاتن ۔ فاعلاتن ۔ فاعلن
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا — ״ ״

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام — فاعلاتن ۔ فاعلاتن ۔ فاعلات
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے — ״ ״ فاعلن

اوّل شعر رمل مسدس محذوف میں ہے ۔ دوسرے شعر کا پہلا مصرع رمل مسدس مقصور میں اور دوسرا رمل مسدس محذوف میں ہے
رمل مسدس مخبون محذوف :

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ — سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

دوسرا مصرع مخبون مقطوع میں ہے ۔ (فاعلاتن ۔ فعلاتن ۔ فعلن)

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز — پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا

اوّل مصرع کا وزن فاعلاتن ۔ فعلاتن ۔ فعلان ۔ رمل مسدس مخبون مقصور ہے ۔ دوسرے کا مخبون مقطوع ۔

قطع کیجے نہ تعلق ہم سے — فاعلاتن ۔ فعلاتن ۔ فعلن
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

پہلا مصرع رمل مسدس مخبون مقطوع میں ہے اور دوسرا محذوف میں ۔

علطیہائے مضامیں مت پوچھ — فاعلاتن ۔ فعلاتن ۔ فعلان
لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں — ״ ״ فعلن

پہلا مصرع مخبون مقطوع مسبّغ میں ہے ۔
رمل مثمن مشکول ۔۔۔ فعلات ۔ فاعلاتن ۔ فعلات ۔ فاعلاتن ۔ بڑی عمدہ بحر ہے ۔ اس میں ایک خاص صوتیاتی لطف اور نغمگی پائی جاتی ہے ۔ رمل کی دوسری بحروں سے یہ زیادہ مشکل بحر ہے ۔ بہت کم شعرا اس میں غزل کہتے ہیں ۔ مرزا غالب کے یہاں بھی صرف دو غزلیں اس بحر میں ہیں ۔ ایک غزل تو کافی شہرت یافتہ ہے جس کا مطلع یہ ہے ۔

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا — اگر اور جیتے رہتے ، یہی انتظار ہوتا

دوسری غزل میں صرف تین شعر ہیں ۔ اس کا مطلع یہ ہے ۔

جو نہ نقدِ داغِ دل کی کرے شعلہ پاسبانی — تو فسردگی نہاں ہے بہ کمینِ بے زبانی



۱۔ بحرِ ہزج مثمن سالم = مفاعی لن۔ ایک مصرع میں چار بار۔
۲۔ بحرِ ہزج اشتر = فاعلن۔ مفاعیلن فاعلن۔ مفاعیلن۔
۳۔ بحرِ ہزج مثمن مقبوض سالم = مفاعلن۔ مفاعیلن۔ مفاعلن۔ مفاعیلن۔
۴۔ بحرِ ہزج مثمن اخرب = مفعول۔ مفاعیلن۔ مفعول۔ مفاعیلن۔
۵۔ بحرِ ہزج مثمن اخرب مکفوف مقصور = مفعول۔ مَفَاعِیلُ۔ مَفَاعِیلُ۔ مَفَاعِیلْ۔
۶۔ بحرِ ہزج مثمن اخرب مکفوف، محذوف = مفعول مفاعیل۔ مفاعیل۔ فعولن۔

ہزج سالم (مثمن) میں غالب نے نہایت اچھی ترنم خیز اور پُرمغز غزلیں کہی ہیں ؎

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا   وہ اک گلدستہ ہے ہم بے خودوں کے طاقِ نسیاں کا

نظر میں ہے ہماری جادۂ راہِ فنا غالبؔ   کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

اسی بحر کا ایک اور شعر ہے ؎

ہم اور وہ بے سبب رنج آشنا دشمن کہ رکھتا ہے   شعاعِ مہر سے تہمت نگہ کی چشمِ روزن پر

اس شعر کا مصرع اوّل قابلِ غور ہے۔ کیوں کہ اوّل تو "اور" کا تلفظ "اُر" شعری ضرورت کے لحاظ سے ویسے ہی بے جا مانا ہے اور اس پر یہ کہ الف بھی گرادیا گیا۔ ایک لفظ سے بیک وقت دو حروف کا سقوط درست نہیں ہے۔

"ہم اور وہ بے سبب رنج آشنا دشمن کہ رکھتا ہے" کی تقطیع

ہمُر وہ بے۔ سبب رنجا۔ شنا دشمن۔ کہ رکھتا ہے

مفاعیلن۔ مفاعیلن۔ مفاعیلن۔ مفاعیلن۔

غالب نے لفظ "اور" کئی جگہ فاع اور فع کے وزن میں برتا ہے، لیکن یہ بے اعتدالی صرف اِسی مصرع میں نظر آئی، حالانکہ بہادر شاہ ظفر کے یہاں بھی ایک ایسی مثال ملتی ہے لیکن میری رائے یہی ہے کہ یہ درست نہیں ہے۔ ؎

"تیری کدورت سنگدلی۔ خاک اور پتھر کیا کہوں" (ظفر)

ہزج اشتر مثمن میں صرف دو غزلیں نظر آئیں لیکن یہ دونوں بہت ہی عمدہ غزلیں ہیں۔ اس بحر میں بڑی لطیف نغمگی ملتی ہے۔

سادگی و پُرکاری۔ بیخودی و ہشیاری   حُسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا

درد دل لکھوں کب تک جاؤں انکو دکھلاؤں   انگلیاں فگار اپنی، خامہ خوں چکاں اپنا

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب   ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

بحرِ ہزج مقبوض سالم میں ایک ہی غزل ہے ؎

عجب نشاط سے جلاّد کے چلے ہیں ہم آگے   کہ اپنے سائے سے سر پاؤں سے ہے دو قدم آگے

اس بحر کی تقطیع بحرِ مجتث مثمن مخبون میں بھی ہوسکتی ہے۔ یعنی = مفاعلن۔ فعلاتن۔ مفاعلن۔ فعلاتن لیکن حدِ فاصل یہ ہوگی، مفاعیلن کی جگہ حشو میں کبھی مفاعیلان بھی آسکتا ہے۔



بحر ہزج اخرب سالم میں ایک ہی غزل ہے۔

گلشن کو تری صحبت از بسکہ خوش آئی ہے   ہر غنچے کا گل ہونا آغوش کشائی ہے

باقی مادہ دو اوزان میں یعنی بحر ہزج اخرب مکفوف محذوف اور ہزج اخرب مکفوف مقصور میں بھی کئی غزلیں ہیں۔ چونکہ محذوف اور مقصور کا اختلاط جائز ہے، اس لئے یہ دونوں اوزان ایک ہی غزل میں جمع ہو سکتے ہیں۔ مثال کے لئے ملاحظہ ہو ؎

یا رب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات   دے اور دل اُن کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

ہر چند سبک دست ہوئے بت شکنی میں   ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگ گراں اور

۱-۲-۴ کا وزن = مفعول۔ مفاعیل۔ مفاعیل۔ مفاعیل۔

اور تیسرے کا " " " فعولن۔

ہزج کو مسدس بھی استعمال کیا گیا ہے۔

ہزج مسدس محذوف اور ہزج مسدس مقصور،

بلائے جاں ہے غالبؔ اُس کی ہر بات   مفاعیلن۔ مفاعیلن۔ مفاعیل

عبارت کیا۔ اشارت کیا۔ ادا کیا   " " فعولن

پہلا مصرع ہزج مسدس مقصور میں ہے، دوسرا محذوف میں۔

ہزج مسدس اخرب مقبوض محذوف = مفعول۔ مفاعلن۔ فعولن۔

فریاد کی کوئی لَے نہیں ہے   مفعول۔ مفاعلن۔ فعولن

نالہ پابندِ نَے نہیں ہے   مفعولن۔ فاعلن۔ فعولن

پہلا مصرع اخرب مقبوض محذوف میں ہے اور دوسرا اخرب اشتر محذوف میں۔

بحر رجز = مستفعلن۔ مستفعلن۔ مستفعلن۔ مستفعلن۔ غالبؔ نے یہ بحر مزاحف استعمال کی ہے صرف تین غزلیں ہیں۔

رجز مثمن مطوی مخبون = مفتعلن۔ مفاعلن۔ مفتعلن۔ مفاعلن۔

اس میں حشو میں مفاعلات بھی آ جائے تو ہرج نہیں، بلکہ زیادہ تر شعرا لاتے ہیں۔ یہ غزلیں بھی کافی کامیاب ہیں اور ان کے یہ اشعار لاجواب ہیں ؎

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں   موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہیئے غیر سے تہی   سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اُٹھا دیا کہ یوں

گلشنِ اتفاق میں ایک بہارِ بے خزاں   میکدۂ وفاق میں بادۂ بے خمار ایک

متقارب = فعولن۔ فعولن۔ فعولن۔ فعولن

اس میں بھی تین ہی غزلیں ہیں اور ایک متفرق شعر ؎



رسا کر فقیروں کا ہم بھیس غالبؔ — تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

مرکب بحروں میں غالب نے بحر منسرح۔ بحر مجتث۔ بحر مضارع اور بحر خفیف کو استعمال کیا ہے۔

بحر منسرح ۔ مستفعلن مفعولات۔ مستفعلن۔ مفعولات

اُردو شعرا کے یہاں یہ بحر بہت ہی کم مستعمل ہے۔ دوبارہ یہ بحر مزاحف استعمال ہوئی ہے۔ مرزا غالب نے اس کو مثمن مطوی مخدور استعمال کیا ہے۔

بحر منسرح مثمن مطوی مجدو ۔ مفتعلن۔ فاعلات۔ مفتعلن۔ فع۔

مفتعلن۔ فاعلات مطوی ہیں اور فع " مجدو " ۔ مرزا کی اس بحر میں ایک ہی غزل ملتی ہے جس کے چند اشعار یہ ہیں ؎

آہ کہ مری جان کو قرار نہیں ہے — طاقتِ بیدادِ انتظار نہیں ہے

دیتے ہیں جنت حیاتِ دہر کے بدلے — نشہ بہ اندازۂ خمار نہیں ہے

تو نے قسم میکشی کی کھائی ہے غالبؔ — تیری قسم کا کچھ اعتبار نہیں ہے

بحر مضارع ۔ مفاعیلن۔ فاع لاتن۔ مفاعیلن۔ فاع لاتن (دوبار)

یہ بحر سالم مستعمل نہیں ہے۔ مزاحف مستعمل ہے۔ مرزا غالب نے اس بحر کو بکثرت استعمال کیا ہے۔ تقریباً ۵۰ غزلیں اس بحر میں ملتی ہیں۔

مرزا نے مضارع کے حسب ذیل اوزان استعمال کئے ہیں :

مضارع مثمن اخرب ۔ مفعول۔ فاع لاتن۔ مفعول۔ فاع لاتن۔

اس وزن میں ایک ہی غزل ہے ؎

میں اور بزمِ مے سے یوں تشنہ کام آؤں

گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا

درماندگی میں غالبؔ کچھ بن پڑے تو جانوں

جب رشتہ بے گرہ تھا ناخن گرہ کشا تھا

مضارع مثمن اخرب مکفوف محذوف ۔ مفعول۔ فاع لات۔ مفاعیل۔ فاع لن

مضارع مثمن اخرب مکفوف مقصور ۔ مفعول۔ فاع لات۔ مفاعیل۔ فاع لان۔

مقصور اور محذوف کا اختلاط درست ہے۔ عروض و ضرب میں فاع لن اور فاع لان بھی لا سکتے ہیں اور اس کے بالعکس بھی۔ اگر عروض میں فاع لان لائیں اور ضرب میں فاع لن تو حرج نہیں۔

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال — مفعول۔ فاع لات۔ مفاعیل۔ فاع لان

ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو — " " " فاع لن

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو — مفعول۔ فاع لات۔ مفاعیل۔ فاع لن

بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر — " " " فاع لان

بحر مجتث ۔ مُس تفع لن۔ فاعلاتن۔ مُس تفع لن۔ فاعلاتن۔

یہ بحر اُردو شعرا کے یہاں مزاحف صورت میں ملتی ہے۔ ترقی پسند شعرا نے بھی اس بحر کو زیادہ استعمال کیا ہے اور آجکل کے اکثر

شاعرِ معنی



شعرا کے یہاں [illegible] میں شک نہیں کہ یہ بحر کارآمد بھی ہے۔ غالب کے یہاں اس بحر میں تقریباً ۱۹ غزلیں موجود ہیں۔

[illegible]

مجتث مثمن مخبون ۔ مفاعلن۔ فَعِلاتُن۔ مفاعلن فعلاتُن۔

باقی اوزان میں ۲ مختصر سی غزلیں ہیں جو مشکل زمین ہے لیکن بہت عمدہ ہے۔

نظر بہ نقصِ گدایاں کمال بے ادبی ہے
کہ خار خشک کو بھی دعوئے چمن نسبی ہے
امام ظاہر و باطن، امیر صورت و معنی
علی ولی اسد اللہ جانشینِ نبی ہے

تم اپنے شکوہ کی باتیں نہ کھود کھود کے پوچھو
حذر کرو مرے دل سے کہ اس میں آگ دبی ہے
دلا یہ درد و الم بھی تو مغتنم ہے کہ آخر
نہ گریۂ سحری ہے، نہ آہِ نیم شبی ہے

۱۔ بحر مجتث مثمن مخبون مقصور = مفاعلن۔ فعلاتن۔ مفاعلن۔ فَعِلان
۲۔ بحر مجتث مثمن مخبون محذوف = " [illegible]
۳۔ بحر مجتث مثمن مخبون محذوف مقطوع = مفاعلن۔ فعلاتن۔ مفاعلن۔ فعلن۔
۴۔ بحر مجتث مثمن مخبون مسکن مقصور = [illegible] فعلان۔

یہ اوزان آپس میں متحد ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ آ سکتے ہیں۔ ایک ہی غزل میں تمام اوزان آ جائیں تو حرج نہیں۔ ایک مصرع ایک میں اور دوسرا دوسرے وزن میں کہا جا سکتا ہے۔ غالب کے یہاں یہ بحر اسی طرح مستعمل ہے۔

بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل — مفاعلن۔ فعلاتن۔ مفاعلن۔ فعلن
کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کیلئے — "
ادائے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا
صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کیلئے

ہمارے ذہن میں اس فکر کا ہے نام وصال — " [illegible] فعلان
کہ گر نہ ہو تو کہاں جائیں ہو تو کیونکر ہو — " " فعلن

غمِ فراق میں تکلیفِ سیرِ باغ نہ دو — " " " فعلن
مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بیجا کا — " " " فعلن



وصالِ جلوہ تماشا ہے پر دماغ کہاں — مفاعلن ۔ فعلاتن ۔ مفاعلن ۔ فَعِلان
کہ دیجے آئینۂ انتظار کو پرواز — " " " فعلان

بحر خفیف ۔ فاعلاتن ۔ مستفعلن ۔ فاعلاتن ۔ (دوبار)

بحر خفیف مسدس الاصل ہے مثمن نہیں آتی ___ عام طور پر اردو شعرا کے یہاں یہ بحر زاحف ملتی ہے اور مخبون زیادہ مستعمل ہے۔

۱۔ بحر خفیف مسدس مخبون محذوف ۔ فاعلاتن ۔ مفاعلن ۔ فَعِلن ۔
۲۔ بحر خفیف مسدس مخبون مقصور ۔ فاعلاتن ۔ مفاعلن ۔ فَعِلان
۳۔ بحر خفیف مسدس مخبون محذوف مسکن ۔ فاعلاتن ۔ مفاعلن ۔ فَعْلن ۔
۴۔ بحر خفیف مسدس مخبون مسکن مقصور ۔ فاعلاتن ۔ مفاعلن ۔ فَعْلان ۔

یہ چار اوزان ایک ہی وزن شمار کیے جاتے ہیں۔ ایک ہی غزل میں چاروں جمع ہو سکتے ہیں یا ایک مصرع ایک وزن میں اور دوسرا ان میں سے کسی وزن پر آ سکتا ہے۔ اس بحر میں تقریباً دس غزلیں غالب کے یہاں ملتی ہیں۔

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے — فاعلاتن ۔ مفاعلن ۔ فَعِلن
آخر اس درد کی دوا کیا ہے — " " "
ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار — " " فَعِلان
یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے — " " فعلن

وہ فراق اور وہ وصال کہاں — فاعلاتن ۔ مفاعلن ۔ فَعِلان
وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں — " " "
تھی وہ اک شخص کے تصور سے — فَعِلن
اب وہ رعنائیِ خیال کہاں — فَعِلان

نوٹ: صدر و ابتدا میں فَعِلاتن بھی آتا ہے ___ ورنہ عام طور پر رکنِ اول مخبون نہیں لاتے ہیں، سالم بھی لاتے ہیں یعنی فاعلاتن۔

غالب کا ایک قصیدہ ہے جو کہ اسی بحر خفیف میں ہے۔ اس کا ایک شعر اس طرح ہے۔

ختم کرتا ہوں اب دعا پہ کلام — شاعری سے نہیں مجھے سروکار

مصرع اول کا وزن فاعلاتن ۔ مفاعلن ۔ فعِلان ہے اور دوسرے کا فاعلاتن ۔ مفاعلن ۔ فعولن ہے۔ میرے خیال میں مصرع دوم بحر سے الگ ہو گیا ہے۔

جن آٹھ بحروں کا ذکر ہم اوپر کر آئے ہیں، بس وہی بحریں غزلیات، قطعات، قصائد اور مثنوی میں غالب کے اردو دیوان میں پائی جاتی ہیں۔ جہاں تک غالب کی رباعیات کا تعلق ہے غالب کی رباعیات انہیں مشہور و معروف بحر ہزج مثمن اخرب و اخرم کے ۲۴ اوزان میں ہیں البتہ غالب کی ایک رباعی[1] کے ایک مصرع کو مروجہ اوزان سے الگ قرار دیا جاتا ہے۔

---

[1] دکھ جی کے پسند ہو گیا ہے غالب — دل رک رک کر بند ہو گیا ہے غالب
واللہ کہ شب کو نیند آتی ہی نہیں — سونا سوگند ہو گیا ہے غالب



اکثر شارحین کا خیال ہے کہ مرزا غالب سے یہاں سہو ہو گیا ہے ــــــ بقول نظم طباطبائی یہ سہو کاتب نہیں بلکہ مرزا غالب کی غلطی ہے، کیوں کہ ان کا کہنا ہے کہ یہ رُباعی انھوں نے نسخۂ رامپور میں خود غالب کی تحریر میں دیکھی ہے اور مصرع اِس طرح ہے:

"دل رُک رُک کر بند ہو گیا ہے غالبؔ"

اس میں ایک سبب زیادہ ہے۔ کسی کسی دیوان میں مصرع یوں بھی ہے۔

"دل رُک کر بند ہو گیا ہے غالبؔ"

لیکن با اعتبارِ مفہوم زیادہ صحیح یہی ہے کہ "رُک رُک کر" ہو۔

اِس سلسلے میں نجم الغنی صاحب کا قیاس زیادہ صحیح ہے۔ وہ لکھتے ہیں، بعض عروضیوں نے رُباعی کے نئے اوزان کی تلاش میں ایک نیا طریقہ یہ نکالا کہ بحر ہزج مسدس اخرب مقبوض محذوف پر ایک رُکن فعلن کا اضافہ کیا اور اُسے رُباعی کا وزن قرار دیا۔ مرزا کی رُباعی اِسی وزن میں ہے، یعنی مفعول۔ مفاعلن۔ فعولن۔ فعلن۔ لیکن مرزا سے چُوک ہو گئی۔ رکنِ اوّل مفعول لانے کے بعد رکنِ دوم فاعلن لانا چاہئے تھا۔ یعنی مفعول فاعلن فعولن۔ فعلن کے وزن پر مصرع ہوتا تھا۔ بہر حال یہاں تک تو بات ٹھیک ہے کہ مرزا سے یہاں غلطی ہو گئی، لیکن یہ صحیح نہیں ہے کہ یہ رُباعی کا وزن ہی نہیں ہے۔ جن لوگوں نے یہ کھوج کی وہ لائقِ تحسین ہیں ــــــ حالاں کہ یہ بات اپنی جگہ یہ ہے کہ عروضی نقطۂ نظر سے ارکان کی نشست غلط ہے، لیکن جہاں تک رُباعی کے ۲۴ مروّجہ اوزان کے یاد رکھنے کی سہولت کا تعلق ہے، یہ سب سے بہتر فارمولا ہے کیوں کہ رُباعی کے مروّجہ آٹھ اوزان اِس میں سموئے ہوئے ہیں۔

محترمہ محفوظ الحسن

غالب — شاعرِ تصوّف

عنوان کچھ عجیب سا ہے، لیکن ایسا بھی نہیں کہ آپ چونک جائیں، کیوں کہ میں کوئی نئی بات نہیں کہنے جا رہا ہوں، میں وہی کہوں گا جس کا ادّعا خود غالب نے کیا ہے ؎

یہ مسائلِ تصوّف یہ ترا بیان غالبؔ   تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

غالب کے مندرجۂ بالا شعر سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود غالب کو مسائلِ تصوّف کے بیان پر بڑا ناز تھا اور وہ یہ سمجھنے لگے تھے کہ وہ صوفی ہیں لیکن جیسے ہی اُن کے ذہن کے پردے پر اُن کی بادہ خواری کا نقش اُبھرتا ویسے ہی وہ ایک لمحے کے لئے رُک کر یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے تھے کہ وہ صوفی نہیں۔ ہاں مسائلِ تصوّف کے بیان پر انہیں دسترس حاصل ہے۔ لیکن ہم اطمینان کی سانس بھی نہیں لے پاتے ہیں کہ غالب کا دوسرا دعویٰ ہوتا ہے ؎

ہم چو من شاعر و صوفی و نجومی و حکیم   نیست در دہر قلم مدعی و نکتہ گو است

یعنی ابھی تھوڑی دیر پہلے وہ صرف مسائلِ تصوّف کے بیان پر ناز کرتے نظر آتے تھے لیکن فوراً ہی یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اُن جیسا نہ صرف صوفی بلکہ شاعر، نجومی اور حکیم بھی زمانے میں نہیں۔ اسے ہم غالب کی شاعرانہ تعلّی نہیں سمجھ سکتے، کیوں کہ وہ بانگِ دہل اپنے صوفی ہونے کا اعلان کرتے نظر آتے ہیں۔

سرفراز حسین کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

"میں صوفی ہوں۔ ہمہ اوست کا دم بھرتا ہوں۔"

ایک دوسرے مکتوب میں مجروح کو لکھتے ہیں:

"صبر و تسلیم، توکّل و رضا شیوہ صوفیا کا ہے۔ مجھ سے زیادہ اس کو کون سمجھے گا۔"

خطوط کے مندرجۂ بالا دونوں ٹکڑوں میں ہمہ اوست، صبر، تسلیم، توکّل، رضا وغیرہ ایسی چیزیں ہیں جن کا تعلق تصوّف سے بھی ہے اور شاعری سے بھی۔ صبر و تسلیم، توکّل و رضا وغیرہ مقاماتِ تصوّف ہیں۔ ان ہی مقامات سے گذر کر سالک صوفیٔ کامل بنتا ہے، جہاں اُسے ہمہ اوست کی روشنی نظر آتی ہے۔ دوسری بات یہ کہ وہ مولانا فخر الدّین کے پوتے مولانا نصیر الدّین عرف میاں کالے صاحب سے بیعت بھی تھے۔ ان تمام شواہد اور دلائل کے باوجود ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ غالب صوفی تھے ہی، کیوں کہ پہلا شعر تو جیسا صاف ہی ہے کہ اُن کی بادہ خواری اُن کے ولی ہونے میں حائل ہے۔ لیکن دوسرا شعر تعلّی ہی ہے، کیوں کہ ایک ہی شخص بیک وقت صوفی، شاعر، نجومی و حکیم نہیں ہو سکتا ہے اور اگر بفرضِ محال ایسا ہو بھی تو وہ اس کا دعویٰ نہیں کر سکتا ۔۔۔ اس سلسلے میں غالب کے متعدّ



متضاد بیانات ہماری رہبری کرتے ہیں اور ہماری مدد کرتے ہیں مثلاً
"تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا"
"اگر زندگی میں ایک دن بھی نماز پڑھی ہو تو کافر اور ایک دن بھی شراب ترک کی ہو تو گنہگار"
"آرائشِ کلام کے لئے کچھ تصوف کچھ نجوم لگا رکھا ہے، ورنہ سوائے موزونیٔ طبع کے یہاں اور کیا رکھا ہے"

اگر غالب کے اوّل الذکر بیان کو ہم شاعرانہ تعلّی ہی سمجھیں تب بھی موخر الذکر بیان کو ہم غالب کے انکسار پر محمول نہیں کر سکتے۔ یہ بہرحال اُن کا راز فاش کرتے ہیں۔ پھر بھی دونوں طرح کے بیانات کی موجودگی میں ہم کچھ الجھن میں پڑ جاتے ہیں کہ غالب کو کس زُمرے میں رکھیں آیا اُن کو صوفی شاعر سمجھیں جیسا کہ اُن کا دعویٰ ہے یا محض مسائلِ تصوف کا بیان کنندہ جیسا کہ خود اُن کا ادّعا ہے۔

اِس سلسلے میں ہمیں ڈاکٹر سلام سندیلوی کے مقالے "اُردو غزل اور اُس کا فن" (مطبوعہ اشارہ پٹنہ ماہ مارچ ۱۹۶۷ء) سے کافی مدد ملتی ہے۔ اِس مقالے میں موصوف نے غزل کے مختلف موضوعات سے بحث کی ہے جن میں تصوف بھی ایک ہے۔ اس موضوع سے بحث کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے صُوفی شاعر یا شاعرِ تصوّف کے فرق کو واضح کرنے کے لئے E H Herman (ای-ایچ-ہرمن) کی تصنیف Meaning and values of mystics (مینگ اینڈ ویلیوز آف مسٹکس) اور حضرت داتا گنج بخش لاہوری کی تصنیف "کشف المحجوب" سے حوالے دیے ہیں اور غالب کو شاعرِ تصوّف قرار دیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ ای۔ایچ۔ہرمن نے مذکورہ تصنیف میں صوفیوں کی دو قسمیں بتائی ہیں۔ پہلی قسم اُن صوفیا کی ہے جو رُوحانی تجربات اور ربّانی مشاہدات سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔ دُوسری قسم میں ایسے صوفی شامل ہیں جو تصوّف کی فلسفیانہ تشریح ہی کو بہت اہم سمجھتے ہیں مگر ذاتی طور پر رُوحانی تجربات اور ربّانی مشاہدات سے محروم رہتے ہیں۔ ہرمن صوفیوں کی اوّل الذکر قسم کو بہتر سمجھتا ہے۔

حضرتِ داتا گنج بخش لاہوری نے بھی اپنی تصنیف میں اسی سے ملتی جلتی تقسیم بتائی ہے۔ آپ کا خیال ہے کہ معرفت کی دو قسمیں ہیں۔ اوّل معرفتِ علمی، جس کے ذریعے دنیا اور عاقبت کا علم ہوتا ہے یہ علم علما اور حکما کو حاصل ہے۔ دوم معرفتِ حالی، اس کے ذریعے خدا کا علم ہوتا ہے۔ اس کے حامل صوفیائے کرام ہوتے ہیں۔ معرفت کی دونوں قسموں کی مثالیں فارسی ادب میں موجود ہیں۔
نُور اللہ شوستری نے مجالس المومنین میں لکھا ہے کہ ایک بار شیخ ابوسعید ابی الخیر اور ابوعلی سینا میں ملاقات ہوئی اور مختلف فلسفیانہ مسائل پر گفتگو ہوئی۔ ملاقات کے اختتام پر دونوں نے ایک دُوسرے کے متعلق رائے قائم کی۔ ابوسعید ابی الخیر نے کہا: "آنچہ او می داند ما می بینیم"۔ ابوعلی سینا نے کہا: "آنچہ او می بیند ما می دانیم"۔ اِس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اوّل الذکر کو معرفتِ حالی اور موخر الذکر کو معرفتِ علمی حاصل تھی۔

مندرجۂ بالا تقسیم کی روشنی میں ہم اُردو کے صوفی شعرا کو دو حصّوں میں منقسم کر سکتے ہیں۔ پہلی قسم کے شعرا میں ہم اُن کو شمار کریں گے جن کی زندگی صوفیانہ نہ تھی تاہم اُنہوں نے صوفیانہ اشعار کہے ہیں۔ تصوّف اُن کے لئے قال تھا حال نہ تھا۔ دُوسری قسم کے وہ شعرا ہیں جن کی زندگی صوفیانہ تھی۔ اُن کے لئے تصوف حال تھا، قال نہ تھا۔ غیر صوفی شعرا میں ہم نمایندہ جگہ غالب کو دے سکتے ہیں۔ مثلاً غالب کے مندرجۂ ذیل اشعار میں مسائلِ تصوف بیان کئے گئے ہیں اُن میں تصوّف کی رُوح موجود نہیں ہے۔

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

اور اس قسم کے بہتیرے اشعار۔

جہاں تک غالب کے تصوف کے قائل ہونے کا سوال ہے میں اس کے ثبوت میں غالب کے اقوال نقل کر چکا ہوں۔ ڈاکٹر سلام سندیلوی نے اِس سلسلے میں مندرجۂ ذیل ثبوت پیش کئے ہیں۔



"غالب کا پیشۂ آبا سولیت سے سپہ گری تھا۔ اُن کے والد مرزا عبداللہ بیگ خاں اور چچا نصراللہ بیگ خاں فوجی افسران تھے۔ اس کے علاوہ غالب کسی سے بیعت بھی نہیں تھے۔ یہی نہیں، اُن کا محبوب مشغلہ مے نوشی تھا۔ اُن کو قمار بازی سے دلچسپی تھی۔ صوم و صلوٰۃ سے بھی گریز کرتے تھے، اس کے باوجود تصوف پر اُنہوں نے طبع آزمائی کی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ صوفیانہ اشعار اُن کے دل سے نہیں نکلے ہیں بلکہ رسمی طور پر انہوں نے اپنے خیالات کا اظہار کر کے ولی بنے کی کوشش کی ہے۔ دراصل غالب مشاہدۂ حق کی گفتگو کر سکتے ہیں، مشاہدۂ حق سے فیضیاب نہیں ہو سکتے۔"

یہاں مجھے ڈاکٹر صاحب کے اعتراضات کے پہلے حصے سے اختلاف ہے۔ کسی کا آبائی پیشہ سپہ گری ہو، یہ اس راہ میں مانع نہیں ہو سکتا کہ کوئی شخص صوفی ہو اور نہ والد اور چچا کی فوجی افسری ہی اس راہ میں حائل ہو سکتی ہے۔ یہ تو اپنے اپنے ظرف، ذوق و وجدان اور ودیعتِ الٰہی کا نتیجہ ہے۔ دُوسری بات یہ کہ غالب مُرید بھی تھے اور اُن کا تعلق مولانا فخرالدین کے پوتے مولانا نصیرالدین عُرف میاں کالے صاحب سے تھا۔ جس کا اظہار خود غالب نے اپنے ایک خط میں کیا ہے اور اس کی توثیق متعدد شواہد کے ساتھ مالک رام نے اپنی کتاب "ذکرِ غالب" میں کی ہے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کے دُوسرے اعتراضات بہرحال مسلّم ہیں۔ ان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ غالب صوفی نہ تھے۔ اس لئے کہ ایک صوفی صوم و صلوٰۃ ترک نہیں کر سکتا۔ وہ کھُلے بندوں شراب نہیں پی سکتا ہے، وہ غالب کی طرح قمار باز نہیں ہو سکتا ہے۔ اگرچہ غالب نے یہ کہا ہے کہ ؎

ہر چند ہو مُشاہدۂ حق کی گفتگو　　　بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ غالب کی یہ کیفیتیں محض ظاہری تھیں۔ اُن کا باطن پاک و صاف تھا۔ کیوں کہ اِس سلسلے میں کوئی ثبوت فراہم نہیں ہوتا، بلکہ وہ ہر جگہ یہ کہتے ہوئے سامنے آتے ہیں کہ۔

"اگر زندگی میں ایک دن بھی شراب نہ پی ہو تو گناہگار اور ایک دن بھی نماز پڑھی ہو تو کافر۔"

جو خود یہ اقرار کرتا ہو کہ نجوم و تصوف کا ذکر محض آرائش کلام کے لئے ہے اور جس کی شراب سے شیفتگی اس حد تک بڑھی ہوئی ہو کہ ؎

مے سے غرض نشاط ہے کس رُوسیاہ کو　　　اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیئے

گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے　　　رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

وہ صوفی ہرگز نہیں ہو سکتا، شاعرِ تصوف ہو سکتا ہے اور غالب کا شمار دُوسرے ہی لوگوں میں ہوگا۔

میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ غالب مسائل تصوف کی فلسفیانہ تشریح کرتے ہیں اس لئے غالب کے فلسفۂ تصوف سے بحث کرنے سے پہلے بہتر یہ ہے کہ چند لفظوں میں فلسفہ اور تصوف کا فرق واضح کر دوں

فکری طور پر فلسفہ اور تصوف میں ایک ایسا رشتہ ہے کہ عام طور پر دونوں ہم معنی سمجھے جانے لگے ہیں۔ اِس غلط فہمی کی اصل بنیاد یہ ہے کہ اُردو ادب میں فلسفہ سے مُراد عام طور پر فلسفۂ اُولیٰ یا علم الٰہیات لیا جاتا ہے اور چونکہ تصوف کا تعلق بھی اِن ہی مسائل سے ہے اس لئے اس قسم کا اشتباہ ہو جانا ایک فطری امر ہے۔ بہرحال مختصراً ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ

"تصوف میں فکری عنصر کم اور احساسی عنصر زیادہ ہوتا ہے۔ فلسفے میں اس کے برعکس، فلسفے میں جن مسائل کو منطقیانہ طرز سے الٹ پھیر سے ثابت کیا جاتا ہے، وہی بحثیں تصوف میں مجاہدوں اور مکاشفوں سے حاصل کی جاتی ہیں۔ فلسفی صرف باتیں بناتا ہے اور صوفی عمل پیرا ہوتا ہے۔ فلسفے میں جو دلائل و براہین سے ثابت کیا جاتا ہے، تصوف میں اس کے تجربات ہوتے ہیں۔"

(شوکت سبزواری)

غرض یہ کہ تصوف کا تعلق دل سے ہے اور فلسفے کا براہِ راست دماغ سے۔ غالب کے پاس دماغ تو ہے دل نہیں۔ اگرچہ صوفیوں



کی طرح کہتے ضرور ہیں کہ ؎

گر تجھ کو ہے یقینِ اجابت دعا نہ مانگ
یعنی بغیر یک دلِ بے مدعا نہ مانگ

لیکن اُن کا تحت الشعور اُن سے یہ کہلواتا ہے ؎

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

خواہشوں کا یہ انبوہ اور تمناؤں کا یہ ہجوم جس سے غالب کے دل کو ایک صوفی کے دل کی طرح پاک ہونا چاہیئے تھا، نہیں ہے۔ وہ آرزو اور خواہشات کی پرورش میں یہاں تک بڑھ جاتے ہیں کہ ؎

نفس نہ انجمنِ آرزو سے باہر کھینچ
اگر شراب نہیں، انتظارِ ساغر کھینچ

غالب کی یہ آرزو صوفیوں کے مسلک سے سراسر الگ ہے۔

اب ہم ذیل میں غالب کے چند اہم فلسفوں پر اظہارِ خیال کریں گے۔

وجود و ہستی ــــ فنا و بقا ــ جبر و قدر

فلسفے میں اہم ترین بحث وجود یا ہستی کی ہے۔ یعنی یہ کہ وجود کیا ہے؟ کب سے ہے؟ اس سے پہلے کیا تھا؟ ہستی پہلے ہے یا نیستی؟ عدم پہلے ہے یا وجود؟ ہستی کسے کہتے ہیں؟ کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی چیز نیست کے بعد ہست ہو جائے؟ کائنات کیا ہے؟ اس کا وجود کس طرح ہوا؟ اس کی ترکیب کیسے ہوئی؟ مادہ اور نفس میں کیا فرق ہے؟ کائنات میں انسان کا مرتبہ کیا ہے؟ حرکت کسے کہتے ہیں؟ سکون کس چیز کا نام ہے؟ یہ اور اسی قسم کے بہتیرے سوالات سر اٹھاتے ہیں لیکن اہم ترین بحث وجود ہی کی ہے۔ اس کے حل کے بعد دوسرے سوالات خود بخود حل ہوتے نظر آتے ہیں۔

"اسلامی مفکرین نے وجود کی دو قسمیں بتائی ہیں (۱) ظلی اور (۲) اصلی یا حقیقی۔ وجودِ ظلی وجودِ اصلی یا حقیقی کے درمیان ایک نسبت ہے ایک رابطہ ہے اور وجودِ اصلی اسے کہتے ہیں جس سے کسی کی ہستی برقرار رہتی ہے۔"

" ویدانت میں وجود کی تین قسمیں بتائی گئی ہیں۔ (۱) اصلی، مثلاً خدا کی ہستی (۲) ظلی، مثلاً دنیا۔ آسمان۔ زمین وغیرہ (۳) خیالی، جیسے بھوت پریت۔ ویدانت کے اس نظریۂ وجود کا دوسرا نام مایا ہے۔" (شوکت سبزواری)

جس کے سب سے بڑے شارح ہندوستان میں شنکر اچاریہ ہوئے ہیں۔

اسلامی تصوف کا فلسفۂ وحدت الوجود ان ہی دونوں نظریات سے مشابہ ہے۔ اسلامی تصوف میں اس کے پیش رو حضرت محی الدین ابن عربی ہوئے ہیں۔

ویدانت کی رو سے وجود صرف اور صرف ایک واجب الوجود کا ہے جسے وہ "برہما" کے نام سے یاد کرتا ہے۔ دوسری کسی چیز کا وجود نہیں ہے۔ بقیہ ساری چیزیں دھوکہ اور فریبِ نظر ہیں۔ ویدانت میں ہے ــــ "ایکو برہما دوتیہ ناستی"۔ صرف ایک برہما کے علاوہ دوسرے کسی کا وجود نہیں ہے۔

وحدت الوجود کا مطلب یہ ہے کہ وجود واحد ہے۔ اسلامی مفکرین اور صوفی شعرا کے یہاں عام طور پر اس کے لئے "ہمہ اوست" اور "لا موجود الا اللہ" کی اصطلاح مستعمل ہے۔ دونوں فلسفوں اور اصطلاحوں میں ظاہری مماثلت کی بنا پر بعض لوگوں کو غلط فہمی ہو گئی ہے کہ اسلامی تصوف کا وحدت الوجود ویدانت کے فلسفہ ادویت سے ماخوذ و مستعار ہے حالانکہ بات ایسی نہیں ہے۔ ہم زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اسلامی تصوف کا وحدت الوجود اور ویدانت کا فلسفہ ادویت مفہوم کے اعتبار سے ایک ہی ہے۔

غالب نے اکثر جگہوں پر اپنے وجودی ہونے کا اعلان کیا ہے۔ انہوں نے اپنے خطوط میں اس کا اظہار کیا ہے اور ایک



تقریظوں اور اپنے تبصروں میں اپنے اس عقیدے پر روشنی ڈالی ہے۔" (شوکت سبزواری)

علاؤالدین احمد خاں کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

میں موحد اور خالص مومن کامل ہوں، زبان سے لا الہ الا اللہ کہتا ہوں اور دل میں لا موجود الا اللہ اور لا موثر فی الوجود الا اللہ سمجھے ہوئے ہوں۔"

لیکن اور آگے بڑھنے سے پیشتر یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ غالب کے سرچشمۂ فیض کا پتہ چلا لیا جائے۔ پروفیسر یوسف سلیم چشتی نے غالب کے وحدت الوجود پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"ہندوستان میں وحدۃ الوجود کا نظریہ اگرچہ اپنشدوں کے زمانے سے مروج ہے، مگر شنکر اچاریہ اس کا سب سے بڑا علمبردار تھا۔ مغرب میں افلاطون، اسپنوزا اور ہیگل نے اس کی پوری وضاحت کی ہے لیکن غالب نے ان میں سے کسی کا مطالعہ نہیں کیا تھا، اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے وہی ذہنی تعبیر پیش کی جو کلام بیدل سے مترشح ہوتی ہے اور بیدل جیسا کہ معلوم ہے شیخ محی الدین ابن عربی کے خوشہ چیں ہیں۔ گمان غالب ہے کہ غالب نے بیدل کے علاوہ مرشد رومی، عارف جامی کا بھی کا بھی مطالعہ کیا ہوگا، لیکن تاثر حضرت محی الدین ابن عربی ہی سے قبول کیا۔"

غالب نے وجود یا ہستی کی جو تشریح کی ہے وہ عین وحدۃ الوجود کے مطابق ہے۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری کے خیال میں غالب کی ہستی کی تشریح تاریخ کے لحاظ سے ویدانت کے نظریہ سے الگ کوئی چیز نہیں۔ میرے خیال میں موصوف نے یہ بات اس لئے کہی ہے کہ دونوں فلسفوں میں بنیادی اہمیت وجود اصلی ہی کو حاصل ہے اور کائنات کی دوسری چیزیں دراصل اسی وجود اصلی کی مرہون منت ہیں۔

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے — ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے
جز نام نہیں صورت عالم مجھے منظور — جز وہم نہیں ہستئ اشیا مرے آگے
شاہد ہستئ مطلق کی کمر ہے عالم — لوگ کہتے ہیں کہ ہے پر ہمیں منظور نہیں
ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد — عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے
ہاں کھائیو مت فریب ہستی — ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

مندرجۂ بالا اشعار میں ہستی ما سوا کو فریب کہا گیا ہے، وہم سے تعبیر کیا گیا ہے، حلقۂ دام خیال بتایا گیا ہے، بازیچۂ اطفال سے تشبیہہ دی گئی ہے۔ یعنی یہ کہ اس کائنات کی ہستی قادر مطلق سے الگ کوئی حقیقت نہیں رکھتی، بلکہ اسی کا پرتو، اسی کا ظل، اسی کا سایہ ہے۔ یہاں وہم یا خیال کا اصطلاحی مفہوم مراد نہیں ہے۔ یہ کائنات اور کائنات کی ساری چیزیں اسی حسن مطلق کا کرشمہ ہیں، محبوب یکتا کا جلوہ ہیں اور بس۔ ہر جگہ صرف اور صرف وہی ہے، اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے ؎

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں — ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

ہمارا وجود اسی محبوب یگانہ، اسی معشوق یکتا کے وجود سے ہے۔ اسی کی خود بینی مرے وجود کا سبب ہے۔ اس لئے اگرچہ اس کے جلوے کثیر ہیں لیکن وہ کثرت کا شکار نہیں۔ وہ واحد ہے۔ اس کی صفات لا انتہا ہیں ؎

اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا — جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا
کثرت آرائی وحدت ہے پرستاری وہم — کر دیا کافر ان اصنام خیالی نے مجھے
قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن — ہم کو تقلید تنک ظرفی منصور نہیں
ہے تجلی تری سامان وجود — ذرہ بے پرتو خورشید نہیں
دل ہر قطرہ ہے ساز انا البحر — ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا



ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود — ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

مندرجہ بالا توضیحات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ غالب نے ہر جگہ وحدت الوجود کا اقرار کیا ہے لیکن ہر بڑے شاعر و فلسفی کی طرح کبھی کبھی وہ بھی متحیر رہ جاتے ہیں اور وحدت الوجود کے بارے میں تشکیک کا شکار ہو جاتے ہیں اور جب اُن کا شک رفع نہیں ہوتا ہے تو سراپا سوال بن جاتے ہیں ؂

ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے غالب — آخر تو کیا ہے "اے نہیں ہے"؟

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود — پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں؟ — غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے؟

شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے؟ — نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہے؟

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں؟ — ابر کیا چیز ہے، ہوا کیا ہے؟

اور جب اُن کی یہ پکار بھی صدا بصحرا ثابت ہوتی ہے تو پوچھ بیٹھتے ہیں ؂

ہے مشتمل نمودِ صُوَر پر وجودِ بحر — یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے — حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

ہر چند ہر ایک شے میں تو ہے — پر تجھ سی تو کوئی شے نہیں ہے

اِن اشعار میں وحدت الوجود کی جگہ فلسفۂ وحدت الشہود کی جھلک ملتی ہے۔ "ہمہ اوست" کی جگہ "ہمہ از اوست" کا پیغام ملتا ہے۔ یہ تناقض یا تضاد صرف غالب کے یہاں نہیں ملتا بلکہ ہر بڑا شاعر اور فلسفی اِس کا شکار رہا ہے۔

فنا و بقا: فلسفۂ تصوف میں فنا و بقا کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ اِس اصطلاح سے مراد یہ ہے کہ کیا یہ کائنات جو ہست ہے کسی زمانے میں نیست ہو جائے گی؟ اگر واقعی ایسا ہے تو پھر کائنات کے پیدا کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ کیا اس کی حیثیت مٹی کے گھروندوں سے زیادہ نہیں، جنہیں بچے کھیلنے کے لئے بناتے ہیں اور کھیلتے کھیلتے جب اکتا جاتے ہیں تو توڑ ڈالتے ہیں۔ کیا معبودِ حقیقی، خالقِ کائنات بھی (نعوذ باللہ) اِسی قسم کے جذبات کے تحت حیات و کائنات کا کھیل کھیل رہا ہے؟

ڈاکٹر شوکت سبزواری نے اس سلسلہ میں بتایا ہے کہ:

- "وجود کی طرح فنا بھی دو طرح کی ہے: اضافی و حقیقی۔ دوسری قسم کو عدمِ محض بھی کہا جاتا ہے۔ دراصل عدمِ محض کبھی نہیں ہوتا۔ جو چیزیں ایک بار پیدا کی جا چکی ہیں وہ کبھی اِس طرح مٹائی نہیں جاتیں کہ اُن کا نام و نشاں تک باقی نہ رہے۔ البتہ ارتقا معلوم ہوتا ہے۔ ہستی برابر حرکت میں ہے۔ ایک منزل سے دوسری منزل اور دوسری سے تیسری تک پہنچتی رہتی ہے۔ جس منزل کو ایک بار چھوڑ دیتی ہے، دوبارہ لوٹ کر اُس کی طرف نہیں آتی۔ اسلام نے حیات کا یہی حرکی تصور پیش کیا ہے۔"

فنا و بقا کے سلسلے میں بھی غالب نے اسلام کے اِس حرکی تصور کی تبلیغ کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ حرکت ہی کا نام زندگی ہے سکون و جمود موت کے مترادف ہے۔ یہ کائنات ہمیشہ حرکت میں ہے اور رنگ بدلتی دنیا ارتقا کی جانب رواں ہے۔ اقبال نے بھی حیات کی یہی توضیح کی ہے۔ غالب کہتے ہیں ؂

ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے — پرتو سے آفتاب کے ذرّے میں جان ہے

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز — پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

لیکن ساتھ ہی ساتھ غالب کا یہ خیال بھی ہے کہ یہ چیزیں، یہ کائنات، یہ آفتاب و ماہتاب، یہ ستارے، زمین و آسمان رُو بزوال ہیں، فنا آمادہ ہیں اور ایک دن ایسا آئے گا جب یہ ساری کی ساری چیزیں نیست و نابود ہو جائیں گی اور باقی صرف

شاعرِ عظیم غالب ۱۸۶۹ء



ذاتِ مطلق رہے گی۔ آج کی جدید سائنس بھی یہی کہتی ہے۔ حال ہی میں سائنس والوں نے یہ انکشاف کیا ہے کہ سورج اپنی روشنی کھوتا جا رہا ہے لیکن چونکہ روز بروز ہماری دنیا سے قریب تر ہوتا جاتا ہے اس لئے گرمی کی شدت کا احساس زیادہ ہوتا ہے۔ غالب نے فنا و زوال کے تصور پر بڑی بھرپور روشنی ڈالی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہیں جدید سائنس سے واقفیت تھی ؎

ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام
مہرِ گردوں ہے چراغِ رہگذارِ باد یاں

اور یہ تسلیم کرتے ہوئے بھی کہ آفرینش کے تمام اجزا زوال آمادہ ہیں، رُو بہ فنا ہیں، وہ اس حقیقت کو تسلیم کئے بغیر نہیں رہتے کہ یہ تغیر پذیری، یہ فنا آمادگی ہی دراصل کائنات کے حسین ہونے کا باعث ہے۔ کائنات کا حُسن اسی میں پوشیدہ ہے۔ یہی نہیں بلکہ یہ فنا پذیری ہی دراصل اوراقِ ہستی کی شیرازہ بندی ہے ؎

نظر میں ہے ہماری جادۂ راہِ فنا غالب
کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

اور یہ خرابی انسانی ہستی کی تعمیر ہی میں مضمر ہے ؎

مری تعمیر میں مضمر ہے صورت اک خرابی کی
ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے، خونِ گرم دہقاں کا

غالبؔ کے خیال میں انسانی ہستی کی تعمیر میں خرابی کی جو صورت مضمر ہے، اُس کی واحد وجہ یہ ہے کہ ؎

وہی اک چیز ہے جو یاں نفس واں نکہتِ گل ہے
چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا

اس لئے وہ مشورہ دیتے ہیں کہ اگر اپنی ہستی سے آشنا ہونا چاہتے ہو تو بہتر یہ ہے کہ اپنی صفاتِ رذیلہ کو فنا کر دو اور اُن کی جگہ صفاتِ حق سے متصف ہونے کی کوشش کرو تاکہ بقا کا درجہ حاصل کر سکو ؎

فنا کو سونپ اگر مشتاق ہے اپنی حقیقت کا
فروغِ طالعِ خاشاک ہے موقوف گلخن پر

جبر و قدر: انسانی فکر و شعور کے نشو و نما اور ارتقا کے ساتھ ساتھ یہ آواز اُٹھتی رہی ہے کہ "میں نہیں تھا حدیثِ جبر و قدر" لیکن بقول ڈاکٹر میر ولی الدین:

"انسان نے اس مسئلے کو نظری کہہ کر کبھی غور و فکر نہیں کیا۔ یہ مسئلہ محض نظری نہیں بلکہ ہمارا نظامِ دینیات۔ سیاسیات، تعلیمات، معاشیات۔ جرمیات اسی مسئلے کے فہم و ابہام پر مبنی نظر آتا ہے۔"

جبر و قدر کا مفہوم یہ ہے کہ کیا انسان اپنے اعمال و افعال پر قدرت رکھتا ہے یا مجبورِ محض ہے جیسا کہ میر کا خیال ہے ؎

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
جو چاہیں سو آپ کرے ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

بقول ڈاکٹر ولی الدین

"اگر ہم مجبور ہیں تو دنیا ہمیں سمجھائے کہ ہمارا ٹھکانہ دوزخ کیوں ہے اور اگر ہم آزاد ہیں تو بقول اسپنوزا کیوں ہمیں اپنی زبان تک پر اختیار نہیں؟"

عقل و فہم انسانی اس مسئلے کے حل کی تلاش میں ناکام رہی ہے۔ جب بھی انسان نے اس پر غور و فکر کرنا شروع کیا ہے یہ مسئلہ اور بھی اُلجھتا گیا ہے اور حقیقت سے دُوری ہوتی گئی ہے اور یہ مسئلہ لاکھ کوشش اور جانفشانیوں کے بعد بھی مسئلہ لاینحل بنا ہوا ہے۔ عقلِ انسانی کے اس عجز کو دیکھتے ہوئے رسولِ کریم صلعم نے فرمایا تھا:

"جب تقدیر کا ذکر کیا جائے تو تم خاموش ہو جاؤ۔"

غالباً آپؐ کا یہ فرمان عوام کے لئے تھا لیکن خواص اور عالمِ خیر کے لئے آپؐ نے یہ حکم صادر فرمایا تھا:

"تقدیر میں گفتگو نہ کیا کرو کیونکہ وہ خدا کا ایک راز ہے، پھر اللہ کے راز افشا نہ کرو۔"



اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اسلام نے اُن چند لوگوں پر یہ راز منکشف کر دیا ہے جن میں اس کو سمجھنے کی صلاحیت ہے۔ علامہ محی الدین ابن عربی کا بھی یہی خیال ہے۔

بہرحال یہ مسئلہ اب تک ما بہ النزاع بنا ہوا ہے کہ آیا انسان مجبورِ محض ہے یا خود مختار۔ اس سلسلہ میں باضابطہ جبریہ اور قدریہ نامی دو گروہ میں لوگ بٹ گئے ہیں اور دونوں اپنے اپنے طور پر مسائل کی توضیح و تشریح کرتے ہیں۔
جبریہ کا خیال ہے کہ ساری چیزیں تو اللہ نے پہلے ہی سے مقرر کر دی ہیں، پھر سوال و جواب اور عذاب و ثواب کا کیا سوال ہے؟ کیونکہ جب یہ بات مسلّم ہے کہ کائنات کی کوئی چیز بغیر حکمِ ایزدی کے حرکت نہیں کر سکتی تو پھر انسان اپنے اعمال و افعال کا (نعوذ باللہ) ذمہ دار کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ تو جو کچھ کرتا ہے، مجبورِ محض ہو کر۔ کیونکہ اُس کی تقدیر ہی میں یہی لکھ دیا گیا ہے۔
دوسری طرف قدریہ کا خیال ہے کہ انسان اپنے اعمال و افعال کا ذمہ دار خود ہے اور اُس کو اپنے تمام حرکات و سکنات پر قدرت حاصل ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اللہ نے تو ہر انسان کی تقدیر میں رزق لکھ دیا ہے، تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ رہے کہ خود بخود اُس کا پیٹ بھر جائے گا یا اُسے شکم پُری کے ذرائع اور رزق کی تلاش کرنی ہوگی؟ اگر تلاش کرنی ہوگی، محنت کرنی ہوگی تو پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان قادر ہے۔

لیکن مندرجۂ بالا دونوں نظریات انتہا پسندی کی دو سرحدوں کو چھوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ بس سے اچھا راستہ لوگوں نے درمیانی راستہ بنایا ہے۔ چنانچہ ایک تیسرا گروہ ایسا بھی ہے جو ان دونوں انتہا پسندوں کے درمیان سمجھوتہ کراتا ہوا نظر آتا ہے اور اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ انسان نہ تو مجبورِ محض ہے اور نہ خود مختار، بلکہ بعض جہتوں سے وہ آزاد ہے اور بعض جہتوں سے پابند۔

جہاں تک غالب کے نظریۂ جبر و قدر کا سوال ہے، غالب اس سلسلے میں جبریہ کے ہمنوا ہیں۔ اُن کے خیال میں رخشِ عمر رواں دواں ہے۔ اس کی رفتار پر ہمیں قابو حاصل نہیں ہے اس لئے ہمیں پتہ نہیں کہ یہ کہاں دم لے گا ؎

رَو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھئے تھمے ۔۔۔ نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

اور جب ایسا ہی ہے تو پھر ؎

کرتا ہوں میں اسے نامۂ اعمال میں نقل ۔۔۔ کچھ نہ کچھ روزِ ازل تم نے لکھا ہے تو سہی

اسی فلسفۂ جبر کے ہم نوا ہونے کی وجہ سے غالب نے زندگی کو غم سے تعبیر کیا ہے اور یہ کہا ہے کہ جب تک زندگی باقی ہے، انسان میں حیات کی رمق باقی ہے، اُس وقت تک غم سے چھٹکارا ملنے کا نہیں ہے۔ ان کے خیال میں غم زندگی کی بنیادی حقیقت ہے۔ یہی نہیں، وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ہستی اور حیات اور غم ایک ہی چیز کے دو رخ ہیں ؎

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں ۔۔۔ موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

اس لئے موت کے علاوہ غمِ ہستی کا اور دوسرا علاج نہیں ہے ؎

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج ۔۔۔ شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

لیکن ساتھ ہی ساتھ غالب کا یہ خیال بھی ہے کہ زندگی کا لطف موت ہی کی وجہ سے باقی ہے ؎

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا ۔۔۔ نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

مندرجۂ بالا توضیحات کی روشنی میں ہم یہ نتیجہ بہ آسانی اخذ کر سکتے ہیں کہ غالب کو فلسفۂ تصوف کے مسائل کے بیان کرنے میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ جس حسین پیرائے اور نادر انداز میں انہوں نے تصوف کے مصطلحات اور فلسفہ جات کی تشریح کی ہے، وہ اُن کا اپنا حصہ ہے، کسی دوسرے شاعر کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس کی بنیادی وجہ میرے نزدیک یہ ہے کہ غالب بنیادی طور

(باقی صفحہ ۲۱۲ پر دیکھئے)

سید علی رضا حسینی

غالب کے مزاج کے بنیادی عناصر

غالب کو آج مختلف انداز سے سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی جا رہی ہے، لیکن اسے بھی غالب کی بلندی کہنا چاہیئے کہ اُن کا سمجھنا آج بھی اُسی طرح دشوار ہے جس طرح اُن کے زمانے میں تھا، اس لیئے کہ جب مختلف اور متضاد خطوط ایک دوسرے کو کاٹتے ہوئے گذریں تو کوئی دو ٹوک بات کہنا آسان نہیں۔ وہ آج بھی نشاطِ تصوّر سے اُسی طرح نغمہ سنج ہیں جس طرح پہلے تھے۔ خدا جانے وہ گلشنِ ناآفریدہ کب پیدا ہوگا جو اُن کی نغمہ سنجی اور اُس کی رُوح کو سمجھ سکے۔ شعورِ ذات و شعورِ فن۔ فکر و عمل۔ رجعت و ترقی۔ مجتہدی اور مقلّدی۔ قنوطیت و رجائیت کے مختلف عناصر کا ایک ذات میں جمع ہونا کسی طرح معجزۂ اصلاح سے کم نہیں۔ جو شخص ایک طرف یہ کہے ؎

نہ ستائش کی تمنّا، نہ صلے کی پروا گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

وہ بہادر شاہ ظفر کی شان میں قصیدے بھی لکھے اور مشاعروں میں ستائش کے صلے میں شرکت بھی کرے۔ طرزِ بیدلؔ میں ریختہ کہتے کہتے طرزِ میرؔ تک آ پہنچے، اس کے خیالات میں ہم آہنگی کیسے پیدا کی جائے؟ معلوم نہیں یہ نادرہ کاری ہو کہ تجربہ کاری۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ غالب کے قارئین کے دل میں اکثر یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ یہ شاعری ہے کہ سحر آفرینی۔ دیوانے کی بڑ ہے کہ شاہد کا مشاہدہ یا عارف کا عرفانِ نفس۔ جس نے جو کچھ محسوس کیا، وہ لکھ دیا۔ جو دیکھا اور جس طرح دیکھا، وہ کہہ دیا۔ ہر بات میں ترتیب و ہم آہنگی کا خیال کیوں؟ جب چاہا، زمانے کو اپنا لیا، جب چاہا، زمانے سے بغاوت کر دی۔ لیکن اگر ایسا ہے تو پھر غالب کی عظمت کا دار و مدار کس بات پر ہوگا؟ غالب کی عظمت کو تسلیم کر لینے کے بعد بھی یہ کہنا پڑتا ہے کہ اس فلسفۂ تضاد سے یہ عظمت مجروح ہوتی ہے۔ کیا اب بھی اس کی عظمتِ فن محفوظ ہے؟ آخر اُن کے فکر و فن کے تانے بانے کس چیز سے تیار ہوئے تھے۔ وہ کون سا خام مواد تھا جو اُن کے کام آ رہا تھا۔ فن میں فکر، گہرائی میں سوز اور سوز میں نکھار کہاں سے پیدا ہوتا ہے؟ کیا یہ زمانے کا مزاج تھا یا اُن کا اپنا مزاج؟ اور اگر ایسا ہے تو پھر غالب کے مزاج کے بنیادی عناصر کیا تھے، روایت پرستی یا تشکیک۔ تقلید یا اجتہاد؟

اگر اسلوب کسی فن کار کے کردار کا آئینہ ہوتا ہے تو غالب کے مکالموں سے جو چیز ہمارے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ مرزا فطرتاً متشکک تھے اور ہر قدم پر تشکیک کا شکار۔ وہ دنیا کو جامد حقیقت سے تسلیم کرنے کو تیار نہ تھے۔ حقیقتیں ہر وقت اُن کے سامنے سوالیہ نشان بن کر آتی تھیں ؎

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں؟ ابر کیا چیز ہے، ہوا کیا ہے؟



معتقد ہونے کے باوجود بھی وہ اس حقیقت سے اپنا دامن نہ بچا سکے ؎

آئندہ و گذشتہ تمنا و حسرت است
یک حرفِ "لا" بود کہ بہ صد جا نوشتہ اند

"لا و الّا"۔ زندگی کی تعمیر و تخریب۔ تسلیم و تدوین کا اشارہ ہوتے ہوئے بھی زمانے کی دست برد سے بے نیاز نہیں۔

"لا" سے "الّا" تک پہنچنے کی منزل تشکیک ہی کے راستے سے ہو کر گذرتی ہے۔ تشکیک کی دنیا میں بہک کر انسان بے راہ رو ہو سکتا ہے۔ وہ اکثر اپنا توازن و اعتدال بھی کھو بیٹھتا ہے، اگر اس میں درک و ادراک کی صلاحیت موجود نہ ہو۔ غالب کا وسیع مطالعہ، اُن کا آزاد مشاہدہ، علمی تبحر، تجزیۂ نفس، تفکر و تعقل اور ساتھ ہی ساتھ اُن کی فارسی دانی اُن کے بہت کام آئی، اس لئے کہ فارسی کے ان شعراء میں عارفین و متصوفین، ناقدین و مفکرین، اسلوب کار اور فن کار سب شامل تھے۔ میرؔ نے غالب کے شروع عمر کا کلام سن کر بڑے پتے کی بات کہی تھی کہ اگر اس بچے کو اچھا رہنما مل گیا تو یہ اُستاد بن جائے گا۔ ورنہ بگڑ جائے گا۔ غالب کا یہ اُستاد اُن کا ذوقِ سلیم تھا۔ علم کی ابتدا تشکیک و تذبذب ہے اور انتہا عرفان و آگہی۔ سچ ہے

KOWLEDGE BEGINS IN DOUBT, BUT ENDS IN CERTAINTY

عمر خیام اس تشکیک و تذبذب کے ساحل پر شاہد و شراب کا پرستار بن کر رہ گیا تو حافظ صوفی صافی بن گئے۔ مگر شخصیت کا خلوص دونوں میں ہے۔ دونوں فکر ہی کے راستے سے فن کی بلندیوں تک پہنچے ہیں۔ زندگی کی داخلی و خارجی کیفیات دونوں پر انتہا عیاں تھیں اور اگر ایسا نہ ہوتا تو حافظ ہرگز یہ نہ کہتے ؎

شبِ تاریک و بیمِ موج و گردابے چنیں حائل
کجا دانند حالِ ما سبکسارانِ ساحلہا

خیامؔ و حافظ دونوں نے زمانے پر طنز کیا ہے۔ دونوں کے طنز نے شوخی و ظرافت کی شکل اختیار کر لی ہے۔ فکر کی دنیا میں جو تشکیک و تذبذب ہے، وہی فن کی دنیا میں شوخی و ظرافت ہے۔ الم انگیزی یا یاس جیسی زندگی کی الم انگیزیوں کا احساس میرؔ کو تھا، وہاں غالبؔ کو بھی تھا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ایک زندگی سے نالاں ہے تو دوسرا زندگی کی الم انگیزیوں پر ہنستا ہے۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ غالب کو مسلمات سے انکار تھا، بلکہ وہ اپنی فکر کے لئے نئی راہیں تلاش کر لیتے ہیں۔ انتشار کا دور غالب اور میر دونوں کو ملا تھا۔ تشکیک و تذبذب میں مبتلا ہو کر یا تو انسان جبری ہو جاتا ہے یا قدری۔ جبریت مایوسی کا اظہار ہے تو قدریت احساسِ خودی و خودبینی، بلندیٔ ظرف و نظر کا۔ جبریت کے ماننے والوں کو کائنات میں اپنی کوئی جگہ نظر نہیں آتی۔ وہ احساسِ کمتری کا شکار اور ذوقِ کم نگاہی کا مریض ہو جاتا ہے۔ قدریت ایک صالح و تنومند تصور ہے۔ دیر و حرم کے امتیاز سے بلند تر، آزادیٔ ضمیر، انسان دوستی اور انسان پرستی کا سرچشمہ۔ قدری کو اپنے اختیارِ تمیزی پر اعتماد ہوتا ہے۔ وہ اپنی ذات کا احترام کرتا ہے۔ جرأتِ فکر و جرأتِ عمل تشکیک و تذبذب کے روشن پہلوؤں کے ترجمان ہیں اور غالب کے پاس یہ دونوں چیزیں موجود ہیں ؎

ہے دیر و حرم آئینۂ تکرارِ تمنا
واماندگیٔ شوق تراشے ہے پناہیں

میرؔ کا یہ احساسِ الم انگیزی ؎

دل کی بربادی کی اس حد پر جرأت کر نہ پوچھ
جانا جاتا ہے کہ اس راہ سے لشکر گذرا

غالب کے یہاں جبرِ خیال سے کم نہیں۔ وہ خلوت میں بھی انجمن تلاش کر لیتا ہے۔ اُس کے یہاں جامِ سفال جامِ جم سے بہتر ہے۔

اور بازار سے لے آئے، اگر ٹوٹ گیا
جامِ جم سے یہ مرا جامِ سفال اچھا ہے

غالب کی اس جرأتِ فکر کا نتیجہ وہ مثنوی ہے جو ابرِ گہربار کے نام سے موسوم ہے۔ مادیت اور روحانیت کی یہ کشمکش بڑی



دلچسپ ہے۔ زندگی تضاد و تقابل کا شکار ہے۔ جدلیاتی حقیقت کی اس سے بہتر عکاسی کیا ہو سکتی ہے کہ ایک طرف زندگی ہمہ گیر نغمہ ہے۔ غم ہجر و ذوقِ وصال کی یہ کشمکش۔ بوسہ و سوگند۔ آسودگی و ناآسودگی۔ باد و ہو۔ شور و شر تو دوسری طرف افسردگی۔ اضمحلال۔ سکوت اور جمود۔ نہ وہ ناک بھاک۔ نہ وہ فریب و گریز کی کیفیت۔ کون اس دنیا میں مطمئن ہوگا، جہاں ہاؤ و ہوش کی بھی گنجائش نہ ہو۔ غالب وصلِ بے انتظار کے قائل نہ تھے۔ وہ نگاہِ آشنا چاہتے تھے تاکہ اُن کے ذوقِ تماشا کی تسکین ہو سکے۔ وہ نگاہِ بے محابا کے ساتھ روزنِ دیوار کے بھی قائل تھے۔ اُن کے یہاں ذوقِ تماشا۔ آئینہ رُو۔ روزنِ دیوار تینوں کا تصوّر اور وجود ضروری تھا۔ اور فردوس اس وجودِ ثلاثہ سے محروم۔ غالب کے یہاں فردوس سے عدم انسیت کی وجہ یہی ہے۔ وہ فردوس کو بھی دوزخ میں اس لئے ملا لینا چاہتے ہیں کہ ان کو سیر کے لئے تھوڑی سی جگہ اور مل سکے۔ غالب اگر آج کے دور میں ہوتے تو اُن پر کفر کا فتویٰ لگ جاتا۔ مگر ان کے نغموں میں زندگی کا جو خروش ہے اس سے وہ مجبور ہیں۔ ان کے نغموں کا یہ خروش اُس تشکیک و تذبذب کا رہینِ منت ہے جو ان کے فکر و فن کا بنیادی ستون ہے "تشکیک اگر حد سے بڑھ جائے تو یاسیت کی حدیں چھو لیتی ہے۔ سراب فریبِ سراب نظر آتی ہے تو ہستی نیستی۔ وجود عدم اور "عالم تمام حلقۂ دامِ خیال"۔ غالب کے اشعار میں اس قسم کا رجحان ملتا ہے مگر "نہیں" کے برابر۔ حسن حیرت نے غالب کو اس طرف جانے سے روکا، وہ اُن کی فطری بذلہ سنجی اور طبعی ظرافت تھی۔ کسی حد تک ان کی بے فکری اور لا اُبالی پن بھی ہے

لاف دانش غلط و نفعِ عبادت معلوم دُردِ یک ساغرِ غفلت ہے چہ دنیا و چہ دیں

ان کے اس میلانِ طبع کے ساتھ دوسری چیز جو انہیں اس "جبر اور "عدمیت" NIHILISM کی طرف جانے سے روک رہی تھی، وہ اُن کا فلسفۂ وحدت الوجود تھا۔ تصوّف کی یہ گرفت ان کے زمانے میں اتنی مضبوط تھی کہ سارا ماحول اس میں جکڑا ہوا تھا۔ شعوری اور غیر شعوری طور پر ہر شخص سے متاثر تھا۔ رند مشربی اور تصوف ہم معنی الفاظ بن گئے تھے۔ اسی لئے غالب کے یہاں بادہ خواری کے باوصف دعوائے تصوّف کی گونج سنائی دیتی ہے۔ یہ چیز ان کا جزوِ ایمان بن چکی تھی۔ توحید کا اعتراف اور "کیش ترک رسوم" پر فخر۔ خفیہ اور اعلانیہ اس کا اظہار ان کی جرأت فکر اور جرأت عمل دونوں کا ثبوت ہے

یہ مسائلِ تصوّف یہ ترا بیان غالبؔ تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

مگر غالب کا تصوّف ہمہ از اوست کا قائل نہ تھا بلکہ ہمہ اوست کا۔ ہمہ اوست کے تصور نے جہاں ان میں بالغ نظری پیدا کی وہاں آدمیت کے عناصر بھی پیدا کئے۔ ملتیں اگر مٹنے کے بعد اجزائے ایماں بن سکتی ہیں تو زندگی کا انفرادی شعور زندگی کا اجتماعی شعور بھی بن سکتا ہے۔ فرد اور جماعت اگر مترادف الفاظ نہیں تو ایک دوسرے سے جدا بھی نہیں ہو سکتے ہیں۔ اقبال نے سچ کہا ہے

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

آج اس دورِ جمہوریت میں اس کا فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ کون اہم ہے؟ اور کیا؟ مگر یہ حقیقت ہے کہ یہ اجتماعی شعور فرد کی کوشش کا رہینِ منت ہے۔ فرد کی انا آج اسی طرح قائم ہے جیسے کہ پہلے تھی۔ شکلیں بدل گئی ہیں مگر اصل رُوح وہی ہے۔ غالب کے زمانے میں اجتماعی فلسفہ اور اجتماعی شعور کی تلاش نے کا رہے۔ وہ دور خالص فرد کی صلاحیتوں کا دور تھا۔ فرد جماعت سے زیادہ اہم ہو سکتا ہے اگر اس کے پاس زندگی کی تعمیر کا سامان موجود ہو۔ غالب کے لئے یہی کیا کم ہے کہ اُس کے پاس صالح اقدارِ حیات موجود تھیں۔ وہ دورِ انتشار میں رہتے ہوئے بھی زندگی سے مایوس نہ تھا

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی



غالب فرد کی انا کے سب سے بڑے محافظ تھے۔ جب وہ اسے مجروح ہوتے ہوئے دیکھتے تھے تو اُن کا لہجہ انتہائی پُرسوز ہو جاتا تھا۔ یوسف مرزا کے نام غالب کا خط ایک پُرسوز مرثیہ، ایک نغمۂ جاں گداز یا نالۂ درد انگیز ہے۔ غالب کے نزدیک ۱۸۵۷ء اس لئے اہم نہیں تھا کہ اس کے سب چاہنے والے مر گئے تھے بلکہ "آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی"۔ "حسن پرستی بوالہوسی میں بدل گئی"۔ غالب کی عظمت کا راز اس میں ہے کہ وہ ہمیں شعور کی بہترین تخلیق میں مدد دیتا ہے۔ کوئی خود کو گنوا کر جماعت کو کیسے اور کب تک یاد رکھ سکتا ہے۔ آج بھی مجبور فرد کے لئے غالب کا نغمہ پیغامِ بیداری ہے ؎

[illegible] بہ وادیے کہ دراں خضر را عصا خفت است   بہ سینہ می سپرم راہ گرچہ پا خفت است

پیروں کے تھکنے کے بعد سینے کے بل راستہ طے کرنا بڑی پامردی اور ہمت کا کام ہے جس کی داد اس کے علاوہ اور کسی طرح نہیں دی جا سکتی ع

این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

غالب کے نغموں کی جھنکار خوابیدہ انسانوں کو جگا سکتی ہے یا نہیں، مگر اتنا تو یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس کی للکار میں وہ قوت ہے جو آج بھی کم رتبہ و بدنصیب انسانوں کا قیمتی سرمایہ ہے ؎

بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم   فلک بہ گردشِ رطلِ گراں بگردانیم

غالب کی عظمت کا راز اُس کے تشکیک و تجدد، آفاقیت و انسان دوستی، شوخی و ظرافت، بذلہ سنجی اور متانت فرد کی عظمت اور اس کی انانیت کے اظہار و حفاظت میں ہے۔ یہ وہ تہذیبی ورثہ ہے جو ہر دور میں انسان کو قوت دیتا ہے۔ جب تک انسان نظامِ جبر سے ٹکراتا رہے گا اور اس کے پاس سے بُرے کو بُرا اور اچھے کو اچھا سمجھنے کی صلاحیت ختم نہ ہوگی تب تک غالب کا یہ نغمۂ حیات بھی دلوں کو گرماتا رہے گا۔

بہتر زندگی کا تصور غالب کے پاس بھی تھا اور ہمارے پاس بھی ہے۔ بہتر زندگی کے حصول کی جدوجہد نہ کبھی ختم ہوئی ہے اور نہ کبھی ختم ہوگی جب تک کہ عالم لو یہ ذرہ تقدیر سے باہر نہ آ جائے۔ اقبال کی نظر میں اس کی سحر بے حجاب تھی، مگر اس بے حجابی کے بعد بھی اس کا دیدارِ عام نہ ہو سکا۔ مگر زندگی کا تصور جامد نہیں بلکہ DIALECTICAL [illegible] بھی اسی کشمکش و تضاد کا شکار ہے جس طرح کل تھی۔ فرق یہ ہے کہ کل تک وہ صرف ایاغ پر منحصر تھی تو آج شتوں پر۔ کل کے بت کافر ادا، آج کے بتانِ آذری ہیں۔ ان کے شیوہ و ناز و ادا، عشوہ و غمزہ میں زمانے نے بڑی بڑی اور ان تبدیلیاں کر دی ہیں۔ حقیقتیں خواب اور خواب حقیقتیں بن گئے۔ زندگی پھیلتی اور بڑھتی رہی ہے۔ آج انسان چاند پر کمند لگا رہا ہے مریخ تک پہنچنے کا آرزومند ہے۔ تحقیق و سائنس کا زمانہ ہے۔ علمِ انسانی کی حدیں لامحدود ہیں۔ مگر اس پوری ترقی کا نقطۂ عروج آج بھی انسان ہے۔ وہ شعور کی ابتدا و انتہا ہے۔ مگر ایجادات، نظریات، انکشافات۔ مختلف متضاد اور متصادم نقطہ ہائے نظر کے باوجود بھی انسان پھیلے ہوئے سماج میں تنہا ہے۔ وہ اپنے خول میں سمٹ گیا ہے۔ فرد کی اہمیت ایک اکائی سے زیادہ کچھ نہیں۔ اس کی حیثیت ناگزیر۔ اُس کی شخصیت غیر اہم۔ یہ ہر دورِ ابتلا و انتشار میں ہوا کرتا ہے۔ غالب کا زمانہ ہنگامہ خیز اور پُرآشوب تھا۔ تبدیلیوں کا دور۔ ابتلا و آزمائش۔ تجربہ۔ تعمیر و تخریب کی آماجگاہ۔ آج بھی دنیا بحرانی دور سے گزر رہی ہے۔ مختلف نظریات ایک دوسرے سے دست و گریباں ہیں۔ تخریبی قوتیں سرگرمِ کار ہیں۔ غالب کے زمانے سے آتے آتے ایک ہی تبدیلی ہوئی ہے اور وہ یہ کہ ان تخریبی قوتوں کا دائرۂ عمل بڑھ گیا ہے۔ آج پوری کائنات اس کی لپیٹ میں ہے، مگر نتیجہ؟ انسان ہراساں، پریشاں، دست دراز و ذلیل! ؎



سبھی

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں

غالب کا یہ شعر انسانی عظمت کا نغمہ ہے، بلکہ آوازِ رحیلِ کارواں جو واقعتاً کسی درماندہ رہ رو کی آواز معلوم ہوتی ہے۔ غالب کی بلند بینی، انسان دوستی اور آفاق گیری کا ثبوت اس سے بہتر کیا ہوگا۔ مرزا کی تشکیک پسندی نے جو شمع روشن کی وہ حقیقتاً علم و آگہی کا سرچشمہ تھی جس سے فکر و فن کے نئے راستے متعین ہوتے تھے اور عملی زندگی کی نئی راہیں کھلتی تھیں آج بھی غالب کا فن لسانِ حیات ہے

غالب پر یہ الزام بے بنیاد ہے کہ وہ مرزا بیدل کے مقلد تھے۔ اُن کا جذبۂ تخلیق کسی کی تقلید کیسے گوارا کر سکتا تھا۔ یہ بات الگ ہے کہ ایک ترقی یافتہ اور باشعور ذہن اپنی مماثلت خود تلاش کر لیتا ہے۔ مماثلت اور مثالیت میں فرق ہے۔ مثالیت کسی چیز کی ہو بہو نقل ہے۔ مماثلت کچھ باتوں میں اشتراک۔ ایک تقلید ہے تو دوسرا اجتہاد۔ بچہ بڑا ہو کر کبھی ماں باپ کے مثل ہوتا ہے لیکن وہ کلیتاً وہ نہیں ہوتا جو اس کے والدین تھے یا ہیں۔ مثالیت اسی مقام سے مماثلت کے قریب آجاتی ہے۔ بچے کے شعور کا پہلا آغوش ماں کی گود اور باپ کا سایہ ہے۔ لیکن بچہ اس مماثلت کے باوجود اس کے مثل نہیں ہوتا۔ اُس کی ہستی الگ ہے۔ اُس کی شخصیت جداگانہ ہے۔ یہی حال غالب اور بیدل کا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ مزاج کے اعتبار سے غالب اور بیدل میں کوئی بنیادی ہم آہنگی ہو، لیکن اتنا تو یقینی ہے کہ دونوں دورِ انتشار کے شاعر ہیں۔ ایک اُردو کا پروردہ تو دوسرا فارسی کا نمک خوار۔ غالب کو اپنی فارسی دانی کا بڑا غرور تھا مگر اُن کے کام غریب اُردو ہی آئی، جو "رنگ بے نعمت" تھی لیکن ذہنی انتشار اور عقل کا ایجاد و ایمائیت دونوں کے فن کی جان ہے۔ بیدل نے فرسودہ تصورات کا مذاق اُڑایا ہے۔ دونوں جنت و دوزخ کے بارے میں شک میں مبتلا ہیں۔ عذاب و ثواب کا تصور دونوں کے یہاں زندہ ہے۔ زندگی کا انجام دونوں کے یہاں مضحکہ خیز ہے۔ دونوں ناصح و واعظ سے جلتے ہیں۔ یہ باتیں اس زمانے کے رجحان سے الگ تھیں۔ بڑی جرأت و دیدہ دلیری کا کام تھا۔ مجتہد وہی ہوتا ہے جو حالات سے خود نتائج اخذ کر سکے۔ دلائل و استخراجِ نتائج مقلد کے بس کی بات نہیں۔ اجتہاد غالب کی صفت تھی۔ تقلید پرستی سے اُن کو نفرت تھی، اس لئے کہ اُن کا تفکر گہرا۔ اُن کا مطالعہ وسیع۔ اُن کے نغموں میں جگر سوزی اور جگر تابی ہے ؎

شبنم بہ گلِ لالہ نہ خالی ز ادا ہے
داغِ دلِ بے درد نظر گاہِ حیا ہے

بقیہ صفحہ ۲۰۷ "غالب شاعرِ تصوف"

پر شاعر تھے، اس لئے خواہ وہ فلسفہ ہو یا تصوف، جس مسئلہ پر بھی انہوں نے روشنی ڈالی ہے، اُس میں شعریت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ نادر تراکیب، اچھوتی تشبیہات، دلکش جاذبِ نظر اور دلفریب الفاظ کا ایک دریا موج مارتا نظر آتا ہے اور غالب فخریہ یہ کہتے نظر آتے ہیں ؎

بیا ور ید گر ایں جا بود زباں دانے
غریبِ شہر سخن ہائے گفتنی دارد

امتیاز علی عرشی

غالب کا دربار اور خلعت

خلعت کی بحالی کے متعلق مرزا صاحب کے بیانات صاف نہیں ہیں، اسی کا نتیجہ ہے کہ سوانح نگاروں نے جو تاریخیں متعین کی ہیں وہ واقعات کی کسوٹی پر پوری نہیں اترتیں۔ ضروری ہے کہ اُن کے سب بیان سامنے رکھ کر اس کا فیصلہ کیا جائے کہ کب دربار کی شرکت اور سرکاری طور پر کس دربار میں خلعت عطا ہوا۔ سب سے پہلے یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ غدر سے پہلے دلی کا تعلق پنجاب کے گورنر سے نہ تھا، اس لئے یہاں صرف گورنر جنرل کی آمد سے دربار ہوتا تھا۔ ۱۸۲۸ء میں لارڈ بنٹنک نے یہاں دربار کیا تو انہیں دربار کی شرکت اور داہنی صف میں دسویں نمبر کی نشست سے معزز کیا۔ لارڈ الن برا نے خلعتِ ہفت پارچہ و سہ رقم جواہر سے بھی عزت بخشی۔ لارڈ ہارڈنگ نے دسمبر ۱۸۴۵ء میں دہلی میں دربار کیا تو اس میں مرزا صاحب کی شرکت اور خلعت یابی ثابت ہوتی ہے۔ لارڈ ڈلہوزی ۲۱ نومبر ۱۸۴۸ء کو دہلی آئے مگر دربار نہیں کیا۔ اس کے بعد غدر تک شاید کوئی دربار دہلی میں منعقد نہیں ہوا

۱۸۵۶ء میں مرزا صاحب نے لارڈ کیننگ گورنر جنرل کی وساطت سے ایک مدحیہ قصیدہ پیش کر کے ملکۂ وکٹوریہ سے درخواست کی تھی کہ مجھے خطاب عطا کیا جائے اور قدیم پنشن اور خلعت میں اضافہ کیا جائے (ذکرِ غالب ۵۸) اس کا فیصلہ ابھی نہ ہوا تھا کہ ۱۸۵۷ء کا فتنہ برپا ہو گیا۔ اس کے فرو ہو جانے کے بعد لارڈ کیننگ کا میرٹھ میں دربار منعقد ہونا طے پایا۔ مرزا صاحب نے ۲۸ نومبر ۱۸۵۹ء کو یوسف مرزا کو لکھا،

> "سب سے بڑھ کر آمد آمد گورنمنٹ کا ہنگامہ ہے۔ دربار میں جاتا تھا، خلعت فاخرہ پاتا تھا، وہ صورت اب نظر نہیں آتی۔ نہ مقبول ہوں، نہ مردود۔ نہ بےگناہ ہوں، نہ گنہگار۔ نہ مخبر ہوں، نہ مفسد۔ بھلا اب تم ہی کہو کہ یہاں دربار ہو اور میں بلایا جاؤں تو نذر کہاں سے لاؤں۔ دو مہینے رات دن خونِ جگر کھایا اور ایک قصیدہ ۶۴ بیت کا لکھا، محمد فضل مصور کو دے دیا۔ وہ پہلی دسمبر کو مجھے دے گا۔ یہ اس کا مطلع ہے ؎
>
> بر سالِ نو دگر آئی بر روئے کار آمد ہزار و ہشت صد و شست در شمار آمد
>
> اس میں التزام اپنی تمام سرگذشت لکھنے کا کیا ہے۔" (خطوط، ۱/ ۱۶۴)

بعد ۳ دسمبر ۵۹ء کو مجروح کو تحریر کیا،

> "میاں تم پنشن، پنشن کیا کر رہے ہو؟ گورنر جنرل کہاں؟ اور پنشن کہاں؟ ڈپٹی کمشنر صاحب کمشنر، لفٹنٹ گورنر بہادر جب اِن تینوں نے جواب دیا ہو تو اس کا مرافعہ گورنمنٹ میں کروں۔ مجھے تو دربار اور خلعت کے لالے پڑے ہیں، تم کو پنشن کی فکر ہے۔ یہاں کے حاکم نے میرا نام دربار کی فرد میں نہیں لکھا۔ میں نے اِس کا اپیل گورنر کے ہاں کیا ہے، دیکھئے کیا جواب



آتا ہے۔" (اُردوئے معلّٰی و خطوط ۱ ، ۲۵۹)

یکم جنوری ۶۱ء کو پھر مجروح کو لکھا:

"پنجشنبہ ۲۹ دسمبر پہر دن چڑھے لارڈ صاحب یہاں پہنچے۔ کابلی دروازے کی فصیل کے تلے ڈیرے ہوئے۔ اسی وقت توپوں کی آواز سنتے ہی میں سوار ہو کر گیا، میر منشی سے ملا۔ اُس کے خیمے میں بیٹھ کر صاحب سکرتر کو خبر کروائی جواب آیا کہ فرصت نہیں۔ یہ جواب سن کر نومیدی کی پوٹ باندھ کر لے آیا۔" (خطوط ۱، ۲۰۶)

مارچ ۱۸۶۱ء میں پھر تفصیل کو مفصل طور پر تحریر کیا

"گورنر اعظم نے میرٹھ میں دربار کا حکم دیا۔ صاحب کمشنر بہادر دہلی نے سات جاگیر داروں میں سے تین جو لقیۃ السیف تھے، اُن کو حکم دیا اور دربار عام سے سوائے میرے کوئی باقی نہ تھا یا جیدھا تھا۔ مجھ کو حکم نہ پہنچا۔ جب میں نے استدعا کی تو جواب ملا کہ اب نہیں ہو سکتا۔ جب یہ سرزمین مخیم خیام گورنری ہوئی، میں اپنی عادتِ قدیم کے موافق خیمہ گاہ میں پہنچا۔ مولوی اظہار حسین خان صاحب بہادر سے ملا۔ چیف سکرتر بہادر کو اطلاع دی۔ جواب آیا کہ فرصت نہیں۔ میں سمجھا کہ اس وقت فرصت نہیں، تو دوسرے دن پھر گیا۔ میری اطلاع کے بعد حکم ہوا کہ ایامِ غدر میں تم باغیوں سے اخلاص رکھتے تھے، اب گورنمنٹ سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟ اُس دن چلا آیا۔ دوسرے دن انگریزی خط اُن کے نام لکھ کر اُن کو بھیجا۔ مضمون یہ کہ باغیوں سے میرا اخلاص مظنۂ محض ہے۔ اُمیدوار ہوں کہ اس کی تحقیقات ہو تاکہ میری صفائی اور بے گناہی ثابت ہو۔ یہاں کے مقامات پر جواب نہ ہوا۔ اب ماہِ گذشتہ یعنی فروری تھا۔ پنجاب کے ملک سے جواب آیا کہ لارڈ صاحب بہادر فرماتے ہیں کہ ہم تحقیقات نہ کریں گے۔ پس یہ مقدمہ طے ہوا کہ دربار خلعت موقوف، پنشن مسدود، وجہ نامعلوم۔" (اُردوئے معلّٰی ، ۲۸۲)

۲۴ مارچ ۶۳ء کو تفتہ کو لکھا:

"ہمیشہ نواب گورنر جنرل بہادر کی سرکار سے دربار میں مجھ کو پارچہ اور تین رقم جواہر خلعت ملتا تھا۔ لارڈ کیننگ صاحب میرا دربار اور خلعت بند کر گئے ہیں۔ نااُمید ہو کر بیٹھ رہا اور مدت العمر کو مایوس ہو رہا۔" (اُردوئے معلّٰی ، ۱۱۱)

۲ مئی ۱۸۶۳ء کو شیو نرائن کو اطلاع دی:

غدر کے رفع ہونے اور دلّی کے فتح ہونے کے بعد میرا پنشن کھلا۔ چڑھا ہوا روپیہ دام دام ملا۔ آئندہ کو بدستور ہے کم و کاست جاری ہوا، مگر لارڈ صاحب کا دربار اور خلعت جو معمولی و مقرری تھا، مسدود ہو گیا۔ یہاں تک کہ صاحب سکرتر بھی مجھ سے نہ ملے اور کہلا بھیجا کہ اب گورنمنٹ کو تم سے ملاقات بھی منظور نہیں۔ میں فقیرِ متکبر مایوس دائمی ہو کر اپنے گھر بیٹھ رہا اور حکامِ شہر سے بھی ملنا میں نے موقوف کر دیا۔" (اُردوئے معلّٰی ۳۸۳)

۶۳ء ہی میں پھر کو لکھا

"۱۸۶ ء میں لارڈ صاحب بہادر نے میرٹھ میں دربار کیا۔ صاحب کمشنر بہادر دہلی اہالیٔ دہلی کو ساتھ لے گئے۔ میں نے کہا میں بھی چلوں؟ فرمایا کہ نہیں۔ جب لشکر میرٹھ سے دہلی آیا، میں موافق اپنے دستور کے روز ورود لشکر، مخیم میں گیا۔ میر منشی صاحب سے ملا۔ اُن کے خیمے میں اپنے نام کا ٹکٹ صاحب سکرتر بہادر کے پاس بھیجا۔ جواب آیا تم غدر کے دنوں میں بادشاہی باغیوں کی خوشامد کیا کرتے تھے، اب گورنمنٹ کو تم سے ملنا منظور نہیں۔ میں گدائی محرم اس حکم سے ممنوع نہ ہوا۔ جب لارڈ صاحب کلکتہ پہنچے، میں نے قصیدہ حسبِ معمول بھیج دیا۔ مع اِس حکم کے واپس آیا کہ اب یہ چیزیں ہمارے پاس نہ بھیجا کرو۔ میں مایوسِ مطلق ہو کر بیٹھ رہا اور حکامِ شہر سے ملنا ترک کیا۔" (اُردوئے معلّٰی ، ۲۸)



لیکن در اصل مرزا صاحب مایوس ہو کر بیٹھے نہیں ہیں۔ جب مئی ۱۸۶۰ء میں ان کی پنشن جاری ہو گئی تو انہوں نے دربار اور خلعت کی بحالی کی کوشش شروع کردی۔ جنوری ۱۸۶۲ء میں کیننگ کی جگہ لارڈ الگن گورنر جنرل مقرر ہوئے مرزا صاحب نے یکم جولائی ۱۸۶۲ء کو درخواست دی اور اُس میں یہ لکھا کہ میری پنشن کا اجرا میری بے گناہی کا ثبوت ہے۔ میرے معاملے کی تحقیق کر کے بے قصور ثابت ہوتے ہوئے یہ دربار و خلعت بحال کیا جائے۔ (ذکرِ غالب، ۵۶)

۱۸۶۳ء میں گورنر صاحب نے دہلی میں دربار کیا۔ اس کے متعلق ۴ مارچ ۱۸۶۳ء کے تفتہ کے خط میں لکھتے ہیں:

"جو یہاں لفٹنٹ گورنر جنرل آئے، میں جانتا تھا کہ یہ بھی مجھ سے نہ ملیں گے۔ کل انہوں نے مجھ کو بلا بھیجا۔ بہت سی عنایت فرمائی اور فرمایا کہ لارڈ صاحب دلی میں دربار نہ کریں گے، میرٹھ ہوتے ہوئے اور میرٹھ میں اس ضلاع کے علاقہ داروں اور مالگزاروں کا دربار کرتے ہوئے سالانہ جائیں گے۔ دلی کے لوگوں کا دربار وہاں ہوگا۔ تم بھی اسانہ جاؤ، شریکِ دربار معمولی لے آؤ۔

بھائی کیا کہوں کہ میرے دل پر کیا گزری۔ گویا مُردہ جی اُٹھا۔ بدستور معمولی میرا قصیدہ [illegible] دھر قصیدے کی فکر، اُدھر رُونیے کی تدبیر، حواس ٹھکانے نہیں۔" (اُردوئے معلّٰی، ۱۱۱)

۴ مئی ۱۸۶۳ء کے شیو نرائن کے خط میں تحریر کرتے ہیں

"سُنو لارڈ صاحب کے وُرود کے زمانے میں نواب لفٹنٹ گورنر بہادر پنجاب بھی دلی آگئے۔ دربار گیا، خیر گزرو، مجھ کو کیا! ناگاہ دربار کے تیسرے دن بارہ بجے چپراسی آیا اور کہا کہ نواب لفٹنٹ گورنر نے یاد کیا ہے۔ بھائی یہ آخر فروری ہے ۔۔۔ بہرحال سوار ہو گیا۔ پہلے صاحب سکرتر بہادر سے ملا۔ پھر نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ تصور میں کیا، بلکہ تمنا میں بھی جو بات نہ تھی، وہ حاصل ہوئی۔ یعنی عنایت سی عنایت۔ اخلاق سے اخلاق۔ وقتِ رخصت خلعت دیا اور فرمایا کہ یہ ہم تم کو اپنی طرف سے ازراہِ محبت دیتے ہیں اور مژدہ دیتے ہیں کہ لارڈ صاحب کے دربار میں بھی تیرا نمبر اور خلعت کھل گیا۔ انبالے جا۔ دربار میں شریک ہو۔ خلعت پہن۔" (اُردوئے معلّٰی، ۳۸۳)

اِس کی تفصیل تفتہ کو اِس طرح لکھی ہے:

"اواخر ماہ گذشتہ یعنی فروری ۱۸۶۳ء میں نواب لفٹنٹ گورنر پنجاب دلی آئے۔ اہالیٔ شہر سب ڈپٹی کمشنر بہادر صاحب کمشنر بہادر کے پاس دوڑے اور اپنے نام لکھوا لائے۔ میں تو بیگانۂ محض اور مطرودِ حکام تھا، گھر سے نہ ہلا۔ کسی سے نہ ملا۔ دربار ہوا۔ ہر ایک کا مگذار ہوا۔ شنبہ ۲۸ فروری کو آرا اور منشی پھول سنگھ صاحب کے بیچے میں چلا گیا۔ اپنے نام کا ٹکٹ صاحب سکرتر بہادر کے پاس بھیجا۔ مہربان ہو کر نواب صاحب کی ملازمت کی استدعا کی۔ وہ بھی حاصل ہوئی۔ حاکمِ جلیل القدر کی وہ عنایتیں دیکھیں جو میرے تصور میں بھی نہ تھیں۔

جملۂ معترضہ، میر منشی لفٹنٹ گورنری سے سابقہ تعارف نہ تھا وہ بطریقِ حسبِ طلب میرے خواہاں ہوئے تو میں گیا۔ حسبِ حکام بموجب استدعا مجھ سے بے تکلف ملے تو میں قیاس کر سکتا ہوں کہ میر منشی کی طرف سے حسبِ طلب ایمائے حکام ہوگا والرحمٰن الطاف خفیہ۔

بقیہ رُوداد یہ ہے کہ دوشنبہ دوم مارچ کو سوادِ شہر خیمۂ خیام گورنری ہوا۔ آخری روز میں اپنے شفیقِ قدیم جناب مولوی اظہار حسین خان بہادر کے پاس گیا۔ اثنائے گفتگو میں فرمایا کہ تمہارا دربار و خلعت بدستور بحال و برقرار ہے۔ میں نے پوچھا کہ حضرت کیونکر؟ حضرت نے کہا کہ حاکم نے ولایت سے کہ تمہارے علاقے کے سب کا عدالت انگریزی و فارسی دیکھے اور کونسل کو حکم لکھوا بھیجا کہ اسداللہ خاں کا دربار اور نمبر اور خلعت بدستور بحال و برقرار رہے۔ میں نے پوچھا کہ حضرت



بیمار کس اصل پر متفرع ہوا؟ فرمایا کہ ہم کو کچھ معلوم نہیں، بس اتنا جانتے ہیں کہ یہ حکم دفتر میں لکھوا کر جو دہ ولایت کو ادھر کو روانہ ہوئے ہیں۔ میں نے کہا سبحان اللہ! کارساز ما بفکر کار ما۔ ۳ مارچ کو ۱۲ بجے نواب لفٹنٹ گورنر بہادر نے مجھ کو بلایا خلعت عطا فرمایا اور ارشاد ہوا کہ لارڈ صاحب کے یہاں کا دربار اور خلعت پاؤ گے۔ عرض کیا گیا، حضور کے قدم دیکھے، خلعت پایا۔ لارڈ صاحب بہادر کا حکم سن لیا۔ بحال ہو گیا۔ اب انبالہ کہاں جاؤں۔ جیتا رہا تو انشاء اللہ دربار میں کامیاب ہو رہوں گا۔" (اردوئے معلیٰ، ۲۸۰)

۱۶ مارچ ۱۸۶۳ء کو نواب فردوس مکاں کو لکھا:

"منگل ۳ مارچ کو جناب لفٹنٹ گورنر بہادر نے خلعت عطا کیا اور فرمایا کہ ہم تمہیں مژدہ دیتے ہیں کہ نواب گورنر جنرل بہادر نے اپنے دفتر میں تمہارے دربار اور خلعت کے بدستور بحال رہنے کا حکم فرمایا۔ میں نے عرض کیا کہ میں انبالہ جاؤں؟ فرمایا البتہ انبالہ جانا ہوگا۔ بعد جناب نواب صاحب کے جانے کے شہر میں شہرت ہوئی کہ دلی کے لوگ انبالہ جانے سے ممنوع ہیں۔ گھبرایا اور صاحب کمشنر کے پاس گیا۔ ایک خط انبا دے آیا۔ زبانی پرسش کا جواب زبانی پایا۔

پھر خط کے جواب میں خط محررہ ۷ مارچ آیا

کل سے ایک اور خبر ہوئی ہے کہ نصیب اعداء لارڈ صاحب کی طبیعت ناساز ہو گئی ہے۔ انبالہ میں دربار نہ کر سکیں گے اور شملہ کو چلے جائیں گے۔ تار برقی میں جناب نواب صاحب سے حکم منگاؤں گا۔ جو حکم آئے گا، آپ سے عرض کر کے اس کی تعمیل کروں گا۔" (مکاتیب: ۲۴)

اس کے جواب میں نواب فردوس مکاں نے تحریر فرمایا:

"جو کہ خط نواب صاحب کمشنر بہادر سے عدم حصول شرف ملازمت جناب مستطاب معلی القاب نواب گورنر جنرل بہادر بنام آقائیم کا بمقام انبالہ مستنبط ہے، اس واسطے تشریف لے جانا آپ کا اس سے دربار استجارت ضروری نہیں معلوم ہوتا۔"

۱۸۶۳ء میں علائی کو تحریر کیا

"جناب لفٹنٹ گورنر بہادر نے دربار کیا۔ میری تعظیم و توقیر اور میرے حال پر لطف و عنایت میری ارزش و استحقاق سے زیادہ بلکہ میری خواہش و تصور سے سوا مبذول کی۔" (خطوط، ۱، ۲۴۸)

۴ اگست ۱۸۶۳ء کو پھر نواب فردوس مکاں کو لکھا:

"جب میرا جانا نہ ہوا تو میں نے قصیدۂ مدح جو دربار کی نذر کے واسطے لکھا تھا، بطریق ڈاک جناب چیف سکرٹر بہادر کو اس مراد سے بھیجا کہ آپ اس کو جناب نواب معلی القاب کی نظر سے گذرا دیں اور یہ دستور قدیم کہ جب میں قصیدہ مدحیہ بھیجتا تو صاحب سکرٹر بہادر کا خط بے واسطۂ حکام ماتحت آتا۔ اب جو میں نے موافق معمول قصیدہ بھیجا یقین ہے کہ مارچ یا اپریل کے مہینے میں وہ لفافہ یہاں سے لشکر کو گیا۔ جدائے نرخواست نا امید ہو کر بیٹھ رہا یہ خیال گزرا کہ جب رسم تحریر خطوط نہ رہی تو دربار و خلعت کہاں۔ ناگاہ کل شام کو صاحب سکرٹر بہادر کا خط ڈاک میں آیا۔ وہی اشفاق کا عنوان، وہی القاب۔" (مکاتیب، ۲۵)

۲۲ فروری اور ۲۲ اگست ۶۳ء کے درمیان کی کسی تاریخ میں قدر بلگرامی کو لکھا:

"میں ہمیشہ نواب گورنر جنرل بہادر کے دربار میں سیدھی صف میں دسواں نمبر اور سات پارچہ اور تین رقم جواہر خلعت پاتا تھا۔ غدر کے بعد پنشن جاری ہو گئی، لیکن دربار و خلعت بند اب کے جو لارڈ صاحب بہ۔ آئے تو اول دفتر سے



بموجب حکم کے مجھ کو اطلاع دی کہ تمہارا دربار و خلعت واگزاشت ہوگیا۔ مگر دلی میں دربار نہیں۔ انبالے آؤ گے تو دربار میں نمبر اور خلعت معمولی پاؤ گے۔ میں نے حرمین و حداں کا مزا پایا اور انبالہ نہ گیا۔ رابرٹ منٹگمری صاحب لفٹنٹ گورنر بہادر قلمرو پنجاب یہاں آئے۔ دربار کیا۔ میں دربار میں نہ گیا۔ دربار کے بعد ایک دن ۱۲ بجے چپراسی آکر مجھ کو بلا لے گیا۔ بہت عنایت فرمائی اور اپنی طرف سے خلعت عطا کیا۔

۱۸۶۵ء کے شروع میں مرزا صاحب نے ایک درخواست دی کہ مجھے ملکہ کا شاعر دربار مقرر کرکے دربار میں اونچی جگہ دی جائے، اور "دستنبو" کو گورنمنٹ اپنے صرف سے شائع کرے۔ اس لارڈ لارنس گورنر جنرل تھے۔ مرزا صاحب ان کے مداح رہ چکے تھے۔ انہوں نے لفٹنٹ گورنر پنجاب سے رپورٹ طلب کی۔ چیف سکریٹری گورنمنٹ پنجاب نے لکھا کہ میرے خیال میں کمشنر دہلی کی یہ سفارش معقول ہے کہ علیا حضرت ملکۂ معظمہ کا تو نہیں، البتہ مرزا غالب کو والسرائے کا درباری شاعر مقرر کر دینے میں کوئی حرج نہیں۔ یہ بھی لازم نہیں کہ عہدے کے ساتھ کوئی تنخواہ مقرر ہو۔ سالانہ خلعت ضرور دیا جائے اور اگر سال کے دوران میں بھی کسی خاص تقریب وغیرہ پر وہ قصیدہ پیش کریں تو بے شک خلعت دیا جا سکتا ہے، اس سے مرزا غالب کی بھی اشک شوئی ہو جائے گی اور علوم مشرقیہ کی حوصلہ افزائی بھی اس وقت بہت کم نگاہی کا شکار ہو رہی ہے۔ اس پر مزید تحقیقات کا حکم ہوا کہ غدر کے دنوں میں مرزا غالب کے رویے کی پڑتال کی جائے، پھر ان سے "دستنبو" کا ایک نسخہ طلب کرکے اس پر بھی رائے لکھی جائے۔ جب مرزا صاحب سے "دستنبو" کا نسخہ طلب کیا گیا ہے تو اس وقت رام پور میں تھے۔ رام پور ہی میں انہوں نے دستنبو کے پہلے ایڈیشن کی تصحیح کرکے بریلی میں دوبارہ طبع کرایا۔ ایک نسخہ حکومت پنجاب کو بھیجدیا۔ حکومت کے میر منشی نے دستنبو کو دیکھ کر یہ رپورٹ کی کہ اس کی زبان پرانی قسم کی فارسی ہے جو اب نامانوس و بعید الفہم ہے۔ اس لیے اسے حکومت کے خرچ پر شائع کرنا بے سود ہے۔

اسی کے ساتھ غدر کے دوران میں مرزا غالب کے رویے کی پڑتال بھی ہو رہی تھی۔ اس پر بھی وہی رپورٹ برآمد ہوئی جس میں مرزا صاحب سے ایک سکہ منسوب کیا گیا تھا۔

آخر تمام امور پر غور کرکے حکومت نے ۶ جنوری ۱۸۶۶ء کو یہ فیصلہ کیا کہ مرزا صاحب کو درباری شاعر بنانا مناسب نہیں، البتہ گورنر جنرل کو اس میں کوئی اعتراض نہ ہوگا، اگر لفٹنٹ گورنر پنجاب انہیں خلعت عطا کریں یا انہیں دربار میں پہلے سے اونچی جگہ عطا کی جائے۔

اس حکم پر گورنر پنجاب نے انہیں خلعت عطا کی تو قربان علی بیگ سالک نے حسب ذیل قطعہ لکھا۔ (دیوان سالک: ۲۷۱)

اسد اللہ خاں بہادر را ۔۔۔ رہبری کرد بخت و اقبالش
داد خلعت گورنر پنجاب ۔۔۔ مہربانی نمود بر حالش
عیسوی گفتم از سر عزت
خلعت بہت یار حیہ سالش

(تاجر سے موصولہ) ۔۔۔ ۱۸۶۶ ۔۔۔ ۱۲۹۶

اتفاق: "غالب نمبر" کا یہ پہلا باب ایک ماہر غالبیات قاضی عبدالودود کے مقالے سے شروع ہو کر دوسرے ماہر غالبیات مولانا عرشی کے مضمون پر ختم ہوتا ہے۔ (ادارہ)

کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

پہلی
تصویر



غالب کی پہلی تصویر جو اُن کی زندگی ہی میں کلیاتِ فارسی
طبعِ دوم میں ۱۸۶۳ء میں لیتھو سے چھپی تھی



مرزا غالب کی سب سے معتبر تصویر

جو لال قلعہ کے عجائب خانہ میں محفوظ ہے۔ یہ تصویر کئی رنگوں میں غالب نے کسی مصور سے بنوا کر خود بہادر شاہ ظفر کو پیش کی تھی



پہلی تصویر

غالب کے چہرے کے نقوش کے
قیاس پر یادگارِ غالب
(مطبوعہ نامی پریس کانپور)
میں ۱۸۹۷ء میں لیتھو سے
چھپی تھی۔ حالی نے دو تصویریں
منشی رحمت اللہ رعد کے پاس
بھیجی تھیں اور ان سے
یہ تصویر
تیار کی گئی۔



دوسری تصویر

۲۴ اگست ۱۹۰۱ء کو
پیسہ اخبار لاہور کے ضمیمہ
میں لیتھو سے چھپی تھی
اسے لالہ سری رام سے
منسوب کیا جاتا ہے کہ
انھوں نے یہ تصویر دہلی
کے مصوروں کے ایک خاندان
سے خریدی تھی۔
یہ اسی کی
نقل ہے۔

غالب عالمِ جوانی میں



لکھنؤ کے مشہور آرٹسٹ محمد حکیم کی بنائی ہوئی رنگین قیاسی تصویر
جو ۱۹۳۲ء میں "نگار" کے "سوحیاں نمبر" میں شائع ہوئی تھی۔



ہو گئے مُضمحل قُویٰ غالبؔ وہ عناصر میں اعتدال کہاں

حکیم محمد آرٹسٹ کی بنائی ہوئی قیاسی تصویر جو سب سے پہلے تاریخِ ادبِ اُردو (مطبوعہ نولکشور) میں شائع ہوئی تھی۔



مرزا غالبؔ کی
وہ تصویر ہے جو رنگون میں
۱۹۲۵ء میں ڈاکٹر ذاکر حسین
کے مطبع سے ترکیت کا دیوان سرل میں
چھپوایا تھا۔ یہ تصویر لاشرگ میں
ایک مصور سے محمد مجیب صاحب
کی معرفت سوائی گئی تھی۔ یہ شبیہ
اصل نہ ہونے کے باوجود سب
سے زیادہ مقبول ہے۔



رحمت علی، ووڈگر ایر
کی کھینچی ہوئی وہ تصویر
جو مرزا غالبؔ کے
انتقال سے چند
دن پہلے کی ہے۔

چند تلامذۂ غالب



میر مہدی مجروح



ہرگوپال تفتہ



الطاف حسین حالی



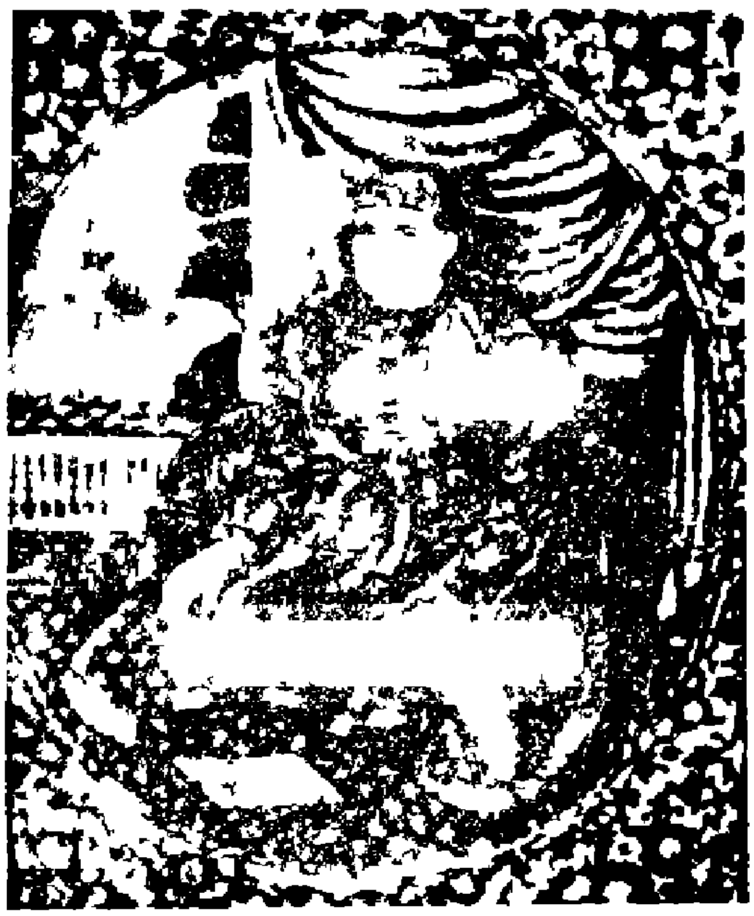
قدر بلگرامی



صفیر بلگرامیؒ



نوابؒ ضیاء الدین احمد خاں نیرؔ رخشاں



نوابؒ یوسف علیخاں ناظم رامپوری



ہرگوبند سہائے نشاط



میر سید علی غمگین
ملقب بہ 'خدا نما'
جن سے
غالب کی
رسم مراسلت تھی



یار محمد خان شوکت

(متعلقہ مضمون)



مولدِ غالبؔ
کلاں محل آگرہ کا وسیع و
عریض مکان – یہی وہ
مقدس دالان ہے جس میں
غالب کے عہدِ طفولیت کے
اَن گنت نشانات ہیں اور
جس کی بلند و بالا چھتوں
سے عالمِ جوانی میں ان گنت
پتنگوں کے پیچ
لڑائے



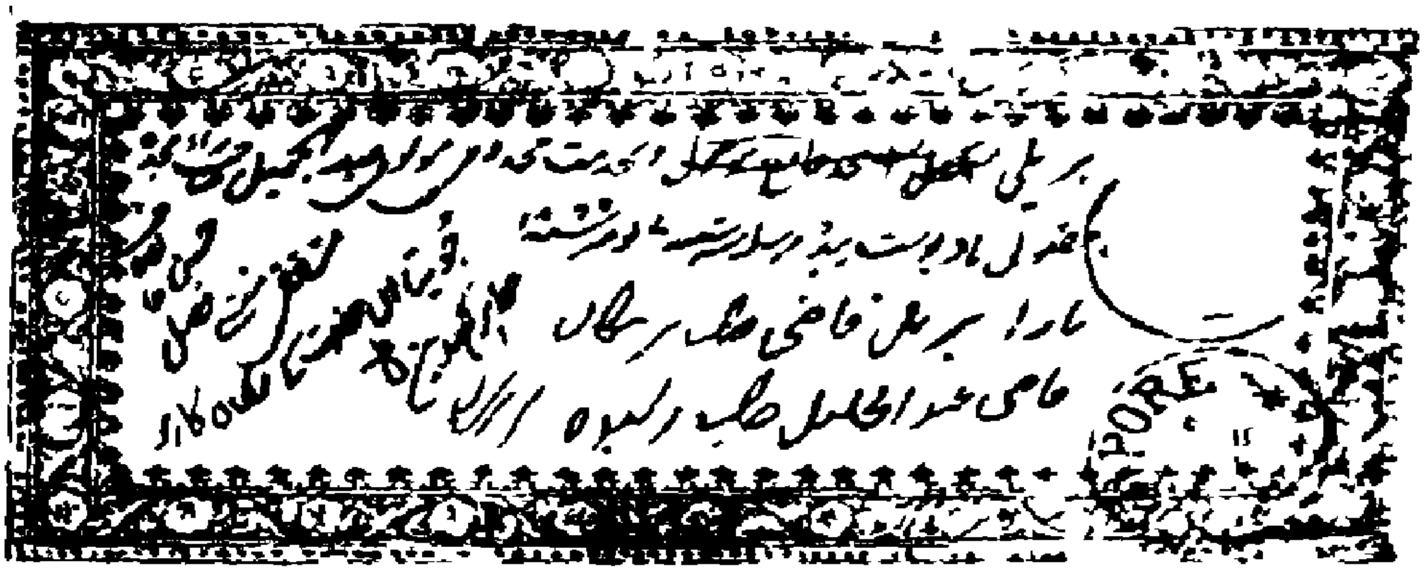
مزارِ غالب
واقع
درگاہ حضرت نظام الدین اولیاء
دہلی

غالب کی طرزِ تحریر



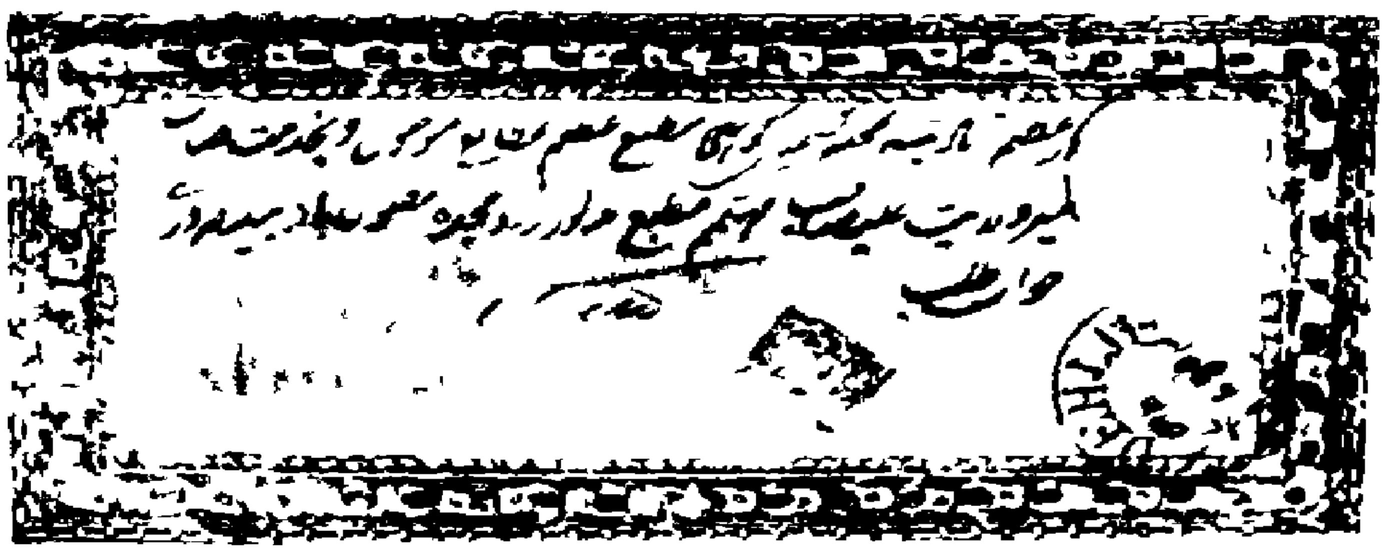
نوابؐ یوسف علیخان والئ رامپور
کے نام
ایک خط

نامہ ہائے غالب



عکسِ لفافہ ۰ (تحریرِ غالب)

قاضی عبدالجلیل (بریلی) کے نام



عکسِ لفافہ : (تحریرِ غالب)

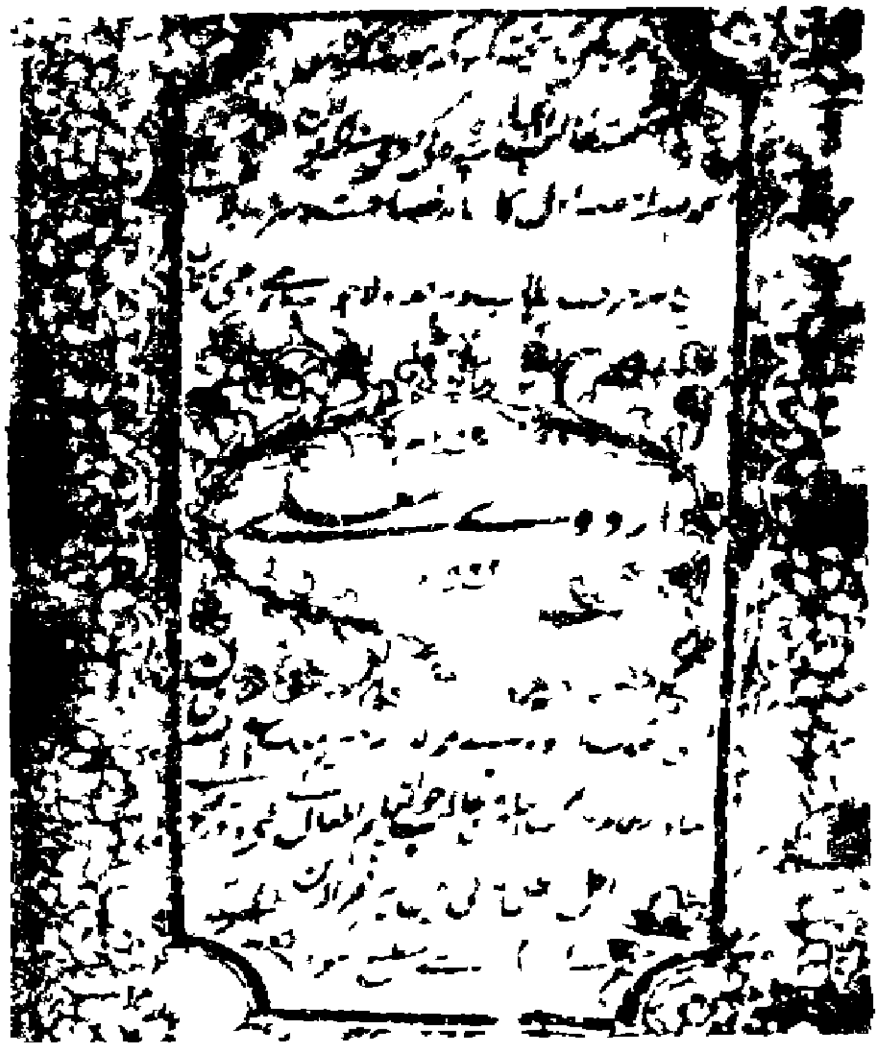
میر ولایت علی مہتمم مطبع عظیم المطابع، عظیم آباد کے نام



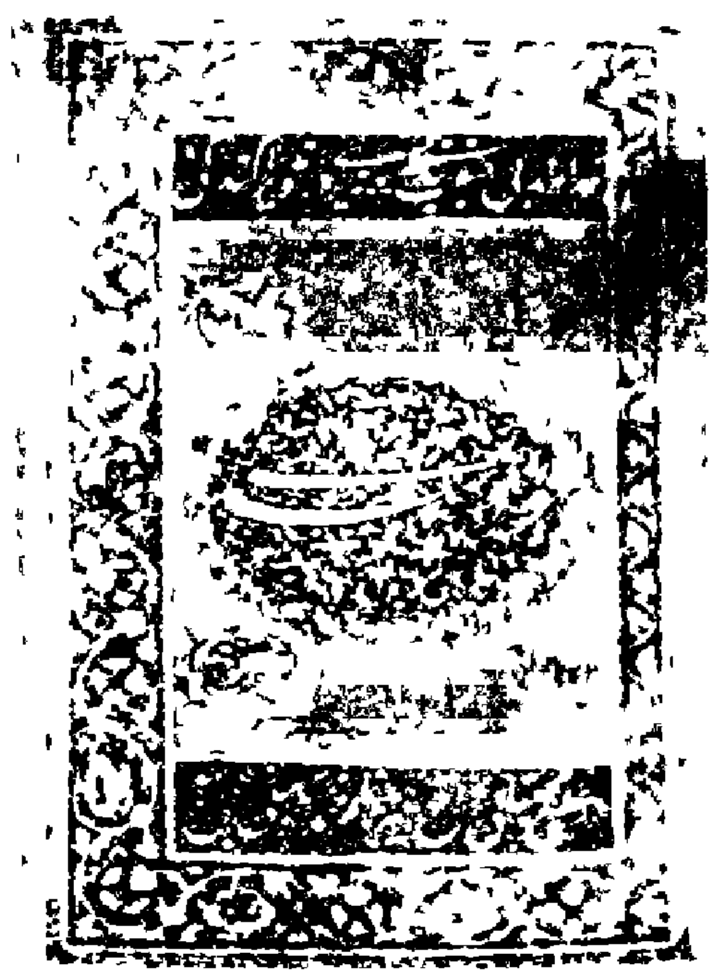
کلیاتِ نثرِ غالب کا سرورق جو غالب کی زندگی میں
۱۸۶۸ء میں مطبع نول کشور سے شائع ہوئی



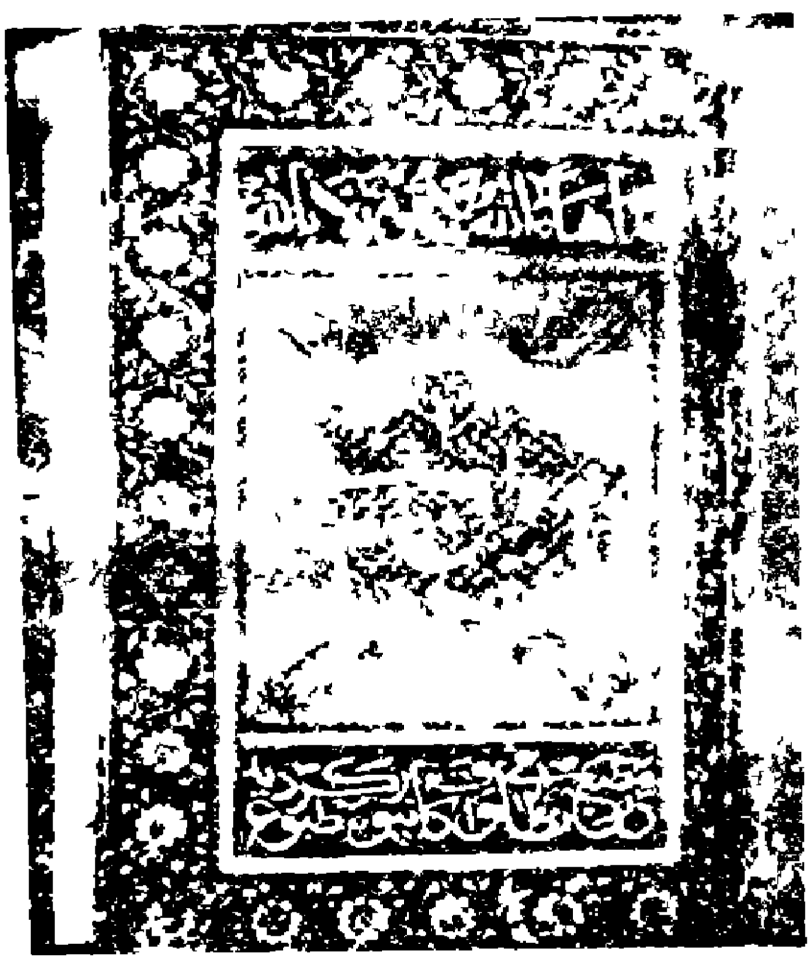
مہرِ نیمروز کا سرورق جو ۱۲۶۸ ہجری میں فخرالمطابع
میں فتح الملک ولی عہد بہادر سلطان فخرالدین،
(مرزا فخرو) کے حسب الحکم شائع ہوئی۔



لوح اردوئے معلیٰ طبع اول دہلی ۱۸۶۹ء



"گنجینہ گوہر ہائے راز کا"

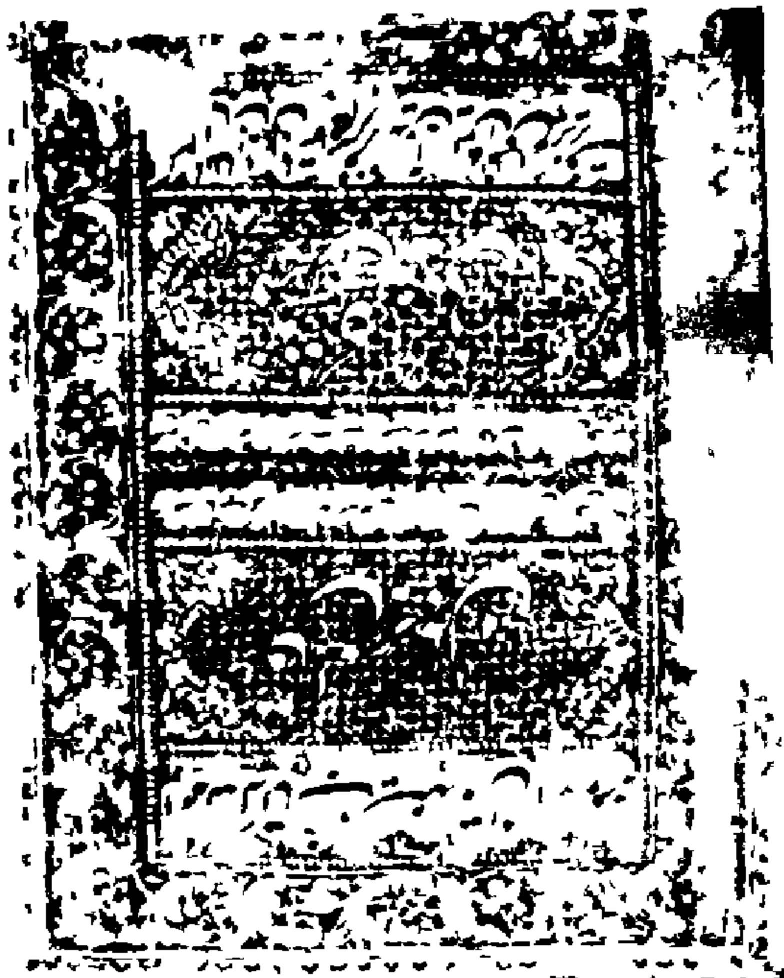


"اشعار کا دفتر کھلا"

[illegible]



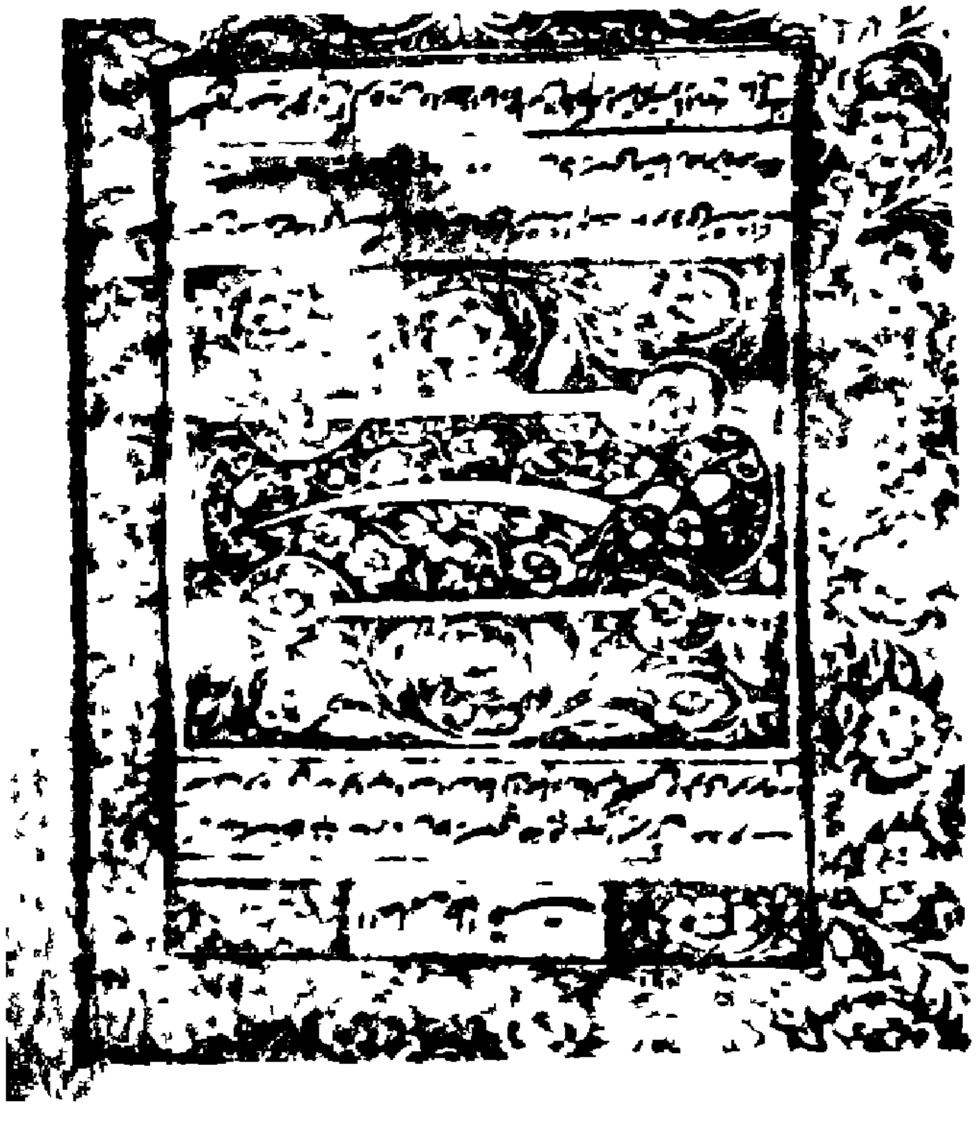
[illegible]

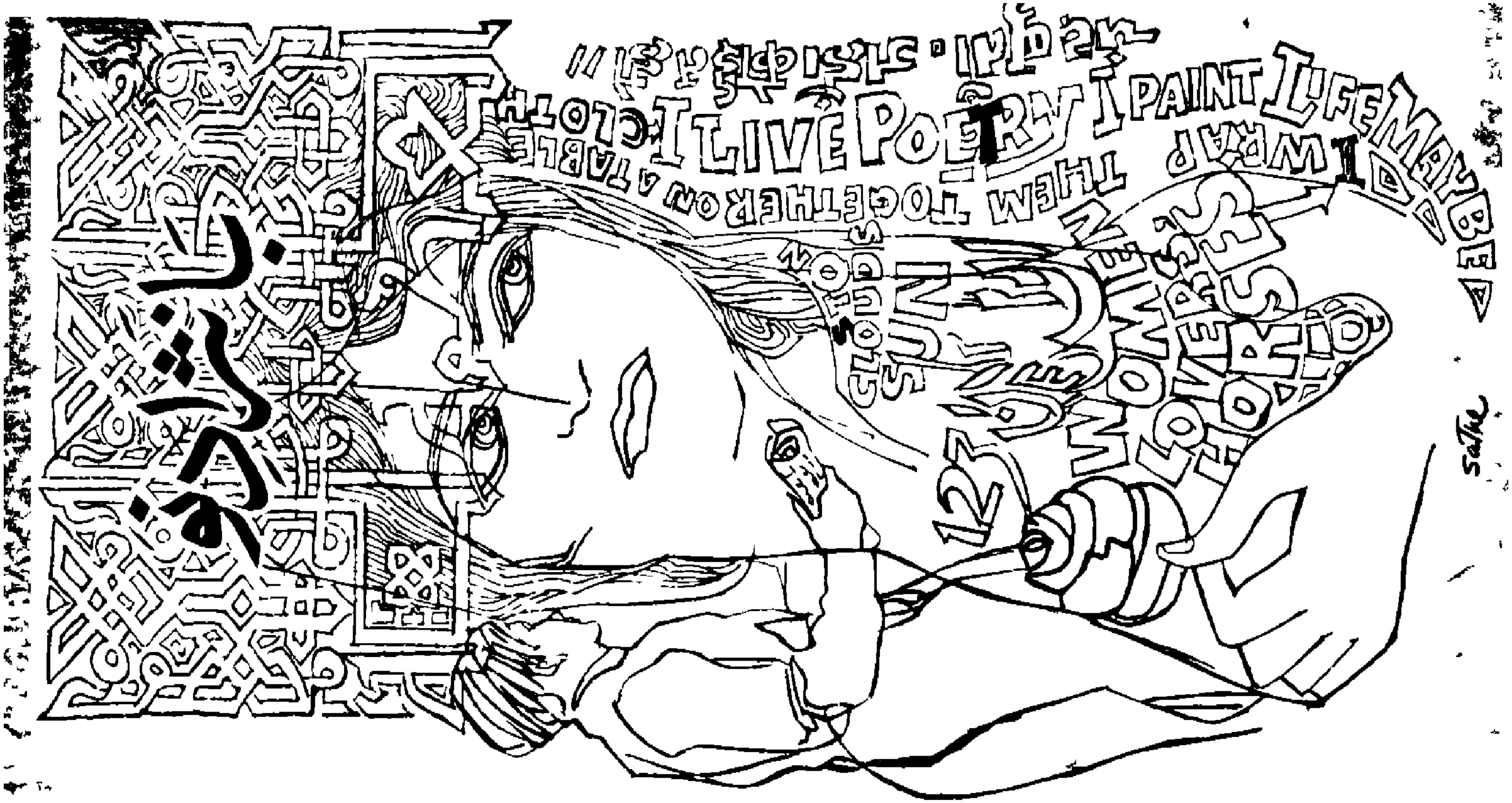


[illegible]



[illegible]




I LIVE POETRY I PAINT LIFE MAYBE A
I WRAP THEM TOGETHER ON A TABLECLOTH
SUN ON CLOUDS
WOMEN
LOVERS
HORSES
Sathe

ڈاکٹر وزیر آغا

غالب کا ذوقِ تماشا

غالب کے ذوقِ تماشا کی نوعیت کیا ہے اور اس نے کس طرح تماشا یا تماشائی کا کردار ادا کیا ہے؟ ــــ اس سوال کا جواب غالب کے کلام کے مطالعے سے بہ آسانی مل سکتا ہے۔ سب سے پہلے غالب کا یہ شعر دیکھئے ؎

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے　　　ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

اس شعر میں تماشائی کا منصب بہت واضح ہے اور یہ احساس بہت توانا ہے کہ دنیا کے جملہ مظاہر بچوں کے کھیل کی طرح ناپائیدار، بے معنی اور بے سمت ہیں اور اسی لئے تفریحی کیفیات کے حامل بھی ہیں۔ یہ ایک خاصا مقبول نظریہ ہے جو غالب سے پہلے بھی رائج تھا، غالب کے زمانے میں بھی عام تھا اور آج کہ زندگی کی مادی حیثیت بہت زیادہ اہمیت حاصل کر چکی ہے، بعض طبقات میں ابھی تک بہت مقبول ہے۔ یہی نظریہ ہے جس کی اساس پر وہ صوفیانہ تصورات وجود میں آئے جو حسیات سے مرتب شدہ دنیا کو غیر حقیقی اور اس کی موجوں کے پیچھے پھیلے ہوئے تمام سمندر کو اصل حقیقت سمجھتے تھے۔ بعض لوگ شاید تماشائی کی اس حیثیت کو ہرا دیں نتیجہ کریں، مگر مشرق میں جہاں پر دی روح کی حیات چند روزہ اور اشیاء کی شکست و ریخت کا عمل موسمی حالات کے باعث بہت تیز ہوتا ہے یہ نظریہ بجائے خود ایک خود رو پودے کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کی مقبولیت فرار کے نظریے کے تحت نہیں بلکہ زندگی کو اس کی اصل صورت میں قبول کر لینے کے رویے کے باعث ہے۔ جب ہر شے اتنے بڑے پیمانے پر فنا پذیر ہو رہی ہو اور تغیر و تبدل کا عمل اس قدر تیز رفتار ہو تو پھر اس کا ادراک فرار کے رجحان کے تابع کس طرح ہو سکتا ہے؟ یہ الگ کہ میں غالب کی اس خاص حیثیت کا جواز مہیا نہیں کر رہا۔ مقصد صرف یہ ہے کہ غالب کے اس نقش کو واضح کیا جائے جو مروجہ نظریے کے زیرِ اثر مرتب ہوا تھا اور جس میں تماشائی کی حیثیت ایک بلند ٹیلے پر بیٹھے ہوئے شخص کی سی تھی۔ مگر غالب کی رگوں میں جو خون دوڑ رہا تھا وہ اُسے تماشائی کے اُس خاص مقام پر زیادہ دیر تک رکنے کی اجازت کیسے دیتا؟ چنانچہ غالب کے ہاں صوفیانہ مسلک کے حامل اس وضع کے اشعار محض ایک ہنگامی اظہار سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے اور وہ اگلے ہی قدم پر تماشائی کے بلند مقام سے اتر کر تماشا کے ہموار میدان میں سرگرمِ عمل دکھائی دینے لگتا ہے اور اس کے اور کائنات کے درمیان ایک ایسا رشتہ استوار ہو جاتا ہے جس میں چند لمحوں کے لئے تماشا اور تماشائی کی تفریق ہی ختم ہو جاتی ہے۔ مثلاً اسی غزل میں غالب یہ بھی کہتا ہے ؎

ہے موجزن اک قلزمِ خوں کاش یہی ہو　　　آتا ہے ابھی دیکھئے کیا کیا مرے آگے

اور ــــ



گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

معاً قاری خود سے پوچھتا ہے کہ جو شخص اپنے سامنے پھیلی ہوئی زندگی کو ایک قلزمِ خوں کی صورت میں محسوس کرتا ہو وہ 'بازیچۂ اطفال' کے نظارے پر کتنی دیر کاربند رہ سکتا ہے؟ اور پھر جب زندگی سے شاعر کی وابستگی اِس قدر توانا ہو کہ وہ محض "آنکھوں کے دم" پر تکیہ کر کے مناظر کے وجود کو طلب کرنے سے بھی دریغ نہ کرے تو اس سے بھی اندازہ لگانا چاہیئے کہ غالب زندگی اور اس کے تار و پود کو کس قدر سچا سمجھتا تھا۔ غالب کے کلام کا مطالعہ کریں تو اُس کے موخر الذکر رویے کے شواہد عام طور سے مِل جائیں گے۔

تماشائی کی حیثیت فاصلے اور بُعد سے مرتب ہوتی ہے۔ جس قدر کوئی شخص خود کو کائنات سے الگ متصور کرتا ہے اُسی نسبت سے وہ تماشائی کے منصب کو بھی اپناتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ تصوف میں تماشائی بننے کے لئے زندگی اور کائنات کے مظاہر کی نفی اور خواہشات کو عبور کرنے کے مسلک پر اس قدر زور دیا جاتا رہا ہے، مگر تصوف محض شکست و ریخت تک محدود نہیں۔ تصوف مظاہر کی ارضی سطح کو توڑتا ضرور ہے لیکن پھر ایک وسیع تر رُوحانی سطح کی تعمیر بھی کرنے لگتا ہے۔ مشہور صوفی شاعر بلھے شاہ سبزی ترکاری اُگانے کا کام کیا کرتا تھا۔ ایک روز جب وہ بیری اُکھیڑ کر کھیت میں لگا رہا تھا اور کسی شخص نے اس سے خدا تک رسائی پانے کا طریق پوچھا تو بلھے شاہ نے اپنے کام کو ترک کئے بغیر فی البدیہہ کہا۔

"رب دا کی پاناں۔ ایدھروں پٹیا اودھر لانا"

(ترجمہ: رب کا پانا کیا مشکل ہے، اِدھر سے اکھیڑا، اُدھر لگا دیا)

صوفی یہی کچھ کرتا ہے، یعنی زمینی زندگی یا مایا کی نفی کر کے ایک ارفع تر رُوحِ کُل کو وجود میں لاتا ہے۔ مگر غالب صوفی نہیں۔ وہ تو زمینی زندگی کو خود سے ہم آہنگ کر کے اُس کو اُوپر اُٹھاتا ہے اور اپنے اِس عمل سے شرکت Participation کی ایک نہایت عمدہ مثال قائم کرتا ہے۔

غالب کی شرکت Participation کا یہ عمل بے حد دلچسپ ہے اور زندگی سے غالب کے گہرے اُنس کو ظاہر کرتا ہے۔ قدیم قبائل میں اِرد گرد کی اشیا کو جاندار تصور کر کے ان سے ویسا ہی سلوک کرنے کی روش بہت توانا تھی اور عہدِ انسان کا بچپن بھی اِس رَوش کے تحت ہی بسر ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ اس عہد میں خود کو جاندار اور بے جان اشیا کی وسیع برادری کا ایک رُکن سمجھتا ہے۔ گویا زندگی کا یہ وہ دَور ہے جس میں شرکت مکمل ہوتی ہے مگر جب اُس کا شعور اُبھر آتا ہے اور انفرادیت واضح ہو جاتی ہے تو وہ بتدریج اس وسیع برادری کی تمام سطحوں سے دست کش ہو کر ایک تماشائی کی طرح کائنات کو دیکھنے لگتا ہے۔ اس عمل سے اُسے تہذیبی اور ذہنی ارتقا تو حاصل ہوتا ہے لیکن اس کے نتیجے میں تنہائی، بے بسی اور کرب بھی ملتا ہے مگر وہ طبقات جو آج بھی شرکت کے اس عمل سے بہرہ مند ہیں، اُن کے یہاں تنہائی اور بے بسی کا کرب بہت کم موجود ہے، اِس لئے کہ وہ خود کو ماحول سے پُوری طرح منسلک اور مربوط محسوس کرتے ہیں۔ درخت اور جانور کو اپنا جدِ امجد تصور کرنے کا وہ میلان جسے "ٹوٹم" کا نام ملا ہے اور جو اپنی واضح صورت میں درخت اور جانور کی پُوجا کی صُورت میں اُبھرتا ہے اِس شرکت ہی کا ایک مظہر ہے۔ یعنی اس کے پس منظر میں رویہ وہی کارفرما ہے کہ انسان کائنات کے دُوسرے جملہ مظاہر کی برادری کا ایک رکن ہے۔ بعض وحشی قبائل میں درخت کو کاٹنے کا عمل یا زمین میں لوہے کا ہَل چلانے کی رَوش کو سخت غصے اور نفرت سے دیکھا جاتا ہے، محض اس لئے کہ یہ درخت یا زمین کو تکلیف پہنچانے کے مترادف ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ غالب کے ہاں ٹوٹم پرستی کا عمل اُبھرا ہے بلکہ صرف اس قدر کہ غالب کا رویہ شرکت کے عمل سے مملو ہے اور جب وہ خود کو کائنات کے رُوبرو پاتا ہے تو قدم بڑھا کر تماشا میں شریک ہو جاتا ہے، مثلاً ؎



میرے غم خانے کی قسمت جب رقم ہونے لگی
لکھ دیا منجملۂ اسبابِ ویرانی مجھے

بات ایک لطیفے کے طور پر بیان ہوئی ہے لیکن "اسبابِ ویرانی" سے خود کو حتمی طور پر منسلک کرنے کی روش کس لاشعوری طلب کی غماز ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ غالب اپنے ماحول سے اس طور منسلک ہے کہ اُسے مغائرت یا کلیتاً کا سامنا کرنے کی ضرورت کم ہی پڑتی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ غالب محض ماحول سے لذت کشید کرتا ہے یا وہ کائنات اور زندگی کے محض مثبت رُخ ہی کا والہ و شیدا ہے، بلکہ یہ کہ وہ سامنے کی دنیا کو ایسا مدِ مقابل نہیں سمجھتا اور اس لئے اس کی ہر ادا بلکہ ہر وار کو قبول کرنے کی طرف مائل رہتا ہے۔ ایسا ہے غالب کا وہ رُجحان مرتب ہوا ہے جو

"مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں"

کی صورت میں ظاہر ہوا ہے اور جس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ زندگی کو اُس کی مسرتوں اور دُکھوں سمیت قبول کرنے پر مائل ہے۔ شرکت کی بہترین صورت بھی یہی ہے کہ مسرت کے ایام ہی میں نہیں، آلام کی گھٹاؤں میں بھی دوست کا ساتھ دیا جائے۔ چنانچہ غالب کے ہاں ماحول سے لین دین Give & Take کی نہایت عمدہ روش وجود میں آئی ہے جو اس بات پر دال ہے کہ غالب نے تماشائے دل و جان سے شرکت کی ہے، محض دکھاوے کے لئے ایسا نہیں کیا۔ یہ چند اشعار دیکھئے ؎

[illegible] ہے جہاں نقشِ رواں نکہتِ گل
جس کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا

باغ میں مجھ کو نہ لے جا ورنہ میرے حال پر
ہر گلِ تر ایک چشمِ خوں فشاں ہو جائے گا

وا کر دیئے ہیں شوق نے بندِ نقابِ حسن
غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

کشش ہے جلوۂ گل ذوقِ تماشا غالب
چشم کو چاہئے ہر رنگ میں وا ہو جانا

میں چمن میں کیا گیا، گویا دبستاں کھل گیا
بلبلیں سن کر مرے نالے غزل خواں ہو گئیں

صد جلوہ رُوبرو ہے جو مژگاں اٹھایئے
طاقت کہاں کہ دید کا ساماں اُٹھایئے

نگہِ گرم سے اک آگ ٹپکتی ہے اسدؔ
ہے چراغاں خس و خاشاکِ گلستاں مجھ سے

فرش سے تا عرش واں طوفاں تھا موجِ رنگ کا
یاں زمیں سے تا آسماں سوختن کا باب تھا

جلوۂ گل نے کیا تھا واں چراغاں آبِ جُو
یاں رواں مژگانِ چشمِ تر سے خونِ ناب تھا

شب ہوئی پھر انجمِ رخشندہ کا منظر کھلا
اس تکلف سے کہ گویا بتکدے کا در کھلا

رنگِ شکستہ صبحِ بہارِ نظارہ ہے — یہ وقت ہے شگفتنِ گل ہائے ناز کا



اِن اشعار کے مطالعے سے یہ احساس جاگتا ہے کہ غالب نے شرکت کے رُجحان کے تحت جب تماشا کو اپنایا ہے تو ماہر کے تماشائی کے وجود کو قطعاً فراموش کر دیا ہے۔ صحیح شرکت Participation کی خوبی بھی یہی ہے کہ کردار تمثیل میں خود کو پوری طرح ضم کر دے، اور چند لمحوں کے لئے اُسے یہ بات ہی بھول جائے کہ وہ تمثیل کا ایک کردار ہے جسے تماشائیوں کا ہجوم نظر کی گرفت میں لئے بیٹھا ہے۔ تماشا میں غالب کی مکمل شرکت اُن اشعار سے بھی ثابت ہوتا ہے جن میں اُس نے ماحول کے ہر موڈ سے اثرات قبول کئے ہیں۔ یعنی اگر ماحول نے اُسے ڈرایا ہے تو غالب واقعتاً ڈر گیا ہے اور اگر ماحول اُس پر مہرباں ہوا ہے تو غالب کی حسِ مزاح پھڑک اُٹھی ہے لیکن اس طور نہیں کہ وہ ایک مسخرے کا کردار ادا کرنے لگے بلکہ صرف اس حد تک کہ اس کے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ کھیلنے لگے۔ مسخرہ حاضرین کو ہمیشہ ملحوظ رکھتا ہے اور اُن سے قہقہہ اُگلوانے کے لئے کسی حرکت سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ لیکن غالب صرف اپنے ایک خاص موڈ کا اظہار کرتا ہے جسے دیکھ کر دوسروں کے ہونٹ بھی تبسم میں بھیگنے لگتے ہیں۔ مثلاً ۔

آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا — پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق

حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی — غالب گر اِس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں

کاش کہ تم مرے لئے ہوتے — پھر ہو یا کیا ہو، جو کچھ ہو

یاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں — دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا

غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی — ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے

ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے — عشق نے غالب نکما کر دیا

آپ کی صورت تو دیکھا چاہیئے — چاہتے ہو خوب رُوؤں کو اسد

اِن اشعار کے مطالعے سے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کہ ذہن میں کوئی دلکش خواب دیکھ رہا ہے ...

... ہی اور اس

باغ پاکر خفقانی یہ ڈراتا ہے مجھے — سایۂ شاخ گل افعی نظر آتا ہے مجھے



...ہوں اندھیری ہے شب غم ہے بلاؤں کا نزول — آج اُدھر ہی کو رہے گا دیدۂ اختر کھلا

اسی طرح غالب کے ہاں شکست کی کیفیات بھی دل کی واردات ہی کا نتیجہ ہیں، تماشا دکھانے کی کاوش ہرگز نہیں مثلاً

گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا — بحر گر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا

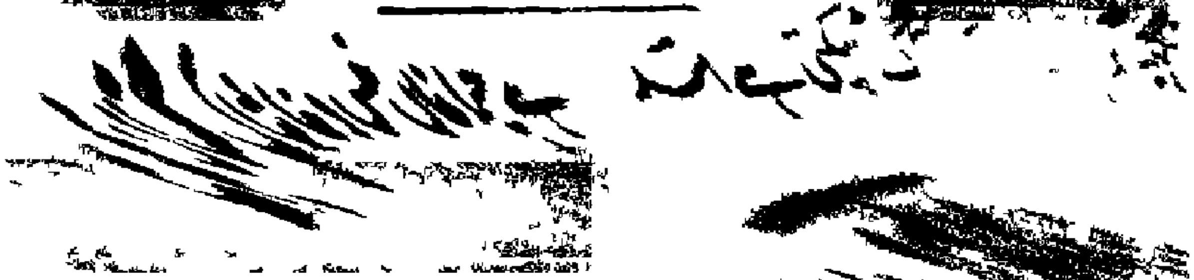
کوئی ویرانی سی ویرانی ہے — دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

یہی حال غالب کی شخصیت کے ساتھ ہے۔ جب وہ ماحول میں خود کو بے بس پاتا ہے تو دوسری نسبت سے اپنے کردار کی توانائی کا اظہار بھی کرتا ہے

...کر خضر کی ہم پیروی کریں — مانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

...گرم کہ غالب کے اڑیں گے پرزے — دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

...ہے، لیکن اس بے دماغی پر — کہ موج بوئے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا



...شاعری میں اہمیت دی

...ہے ساماں خراب نہ احساں اٹھائیے

...پھر وہی فرصت کہ رات دن — بیٹھے رہیں تصور جاناں کئے ہوئے

...تلاش کو دہر میں — تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

...بھی حسرت کی ملے داد — یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

...ذوق معاصی بھی — بھروں یک گوشۂ دامن گر آب ہفت دریا ہو

...معاصی تنک آبی سے ہوا خشک — میرا سر دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

شاعرِ تمنا
ہے اس قسم کے اشعار ...
... تماشائی نیرنگِ تمنا



مطلب نہیں کچھ اس سے کہ مطلب ہی بر آوے

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

ہوئی ہے کس قدر ارزانیِ مے جلوہ
کہ مست ہیں ترے کوچے میں سب در و دیوار

دیکھو لے سامانِ خط کا
اس کو کہتے ہیں عالم آرائی
کہ زمیں ہو گئی ہے سر تا سر
روکشِ سطحِ چرخِ مینائی

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں
غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں
ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

غالب کے مسلک کو واضح کرتے ہیں۔ وہ حیات و کائنات کا تماشا کرنے کے لئے فاصلے کا نہیں قرب کا قائل ہے اور زندگی کے ہر مظہر میں اس کے خاص وصف کی نسبت سے دلچسپی لیتا ہے مثلاً وہ نیرنگیٔ تمنا کا تماشا کرتے ہوئے استغنا کا اظہار کرتا ہے اور ارزانیٔ مے جلوہ کو سامنے پا کر مست ہو جاتا ہے اور جب دیکھتا ہے کہ زمیں آسمان کا آئینہ بن گئی ہے تو کھل اٹھتا ہے۔ پھر یکایک سبزہ و گل اور پری چہرہ لوگوں کو ایک نظر دیکھ کر حیران ہو جاتا ہے اور دوسرے ہی لمحے رخشِ عمر پر خود کو محسوس کر کے اپنی بے بسی کے اظہار کرنے میں تامل نہیں کرتا۔ جو شخص زندگی کو اصل سمجھنے سے کلی گریزاں ہو وہ زندگی کے مظاہر کے بارے میں ایسے شدید اور متنوع ردِ عمل کا اظہار کیسے کر سکتا ہے؟ نیز جو شخص تماشا کا اس طور جزو بن جائے، جیسے مثلاً قدیم انسان قبائلی رقص کا حصہ بن جاتا تھا، وہ تماشائی کے منصب پر کس طرح یوں فائز ہو سکتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ غالب تماشا کو محض بچوں کا کھیل نہیں سمجھتا، گوشت پوست کی زندگی کا ایک سفر قرار دیتا ہے لیکن اس کا قلب روشن اور نگاہ تیز رکھی ہے اس لئے اسے ہمہ وقت اپنی "تماشائی کی حیثیت" کا عرفان بھی حاصل رہتا ہے اور یہ کوئی معمولی بات نہیں۔

[illegible] کی کرامت

غالب کا کلام جدید میزان پر

غالب اپنے عہد کا ایک عظیم تجرباتی شاعر تھا۔ اُس نے اسلوب اور معنویت دونوں اعتبار سے اس قدر متنوع اور گوناگوں تجربات انجام دیے ہیں کہ متقدمین سے لے کر متاخرین تک کوئی بھی اُس کا ہم قدم اور ہم سفر نظر نہیں آتا۔ بیسویں صدی میں جتنی بھی شعری تحریکیں معرضِ وجود میں آئیں وہ کسی نہ کسی طرح غالب کی مرہونِ منت ضرور رہیں۔ اس لحاظ سے نیاز فتح پوری کا یہ قول بڑی حد تک درست ہے کہ "اُردو شاعری میں نئے رجحانات کا سُراغ ہمیں غالب کے وقت سے ملتا ہے"۔[1]

غالب کے مطالعے کے لئے دو طریقے ہو سکتے ہیں اور میری رائے میں ان دونوں طریقوں کو بروئے کار لانا چاہیئے۔ پہلا طریقہ یہ ہے کہ غالب کے کن ذہنی عوامل نے اُس کے ان مختلف النوع اشعار کو جنم دیا، اُسے مدِنظر رکھا جائے۔ دوسرا طریقہ یہ کہ ہمارے عہد کا سماجی اور سیاسی انتشار بڑی حد تک غالب کے زمانے کے انتشار سے مشابہت رکھتا ہے اور اس لئے ہم اپنے زمانے کے انتشار کو مدِنظر رکھتے ہوئے غالب کا مطالعہ کریں اور اس سے اپنے طور پر محظوظ ہوں۔ جہاں تک شاعر کے ذہنی عوامل کا تعلق ہے، ہم غالب کے خطوط سے کسی حد تک اس کا سُراغ لگا سکتے ہیں۔ غالب کو سمجھنے کے لئے اُس کا یہ جملہ کہ "شاعری قافیہ پیمائی نہیں بلکہ معنی آفرینی ہے" بڑی حد تک ہماری رہنمائی کرتا ہے اور اُس کے ذہنی عوامل تک پہنچنے میں ممد و معاون ثابت ہوتا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے، شاعر نے معنی آفرینی کی کوشش میں کہاں کہاں تک وادیٔ خیال میں آگہی سے لے کر مرزا عرفاں تک کے مختلف مراحل طے کئے ہیں ؎

مشتاقِ طے کروں ہوں رہِ وادیٔ خیال · تا بازگشت سے نہ رہے مدّعا مجھے

غالب فطرتاً مشکل پسند واقع ہوا تھا اور یہی سبب ہے کہ ابتدائی دَور میں اُس نے بیدل کا تتبع کیا۔ کیوں کہ بیدل کے مزاج سے اس کا مزاج بڑی حد تک ہم آہنگ تھا۔ بعد میں میر کے رنگ میں اُس نے شعر کہنا شروع کیا تو سادگی کے باوجود اس کے اشعار میں ذہنی اور نفسیاتی پیچیدگی کارفرما نظر آتی ہے۔ بیسویں صدی میں چونکہ ہماری زندگی پیچیدگی کی طرف گامزن ہے اس لئے غالب کی یہ ذہنی اور نفسیاتی پیچیدگی ہی اُسے اُس عہد کے مقبول ترین شاعروں کی صفوں میں لا کر کھڑا کر دیتی ہے۔ حالاں کہ "سہلِ ممتنع" کی خوبی کو وہ شعر کا بہت بڑا حُسن تصور کرتا تھا، جیسا کہ اُس نے لکھا ہے:

"سہلِ ممتنع اس نظم کو کہتے ہیں کہ دیکھنے میں آسان نظر آئے اور اس کا جواب نہ ہو سکے۔ بالجملہ سہلِ ممتنع

---

[1] "لازوال ادب کی تخلیق" (از نیاز فتحپوری)



کمالِ حسنِ کلام ہے، و بلاغت کی نہایت ہے۔ ممتنع درحقیقت ممتنع النظیر ہے۔ خود ستائی ہوتی ہے، تاہم اگر غور کرے گا تو نظیر کی نظم و نثر میں سہل ممتنع پائے گا۔"[1]

لیکن اس کے وہ اشعار جن میں سہل ممتنع کی خوبی نہیں ہے۔ وہ بھی کسی طرح کمتر درجے کے نہیں ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے شاعر کے بیدار اور حسی تجربے ہیں جو خود بطریقِ اظہار چاہتے ہیں۔ کبھی سادگی کے ساتھ یہ خود کو ظاہر کرتے ہیں اور کبھی پیچیدگی کے ساتھ۔ یہ اور بات ہے کہ ہر تجرباتی شاعر کی طرح کبھی کبھی ہمیں غالب میں بھی EVERY NEW ATTEMPT* A FAILURE OF DIFFIRENT KIND کا احساس ہوتا ہے، لیکن احساس کے یہ بادل اس وقت چھٹ جاتے ہیں جب شاعر اپنے تجربے OBLIQUE کے انداز بیان یا یوں جوار پیش کرتا ہے۔

> ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو — بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

غالب کی شاعری قنوطیت اور رجائیت۔ رومانیت اور واقعیت۔ رندی اور تصوف۔ شوخی اور انکساری۔ اطلاع اور ابہام۔ غرض کہ مختلف متضاد کیفیتوں کا حسین و جمیل مرقع ہے۔ غالب کی آزاد طبیعت نے اسے کسی مخصوص رجحان سے مفاہمت کرنے نہیں دیا۔ یہی سبب ہے کہ اس نے زندگی کو کھلے ذہن کے ساتھ مختلف زاویوں سے دیکھا ہے اور ایک سچے فن کار کی حیثیت سے زندگی کی متضاد کیفیتوں کو اپنے فن کے دامن میں سمونے کی کوشش کی ہے۔ اس کے مشاہدات کچھ قدر وسیع تھے کہ کائنات کا ہر ذرہ اُسے دعوتِ عرفان دیتا تھا، جیسا کہ ذیل کے اشعار سے ظاہر ہے ؎

> صد جلوہ روبرو ہے جو مژگاں اٹھائیے — طاقت کہاں کہ دید کا احساں اٹھائیے
>
> کہتے ہے جلوۂ گل ذوقِ تماشا غالب — چشم کو چاہیئے ہر رنگ میں وا ہو جانا
>
> ساغرِ جلوۂ سرشار ہے ہر ذرۂ خاک — شوقِ دیدار بلا آئینہ ساماں نکلا

شاعر صرف فطرت کے مشاہدات پر قانع نہیں رہتا، بلکہ کثرتِ نظارہ سے وسیع القلبی کی دعوت دیتا ہے جس سے انسانی رشتے استوار ہوتے ہیں ؎

> حسد سے دل اگر افسردہ ہے گرمِ تماشا ہو — کہ چشمِ تنگ شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو

غرض کہ غالب نے ذہن کے تمام دروازے باز رکھے اور مختلف سمتوں سے کھلی ہواؤں کا خیر مقدم کیا۔ یہی سبب ہے کہ اُس نے ایک ہی لے میں زندگی کا راگ نہیں الاپا ہے۔ ایک خالص تجرباتی شاعر کی حیثیت سے وہ ہر مقام پر رنگ و آہنگ بدلتا رہا ہے اور غالباً یہی سبب ہے کہ اس کی شاعری کے مختلف حصوں سے مختلف آوازیں ابھرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ لیکن یہ آوازیں ایسے لامحدود آہنگوں کا امتزاج ہوتا ہے جن کا تعلق اردو اور فارسی کے قدیم کلاسیکل شعرا کے علاوہ خود ہماری تہذیب، ثقافت اور روایت سے بہت گہرا ہے اور یہی سبب ہے کہ یہ آہنگ اجتماعی لاشعور کو متاثر کرتے ہیں۔ جو لوگ موسیقی کی ہیئت سے واقف ہیں وہ لوگ جانتے ہوں گے کہ موسیقی جس قدر زیادہ تعداد میں مختلف آہنگوں کے امتزاج سے بنتی ہے اُسی قدر سُریلی اور دلکش ہوتی ہے۔ وائلن جس میں بہت سے تار ہوتے ہیں اس میں اکتارا کی موسیقی سے زیادہ دلکشی پائی جاتی ہے۔ یہی حال غالب کی شاعری کا ہے۔ اس میں آواز میں پوشیدہ لامحدود لہجے ہمارے تحت الشعور اور لاشعور کے بے شمار تجربات کو ابھارنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔

غالب کے بعض ایسے تاریخی جن کے ادبی نظریوں میں بُعد المشرقین ہے وہ بھی غالب کی عظمت کے قائل ہیں اور اس کا سبب



غالباً یہ ہے کہ غالب کے کلام میں ہر تعص کو کم ہو یا بیش، اپنے مطلب کی چیز مل جاتی ہے۔ ایک طرف اگر اس کی شاعری میں خود ساتیت کا یہ عالم ہے کہ وہ دن رات تصورِ جاناں کئے ہوئے بیٹھے رہنا چاہتا ہے؎۱ تو دوسری طرف واقعیت کا عالم یہ ہے کہ محبوب کے سوا بھی شاعر پر بہت سے ستم ہوئے ہیں جس کی تلافی محبوب کی وفا سے ممکن نہیں؎۲۔ ایک طرف اگر شاعر کے ذوقِ گناہ کا یہ عالم ہے کہ شاعر خدا سے ناکردہ گناہوں کی حسرت کی داد چاہتے ہوئے؎۳ اپنا دامن معاصی کے ہفت دریا سے بھرنا چاہتا ہے؎۴ جس سے بالآخر دریائے معاصی بھی خشک ہو جاتا ہے؎۵، تو دوسری طرف اس کی شرمندگی کا عالم ملاحظہ فرمائیے

[illegible] ۱ رحمت اگر قبول کرے کیا بعید ہے — شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا

ایک طرف اگر غالب کے یہاں

دھوتا ہوں جب میں پینے کو اس سیم تن کے پاؤں — رکھتا ہے ضد سے کھینچ کے باہر لگن کے پاؤں

جیسے روایتی استعارے نظر آتے ہیں جن کی تعداد نسبتاً کم ہے، وہیں ایسے پیکری (Imagist) استعارے بھی کثرت سے ملتے ہیں جیسے

دھمکی میں مر گیا جو نہ بابِ نبرد تھا — عشقِ نبرد پیشہ طلبگارِ مرد تھا

وہ کیا کہ ظالم کہ کیا نورِ چراغِ کشتہ ہے — نقشِ بیمار و فادودِ چراغِ کشتہ ہے

چاہے سائنس کی دنیا میں ہو یا شعر و ادب کی دنیا میں بعض ایسے ذہین لوگ ہوتے ہیں جو اپنی ذکاوت INTUITION کے ذریعے ایسی صداقت کو اپنی ذہنی گرفت میں لے آتے ہیں جس کا اُس وقت وجود نہیں ہوتا، لیکن ایک مدت گذرنے کے بعد آنے والی نسل کے سامنے اس صداقت کا انکشاف ہوتا ہے اور وہ نسل اس صداقت کو پہچاننے میں کامیاب ہوتی ہے۔ غالب کا شمار بھی ایسے ہی ذہین لوگوں میں ہوتا ہے، حالاں کہ مغربی ادب میں انیسویں صدی کے آخری حصے میں علامت پسندی Symbolism اور بیسویں صدی کے آغاز میں پیکریت Imagism کی تحریک معرضِ وجود میں آئی، لیکن اس سے نصف صدی قبل اُردو کے اس شاعر نے اپنی فطری ذکاوت کی مدد سے علامت پسندی اور پیکریت پر مختلف قسم کے تجربے انجام دے کر جس طرح اُن کے سارے امکانات کو روشن کیا ہے وہ ہمیں حیرت میں ڈال دیتا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ انھوں نے اپنے زمانے میں ایسے بھی شعر کہے ہیں جن کی قدر و قیمت اشتراکی واقعیت کے عروج کے بعد اور بڑھ گئی۔ غرض کہ اپنے زمانہ استثنائی عکاسی کرتے ہوئے غالب نے اپنی فطری ذکاوت کی مدد سے سو سال کے بعد کے ذہنی انتشار کو اپنے دامن میں سمو لیا تھا۔ "مستقبل کے مسائل" کا عرفان کسی بھی ذہین مفکر کے لئے آسان ہے، لیکن غالب کی خصوصیت اس میں ہے کہ اس کی سو سال قبل کی شاعری "جدید ذہن" کی عکاسی کرتی ہے اور اسے جدید شاعری کے امام کا درجہ عطا کرتی ہے۔

ترقی پسند شاعری کے زمانے میں جب شاعری عوام کے مسائل سے وابستہ ہو گئی تو مزدور اور دہقان کو شاعری میں اہمیت دی جانے لگی، اس لئے اس زمانے میں غالب کے ذیل کے اشعار کو مقبولیت حاصل ہوئی۔

دیوار بارِ منّتِ مزدور سے ہے خم — اے خانماں خراب نہ احساں اُٹھائیے

---

۱ جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن — بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کئے ہوئے

۲ تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں — تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

۳ ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد — یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

۴ بقدرِ حسرتِ دل چاہیئے ذوقِ معاصی بھی — بھروں یک گوشۂ دامن گر آبِ ہفت دریا ہو

۵ دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک — میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا



مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

کارگاہِ ہستی میں لالہ داغِ ساماں ہے
برقِ خرمنِ راحت، خونِ گرمِ دہقاں ہے

رنگِ لیلیٰ کو خاکِ دشتِ مجنوں رنگینی بخشے
اگر بووے بجائے دانہ دہقاں نوک نشتر کی

ترقی پسندی کے دور میں غمِ عشق کے مقابلے میں غمِ روزگار کی اہمیت کا احساس ہونے لگا لیکن اس کا سُراغ ہمیں غالب کے اس شعر میں مل جاتا ہے ؎

غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غمِ عشق گر نہ ہوتا، غمِ روزگار ہوتا

ہندوستان کی جنگِ آزادی کے دوران شاعری میں "دار و رسن" کی ترکیب کو جدوجہد کی علامت کی حیثیت سے پیش کیا جانے لگا۔ بعض ترقی پسندوں نے رومانیت کے پس پردہ ٹھوس واقعیت کا درس دینے کا رویّہ اختیار کیا۔ اسی رویّے کا سُراغ ہمیں غالب کے اس شعر میں ملتا ہے ؎

قد و گیسو میں قیس و کوہکن کی آزمائش ہے
جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

ترقی پسندی کے بعد اُردو کی تجرباتی شاعری نے جو رنگ اختیار کیا اُس میں موجودہ حیات کی تنہائی۔ ویرانی۔ ناامیدی اور زندگی کی کشمکش کو عروج حاصل ہے۔ اِس وقت بین الاقوامی ادب میں جس طرح کی شاعری کو قبولِ عام حاصل ہے اُس کی نوعیت بھی تقریباً یہی ہے۔ جدید شاعر اجتماعی غم سے زیادہ فرد کے غم پر توجہ مرکوز کرنے لگا ہے اور اس کا عقیدہ ہے کہ فرد کے غم کی پُرخلوص عکاسی سے اجتماعی غم کی عکاسی بھی ہو جاتی ہے۔ غرض کہ تنہائی، بے بسی اور بے یقینی کا جذبہ دونوں جنگِ عظیم کے علاوہ موجودہ بین الاقوامی سیاسی اور سماجی بحران کا نتیجہ ہے۔ غالب کے کلام میں اُس کے اپنے دور کے سیاسی اور سماجی بحران کی عکاسی کے پس پردہ جدید ذہن کی کارفرمائی دیکھئے ؎

یہ طوفاں گاہِ جوشِ اضطرابِ شامِ تنہائی
شعاعِ آفتابِ صبحِ محشر تارِ بستر ہے

میرے غم خانے کی قسمت جب رقم ہونے لگی
لکھ دیا منجملۂ اسبابِ ویرانی مجھے

ہوئی ہے مانعِ ذوقِ تماشا خانہ ویرانی
کفِ سیلاب باقی ہے برنگِ پنبہ روزن میں

سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے
کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

رگ و پے میں جب اُترے زہرِ غم تب دیکھئے کیا ہو
ابھی تو تلخیٔ کام و دہن کی آزمائش ہے

حرکت و اضطراب موجودہ تہذیب کی ایک اہم خصوصیت ہے۔ صنعتی تہذیب کے ساتھ ساتھ کسی کو اتنی فرصت نہیں ہے کہ دوسروں کی طرف مُڑ کر دیکھے۔ ہر شخص اپنے ذاتی مسائل کی چہار دیواری میں محصور ہے۔ اس کے علاوہ موجودہ تہذیب کی تیز رفتاری ہمیں عروج یا زوال کی طرف لے جا رہی ہے اس کا پتہ نہیں چلتا۔ موجودہ تہذیب کے اس پہلو کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے غالب کے ذیل کے اشعار سے لُطف اُٹھائیے اور غور فرمائیے کہ غالب کی ذکاوت کس قدر دُور رس تھی ؎

رہی ہوں ہے یا سہ پائے ثبات کا
نے بھاگنے کی گوں نہ اقامت کی تاب ہے

ہر قدم دُوریٔ منزل ہے نمایاں مجھ سے
میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

ہوئے ہیں پاؤں ہی پہلے نبردِ عشق میں زخمی
نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے

جدید شاعر کو جب اپنے چہرے کا احساس ہونے لگا تو اُس کی نظر میں "آئینہ" کی اہمیت بڑھ گئی، کیونکہ یہی آئینہ اُس کی زبوں حالی کی غمازی کرتا ہے۔ اِسی احساس کا سُراغ ہمیں سو سال قبل کی غالب کی شاعری میں بھی مل جاتا ہے ؎

مُدعا محوِ تماشائے شکستِ دل ہے
آئینہ خانے میں کوئی لئے جاتا ہے مجھے



جدید شاعر کی ویرانی کے احساس کا یہ عالم ہے کہ اُس کا اپنا سایہ تک اُس کا ساتھ نہیں دیتا۔ جدید ذہن کے اس احساس کی ترجمانی غالب کے کلام میں ملاحظہ فرمائیے ـ

[illegible] مجھ سے مثلِ دُود بھاگے ہے پاس مجھ آتش بجاں کے کس سے ٹھہرا جائے ہے
وحشتِ آتشِ دل سے شبِ تنہائی میں صورتِ دُود رہا سایہ گُریزاں مجھ سے

جدید ذہن کے ان تمام منفی رجحانات کے باوجود اس میں عزم و عمل کا مثبت رجحان بھی موجود ہے جس کا وجود نہ ہو تو شاید انسان کا دم نکل جائے۔ کرکے گارڈ، نطشے اور ہسرل کے فلسفیانہ مفروضوں سے متاثر ہو کر جدید شاعر سوچنے لگا ہے کہ وہ اپنے ماحول کے درمیان تشکیلی دور سے گذر رہا ہے اور اپنی قوتِ ارادی کے ذریعہ اپنے تاریک ماحول سے خود کو نکال لینے کا اہل بن سکتا ہے۔ اس رجحان کا عروج ہمیں وجودیت پسندی (EXISTENTIALISM) میں ملتا ہے۔ سائنسی انکشافات اور خلائی سفر نے جدید انسان کا جس قدر حوصلہ بلند کیا ہے اس کا ذکر جدید شاعر کے لئے فطری بھی ہے اور لازم بھی۔ لیکن غالب ذیل کے شعر میں انسان کو جس بلندی پر دیکھنے کا حوصلہ رکھتا ہے وہاں تک غالباً کسی وجودیت پسند شاعر کی بھی رسائی نہیں ہوتی ہے۔

ہے کہاں تمنّا کا دُوسرا قدم یا رب ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

بیسویں صدی میں سائنس نے زمان و مکان کے باہمی تعلقات کا جو نیا تصور پیش کیا ہے وہ فلسفۂ کائنات کے لئے بہت بڑے انقلاب کی حیثیت رکھتا ہے۔ آئنسٹائن نے اپنے نظریۂ اضافیات میں ثابت کر دیا ہے کہ واقعات بالذات نہیں بلکہ اضافی حیثیت رکھتے ہیں اور زمان و مکان کا باہمی رشتہ اس قدر گہرا ہے کہ ایک کے بغیر دُوسرے کا تصوّر ناممکن ہے۔ اس لئے جدید شعرا کو اس امر کا احساس ہونے لگا ہے کہ وقت خود ہمارے اندر پیدا ہوتا ہے اور احساس کی راہوں میں ہمارے ساتھ ساتھ چلتا ہے اس لئے جدید شاعری میں وقت کے عنصر کو جتنی اہمیت حاصل ہے اس سے قبل کبھی نہیں تھی۔ لیکن غالب کی ذکاوت ملاحظہ فرمائیے کہ اس میں وقت کو اپنی ذات کے اندر جذب کر لینے کا حوصلہ پایا جاتا ہے۔

مہرباں ہو کے بُلا لو مجھے چاہو جس وقت میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں
فردا و دی کا تفرقہ یکبار مٹ گیا تم کیا گئے کہ ہم پہ قیامت گذر گئی

تعجب اس بات پر ہے کہ وقت کے گھٹنے یا بڑھنے کا تصور جو بیسویں صدی کی سائنسی تحقیقات کا نتیجہ ہے غالب کے کلام میں بھی پایا جاتا ہے ـ

ز رفتارِ عمر قطعِ رہِ اضطراب ہے اِس سال کے حساب کو برق آفتاب ہے

میر کے پرستاروں کا غالب پر سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ غالب سائینٹفک ذہن رکھتا تھا جب کہ میر خالص شاعرانہ ذہن کا مالک تھا، لیکن سوال یہ ہے کہ سائینٹفک ذہن رکھنا تخلیقِ شعر کا مانع نہیں ہوتا۔ عالمِ موجودات کی حقیقتوں سے شاعر کی تعمیری خودی (CREATIVE SELF) ہمیشہ متاثر ہوتی ہے لیکن ماقبلِ شعور (PRECONSCIOUS) اور منوّر ادراک (ILLUMINATING INTELLECT) کے زیرِ اثر شاعر کے ذہن میں شعر کا جو تخلیقی عمل معرضِ وجود میں آتا ہے وہ سراسر غیر سائنسی ہے۔ اس اعتبار سے غالب کے اشعار سائینٹفک صداقتوں پر مبنی ہونے کے باوجود خالص شاعرانہ ردِ عمل کے نتائج ہیں۔ غالب کی شاعری اپنی ذات سے نکل کر ساری کائنات کا احاطہ کرتے ہوئے پھر اپنی ذات کی طرف لوٹ آتی ہے۔ اس طرح اس کے نزدیک خارجیت اور داخلیت کا مصنوعی فرق ختم ہو جاتا ہے اور اس کی شاعری ایک ایسے تصوّف کی بلندی تک پہنچ جاتی ہے جہاں شہود و شاہد و مشہود کے درمیان فرق باقی نہیں رہتا۔ [1]

[1] اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں



غالب کے بعض اشعار سائنٹفک صداقتوں پر مبنی ہیں۔ اور اس لئے ان سائنٹفک صداقتوں کے پیشِ نظر اُن کا مطالعہ کیا جائے تو ہم بطورِ خاص لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ اُن کا یہ شعر لیجئے

مری تعمیر میں مضمر ہے صورت اک خرابی
ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

یہاں شاعر یہ کہنا چاہتا ہے کہ دہقاں کی میکانکی قوت (MECHNICAL ENERGY) قوتِ حرارت (HEAT ENERGY) میں تبدیل ہو جاتی ہے اور قوتِ حرارت قوتِ برق (ELECTRICAL ENERGY) میں تبدیل ہو کر بالآخر تخریب کا باعث بنتی ہے۔ یہاں جو ایک قوت کا دوسری قوت میں تبدیل ہونا بتلایا گیا ہے وہ سو فیصدی سائنٹفک صداقت ہے اور ہمیں تعجب ہے کہ غالب جو سائنسی علوم سے ناواقف تھا، کس طرح اس نے اپنی فطری ذکاوت کی مدد سے اس صداقت کا عرفان حاصل کر لیا۔ ذیل کا شعر بھی اسی نوعیت کا ہے

کارگاہِ ہستی میں لالہ داغ ساماں ہے
برقِ خرمنِ راحت خونِ گرمِ دہقاں ہے

بعض احباب کہہ سکتے ہیں کہ غالب کے ان اشعار میں زبردستی سائنٹفک معنی پہنانے کی کوشش کی گئی ہے، ورنہ شاعر کے ذہن میں کچھ اور معنی ہو سکتے ہیں لیکن "رقعاتِ عودِ ہندی" میں مندرجۂ بالا شعر سے متعلق خود غالب کی اس وضاحت کے بعد شک و شبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی

" داغ ساماں۔ مثلِ انجم انجمن۔ وہ شخص کہ داغ جس کا سرمایہ و ساماں ہو۔ موجودیت لالہ کی منحصر نمائش داغ پر ہے ورنہ رنگ تو اور پھولوں کا بھی لال ہوتا ہے۔ بعد اس کے سمجھ لیجئے کہ پھول کے درخت یا غلّہ جو کچھ بویا جاتا ہے دہقان کو جوتنے بونے پانی دینے میں مشقت کرنی پڑتی ہے اور ریاضت میں لہو گرم ہو جاتا ہے۔ مقصود شاعر کا یہ ہے کہ وجود محض رنج و عذاب ہے۔ مزارع کا وہ لہو جو کشت و کار میں گرم ہوا ہے، وہی لالہ کی راحت کے خرمن کا برق ہے، حاصلِ موجودیتِ داغ اور داغ منافی راحت اور صورتِ رنج عجیب "

غرض کہ سائنٹفک صداقتوں کا عرفان غالب کی اُفتادِ طبع اور ذکاوتِ فطری سے تعلق رکھتا ہے جیسا کہ میں نے کہا ہے ذکاوتِ فطری کی مدد سے ذہین مفکروں کے لئے سائنسی دنیا میں بھی پیشین گوئی ممکن ہے اور شعر و ادب کی دنیا میں بھی۔ لیکن سائنسی دنیا میں صداقت کی پیشین گوئی جس قدر آسان ہے، شعر و ادب میں صداقت کی پیشین گوئی اسی قدر مشکل۔ بفرضِ محال اگر وہ سائنسی صداقتیں جن پر غالب کے ایسے اشعار کی اساس ہے، آگے چل کر غلط ثابت ہوں (جیسا کہ عموماً سائنسی صداقتوں میں ہوتا ہے) تو اس سے غالب کے شعر کی اہمیت میں کوئی فرق نہیں پڑے گا، کیوں کہ سائنس کا تعلق اسی مادی دنیا سے ہے جب کہ شاعری کی کامیابی کا انحصار مابعدالطبیعاتی تجربات سے ہے

غالب کا یہ شعر لیجئے

چھوڑا مہِ نخشب کی طرح دستِ قضا نے
خورشید ہنوز اس کے برابر نہ ہوا تھا

خورشید کو مہِ نخشب کے ساتھ تشبیہ دے کر شاعر نے سورج کو ایک نامکمل تتمے کی حیثیت سے پیش کیا ہے اور دستِ قضا کی ترکیب کے ساتھ سورج کے DECAY ہونے کا تصور وابستہ ہے۔ یہ ایک سائنسی صداقت ہے کہ سورج زوال آمادہ ہے۔

غالب کا ایک اور شعر لیجئے

نقل کرتا ہوں اسے نامۂ اعمال میں میں
کچھ نہ کچھ روزِ ازل تم نے لکھا ہے تو سہی

سائنس کے نظریۂ اضافیات کے اعتبار سے اس شعر کی تشریح یوں ہوتی ہے کہ چہار ابعادی (FOUR DIMENSIONAL) کائنات میں ہر واقعہ ایک نقطے کی حیثیت رکھتا ہے اور کائنات کی لکیر (WORLD LINE) انہیں نقطوں میں سے ہو کر گزرتی



ہے یعنی روزِ ازل سے جہاد جمادی کائنات کی ہر شے ایک خطے سے شکل میں متعین ہے اور شاعر اسے گویا نامۂ اعمال میں اُتار رہا ہے۔ آئنسٹائن کے مندرجۂ بالا نظریے سے اقبال کو اس لئے اختلاف تھا کہ اگر ہر واقعے کو روزِ ازل سے متعین شدہ تصور کر لیا جائے تو انسان کی قوتِ ارادی کی کچھ اہمیت باقی نہیں رہتی۔ بہرکیف یہ نظریاتی اختلاف دراصل سائنٹفک اور فلسفیانہ ذہن کا اختلاف ہے۔ غالب کا تصور آئنسٹائن کے سائنسی تصور سے مطابقت و مناسبت رکھتا ہے۔

غالب کا یہ شعر لیجئے ؂

از مہر تا بہ ذرّہ دل و دل ہے آئینہ طوطی کو شش جہت سے مقابل ہے آئینہ (۱)

اس شعر میں شاعر یہ کہنا چاہتا ہے کہ آفتاب سے لے کر ذرّے تک رُخ و رُخ اور دل و دل ہر ایک چیز آپس میں آئینہ ہے اور ایک کو دوسرے میں اپنی ہی صورت نظر آتی ہے۔ یہاں جو ذہنی پیکر پیش کیا گیا ہے اس سے لطف اندوز ہونے کے لئے سائنس کے اس تجربے (EXPERIMENT) کو مدِنظر رکھنا چاہئے کہ دو مساوی آئینوں کے درمیان اگر ایک قندیل روشن ہو تو ایک میں دوسرے کا عکس پڑنے کی وجہ سے لامحدود تعداد میں قندیلیں نظر آئیں گی اور آئینوں کی لامحدود شبیہیں ایک دوسرے میں مل کر گڈمڈ ہو جائیں گی۔ یہاں لفظ "طوطی" ایک علامت (SYMBOL) کی حیثیت رکھتا ہے لیکن فرانسیسی زبان کے علامت پسند شعرا کی طرح نہایت شخصی اور ذات پر مرکوز۔ غالب کے ان اشعار سے

تا کجا عمر پہ کھلے انکار ہوائے صیقل دیکھ برسات میں سبز آئینے کا ہو جانا (۲)

اہلِ بینش نے بہ حیرت کدۂ شوخیٔ ناز جوہرِ آئینہ کو طوطیٔ بسمل باندھا (۳)

ہمیں یہ اشارہ ملتا ہے کہ شاعر کے ذہن میں فولادی آئینہ تھا جو برسات کے موسم میں زنگ لگنے کی وجہ سے سبز ہو جاتا تھا اور اس لئے اس کے جوہر کو بطور پر طوطی کے ساتھ تشبیہہ دے سکتے ہیں، لیکن اکثر شارحین کا خیال ہے کہ شعر (۱) میں طوطی سے مُراد محض جوہرِ آئینہ نہیں بلکہ مردِ عارف ہے جس کی نظر میں سارا عالم ذاتِ واحد سے اتحاد رکھتا ہے اور کوئی اس کا غیر نہیں ہے۔ چوں کہ طوطی کی علامت نہایت شخصی ہے اس لئے ہر شخص کو اپنے طور پر مطلب نکالنے اور اس سے لطف اندوز ہونے کا حق حاصل ہے۔ اسی اعتبار سے میری نظر میں "طوطی" علامت ہے "روح" کی۔ کیوں کہ عموماً جسم کے اندر روح کے مقید ہونے کو پنجرے کے اندر طوطی کے مقید ہونے سے تعبیر کرتے ہیں۔

آئینہ سے متعلق ایک اور شعر ملاحظہ فرمائیے ؂

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسدؔ ڈرتا ہوں آئینہ سے کہ مردم گزیدہ ہوں

یوں سوچئے کہ شاعر جو حیرتی کا شکار ہے، اُس کے دل میں اپنے کھوئے ہوئے چہرے کو پھر سے پانے کی تڑپ ہے۔ اسی تڑپ سے مجبور ہو کر جب وہ آئینہ دیکھتا ہے تو آئینے میں اپنی مسخ شدہ شکل دیکھ کر ڈر جاتا ہے۔ اُس کی حالت اسی طرح قابلِ رحم ہوتی ہے جس طرح ایک کتے کا کاٹا ہوا مریض پیاس کی شدت سے پانی مانگتا ہے لیکن پانی دیکھتے ہی اُسے ڈر لگتا ہے اور اسی پیاس کی شدت میں آخرکار وہ تڑپ تڑپ کر دم توڑ دیتا ہے۔ اس شعر میں جس احساساتی تڑپ کی عکاسی ہوئی ہے وہ جدید ذہن کے نفسیاتی اضطراب سے بڑی حد تک قریب ہے۔ HYDROPHOBIA پر کسی بھی زبان میں ایسا شعر میری نظر سے نہیں گذرا۔ یہاں یہ بات خاص طور پر قابلِ غور ہے کہ غالب نے MEDICAL SCIENCE سے بھی اپنی شاعری کے لئے ذہنی پیکر اخذ کئے ہیں۔ غرض کہ گوناگوں ذہنی پیکروں کے استعمال میں غالب نے اس قدر اپنی ذہانت اور فطانت کا ثبوت دیا ہے کہ انہیں بجا طور پر پیکری شعرا (IMAGIST POETS) میں ایک امتیازی درجہ عطا کیا جا سکتا ہے۔ اُس نے



جن ذہنی پیکروں کا استعمال کیا ہے وہ صرف ہمارے حواس خمسہ سے وابستہ ادراک (SENSORY PERC[illegible]) کا خیال پیدا نہیں کرتے، بلکہ ان پیکروں سے وابستہ جذباتی کیفیات کی موجیں ہمارے تحت الشعور اور لاشعور کی مختلف سطحوں سے لامحدود تجربات کو ابھار لانے کی اہلیت رکھتی ہیں۔ اس طرح ہمیں ان ذہنی پیکروں میں تہہ در تہہ معنویت کا احساس ہونے لگتا ہے اس لئے ان ذہنی پیکروں کو میں MULTI-DIMENSIONAL تصور کرتا ہوں۔ غالب کے کلام میں اکثر جگہ جذباتی کیفیات کی مختلف لہروں کے باہمی امتزاج سے سالم کلیت پیدا ہوتی ہے۔ البتہ بعض جگہوں پر اسی سالم کلیت کے فقدان کے سبب اس کا شعر ناکامیاب ہو جاتا ہے لیکن ایک خالص تجرباتی شاعر ہونے کے ناطے یہ ناکامیاں ایسی ہیں جن پر ہزاروں کامیابیاں قربان ہو جائیں۔

غالب نے بعض اشعار میں ایک طرح کی حس سے وابستہ ذہنی پیکر کو دوسری طرح کی حس سے وابستہ ذہنی پیکر کے ساتھ ملا کر امتزاجیت (SYNESTHESIA) کا تجربہ انجام دیا ہے جس کے مطالعے سے ہمارا ذہن و شعور ایک نئی قسم کے جذباتی تجربات سے دوچار ہوتا ہے۔ ذیل کا شعر ملاحظہ فرمائیے ؎

چشم خوباں خامشی میں بھی نوا پرداز ہے
سرمہ تو کہہ دے کہ دودِ شعلۂ آواز ہے

یہاں "شعلہ" سے وابستہ ذہنی پیکر کا تعلق "بصارت" سے ہے اور "آواز" سے وابستہ ذہنی پیکر کا تعلق سماعت سے ہے۔ ان دونوں کیفیتوں کے امتزاج سے جو نئی کیفیت پیدا ہوتی ہے اس کا تعلق اس مرئی کائنات سے نہیں بلکہ مابعد الطبعی تجربات سے ہے۔ غالب کے ہم عصر شاعر مومن نے بھی شعلہ اور آواز ان دونوں اشیاء کی دو مختلف کیفیتوں کو بیک وقت یکجا پیش کر کے امتزاجیت کا تجربہ انجام دیا ہے مثلاً ؎

اس غیرتِ ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

لیکن غالب کی خصوصیت اس میں ہے کہ تجریدی عمل (ABSTRACTION) میں وہ ایک قدم اور آگے بڑھ جاتا ہے اور "دودِ شعلۂ آواز" کی ترکیب سے ہمارے ذہن کو بعض نامعلوم تجربات کی عمیق ترین تہوں تک پہنچا دیتا ہے۔ اسی نوعیت کا ایک اور شعر ملاحظہ فرمائیے ؎

ڈھونڈے ہے اس مغنی آتش نفس کو جی
جس کی صدا ہو جلوۂ برقِ فنا مجھے

اس شعر میں "صدا" اور "جلوۂ برقِ فنا" ان دونوں ذہنی پیکروں سے وابستہ دو متضاد کیفیتوں کے حسین و جمیل امتزاج سے ہمارے ذہن میں ایک نئی قسم کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ اس شعر میں امتزاجیت پر جو تجربہ کیا گیا ہے اس کی نوعیت "دودِ شعلۂ آواز" سے مختلف ہے کیونکہ "دود"۔ "شعلہ" اور "آواز" ان سب کا تعلق کسی نہ کسی SENSORY ORGAN سے ہے جبکہ جلوۂ برقِ فنا کا وجود صرف ایک خیالی دنیا میں ممکن ہے مرئی دنیا میں نہیں۔

یہاں خاص طور پر یہ کہنا چاہوں گا کہ کسی بھی ذہنی پیکر کی کامیابی کا اس وقت تک اندازہ لگایا نہیں جا سکتا جب تک کہ پورے شعر کے مجموعی تاثر کو پیش نظر رکھ کر اس ذہنی پیکر کا مطالعہ نہ کیا جائے۔ اس اعتبار سے بھی غالب کے اکثر ذہنی پیکر کامیاب نظر آئیں گے، کیونکہ عموماً یہ نادر ذہنی پیکر کیفیات کے ابلاغ میں جذبات کی اضافی سرِاوانی کا حق ادا کرتے ہیں۔

ذیل میں چند ایسے اشعار مثال کے طور پر پیش کر رہا ہوں جن کے مطالعے سے غالب کے ذہنی پیکروں کے کینوس کی بے پناہ وسعت و پہنائی کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے ؎

پیکرِ عشاق سازِ طالعِ ناساز ہے
نالہ گویا گردشِ سیارہ کی آواز ہے



وہ گُل جس گلستاں میں جلوہ فرمائی کرے غالبؔ
چٹکنا غنچۂ گل کا صدائے خندۂ دل ہے

گِرہ ہوں میں شکوہ سے یوں راگ سے جیسے باجا
اک ذرا چھیڑیئے پھر دیکھیئے کیا ہوتا ہے

رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو وہ اگر شرار ہوتا

اس شمع کی طرح سے جس کو کوئی بجھا دے
میں بھی جلے ہوؤں میں ہوں داغِ ناتمامی

آگ سے پانی میں بجھتے وقت اُٹھتی ہے صدا
ہر کوئی درماندگی میں نالے سے ناچار ہے

نہ گُلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز

بیاں کس سے ہو ظلمت گستری میرے شبستاں کی
شبِ مہ ہو جو رکھ دیں پنبہ دیواروں کے روزن میں

یارب مجھے زمانہ مٹاتا ہے کس لئے
لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

سیاہی جیسے گر جاوے دمِ تحریر کاغذ پر
مری قسمت میں یوں تصویر ہے شبہائے ہجراں کی

کس کا سُراغِ جلوہ ہے حیرت کو اے خدا
آئینہ فرشِ شش جہتِ انتظار ہے

ہے ذرّہ ذرّہ تنگیِ جا سے غبارِ شوق
گر دام یہ ہے وسعتِ صحرا شکار ہے

بے پردہ سوئے وادیٔ مجنوں گذر نہ کر
ہر ذرّے کے نقاب میں دل بیقرار ہے

جوہرِ آئینہ ساں مژگاں بدل آسودہ ہے
قطرہ جو آنکھوں سے ٹپکا سو نگہ آلودہ ہے

ہاتھ دھو دل سے یہی گرمی گر اندیشہ میں ہے
آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلا جائے ہے

تجھ سے قسمت میں مری صورتِ قفلِ ابجد
تھا لکھا بات کے بنتے ہی جُدا ہو جانا

لپٹنا پرنیاں میں شعلۂ آتش کا آساں ہے
ولے مشکل ہے حکمت دل میں سوزِ غم چھپانے کی



چار موج اٹھتی ہے طوفانِ طرب سے ہر سو — موجِ گل، موجِ شفق، موجِ صبا، موجِ شراب

موجۂ گل سے چراغاں ہے گزرگاہِ خیال — ہے تصور میں زبس جلوہ نما موجِ شراب

ایک عالم پہ ہیں طوفانیٔ کیفیتِ فصل — موجۂ سبزۂ نوخیز سے تا موجِ شراب

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں — ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

ہوں گرمیٔ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج — میں عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ ہوں

ایک بات قابلِ غور ہے کہ فارسی کی ترکیبِ اضافت سے غالب کو نئے نئے ذہنی پیکر تراشنے میں بڑی مدد ملتی تھی۔ انہیں فارسی ترکیبوں کی بدولت غالب کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معنویت سمو کر ذہنی پیکروں میں شدت (INTENSITY) پیدا کرنے میں کامیاب ہوا تھا۔

غالب نے محض معنویت ہی میں نہیں بلکہ اسلوب میں بھی بہت سے نادر تجربے انجام دئیے ہیں۔ اس لئے اسلوب کے اعتبار سے بھی جدید رجحانات کا سراغ ہمیں غالب کے کلام میں ملتا ہے۔ اس نے ذیل کے مصرعوں میں

"میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں"
"بات کچھ سر تو نہیں ہے کہ اٹھا بھی نہ سکوں"
(زہر) کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں" –

میں منفی موازنہ (NEGATIVE COMPARISION) کا طریقہ اپنایا ہے۔ بعض اشعار میں غالب نے خود تضادی (SELF CONTRADICTION) کے طریقے پر بات سے بات پیدا کرنے کی کوشش کی ہے مثلاً

ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے — مرتے ہیں ولے ان کی تمنا نہیں کرتے
دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے — میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

انسانی نفسیات کے گہرے مطالعے کے لئے شیکسپیئر کو ایک منفرد حیثیت حاصل ہے۔ غالب اردو کا واحد شاعر ہے جسے فطرتِ انسانی کا کامیاب ترجمان ہونے کی حیثیت سے شیکسپیئر کا ہم پلہ تصور کیا جاسکتا ہے۔ ذیل کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے جن میں غالب ایک ماہرِ نفسیات اور عکاسِ فطرت کی حیثیت سے ہمیں نظر آتا ہے۔

گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے — رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے
رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج — مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہوگئیں
قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم — گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو
خیالِ مرگ کب تسکیں دلِ آزردہ کو بخشے — مرے دامِ تمنا میں ہے اک صیدِ زبوں وہ بھی
ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال — ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو
موت کا ایک دن معین ہے — نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

شاعر بمبئی

غالب نمبر ۶۹ء



منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید — نا اُمیدی اُس کی دیکھا چاہیے

جہاں موسیقی کے متعلق شیکسپیئر نے کہا ہے

THR MAN THAT HATH NO MUSIC IN HIRSELF

NOR IS NOT MOVED WITH CONCORDS OF SWEE

FIT FOR TREASONS, STRATAGEMS AND SPOI

وہیں غالب کا یہ شعر ملاحظہ فرمائیے ؎

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو — جو مے و نغمہ کو اندوہ رُبا کہتے ہیں

شیکسپیئر کے لہجے میں تُندی اور تیزی ہے جب کہ غالب کے لہجے میں دھیما پن ہے اور وہ اپنے جذبات پر پُوری طرح قابو پانے میں کامیاب ہوا ہے۔

غالب نے شاعری کے میدان میں کہیں کہیں ٹھوکریں بھی کھائی ہیں اور پھر وہ ٹھوکریں کھا کر سنبھلنے میں کامیاب بھی ہوا ہے۔ اُس کے بعض اشعار میں اگرچہ ابہام ہے تو بعض اشعار میں قابلِ گرفت حد تک ابہام موجود ہے حالانکہ ابلاغ کے متعلق خود غالب کا نظریہ ہے کہ

دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اُس نے کہا — میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

لیکن خود اُس کے بہت سے اشعار اس معیار پر پُورے نہیں اُترتے، مثلاً غالب کے اس شعر میں ؎

رہا آباد عالم اہلِ ہمّت کے نہ ہونے سے — بھرے ہیں جس قدر جام و سبو میخانہ خالی ہے

"اہلِ ہمّت" ایک ایسی ترکیب ہے جو ابلاغ میں رُکاوٹ پیدا کرتی ہے۔ یہاں "اہلِ ہمّت" کی ترکیب بہت ہی شخصی اور ذات پر مرکوز ذہنی پیکر پیش کرتی ہے SELF CENTRED جو عام قاری کی گرفت سے باہر ہے اس لئے اس میں "میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے" والی بات کہاں رہا

غالب کا ایک اور شعر لیجئے ؎

لے گئی ساقی کی نخوت قلزم آشامی مری — موجِ مے کی آج رگ مینا کی گردن میں نہیں

پہلے مصرع میں "لے گئی" کا فاعل "ساقی کی نخوت" ہے یا "قلزم آشامی"۔ پہلی نظر میں اس کا اندازہ نہیں ہوتا۔ "ساقی" "قلزم آشامی" اور "نخوت" جیسے ذہنی پیکر سے وابستہ کیفیات کی موجیں "مینا کی گردن" سے وابستہ کیفیات کی لہروں کے ساتھ مل کر سالم کیفیت کی شکل اختیار نہیں کرتیں۔

غالب کا یہ شعر لیجئے ؎

فشارِ تنگیٔ خلوت سے بنتی ہے شبنم — صبا جو غنچے کے پردے میں جا نکلتی ہے

اس شعر میں معنی آفرینی بھی ہے اور نازک خیالی بھی۔ یہ ضرور ہے کہ "فشارِ تنگیٔ خلوت" "شبنم" "صبا کا غنچے کے پردے میں جا نکلنا" وغیرہ ذہنی پیکر سے وابستہ معنوی کیفیات آپس میں مل کر سالم کلّیت کی شکل اختیار کرتی ہیں لیکن کیفیات کے ابلاغ میں جذبات کی اضافی فراوانی کا فقدان نظر آتا ہے۔ معنی آفرینی کی تلاش میں شاعر نے محض تکلف اور تصنع سے کام لیا ہے جس کا ہماری زندگی سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں۔ کم از کم اس شعر میں

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں — خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

کی طرح HUMAN TOUC نہیں۔ بہرکیف غالب کے کامیاب اشعار اُس کے ناکامیاب اشعار پر بہت بھاری ہیں اور بلند قامت شاعروں کی صفوں میں کھڑا کر دیتے ہیں۔

(باقی صفحہ ۲۶۲ پر دیکھئے)

بشیر نواز

اُردو شاعری کے دو رجحانات (میر و غالب)

غالب نے ڈھائی اشعار میں میر کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ ایک شعر میں ناسخ کے مصرع پر مصرع لگا کر اور دو مکمل اشعار میں ؎

غالب اپنا بھی عقیدہ ہے بقولِ ناسخ — "آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں"
ریختہ کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب — کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا
میر کے شعر کا احوال کہوں کیا غالب — جس کا دیوان کم از گلشنِ کشمیر نہیں

پھر ذوق و غالب کا وہ مشہور واقعہ ہے جس میں غالب نے از راہِ مذاق ذوق کو سودا کی تعریف کی وجہ سے سودائی اور خود کو میری کہا تھا۔ اس کے باوجود غالب کے کلام پہ میر کا اثر نہ ہونے کے برابر ہے اور یہ بات بڑی تعجب خیز معلوم ہوتی ہے کہ غالب ایسے اتنے قریبی اور عظیم پیش رو سے متاثر ہونے کی بجائے فارسی کے متاخرین اور بعض اوسط یا اس سے بھی کم درجے کے شعرا سے متاثر ہوئے۔ اوسط درجے کے شعرا سے میری مراد بیدل۔ عرفی، نظیری اور طالب آملی نہیں ہیں۔ غالب ان سے تو متاثر ہوئے ہی، اس کے ساتھ ساتھ شوکت، علی اور ناصری وغیرہ کے رنگِ سخن پر بھی اُن کی نگاہیں پڑتی رہی ہیں۔

میر کے بارے میں جو شعر غالب کے ہیں اُن میں بھی وہ عقیدت اور نیازمندی نہیں ملتی جو بیدل کے تعلق سے اُن کے اشعار میں یا میر کے تعلق سے ناسخ کے مصرع یا ذوق کے اس شعر میں نظر آتی ہے ؎

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب — ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

اس کی دو ہی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ غالب میر کی عظمت کے یا تو سرے سے معترف ہی نہ تھے یا ان دونوں کا مزاج اور مذاقِ شعری ایک دوسرے سے قطعی مختلف تھا۔ پہلی بات میں زیادہ وزن اس لئے نظر نہیں آتا کہ واقعہ اگر یوں ہوتا تو غالب اس کا برملا اظہار کر دیتے، کیونکہ انہوں نے اکثر فارسی کے ایسے شعرا کے بارے میں جن کا اس زمانے میں طوطی بولتا تھا، کافی سخت رائیں دی ہیں۔ وہاں تو "میاں فیضی کی بھی کبھی کبھی ٹھیک نکل جاتی ہے" تک معاملہ پہنچ چکا تھا۔ اب رہ جاتی ہے دوسری بات اور اس پر تفصیلی انداز میں گفتگو کر کے ہی ہم کسی نتیجے سے قریب ہو سکتے ہیں۔

مزاج کے اعتبار سے میر و غالب میں باوجود بیسیوں قدرِ مشترک نظر آتی ہے۔ میر کو بھی اپنی عظمت اور بڑائی کا احساس ہے اور غالب کو بھی۔ دونوں کو اپنے آپ پر مکمل بھروسہ ہے اور دونوں ہی اپنے آپ کو اپنے دور سے کچھ آگے اور اونچا سمجھتے ہیں، لیکن بہ نظرِ غائر دیکھنے سے دونوں شعرا کے مزاج اور رویے میں زمین آسمان کا فرق نظر آتا ہے اور یہ فرق ہی ان کی الگ



الگ ماحول میں متعین کر کے اُن کے نظریۂ فن اور شعری رویّے کو ایک دوسرے سے قطعی مختلف بنا دیتا ہے۔
میر نے جس ماحول اور جن حالات میں پرورش پائی، اُس میں منکسر المزاجی۔ توکل۔ استغنا۔ فقیری و درویشی اور صافی العشق ہو جانا قدرِ اوّل تھا۔ برخلاف اِس کے غالب نے ایک جاگیردار گھرانے اور معاشرے میں آنکھ کھولی جہاں دنیاوی عزت و عظمت، درباری اعزازات اور اپنی شخصیت تسلیم کرنا اور کرانا بنیادی اہمیت رکھتا تھا۔ پھر غالب کی رگوں میں ماورا النہری لہو رواں اور اُن کا پیشۂ آبا سو پشت سے سپہ گری تھا، جس کا انہیں آخر دم تک احساس رہا۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے ہاں اولیت اُن کی اپنی ذات کو حاصل رہی جب کہ میر اپنے آپ کو فنا کی منزل تک پہنچا معراج بندگی سمجھتے رہے

"ہم کہ ہیں یاں کو بھی ہم شور جاتے ہیں"

میر کو اپنی عظمت کا احساس محض اپنی ذات کی وجہ سے نہیں بلکہ اِس وجہ سے ہے کہ انہوں نے محبت کے بعض ضوابط کر لیے ہیں اُن کو اپنے محبوب کی ذات میں ضم کر لیا ہے۔ اِس کی خواہش۔ وہ تو اِس بات پہ نازاں ہیں کہ اُن کی بندگی اور پرستش نے کسی کو خدا بنا دیا ہے

پرستش کی یاں تک کہ اے بت تجھے
نظر میں سبھوں کی خدا کر چلے

میر اپنی شخصیت کو ایک عظیم اور برتر شخصیت میں پہلے گم کر دیتے ہیں۔ اُس سے عشق میں اتنا انہماک پیدا کر لیتے ہیں کہ "من و تو" کا فرق مٹ جاتا ہے

کر میر جدا الفت گلچیں سے گل جس میں
توڑا تھا شاخ گل کو نکلی صدائے بلبل

اور پھر اُس کا ایک جزو بن جانے کی وجہ سے یا اُس سے نسبت کی وجہ سے خود بھی عظیم اور برتر بن جاتے ہیں

ہیں مشت خاک لیکن جو کچھ ہیں میر ہم ہیں
مقدور سے زیادہ مقدور ہے ہمارا

برخلاف اس کے غالب کا محور اُن کی اپنی ذات ہے۔ غالب اپنے آپ کو دوسری ذات میں ضم کر دینے کی بجائے اس کے مدِ مقابل بن جاتے ہیں اِس لیے اُن کے عشق میں "توڑا تھا شاخ گل کو نکلی صدائے بلبل" کی کیفیت پیدا ہونے کی بجائے "کیوں گرم لیتے کو کشاکش درمیاں کیوں ہو؟" والی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ غالب میر کے رویّے کے ٹھیک خلاف رویّہ اختیار کرتے ہیں، یعنی دوسری شخصیت کے تعلق سے اپنی ذات و شخصیت کی اہمیت کے بجائے اپنی ذات کی نسبت و تعلق سے دوسری شخصیت یا ذات کو تسلیم کرتے ہیں

اپنی گلی میں کر نہ مجھے دفن بعدِ قتل
میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے

چنانچہ یہ فرق دونوں شعرا کے لہجے، اندازِ بیاں، لفظوں کے انتخاب اور مزاجِ شعر میں نمایاں نظر آتا ہے۔ میر کے انداز کی سادگی و دل برشتگی۔ نرمی اور دھیمے پن کا باعث اُن کے گھرانے، والد اور اُن کے بعد میر امان کی تعلیمات کا نتیجہ ہیں جس سے وہ صغر سنی ہی میں کافی متاثر اور اچھی طرح آشنا ہو چکے تھے۔ غالب کا مزاج اپنے ماحول کی تمام تر طمطراق۔ بلند آہنگی۔ رکھ رکھاؤ اور ٹیپ ٹاپ کا پیدا کردہ ہے۔ دل آزردہ شاعر کو اُس کے حالات نے صوفیانہ سادگی، قلندرانہ استغنا اور درویشانہ طرزِ حیات کی طرف راغب کر دیا۔ چنانچہ اُس کے لہجے پر ہندی کے بھگتی شاعروں کے لہجے کی چھاپ نظر آتی ہے۔ یہ لہجہ اور رویّہ یونانی، عجمی، بدھ اور ویدانتی فلسفے کے اثرات کا نتیجہ ہے جو تصوّف کے واسطے سے میر تک پہنچا۔ جب کہ غالب اپنے ماحول، نسلی خصوصیات اور جرأت فلسفۂ حیات کے اثرات کی وجہ سے ایہامِ شاعری کو بلند لہجہ۔ نادر تشبیہات، بلندیٔ تخیل اور معنی آفرینی سے سجاتے ہیں۔ اُن کے مزاج اور افتادِ طبع کا تقاضہ ہی یہ تھا کہ وہ فارسی کے ساحروں کا اثر قبول کریں (جن کے ہاں یہی خصوصیات پائی جاتی تھیں) اور



اُن کے لہجے میں فارسی قصائد کا سا وقار پیدا ہو۔ ان شعرا کے مزاجوں اور لہجوں کا یہ فرق ان کے ہم معنی اور ایک ہی موضوع پر کہے گئے اشعار میں بھی پوری طرح باقی رہتا ہے۔[۱] یہاں ان کا مقابلہ قطعاً مقصود نہیں۔ صرف دو صاحبِ طرز شاعروں کے لہجوں اور اندازِ بیاں کے مختلف ہونے کی نشاندہی مقصود ہے) مثال کے طور پر میر کے شعر

سمجھا تو ہوگا صبحِ مبارک میں حالِ میر ۔۔۔ اِس پر بھی جی میں آوے تو دل کو لگائیے

کے مقابلے میں غالب کا مشہور قطعہ

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل ۔۔۔ زنہار گر تمہیں ہوسِ نائے و نوش ہے

. . . .

پڑھیں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ جو بات میر کہہ رہے ہیں تقریباً وہی بات غالب بھی کہتے ہیں لیکن میر کے لہجے میں ایک مسکینی اور بے یاری و لاتعلقی کا انداز ہے جیسے کہہ رہے ہوں ہمیں جو کہنا ہے کہے دیتے ہیں آگے آپ کی مرضی۔ غالب کے لہجے میں ایک قطعیت اور اصرار ہے۔ میر کے شعر میں "اِس پر بھی جی میں آوے تو" کا ٹکڑا اور غالب کے قطعے کا "زنہار"۔ دونوں کے مزاج کے فرق کو اُجاگر کرتا ہے۔ ایسے ہی کمال اور معنوی تہہ داری کا اظہار میر و غالب دونوں کے یہاں ملتا ہے لیکن یہاں بھی مزاج کی وجہ سے لفظیات اور اظہار کے انداز میں نمایاں فرق نظر آتا ہے۔

سہل ہے میر کا سمجھنا کیا ۔۔۔ ہر سخن اُس کا اک مقام سے ہے

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے ۔۔۔ جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

میر کی سادگی اور غالب کی بلند آہنگی خصوصی توجہ کی متقاضی ہے۔ میر سادگی اور راست اندازِ بیاں کے شاعر ہیں جب کہ غالب

۱۔ میر

دن فصلِ گل کے جلتے ہیں اب کے بھی جاؤ سے
دل داغ ہو رہا ہے جس کے سبھاؤ سے
کوئی تجھ سا بھی کاش تجھ کو ملے
مدعا ہم کو انتقام سے ہے
وہ دل نہیں رہا ہے نہ اب وہ دماغ ہے
جی تن میں جیسے بجھتا سا کوئی چراغ ہے
سہل ہے میر کا سمجھنا کیا
ہر سخن اس کا اک مقام سے ہے
رہی نہ گفتہ مرے دل میں داستاں میری
نہ اس دیار میں سمجھا کوئی زباں میری
آج ہمارے گھر آیا تو کیا ہے یاں جو نثار کریں
اِلّا کھینچ بغل میں تجھ کو دیر تلک ہم پیار کریں

غالب

آغوشِ گل کشودہ برائے وداع ہے
اے عندلیب چل کہ چلے دن بہار کے
عاشق ہوئے ہیں آپ بھی اک اور شخص پر
آخر ستم کی کچھ تو مکافات چاہیے
عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا
جس دل پہ ناز تھا مجھ کو وہ دل نہیں رہا
گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے
یا رب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
یا اور دیگر ایسا جو دے زباں دانے
غریبِ شہر سخن ہائے گفتنی دارد
ہے خبر گرم اُن کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا



پیچیدہ ترکیبوں کا استعمال پسند کرتے ہیں۔ سادگی کی وجہ سے میر کے شعر میں فوری اثر اندازی اور "دل چیر دیے دل دوز" والی کیفیت ملتی ہے۔ غالب کی پیچیدہ ترکیبیں ان کے شعر میں معنوی تہہ داری پیدا کرتی ہیں۔ ان کے شعر ہم کو زیادہ متاثر کرتے ہیں اور قاری کی سوچ کو مختلف امکانات کی طرف بہا لے جاتے ہیں۔ غالب کا شعر مختلف سمتوں کی نشان دہی کرتا ہے اور میر کا شعر تجربہ بیان کرتا ہے۔ اب یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ غالب کا شعر واردات نہ بننے کے باوجود کیوں متاثر کرتا ہے جب کہ ہماری تنقید کہتی ہے کہ اچھا شعر سادگی، جوش اور احساس کی شدت کی وجہ سے وجود میں آتا ہے۔ غالب کے اشعار اور ان کا عمومی تنقید کے ان معیارات کے سامنے ایک سوالیہ نشان کی طرح کھڑے ہو جاتے ہیں۔ غالب کسی واقعہ، یا تجربے کے راست اظہار کی بجائے اس کے اندرونی رشتوں اور محرکات کا پتہ لگانا چاہتے ہیں۔ اور یہیں سے میر کے اور ان کے راستے قطعی مختلف سمتوں میں مڑ جاتے ہیں۔

میر کے پاس تصوف کے پٹ یا عشق پر عقیدے کی حد تک اعتماد پایا جاتا ہے جس کی وجہ سے ان کے عشق میں سکون اور طمانیت کی فضا کا احساس ہوتا ہے۔ عشق پر ان کا راسخ عقیدہ جو تصوف کے مروجہ اصولوں پر کلی اعتماد کا نتیجہ ہے انہیں سب کچھ [illegible] سے بے نیاز ہو جانے کی سکت پیدا کر دیتا ہے۔ (یہاں تصوف کے عام اصول فنافی الشیخ (فنافی المحبوب) فنافی الرسول اور فنافی اللہ کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی کہ یہ بالکل عام ہے) ان کے پاس عشق ایسا مسئلہ آپ خود ہے جس کی کامیابی یا ناکامی ان کے نزدیک اہمیت نہیں رکھتی کہ ؎

عشق معشوق عشق عاشق ہے — یعنی اپنا ہی مبتلا ہے عشق
دلکش ایسا کہاں ہے دشمنِ جاں — مدعی ہے یہ مدعا ہے عشق

اور

"آرزو عشق مدعا ہے عشق"

جب کوئی عمل خود مدعا ہو، کسی مدعا کا ذریعہ نہ ہو تو اس میں ناکامی یا کامیابی کا امتیاز و فرق باقی نہیں رہتا۔ چاہے جانا اور مسلسل چاہتے رہنا، جلنے اور انجام سے بے نیاز ہو کر جینا سب کچھ محبت کی راہ میں اس کا حق سمجھ کر لٹا دینا میر کا تصورِ عشق اور وطیرہ ہے ؎

گرچہ وہ گوہرِ تر ہاتھ نہیں آتا لیکن — دم میں دم جب تئیں ہے اس کے طلب گار رہو

میر کو گوہرِ تر کے حصول کی فکر ہے، نہ اس کے حاصل نہ کر سکنے کا غم۔ وہ تو صرف دم میں دم جب تئیں ہے اس کے طلب گار رہنے والوں میں سے ہیں، اسی لئے وہ اپنی ناکامیوں میں بھی ایک بانکپن اور شکستوں میں بھی فتح کی شان پیدا کر لیتے ہیں۔

بڑے سلیقے سے میری بھی محبت میں — تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

نتیجے اور حاصل سے بے نیازی انہیں فتح و شکست دونوں سے بے نیاز کر دیتی ہے اور وہ صرف اس بات پر خوش رہتے ہیں کہ انہوں نے اپنی سعی و جد و جہد کر لی ؎

شکست و فتح نصیبوں سے ہے ولے اے میر — مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

یہ خود شناسی کا قدیم اور محبوب زاویۂ حیات ہے اس کی مثالیں بدھ و ویدانتی فلسفے اور اس کے توسط سے صوفیا کے ہاں مل سکتی ہیں۔ اس رویے پر بھرپور اعتماد اور اس کے نتائج کو طے شدہ اور قطعی مان کر ہی میر کی طرح کی شاعری ممکن تھی سو میر نے کی۔ لیکن غالب کا معاملہ اس کے برعکس تھا۔ وہ کسی طے شدہ نتیجے کی روشنی میں اپنے تجربات کو ترتیب دینے کے قائل نہ ہو سکتے تھے اور نہ ان کے پاس وہ راسخ العقیدگی تھی جو میر کے ہم عصروں میں عام اور غالب کے ہم عصروں میں مفقود تھی۔ اس کی وجوہ کے



لیے ہمیں اس دور کے سیاسی، سماجی حالات اور ان سے زیادہ غالب کی شخصیت اور اس شخصیت کی تعمیر و تشکیل کے عناصر پر نظر ڈالنی ہوگی۔ سیاسی سماجی حالات پر مزید کچھ لکھنا تحصیلِ حاصل ہے۔ صرف یہ اشارہ کر دینا کافی ہوگا کہ اُن کے دور کے کسی اہم شاعر کے پاس عقیدے کا وہ سرمایہ نہ بچا تھا جو اُن کے پیش رووں کے پاس تھا۔ چنانچہ ذوق نے ہیئت پرستی، مومن نے معاملہ بندی اور ناسخ نے ضلع جگت اور رعایتِ لفظی پر اپنے فن کی بنیاد رکھی۔ ان لوگوں کے نزدیک تصور برائے شعر گفتنِ خوب تھا۔

غالب ماوراء النہری، اُن کے آبا و اجداد سپاہی پیشہ جن سے مقصد کے حصول کی خواہش اور خوب سے خوب تر کی جستجو نئے نئے بیابانوں کی خاک چھنوا چکی تھی، اُن کے مزاج میں منزل کی تلاش اور منزل پر پہنچ کر سفر کی تکان کا ازالہ کرنے کی خواہش دونوں شامل تھے۔ اسی مزاج نے انہیں اور اُن کے قبیلے کے افراد میں مسلسل جد و جہد کرتے اور زندگی سے پیہم نبرد آزما رہنے کا حوصلہ پیدا کیا تھا۔ چنانچہ غالب بھی مسلسل جد و جہد اور زندگی سے نبرد آزمائی میں مصروف نظر آتے ہیں۔ انہیں کے امیج کا سہارا لیں تو غالب رخشِ عمر کے ایسے سوار دکھائی دیتے ہیں جس کے ہاتھ میں نہ باگ ہے نہ پیر رکاب میں۔ پھر بھی وہ رخشِ عمر پر اس اعتماد کے ساتھ بیٹھا ہوا ہے کہ آخر اس پر قابو پا ہی لے گا۔ یہ رخشِ عمر انہیں زندگی کے نشیب و فراز، سیدھے ٹیڑھے، آڑے ترچھے، اچھے برے راستے پر لے جاتا ہے۔ چابک سوار کی نظر سے ہر منظر گزرتا ہے اور وہ ہر منظر کا تجزیہ کر سکتا ہے۔ ان تجربوں کے ساتھ اس کی "انا" میل کھا کر اس میں وہ شانِ اعتمادی پیدا کر دیتی ہے جو کسی بیرونی فلسفے کی دین نہیں بلکہ اس کی اپنی شخصیت کا جزو ہے ؎

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے ۔ ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

وہ غالب کی زندگی کے ہر رنگ اور ہر موڑ سے آشنائی ہی ہے جو اُن کے کلام میں جلوۂ صد رنگ پیدا کر دیتی ہے اور پڑھنے والے کو ہر موڑ اور ہر رنگ کے مطابق کچھ نہ کچھ مل جاتا ہے۔ زندگی سے کچھ حاصل کرنے کی خواہش ظاہر ہے کہ انسان کو اس کے ساتھ ہر لمحہ لگائے رکھے گی۔ وہ ہر حال میں اس کا دامن تھامے رہے گا۔ خواہ نامرادی و ناامیدی کی کیسی ہی آندھیاں اٹھیں ؎

سنبھلنے دے ذرا اے ناامیدی کیا قیامت ہے ۔ کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

زندگی سے یہی محبت اور جینے کی یہی خواہش غالب کو زندگی کے ہر پہلو کو برتنا، عمل کرنا اور اس کے حاصل کی جستجو کرنا سکھاتی ہے۔ وہ کبھی زندگی سے بیزار نہیں ہوئے، اس لئے اُن کے ہاں حاصل تک پہنچے، گوہرِ مقصود کی تلاش، اس کے حصول اور ہر سفر کے بعد منزل کی آسائش سے لطف اندوز ہونے کی شدید خواہش پائی جاتی ہے۔ اُن کے نزدیک حرکت و عمل اُس وقت تک بے معنی ہیں جب تک اُن کے نتیجے تک پہنچنے کی امید نہ ہو۔ انہیں اس کا احساس تو ہے کہ ہر سفر کا اختتام منزل کی آسائش پر نہیں ہو سکتا، لیکن وہ چاہتے ہیں کہ ایسا ہی ہو، اسی لئے انہیں کبھی حاصل کا افسوس[1] ہوتا ہے اور کبھی منزل رسی کی خوشی[2]۔ حاصل کی طرف یہ شعوری سفر اگر ناکامی پر ختم ہوتا ہے تو میر کے برخلاف اُن میں ایک جھلاہٹ اور تلخی پیدا کر دیتا ہے ؎

کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل ۔ انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں (غالب)

خود دل سے کیا ہوں آزردہ ۔ میں اِس چار دن کے جینے پر (میر)

غالب کا رویہ ایک عملی اور زندگی سے ہر لمحہ نبرد آزمائی کرتے رہنے والے شخص کا رویہ ہے، جب کہ میر "جبر" کے فلسفے کو ایک مسلمہ حقیقت

۱؎ سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ الفتِ ہستی ۔ عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

۲؎ چار موج اٹھتی ہے طوفانِ طرب سے ہر سو ۔ موجِ گل۔ موجِ صبا۔ موجِ شفق۔ موجِ شراب



ماں کر اس میں وضع داری قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ میر کے رویّے اور وضع نبھانے کے انداز میں یقیناً ٹریجڈی کی سی رُومانی فضا اور رُوحانی بلندی کا احساس ہوتا ہے لیکن یہ رویّہ کم از کم ہماری آج کی زندگی کی چیز معلوم نہیں ہوتا جب کہ غالب کا رویہ اپنے اطراف رُومانی اور رُوحانی ہالے نہ رکھنے کے باوجود ہماری آپ کی زندگی میں جاری و ساری نظر آتا ہے۔ شاید یہ بدلتے ہوئے حالات اور معاشرے کا اثر ہے کہ ہم میر کے رویّے کی تعریف کرنے، اس کی عظمت کے قائل ہونے اور میر کو ٹریجڈی کے ہیرو کی طرح پُر عظمت سمجھنے کے باوجود اُن کی سی زندگی گذارنے اور اُن کے رویے پر عمل کرنے کی سکت خود میں نہیں پاتے یا ایسا کرنا نہیں چاہتے۔ عمل اور اس کے نتیجے پر نظر، کوشش اور اُس کے بارآور ہونے کی تمنا عام انسانی نفسیات ہے۔ یہ زندہ رہنے اور زندگی سے بھرپور لطف اندوز ہونے والے شخص کی جائز خواہش ہے۔ غالب اِس خواہش کے اظہار میں نہ شرم محسوس کرتے ہیں نہ اسے دبا کر کسی بلند فلسفے اور اُونچے آدرش کو قبول کرنے کو تیار ہیں۔ وہ زندگی میں بھی اور عشق میں بھی فائدہ، نقصان، کھونے پانے اور کوشش اور حصُول پر نظر رکھتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ غالب نے جس شدّت اور کثرت سے سُود، صَرف، زیاں، جمع، نفع، نقصان، خرچ، سعی، حاصل، حساب کتاب اور اِس قماش کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ اِس کی مثال کسی دُوسرے شاعر کے پاس کم ہی ملے گی۔[1]

ایک طرف تو غالب کسی مروجہ عقیدہ یا طے شدہ نتیجے پر اعتماد نہ رکھتے تھے، دُوسری طرف اپنے مزاج کے اعتبار سے ہر چیز کو عقل کی میزان پر تولے بغیر اس سے مطمئن نہ ہو سکتے تھے۔ نتیجے کے طور پر اپنے ہر عمل اور کوشش کا صِلہ طلب کرنا ضروری تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی عشقیہ شاعری اُردو فارسی یا افلاطونی روایت کے معیار پر پوری نہیں اُترتی۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ غالب کی عشقیہ شاعری میں عاشق و معشوق دونوں کی شخصیتوں کا بھرپور احساس ہوتا ہے۔ یہاں کوئی فریق اپنے آپ کو دُوسرے کی رضا کا اِس حد تک تابع نہیں کر دیتا کہ اس کی شخصیت ہی دُوسری ذات میں ضم ہو جائے۔ اپنے آپ کو محبوب کی ذات میں گُم کر دینے کا رویّہ رُوحانی اور متصوفانہ عشق کے اثرات کا نتیجہ ہے اور چونکہ ہمارے اکثر بڑے شعرا اِن تعلیمات سے نہ صرف آشنا اور متاثر تھے بلکہ عملی طور پر بھی اِس کے پیرو تھے اس لئے ان کے مادّی عشق پر بھی یہ پرچھائیاں پڑتی ہیں۔

چنانچہ عشقیہ شاعری کا تصوّر بغیر ایثار، قربانی، جیتے سے لے بیاری اور جسم سے لاپروائی کے کم ہی اُبھرتا ہے جیسا کہ غالبؔ کے بارے میں عرض کیا جا چکا ہے کہ اُن کا تصورِ حیات اگر سراسر مادی نہ بھی ہو تب بھی اس حد تک رُومانی نہ تھا جس حد تک مثال کے طور پر درد و میر کا تھا۔ پھر اُن کا مزاج جس سے بحث کی جا چکی ہے اور ان سب سے زیادہ سُنے سُنائے نظریوں اور عقیدوں پر شک و شُبہہ کی نظر ڈالنے کا انداز اُن کے عشق میں وہ یک سُوئی اور ہم آہنگی پیدا نہیں ہونے دیتا جس کے نتیجے کے طور پر

"توڑا تھا شاخِ گُل کو نکلی صدائے بلبل"

والی کیفیت پیدا ہو سکے۔ برخلاف اس کے اُن کے عشق میں عاشق و معشوق دونوں کی شخصیتیں اپنی اپنی جگہ منفرد اور نمایاں سطح

---

[1] تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ
جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا

دل کو ہم صرفِ وفا سمجھے تھے کیا معلوم تھا
یعنی یہ پہلے ہی نذرِ امتحاں ہو جائے گا

فائدہ کیا سوچ آخر تو بھی دانا ہے اسدؔ
دوستی ناداں کی ہے جی کا زیاں ہو جائے گا

بلا کہ گریہ بہ مقدارِ حسرتِ دل ہے
مری نگاہ میں ہے جمع و خرچ دریا کا

دل سے ہوائے کشتِ وفا مٹ گئی کہ واں
حاصل سوائے حسرتِ حاصل نہیں رہا

ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ ۔۔۔ وغیرہ وغیرہ



آتی ہیں، وہ ایک دوسرے کی تکمیل یقینی طور پر کرتی ہیں لیکن ایسے وجود کو برقرار رکھتے ہوئے۔ ظاہر ہے کہ جہاں دو شخصیتیں الگ الگ ہوں گی وہاں ہزار قربتوں کے باوجود فاصلے نکل آئیں گے[1] اُن میں ٹکراؤ بھی ہوگا، کشاکش بھی اور کچھ حدود کے اندر یکجائی و ہم آہنگی بھی۔ یہ مادی اور عملی زندگی کا عشق ہے جس میں ہوس اور پاکیزہ محبت، ایثار و خود غرضی، رُوحانی سکون اور جسم کی پکار دُھوپ چھاؤں کی طرح ساتھ ساتھ ملتے ہیں اور غالب کو یہاں بھی نفع نقصان اور کوشش اور اس کے حاصل کی فکر رہتی ہے

فائدہ کیا سوچ آخر تو بھی دانا ہے اسد	دوستی ناداں کی ہے جی کا زیاں ہو جائے گا

اُن کی بندگی بھی اس لئے ہے کہ اس میں ان کا بھلا ہو۔ اگر بندگی اُن کے حق میں بھلائی نہ بن سکے تو اس پر انہیں جھلاہٹ ہوتی ہے۔

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی	بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

یہ تان اتنی لمبی ہوتی ہے کہ وہ محبوب کو بھی اس لئے راضی رکھنا چاہتے ہیں کہ اُن پر زمانہ مہربان ہو سکے

سب کے دل میں ہے جگہ تیری جو تو راضی ہوا	مجھ پہ گویا اک زمانہ مہرباں ہو جائے گا

جہاں حاصل کا کچھ امکان نہ رہے غالب وہاں سے آگے بڑھ جانے ہی میں عافیت سمجھتے ہیں

دل سے مٹنا تیری انگشتِ حنائی کا خیال	ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا

یہ رویہ عشق پر بھرپور اعتماد یا کسی اور مکمل اعتماد رکھنے والے شعرا کے رویّے سے نہ صرف مختلف بلکہ اُس کے متضاد ہے غالب کو زندگی اور اس کے مادی تقاضوں کا پُورا احساس اور جان بہرحال عزیز ہے اس لئے وہ

تاب لائے ہی بنے گی غالب	واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

کہہ کر انگریزوں کی ستائش بھی کرتے ہیں اور اُستادِ شاہ سے معذرت طلبی بھی۔ محل حسین کا قصیدہ بھی کہتے ہیں اور عیش کے لئے کلکتہ کا سفر بھی کرتے ہیں۔

"اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا"

کہنے والے شخص کا یہ عمل بظاہر کچھ عجیب سا نظر آتا ہے لیکن حاصل کو اہمیت دینے اور نتیجے پر ہر دم نظر رکھنے والے شخص کے نقطۂ نظر سے نہ یہ عجیب بات ہے اور نہ قابلِ ملامت۔ میر کی حاصل اور نتیجے سے بے نیازی اُن کے طرزِ عمل میں یقیناً ایک عظمت اور بلندی پیدا کر دیتی ہے لیکن اسی وجہ سے وہ زندگی سے بڑی حد تک لاتعلق ہو جاتے ہیں[2] اور

---

[1] میر

ہر چند اس متاع کی اب قدر کچھ نہیں
پر جس کسو کے ساتھ رہو تم وفا کرو

سر جاک آستاں پہ تمہارے رہا مدام
اس پر بھی یا نصیب جو تم سے وفا کہو

دُور بیٹھا غبارِ میر اُس سے
عشق بن یہ ادب نہیں آتا

یا

"ٹک دیکھ لیا دل شاد کیا"

غالب

قہر ہو یا بلا ہو جو کچھ ہو
کاش کہ تم مرے لئے ہوتے

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

نزاکتیں کہ بدگو ایک نگاہوں میں تو کیا
بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

[2] آگے کے صفحے پر



ہو کوئی بادشاہ کہ کوئی وزیر ہو
اپنی بلا سے بیٹھ رہے جب فقیر ہو

کر کے الگ ہٹ جاتے ہیں۔ چنانچہ میر زندگی کے صرف اُس حصے سے نباہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں جو اُن کی مرضی اور مزاج کے مطابق ہو۔ اس کے نتیجے کے طور پر زندگی کا ایک بڑا حصہ اُن سے اور اُن کے فن کی زد سے دور ہو جاتا ہے۔ اِسی لئے اُن کے پاس ہمیں ایک خاص قسم اور لہجے کے اشعار تو بہت مل جاتے ہیں اور یقینی طور پر اُن میں سے اکثر پر عظمت کی چھاپ بھی بڑی گہری ملتی ہے لیکن اُن کے اپنے طرزِ حیات سے ہٹ کر زندگی کے اور پہلوؤں پر اُن کی نظر کم ہی جاتی ہے یا جاتی بھی ہے تو اس کی گہرائیوں تک نہیں پہنچ پاتی۔ یہی وجہ ہے کہ ایک خاص موڈ اور کیفیت میں پڑھنے والے پر وہ بے پناہ اثر انداز ہوتے ہیں، لیکن غالب کی طرح ہر موڈ، ہر کیفیت اور ہر شخص کو ہر حال میں مطمئن نہیں کر سکتے۔ باوجود اپنی مشکل زبان اور دقت پسندی کے، غالب ہر موڈ میں پڑھنے والے کو کچھ نہ کچھ دے سکتے ہیں۔ زندگی کے راستوں پر غالب ایک ایسے ہم سفر کی طرح ہیں جس کی زبان اور انداز قدرے اجنبی ہے لیکن ہم سفری اور مشترکہ دکھ سکھ اس سے قرب کا احساس دلاتے رہتے ہیں۔

عدم عقیدگی جسے ڈاکٹر سید عبداللطیف "روحانی ہم آہنگی کی کمی" کا نام دیتے ہیں (اگر وہ کمی کی جگہ فقدان بھی کہتے تو کوئی فرق نہ پڑتا) یہی اور حاصل پر ہر دم نظر رکھنے اور زندگی کی کامیابیوں اور ناکامیوں کا باضابطہ حساب کتاب رکھنے کے رویے نے غالب کے ذہن کو تحریکی بنا دیا۔ وہ کسی رائج فلسفے پر اندھا اعتقاد رکھنے کی بجائے ہر شے کی اصل، ہر عمل کے نتائج و عواقب اور ہر واقعے، حادثے یا تجربے کے اندرونی رشتوں کی تلاش میں سرگرداں نظر آتے ہیں۔ اِس تلاش و جستجو میں وہ کسی کی رہنمائی قبول کرنے کو تیار نہیں، کیونکہ انہیں علم ہے

"کیا کیا خضر نے سکندر سے"

اِسی اندازِ نظر نے انہیں ہر عقیدے، ہر رسم اور ہر روایت سے مشکوک کر دیا۔ وہ حالات و واقعات کو روایت یا کسی پہلے سے طے شدہ اصول و نظریہ کے تحت رکھ کر سمجھنے کی بجائے اپنے طور پر سمجھنے اور حل کرنے کی طرف راغب ہوئے۔

"اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو"

چنانچہ غالب کے ہاں تجربے کے راست بیان کے بجائے اُس کے محرکات پر غور کرنے کا رجحان ملتا ہے۔ واردات کے ذکر سے زیادہ اس کا تجزیہ ملتا ہے۔ یہ رویہ بھی میر کے رویے کے ٹھیک خلاف ہے۔ میر اپنے ہر تجربے کو انتہائی خلوص کے ساتھ راست انداز میں بیان کر دیتے ہیں چنانچہ اُن کی شاعری کا بیشتر حصہ واردات کا انتہائی موثر بیان بن جاتا ہے۔ غالب تجربے کے راست بیان اور ایسے واردات قلب بیان کرنے کی بجائے اس کے محرکات پر غور کرتے ہیں اور یہیں سے اُن کے ہاں کیا؟ کیوں؟ اور کیسے؟ کے سوالات اُبھرنے شروع ہوتے ہیں۔ اِن بنیادی سوالات کے جواب غالب کے پاس بھی نہیں ہیں کہ ان سوالوں کے حل دریافت کرنا اور انہیں منطقی استدلال کے ساتھ پیش کرنا کسی باضابطہ فلسفی کا منصب ہے (ویسے بھی ایسا کون سا فلسفہ ہے جو سبھی کو مطمئن کر چکا ہے یا کر سکتا ہے؟) میں غالب کو فلسفی ماننے والوں کا پورا پورا احترام کرنے کے باوجود غالب کو فلسفی ماننے سے انکار کرتا ہوں۔ خدا گواہ ہے کہ بار بار غالب کا پورا کلام پڑھنے اور پوری دیانت داری سے اُسے سمجھنے کی کوشش کے باوجود میں فلسفۂ کلامِ غالب

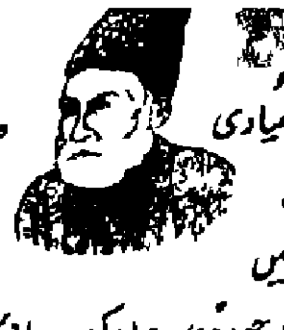
صفحہ ماقبل کا نوٹ

میر اِس خرابے کا بہت، اس جل کے سوئے پیئے
کسو دیوار کے سائے میں منہ پر لے کے داماں کو

دیر رہنے کی جا نہیں یہ چمن
بوئے گل ہو، صفیرِ بلبل ہو

یا

اچھا ہے وہ فقیر کہ جو بے نیاز ہے (میر)



بھی کسی تنے سے دوچار نہیں ہوا۔ انھوں نے یقیناً بنیادی فلسفیانہ سوالات اُٹھائے لیکن اُن کا حل خود پیش کرنے کے بجائے پڑھنے والوں کو اپنے طور پر سوچنے اور سمجھنے کی گنجائش چھوڑ دی اور یہی وجہ ہے کہ غالب ہمیں کسی فلسفی سے زیادہ عزیز ہیں۔ بات یہ ہے کہ اس سلسلے میں غالب خود جیسی رعایت لیتے ہیں دوسروں کو اور اپنے پڑھنے والوں کو بھی ویسی ہی رعایت دیتے ہیں (جو شخص خود دوسروں کی رہنمائی پسند نہ کرتا ہو وہ اوروں کا رہنما بننا بھی کیوں پسند کرے گا) غالب کی افتادِ طبع اور اندازِ فکر قدم قدم پر اُن کے سامنے سوالات کھڑے کر دیتے ہیں اور یہیں سے اُن کے ہاں تحیّر کی کیفیت اور سوالیہ لسان سے شروع ہوتے ہیں۔ یہ سوالات مظاہرِ فطرت سے لے کر انسان کی کامیابیوں اور ناکامیوں تک اور حیات و کائنات کے اہم ترین معاملات سے لے کر زندگی کے معمولی معمولی واقعات تک پھیلے ہوئے ہیں ؎

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہیں
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

جاں کیوں نکلنے لگتی ہے تن سے دمِ سماع
گر وہ صدا سمائی ہے چنگ و رباب میں

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں؟
غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں
ابر کیا چیز ہے، ہوا کیا ہے

کیوں ردِ قدح کرے ہے زاہد
مے ہے یہ مگس کی قے نہیں ہے

غالب تمہیں کہو کہ ملے گا جواب کیا
مانا کہ تم کہا کئے اور وہ سنا کئے

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

یہ تحیّر اور سوالیہ انداز غالب کے ذہن کی پوری پوری نمائندگی کرتا ہے۔ وہ رہنمائی پہلے ہی رد کر چکے تھے۔ تصوّف اُن کی زندگی میں رچ نہ سکا تھا۔ اِس کے تعلق سے کئی شبہات موجود تھے ؎

قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل
کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا

مذہب وغیرہ کے ظواہر اُن کے لئے بے معنی یا شکست خوردہ ذہنوں کی پناہ گاہیں تھے ؎

دیر و حرم آئینۂ تکرارِ تمنّا
واماندگیٔ شوق تراشے ہے پناہیں

انہیں احساس تھا کہ

نہیں کچھ سبحہ و زنّار کے پھندوں میں گیرائی

چنانچہ غالب اپنے ذہنی سفر پر تنہا تنہا رواں نظر آتے ہیں۔ وہ ایسے مسافر کی طرح ہیں جو اپنے اندر بس صرف اپنی روشنیٔ طبع اور ذہن رسا کی شمع کو دیکھتا ہے۔ یہی اُس کے رہبر بھی ہیں اور ہم سفر بھی۔ مونس بھی اور غمخوار بھی۔ چنانچہ ان کے ہاں اپنی ذات کو دیکھنے (جسے اُن کی قد آور شخصیت کی تنہائی کہہ لیجئے) اور تنہائی کا احساس قدم قدم پر ملتا ہے۔ یہ تنہائی شکست خوردگی کی پیدا کردہ نہیں ہے بلکہ لوگوں کے درمیان ایک ہے۔ "انہیں آدمی تو مل جاتے ہیں"، "انسان" نہیں ملتا۔ اپنے ہم ذہن و ہم جنس کو نہ پا کر ایک طرف تو غالب کو اپنے اجنبی ہونے کا احساس شدّت سے ہوتا ہے اور دوسری طرف وہ اپنی ذات میں زیادہ انہماک سے دلچسپی لینے لگ جاتے ہیں۔ اِس منزل پر پہنچ کر "شہر شحن ہائے گفتنی کے اظہار کے لئے پورے شہر میں زباں داں" کی جستجو میں مصروف ہو جاتا ہے۔ اپنے ماحول سے اجنبیت کا احساس اُسے ستائش اور صلے سے بے نیاز کر دیتا ہے اور وہ بڑی بے نیازی سے کہہ اُٹھتا ہے ؏

گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

یہیں سے غالب کے کلام میں خود کلامی اور خدا سے سوال کرنا اور خود ہی اُن کے جوابات دینے کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے



ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں

غزل پر بھی غالب کا ذہن مسلسل کھوج اور جستجو میں نظر آتا ہے ــــ وہ کسی سوال کا حتمی جواب دے کر اپنے سفر کو ختم نہیں کر دیتے بلکہ قضیے کے مقابل قضیہ کھڑا کر کے اور سوال کے سامنے جوابی سوال کا آئینہ رکھ کر اپنے ذہنی سفر کو مسلسل جاری رکھتے ہیں۔ یہ سفر بندگی کا سفر ہے جو صرف بندگی کے خاتمے ہی پر ختم ہو سکتا ہے۔ یہ تحرک اور مسلسل سفر غالب کے کلام کا اہم ترین جوہر ہے۔

قضیے کے سامنے قضیہ کھڑا کرنا غالب کا عام رویۂ شعر ہے۔ چنانچہ وہ ایسے موقع پر بھی جہاں وہ بڑی آسانی سے ہاں یا نہ کہہ کر قضیہ ختم کر سکتے تھے، ایسا نہیں کرتے۔ اس طرح ایک طرف تو ان کا سفر جاری رہتا ہے اور دوسری طرف وہ قاری پر اپنے نتائج مسلط کرنے کے غیر شاعرانہ عمل سے بچ جاتے ہیں ــــ

رہی نہ طاقتِ گفتار اور اگر ہو بھی
تو کس امید پہ کہیے کہ آرزو کیا ہے؟

چپک رہا ہے بدن پر لہو سے پیراہن
ہماری جیب کو اب حاجتِ رفو کیا ہے؟

یہاں تک کہ وہ اپنے پر کئے گئے اعتراضات کے جواب میں بھی ایک سوال کھڑا کر کے چپ ہو جاتے ہیں ــــ

شعلے کیونکر ہو جو نہ ہووے صوفی؟
وضعی کیونکر ہو مست و دراز الشہرت؟

میں نے عرض کیا ہے کہ غالب کسی واقعے کے بیان پر اکتفا کرنے کے بجائے اس کے محرکات پر غور کرتے ہیں ظاہر ہے کہ یہ ایک سطحی عمل نہیں اس کے لئے واقعات و اشیاء کی تہہ تک اترنا پڑتا ہے۔ ایک واقعے کو جنم دینے میں کئی کئی عوامل کارفرما ہوتے ہیں جن میں کچھ ایک دوسرے سے ... میں کچھ متضاد بھی، کچھ واضح اور راست ہوتے ہیں، کچھ غیر واضح اور غیر راست۔ چونکہ غالب تجربے یا واقعے کی ظاہری سطح پر رک کر اسے قبول کر کے چپ نہیں ہو جاتے، بلکہ ان UNDER CURRENTS کو گرفت میں لینے کی کوشش کرتے ہیں جو ... محرکات میں شامل ہیں، لہٰذا انہیں محرکات کی طرح پیچیدہ زبان، تراکیب، دو دو تین اضافتیں نہیں، بلکہ تین تین چار اضافتیں (جو اہلِ زبان کے نزدیک غیر فصیح ہوتی ہیں) اور اکثر اوقات دو متضاد معنی اور کیفیات رکھنے والے الفاظ کے مرکبات ... لینے پڑتے ہیں۔ میر واقعہ کو اس کی ظاہری شکل میں قبول کر لیتے ہیں (ان کے نزدیک محرکات پر غور کرنا ان کا کام نہیں بلکہ ... واقعے اور ہر ذرّے میں موجود ہے ــــ وہی عقیدے کی بات ہے) اسے اپنے وجدان کا جزو بنا لیتے ہیں ... اور میر اس کا اظہار کر دیتے ہیں جس راست انداز میں انہوں نے اس کا اثر قبول کیا ہے، لہٰذا انہیں پیچیدہ زبان یا غیر راست ... استعمال کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ میر کی طرح ہر واقعہ مقدّر جان کر اسے اپنے وجدان کا جزو بنا لینا اس وقت تک ... ممکن ہے جب تک ذہن شک و شبہہ کی ہلکی سی پرچھائیں سے بھی پاک صاف نہ ہو اور جب تک ہر واقعہ ہر کہ از دوست می رسد ... "پر پختہ اعتقاد نہ ہو، کوئی واقعہ وجدان کا جزو نہیں بن سکتا اور جب تک تجربہ وجدان کا جزو نہ بنے لہجے میں وہ گھلاوٹ اور ... پیدا نہیں ہو سکتی جس کی وجہ سے میر خدائے سخن کہلاتے ہیں۔ ویسے میر کا لہجہ بڑا قاتل ہے۔ اس ... نظر پڑتی ہے لیکن اسے اپنانے کی کوشش اس دور میں وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کی نظر اس لہجے کے محرکات تک نہ جا سکے ... علم ہے کہ میر کے لہجے کی گھلاوٹ صرف الفاظ، مترنم بحروں اور غمگین فضا کی پیدا کردہ نہیں ہے بلکہ ایک ... ساتھ ہر "واقعہ" کو قبول کرنے اور اسے اپنی شخصیت کا جزو بنا لینے میں ہے، وہ کبھی یہ جرأت نہیں کر سکتے کیونکہ حالات کی تبدیلی نے اعتقاد کی وہ دولت ہم سے چھین لی ہے۔ ویسے آزادی کے فوری بعد ابن انشا اور ان کی تقلید میں ... شہرت ... خلیل الرحمٰن اعظمی اور ناصر کاظمی وغیرہ نے یہ تجربہ کر کے دیکھ ... عبرتناک ... ناصر کاظمی ...



بجائے اسے آج کے حالات سے ہم آہنگ کرنے کی بڑی حد تک
جائے "شکر ہو سو بہتر ہے" کہہ کر خاموش ہو جانا پڑا۔ بات
لئے مخصوص ذہنی کیفیت اور set up کی ضرورت تھی۔ اس

کوشش کی لیکن انہیں بھی آخر میں زندگی "سو کبھی جو ل جائے
یہ سچ ہے کہ میر نے جس انداز اور جس قسم کی شاعری کی، اس کے
میں شک نہیں کہ خارجی سطح پر اُن کے دور میں بھی انتشار تھا۔

باہر تبدیلیاں ہو رہی تھیں لیکن داخلی یا ذہنی طور پر۔ وہ اور اُن کے دور کے لوگ ایک بچے جمائے نظام میں رہ رہے تھے۔ خارجی شکست و ریخت
اور تبدیلیوں نے اس حد تک شدت اختیار نہیں کی تھی۔ وہ ذہنی اور رُومانی سطح پر بھی پوری طرح اثر انداز ہو کر سوچنے کی راہوں اور انداز نظر
کو یکسر تبدیل کر دیں اور پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ میر نے اپنے انداز کی شاعری کے تمام امکانات کو رُو بہ کار لا کر ختم کر چکے تھے۔ برخلاف اس کے
غالب کے دور میں نئی تبدیلیوں نے غور و فکر کو متاثر کرنا شروع کر دیا تھا اور اہل نظر اپنے عقائد و روایات پر از سر نو غور کر رہے تھے۔ جو تبدیلیاں
میر کے دور میں خارجی سطح پر تھیں اب وہ ذہنوں اور انداز فکر کو متاثر کرنے لگی تھیں۔ انہیں حالات کا اثر تھا کہ غالب نے نئے انداز سے فنی
گو برتا اور زبان و بیان، اور طرز اظہار کے نئے امکانات کی نشاندہی کی۔ ان امکانات کو غالب اس حد تک رُو بہ کار نہ لا سکے کہ ان میں کوئی
گنجائش باقی نہ رہ جائے۔ پھر غالب جن امکانات کی نشاندہی کرتے ہیں، وہ اتنے تہہ در تہہ اور پھیلے ہوئے ہیں کہ اُن کے ختم ہونے کا سوال تک
اندیشہ نظر نہیں آتا، جب تک آج کے معاشرے میں کوئی بنیادی تبدیلی اور انقلاب عظیم نہیں آ جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ آج کی نسل یا پوری نئی
نسل غالب کے آئینے میں اپنے طرز فکر اور رویۂ حیات کا عکس بڑی حد تک دیکھ سکتی ہے۔ کسی طے شدہ نتیجے پر اپنے فن کی بنیاد رکھنے کی
بجائے سچائی تک خود پہنچنے کی کوشش، تجربے کو محض اس کی ظاہری شکل میں دیکھ کر رد یا قبول کرنے کی بجائے اس کے اندرونی رشتوں کی
تلاش، کسی کی رہنمائی قبول کرنے سے انکار اور اس کی بجائے اپنی ذات کی رہنمائی میں سفر کرنے کا میلان اور حاصل کردہ نتائج کو حرف آخر
مان کر اُن کی تبلیغ کے بجائے صرف ان کے اظہار پر اکتفا۔ یہ ہے غالب اور نئے ذہن میں قدر مشترک۔

غالب کے مطالعے کی روشنی میں نئی نسل کے لوگوں سے کئے جانے والے سوالات کہ وہ کس عقیدے پر یقین رکھتے ہیں یا وہ سب مل کر
کس فلسفے کی تبلیغ کرنا چاہتے ہیں یا بھری دنیا میں کیوں تنہائی محسوس کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ صرف مضحکہ خیز اور بے معنی بلکہ سوال کرنے والے
کی ذہنی صحت کو مشکوک بنا دینے والے معلوم ہوتے ہیں، کیونکہ نئی نسل کے ادیب آغا ہوں یا کماری سلیم، باقر مہدی اور کمار پاشی ہوں یا
شاذ فاروقی، عمیق حنفی، فضیل جعفری اور محمد علوی، افتخار جالب اور عباس اطہر ہوں یا ندا فاضلی اور عادل منصوری وغیرہ بھی اپنی ذات
کی رہنمائی اور روشنیٔ طبع کے بل بوتے پر ذہنی سفر طے کر رہے ہیں۔ ان سے پہلے یہ سوالات غالب سے کئے جانے چاہئیں۔ اُن
کے کسی نظریے یا فلسفے کے پرچار کا مطالبہ کرنے سے پہلے غالب سے یہ مطالبہ کرنا ہوگا، کیونکہ وہ بھی تو کسی طے شدہ نتیجے یا نظریے کے
ناشر کی بجائے "ورق گردانی نیرنگ یک بت خانہ" ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ یہ انداز نظر اچھی اور بڑی شاعری کی ضمانت ہے ؟ یا چند نظریوں کی تبلیغ و اشاعت بڑا ادب پیدا کرتا ہے تو
دونوں قسم کی شاعری کے نمونے اور اُن کا انجام ہمارے سامنے ہے اور کیا یہ ادب و شعر سے سنجیدگی کے ساتھ دلچسپی رکھنے والوں
کے لئے دعوتِ فکر نہیں ؟

لے "ہیں ورق گردانی نیرنگ یک بت خانہ ہم"

بقیہ صفحہ ۲۵۱ "غالب کا کلام جدید میزان پر"

اگر زندگی کے لامحدود پہلوؤں کی خوبصورت عکاسی، انسانی نفسیات کی صداقت آمیز ترجمانی، اپنے عہد کے علاوہ
مستقبل کا عرفان اور تہہ در تہہ معنویت کے ساتھ ذہنی پیکروں کا استعمال بلند پایہ شاعری کا معیار ہو تو غالب
بین الاقوامی ادب میں بھی غالب کا ثانی مشکل سے نظر آئے گا۔ بقول خود ؎

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

ساقی انصاری

غالب کی انا — کلامِ غالب کے آئینے میں

مولانا ابوالکلام آزاد نے "غبارِ خاطر" میں ایک جگہ سوال کیا ہے

" ایک ادیب۔ ایک شاعر۔ ایک مصوّر ایک اہلِ قلم کی انانیت (EGOTISM) کیا ہے؟"

اور پھر خود ہی اس کا جواب دیا ہے:

" آپ کو صاف دکھائی دے گا یہ انانیت دراصل اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ اس کی (شاعر، مصوّر یا ادیب کی) فکری انفرادیت کا ایک قدرتی سرجوش ہے جسے وہ دبا نہیں سکتا۔ اگر دبانا چاہتا ہے تو اور زیادہ اُبھرنے لگتی ہے اور اپنی ہستی کا اثبات کرتی ہے۔"

آئیے ہم دیکھیں کہ غالب کی فکری انفرادیت کا سرجوش کلامِ غالب میں کس طرح عکس ریز ہے۔ غالب کا سارا کلام منظوم اور غالب کے خطوط اس بات کے شاہد ہیں کہ غالب کی شخصیت ایک بڑی باوقار متنوع اور رنگا رنگ شخصیت تھی۔ اپنی انفرادیت کو قائم رکھنے اور چمکانے میں وہ کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھتے تھے۔ شارعِ عام پر چلنا ان کے لئے باعثِ ننگ تھا۔ علم و ادب کا میدان ہو یا شعر و شاعری کا۔ تاریخ نویسی ہو یا خطوط نگاری ہر جگہ وہ اپنی فکری انفرادیت کی شان قائم رکھنا ضروری سمجھتے تھے۔ یہ ان کی افتادِ طبع تھی، یہ اُن کا مزاج تھا۔ ظاہر ہے کہ اُن کی انفرادیت نے اُن کی پندار اور مثبت انانیت ہی سے نشوونما پائی ہے۔ نہ صرف غالب کے تفکر میں بلکہ اُن کے لب و لہجہ میں بھی ان کی انانیت کا خمیر اس درجہ رچا اور بسا ہے جیسے بقول مولانا محمد حسین آزاد "آگ میں گرمی اور روشنی"۔ اسی لئے جب اُن کا اشہبِ فکر جولانیاں دکھاتا ہے تو اُن کی انفرادیت اور انانیت کا قدرتی سرجوش بھی اُبھرے بے بار نہیں رہ سکتا۔

عرض کیجئے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں
کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم
اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلیدِ تنک ظرفیِ منصور نہیں

غالب کی انانیت کی نشوونما میں اُس زمانے کے سماجی اور معاشی حالات کا بڑا دخل ہے۔ غالب فطرتاً خوددار اور خودبیں شخص تھے۔ اُن کو اپنی خاندانی امارت اور وجاہت پر بڑا ناز تھا۔ وہ اپنے کمالاتِ فن سے بھی خوب واقف تھے۔ انہیں احساس تھا کہ وہ نابغۂ روزگار لوگوں میں سے ایک ہیں مگر دلی کی لٹی ہوئی سلطنت میں ان کا کوئی ایسا قدردان نہ تھا جو حالِ جاناں کی



طرح خلعت و انعام سے اُن کا گھر بھر دیتا۔ معاشی مجبوریوں کی وجہ سے اُن کو دُوسروں کے آگے دستِ سوال دراز کرنا پڑتا تھا۔ قصائد لکھنے پڑتے تھے۔ غیر ضروری تعریفیں کرنی پڑتی تھیں۔ ظاہر ہے کہ اُن کے احساسِ عزّ و وقار کیلئے یہ باتیں ضربِ شدید کی حیثیت رکھتی تھیں مگر کم از کم اشعار میں تو یہ مجبوری نہ تھی۔ خود کہتے ہیں ؎

آج مجھ سا نہیں زمانے میں　　شاعرِ نغز گوئے و خوش گفتار
رزم کی داستان گر سنیئے　　ہے زباں میری تیغِ جوہر دار
بزم کا التزام گر کیجے　　ہے قلم میرا ابرِ گوہر بار

وجاہت علی سندیلوی نے "ناقیاتِ غالب" میں لکھا ہے کہ

"غالب زندگی سے بہت کچھ چاہتے تھے۔ اُن کی یہ ہوس بیک وقت اُن کے کردار کی کمزوری بھی اُن کے فن کا جوہر تھی۔ انہیں شہرت۔ محبت۔ دولت۔ امارت۔ عیش و عشرت۔ معشوق۔ دوست۔ شراب۔ جوانی۔ علم ہمہ دانی غرض کہ ہر چیز کی ہوس تھی۔ وہ زندگی کی ہر پُر لطف اور پُر مسرت چیز سے محظوظ ہونا چاہتے تھے اور زیادہ سے زیادہ محظوظ ہونا چاہتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اُن کی یہ سب تمنائیں اور آرزوئیں پوری نہیں ہو سکتی تھیں، لہذا ان کی بے پناہ تمناؤں اور آرزوؤں ہی کے تناسب سے ان کی مایوسیاں اور محرومیاں بھی تھیں۔ اُن کا یہ جوشِ طلب اور احساسِ محرومی ہی اُن کی شاعری میں جلوۂ صد رنگ پیدا کرتا ہے۔"

کیفیتِ دگر ہے فشارِ دلِ خوں میں　　اک غنچے سے صد ساغرِ گل رنگ نکالوں

میں سمجھتا ہوں کہ "جوشِ طلب" اور "احساسِ محرومی" کے درمیان یہ غالب کی انانیت ہی تھی جس نے ان کے تفکّر میں توازن اور نظم و ضبط قائم رکھا۔ اگر غالب کی انا اُن کو مار نہ رکھتی تو خدا معلوم اُن کا احساسِ محرومی اُن کو کہاں لے جاتا۔ اگرچہ واقعات اِس بات کے شاہد ہیں کہ بعض اوقات اپنی مطلب براری کے لئے وہ اپنی سطح سے نیچے بھی آجاتے ہیں جیسا کہ مفتی صدر الدین آزردہ کی بیوہ کو رامپور سے پنشن ملنے میں رکاوٹ ڈالنے کا معاملہ۔ تاکہ وہ رُوپیہ غالب ہی کو مل جائے مگر ایسی مثالیں خال خال ہیں اور ان کو انسانی کمزوری اور مستثنیات میں شمار کرنا چاہیئے، ورنہ واقعہ یہی ہے کہ غالب اپنی سماجی اور ادبی عظمت اور مرتبے سے خُوب واقف تھے اور روزمرہ کی زندگی میں خاص رکھ رکھاؤ برتتے تھے۔ شاعری بہرحال شخصیت کے اظہار کا ایک موثر وسیلہ ہے اور غالب نے اپنی شاعری میں جابجا اپنی شخصیت کے اس پہلو کا اظہار کیا ہے۔ کہیں کھُل کر اور کہیں ستر پردوں میں چھپا کر۔

میں اور بزمِ مے سے یوں تشنہ کام آؤں　　گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا
جب تک کہ نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالم　　میں معتقدِ فتنۂ محشر نہ ہوا تھا
مے سے غرض نشاط ہے کس رُو سیاہ کو　　اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیئے
عالم غبارِ وحشتِ مجنوں ہے سر بسر　　کب تک خیالِ طرۂ لیلیٰ کرے کوئی
عجز و نیاز سے تو نہ آیا وہ راہ پر　　دامن کو آج اُس کے حریفانہ کھینچیئے

سوال یہ ہے کہ غالب کی انانیت کسی مجہول شخصیّت کی انانیت تھی یا ایک مفکّر، ایک دانائے روزگار کی انانیت تھی اور اس کا اظہار جس طرح اشعار میں ہوا ہے اس کو دنیا نے کن نگاہوں سے دیکھا؟ انانیت کا یہ اظہار بے ساختگی اور جوش کی پیداوار ہے یا یہ تکلفاً یا برائے شعر گفتن پیدا کی گئی ہے؟ اس کا جواب ہمیں غالب کے اشعار ہی میں مل سکے گا ؎

دکھاؤں گا تماشا دی اگر فرصت زمانے نے　　مرا ہر داغِ دل اک تخم ہے سروِ چراغاں کا
کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق　　ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد



زمانہ سخت کم آزار ہے بجانِ اسد — وگرنہ ہم تو توقع زیادہ رکھتے ہیں
وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں — سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو
نہ اتنا برشِ تیغِ جفا پر ناز فرماؤ — مرے دریائے بیتابی میں ہے اک موجِ خوں وہ بھی
[illegible] نقدِ دو عالم کی حقیقت معلوم — لے لیا مجھ سے مری ہمتِ عالی نے مجھے
بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے — ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

ان اشعار میں اور اسی قبیل کے دوسرے اشعار میں غالب کی فکری انفرادیت اور انانیت کا ایک نغمہ ہے جو گونج رہا ہے۔ ان اشعار میں جو بے ساختگی، آمد اور جوش ہے، وہ برائے شعر گفتن نہیں ہے، بلکہ غالب کی اپنی ناوقار اور دانائے راز شخصیت کا اظہار ہے جس نے شعر کا لباس پہن لیا ہے۔ ان اشعار کا لب و لہجہ بھی غالب کی بیدار انانیت کا آئینہ دار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ اشعار نہیں بے وقعت اور کم مایہ نہیں معلوم ہوتے بلکہ ان میں ایک مفکر کی بلندیٔ فکر و نظر اور جوش و جذبہ کا اظہار ملتا ہے۔ یہ غالب کی پرجوش انانیت ہی ہے جو ان سے کہلواتی ہے کہ ؎

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے — ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

یہاں تک کہ وہ معشوق سے بھی کسی نہ کسی پیرائے میں اپنی انانیت کا اظہار کر ڈالتے ہیں ؎

مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے — تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے

انہیں غمِ آوارگی ہائے صبا کی بھی پروا نہیں ہے کیوں کہ انہوں نے اپنے دماغ کو پہلے سے اس بات کا موقع ہی نہیں دیا کہ وہ عطرِ پیراہن سے ؎

دماغِ عطرِ پیراہن نہیں ہے — غمِ آوارگی ہائے صبا کیا

اپنی انانیت کا اظہار وہ خدا اور بندے دونوں کے سامنے کر سکتے ہیں اور اس میں انہیں کوئی دقت محسوس نہیں ہوتی ہے۔

در خورِ قہر و غضب جب کوئی ہم سا نہ ہوا — پھر غلط کیا ہے کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا
حریفِ مطلبِ مشکل نہیں فسونِ نیاز — دعا قبول ہو یا رب کہ عمرِ خضر دراز
آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد — مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ
کیوں نہ فردوس میں دوزخ کو ملا لیں یا رب — سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی
جامِ ہر ذرہ ہے سرشارِ تمنا مجھ سے — کس کا دل ہوں کہ دو عالم سے لگایا ہے مجھے

غالب کی یہ انانیت کسی فلسفے کی پیداوار نہیں ہے، بلکہ یہ ان کی فعال شخصیت کا پرتو ہے جو خود بینی اور خود شناسی کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ کوئی بڑا شاعر یا ادیب بڑا کہلانے کا مستحق ہی نہیں ہے اگر اس میں خود بینی اور خود شناسی کا جوہر نہ ہو۔ خود شناسی اور انانیت کا یہ جوہر ایسا نہیں ہے جسے چھپا کر رکھا جا سکے۔ عالمی ادب کی تمام بڑی شخصیتوں کے یہاں انانیت کا یہ اظہار کسی نہ کسی شکل میں ضرور ملتا ہے خواہ وہ ٹالسٹائی کی خود نوشت سوانح حیات ہو یا ٹیگور کی ترکِ ماری۔ خواہ فیضی کا یہ اعلان ہو کہ ؎

امروز نے شاعرم حکیم — دانندۂ حادث و قدیم

یا میر انیس کا یہ چیلنج کہ ؎

لگا رہا ہوں مضامینِ نو کے پھر انبار — خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

بہرحال شاعر یا ادیب کی فطری انا اپنا اظہار چاہتی ہے اور شاعر یا ادیب اپنے آپ کو اس سے باز نہیں رکھ سکتا۔ غالب کی



عظمت کا راز اُن کی مفکرانہ بصیرت میں ہے۔ اُن کے یہاں جذبہ سب کچھ نہیں ہے، بلکہ وہ جذبے اور فکر کے امتزاج سے اپنے اشعار کے لافانی مرقعے تیار کرتے ہیں۔ حیات و کائنات کے مسائل سے وہ سرسری طور سے نہیں گذر جاتے، بلکہ ژرف نگاہی کی ماہیت پر غور کرتے ہیں۔ اُن کی انانیت ان جہات کی متقاضی ہوتی ہے کہ وہ زندگی کے رموز و کیفیات کی مرقع نگاری ایک نئے اور اچھوتے ڈھنگ سے کریں۔ کیا قصیدہ، کیا غزل، ہر میدان میں اُن کی راہ اپنے ہم عصروں اور پیش روؤں سے الگ ہے۔ غالب جو کچھ کہتے ہیں ایک خاص بلندی سے کہتے ہیں۔ اُن تک نگاہیں تو پہنچ سکتی ہیں مگر اُن کی ہمسری نہیں کی جا سکتی۔ غالب کی انانیت کبھی کبھی اُن کے لئے مضر بھی ثابت ہوئی۔ مثلاً برہانِ قاطع والا معاملہ۔ مگر سپر اُنہوں نے کبھی نہیں ڈالی۔ اِس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ہر جگہ غلط تھے۔ جس چیز کو وہ صحیح سمجھتے تھے اس کے بارے میں سمجھوتہ کرنے کے لئے وہ کبھی اپنے آپ کو آمادہ نہ کرسکے۔ اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ اگر غالب کی شاعری میں ان کی انا کا اتنا عمل دخل نہ ہوتا تو اس میں جمال جلیہ بھی آ جاتا مگر جلال نہیں پیدا ہو سکتا تھا۔ غالب زندگی کی طرح شاعری میں بھی آہنگ و وقار قائم رکھنے کے لئے شعوری طور سے جدوجہد کرتے تھے۔ مفکرانہ شاعری کے لئے یہ چیز غالب کے لئے ناگزیر تھی۔ طرزِ بیدل کی طلسماتی فضا کو اُنہوں نے اِسی لئے ترک کیا کہ وہ ایک خاص حد سے آگے اُن کی فکری بصیرت کا ساتھ نہ دے سکتی تھی۔ غالب کے صرف یہ دو شعر دیکھئے اور اُن کی مفکرانہ بصیرت اور خود شناسی کی داد دیجئے :-

تماشائے گلشن، تمنائے چیدن
بہار آفرینا! گنہگار ہیں ہم

نہ ذوقِ گریباں، نہ پروائے داماں
نگہ آشنائے گل و خار ہیں ہم

غالب ـــــ میرے عہد کا فن کار

غالب کی بھی عجب و غریب شخصیت ہے۔ پچھلے سو سال سے نہ جانے کتنی دُور بینوں نے اسے اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کی، اپنے اپنے طور پر سمجھنے کا دعویٰ بھی کیا۔ لیکن آج بھی وہ اتنی ہی دُور اور اُلجھی ہوئی ہے جتنی سو سال پہلے تھی۔ اپنے عہد میں وہ ناقدری کا شکار رہی اور آج قدر دانی کے غبار میں چھپی ہوئی نظر آتی ہے۔ غالب اُردو تنقید کا فیشن بن گیا ہے۔ ہر کس و ناکس اُسے نمغے کی طرح اپنے نام کے ساتھ ٹانکنے کی کوشش کر رہا ہے، لیکن یہ تحقیقات غالب کا تعارف تحریر کم اور خود لکھنے والے کی شناخت زیادہ ہوتی ہیں۔ اِس آئینے میں سب اپنے اپنے عکس ہی کو غالب سمجھ کر فیصلے فرماتے رہے ہیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے انہیں زندگی کا شاعر مانا، رشید احمد صدیقی نے اُردو شاعری میں طنز و ظرافت کا بانی ٹھہرایا۔ ممتاز حسین صرف میں بُزن اپنی شکست کی آواز " ہی تک پہنچ پائے اور خورشید الاسلام کو اُن کی شاعری میں ایک نامکمل انسان کا کردار نظر آگیا۔ سب نے اِس ہمہ جہت شخصیت کو اپنے اپنے طور پر سمجھے، سمجھانے کی کوشش کی، لیکن غالب کا "طور" پھر بھی تشنہ رہ گیا۔ غالب کی شاعری ایک جان دار انسان کی تہہ دار شخصیت کا عطیہ ہے اور اس بدقسمتی سے ہم ابھی تک اپنے علاوہ کسی دُوسرے کو ماننے کے لئے تیار نہیں۔ ہمیں اپنے مخصوص رنگ اتنے عزیز ہیں کہ ہر دُوسرا وجود پہلے وجود کے لئے خارجی تماشے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ ہم سب اِسی طرح دیکھنے اور دیکھے جانے کے حصاروں کے اسیر ہیں۔

کچھ شخصیتیں اتنی رقیق صُورت میں ہوتی بھی ہیں کہ وہ آسانی سے کسی بھی سانچے میں ڈھل جاتی ہیں۔ اُن میں بلا کی مُلائمیت ہوتی ہے۔ لیکن غالب کی ریڑھ کی ہڈی اتنی سیدھی اور مضبوط ہے کہ وہ بنا ٹوٹے پھوٹے کسی سانچے میں نہیں سماپاتے۔ غالب کے ساتھ یہ توڑ پھوڑ کا عمل کچھ زیادہ ہی کیا گیا ہے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ خود سانچے ہی جواب دے جاتے ہیں۔ ہر آبگینہ تُندیٔ صہبا کا متحمل بھی کہاں ہوتا ہے۔

ہُوا بھی کچھ ایسا ہی۔ غالب سے پہلے اور شاید بعد میں بھی، اُردو تنقید کو کسی جان دار شخصیت سے سابقہ نہیں پڑا۔ وہ عام طور سے لفظوں کے ڈھیر میں چھپے ہوئے مُردوں کی ہڈیاں ہی گنتی رہی ہے (ایسے سخت جان بہت کم ہوتے ہیں جو مرنے کے بعد بھی اپنی حفاظت کے لئے زندہ رہتے ہیں) اِس صرف، تقسیم میں اب تو وہ اتنی ماہر ہو گئی ہے کہ بنا جسم ٹٹولے ہی، وہ اُنگلیاں چلا کر کسی کی بھی ہڈیوں کا حساب مرتب کر لیتی ہے۔ لیکن غالب نے صرف ہڈیاں ہی نہیں چھوڑیں، وہ دھڑکتے ہوئے دل اور پھیلتے ہوئے ذہن کو بھی لفظوں کے حوالے کر گئے ہیں۔ ہڈیاں، دل اور ذہن کے انفرادی امتزاج سے اُردو شاعری نیں ایک نئی شعری روایت کی داغ بیل پڑتی ہے اور ہمارے پاس جو تنقیدی پیمانے ہیں وہ اس غیر میکانکی امتزاج پر پُورے نہیں اُترتے۔ اِس شخصیت میں دُوسری ہستیوں



کے عطا کردہ دنیا کی گنجائش کہاں۔ ان میں تو لحنوں کے ساتھ ساتھ سُروں کے زیروبم میں بھی تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ ان تبدیلیوں کا تعلق کسی خارجی منطق سے نہیں، اس کی خود اپنی منطق ہے۔ غالب نے بھی ایک اچھے فن کار کی طرح اپنے زمین و آسمان خود تخلیق کئے ہیں۔ اس دنیا کے وہ خالق اور سیاح دونوں ہیں۔ اس کے لئے وہ خلا کی اندھی گہرائیوں میں چھلانگ لگا کر ساتویں دن آرام کرنے نہیں بیٹھ گئے۔ وہ قدم قدم پر ٹوٹ ٹوٹ کر جڑتے رہے ہیں۔ وہ تمام عمر ٹکڑا ٹکڑا آسمان اور ذرّہ ذرّہ زمین جمع کرتے رہے ہیں۔ ان کے لئے آرام کہاں، وہ تو سانس کی آخری اکائی کو بھی اسی تلاش و جستجو کی نذر کر گئے۔ شخصیت کی اس تعمیر میں انہیں تخریبی مراحل سے گذرنا پڑا ہے۔ یہ کائنات ہی غالب کی وہ تہہ دار شخصیت ہے جو لفظوں میں ڈھل کر ان کی شاعری بن گئی ہے جس میں دھوپ چھاؤں، اندھیرا اجالا، غم و خوشی، سیاہ سفید، جنت دوزخ، شیطان انسان سب کچھ ایک ہی وجود کے مختلف خلقی و معاشرتی تضادات کا ایک واضح نظام مرتب کرتے ہیں۔ غالب اپنی بنائی ہوئی دنیا میں انسان کی تنہائی کی پہلی آواز تھے اور یہی تنہائی ہر خالق کا مقدر بھی ہوتی ہے۔ غالب کو جو کائنات ورثے میں ملی تھی وہ آدم، شیطان اور خدا تین ٹکڑوں میں منقسم تھی۔ ان کی اپنی مستقل وحدتیں تھیں۔

شیطان ایک جرم کی پاداش میں جلاوطن ہو کر خدا اور اس کی مخلوق سے انتقام لینے کی کوشش کر رہا تھا اور آدم آسمانی تحفظات کے سائے میں زمین کی پیمائش میں لگا ہوا تھا۔ خدا اچھے برے اعمال کی میزان لئے آسمان کے پیچھے دونوں کا منتظر تھا۔ وقت کے ساتھ کائنات کا یہ روپ کوئی نہیں بدلا، ہاں ان ٹکڑوں کے ناموں میں ضرور تبدیلی آگئی ہے۔ سیاسی نظریات، ملک پرستی اور قومی و نسلی امتیازات کائنات کی اسی روایتی تقسیم کی لکیریں ہیں۔

لیکن غالب نے اپنی شخصیت میں جس دنیا کی تعمیر کی تھی وہ اس سے مختلف تھی۔ اس کو انہوں نے اپنے شعور و تجربات کے سہارے تخلیق کیا تھا اس لئے وہ خود خالق تھے، اسی لئے آسمانی تحفظات کی جگہ تشکیک و عدم یقینی ان کا نصیب ہوئی اور شیطان جو جلاوطن کر دیا گیا تھا، خود اس خاکی کے وجود میں سرایت کر گیا۔ غالب خود اپنے دوست، خود اپنے دشمن اور خود ہی اپنی میزان بن گئے۔

فرانس کے مشہور آرٹسٹ پکاسو نے اپنے فن کی تشریح کرتے ہوئے کہا ہے؛

"ہر حقیقت پیدا کرنی چاہئے۔ میں کبھی بہت بڑے جسم پر چھوٹا سا سر بناتا ہوں اور کبھی چھوٹے سے شریر پر بہت بڑا سر رکھ دیتا ہوں۔ میں دیکھنے والوں کی توجہ اس طرف موڑنا چاہتا ہوں، جدھر اسے جانے کی عادت نہیں ہے۔ میں دیکھنے والے کو وہ چیز دکھانا چاہتا ہوں جسے وہ میری مدد کے بغیر نہیں دیکھ سکتا"

سوال پیدا ہوتا ہے آخر پکاسو کو اس مشقت کی ضرورت کیوں پڑی، رنگوں کی مروجہ نقاشی اور فن کاروں سے منہ موڑ کر اسے رنگوں اور ریکھاؤں کی انجانی وادیوں میں کیوں بھٹکنا پڑا۔ وہ کون سی پُراسرار شے ہے جسے دیکھنے والے اس کی مدد کے بغیر نہیں دیکھ سکتے۔ یہی وہ سوالات ہیں، جن کا جواب دئے بغیر کسی اچھے فن کار کی تخلیقات کی روح تک رسائی ممکن نہیں۔ ہر بڑا آرٹسٹ اپنی اجنبی دنیا کا باسی ہوتا ہے جس کا وہ خود خالق بھی ہوتا ہے۔ غالب کی شاعری کا موضوع خود ان کی شخصیت ہے، اس کا لب و لہجہ روحانی کشمکش کی پیداوار ہے۔ اس کی تہہ داری ان کے ذہن کی عرفانی سطح کا پتہ دیتی ہے۔ اس کی وضع قطع اپنے عہد میں سب سے جدا ہے، اسی طرح جیسے ان کی شخصیت دوسروں سے الگ ہے۔ انہوں نے اپنی دنیا ہی کا سیاحت نامہ منظوم کیا ہے اور اسی لئے ان کے لب و لہجہ اور موضوعی تہہ داریوں پر کچھ اسی قسم کے اعتراضات کئے گئے جن کا سامنا آزادی کے بعد کی اردو شاعری کو کرنا پڑ رہا ہے۔ غالب اردو کے پہلے شاعر ہیں جنہوں نے خود برہنگی کو فن بنا کر جبلتوں کو لطافت عطا کرنے کی سعی کی ہے۔ یہ شاعری اپنے معاصرین اور پیش رؤوں کے برعکس کرنے کے لفظوں میں "الوھو" کی حرارت لئے ہوئے ہے۔ اس میں جس انسان کا کردار ابھرتا ہے وہ لاشعوری حرکت اور شعوری مختاری کے درمیان وجود کی ان سطحوں کو کریدتا نظر آتا ہے، جن ۔۔۔



مند۔ عہد کی نئی نقابیں ڈالی جاتی رہی ہیں۔ وہ اپنے اندر　مجھے جہنم کے عذاب کو سہتا ہوا مطرب اور سماج سے نئے سمجھوتے کر رہا ہے۔ اُس کا رشتہ اپنی تاریخ اور　معاشرے سے ٹوٹا تو نہیں ہے، لیکن اِس رشتے کی دستاویز اُسے نئے سرے سے تیار کرنی پڑی ہے۔ وہ کسی　داخلی یا خارجی خود فریبی کا شکار بھی نہیں ہے۔ امید و یاس کی سرحدوں سے دور وہ اپنے سانسوں کی شعلگی ہی سے وہ قوت نچوڑ لیتا ہے جو زندگی کرنے کے لئے ضروری ہے۔ اُس کی ترکیب میں مسلسل رفتار ہی زندگی کا نام ہے

ایک چکر ہے مرے پاؤں میں، زنجیر نہیں　　　　میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

وہ سسی فس کی طرح طلوع سے لے کر غروب تک سورج کی چٹان کو اپنی اُڈری شکستوں کے ساتھ ڈھکیلتا ہے...... سورج اسے پھر سے پھسلتا نظر آتا ہے تو وہ ڈر کر بھاگتا نہیں، بلکہ مسکراتے ہوئے دوبارہ اُسے ...... ڈھکیلنے لگتا ہے، اسی سعیٔ لاحاصل میں اُس نے ایک لذت کا پہلو بھی نکال لیا ہے۔ ہجوم ناامیدی کی تاریکیوں میں وہ اُسے چراغ کی طرح لئے پھرتا ہے۔

اس ہجوم ناامیدی خاک میں مل جائے گی　　　　وہ جو اک لذت ہماری سعیٔ لاحاصل میں ہے

حالی نے اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی ہلکی سی لکیر دیکھ کر اُسے حیوانِ ظریف کہا ہے، لیکن دراصل یہ مسکراہٹ ریگستان کی اُس چمکتی ہوئی ریت سے مماثل ہے جو شعاعوں کے اُبھرتے ہی جھلملی ہوئی نہر بن کر دھوکہ دینے لگتی ہے لیکن جیسے جیسے آدمی اس کی طرف بڑھتا ہے وہ دور سے دور تر ہوتی جاتی ہے۔ دوستوفسکی کا "پاگل" بھی روحانی کرب کی ایک خاص سطح پر پہنچ کر مسکرانے لگا تھا۔ اُس کے منہ سے بار بار یک جملہ نکلتا تھا: "جو کچھ ہے وہ ٹھیک ہے۔" یہ مسکراہٹ وقت کے سیلاب کے سامنے انسانی بے مائگی کا طنزیہ اعتراف ہے جو خود اُس کے وجود کا حصار بھی ہے۔ میر آنسوؤں تک آتے آتے ہی دوہرے ہو گئے تھے۔ غالب کے اعصاب زیادہ مضبوط تھے۔ وہ آنسوؤں سے گذر کر مسکراہٹ تک پہنچ چکے تھے۔

...... غالب وقت کے لمحاتی وجود کے قائل ہیں۔ ہر لمحہ اُن کی موت کے اعلان کے ساتھ اُن کے نئے جنم کی بشارت ہوتا ہے۔ وہ زندگی بھر بار بار مر کر پیدا ہوتے رہے ہیں اور واقعی اگر ابتدا سے انتہا تک ایک ہی زندگی جینا پڑ جائے تو سانسوں کا بوجھ اُٹھائے نہ بنے۔ غالب کی شخصیت کئی ہلکے، گہرے رنگوں کے امتزاج سے عبارت ہے۔ جس طرح خدا نے خاص اپنی ایمج میں انسان کو تخلیق کیا ہے اُس کار بھی اُسی طرح اپنی تخلیقات کے وسیلے سے اپنی شخصیت کا اظہار کرتا ہے۔ ہر انسان کی شخصیت اُس کے عرفانی شعور کے مطابق بنتی بگڑتی رہتی ہے۔ شہہ داں آرٹ شخصیت کی تہہ داریوں میں پروان چڑھتا ہے۔ اُس میں خارجی کوشش کا دخل کم ہوتا ہے۔ شخصیت خود اپنے انفرادی مزاج کے مطابق اظہار و بیان کی سمتیں متعین کر لیتی ہے۔ زبان کو اپنے مزاج سے ہم آہنگ کرنے کے لئے انہیں اُس کے روایتی دبستان سے بغاوت بھی کرنی پڑی ہے۔ اُن کی شخصیت کی طرح اُن کے شعروں میں بھی کئی تہیں ہوتی ہیں۔ ہر دو لفظ خواں کے ذہن تک کا مد سرا آتا ہے، ترشے ہوئے ہیرے کی مانند مختلف رنگوں کو اپنے اندر سمیٹے ہوتا ہے۔ اُن کے شعر اسی لئے کسی ایک رنگ کی سطح پر کبھی نہیں ٹھہر پاتے۔ اُن سے ایک ساتھ کئی کئی شعاعیں پھوٹتی نظر آتی ہیں۔ اِس شاعری کا فکری قطعیت سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ کہیں کہیں تصوف کی روایتی پرچھائیوں کے علاوہ اِس میں کسی مسلک یا عقیدے کی تلاش بھی بے سود ہے۔ غالب نہ جوابات سے مطمئن ہوتے ہیں، نہ خود مقصدی شاعروں کی طرح جوابات دیا پسند کرتے ہیں۔ اُن کا متجسس ذہن تو ہر مقام پر ایک سوالیہ نشان لگاتا نظر آتا ہے۔ اُنہوں نے ایک ہوش مند انسان کی طرح زندگی کے سرد و گرم کی یاترا کی ہے۔ حقیقت کا مفہوم اُن کے یہاں بہت کشادہ اور ہمہ جہت ہے۔ اِس کا کوئی ایک رُخ یا زاویہ نہیں ہے۔ وہ بیک وقت کئی چہرے لیے نمودار ہوتی ہے۔ حقیقت کا یہ آفاقی تصور غالب سے پہلے اُردو شاعری میں مشکل ہی سے نظر آتا ہے۔ غالب کی شعری دنیا میں جو مظاہر نظر آتے ہیں، اُن کی دھڑکن حقیقت کا یہی بدلا ہوا روپ ہے۔ حقیقت کے اِس وسیع ادراک نے ان کی نظر کو کئی سمتوں



بکھیر دیا ہے۔ اشیا کے نئے نئے داخلی و خارجی رشتوں کی تلاش اور اُن کی اَن جانی ہیئتوں کے سُراغ نے اُن کے آرٹ میں ایک عجیب قسم کی کائناتی شان پیدا کر دی ہے۔ اس میں وقت کے بہاؤ کو تاریخی ادوار مرتب نہیں کرتے، وہ خود فن کار کا شعور اُسے حرکت عطا کرتا ہے۔ یہاں وقت ماضی، حال اور مستقبل کے محدود دائرے میں محدود نہیں ہے۔ وہ تینوں سمتوں سے یک ساتھ گذرتا محسوس ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ غالب کی شاعری میں الفاظ و معانی کے درمیان کوئی لغت کام نہیں کرتی۔ اُنہوں نے لفظوں میں اپنی سانسوں سے گرہیں لگائی ہیں، لیکن اُن کے کسی ایک شعر یا شعر کی کسی ایک سطح پر کوئی رائے قائم کر لینا دُرست نہیں۔ غالب نے اپنی شاعری میں اپنے وجود کو بکھیرا ہے۔ اُن کا کلام اُن کی مجموعی شخصیت کا ترجمان ہے۔ کنارے کی موجوں کی چہل پہل سے سمندر کی گہرائیوں کا اندازہ ممکن نہیں اور یوں بھی غالب ہر کسی کے ساتھ اور ہر وقت بے تکلف ہو جانے کے عادی بھی نہیں ہیں۔ وہ اپنی زندگی کی طرح اپنی شاعری میں بھی ہر جگہ لئے دیئے رہنے کے عادی ہیں۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے کسی بڑے ذہن کو پورے طور سے سمجھنے کے لئے سمجھنے والے سے بھی اُتنے ہی بڑے ذہن کا مطالبہ کیا ہے۔ کسی حد تک یہ دُرست بھی ہے۔ کم سے کم اُردو میں غالب کے سمندر میں تو اس کی سچائی سے انکار مشکل ہوگا۔ غالب کے فن کی مجموعی رُوح کو پانے کے لئے قاری میں عرفانِ ذات کی روشنی کی ضرورت ہے، جس کے بغیر غالب فہمی میں بھی اسی قسم کی غلطیوں کا امکان ہے جیسی سردار جعفری نے کیں۔ [illegible] اس کو سمجھنے میں کی ہیں! عرفان اور عقیدہ میں فرق ہے۔ عقیدہ غیر منطقی یقین کی درستی میں ہزاروں سال پُرانے آسمان اور کہنہ دھرتی کے وجود کا اثبات کرتا ہے۔ اس کے تحت آدمی ابتدا سے انتہا تک ایک ہی زندگی کا بوجھ ڈھوتا رہتا ہے۔ عرفان عقیدہ کی ضد ہے۔ عرفان کی تشکیل لمحہ بہ لمحہ موت و زندگی کی براہِ راست کشمکش کرتی ہے۔ قاری کی عقیدت زدگی غالب جیسے شاعر کے سمجھنے میں تو بہت بڑی رُکاوٹ بن جاتی ہے۔ غالب تلاش و جستجو کے جویا، اور عقیدت ہر ذہنی تجسس کی دُشمن!

وقت بڑے سے بڑے پہاڑ کو ریت بنا کر رکھ دیتا ہے۔ ہر آنے والے لمحے کا رُخ ماضی کی طرف ہی ہوتا ہے۔ ماضی کے اتھاہ سمندر میں بُلبلے کی طرح جو "حال" کا لمحہ اُبھرتا ہے، وہ ہوا کے دُوسرے جھونکے کے ساتھ خود بھی ماضی کی میراث کا جزو بن جاتا ہے۔ دیکھتے دیکھتے کتنے رویّے، اقدار اور اسلوب پُرانے ہو گئے۔ ترقی پسند تحریک شباب آنے سے پہلے تیس پینتیس سال میں بوڑھی ہو گئی۔ ابھی کچھ دن پہلے سماجی حقیقت نگاری کا ڈھول بجا کر جوش کی پُرشور آواز نے اپنے اِرد گرد کتنا مجمع اکٹھا کر لیا تھا، مگر آج وہ بھی محض یادگاروں کی چیز ہو کر رہ گئے۔ لیکن غالب آج بھی باقر مہدی، کمار پاشی، وزیر آغا، عقیل جعفری اور شہریار وغیرہ کی طرح میرے عہد ہی کے شاعر معلوم ہوتے ہیں۔ پچھلے سو سال میں وقت نہ جانے کتنی اہم تبدیلیوں سے گذرا ہے۔ سائنسی انکشافات نے ہماری سوچ کے انداز کو نئی وسعتوں سے آشنا کیا ہے۔ صنعتی پھیلاؤ نے دیکھتے دیکھتے معاشرہ کے تہذیبی نظام کو ہلا کر رکھ دیا۔ سماجی رشتوں کی نوعیتیں اور اقدارِ حیات کی تعبیریں روز بروز نئے پہلوؤں میں ظاہر ہو رہی ہیں۔ دو عظیم جنگوں کے بعد خود انسان کے ذہنی انتشار نے اپنے آپ کو خود کشی کے بھیانک اندھیروں میں ڈھکیل دیا ہے۔ مگر ان تمام تبدیلیوں اور ذہنی و علمی انقلابات کے باوجود غالب برابر ہمسری کا دعویٰ کر رہے ہیں۔ اُن کے اشعار آج بھی ہر گلی کوچے میں ساتھ ساتھ بھٹکتے ہیں، میرے دُکھ سکھ کی ترجمانی کرتے ہیں، میرے ذہنی ورُوحانی المیات کا تجزیہ کرتے ہیں۔ انھیں نہ میری جھلاہٹوں سے گھبراہٹ ہوتی ہے، نہ میری عُریانی و برہنگی سے برگشتگی ہے

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسد	ڈرتا ہوں آدمی سے کہ مردم گزیدہ ہوں
مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی	ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا
نہ گلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز	میں ہوں اپنی شکست کی آواز
ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا	نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا
توقع خستگی میں ان سے تھی کچھ داد پانے کی	وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغِ ستم نکلے

مستان طرزی

غالب اور جدیدیت

گوئٹے نے ایکرمن سے دورانِ گفتگو ایک بار کہا تھا کہ

"فلسفے والے مفکرین کے افکار کا تجزیہ کرتے تک جاتے ہیں اور الگ الگ عناصر کا ماخذ بتانا اُن کا شیوۂ تحقیق ہوتا ہے،
لیکن کیا اس سے ایک بڑے فن کار یا مفکر کی انفرادی شخصیت یا اُس کی مخصوص اُپج کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے کہ
کوئی شخص گوئٹے کی تحلیل اور تجزیہ اس طرح کرے کہ اُس نے اتنے بکرے، اتنی سبزی ترکاری اور گندم کھائی۔ ان
سب کو ملا کر گوئٹے بن گیا، لہٰذا گوئٹے کی ماہیت سمجھ میں آگئی۔" [1]

جدید مختلف تنقیدی نظریات و عملیات نے اُردو ادب کے تنقیدی سرمائے میں کچھ اسی قسم کا اضافہ کیا ہے، بلکہ اب یہ تنقیدی اور تجزیاتی عمل صرف گوئٹے ہی کی ساخت ہوئی منزل تک آ کر نہیں رک جاتا، مبادا کچھ اور بڑھ کر یہ بھی پتہ لگانا چاہتا ہے کہ وہ ترکاری اور سبزی یورپ یا ایشیا کی کس منڈی سے خریدی گئی، گندم کس طرح اُگایا گیا، آب پاشی کے لئے منڈا ین یو۔ ایس۔ اے پمپنگ سٹ بھی استعمال کیا گیا تھا یا نہیں؟ اس عمل دروں بینی اور شعور و لاشعور کی جغرافیہ دانی نے ایک طرف معاشی نقطۂ نظر کو فروغ دیا اور زندگی کے ہر شعبے میں، شخصیت کے ہر پہلو میں معاشی اسباب کو کارفرما پایا، تو دوسری طرف نفسیاتی نقطۂ نظر نے حیات حاصل کیا اور گویا کوں پیچ در پیچ زندگی کے ہر اقدام کو فرائڈی ترازو پر تولا اور شخصیت کی شعوری اور ذہنی تشکیل کی سراغ رسانی کی۔ نتیجے کے طور پر قصرِ ادب میں ایک دروازے سے عبدالرحمٰن بجنوری نقل میں ہندوستانی الہامی کتاب وا بے داخل ہوتے ہیں جو غالب کو ورڈز ورتھ، شکسپیئر، ٹیگور، برکلے، اسپینوزا اور ہیگل کے دوش بدوش لا کھڑا کرتے ہیں، تو دوسری طرف دوسرے دروازے سے یگانہ اپنی چنگیزیت کے بل پر سر بسر پیکار نظر آتے "ہوں غالب کا چچا مرزا یگانہ" کہتے ہوئے داخل ہوتے ہیں۔ اور صولتیت کے عقیدہ آباسے مار مارطلب ہوتے ہیں اور جو غالب کے سارے اشعار پر مالِ مسروقہ کی مُہر لگاتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ خواجہ غلام حُسین کمیداں کی امارت کے واقعے نے یا غالب کے پانچ سال کی عُمر میں یتیم ہو جانے کے حادثے نے قرض کی مے پینے کے المیے نے یا داغِ حسرتِ دل شمار کرنے کے تجربے ہی نے غالب کی مکمل ذہنی تشکیل نہیں کی بلکہ بالفاظ مجنوں گورکھپوری "وہ ایسی ہستی تھا جس کے ذہن کی تعمیر میں خارجی حالات و اسباب کی غیر شعوری کارفرمائی جس قدر بھی رہی ہو، لیکن وہ کسی خاص تحریک کا نتیجہ نہیں تھا وہ تاریخ کا فطری اور بے ساختہ پیداوار تھا۔"

---

[1] ... عبدالحکیم



قدیم اور جدید کا مسئلہ اتنا ہی پرانا ہے جتنا خود ادب کا وجود۔ دسودگی عصر کے کاندھوں پر ایک نظام ہستی سیاسی، سماجی، معاشی اور ثقافتی نظریات و اقدار کی لاش جب اٹھتی ہے تو دوسرے نظام حیات کی طرح سیری ایالوم پیدائش ہوتی ہے۔ ایک معاشرہ دم توڑتا ہے تو دوسرا جنم لیتا ہے۔ ایک کے زوال کے بجھتے چراغ سے دوسرے کے عروج کی شمع نور آگیں ہوتی ہے۔ ایک تہذیب کی تمت ہی پر دوسری کی بسم اللہ ہوتی ہے۔

چنانچہ تقلید و تجدید کا ترک واحد اور ادب میں اس کی ضرورت نقادانِ فن کا دلچسپ موضوع ہے۔ "جدیدیت" کوئی ایچ ٹو او (H₂O) کا فارمولا نہیں کہ جس کے سانچے میں ہمیشہ پانی کا قطرہ ہی آئے گا اور نہ جدیدیت "نیو تھری" کا اسٹینڈرڈ سائز موزہ ہے جو ہر جوان کے پاؤں میں مناسب ہی آسکے گا۔ دنیائے ادب میں بدلتے ہوئے نظریات و اقدار قابل قبول نہیں جب تک اُن میں حیات گیر خصوصیت نہ ہو، رُوحِ عصر کے اظہار کی طاقت نہ ہو۔ جب تک اُن میں ہر آن اور ہر لحظہ تغیر پذیر دنیا کی لیلائے حیات کے گیسو پر، تھا تک کردار روؤں کی بے نقابی کی صلاحیت نہ ہو، کرب ہستی کی ترجمانی کی قوت نہ ہو اور دامنِ زندگی کی قبائے تار تار کی آبرو بچا لینے کی عظمت نہ ہو۔ اِن خصوصیات کے ساتھ ہی جدیدیت صحیح جدیدیت کہلا سکتی ہے۔ اِس کے باوجود میں صرف غالب کے افادی پہلو ہی کا قائل نہیں بلکہ اس کے جمالیاتی پہلو کو بھی شانہ بہ شانہ دیکھنا چاہتا ہوں۔

غالب نہ صرف زندگی کا شاعر ہے بلکہ فن کا بھی۔ زندگی کے تجربات کے ساتھ ساتھ فن کی متوازن اور مناسب ہم آہنگی کی ضرورت جوش شاہدی مرحوم کے الفاظ میں دیکھی جا سکتی ہے ؎

ہے وہ ادب لطافتِ احساس کا کفن ٭ جس میں ہو تجربوں سے بھی چھوٹا لباسِ فن

غالب نے تجربوں کے جسم پر فن کا جو لباس چڑھایا ہے وہ نہ کہیں سے چھوٹا ہے نہ تنگ ہے اور نہ ڈھیلا۔ اور پھر تجربات بھی کچھ ایسے متناسب الاعضاء واقع ہوئے ہیں جو لباس کی دیدہ زیبی کا سبب بنتے ہیں۔

غالب کو ہم اردو کا پہلا بڑا مفکر شاعر کہہ سکتے ہیں۔ وہ فکر و شعور کی دنیائے عظیم کا ایک ایسا خلاق ہے جو ستروں اور ستاروں کو آفتاب سمجھتا ہے کیوں کہ نفسِ گرم کی ایک دولت ماورا کا عنصر بھی اس کی ذہنی ساخت میں کارفرما ہے ؎

دمے گرمے کہ من دادہ سرکش دہد ٭ گفتہ باشند کہ سخنے ہر کہ زمانے دارد

غالب اپنے قدیم ماحول اور روایتوں میں سانس لیتے ہوئے بھی جدیدیت کی تابناکی کو دیکھ لیتے ہیں۔ اُن کی جدیدیت اور موضوع و اسلوب دونوں ہی پر دوں سے جھانکتی ہے۔ بیاں کے لئے کچھ اور وسعت کی تمنا اسلوب میں جدیدیت کی غماز ہے (خواہ محل حسین حال کی تعریف ہی کے لئے سہی) اور مشاہدۂ حق کی گفتگو میں بادہ و ساغر کی ناگزیری اقلیم افکار میں تجدید کی آئینہ دار۔ غالب ہی نے غزل کو ایک نئی دنیا، ایک وسیع زمیں، کشادہ و بلند آسماں، لامتناہی دشت و در اور ایک برگ و بار۔ آگیں نصاری جس میں بیرنگی حیات اور پیچیدگی زیست کے اچھے اور بُرے، چھوٹے اور بڑے اور اپنے اور دوسروں کے تجربات گوناگوں جلوؤں کی صورت میں رقص کناں ہیں۔ تقاضۂ سخن کی ہر ادا اِس حقیقت کی غماز ہے کہ فن کار کو ایک جہاں نو کا انتظار ہے۔

غالب سے پہلے اردو شاعری کی مانگ پر جارحیت کا سیندور تھا۔ رُخ پر پژمردگی و رلودگی کا غازہ۔ لفظی زور آزمائی اور مضمون آفرینی کے دبیز پردوں میں اس کا حسنِ انبساط آگیں جلوہ ریز نہیں ہو پاتا تھا۔ قصرِ شاعری میں ایک معروف شہنشاہِ اقلیم سخن قرص ہی کی مے پی کر شیخ و زاہد ملا و شیخ کی صورت میں اپنی مانع مستی کے رنگ لانے کی حقیقت سے ماجرا ہوتا ہوا ایک خاص انداز میں آتا ہے۔ جس کے آگے پیچھے کعبہ و کلیسا ہے جس کو واعظ تنگ نظرے کافر اور کافر نے مسلمان سمجھا، جو مسائلِ تصوف کے طرزِ اظہار میں بھی وہ کمال رکھتا تھا کہ اگر بادہ خوار نہ ہوتا تو ولی سمجھا جاتا، جس کے نزدیک دنیا بازیچۂ اطفال تھی اور جو راہِ سخن پر تقلید کا قائل نہ تھا کیوں کہ اُس کا نظریہ تھا کہ ؎



زلّہ بردار کس چرا باشم　　　　　من ہمایم مگس چرا باشم

اور جب یہ زلّہ برداری اس طبعِ جدت پسند کو گراں گزرتی ہے تو طرفِ تنگنائے غزل کا شکوہ کناں ہوتا ہے اور اقلیمِ سخن کی جہاں گیری و جہاں بانی صرف اسی کا حصہ تھی جس کے حصول میں کچھ لوں کے لئے راہ میں رکاوٹ سی آئی اور جو تیمور کے اظہارِ خیال کی بنیاد میں کہ نوجوان ذہن ہے، اگر خود کو سنبھال نہ سکا تو بہل کیسے گئے گا۔ لیکن جلد ہی منزل گیری کا وہ مقام آیا کہ جہاں اور نگِ سلیماں بھی ایک کھیل تھا اور اعجازِ مسیحا بھی ایک بات تھی۔

نئے اور پرانے اقدار کے درمیاں ایک ناقابلِ محسوس قسم کی تبدیلی کارفرما رہتی ہے جس کی ریزیں ہر دلی سی رہتی ہے۔ یہ لہر قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ روایات کی آئینہ دار بھی ہوتی ہے اور تجدید کی پیامبر بھی۔ اس لئے نئے اقدار و نظریات بھی مکمل طور پر نئے نہیں ہوتے، بلکہ روایات کے رنگ و روغن ہی سے اُن کا فکری خمیر تیار ہوتا ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ تجدید دراصل تقلید ہی کے بطن سے خونِ حیات حاصل کرتی ہے اور یہ عمل فن کار کے یہاں غیر شعوری طور پر ہوتا رہتا ہے اور جب یہ عمل تاریخ کے اعتبار سے تعمیری اور متوازن ہو تو معیارِ ادب بنتا ہے اور جب ناہموار اور غیر تعمیری ہو تو دیوانِ جرکین بن جاتا ہے۔

سرور صاحب کے خیال میں اُن (غالب) کی عظمت اور مقبولیت کا راز یہ ہے کہ وہ بعض حیثیتوں سے پرانے ہیں اور بعض حیثیتوں سے نئے۔ اُن کی لے میں نہیں اُن کی آواز کے ساتھ اُن کے اور آنے والے دور کی کتنی ہی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ غالب نے اپنی تہذیب اور معاشرے کی جواں مرگ لاش کو اپنی آنکھوں کے سامنے اُٹھتے دیکھا تھا۔ تہذیب فرسودہ، مضمحل اور بے کار لاکھ سہی وہ غالب کے دور کی تہذیب تھی۔ وہی تہذیب جس کے چراغ نے شیراز و اصفہاں کی شمع سے کسبِ نور کیا تھا، وہی تہذیب جو صدیوں کی ریاضت کا ثمرہ تھی، جس میں ادائے نور جہاں کا بانکپن تھا تو عدلِ جہانگیری کی جلوہ آرائی، جس میں جلالِ اکبری تھا تو جمالِ شاہ جہانی، اور اسی لئے کہیں کہیں اس تہذیب کی جواں مرگی کا مرثیہ بھی نظر آجاتا ہے تو ظلمت کدہ میں شبِ غم کا جوش ہو جاتا ہے اور شاعر کسی کی دعا کو بھی تلافی کے لئے کم تر شمار کرتا ہے، کیوں کہ غریب غالب پر کچھ اور بھی ستم ہوئے تھے۔ یہ کچھ اور ستم خوردگی کی تکلیف کا احساس اپنے ماضی کے قیمتی موتیوں کے لُٹ جانے کا احساس یہاں ہی تو ہے۔

بیدل کے رنگ کے اشعار سرور صاحب کے خیال میں رومانی ہیں اور رومانیت وہ وادی ہے جہاں ایک طرف جذبات کے سلسلے فن کار کے رفیقِ سفر ہوتے ہیں تو دوسری طرف تخیل کی سیر اور نرم گھاس فرشِ مخمل کا لطف دیتی ہے۔ یہ تخیل پرستی ایک نئے زمین و آسمان اور ایک نئے شب و روز سے روشناس کراتی ہے۔ چنانچہ یہی رومانیت غالب کی انانیت کو تقویت بخشتی ہے اور اسی طرح ذہنی کے سہارے شاعر "واقعہ سخت ہوئے" پر بھی جانِ عزیز کے لئے تاب لانے کا متمنی نظر آتا ہے۔ اس انانیت کی تشکیل میں صرف رومانیت ہی کو سبب کُل کی حیثیت نہیں حاصل ہے بلکہ غالب کی رسمی انفرادیت کا بھی بہت بڑا ہاتھ ہے جس نے اُسے پہلودار اور نوکیلا بنا دیا ہے۔ غالب کی اس انانیت نے خود رومانیت کی گود میں پلی تھی اور جس کے رنگ و روغن کی کیمیائی آمیزش، تہذیبوں کی کشمکش اور صحت مند ذہنی تشکیک سے پیدا ہوئی تھی، غالب کو ایک نیا اندازِ نظر بخشا تھا، ایک اچھا تاطرز سخن عطا کیا تھا جو دنیا میں اور بہت اچھے سخن وروں کے ہوتے پر بھی اندازِ بیاں کے چلنے میں کچھ اور تھا اور اس نئے پن اور اچھوتے پن نے، جب غالب کو کلکتہ کا سفر کرنا پڑا، تجدید پسندی کی ایک واضح صورت اختیار کرلی۔ اگرچہ غالب کا یہ سفر بھی زندگی کے اُن خاص امر سے متعلق تھا۔ کلکتہ کی فضا مغربی افرادِ قوم سے جلوہ زار بنی ہوئی تھی اور سرمایہ دارانہ نظام کی زریلی چاندنی سر بفلک عمارتوں کی سپیدی پر اترا رہی تھی ہوکر ایک مرکب قسم کی دلکش چمک پیدا کر رہی تھی۔ ایک نئی تہذیب اور ایک نئے نظام کی جھلکیاں غالب نے دیکھیں۔ مغربی اقدار، علم و فن سے بہرہ ور ہونے کا کچھ موقع ملا اور پھر اِن عناصر نے اُن کی جدیدیت کی تشکیل میں بڑی مدد کی۔ ان نئے نظریات نے اُس کو تقلید پرستی اور رسم و راہِ عام

خلاف ایک الگ راستہ تھا اور یہ وہ بلندی ہے



جس پر چڑھ کر غالب نے تقلید وفا فرمادگو بھی معاف نہیں کیا
تقریت ہیں مر سکنے والے کو کبھی کو بھی سرگشتۂ رسوم و قیود کہہ کر پکارا۔ غالب نے نئے نظامِ حیات پر لبیک کہا
ں کی ابتدا آئینِ اکبری پر مقدمہ میں کیا اور اس کی ترویج کا استعمال کیا۔ کلکتہ سے لائی ہوئی وہی تبدیلی جو ان کے شعور و وجدان کے راستے سے ذہن کی دنیا میں داخل ہوئی تھی، اس لئے اس نے ایک مستقل جگہ بنالی تھی۔ جب سر سید نے آئینِ اکبری کی تصحیح کی اور غالب سے اُس پر تقریظ لکھنے کی فرمائش کی تو کلکتہ سے آنے کے بیس برس بعد تقریظ کے بجائے ایک نظم لکھ کر بھیج دی۔ جس کے اشعار اس حقیقت کے ترجمان ہیں کہ شاعر کی تجدید پسندی ایک ساتھ برگ و بار کی حامل ہو چکی تھی سو سال سے زائد عرصے کے بعد آج بھی یہ نظم حیات آفریں نظام نو کی تمہید جدیدیت کو اُسی رعنائی و زیبائی کے ساتھ گلے لگاتی نظر آتی ہے ؎

صاحبانِ انگلستاں را نگر	شیوہ و انداز اینان را نگر
تا چہ آئیں ہا پدید آوردہ اند	آنچہ ہرگز کس نہ دید آوردہ اند
زیں ہنرمنداں ہنر بیشی گرفت	سعی بر پیشینیان پیشی گرفت
حق ایں قوم است آئیں داشتن	کس نیارد ملک بہتر زیں داشتن

موجودہ علوم اور سائنس کی ترقیاں موجودہ زندگی کو اگر ممتنع تعاون بخشیں تو پھر یہ کارزارِ حیات گلستانِ ارم بن سکتا ہے۔ اور اسی لئے غالب نے آئینِ اکبری پر ایک نئے نظام کو سراہا ہے۔

غالب نے فارسی اشعار میں اپنے نظریاتِ شعری کو بھی بڑے واضح انداز میں بیان کیا ہے۔ ادب برائے ادب یا برائے زندگی کی تفریق اُن کے سامنے شاید آج کی طرح واضح شکل میں نہیں رہی ہوگی۔ اس کے باوجود اُن کے نظریاتِ شعر و ادب میں کارِ تجدید کا استقبال کرتے نظر آتے ہیں ؎

غزل گر نہ باشد نوائے دگر	سرِ دل سلامت ہوائے دگر
اگر مجلس آرائی رعود بایست	بر آتش فگندن نمک شود نیست

غالب نے میر مہدی مجروح سے فرمایا کہ قصہ پڑھ کر کیا کرو گے منطق، فلسفہ اور دوسرے علوم کا مطالعہ کرو
یہی وہ انانیت پسند شاعر ہے جس کی نگہہ گرم سے آگ ٹپکتی ہے لیکن اسی آگ سے حسن و جمال گلستاں میں چراغاں ہے۔ یہی وہ مسعود رندِ بلانوش ہے جس کا دل ہجومِ فکر سے مثلِ مے لرزتا تھا کیونکہ شیشہ نازک تھا اور صہبا آبگینہ گداز تھی۔ قربان اسی مستی پر اور نثار ایسی بے خودی پر جو اپنے دامن میں وفورِ خود آگاہی کی دولت رکھتی ہو۔ یہ ہجومِ فکر عام رندوں کی قسمت کہاں۔ وہ فرنگی ارمانِ اقتدار، سیاست اور یوسفانِ رلیمائے سلطنت کو متنبہ کرتا ہے کہ دلوں کی زحمت ایک جہاں کو ویران کر سکتی ہے کیونکہ دشت بھی غبارِ خاطرِ افسردگاں کا سامانِ حشر خیز ہے اور جوش اشک سے جو پیہم طوفاں کئے ہوئے بیٹھا ہے اس لئے اس سہل آفرینا یکی کو نہ چھیڑا جائے۔

منزل دور، راہ دشوار، مسافر تنہا، پھر بھی اک برگ ہم سفر ملے پر اُس انانیت پسند کو اُس کی رہبری قبول کہاں، وہ تو خضر کی پیروی کو لازم نہیں سمجھتا۔ ایسی راہ پر اکیلا راہ سے سنگِ گراں ہٹاتا ہوا پندار کے صنم کدہ کو ویران کرتا ہوا ئے دشت و دراو سے آسمان و زمیں کے نشۂ بے جستجو سے سرشار ماضی، حال اور مستقبل بہترین ادوار کا محبوب و مقبول شاعر بڑھا جا رہا ہے اگرچہ عشق کی عمارت گر سے شرمندہ ہے کہ حسرتِ تعمیر کے سوا گھر میں خاک نہیں ہے لیکن آئیے ذرا ہم بھی جھانک کر دیکھیں کہ اُس حسرتِ تعمیر کے پردے میں کائنات کی کتنی لامحدود پہنائیاں پوشیدہ تھیں۔ کتنے اصنامِ ناتراشیدہ آج پتھروں کے سینے چیر کر باہر نکل پڑے اور کتنے نغماتِ ناسرائیدہ ساز کے تاروں کو توڑ کر سر بزمِ انجمن دعوتِ غور و فکر دے رہے ہیں۔ ▲

جعفری

کلامِ غالب میں شعری پیکر تراشی

ایک اشاراتی جائزہ

غالب کی وفات اور "اپالو ۸" کی اڑان کا درمیانی عرصہ کچھ کم عرصہ نہیں۔ پورے سو برس۔ اِن سو برسوں میں دنیا کی تاریخ اور جغرافیہ میں کیا کچھ تبدیلیاں رونما نہیں ہوئیں۔ اِن سو برسوں میں انسانی زندگی نے کیا کچھ انقلاب نہیں دیکھے۔ بنی نوعِ انسان نے ایک دوسرے پر اپنی وحشت حماقت اور اپنی قدرت کا اظہار کرنے کے لئے اِس عرصے میں دو دو عظیم جنگیں [illegible] تقسیم ہوئے۔ شہر اُجڑے اور بسے۔ تاریکیاں سمٹیں اور بکھریں۔ سائنس اور علم نفسیات نے زندگی اور انسان کے متعلقات کو از سرِ نو سمجھنے اور پرکھنے کی کوشش کی۔ تہذیب اور کلچر جیسے الفاظ کے معنی بدل گئے۔ ادبیاتِ عالم کے معیار یکسر تبدیل کر دئے گئے۔ لیکن ان تغیراتِ زمانہ کے باوجود فن کاروں اور شاعروں میں سے کچھ نام اپنی اپنی جگہ پر پہاڑوں کی طرح اٹل رہے اور تغیرات کی آندھی انہیں اپنی جگہ سے ایک انچ بھی تو نہ کھسکا سکی۔ اگر ہم ادبیاتِ عالم پر ایک اچٹتی سی نگاہ [illegible] دیں میں ہمیں ہومر، ورجل اور شیکسپیئر کے ساتھ ایک نام غالب کا بھی نظر آتا ہے۔ غالب جس نے ہر زمانے کی [illegible] کا زندہ ہم عصر کی طرح ساتھ دیا اور جس کا کلام آج بھی اسی طرح زندہ و تابندہ ہے، جس طرح [illegible] ہر [illegible] کے باوجود پہلے جیسا ہی زندہ و تابندہ رہتا ہے۔ نئی زمانہ جب کہ بیشتر نئے اذہان کے نزدیک جدیدیت [illegible] کا واحد معیار ہے اور سارے اردو ادب میں ایک انتہائی شدید غیر کلاسیکی اور غیر رومانی فضا پھیلی ہوئی ہے، غالب کی شاعری کا جادو نہ کم ہوا ہے نہ پھیکا پڑا ہے۔ آج غالب اپنے بزرگوں (مثلاً میرؔ اور سوداؔ)، اپنے ہمعصروں (مثلاً ذوقؔ اور مومنؔ) اور اپنے چھوٹوں (مثلاً اقبالؔ اور جوشؔ) کے مقابلے میں ہمارے ذہنوں سے زیادہ قریب ہیں۔ شاید اس لئے کہ آج کا دور غالب کے دور سے کئی لحاظ سے ملتا جلتا ہے۔ غالب کے دور کے مسائل خواہ وہ سماجی ہوں یا نفسیاتی، تہذیبی ہوں یا کسی اور حد تک اسی نوعیت کے تھے جو آج جدید شاعروں اور فن کاروں کا مقدر بن چکے ہیں۔ مرزا تفتہ کے نام اُن [illegible]

[illegible] کا یہ اقتباس

"مجھ کو دیکھو کہ نہ آزاد ہوں نہ مقید، نہ رنجور ہوں نہ تندرست، نہ خوش ہوں نہ ناخوش، نہ مُردہ ہوں، نہ زندہ۔ جئے جاتا ہوں، باتیں کئے جاتا ہوں ۔۔۔ جب موت آئے گی، مر رہوں گا۔ نہ شکر ہے نہ شکایت۔ جو تقریر ہے [illegible] حکایت ہے۔"

[illegible] ہے کہ اس دور کے ذہنی و روحانی انتشار اور سماجی و سیاسی ابتری کے تعلق سے غالب کا [illegible] یہ تھا جیسا کہ زمانہ جدید شاعروں کا اپنے دور کے تعلق سے ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں، بلکہ اگر

ہم ان باتوں سے الگ ہٹ کر خالص فنی اور شعری اقدار

سے موجودہ شعری روایات کی روشنی میں غالب کی شاعری اور فن کا جائزہ لیں تو بھی ہمیں کسی موقع و محل پر غالب کے (بحیثیت شاعر) پرانے یا فرسودہ ہو جانے کا شبہ تک نہیں ہوتا۔ شعری اور فنی لحاظ سے ہمیں نئی شاعری اور غالب کی شاعری میں خاصی گہری مماثلت نظر آتی ہے۔ یہاں میں بس سلسلے میں صرف ایک پہلو کی طرف اجمالی اشارہ کرنا چاہوں گا۔ نئی شاعری سے دلچسپی رکھنے والے ناقدین و قارئین کے لئے اب یہ بات راز نہیں رہ گئی کہ نئی شاعری میں علائم اور استعاروں کے علاوہ شعری پیکر کم و بیش ریڑھ کی ہڈی کی سی حیثیت رکھتے ہیں۔ اگرچہ غالب کے سامنے نہ تو کسی اور ایا پاؤنڈ کا یہ قول تھا کہ "ضخیم ضخیم کتابوں کی تصنیف کے مقابلے میں ساری زندگی میں صرف ایک پیکر کی تخلیق زیادہ اہم کام ہے" اور نہ ہی انہیں کسی گراہم ہاؤ GRAHAM HOUGH نے یہ سمجھایا تھا کہ "شعری پیکر اور علائم ہی پیچیدہ جذبات کے اظہار کا بہترین ذریعہ ہیں۔" لیکن ہمیں غالب کی شاعری میں جگہ جگہ خوبصورت اور تاثر سے بھرپور شعری پیکر جگمگاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ بالکل ویسے ہی ہے جیسے شیکسپیر کے زمانے میں اگرچہ شعری پیکر، علائم یا استعاروں کی کوئی باقاعدہ تھیوری موجود نہ تھی لیکن اس کے باوجود اس کے ڈراموں اور اس کی شاعری میں یہ خصوصیات بدرجۂ اتم ملتی ہیں۔ غالب چونکہ ایک ذہن جدید کے مالک تھے اس لئے فطری طور پر اُن کی شاعری اپنے زمانے سے بہت آگے تھی اور اُن کی شاعری کی قدر و قیمت متعین کرتے وقت ہم شعری پیکر تراشی یا علائم و استعارہ کو کسی بھی طرح نظر انداز نہیں کر سکتے۔ شعری پیکر جیسا کہ ڈے۔ لیوس نے اپنی مشہور کتاب THE PETIC IMAGE میں کہا ہے، دراصل وہ لفظی تصویریں ہیں جنہیں حروف بناتے ہیں۔ کبھی کبھی کسی تلمیح یا تشبیہ یا استعارہ کے ذریعے بھی شاعر شعری پیکر کی تخلیق کرتا ہے۔ علاوہ ازیں بعض اوقات شعری پیکر کی تشکیل ایسے فقروں یا جملوں سے بھی ہوتی ہے جو بظاہر تو سپاٹ معلوم ہوتے ہیں لیکن جو معنی کے اعتبار سے ہمارے تخیل کو زیادہ گہری معنویت اور دور رس تاثرات سے دوچار کرتے ہیں۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ شعری پیکر کسی نہ کسی سیاق و سباق میں بڑی حد تک ہمارے ذہنوں تک الفاظ کا استعاراتی تاثر منتقل کرتے ہیں۔ غالب نے چونکہ حیات و کائنات کا مطالعہ ہر پہلو سے کیا تھا اور اُن کے تجربات و مشاہدات کا کوئی اور چھور نہ تھا، اس لئے اُن کے پاس ABSTRACT خیالات و احساسات کا ایک ایسا سلسلۂ لامتناہی تھا، جس کا بہتر اظہار پیکر کی مدد ہی سے کیا جا سکتا تھا۔ اگر ہم کلامِ غالب کا ایک سطحی جائزہ بھی لے ڈالیں تو ہم بہ آسانی اس نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں کہ غالب کی شاعری میں بصارتی، سماعی، احساساتی اور استعاراتی ہر طرح کے پیکر خاصی بڑی تعداد میں مل جاتے ہیں۔ غالب نے پیچیدہ انسانی جذبات اور نفسیاتی کیفیات کے اظہار کے لئے جا بجا فنِ پیکر تراشی کا سہارا لیا ہے۔ اگر ہم غالب کے ان اشعار کا مطالعہ کریں:

موجۂ گل سے چراغاں ہے گذرگاہِ خیال
ہے تصور میں زبس جلوہ نما موجِ شراب

تماشا ہوا ہے گردشِ مینا سے جوشِ حلق
لرزے ہے موج مے تری رفتار دیکھ کر

تو اور آرائشِ خمِ کاکل
میں اور اندیشہ ہائے دور دراز

نظر لگے نہ کہیں اُس کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

تو پہلی نظر میں ہمیں ان اشعار میں استعمال شدہ شعری پیکر بہت زیادہ چونکانے یا متحیر کر دینے والے نہیں معلوم ہوتے بلکہ موضوعات کے لحاظ سے یہ مناسب ترین اور عام فہم شعری زبان کا حاصل معلوم ہوتے ہیں، لیکن قاری جیسے جیسے ان اشعار کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کرتا ہے اور اُن پر غور کرتا ہے تو اس کے دل و دماغ میں انبساط آمیز تحیر کی پرتیں ایک ایک کر کے کھلتی جاتی ہیں۔ ان میں سے بعض پیکر (مثلاً خمِ کاکل اور زخمِ جگر وغیرہ) بے حد روایتی ہونے کے باوجود غالب کے



ان اشعار میں ایک مالکل ہی نئی اور انوکھی تشکل اختیار کر گئے ہیں۔ یہ نہیں نہ صرف سوچنے پر بلکہ متذکرہ اشیاء کے داخلی جوہر کی تلاش و دریافت پر اکساتے ہیں اور شعر کے تخلیقی عمل میں ہمیں شامر کا شریک بنا جاتے ہیں۔

علاوہ ازیں ہمیں غالب کے یہاں خاصی بڑی تعداد میں ایسے اشعار ملجاتے ہیں، جن میں ہمیں بصارتی پیکر کا بے حد عامدہ اور نئے حد مناسب استعمال ملتا ہے۔ ان شعری پیکروں کا یہ استعمال محض کوئی حادثہ یا اتفاقی بات نہیں، بلکہ ایسا لگتا ہے کہ غالب نے شعوری طور پر اپنے مشکل خیالات اور پیچیدہ جذبات و تجربات کو زیادہ سے زیادہ ٹھوس انداز میں قاری تک منتقل کرنے کی کوشش کی ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل — جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا
[illegible]غ پا کر خفقانی یہ ڈراتا ہے مجھے — سایۂ شاخِ گل افعی نظر آتا ہے مجھے
[illegible]ری کب خاکستر و بلبل قفسِ رنگ — [illegible] نالہ نشانِ جگر سوختہ کیا ہے
اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا — لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں
[illegible]و دعوائے گرفتاریٔ الفت — دستِ تہِ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے
[illegible]وں کتنک جاؤں آنکھوں دکھلادوں — انگلیاں فگار اپنی خامہ خونچکاں اپنا
[illegible] سرودِ تپشِ غم کہاں تلک — ہر مو مرے بدن میں زبانِ سپاس ہے

ان اشعار [illegible] پہلے مصرعے میں اور کبھی دوسرے مصرعے میں جو لفظی تصویریں ملتی ہیں، وہ صرف بصارت سے تعلق رکھنے والی جمالیاتی حس کو [illegible] ہی نہیں کرتیں، بلکہ ان لفظی تصویروں کا شعری عمل اس سے کہیں زیادہ پہلودار اور معنی خیز ہے۔ ان [illegible] وہ فگار انگلیاں ہوں یا دودِ چراغِ محفل، پڑھنے والے پر گنجینۂ معنی کا طلسم آشکار کرتا چلا جاتا ہے۔ "دستِ [illegible] ہے" یا "لڑتے ہیں" شعری پیکر تراشی کے فن میں غالب کی خلاقانہ قوتوں کے مظہر ہیں کہ ان کے ذریعے سے اختصار کے ساتھ اور [illegible] ہے جسے کہنے کے لئے اور اس موثر انداز میں کہنے کے لئے بیسیوں صفحات بھی ناکافی ہے۔ یہ پیکر معشوق اور عاشق کی نفسیات اور اس کے تمام تلازمات کا اظہار کچھ اس انداز میں کرتا ہے کہ پوری تصویر سامنے آجاتی ہے۔ اسی طرح کا

"لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں"

جیسے جاگتے، شوخ اور کٹیلے معشوق کو لا کھڑا کرتا ہے۔

[illegible] میں استعاراتی اور احساساتی پیکر کی چند مثالیں پیش کرنی چاہوں گا۔

[illegible] رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے — نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں
[illegible]ے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا — نہ کہیں جنازہ اٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا
[illegible]ں ہوں اور ماتمِ یک شہرِ آرزو — توڑا جو تو نے آئینہ تمثال دار تھا
[illegible]ل ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر — ہم اس کے ہیں، ہمارا پوچھنا کیا

[illegible]

مندرجہ بالا تمام اشعار کا [illegible]
استعاراتی [illegible]
ہے تو [illegible]

رشید الدین

غالب کے کلام میں طنز کا پہلو

غالب کا نام ذہن میں آتے ہی مجھے رشید احمد صدیقی کا یہ جملہ یاد آجاتا ہے:

"مغلیہ دور نے ہندوستان کو تین چیزیں دی ہیں، ایک غالب، دوسرے اردو اور تیسرے تاج محل!"

یہ ایک اعلیٰ ترین اعزاز ہے جو آج کے ایک نقاد نے آج سے سو سال پہلے کے ایک شاعر کو دیا ہے۔ کوئی اور شاعر ہوتا تو اِس سے اُس کی عاقبت سنور جاتی، اور اُس کی روح ہمیشہ رشید صاحب کی احسان مند ہوتی، مگر یہ تو غالب ہیں، جنہیں اب تک ایسے کتنے ہی اعزاز مل چکے ہیں اور آج اُردو والے صد درجہ اہتمام کے ساتھ ساری دنیا میں اُن کی صد سالہ برسی منا کر انہیں اب تک دیئے گئے سارے اعزازات میں سب سے بڑا اعزاز عطا کر رہے ہیں۔

غالب بہت بڑے شاعر ہیں اتنے بڑے کہ سوائے اقبال کے آج تک اُردو دنیا اُن کی ٹکر کا کوئی دوسرا شاعر پیدا نہ کر سکی۔ اُن کا اُردو کلام گو کمیت (QUANTITY) میں بہت تھوڑا ہے مگر کیفیت (QUALITY) میں بہت زیادہ۔ باوجود غزل کی تنگیٔ داماں کے شاکی ہونے کے، غالب نے اِس میں وہ گل کاریاں اور معنی آفرینیاں پیدا کیں کہ اوروں کے قلموں پر مُہر لگا دی۔ اب تک غالب کے کلام پر جتنی شرحیں لکھی گئیں اور اُن کی زندگی اور کلام پر جتنی کتابیں اور مضامین معرضِ وجود میں آئے اُن کی وجہ سے اُردو میں غالبیات کا ایک مستقل موضوع پیدا ہو گیا اور غالب کے ساتھ ساتھ ماہرینِ غالبیات بھی جاوداں ہو گئے۔

اُردو ادب میں غالب کو جو مقام ملا، وہ محض ایک امرِ اتفاقی یا عقیدت مندی کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اُن کا کلام اتنا جاندار ہے کہ جوں جوں وقت گزرتا جا رہا ہے، وہ اہلِ ذوق کی توجہ اپنی جانب مبذول کراتا جا رہا ہے اور شعورِ انسانی میں ترقی کے ساتھ ساتھ اس میں نئے نئے معنی اور مفاہیم پیدا ہو رہے ہیں۔ دراصل بات یہ ہے کہ غالب اپنے دور سے سو سال پہلے پیدا ہو گئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے کلام کی جو قدر آج کی جا رہی ہے وہ اُن کے زمانے میں یا اُن کے مرنے کے فوری بعد نہ کی جا سکی۔ آج غالب کی جو قدر کی جا رہی ہے، اُس نے جہاں بہت سے معتقدین و ماہرینِ غالب پیدا کئے، وہیں کئی غالب شکن بھی پیدا ہو گئے، مگر اُن کی یلغار غالب کے مقام کے مضبوط قلعے میں ایک ننھا سا رخنہ بھی پیدا نہ کر سکی۔

غالب کا کلام بہت ہمہ پہلو ہے۔ کسی ایک مضمون میں اُس کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لینا ممکن نہیں ہے، اِس لئے میں نے اپنے اِس مضمون میں اُن کے کلام میں پائے جانے والے طنز کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ غالب بہت بڑے طنز نگار SETIRIST تھے۔ میری رائے میں اپنی سنجیدہ تحریروں میں طنز کے جو خوش گوار اور شگفتہ تیر انہوں نے چلائے ہیں، اُس میں سوائے کرشن چندر کے، کوئی اُن کا ثانی نہیں۔ علامہ فیض نے اقبال کو "ظریف، طرار اور حاضر جواب" کہا تھا لیکن



یہ خصوصیات اقبالؔ سے بھی زیادہ غالب ہیں تھیں۔ اُن کے انتہائی سنجیدہ اور واعظ قسم کے شاگرد حالیؔ نے اُن کی سوانح حیات "یادگارِ غالب" میں بار بار اُن کی شوخ طبیعت اور عامر جوابی وطنز کا ذکر کیا ہے اور جا بجا اُن کے لطائف بیان کئے ہیں۔

غالبؔ کے کلام کے طنزیہ پہلو پر بحث کرنے سے پہلے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے حالاتِ زندگی پر ایک نظر ڈال لی جائے، کیونکہ غالب کے کلام کے فکر کے ڈانڈے اُن کی زندگی سے ملتے ہیں اور اُن کے کلام (خصوصاً طنزیہ کلام) میں اُن کی زندگی کا پرتو نظر آتا ہے۔ مرنے کے بعد غالب کا سا خوش قسمت شاعر شاید ہی کوئی ہو، مگر جب تک وہ زندہ رہے، انتہائی تکلیف دہ حالات میں زندگی بسر کی۔ اُن کے معاشی، معاشرتی اور خاندانی حالات اُن کے نظریات اور اُفتادِ طبع کے مطابق نہ تھے۔ اُن کے آباؤ اجداد اہلِ سیف تھے۔ غالب اہلِ قلم سے۔ اُن کے اہلِ خاندان (خصوصاً بیوی) انتہائی پابندِ صوم و صلوٰۃ تھے تو غالب حد درجہ مذہب بیزار۔ زندگی بھر انہوں نے کوئی نوکری نہیں کی اور صرف سرکاری پنشن پر گذر بسر کی۔ شراب کی عادت عمر بھر رہی۔ دل کے غنی تھے اِس لئے ہاتھ ہمیشہ تنگ رہتا تھا۔ اُس زمانے کا ماحول بھی اُن کے لئے تکلیف دہ تھا۔ اُن کے کلام کو سمجھنے والے دلّی میں صرف چند تھے ایسے ویسے شاعر مشہور اور نام آور تھے اور اُن کے کلام کی خاطر خواہ پذیرائی نہیں ہوتی تھی۔ یہ تمام عوامل اُن کے طنزیہ اشعار میں پس منظر کی حیثیت رکھتے ہیں۔

غالب کا اصلی نام اسد اللہ خاں تھا۔ نام کی مناسبت سے پہلے اسدؔ اور پھر غالبؔ تخلص کیا۔ اُن کی عرفیت مرزا نوشہ اور لقب نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ تھا، جو انہیں آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفرؔ کے دربار سے ملا تھا۔ غالب ۸ رجب ۱۲۱۲ھ میں شہر آگرہ میں پیدا ہوئے۔ اُن کے آباؤ اجداد ایبک قوم کے تُرک تھے۔ غالب کے دادا شاہ عالم کے زمانے میں سمرقند سے ہندوستان آئے۔ اُن کے ایک فرزند عبد اللہ خاں عُرف مرزا دُولہا کے ہاں غالب پیدا ہوئے۔ غالب کے ایک اور بھائی یوسف خاں تھے، جو عین عالمِ جوانی میں لا علاج جنون انتقال کر گئے۔ غالب کے والد نے لکھنؤ، حیدر آباد اور الور میں فوجی ملازمتیں [illegible] ملازمت ہی ایک معرکے میں گولی لگنے سے ان کا انتقال ہوا۔ والد کے انتقال کے بعد اُن کے چچا مرزا نصر اللہ بیگ نے ان کی پرورش کی۔ غالب کے چچا نے نواب فخر الدین کے ہاں اپنا رشتہ کیا تھا اور ان ہی کی سفارش پر انگریزی فوج میں ملازم ہو گئے تھے۔ اِن کی انہیں پنشن بھی ملتی تھی۔ جب ان کا انتقال ہوا تو یہی پنشن غالبؔ کے نام منتقل ہو گئی۔ غدر ۱۸۵۷ء کے بعد تین سال تک یہ پنشن بند رہی، مگر پھر جاری ہو گئی۔

تیرہ سال کی عمر تک وہ آگرے ہی میں رہے۔ اس کے بعد ان کی شادی کر دی گئی اور وہ ہمیشہ کے لئے اپنے سُسرالی شہر دلّی چلے گئے اور پھر یہیں کے ہو رہے۔ اُن کی اُردو اور فارسی کی تعلیم آگرے ہی میں ہوئی۔ دلّی میں ان کا قیام قریب پچاس برس رہا۔ ساری عمر کرائے کے مکانوں میں رہے۔ اسی طرح کبھی ذاتی کتابیں نہیں خریدیں۔ دلّی میں اس زمانے میں ایک شخص کا پیشہ لوگوں کو کُتب فروشوں کے یہاں سے کتابیں لاکر گھروں پر کرائے سے سربراہ کرنا تھا۔ غالبؔ بھی اس سے کتابیں منگواکر پڑھتے اور پھر واپس کر دیتے تھے۔ غالب۔ اپنی زندگی میں دو لمبے سفر کئے۔ ایک کلکتے کا اور دُوسرا رامپور کا۔ کلکتہ وہ اپنی پنشن کے دوبارہ اجرا کی کارروائی کے سلسلے میں گئے تھے۔ اِس سفر کی آمد و رفت کے دوران چند ماہ لکھنؤ اور بنارس میں بھی رہے۔ رامپور وہ [illegible] سے ملنے کے لئے گئے تھے۔

[illegible] ہے جو اسد اور بگ سے مرکب ہے۔ اسد کے معنی چاند اور بگ کے معنی کامل کے ہیں۔ اسطرح ایک کے معنی ماہِ کامل کے ہیں۔

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے



غالب کو ایک بار سزا بھی بھگتنی پڑی۔ انہیں چوسر اور شطرنج کھیلنے کی عادت تھی اور وہ بھی بازی بدکر۔ ۱۲۶۴ھ میں شہر دلی کے کوتوال نے کچھ ذاتی خصومت کی بنا پر انہیں عین موقع پر گرفتار کرلیا۔ مقدمہ چلا اور چھ مہینے کی سزا ہوئی۔ غالب نے اس کے خلاف اپیل بھی کی، مگر وہ نامنظور ہوگئی اور ناچار جیل جانا پڑا۔ لیکن آدھی میعاد گزرنے کے بعد ہی انہیں رہا کر دیا گیا۔ گو جیل میں غالب کو کوئی تکلیف نہیں تھی مگر یہ شریفوں کا شیوہ نہیں تھا، اس لئے عمر بھر انہیں اس کا قلق رہا۔ غالب نے دلی کی ایک گانے والی سے عشق بھی کیا تھا اور عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ کوتوالِ دلی اُن کا رقیب تھا، اسی لئے اُس نے موقع سے فائدہ اُٹھا کر انہیں رگڑ دیا۔

۱۲۶۶ھ میں ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ نے غالب کو نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ کا خطاب اور چھ پارچے کا خلعت دربارِ عام میں عطا کیا اور خاندانِ تیموری کی تاریخ نویسی پر پچاس روپے ماہانہ مشاہرہ مقرر کیا۔ ۱۲۷۱ھ میں ذوق کے انتقال کے بعد وہ بہادر شاہ کے اُستاد بھی مقرر ہوئے۔ مگر وہ یہ خدمت بادلِ ناخواستہ انجام دیتے تھے، کیونکہ یہ چیز ان کی طبیعت کے خلاف تھی۔

غالب کے یہاں کوئی اولاد نہیں تھی۔ اصل میں اُن کی بیوی امراؤ بیگم کے پے در پے سات بچے ہوئے، مگر کوئی بھی زیادہ دن زندہ نہیں رہا۔ اس طرح ایک مدت تک اُنہوں نے اور اُن کی بیوی نے تنہا زندگی بسر کی۔ مگر اُن کی بیوی کے بھانجے زین العابدین خاں عرف عارف کو وہ دونوں اپنے بیٹے کی طرح چاہتے تھے مگر افسوس کہ عین جوانی میں اس کا انتقال ہوگیا۔ مرثیۂ عارف غالب نے اسی موقع پر لکھا تھا۔ بعد میں عارف کے دونوں بچوں کی پرورش اُنہوں نے اپنے بچوں کی طرح کی۔

غالب نے غدر کا سانحہ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ غدر کے دوران وہ کہیں نہیں گئے، بلکہ دروازے بند کرکے گھر میں بیٹھے رہے۔ ایک بار چند انگریز سپاہی اُن کے گھر میں بھی گھس آئے اور انہیں پکڑ کر اپنے افسر کے پاس لے گئے مگر وہاں غالب اپنی خوش طبعی کی بنا پر صاف بچ گئے۔[1] غدر کے بعد غالب کے معاشی حالات بہت ابتر ہوگئے۔ انگریزوں نے اس شبہ کی بنا پر کہ اُنہوں نے بھی غدر میں مغل بادشاہ اور مسلمانوں کا ساتھ دیا تھا، اُن کی پنشن بند کردی۔ خاندانی اثاثہ اور بیوی کے زیورات اُنہوں نے غدر کے بلوے سے ڈر کر ایک جگہ گاڑ دئے تھے۔ اسے انگریز سپاہی کھود کر لے گئے۔ تقریباً دو برس تک غالب کی کوئی ذریعۂ آمدنی نہ تھا۔ اس کے بعد نواب یوسف علی خاں والیٔ رامپور نے ان کا تاحیات سو روپے ماہانہ وظیفہ مقرر کردیا۔ غدر کے تین برس بعد جب غالب ہر الزام سے بری ہوئے تو سرکاری پنشن بھی جاری ہوگئی۔ دلی کی تباہی، بہادر شاہ ظفر کا زوال اور اپنے خاندان اور قوم کے افراد کا تتر بتر ہوجانا غالب کے لئے بہت بڑے سانحات تھے جو غدر کی وجہ سے وقوع پذیر ہوئے تھے۔ غالب جیسے حساس اور باشعور شخص کے لئے غدر کا واقعہ سوہانِ روح ثابت ہوا۔

آخری عمر میں غالب بہت ضعیف اور ناتواں ہوگئے تھے اور ہر وقت موت کی آرزو کرتے رہتے تھے۔ قوتِ سماعت بالکل جواب دے گئی تھی۔ بذریعہ تحریر بات چیت کرتے تھے۔ ہر سال اپنی وفات کی تاریخ نکالتے اور یہ خیال کرتے کہ اس سال وہ ضرور مرجائیں گے۔ گویا اپنے آخری عمر میں وہ اپنے ہی اِن اشعار کی مجسم تصویر بن گئے تھے ؎

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی
موت آتی ہے پر نہیں آتی

---

[1] انگریز افسر نے اُنہیں دیکھ کر پوچھا: ”ویل تم مسلمان؟“ غالب نے جواب دیا: ”آدھا۔“ انگریز افسر نے پوچھا: ”اس کا مطلب؟“ اُنہوں نے جواب دیا: ”شراب پیتا ہوں، مگر سؤر نہیں کھاتا۔“ یہ سُن کر انگریز افسر بے تحاشا ہنس پڑا۔ بعد میں جب اُسے معلوم ہوا کہ یہ اُردو کے بہت بڑے شاعر ہیں تو انہیں گھر جانے کی اجازت دے دی۔



مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی　　　　موت آتی ہے پر نہیں آتی

آخری دنوں میں ہر وقت اس شعر کا ورد کرتے رہتے تھے

[illegible] سرِ راہ ہے　　　　عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

بالآخر ۲ ذیقعدہ ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء میں ۷۳ برس کی عمر میں غالب نے اس دنیا کو خیرباد کہا۔

یہ تھی غالب کی زندگی کی ایک جھلک جس میں سوائے ناکامیوں اور نامرادیوں کے کچھ اور نہیں تھا۔ خود غالب کو بھی اس کا احساس بدرجۂ اتم تھا۔ اُن کے خطوط پڑھنے سے اس کا کوئی اندازہ ہو سکتا ہے۔ ایک خط میں اپنے ایک شاگرد ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں:

"تم مشقِ سخن کر رہے ہو اور میں مشقِ فنا میں مستغرق ہوں۔ بوعلی سینا کے علم اور نظیری کے شعر کو ضائع، بے فائدہ اور موہوم جانتا ہوں۔ زیست بسر کرنے کو کچھ تھوڑی سی راحت درکار ہے۔ باقی حکمت اور سلطنت، شاعری اور ساحری سب خرافات ہے۔ ہندوؤں میں کوئی اوتار ہوا تو کیا اور مسلمانوں میں کوئی نبی بنا تو کیا۔ دنیا میں نام آور ہوئے تو کیا اور گمنام جئے تو کیا۔ کچھ معاش ہو، کچھ صحتِ جسمانی، باقی سب وہم ہے۔"

ایک اور خط میں اپنی زندگی کے بارے میں اپنے ایک شاگرد کو لکھتے ہیں:

"آٹھویں رجب ۱۲۱۲ھ میں روبکاری کے واسطے یہاں بھیجا گیا۔[1] تیرہ برس حوالات میں رہا۔ ساتویں رجب ۱۲۲۵ھ میں میرے واسطے حکمِ حبسِ دوام صادر ہوا۔[2] ایک بیڑی[3] میرے پاؤں میں ڈال دی اور دلی شہر کو زندان مقرر کیا اور مجھے اس زندان میں ڈال دیا۔ فکرِ نظم و نثر کو مشقت ٹھہرایا۔ برسوں بعد میں جیل خانے سے بھاگا۔ تین برس بلادِ شرقیہ میں گھومتا رہا۔ پایانِ کار مجھے کلکتے سے پکڑ لائے اور پھر اسی محبس میں بٹھا دیا۔ جب دیکھا کہ قیدی گریز پا ہے تو دو ہتھکڑیاں اور بڑھا دیں۔[5] پاؤں بیڑی سے فگار، ہاتھ ہتھکڑیوں سے زخم دار۔ مشقتِ مقررہ اور مشکل ہو گئی۔ طاقت یک قلم زائل ہو گئی۔ سالِ گزشتہ بیڑی کو زاویۂ زندان میں چھوڑ مع دونوں ہتھکڑیوں کے بھاگا، میرٹھ، مرادآباد ہوتا رامپور پہنچا۔ کچھ دن کم دو مہینے وہاں رہا کہ پھر پکڑا آیا۔ اب عہد کیا کہ پھر نہ بھاگوں گا۔ بھاگوں کیا؟ بھاگنے کی طاقت بھی تو نہ رہی۔ حکمِ رہائی دیکھئے کب صادر ہو۔[6] ایک ضعیف سا احتمال ہے کہ اس ماہ ذی الحجہ میں چھوٹ جاؤں۔"

آخری عمر میں جب غالب کو نماز کی تلقین کی گئی تو اس کا جواب انہوں نے یوں دیا تھا:

"ساری عمر فسق و فجور میں گزری۔ نہ کبھی نماز پڑھی، نہ روزہ رکھا۔ نہ کوئی نیک کام کیا۔ زندگی کے چند انفاس باقی رہ گئے ہیں۔ اب اگر چند روز بیٹھ کر اشارہ سے نماز پڑھی تو ساری عمر کے گناہوں کی تلافی کیونکر ہو سکتی ہے۔ میں تو اس قابل ہوں کہ جب مروں تو میرے دوست و عزیز میرا منہ کالا کریں اور میرے پاؤں میں رسّی باندھ کر شہر کے تمام گلی کوچوں اور بازاروں میں تشہیر کریں اور پھر شہر سے باہر لے جا کر کتوں اور چیلوں کے کھانے کو (اگر وہ ایسی چیز کھانا پسند کریں) چھوڑ آئیں۔"

ایک خط میں اپنے بارے میں لکھتے ہیں:

"خدا کا مقہور، خلق کا مردود، بوڑھا، ناتواں، بیمار، فقیر، نکبت میں گرفتار۔ میرے اور معاملات کلام و کمال سے

---

[1] اپنی پیدائش کی طرف اشارہ ہے۔ [2] بچپن اور شادی سے پہلے کا زمانہ مراد ہے۔ [3] یعنی شادی ہوئی۔ [4] مراد بیوی۔ [5] دو ہتھکڑیوں سے مراد حسین علی خاں اور باقر علی خاں فرزندان زین العابدین خاں عرف عارف ہے جن کی پرورش عارف کے انتقال کے بعد غالب نے اپنے بچوں کی طرح کی۔ [6] موت کا طرف اشارہ ہے۔



قطع نظر کرو۔ وہ جو کسی کو بھیک مانگتا نہ دیکھ سکے اور خود بھیک مانگے، وہ میں ہوں۔ یہاں خدا سے بھی توقع باقی نہیں رہی، مخلوق کا کیا ذکر؟ کچھ بن نہیں آتی۔ اپنا تماشائی آپ بن گیا ہوں۔ رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں۔ یعنی میں نے اپنے آپ کو اپنا غیر تصور کر لیا ہے۔ جو دکھ مجھ کو پہنچتا ہے، کہتا ہوں لو غالب کے ایک جوتی اور لگی۔ بہت اتراتا تھا کہ میں بڑا شاعر ہوں اور فارسی داں ہوں۔ آج دور دور تک میرا جواب نہیں۔ لے اب قرض داروں کو جواب دے۔ سچ تو یہ ہے کہ غالب کیا مرا، بڑا ملحد اور کافر مرا۔"

غالب کے حالاتِ زندگی پڑھنے اور اُن کے بارے میں خود غالب کے خیالات جاننے کے بعد غالب کے طنزیہ اشعار کے سمجھنے میں بہت مدد مل جاتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ غالب ہی تھے جو ایسے حالات میں طنزیہ اشعار کہہ کر خاموش ہو گئے، ورنہ اُن کی جگہ کوئی اور ہوتا تو گریباں چاک کر کے جنگل کی راہ لیتا، یا دلّی کے گلی کوچوں میں برہنہ پا اور ننگے سر مارا مارا پھرتا اور بچوں کی سنگ باری کا نشانہ بنتا۔ غالب میں ضبط کا مادہ بہت زیادہ تھا اور وہ پریشانیوں کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ یہ چیزیں کسی انسان کی پختہ شخصیت کی دلیل اور اپنے آپ پر کامل اعتماد کی غماز ہیں۔ غالب بے حد گمبھیر، بُردبار، بھاری بھرکم شخصیت کے انسان تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں اُن کے طنز میں پھکڑپن نہیں بلکہ وقار، سطحیت نہیں بلکہ گہرائی، جھنجھلاہٹ نہیں، بلکہ زیرِلب مسکراہٹ، قنوطیت نہیں بلکہ رجائیت اور عامیانہ پن نہیں، بلکہ ایک معیار ملتا ہے۔

غالب اُردو کا پہلا شاعر ہے جس نے طنز میں خدا کو مخاطب کیا ہے، ورنہ اُن کے زمانے میں تو اُردو شعراء محبوب کو مؤنث باندھنے کی جرأت بھی نہ کر سکے تھے۔ غالب کے حالاتِ زندگی اور اس کے بارے میں خود اُن کے خیالات کو پیشِ نظر رکھ کر آپ ان کے مندرجہ ذیل اشعار پڑھیے جو انہوں نے خدا سے مخاطبت میں کہے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں، اس کے بعد ان پر کسی مزید تبصرے کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔

زندگی اپنی جب اس طور پہ گزری غالب — ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی؟ — بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

آگے پیچھے آہ و نالہ، دائیں بائیں رنج و غم — میں چلا اس شان سے اپنے خدا کے سامنے

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد — مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

سفینہ جب کہ کنارے پہ آلگا غالب — خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہیے

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد — یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

غالب نے خدا کے بعد مذہبی عقائد پر بھی اپنے اشعار میں طنز کیا ہے۔ اُن کے دیوان میں ایسے بہت سے اشعار ملتے ہیں۔ جنّت کے بارے میں وہ کہتے ہیں ؎

ہم کو معلوم ہے جنّت کی حقیقت، لیکن — دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے



جس میں لاکھوں برس کی حوریں ہوں ... کرے کوئی

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

... جس کے لیے ہم کو ہو بہشت عزیز سوائے بادۂ گلفام مشکبو کیا ہے

کراماً کاتبین، جو اسلامی عقیدے کے مطابق ہر انسان کے اچھے اور بُرے اعمال کی تحریر کا کام انجام دیتے ہیں، کے بارے میں وہ ...

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا ؟

روزہ کے بارے میں غالب کے خطوط اور اشعار دونوں میں ظریفانہ اظہارِ بیان ملتا ہے۔ ایک دوست کو انہوں نے رمضان میں خط لکھا تو ... کے تعلق سے لکھتے ہیں:

"دھوپ بہت تیز ہے روزہ رکھتا ہوں، مگر روزے کو بہلاتا رہتا ہوں۔ کبھی پانی پی لیا۔ کبھی حقہ پی لیا کبھی کوئی ٹکڑا روٹی کا بھی کھا لیا۔ یہاں کے لوگ عجیب فہم رکھتے ہیں۔ میں تو روزہ بہلاتا ہوں اور یہ فرماتے ہیں کہ تو روزہ نہیں رکھتا؟ یہ نہیں سمجھتے کہ روزہ نہ رکھنا اور چیز ہے اور روزہ بہلانا اور بات ہے۔"

اپنے چہیتے شاگرد میر مہدی مجروح کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"میاں! اب رزق جینے کا ڈھنگ مجھے آگیا ہے۔ اس طرف سے خاطر جمع رکھنا۔ رمضان کا مہینہ روزے کھا کھا کر کاٹا۔ آگے خدا رازق ہے کچھ اور کھانے کو نہ ملا تو غم تو ہے۔"

روزے کے بارے میں غالب کے چند لطائف بھی مشہور ہیں۔ ایک بار رمضان کے مہینے میں ایک سُنّی مولوی صاحب غالب سے ملنے آئے۔ عصر کا وقت تھا۔ انہوں نے خدمت گار سے پانی مانگا۔ مولوی صاحب نے تعجب سے پوچھا "کیا جناب کو روزہ نہیں ہے؟" غالب نے جواب دیا "سُنّی مسلمان ہوں، چار گھڑی دن رہے روزہ کھول لیتا ہوں۔" ایک اور لطیفہ بہادر شاہ ظفر کے ساتھ ہے۔ ایک بار غالب بعدِ رمضان، عید ملنے قلعۂ معلیٰ گئے۔ بادشاہ نے پوچھا۔ "کتنے روزے رکھے؟" غالب نے جواب دیا "پیر و مرشد! ایک نہیں رکھا۔" یہاں الفاظ کی ذو معنویت اور رعایتِ لفظی قابلِ غور ہے۔

روزے کے بارے میں انہوں نے دو رباعیات میں بھی ظریفانہ انداز میں اظہار کیا ہے۔

افطارِ صوم کی اگر کچھ دستگاہ ہو اُس شخص کو ضرور ہے روزہ رکھا کرے
جس پاس روزہ کھول کے کھانے کو کچھ نہ ہو روزہ اگر نہ کھائے تو ناچار کیا کرے

سامانِ خور و خواب کہاں سے لاؤں آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں؟
روزہ مرا ایمان ہے لیکن غالب خس خانہ و برفاب کہاں سے لاؤں؟

غالب نے اصول، پامال روایتیں اور فرسودہ اعمال سے بھی غالب کو اتفاق نہ تھا وہ کسی نئی اور اچھوتی چیز کو پسند کرتے تھے اور روایت سے زیادہ بغاوت کے قائل تھے۔ اپنے بعض اشعار میں انہوں نے مروجہ روایتوں پر بھی طنز کیا ہے، چاہے پھر وہ

عشق پہ کیوں نہ ہو سہ



تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسدؔ　　سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

بضربِ تیشہ وہ اس واسطے ہلاک ہوا　　کہ ضربِ تیشہ پہ رکھتا تھا کوہکن تکیہ

ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا　　نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل　　کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

عام طور پر اُردو غزل میں مقطع یعنی آخری شعر میں شاعر اپنا تخلص لاتا ہے اور اس میں اپنی تعریف و توصیف بیان کرتا ہے جسے شاعرانہ تعلّی کہتے ہیں ۔ یہ چیز مروّجہ روایت کے مطابق کچھ بُری بھی نہیں سمجھی جاتی، مگر غالبؔ نے ایسے اکثر مقطعوں میں اپنی تعریف کے بجائے اپنا مذاق اُڑایا ہے اور اپنے اوپر طنز کیا ہے، لیکن اگر آپ بہ نظرِ غائر ان اشعار کا مطالعہ کریں تو آپ کو پتہ چلے گا کہ اصل میں غالبؔ نے ان میں کمالِ ہوشیاری سے بقولِ حالی "اپنی دانائی اور ہنرمندی ثابت کی ہے"۔ مثلاً ؎

غالبِؔ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں　　روئیے زار زار کیا، کیجیے ہائے ہائے کیوں

ہم کہاں کے دانا تھے، کس ہنر میں یکتا تھے　　بے سبب ہوا غالبؔ دشمن آسماں اپنا

ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا　　وگرنہ شہر میں غالبؔ کی آبرو کیا ہے

تھی خبر گرم کہ غالبؔ کے اڑیں گے پرزے　　دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

پوچھتے ہیں وہ کہ غالبؔ کون ہے　　کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالبؔ　　شرم تم کو مگر نہیں آتی

چاہتے ہیں خوب رویوں کو اسدؔ　　آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

تنگ دستی اگر نہ ہو غالبؔ　　تندرستی ہزار نعمت ہے

محبوب سے نوک جھونک اور چھیڑ چھاڑ اُردو غزل کا خاص وصف رہا ہے۔ غالبؔ کے یہاں بھی اس ضمن میں بہت سے اشعار ملتے ہیں جن میں طنز بھی ہے، شوخی بھی، شرارت بھی ہے اور ظرافت بھی ؎



ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے — تم ہی کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل — جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ — ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

بے نیازی حد سے گزری بندہ پرور کب تلک — ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرمائیں گے کیا

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے — ہوئے تم دوست جس کے دشمن اُس کا آسماں کیوں ہو

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے — بے نیازی تری عادت ہی سہی

دیگر اور شعراء کی طرح غالبؔ کے پاس ناصح اور واعظ و زاہد پر بھی طنزیہ اشعار ملتے ہیں ؎

حضرتِ ناصح گر آئیں دیدہ و دل فرشِ راہ — کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائیں گے کیا؟

گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھا یوں سہی — یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا

کیوں ردِ قدح کرے ہے زاہد — مے ہے یہ مگس کی قے نہیں ہے

کہاں میخانہ کا دروازہ غالبؔ اور کہاں واعظ — پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

غالبؔ کے پاس بعض اشعار میں دوستوں پر طنز بھی ملتا ہے ؎

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح — کوئی چارہ ساز ہوتا، کوئی غم گسار ہوتا

گرچہ ہوں دیوانہ پر کیوں دوست کا کھاؤں فریب — آستیں میں دشنہ پنہاں، ہاتھ میں نشتر کھلا

غالبؔ بہت سخت جان، مستقل مزاج اور حوادث سے بے خوف انسان تھے۔ دنیا اور معاملاتِ دنیا کو وہ کوئی خاص اہمیت نہیں دیتے تھے۔ چنانچہ اس موضوع پر بھی ہمیں اُن کے دیوان میں چند طنزیہ اشعار ملتے ہیں ؎

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے — ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسدؔ — عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے



رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

ہم اور تم فلک پیر جس کو کہتے ہیں
فقیر غالبِ مسکیں کا ہے کہن تکیہ

غرض غالب کے پاس ہمیں ہر موضوع پر طنزیہ اشعار ملتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج کے بیشتر طنز و مزاح نگاروں نے پیر صاحب کی داڑھی کی طرح تبرکاً غالب کے اکثر مصرعوں اور اشعار سے اپنی تحریریں سجالی ہیں اور بقول شخصے "دیوانِ غالب میں اب کچھ باقی نہیں رہ گیا ہے، بلکہ سب اردو کے طنز نگاروں کے مضامین میں منتقل ہو گیا ہے"۔ ایک طرف یہ حال ہے تو دوسری طرف یار لوگوں نے غالب کے بہت سے اشعار میں تحریف کر کے انہیں اپنے مفید مطلب سا لیا ہے اور بعض بہت سے فحش اور غیر شائستہ اشعار غالب کے نام منسوب کر دیئے گئے ہیں۔ ویسے یہ بات کسی شاعر کے لئے بہت بڑا اعزاز بھی ہے کہ اس کے مصرعے اور اشعار زبان زدِ خاص و عام ہو جائیں اور لوگ انہیں اپنی گفتگو اور تحریروں میں استعمال کرنے پر مجبور ہو جائیں اور کوئی شاعر اتنا عوامی ہو جائے کہ اس کے اشعار میں عوام تحریف کرنے لگیں اور بہت سے عام فہم اور غیر معیاری شعر اُس کے نام سے منسوب کر دیئے جائیں۔

غالب کے طنز کی ایک اور خاص بات جو مجھے خاص طور پر پسند ہے، وہ یہ ہے کہ اس سلسلے میں اُن کے کلام اور شخصیت میں بڑی مطابقت ہے۔ اردو میں اور خصوصاً غزل میں عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ ایک شاعر صاحب نے عمر بھر شراب کو ہاتھ نہیں لگایا، مگر اشعار میں اُس کے دریا بہا دیئے ہیں۔ کسی صاحب نے عمر بھر کسی غیر کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھا، مگر شاعری میں سینکڑوں عشق کر ڈالے۔ اکثر شاعر حضرات اپنی خانگی زندگی میں کسی متشرع و مقطع بزرگ کو دیکھتے ہیں تو بے حد تعظیم دیتے ہیں، مگر شاعری میں اُن پر زاہد، واعظ اور ناصح کی آڑ میں پھبتیاں کسی جاتی ہیں، مگر غالب کے پاس آپ کو یہ تضاد نہیں ملے گا۔ اِس حد تک وہ بڑے باعمل (PRACTICAL) اور کھرے شاعر ہیں۔

غالب کی شخصیت بڑی ہمہ گیر اور اُن کی شاعری بڑی ہمہ پہلو ہے۔ یہاں اُن کی شاعری کے صرف ایک پہلو یعنی طنز سے بحث کی گئی ہے، ویسے اُن کی شاعری کے بیسیوں پہلو ہیں اور اُن کے تعلق سے بیسیوں مضامین لکھے جا سکتے ہیں۔ غالب کی شاعری اتنی جاندار ہے کہ سو سال گزرنے کے بعد بھی وہ آج ہی کی شاعری معلوم ہوتی ہے اور آئندہ بھی اس کا یہی حال رہے گا۔ سچ تو یہ ہے کہ غالب بڑا باکمال شاعر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ،

"ہوئی مدت کہ غالب مر گیا پر یاد آتا ہے" ▲

بقیہ صفحہ ۲۷۷ "کلامِ غالب میں شعری پیکر تراشی"

ردِ عمل سبھی چیزیں لمس و حوتی متعارف کرائی گئی ہیں۔ اِن اشعار کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان میں لفظی پیکر ورآ اُبھر کر سامنے نہیں آتے، بلکہ شعر کو پڑھ کر ہمیں پہلے یہ محسوس ہوتا ہے جیسے ہمارے احساسات و خیالات کے گہرے سمندر میں کسی نے کنکر پھینک دیا ہے اور لہریں چھوٹے چھوٹے دائرے بناتی چلی جا رہی ہیں۔ یہی دائرے آگے چل کر واضح تصویروں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اِن اشعار میں پیکر تراشی ہماری سوچ کو مہمیز لگاتے ہیں اور پھر تصویر بناتے ہیں۔ غالب کی شاعری میں شعری پیکر تراشی کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ انہوں نے اِس سلسلے میں پیکر تراشی کی کسی ایک مخصوص جہت PATTERN کو نہیں اپنایا، اور نہ ہی وہ اِس سلسلے میں کسی ایک مخصوص و محدود اصول پر کاربند رہے ہیں بلکہ انہوں نے حسب ضرورت ایمائیت کو بہتر سے بہتر انداز میں قاری تک پہنچانے کے لئے پیکر تخلیق کرتے ہوئے مختلف قسم کی تبدیلیوں (VARIATIONS) سے کام لیا ہے اور یہ اُن کا بڑا کارنامہ ہے۔

زیرِ نظر مضمون غالب کے فنِ پیکر تراشی کا یقیناً ایک نامکمل اور تشنہ مطالعہ ہے، لیکن اگر نقادانِ کرام کلام غالب کے اِس پہلو پر دیگر لسانی و تکنیکی پہلوؤں کی طرف توجہ دیں تو غالبیات میں مزید اضافے کی ابھی گنجائش ہے۔ ▲

خواجہ سلیم الدین

تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو؟

غزل گو شاعر کے لیے عشق کرنا لازمی ہوتا ہے، کیونکہ عشق اِس صنف کا تقاضہ ہے۔ عشق کا جذبہ پُرتاثیر اور ہمہ گیر ہے۔ اسی لئے غزل کا ہر شعر پوری حد تک کائنات پر محیط ہوتا ہے اور غزل نے عشق و محبت کی ساری واردات و کیفیات اور تمام اسرار و رموز کو اپنے دامن میں سمو لیا ہے اس طرح عشق ہی غزل کی رُوح قرار پائی۔ غزل گو شعراء نے انہیں مضامین کو اپنایا اور نفسانی جذبات کو استعمال دیا۔ جب پچھلوں نے اگلوں کی تقلید کی تو نہ صرف مضامین میں بلکہ خیالات و الفاظ میں، تراکیب و اسالیب میں، تشبیہات و استعارات میں، بحروں، قافیہ میں، ردیف میں، غرض ہر ہر بات میں اُن کا تتبع کر ڈالا۔ اس کے نتیجے میں جو کچھ سرمایہ تیار ہوا، اس میں یکسانیت ہی نظر آتی ہے جسے دیکھ کر اُکتاہٹ محسوس ہوتی ہے۔ اگر ہم غزلیات کا بغائر مطالعہ کریں تو عاشق اور محبوب کا جو مجموعی تاثر پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے شعراء کا معشوق بے وفا و بے مُروّت ہے، بے مہر و بے رحم ہے، ظالم، قاتل، صیاد، جلاد اور ہرجائی ہے۔ اپنوں سے نفرت کرنے والا، اوروں سے ملنے والا ہے۔ سچی محبت پہ یقین نہ لانے والا اہلِ ہوس کو عاشقِ صادق جاننے والا ہے۔ بدگمان و بدزبان ہے۔ بدمعاش و بدچلن ہے۔ اِسی قبیل کی تمام بُرائیوں سے موصوف کرتا اور اپنے تئیں غم زدہ و مصیبت زدہ، بیمار و بدبخت، بدنام و مردود، آوارگی پسند، بدنامی کا خواہاں، میخوار و بدمست، وفادار و خود فراموش، جفاکش و صابر، بیقرار و دیوانہ، ہوشیار، غیور، رشک کا پُتلا، رقیبوں کا دشمن، سارے جہان سے بدگمان، آسمان کا شاکی، زمین سے نالاں۔ ان تمام صفات سے متصف کرنا، جو مرد کے لئے قابلِ افسوس تصور کی جاتی ہیں۔ اِسی قسم کے دو کردار ہمارے سامنے اُبھر کر آتے ہیں۔

تو یہ اندازِ فکر ایران کی دین ہے جس میں تصوف کا اچھا خاصا سرمایہ موجود ہے، صوفی شعراء کے یہاں عشق کی معراج "فنا فی الذات" ہے، جس میں انفرادی تشخص کو محبوب کی شخصیت میں ضم کر دینا نصب العین قرار پاتا ہے۔ دُوسری طرف فلسفۂ ویدانت بھی اِسی قسم کا تصور پیش کرتا ہے۔ ہمارے شعراء نے جب اُردو میں شاعری شروع کی تو فارسی سے خیالات بھی اُردو میں منتقل کر لئے۔ جس میں تصوف کا اچھا خاصا سرمایہ ہاتھ آ گیا۔ متصوفانہ شاعری ہمارے شعراء کے لئے ایک اعتبار سے ایک وقت [illegible] روایت [illegible] قرار پائی، جس کو اختیار کرنا شاعرانہ معاشرے میں عزت افزائی اور شرحِ رُوئی کے مصداق تھا اور ترک کرنا باعثِ ننگ۔ کیونکہ غزل معنوی آزادی کھو کر روایات کی محکوم ہو چکی تھی۔ غزل کے موجدوں نے جن خیالات کے اظہار کے لئے غزل کو مختص کر رکھا تھا اور بعد کے شعراء نے ان کے اتباع میں اُن مضامین کے دفتر کے دفتر کھول دئے۔ تقریباً اُس کے تمام شعراء کے یہاں پامال و فرسودہ مضامین جو مدت دراز سے عربی، فارسی اور بعد میں اُردو غزلوں میں سدھتے چلے آئے



گیا۔ الفاظ کے تھوڑے سے ردوبدل کے ساتھ اور نئی بندشوں میں پیش کیے جاتے رہے۔ بقول مولانا حالی میر سے ذوق تک جتنے مشہور غزل گو اہلِ زبان میں گزرے ہیں اُن کی غزلوں میں ایسے مضامین بہت کم نکلیں گے جو اس محدود دائرے سے خارج ہوں۔ اُن کے فن کا کمال یہی سمجھا جاتا تھا کہ جو مضامین پہلے بندھ چکے ہیں، انہیں کو بلیغ اسلوب میں اس طرح ادا کیا جائے کہ نئی بندش پہلی بندشوں سے بڑھ جائے۔ لیکن جوں جوں زمانہ گزرتا گیا، دُوسرے مضامین بھی اُردو غزل میں پیش کیے جانے لگے۔ حُسن و عشق کی داستان سے ہٹ کر مسائلِ حیات، فلسفہ اور تصوف کے مسائل بھی پیش کیے گئے لیکن اشاروں اور کنایوں کے ذریعے۔ کیوں کہ غزل کا مزاج خود اس قسم کے مضامین کا متحمل نہیں ہے، اس لئے علامتوں سے کام لیا گیا۔ لیکن اہم ترین موضوع عشق ہی رہا جو سدا بہار ہے۔

اس سے پہلے ذکر کر چکا ہوں کہ عشقیہ خیالات کے اظہار میں یکسانیت نظر آتی ہے۔ لیکن یکسانیت بادی النظر میں ہے۔ ہم غزل کا بغائر مطالعہ کریں تو اس کی تہہ میں انفرادیت بھی موجود نظر آتی ہے جس کے ذریعے ہم شاعر کا معیار و مقام متعین کر سکتے ہیں۔ بظاہر یہ کام تحصیلِ حاصل ہے، کیوں کہ عشق کے اظہار میں ہمارے شعراء نے نئی راہیں تلاش نہیں کیں۔ یکسانیت کا احساس حقیقتاً انہیں علامات کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اچھے شعراء کے یہاں انفرادیت نمایاں ہوتی ہے اور جہاں تک غزل کا معاملہ ہے، ہم انفرادیت کو اچھائی اور بُرائی کا معیار قرار دے سکتے ہیں۔

غالب ایک اچھے شاعر ہی نہیں بلکہ ایک عظیم شاعر بھی ہیں لہٰذا اُن کے کلام میں عشقیہ خیالات کے اظہار میں انفرادیت پر جدت و جدّت طرازی ہے۔ غالب نے محض رسمی طور پر جذبات و احساسات کی، نظریات و رجحانات کی ترجمانی نہیں کی بلکہ عشق کا انسانی تصور پیش کیا اور بڑے ہی صحت مند خیالات کو اپنے کلام میں جگہ دی، تاہم اُن کے کلام کا بیشتر حصہ رسمی معلوم ہوتا ہے جو ہماری بحث سے خارج ہے۔ ہمیں انہیں اشعار کو پیش کرنا ہے جن میں کچھ حقیقت موجود ہے، جس کے لیے اُن کی زندگی کے حالات سے مدد لینی ہوگی۔ غالب نہ تو صوفی تھے اور نہ ہی فلسفی۔ وہ ایک انسان تھے اور اپنی تمام خوبیوں اور بُرائیوں کے ساتھ۔ اُن کی جوانی رنگ رلیوں اور خرافات میں بسر ہوئی۔ شراب نوشی کی لت اُسی زمانے میں پڑ چکی تھی جو آخر دم تک نہ چھوٹ سکی۔ اسی زمانے میں ایک ستم پیشہ ڈومنی سے اُنسیت بھی ہو چکی تھی، جس کی وفات پر انہوں نے بڑا ہی درد ناک نوحہ بھی لکھا جس سے اُن کے دلی تاثرات کا اظہار ہوتا ہے۔ غالب کی شعر گوئی نے جس دور میں نشو و نما پائی، اس وقت روایتی اندازِ سخن کا دور دورہ تھا جو بات سے زیادہ بات کہنے کے ڈھنگ پر نظر رکھتا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ بات کرنے کا ڈھنگ ہی آدمی کو شاعر بناتا ہے، پھر اس ڈھنگ میں جتنی صفائی، جس قدر گہرائی اور اثر انگیزی ہوگی، شاعر کا منصب بھی اتنا ہی رفیع الشان ہوگا۔ غالب نے جس ڈھنگ سے بات کی، اندازِ سخن نرالا اور خیالات و جذبات کو منفرد اور انوکھے انداز سے پیش کیا، جس کی لپیٹ پر ذہن و فکر کی بے باکی کارفرما ہے جو آپ بیتی کی راہ سے دل کی گہرائیوں تک پہنچتی ہے اور شاعر کے تخیل کی مدد سے جگ بیتی کا رُوپ اختیار کر لیتی ہے ؎

دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اُس نے کہا   میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

غالب کی شاعری روایات سے مضبوط رشتہ رکھنے کے ساتھ روایتی عناصر سے بڑی حد تک پاک ہے اور اُن کی زندگی کے مختلف پہلوؤں خصوصاً وارداتِ قلبی اور معاملاتِ حُسن و عشق کا سراغ لگانے میں بڑی مدد دیتی ہے۔ غالب کا یہ قابلِ قدر وصف ہے کہ انہوں نے اپنے کلام کو اپنے تجربات کا آئینہ بنایا۔ دُوسرے انہوں نے اپنے دَور کی روایتی قدروں سے بالاتر ہو کر تنگنائے غزل کو نئی پہنائیوں اور نئی توانائیوں سے رُوشناس کرایا۔ بقول آلِ احمد سرورؔ زوال آمادہ شعراء میں جو باتیں ہوتی ہیں، غالب میں سب موجود تھیں۔ اپنی ذات کو آگے رکھنا، اپنی دنیا الگ بسانا غالب نے اپنے ماحول سے سیکھا۔ یہی وجہ ہے کہ ساری



زندگی وہ اپنے کو دوسروں سے الگ رکھیے، تشخص اور انفرادیت قائم رکھنے کی ذہنی عادت ہے۔ غالب ایک سپاہی زادہ تھے۔ طبیعت میں عزم و ہمت اور حوصلہ مندی تھی جو سپاہی زادوں میں ہوا کرتی ہے۔ موروثی جاگیر روروں پر تھی اور یہ سوچ کر شاعری شروع کی کہ کمائے روزگار ہوں گے اور اس قدر بلند جیسے فردوسی یا خاقانی۔ اور قدر دانی اس طرح ہوگی جیسی محمود، جہانگیر یا خان خاناں کیا کرتے تھے۔ لیکن انہیں تھوڑے دنوں میں اپنی قسمت اور زمانے کی ناقدری کی شکایت کرنی پڑی اور حقیقت میں زندگی اتنی آساں اور "بازیچۂ اطفال" ثابت نہ ہوئی جیسا کہ انہوں نے سوچ رکھا تھا۔ کم سنی میں والد کا انتقال، چچا کا سایہ سر سے اٹھ جانا، سسرال کا نازو نعم، اس کے بعد جائداد کے جھگڑے، قرض کا بار، غدر کی تکالیف، بھائی کی موت۔ ان تمام مصائب سے انہیں گذرنا پڑا۔ غرض کہ مشکلیں اتنی پڑیں اُن پر کہ آساں ہو گئیں۔

اور شاید یہی وجہ ہے کہ ہم غالب کے کلام میں افسردگی اور خود پرستی کی نمایاں علامت پاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی طبیعت میں جو عزم ہمت اور مزاج میں جو انانیت موجود تھی، جگہ جگہ نظر آتی ہے۔ غالب میں حالات سے فائدہ اٹھانے، شراب نہ ملے تو زود رنج ہو جانے یہی سے لطف اندوز ہونے کی خصوصیت بھی تھی۔ دشمن کو ہم زبان کر لینا، رقیب کے در پر شوقِ دیدار میں چلے جانا، حالات سے مصالحت کر لینا یہ ساری باتیں غالب میں موجود تھیں۔

غالب کے کلام میں حسن و عشق کے مضامین عجیب کیفیت پیدا کرتے ہیں۔ اُن کا محبوب عاشق سے ناز و غمزہ کرتا ہے، تو اس کی دلجوئی بھی کرتا ہے۔ اس پر ستم کرتا ہے تو چشم کرم بھی رکھتا ہے۔ عاشق بھی محبوب کے حسن سے متاثر ہوتا ہے۔ اسکی روانی، روش اور مستی ادا سے محظوظ ہوتا ہے۔ وصل پر خوش ہوتا ہے تو ہجراں سے رنجیدہ بھی ہوتا ہے۔ بے قراری میں تڑپتا بھی ہے، آنسو بھی بہاتا ہے، لیکن جب اس پر بھی محبوب بے التفاتی برتتا ہے تو خود بھی بے رخی کا اعلان کر دیتا ہے ؎

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے، ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں — سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو
ہمیں پھر اُن سے اُمید اور انہیں ہماری قدر — ہماری بات ہی پوچھیں نہ وہ تو کیونکر ہو
وفا کیسی، کہاں کا عشق، جب سر پھوڑنا ٹھہرا — تو پھر اے سنگ دل! تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو
لاگ ہو تو اُس کو ہم سمجھیں لگاؤ — جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا

محبوب سے نیازمندی اُردو غزل کی روایت ہے اور عملی زندگی میں عاشقانہ کردار پر بھی اُس کے نقوش بڑے گہرے ہوتے ہیں۔ غزل میں عشق پر حسن کی برتری کی وجہ وہ خیالات ہیں جو فارسی کی متصوفانہ شاعری سے اُردو میں عہد بہ عہد منتقل ہوتے رہے ہیں۔ غالب طبعاً صوفی نہ تھے اور نہ ہی عام روش پر چلنا چاہتے تھے۔ چنانچہ اُن کی شاعری میں اُس نیازمندی، فروتنی اور خاکساری کا پتہ نہیں چلتا، جو اس غزل کا خاصہ ہے۔ اس کے برعکس اُن میں ایک عاشقانہ پندار پایا جاتا ہے۔ غالب کا یہ انداز اُردو غزل میں منفرد ہے۔ ان سے پہلے غزل کے عاشق میں۔

وہ بھی دن ہو کہ اُس ستمگر سے — ناز کھینچوں بجائے حسرتِ ناز

کی جرأت بہت کم تھی، ورنہ اُردو غزل کی اساس نیازمندی، بے چارگی اور خاکساری ہی ہے۔ برخلاف اس کے یہ غالب کے مزاج کی انانیت اور یکتائی ہے جو اس طرح سے سوچتے ہیں کہ

دل لگا کر لگ گیا اُن کو بھی تنہا بیٹھنا — بارے اپنی بے کسی کی ہم نے پائی داد، یاں

غالب نے جذبے کی گہرائی اور روحانی تڑپ کو اپنے تمام عمق اور اثر کے ساتھ ادا کیا ہے۔ اُن کے یہاں باوجود شدّتِ احساس کے، کامل سپردگی اور بے چارگی نہیں ہے۔ وہ شدّت اور کرب کو محض بیان کر دینا ہی کافی نہیں سمجھتے، بلکہ ان کا دماغ اس پر قابو پا لیتا ہے اور اپنے جذبات اور احساسات سے بلند ہو کر اُن میں ایک لذت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے حزن اصلیا



کوشش کی گئی ہے وہ ذہنی تجرید نہیں، بلکہ تجربے اور جذبے سے بھرپور ہونے کے باعث مجازی، مادّی اور انسانی ہیں۔ محبت میں روٹھنے اور منانے، بدگمانی اور خفگی، انتظار اور تڑپ، اُلجھن اور بے بسی، رشک اور جلن، طنز اور اصرار کے بہت سے موقعے آتے ہیں۔ یہ شاعر کے عشق کی محض منزلیں ہیں، جائے قیام نہیں ہیں۔ غالب کی رنگین مزاجی اُن کی رندانہ شوخیوں کا سہارا لے کر "عذرِ مستی" کی حدود کو چھونے لگتی ہے، "علَم پیش دستی" کبھی ہو جاتی ہے اور "دھول دھپّا" کی نوبت پہنچ جاتی ہے۔ غالب تشنہ کام رہنا نہیں چاہتے۔ اُن کی شاعری کی بنا محض تخیّل آفرینی اور تصوّر پرستی پر نہیں ہے۔ نہ وہ خود خلاؤں میں گم رہتے ہیں اور نہ اپنی شاعری کو خلاؤں میں گم ہونے دیتے ہیں، بلکہ اُن کے کلام میں پُرسکون زندگی، انسانی ہستی کے رنج و خوشی، مکروہاتِ زندگی، حسن و عشق کی کشمکش، رنجیدہ دلوں کو تسکین و راحت دینے کی کیفیت موجود ہے۔ ان تمام باتوں کے لئے صرف زبان پر قدرت حاصل ہونا کافی نہیں، بلکہ فطرت کا بڑا نکتہ داں ہونا ضروری ہے، جیسے ؎

لے تو لوں سوتے میں اُسکے پاؤں کا بوسہ مگر ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہو جائے گا

عقل و شوق، [illegible] اور آرزو کے متضاد تقاضوں کو بڑے ہی فنکارانہ شعور کے ساتھ یکجا کیا ہے۔ انسان اور اس کے خصائل سے گہری واقفیت، وسعتِ نظر، انسانی ہمدردی اور غم خواری یہ ایسی خوبیاں ہیں جو غالب کے کلام میں بکھری پڑی ہیں۔

غزل کی روایت میں رقیب کا ایک خاص تصوّر پیدا ہو چکا ہے اور یہ کردار محبّت کے اجزائے ترکیبی میں ایک اہم جزو ہے۔ غزل کے تمام شعراء نے اُس کے حق میں فراخ دلانہ رویہ اختیار نہیں کیا، جو عاشق کی نفسیات سے بالکلیہ بعید بھی نہیں ہے۔ وہ رقیب کی ذات کو طعن و طنز کا نشانہ بنا کر اپنے عشق کے صحیح خدوخال کو اُبھرنے اور اُجاگر ہونے میں مدد دیتے ہیں۔ برخلاف اِس کے غالب نے عام روش سے ہٹ کر رقیب کے کردار کا جائزہ حریفانہ احساس سے بالاتر ہو کر لیا ہے۔ ناقدین کا عام خیال یہ ہے کہ فیض احمد فیض رقیب کو تحقیر و تنفّر سے بالاتر تصوّر کرتے ہیں اور اِس رجحان کے اظہار میں منفرد ہیں۔ فیض کی "رقیب سے" ایک اہم نظم ہے اور فکر انگیز بھی۔ فیض نے لذّتِ عشق کی تشریح کی ہے اور خوب کی ہے۔ عشق اُن کے اور رقیب کے درمیان مشترک تجربہ ہے۔ کہتے ہیں ؎

ہم نے اِس عشق میں کیا کھویا ہے کیا پایا ہے جُز ترے اور کو سمجھاؤں تو سمجھا نہ سکوں

وہ ایک حد تک جگر کے اِس خیال سے متفق معلوم ہوتے ہیں ؎

وہ ہزار دشمنِ جاں سہی، مجھے غیر پھر بھی عزیز ہے جسے خاکِ پا تری چھو گئی، وہ بُرا بھی ہو تو بُرا نہیں

یہ تصوّر نیا نہیں ہے، نہ ہی فیض کی دین ہے۔ رقیب کا یہ انسانی تصوّر اور رقیب کے ساتھ تعلقات کی نوعیت بھی اُردو شاعری کے لئے کوئی انوکھی چیز نہیں ہے۔ مومن اور غالب اِس راہ میں فیض کے پیش رَو ہیں۔ مومن کا شعر ملاحظہ ہو جس میں تجربہ اور حقیقت موجود ہے ؎

سامنے اُس کے نہ کہتے مگر اب کہتے ہیں لذّتِ عشق گئی غیر کے مر جانے سے

غالب نے بھی رقیب کے متعلق جو تصوّر پیش کیا ہے، اُس میں انسانیت ہے۔ روایتی تضحیک و تذلیل نہیں ہے۔ ملاحظہ ہو۔

تا کرے نہ غمّازی، کر لیا ہے دشمن کو دوست کی شکایت میں ہم نے ہم زباں اپنا

دیا ہے دل اگر اس کو، بشر ہے کیا کہیئے ہوا رقیب، تو ہو، نامہ بر ہے کیا کہیئے

رقابت کے اس جذبے کا اظہار اس طرح ہو سکتا ہے کہ رقیب یا محبوب کو مار ڈالا جائے۔ یہ جذبے کا راست اظہار کہلائیگا



لیکن یہ عمل جذبے کی تہذیب کسی صورت میں بھی نہیں ہو سکتا۔ غالب نے اپنے اس جذبے کو انتہائی متوازن کر لیا ہے اور مصلحتاً ہی سہی محبوب سے شکوہ شکایت کے معاملے میں ایک اہم درمیانی راہ نکال لیا۔ دوسرے، شاعر بری کے احساس کو مدِّ نظر رکھا۔ رقابت کے جذبے کی اس سے بڑی تہذیب نہ ہو گی کہ غالب نے اس ناخوش گوار جذبے سے پہلو بچائے بغیر اس کی تخریبی قوت کو کم کر دیا ہے۔ اسے ہمہ گیر، مضبوط اور لطیف بنا دیا ہے۔ جذباتی تہذیب کی پہلی شرط یہی ہے کہ ہر قسم کے جذبات کو قبول کیا جائے اور انہیں ہر قسم کی ذہنی، اخلاقی، سماجی اور جمالیاتی اقدار سے ٹکرانے دیا جائے۔ غالب نے ان تمام پہلوؤں کو مدِّ نظر رکھا ہے۔ عمومی طور سے ایسی شخصیتیں بہت کم ہوتی ہیں جو تھوڑے رکھ رکھاؤ کے ساتھ حالات سے سمجھوتہ کر لیتی ہیں۔ غالب کی شخصیت کا یہ وصف ہے کہ وہ حالات اور جذبات کی رَو میں بہہ نہیں جاتے، بلکہ فکر و ادراک کے ساتھ مصالحت کر لیتے ہیں، تاکہ معاملہ بگڑنے نہ پائے اور آئندہ کے لیے گنجائش بھی باقی رہے۔ کہتے ہیں ؎

قطع کیجے نہ تعلق ہم سے — کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی
ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے — بے نیازی تری عادت ہی سہی
[illegible] نہ دکھلا، پر بہ اندازِ عتاب — کھول کر پردہ ذرا آنکھیں ہی دکھلا دے مجھے
[illegible] بات، مگر خو بری نہیں — بھولے سے اس نے سیکڑوں وعدے وفا کیے
نہیں نگار کو الفت نہ ہو نگار تو ہے — روانیِ روش و مستیِ ادا کہیے
تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو — مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

ان اشعار کو دیکھتے ہوئے ہمیں سوچنا پڑتا ہے کہ غالب نے محض احساسات کی عکاسی نہیں کی ہے، بلکہ احساس کو فکر کے سانچے میں ڈھال کر پیش کیا ہے اور احساس کو سیدھے سادے اظہار سے ہٹا کر فکری انداز کی طرف موڑنا غالب ہی کا کمال ہے۔ غالب سے پہلے اردو شاعری میں جذبات تھے، احساسات تھے لیکن فکر و فن اور شوخ ذہانت نہیں تھی۔ صاحبِ دل حسن و محبت کے معاملات سے بخوبی واقف ہوں گے اور انہیں یہ اندازہ بھی ہو گا کہ غالب نے جس قدر تفکر اور عقلیت سے اپنے جذبات و احساسات کو فلسفہ کیا ہے، کسی اور نے نہیں کیا۔ جس کی وجہ سے غزل میں ایک وقار پیدا ہو گیا اور معنویت میں اضافہ بھی ہو گیا ہے۔ اسی وجہ سے ان کے کلام میں زندگی کی حرارت اور عزم و ہمت موجود ہے جس کا تعلق ان کی شخصیت کی مخصوص افتادِ طبع اور زندگی کے تجربات سے ہے۔

غالب عشق میں سراپا نیاز نہیں، بلکہ خودداری کے قائل تھے۔ اُن کے یہاں چاہے جانے کے ساتھ ساتھ چاہے جانے کی تمنا بھی موجود ہے۔ محبت کے دونوں رُخ ملتے ہیں۔ ہجر کے مصائب کا بھی ذکر ہے اور وصل کی لذتوں کا بھی۔ حسن کے معاملے میں مکمل سپردگی، مجبوری، بے چارگی، گھٹن اور گھٹن کا کہیں نشان نہیں۔ برخلاف اس کے ان کے یہاں عشق کا بلند معیار بھی موجود ہے۔ ان کی طبیعت عشق سے ریت کا مزا بھی اٹھاتی ہے۔ "ستم ہائے روزگار" سے پس جانے کے باوجود وہ محبوب کے خیال سے غافل بھی نہیں رہے۔ ایسی صورت میں اُن کے جذبے کے خلوص پر شک بھی نہیں کیا جا سکتا۔ بحیثیتِ مجموعی ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ غالب محبت کے معاملے میں لذتِ ملنے کے قائل تھے۔ چھا جاں یا ما تاجاں کی قید نہیں چاہتے تھے ؎

[illegible] میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید — مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو

یا پھر یوں دیکھیے کہ [illegible]

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا — تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

حامد اللہ ندوی

سبد چین اور غالب کے انگریز ممدوح

خود غالب کی تصریح کے مطابق "سبد چین" اُس میوہ کو کہتے ہیں جو آخر موسم میں درخت پر رہ جاتا ہے اور چین کے اُتار لینے کے بعد ٹہنیاں بے برگ و بار ہو جاتی ہیں۔ چوں کہ اس مجموعے میں غالب کے وہ اشعار ہیں جو اُن کے کلیاتِ فارسی میں شامل ہونے سے رہ گئے تھے اور یہ اس سلسلے کی آخری چیز تھی اس لیے اُنھوں نے اس کا نام سبد چین رکھ دیا۔

سبد چین کا پہلا نسخہ خود غالب نے اپنی نگرانی میں ۱۸۶۷ء میں شائع کیا تھا جو بہت جلد نایاب ہو گیا۔ لہٰذا ۱۹۳۸ء میں جب مالک رام کو اس کا ایک نسخہ نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی کے کتب خانے سے دستیاب ہوا تو اُنھوں نے نئی ترتیب و تصحیح کے ساتھ اس کو دوبارہ مکتبۂ جامعہ دہلی سے شائع کیا۔ یہ غالب کے فارسی اشعار کا مختصر سا مجموعہ ہے اور اِس میں ہر صنفِ سخن سے متعلق اُن کا کلام موجود ہے۔ قصائد بھی ہیں اور مثنویاں بھی ہیں، ترکیب بند بھی ہیں اور قطعات بھی ہیں، غزلیں بھی ہیں اور رُباعیات بھی ہیں۔ اِن سب میں غالب کا اُن کا اپنا رنگ اور اُن کی اپنی انفرادیت تو موجود ہے ہی، لیکن جس بات کی طرف خصوصیت کے ساتھ یہاں اشارہ کرنا مقصود ہے وہ ہے اِن قصائد یا قطعات میں انگریزوں کی مدح!

اِس پورے مجموعے میں چار قصیدے، چار قطعے، دو رُباعیاں اور کچھ متفرق اشعار انگریز افسروں کی شان میں ہیں جن کا کہیں کھل کر نام لیا ہے اور کہیں وائسرائے، گورنر جنرل اور نواب کہہ کر اُن کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ جن افسروں کا نام لے کر تعریف کی ہے، اُن میں لارڈ الگن، لارڈ لارنس، منٹگمری اور مکلوڈ خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔

پہلا قصیدہ لارڈ الگن کی مدح میں ہے۔ اس کا پہلا شعر ہے ؎

بیا کہ مدحِ خداوندِ دادگر گویم   الا یکہ گفتم ازیں پیش بیشتر گویم

اصل مدح اِس طرح شروع کی ہے ؎

کہ بے مبالغہ فرزانہ لارڈ الگن را   وزیرِ اعظمِ سلطانِ بحر و بر گویم
بدیں کلاہ کہ فرنگیاں او دارد   گراف نیست اگر شاہ تاجور گویم

پورے قصیدے میں غالب نے کہیں اپنا کوئی مدّعا ظاہر نہیں کیا ہے۔ صرف الگن کے لشکر کی تعریف کی ہے اور پھر اپنے دُکھ درد کی کہانی اِن الفاظ میں سنائی ہے ؎

زمانہ وار زمانم ستر رفتاں گردد   اگر براہِ حدیثِ تفِ جگر گویم
شود رکاب نگاور در آب ناپیدا   اگر روانیِ سیلابِ چشمِ تر گویم



دوسرا قصیدہ جان لارنس کی تعریف میں ہے اور اس شعر سے شروع ہوتا ہے ؎

منت کش کہ خورشید فروزاں ہیکل — گرد آمدہ گرائیدہ نظرگاہ عمل

اس قصیدے میں مدح کے شعر اس طرح شروع ہوئے ہیں۔

پیش رو تہنیت مقدم ہنگام بہار — زمزمہ مدحت نواب گورنر جنرل

جان لارنس بہادر کہ لطیرتش ز بہار — ہیچ بیندہ بہ سیدھان جزا حول

اس قصیدے میں بھی غالب نے اپنا کوئی خاص مدعا ظاہر نہیں کیا ہے، البتہ انگریزی حکومت سے اپنے دیرینہ تعلقات کا ذکر کرنے کے بعد بخشش چاہی ہے، لکھا ہے ؎

بمن از پیش گورنمنٹ ہمایوں توقیع — می رسد بر نمط سالفۂ دور ازل

ہست زاں دفتر فرخندۂ فرخ آثار — رقمے چند مرا زیب دہ جیب و بغل

کز چہل سال بہ حکم مددولت گشت — دایہ ام پایہ ام از تو چہ اکثر چہ اقل

لاد شناس کہ پایہ تو بود دیدہ مس — حالی از گرد رہت نیست بہ مردم مکحل

چوں ترا داد قضا منصب دارائی ہند — چوں ترا کرد قدر مرجع ارباب دول

مہر ستم بہ نظرگاہ تو نظم و نثرے — حالی از طول کلام و تہی از طول امل

غالب گوشہ نشیں را رہ بہ تو آوردنے — دلش از بیم دو نیم است ودماغش مختل

بہ جبیں سدہ دیرینہ سمتاتے کہ با او — نیست با این ہمہ در مدح طرازی مبتل

تیسرے قصیدے میں کسی کا نام نہیں لیا ہے لیکن اس میں جو خصوصیتیں اپنے ممدوح کی بتائی ہیں، وہ لارنس پر صادق آتی ہیں۔ اس قصیدے میں بھی غالب نے کھل کر کوئی بات کہنے سے احتراز کیا ہے۔ صرف حاضر خدمت نہ ہونے کی وجہ اس طرح بیان کی ہے ؎

بہ انجمن نرسیدم زناتوانائی — ولے بعرض تنا و دعایم معذور

قصیدہ ہشتم بھی اپنے ممدوح کے ذکر سے خالی ہے۔ ممکن ہے یہ بھی لارنس ہی کی شان میں ہو۔ اس میں شہنشاہ ہند و انگلینڈ کے خلعت بھیجے کا ذکر ہے، لکھا ہے ؎

تار بحتشہائے شاہنشاہ ہند و انگلینڈ — خلعت از مہر خدیوشہ نشاں آوردہ اند

قطعات میں قطعۂ چہارم "وائسرائے کشور ہند" کی شان میں ہے۔ قطعۂ ہفتم نواب میکلوڈ" کی تعریف میں اور ششم و ہفتم منٹگمری کی مدح میں ہیں۔ ان قطعات میں بھی سوائے مبالغہ آمیز روایتی تعریف کے، اور کوئی کام کی بات نہیں۔ ذیل کی دو رباعیاں بھی ایسی دو انگریز افسروں کی شان میں ہیں ؎

ہر روز تنم ز سایہ لرزاں گردد — ہر شب دلم از داغ چراغاں گردد

خواہم ز لطف منٹ گمری صاحب — کار من آشفتہ ساماں گردد

اے پایہ بلند ساز والا جاہی — از مہر تو یاد ہر چہ از حق خواہی

مہ کو کہ میکلوڈ کہ در صورت تست — چوں مہر عیاں معنی روح اللہی

متفرق اشعار میں ان چار افسروں کے علاوہ ایک شعر "ملکہ" کی شان میں بھی ہے، لکھا ہے ؎

ملکہ آنکہ بہ ری چرخ پرستش باشد — لارڈ لارنس گرامایہ وری پرستش باشد



اِن سارے قصائد، قطعات، رباعیات اور متفرق اشعار کو پڑھنے کے بعد جو سوال ذہن میں پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ آخر یہ کون لوگ تھے اور غالب جیسے خوددار شاعر کو ان کی شان میں قصیدہ خوانی کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ خود ان اشعار میں اس سوال کا کوئی جواب ہمیں نہیں ملتا۔ زیادہ سے زیادہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے کوئی وائسرائے تھا، تو کوئی گورنر جنرل، کوئی نواب تھا تو کوئی صاحب۔ لہٰذا مجبوراً ہمیں بیرونی وسائل سے کام لینا پڑتا ہے اور بیرونی ذرائع سے جو معلومات اِن افسروں کے متعلق ہمیں ملتی ہیں اُن کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

لارڈ ایلگن LORD ELGIN: اس کا اصل نام جیمس بروس تھا۔ ۲۰ جولائی ۱۸۱۱ء کو لندن میں پیدا ہوا۔ باپ فوجی آدمی تھا۔ اس نے بیٹے کی تربیت بھی اسی نہج پر کی۔ جوان ہونے کے بعد جامیکا، کینیڈا، چین اور بعض دُوسرے ملکوں میں باری باری اُونچے عُہدوں پر مامور رہا۔ ۱۸۵۷ء میں جب ہندوستان میں بغاوت پھوٹ پڑی تو اُس وقت کے ہندوستانی وائسرائے لارڈ کیننگ کی درخواست پر اس نے اپنی ساری انگریزی فوج کا رُخ تیزی کے ساتھ چین سے ہندوستان کی طرف موڑ دیا، جس سے اس بغاوت کو فرو کرنے میں بڑی مدد ملی۔ چنانچہ اس کو اُس کی اِن خدمات کے صلے میں لارڈ کیننگ کے بعد ہندوستان کا وائسرائے بنا دیا گیا۔ وہ ایک پختہ ارادے اور مضبوط کردار کا آدمی تھا۔ بغاوت کے بعد ہندوستان کے حالات کو اعتدال پر لانے میں اس کا بڑا حصّہ ہے۔

لارڈ لارنس LORD LAWRANCE: یہ ۴ مارچ ۱۸۱۱ء کو یارکشائر میں پیدا ہوا۔ پیشۂ آبا سپہ گری تھا۔ اس نے بھی سپاہی بننے کی بڑی کوشش کی مگر ناکام رہا اور ایسٹ انڈیا کمپنی میں ایک کلرک کی حیثیت سے کام کرنے لگا۔ اس کی قسمت اس وقت چمکی جب لارڈ ہارڈنگ نے اس کے اندر چھپے ہوئے جوہر کو پہچانا اور اس کو اس دلدل سے نکال کر ہندوستان کے شمال مغربی صوبے کا گورنر بنا دیا۔ اس کے دو بھائی ہنری لارنس اور جارج لارنس پہلے ہی نام کر چکے تھے۔ آہستہ آہستہ اس نے بھی اپنی انتظامی صلاحیت کی دھاک لوگوں کے دلوں میں بٹھانی شروع کر دی۔ ہندوستان کی بغاوت فرو کرنے میں جس افسر نے سب سے زیادہ پھرتی دکھائی، وہ جان لارنس ہی تھا۔ اس نے نہ صرف یہ کہ پنجاب کو مکمل طور پر قابو میں رکھا، بلکہ دہلی پر دوبارہ قبضہ کرنے میں بھی اس کا بڑا حصّہ ہے۔ لارڈ ایلگن کی اچانک موت سے ہندوستان میں گورنر جنرل کی جگہ خالی ہوئی تو یہ اعزاز اس کو ملا اور ۱۸۶۳ء تا ۱۸۶۹ء پورے چھ سال وہ ہندوستان کا گورنر جنرل رہا۔

رابرٹ منٹگمری ROBERT MONTGOMRY: اس کا شمار بھی ہندوستان کے بہترین منتظمین میں ہوتا ہے۔ ۱۸۲۸ء میں وہ ہندوستانی ملازمت سے منسلک ہوا۔ ایک زمانے تک الٰہ آباد اُس کا مستقر رہا۔ پھر پنجاب اس کا تبادلہ ہوا، جہاں اس نے لارڈ ڈلہوزی کے کمشنر کی حیثیت سے پنجاب کی نوحی تنظیم میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔ ہندوستان کی بغاوت کے زمانے میں بھی وہ پنجاب کی فوج کا افسر تھا۔ بغاوت کی خبر پاتے ہی اُس نے کمالِ ہوشیاری سے ساری ہندوستانی رجمنٹ سے ہتھیار رکھوا لئے اور گورا رجمنٹ کی مدد سے پنجاب کو فسادات میں حصّہ لینے سے روک دیا۔ اپنی ان خدمات کے صلے میں وہ پہلے پنجاب کا لفٹنٹ گورنر بنا اور پھر سکریٹری آف اسٹیٹ آف انڈیا کی کونسل کا ممبر نامزد ہوا اور مرتے دم تک وہ اس عہدے پر برقرار رہا۔

سر میکلوڈ SIR DOMALD MCLEOD: یہ ایک ہندوستانی نژاد انگریز تھا۔ ۸ مئی ۱۸۱۰ء کو کلکتہ میں پیدا ہوا۔ تعلیم و تربیت انگلستان میں پائی۔ ۱۸۲۸ء میں وہ دوبارہ ہندوستان آیا اور مختلف چھوٹی چھوٹی ملازمتوں سے منسلک رہا، جو زیادہ تر فوجی اور انتظامی تھیں۔ ۱۸۴۹ء میں وہ جان لارنس کی جگہ سکھ علاقے کا کمشنر بنا دیا گیا۔ ہندوستان کی بغاوت کے زمانے میں وہ پنجاب ہی میں تھا اور فسادات کو دبانے میں بڑی حکمتِ عملی دکھائی۔ منٹگمری کی طرح یہ بھی ترقی پاکر پنجاب کا لفٹنٹ گورنر بنا اور ۱۸۶۶ء میں تاج کی طرف سے نوب کا خطاب پایا۔ وہ ایک مذہبی آدمی تھا۔ ہندوستانی اور یورپین دونوں

(باقی صفحہ ۳۲۱ پر دیکھئے)

مناظر عاشق ہرگانوی

غالب اور غدر

جس شہر میں رہتا ہوں اُس کا نام دِلّی اور اس محلہ کا نام بلّی ماروں کا محلّہ ہے۔[1]

۱۶ رمضان ۱۲۷۳ھ مطابق ۱۱ رمئی ۱۸۵۷ء کو علی الصباح یکایک دلّی کی شہر پناہ اور قلعے کی در و دیوار میں زلزلہ پیدا ہوا۔ یعنی میرٹھ چھاؤنی سے کچھ باغی سپاہی بھاگ کر دلّی آئے۔ سب کے سب بغاوت پر کمربستہ اور انگریزوں کے خون کے پیاسے تھے۔ شہر پناہ کے محافظوں نے جو باغیوں کے ساتھ ہم پیشہ ہونے کی وجہ سے قدرتاً ہمدردی رکھتے تھے، اور جو ممکن ہے پہلے سے اُن کے ساتھ عہد و پیماں بھی کر چکے ہوں، دروازے کھول دیئے اور حقِ نمک اور حفاظتِ شہر کو بالائے طاق رکھ کر ان ناخواندہ یا خواندہ مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ ان سبک عناں سواروں اور تیز رفتار پیادوں نے جب شہر کے دروازوں کو کھلا ہوا اور دربانوں کو مہماں نواز پایا تو دیوانہ وار ہر طرف دوڑ پڑے اور جہاں جہاں انگریز افسروں کو پایا، قتل کر ڈالا اور اُن کی کوٹھیوں میں آگ لگا دی۔ اہل شہر کو، جو سرکار انگریزی کے نمک خوار تھے اور حکومت انگریزی کے سائے میں امن و اماں کے ساتھ زندگی بسر کر رہے تھے، ہتھیار سے بیگانہ، تیر و تبر میں بھی امتیاز نہ کر سکتے تھے۔ نہ ہاتھ میں تبر رکھتے تھے نہ شمشیر۔ سچ پوچھو تو یہ لوگ صرف اس مطلب کے تھے کہ گلی کوچوں کو آباد کریں۔ اس گروہ کے ہرگز نہ تھے کہ جنگ و جدل کے واسطے کمربستہ ہوں۔ ان غریبوں نے اپنے آپ کو اس آفتِ ناگہانی کے آگے ناچار اور بےبس پایا، اس لئے گھروں کے اندر غم اور ماتم میں بیٹھ رہے۔ بندہ بھی انہیں ماتم زدگان میں سے ہے۔ گھر میں بیٹھا تھا کہ شور و غوغا بلند ہوا۔ قبل اس کے کہ سبب دریافت ہو، چشم زدن میں صاحب ریجنٹ بہادر کے قلعے میں مارے جانے کی خبر آئی ——— معلوم ہوا کہ سوار اور پیادے ہر گلی کوچے میں گشت لگا رہے ہیں۔ پھر تو کوئی جگہ ایسی نہ تھی جو گل انداموں کے خون سے رنگین نہ ہو ——— انگریزوں کے پاس علاقۂ دلی میں سوائے اُس پہاڑی کے، جو شہر میں واقع ہے، اور کچھ باقی نہ رہا۔ چنانچہ ان اہل دانش نے اسی جائے تنگ میں دمدمے اور مورچے بنائے اور ان پر زبردست توپیں لگائیں۔ دیسیوں نے بھی جو توپیں میگزین سے اُڑائی تھیں، ان کو لے جا کر قلعے میں نصب کیا اور دونوں جانب سے گولہ باری شروع ہوئی ——— ۱۴ ستمبر ۵۷ء کو انگریزی سپاہ نے اس شد و مد کے ساتھ کشمیری دروازے پر گولہ باری کی کہ کالوں کی سپاہ میں بھاگڑ پڑ گئی۔ اگرچہ گیارہ مئی سے

---

[1] اُردوئے معلیٰ



چودھویں ستمبر چار ماہ اور چار روز کا وقفہ تھا، لیکن چونکہ شہر دو شنبہ ہی کے روز ہاتھ سے نکلا اور دو شنبہ ہی کو پھر قبضے میں آگیا۔[1]

واللہ ڈھونڈنے کو مسلمان اس شہر میں نہیں ملتا۔ کیا امیر، کیا غریب، کیا اہلِ حرفہ۔ اگر کچھ ہیں تو باہر کے ہیں۔ ہنود البتہ کچھ کچھ آباد ہو گئے ہیں۔ اب پوچھو کہ تو کیونکر مسکنِ قدیم میں بیٹھا رہا۔ صاحبِ بندہ، میں حکیم محمد حسن خاں مرحوم کے مکان میں نو دس برس سے کرایہ کو رہتا ہوں اور یہاں قریب کیا بلکہ دیوار بدیوار ہیں گھر حکیموں کے۔ اور وہ نوکر ہیں راجہ نرندر سنگھ بہادر والیِ پٹیالہ کے۔ راجہ نے صاحبانِ عالیشان سے عہد لے لیا تھا کہ بروقتِ غارتِ دلی یہ بچ رہیں۔ چنانچہ بعد فتح راجہ کے سپاہی یہاں آبیٹھے اور یہ کوچہ محفوظ رہا۔ ورنہ میں کہاں اور یہ شہر کہاں۔ مبالغہ نہ جاننا، امیر غریب سب نکل گئے۔ جو رہ گئے تھے، وہ نکالے گئے۔ جاگیردار، پنشن دار، دولت مند، اہلِ حرفہ کوئی بھی نہیں ہے۔ مفصل حال لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ ملازمانِ قلعہ پر شدت ہے اور باز پرس۔ دار و گیر میں مبتلا ہیں۔ مگر وہ نوکر جو اس ہنگام میں نوکر ہوئے اور ہنگامے میں شریک رہے ہیں۔[2]

میں غریب شاعر دس برس سے تاریخ لکھنے اور شعر کی اصلاح دینے پر متعلق ہوا ہوں۔ خواہی اس کو نوکری سمجھو، خواہی مزدوری جانو۔ اس فتنہ و آشوب میں کسی مصلحت میں، میں نے دخل نہیں دیا۔ صرف اشعار کی خدمت بجا لاتا رہا اور نظر اپنی بے گناہی پر۔ شہر سے نکل نہیں گیا۔ میرا شہر میں ہونا حکام کو معلوم ہے مگر چونکہ میری طرف بادشاہی دفتر میں سے یا مخبروں کے بیان سے کوئی بات پائی نہیں گئی، لہٰذا طلبی نہیں ہوئی، ورنہ جہاں بڑے بڑے جاگیردار بلائے ہوئے یا پکڑے ہوئے آئے ہیں، میری کیا حقیقت تھی۔ غرض کہ اپنے مکان میں بیٹھا ہوں۔ دروازے سے باہر نہیں نکل سکتا۔ سوار ہونا اور کہیں جانا تو بڑی بات ہے۔[3] رہا یہ کہ کوئی میرے پاس آوے۔ شہر میں ہے کون جو آوے؟ گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں۔ مجرم سیاست پائے جاتے ہیں۔ جرنیلی بندوبست یازدہم مئی سے آج تک یعنی شنبہ پنجم دسمبر ۱۸۵۷ء تک بدستور ہے۔[4]

سہ شنبہ ۹ جنوری ۱۸۵۸ء اس وقت تک میں مع عیال و اطفال جیتا ہوں۔ بعد گھڑی بھر کے کیا ہو، کچھ معلوم نہیں۔[5]

میں مع زن و فرزند ہر وقت اسی شہر میں قلزمِ خوں کا شناور رہا ہوں۔ دروازے سے باہر قدم نہیں رکھا۔ نہ پکڑا گیا، نہ قید ہوا، نہ مارا گیا۔ کیا عرض کروں کہ میرے حال پر کیسی عنایت کی اور کیا نفسِ مطمئنہ بخشا۔ جان و مال و آبرو میں کسی طرح کا فرق نہیں آیا۔[6] ــــ لیکن ــــ بیگم صاحبہ نے بغیر مجھ سے کہے ہوئے قیمتی اشیا مثلاً زیور، کپڑے جو کچھ تھے، چھپا کر کالے صاحب پیرزادہ کے مکان بھجوا دیے تاکہ وہاں تہ خانے میں محفوظ رہیں اور دروازہ مٹی سے بند کر دیا۔ جب لشکرکشوں نے شہر فتح کر لیا اور سپاہیوں کو لوٹ کا حکم ملا تو اس راز کے رازداں نے مجھے بتلایا، مگر وہ اسباب ہاتھ سے جا چکا تھا۔ میں نے افسوس کیا اور یوں تسلی دی کہ جانے والی چیز تھی، اچھا ہوا کہ میرے

---

[1] دستنبو (ترجمہ) [2] منشی ہرگوپال تفتہ کے نام۔ [3] لیکن اس میں مرزا نے مبالغہ کیا ہے۔ وہ خود ایک خط میں نواب محمد یوسف علی خاں والیِ رامپور کو لکھتے ہیں: "دریں ہنگامہ (غدر) خود را بکنار کشیدم و بدیں اندیشہ کہ مبادا اگر یک قلم ترکِ آمیزش کنم خانہ من تاراج رود و جاں در معرض تلف افتد، بباطن بیگانہ و بظاہر آشنا ماندم" (مکاتیبِ غالب ص ۹) اس کے علاوہ بعض اور روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ قلعہ میں بھی جایا کرتے تھے۔ چونکہ باغیوں نے بہادر شاہ ظفر کے شہنشاہِ ہندوستان ہونے کا اعلان کر دیا تھا اور مرزا نہیں جانتے تھے کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے اس لئے انہوں نے مصلحت اسی میں دیکھی کہ یکایک تعلقات منقطع نہ کیے جائیں۔ (ذکرِ غالب از مالک رام ص ۸۷)

[4] اردوئے معلّٰی ص ۹۰ و ۱۱ اور گلستانِ سخن ص ۵ تا ۶۔ [5] اردوئے معلّٰی ص ۹۰۔ [6] ایضاً ص ۹۱

گھر سے نہیں گئی۔



دلی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر ہے۔ قلعہ، چاندنی چوک، ہر روز مجمع بازار جامع مسجد[1] کا، ہر ہفتے سیر جمنا کے پل کی۔ ہر سال میلہ پھول والوں کا۔ یہ پانچوں باتیں اب نہیں۔ پھر کہو دلی کہاں۔ میری جان یہ وہ دلی نہیں ہے جس میں تم پیدا ہوئے ہو، وہ دلی نہیں ہے جس میں تم نے علم تحصیل کیا ہے، وہ دلی نہیں ہے جس میں تم شعبان بیگ کی حویلی میں مجھ سے پڑھنے آتے تھے، وہ دلی نہیں ہے جس میں سات برس کی عمر سے آتا جاتا ہوں، وہ دلی نہیں ہے جس میں اکیاون برس سے مقیم ہوں، ایک کیمپ ہے۔ مسلمان اہلِ حرفہ یا حکام کے شاگرد پیشہ۔ باقی سراسر ہنود۔ معزول بادشاہ کے ذکور جو بقیۃ السیف ہیں وہ پانچ پانچ روپیہ مہینہ پاتے ہیں۔ امرائے اسلام میں سے اموات گنو۔ حسن علی خاں بہت بڑے باپ کا بیٹا، سو روپیہ روز کا پنشن دار، سو روپیہ مہینہ کا روزینہ دار بن کر گیا۔ میر ناصر الدین باپ کی طرف سے پیرزادہ، نانا اور نانی کی طرف سے امیر زادہ، مظلوم مارا گیا۔ آغا سلطان، بخشی محمد علی خاں کا بیٹا، جو خود بھی بخشی ہو چکا ہے، بیمار پڑا۔ نہ دوا، نہ غذا۔ انجام کار مر گیا۔ تمہارے چچا کی سرکار سے تجہیز و تکفین ہوئی۔ احبا کو پوچھو۔ ناظر حسین مرزا، جس کا بڑا بھائی مقتولوں میں آ گیا، اس کے پاس ایک پیسہ نہیں۔ ٹکے کی آمد نہیں۔ مکان اگرچہ رہنے کو مل گیا ہے، مگر دیکھئے چھٹا رہے یا ضبط ہو جائے۔ بڑے صاحب ساری املاک بیچ کر نوش جان کر کے بیک بینی و دو گوش بھرت پور چلے گئے۔ ضیاء الدولہ کے پانسو روپیہ کرایہ کی املاک واگذاشت ہو کر پھر قرق ہو گئی۔ تباہ خراب لاہور گیا۔ وہاں پڑا ہوا ہے۔ دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ قصہ کوتاہ قلعہ اور جھجر اور بہادر گڑھ اور بلب گڑھ اور فرخ نگر کم و بیش تیس لاکھ روپے کی ریاستیں مٹ گئیں۔ شہر کی عمارتیں خاک میں مل گئیں۔[2] بڑے بڑے نامی بازار، خاص بازار اور اردو بازار اور خانم کا بازار کہ ہر ایک بجائے خود ایک قصبہ تھا، اب پتہ بھی نہیں کہ کہاں تھے۔ صاحبانِ امکنہ، دوکانیں نہیں بتا سکتے کہ ہمارا مکان کہاں تھا اور دوکان کہاں تھی۔ غلہ گراں ہے۔ موت ارزاں ہے۔ میوہ کے مول اناج بکتا ہے۔ ماش کی دال ۸ سیر، باجرہ ۱۲ سیر، گیہوں ۱۳ سیر، چنے ۱۶ سیر، گھی ڈیڑھ سیر، ترکاری مہنگی۔[3] اس پر مصیبتِ عظیم یہ ہے کہ قاری کا کنواں بند ہو گیا۔ لال ڈگی کے کنویں یک قلم کھاری ہو گئے۔ آخر کھاری ہی پانی پیتے ہیں۔ گرم پانی نکلتا ہے۔ پرسوں میں سوار ہو کر کنوؤں کا حال دریافت کرنے گیا تھا۔ مسجدِ جامع سے راج گھاٹ دروازے تک بے مبالغہ ایک صحرا لق و دق ہے۔ اینٹوں کے ڈھیر جو پڑے ہیں وہ اگر اٹھ جائیں تو ہُو کا عالم ہو جائے۔ یاد کرو مرزا گوہر کے باغیچے کے اس جانب کو کئی بانس نشیب تھا، اب وہ باغیچے کے صحن کے برابر ہو گیا۔ یہاں تک کہ راج گھاٹ کا دروازہ بند ہو گیا۔ فصیل کے کنگورے کھلے رہے ہیں۔ باقی سب اٹ گیا۔ کشمیری دروازے کا حال تم دیکھ گئے ہو۔ اب آہنی سڑک کے واسطے کلکتہ دروازے سے کابلی دروازے تک میدان ہو گیا۔ پنجابی کٹرہ، دھوبی کٹرہ، رامجی گنج، سعادت خاں کا کٹرہ، جرنیل کی بیوی کی حویلی، رامجی داس گودام والے کے مکانات، صاحب رام کا باغ، حویلی ان میں سے کسی کا پتہ نہیں ملتا۔ قصہ مختصر شہر صحرا ہو گیا تھا۔ اب جو کنویں جاتے رہے اور پانی گوہرِ نایاب ہو گیا تو یہ صحرا صحرائے کربلا ہو جائے گا۔ اللہ اللہ دلی والے اب تک یہاں کی زبان کو اچھا کہے جاتے ہیں۔ واہ رے حسنِ اعتقاد! ارے بندۂ خدا اردو بازار

---

[1] نواب امین الدین احمد خاں بہادر رئیس لوہارو کے نام۔ [2] گلستانِ سخن ص ۲۲۔ [3] چودھری عبد الغفور کے نام۔
[4] میر مہدی مجروح کے نام۔



[illegible] ہا، اردو کہاں، دلی کہاں۔ واللہ اب شہر نہیں ہے کیمپ ہے۔ چھاؤنی ہے۔ نہ قلعہ، نہ شہر، نہ بازار، نہ نہر۔ اور الور کا حال کچھ اور ہے۔ مجھے اور انقلاب سے کیا کام۔ لیکن سکے کا وار تو مجھ پر ایسا چلا جیسے کوئی چھرا یا گولی۔ مگر اب کس سے کہوں، کس کو گواہ لاؤں۔ یہ دونوں سکے ایک وقت میں کہے گئے ہیں۔ جب بہادر شاہ تخت پر بیٹھے تو ذوق نے یہ دو سکے کہہ کر گزرانے۔ بادشاہ نے پسند کئے۔ مولوی محمد باقر جو ذوق کے معتقدین میں تھے، اُنھوں نے دلی اُردو اخبار میں یہ دونوں سکے چھاپے۔ اس سے علاوہ اب وہ لوگ موجود ہیں کہ جنھوں نے اس زمانے میں مرشد آباد اور کلکتے میں یہ سکے سنے ہیں اور اُن کو یاد ہیں۔ اب یہ دونوں سکے سرکار کے نزدیک میرے کہے ہوئے اور گزرانے ہوئے ثابت ہوئے۔ میں نے ہرچند قلمرو ہند میں دلی اُردو اخبار کا پرچہ ڈھونڈا، کہیں ہاتھ نہیں آیا۔ یہ دھبّا مجھ پر رہا۔ پنشن بھی گئی اور وہ ریاست کا نام و نشان خلعت و دربار بھی مٹا۔ خیر جو کچھ ہوا، چونکہ موافق رضائے الٰہی کے ہے، اس کا گلہ کیا ہے

چوں حلقۂ سپہر لعرباں داؤ ست بیداد سود آنچہ بما آسماں دہد[1]

میں نے سکہ کہا نہیں اور اگر کہا تو اپنی جان اور حرمت بچانے کو کہا۔ یہ گناہ نہیں اور اگر گناہ بھی ہے تو ایسا کیا سنگین ہے کہ ملکۂ معظمہ کا اشتہار بھی اس کو نہ مٹا سکے۔ سبحان اللہ گولہ انداز کا بارود بنانا اور توپیں لگانی اور بنک گھر اور میگزین کا لوٹنا معاف ہو جائے اور شاعر کے دو مصرعے معاف نہ ہوں[2]۔

آخر ۱۸۶۳ء میں لارڈ صاحب بہادر نے میرٹھ میں دربار کیا۔ صاحب کمشنر بہادر دلی اہالیٔ دلی کو ساتھ لے گئے۔ میں نے کہا، میں بھی چلوں۔ فرمایا کہ نہیں۔ جب لشکر میرٹھ سے دلی میں آیا، میں اپنے دستور کے موافق روز ورود لشکر میں گیا۔ میر منشی سے ملا۔ ان کے خیمے میں بیٹھ کر صاحب سکرتر بہادر کو اطلاع کروائی۔ جواب آیا کہ ہمارا سلام دو اور کہو کہ فرصت نہیں ہے۔ خیر میں اپنے گھر آیا۔ کل پھر گیا۔ خبر کروائی۔ حکم ہوا کہ غدر کے زمانے میں تم باغیوں کی خوشامد کرتے رہتے تھے۔ اب ہم سے ملنا کیوں مانگتے ہو۔ عالم نظر میں تیرہ و تار ہو گیا۔۔۔ اس دن چلا آیا۔ دوسرے دن میں نے انگریزی خط لکھوا کر اُن کو بھیجا۔ مضمون یہ کہ باغیوں سے میرا اخلاص مظنہ محض ہے۔ اُمیدوار ہوں کہ اس کی تحقیقات ہو، تاکہ میری صفائی اور بے گناہی ثابت ہو۔ یہاں کے مقامات پر جواب نہ ہوا۔ اب ماہ گذشتہ

(باقی صفحہ ۳۲۱ پر دیکھئے)

---

[1] اصل قصہ یوں ہے کہ غدر کے ایام میں ایک جاسوس گوری شنکر نے انگریزوں کو خفیہ اطلاع دی کہ ۱۸ جولائی ۱۸۵۷ء کو جب بہادر شاہ نے دربار کیا تو میرزا غالب نے یہ سکہ کہہ کر ایک پرچہ پر لکھا اور حضور میں گزرانا ہے

بزر زد سکۂ کشور ستانی سراج الدین بہادر شاہ ثانی

غدر کے بعد جب میرزا، صاحب کمشنر بہادر کی ملاقات کو گئے تو اُنھوں نے ان سے اس سے متعلق پوچھا۔ غالب نے جواب دیا "یہ شخص غلط لکھتا ہے بادشاہ تھا عز، بادشاہ کے بیٹے شاعر، بادشاہ کے نوکر شاعر۔ خدا جانے کس نے کہا، اخبار نویس نے میرا نام لکھ دیا۔ اگر میں نے کہہ کر گزرانا ہوتا تو دفتر سے وہ کاغذ میرے ہاتھ کا لکھا ہوا گزرتا۔" بعد میں اُنہیں ایک دوست نے بتایا کہ جب بہادر شاہ تخت پر بیٹھے ہیں تو یہ سکہ ذوق نے کہہ کر پیش کیا تھا اور نہ صرف یہی بلکہ ایک اور بھی (دوسرا سکہ غالباً یہ تھا ہے بسیم و زر زده شد سکہ لہ فضل اللہ ۔ سراج دین ابوظفر شہ بہادر شاہ) چونکہ بہادر شاہ ۳۰ ستمبر ۱۸۳۷ء کو تخت پر بیٹھے ہیں اسی لئے وہ دوستوں سے ۱۸۳۷ء کے اخبار اور خصوصاً مولوی محمد باقر (والد مولانا محمد حسین آزاد) کا اخبار مسمّٰی بہ "دہلی اُردو اخبار" مانگتے تھے، کیونکہ ذوق اور مولوی محمد باقر میں گہری ملت تھی اور یہ سکے اُن کے اخبار میں شائع ہوئے تھے (اُردوئے معلّٰی ص ۹۹، ۱۰۲) مگر نہ یہ اخبار ملا اور نہ وہ اس الزام سے اپنی بریت ثابت کر سکے۔ (ذکر غالب ص ۸۰، ۸۱)

[2] اُردوئے معلّٰی ص ۱۰۸۔ [3] ایضاً ص ۲۷۶ [4] خواجہ غلام غوث بےخبر کے نام۔

خرجِ طبعِ رواں

سلام



اقبالؔ

مرزا غالب

فکرِ انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا
ہے پرِ مرغِ تخیّل کی رسائی تا کجا
تھا سراپا روح تو، بزمِ سخن پیکر ترا
زیبِ محفل بھی رہا، محفل سے پنہاں بھی رہا
دید تیری آنکھ کو اُس حسن کی منظور ہے
بن کے سوزِ زندگی ہر شے میں جو مستور ہے

محفلِ ہستی تری بربط سے ہے سرمایہ دار
جس طرح ندی کے نغموں سے سکوتِ کوہسار
تیرے فردوسِ تخیّل سے ہے قدرت کی بہار
تیری کشتِ فکر سے اُگتے ہیں عالم سبزہ وار
زندگی مضمر ہے تیری شوخیِ تحریر میں
تابِ گویائی سے جنبش ہے لبِ تصویر میں

نطق کو سو ناز ہیں تیرے لبِ اعجاز پر
محوِ حیرت ہے ثریا رفعتِ پرواز پر
شاہدِ مضموں تصدق ہے ترے انداز پر
خندہ زن ہے غنچۂ دلّی گلِ شیراز پر
آہ! تو اُجڑی ہوئی دلّی میں آرامیدہ ہے
گلشنِ ویمر میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے

لطفِ گویائی میں تیری ہمسری ممکن نہیں
ہو تخیّل کا نہ جب تک فکرِ کامل ہم نشیں
ہائے! اب کیا ہو گئی ہندوستاں کی سرزمیں
آہ! اے نظّارہ آموزِ نگاہِ نکتہ بیں
گیسوئے اُردو ابھی منّت پذیرِ شانہ ہے
شمع یہ سودائیِ دل سوزیِ پروانہ ہے

اے جہان آباد! اے گہوارۂ علم و ہنر
ہیں سراپا نالۂ خاموش تیرے بام و در
ذرّے ذرّے میں ترے خوابیدہ ہیں شمس و قمر
یوں تو پوشیدہ ہیں تیری خاک میں لاکھوں گہر
دفن تجھ میں کوئی فخرِ روزگار ایسا بھی ہے؟
تجھ میں پنہاں کوئی موتی آبدار ایسا بھی ہے؟

ویمر: جرمنی کا مشہور شاعر گوئٹے اس جگہ مدفون ہے۔



احسان دانش

ذوق و غالبؔ

عجب دَور تھا ذوق و غالبؔ کا یارو
کوئی اِن سے اُوپر اُبھر کر نہ آیا
تھے جو نغز گو شاعرانِ گرامی
دبائے رہا سب کو اِن دو کا سایا
کیا منتخب ذوق کو اِس فضا نے
بہ نازو نعم اپنا شاعر بنایا
وہ زورِ بیاں کے کرشمے دکھائے
بہ آہستہ کا اُستاد اور نام پایا
مگر دَور گزرا تو اِک خامشی تھی
نہ پہلی حکومت نہ پہلی رعایا

اِدھر دَور میں غالبِ خستہ جاں نے
جو دِل نے الاپا وہی راگ گایا
نہ آسائشِ دَہر کی راہ دیکھی
نہ انعام و اکرام کی سمت آیا
پسِ ذوق جب شاہ نے جستجو کی
اُسی کو بس اصلاح کا اہل پایا
نتیجے میں ہے آج غالبؔ ہی غالب
دماغوں کو بدلا، پلٹ دی ہے کایا
نہ جانے یہ تھی خاک کس سرزمیں کی
مٹی ہے تو اکسیر کا نام پایا
زمانے کی تخلیق تھی، ذوق لیکن
اسدؔ نے خود اپنا زمانہ بنایا



رئیس فروغ (کراچی)

غالب

اتفاقاً کہیں صدیوں میں گزر کرتا ہے — شوخیِ گیتی کوئی صیقل گرِ آئینۂ سنگ
مدتوں بعد کوئی مست بتاتا ہے کہ ہے — مایۂ عقل ترازوئے جنوں کا پاسنگ
روز لگتا نہیں دارائے سخن کا دربار — حس کی سرکار میں کرتی ہے گدائی فرہنگ

بند پاتا ہے تو آزادہ روی میں سرور — مردِ خود بیں درِ کعبہ سے پلٹ جاتا ہے
دل کو رہنِ طلبِ جامِ سفالیں کرکے — شوکتِ ساغرِ جمشید کو ٹھکراتا ہے
برق سے شمعِ سیہ خانہ جلانے والا — آبگینے کو مئے تند سے پگھلاتا ہے
شیوۂ عشق تنک ظرفیِ منصور نہیں — ورنہ ہر قطرے میں دجلہ تو نظر آتا ہے
کچھ نہ پانے پہ بھی عالم کو دلِ رمز شناس — شاہدِ ہستیِ مطلق کی کمر پاتا ہے

لیں یہ چلتا نہیں قزاقِ اجل کا سوفار — جل کے بجھتا ہی نہیں سوزِ تمنا کا چراغ
رنگِ بیرنگیِ دوراں میں نہیں کھو سکتا — خوں یک مجمعِ جذبات سے سینچا ہوا باغ
آج لوحِ ابدِ دستِ جنوں کی تحریر — شمعِ محرابِ بقا سینۂ فن کار کا داغ

غالب اے راہ برِ روشنیِ ذہن و ضمیر
سرِ مشرق ترے افکار کی عظمت سے بلند
تیری تخئیل کی کھاتا ہے ہمالہ سوگند
اسے کہ دیواں ہے را ویدِ مقدس کی نظیر



ضیا فتح آبادی

غالبِ خستہ کے بغیر

(چند رُباعیات)

احساس کی آنچوں میں نکھرتا ہے ابھی
گلیوں سے تخیل کی گزرتا ہے ابھی
فن کار کی قدر و منزلت باقی ہے
غالب کو زمانہ یاد کرتا ہے ابھی

زندہ ہے پسِ مرگ بھی نامِ غالب
صورت گرِ جدت ہے کلامِ غالب
ملتا ہے رُخِ صبحِ ابد سے جاکر
یہ سلسلۂ گیسوئے شامِ غالب

ہمرازِ جمالِ حسن، طور اور کلیم
غنچوں کے دلوں میں چٹکیاں لیتی شمیم
ثابت نہ ہوا ایک صدی میں آخر
غالب بھی عظیم، فکرِ غالب بھی عظیم

اندوہ سے "یک جان و دو قالب" غالب
گویائے الم، درد کا طالب، غالب
یکتا تھا وہ علم و آگہی میں، اور اب
سو سال کے بعد بھی ہے غالب، غالب

مستی اُس کی تھی ہوشمندی کا کمال
ملتی ہی نہیں اور کوئی ایسی مثال
پیچیدگیِ فکر سے تھا کل مشکل
اور آج بھی غالب کو سمجھنا ہے محال

غالب نے دیا موڑ نیا اُردو کو
منزل کا پتہ مل تو گیا اُردو کو
یوں نوک پلک اِس کی سنواری اُس نے
آپ اپنے سے آتی ہے حیا اُردو کو

ہر شعر میں اُس کے ہے دُکھے دل کی پکار
لفظوں میں پھڑکتی ہے رگِ ابرِ بہار
غالب کے بغیر آہ، بُرا ہے اُردو
دامن بھی ہے چاک اور گریباں بھی تار



کرشن موہن

غالب

شاعرِ نکتہ داں و نکتہ نواز

اک مفکّر، فلسفی اور ندیم
طورِ کیف و سرور کا تھا کلیم
نورِ تقدیم جس کا ذوقِ سلیم
جس کی فطنت، شعورِ نو کی شمیم

شاعرِ نکتہ دان و نکتہ نواز — سربسر ناز، سربسر انداز
ہمہ گیر اُس کے شعر کا اعجاز — اور فلک بوس فکر کی پرواز
اُس کی تہ دار فکر، سوز و گداز — اُس کا انداز، لطفِ راز و نیاز
تنگدستی میں بھی نوا پردار — فاقہ مستی میں بھی مزاج نواز
جس کے ذہنِ رسا کے حلقہ بگوش — ندرتِ ناز، ندرتِ انداز
جس کو آرائشِ خم کا شغل — وجہِ اندیشہ ہائے دور و دراز
ہند کا لوحِ اُس کی سوچ میں تھا — گرچہ تھا مستِ بادۂ شیراز
وہ کہ تھا نظم و نثر میں یکساں — صاحبِ طرز، صاحبِ اعجاز
اسد اللہ خاں وہ عاشقِ شوخ — میرزا نوشہ، رندِ شاہد باز
اپنی فکرِ ہزار پہلو میں — گہ پرستار، گہ بُتِ طناز
کتنے ہی دفتروں پہ بھاری ہے — اُس کے رنگیں کلام کا ایجاز

کیفِ ماضی و نورِ آئندہ
کسا ہے جس کے مرگ شرمندہ
تا ابد زندہ اور تابندہ
نام اُس کا رہے گا رخشندہ



عطا محمد شعلہ

بہ یادِ غالب

(رائلے)

بہت بلند ہے رواز طائرِ تخئیل
مگر وہ گردِ تخیل کو تیری پا نہ سکا
حلاتے اور بھی لوگوں نے فکر کے قندیل
ہب بلند ہے یرواز طائرِ تخئیل
لگائی تو نے مگر فکرِ نو کی ایسی سبیل
بغیر پیاس بجھائے کوئی بھی جا نہ سکا
بہت بلند ہے رواز طائرِ تخئیل
مگر وہ گردِ تخیل کو تیری پا نہ سکا

●

ربانِ سہل میں جادو جگا دیا تو نے
عزل کے رُخ پہ مَلا فکر کا نیا غازہ
حلوں کو طرزِ تکلم سکھا دیا تو نے
زبانِ سہل مں جادو جگا دیا تو نے
عزل کو اِک نیا رستہ دکھا دیا تو نے
ہوئی روایت منصور جس سے پھر تازہ
زبانِ سہل مں جادو جگا دیا تو نے
عزل کے رُخ پہ مَلا فکر کا نیا غازہ

●

غمِ حبیب سے لو جھل حیات، آنکھ تھی نم
یہ غم بھی جھیل گیا تو اعصب کیا تو نے!
بہت عزیز تھے اب تک تو گیسوئے پُرخم
غمِ حبیب سے لوجھل حیات، آنکھ تھی نم
لگا کے اِن پہ غمِ کائنات کا مرہم
عزل کو جینے کا اِک حوصلہ دیا تو نے
غمِ حبیب سے بوجھل حیات، آنکھ تھی نم
یہ غم بھی جھیل گیا تو! غضب کیا تو نے

●

حو اپنے زخموں سے کھیلیں اب ایسے لوگ کہاں،
ترے ستار کو یہ فن سکھا دیا تو نے
غموں سے چُور ہوں لیکن نہ لائیں لب پہ فغاں
حو اپنے زخموں سے کھیلیں اب ایسے لوگ کہاں،
سمجھ سکا نہ کوئی تیرے دل کا سوزِ نہاں
تصورات کو پیکر بنا دیا تو نے
حو اپنے زخموں سے کھیلیں اب ایسے لوگ کہاں،
ترے ستار کو یہ فن سکھا دیا تو نے



ہیروں کا سوداگر

شادا شادی

...سے اک سوداگر آیا
رنگ برنگے ہیروں سے بھرپور پٹارے لایا

کچھ تھے خالص ہندوستانی، کچھ اصلی ایرانی
ایک سے بڑھ کر ایک انوکھا، بیش بہا، لاثانی

...مسجد کے سایہ میں اپنی دکاں لگائی
شہرہ سن کر دور دور سے خلقت دوڑی آئی

ایرانی ہیروں کی ایسی تیز چمک جاتی تھی
آسمان کے تاروں تک کی آنکھ جھپک جاتی تھی

لیکن اُس کے دیسی ہیرے لاجواب ہیرے تھے
چمک دمک میں، کانٹ چھانٹ میں، انتخاب ہیرے تھے

سب ہی تھے انمول، کوئی ارزاں سامان نہیں تھا
سوداگر کے دل کو لیکن اطمینان نہیں تھا

...ڈھیر لگا رکھے تھے دیسی ہیرے
کچھ ان گھڑ، کچھ خاک آلودہ، کچھ لافانی ہیرے

ہم پیشہ بیوپاری اُن کی قیمت آنک نہ پائے
لوگوں نے منڈی میں اُلٹے سیدھے دام لگائے

اک بولا "کیوں کانچ کے ٹکڑے بھر لائے ہو حضرت"
اک بولا "پتھر یہ کیا جمع کر لائے ہو حضرت"

جوہری ایک سے ایک بڑا ہے، کون انھیں پوچھے گا
پھینکو یہ سب مال، کوئی دلی میں مفت نہ لے گا

غرض کہ منڈی میں جتنے بھی منہ تھے، اُتنی باتیں تھیں
ناقدری کی، نافہمی کی، ناسمجھی کی باتیں تھیں

بیٹھا تھا بازار بیچ، مایوس و اُداس پردیسی
قسمت سے آ نکلے دو جوہر شناس پردیسی

اُن دونوں کو جوہریوں کی حاصل تھی سرموری
اک پانی پت کا باشندہ تھا اور اک تھا سحوری

دیکھا جب وہ مال پھٹی کی پھٹی رہ گئیں آنکھیں
ہر متعبر، لاکھ ٹکے کی بات کہہ گئیں آنکھیں

وید مقدس کے لفظوں میں ہے جیسی تابانی
اِن ہیروں کی، اُس سے نہیں ہے کچھ کم ضوافشانی

اِن کی ضو سے چندر کرن کی جوت جوانی مانگے
معشوقوں کی شوخ نظر کا خنجر پانی مانگے

پھولوں جیسا رنگ، کلی جیسا البیلا پن ہے
نئی نویلی اک سولہ سنگھار کیے دلہن ہے

پہلے بھی پیدا ہوتے تھے، دریا در یا موتی
اُڑا لیا اِس نے تو کنواری کنیا کی تھر کا موتی

یہ تقدیس و تاب کہاں سے، پتھر لائے ہوں گے
سرمد کے خوں کے قطروں سے لعل بنائے ہوں گے

... حوران جنت کے آویزے ہیں
یا یہ سب تسبیح ملائک کے یاقوتی دانے ہیں

... پہلو لعلِ گراں کیا پیدا یونہی ہوا ہو گا
اس کو گڑھنے والے نے لوہے سے خوں اُگلا ہو گا

... غواص دریا در دریا لیں گے
آج نہیں تو کل دنیا سے لوہا منوا لیں گے

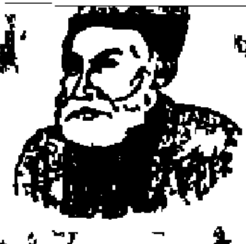
... انگاروں پر شبنم بن جائیں گے
زخموں سے چُور دلوں کا مرہم بن جائیں گے

... وجہ سے ان ہیروں کی ضو بڑھتی جائے گی
یعنی لعلِ شب چراغ کی لو بڑھتی جائے گی

پھر اِس لو سے انساں محنت تک ہوں گے
اک روشن دیپک سے روشن لاکھوں دیپک ہوں گے

قریہ قریہ، نگر نگر، اس آدم پوجے گا انھیں
ہندستاں کا ذکر تو کیا، سارا عالم پوجے گا انھیں

[1] غیر ترا شیدہ [2] قیمت کا اندازہ نہ کر پایا [3] سرتاجی



قمر اقبال

پیغمبرِ دَورِ نَو

وہ شاعر کہ جو پیغمبرِ دَورِ نَو تھا
ہے مقدّس ترے دیواں کا ہر اِک ورق
تُو وہ سُورج کہ جو اُبھرا تھا کئی سمتوں سے
تُو نے دریافت کیے فکر کے نادیدہ اُفق

ایک اِک حرف دَمکتا ہے نگینے کی طرح
ملکۂ فن کی ہیں انگڑائیاں شعروں میں ترے
تُو مرے دَور کا شاعر تو نہیں ہے لیکن
ہیں مرے دَور کی پرچھائیاں شعروں میں ترے

تیرے نزدیک علامت تھی نئے موسم کی
دل کے خوابیدہ سے زخموں کا ہرا ہو جانا
دردمندانِ محبت کو دیا تُو نے پیام
درد کا حد سے گُذرنا ہے دَوا ہو جانا

تُو کہ غم سب کا سمجھتا رہا اپنا، وَرنہ
سنگ اُٹھا لینے پہ سر یاد کسے آتا ہے
باعثِ رشک ہے دیوانگی تیری، وَرنہ
دشت کو دیکھ کے گھر یاد کسے آتا ہے

نسل در نسل دل و ذہن کو گرمائے گا
تیری آواز کا جادُو ترے لہجے کا وقار
محلوں، کوٹھوں پہ، درگاہوں پہ گزریں گے یہی
سالہا سال رہے تیکھے سلونے اشعار

ایک تیشے کی طرح تھا ترے ہاتھوں میں قلم
فن کا کہسار شب و روز تراشا تُو نے
لکھ دیا تُو نے جو، دُنیا اُسے دُہراتی ہے
جاوداں ہو گیا جس لفظ کو برتا تُو نے

بالیقیں آج بھی شعروں میں وہی ہے کہ جو تھا
وقت کی گرد ترے شیشۂ فن پر نہ جمی
تیرے احساس کا دریا تھا رَواں ہر جانب
کسی ساحل پہ تری موجِ تخیّل نہ تھمی

زندگی کروٹیں لیتی ہے ہر اِک مصرعے میں
کون ہے وہ جو ترے فن کا پرستار نہیں
ہم نے محسوس کیا خُود ہی معلوم کیا
ہم سخن فہم ہیں، غالب کے طرفدار نہیں



رشی پٹیالوی

غالبِ سحرالبیاں

وہ امینِ رازِ حق، وہ شاعرِ جادو بیاں
انجمن آرا ہے جس کا ذکرِ جاوداں
گرمیِ عشق کی تنویر جس کی ذات میں
جس نے بخشی شعریت کو علم و فن کی روشنی
مختلف تھا دوسروں سے جس کا اسلوبِ بیاں
جس کی فکرِ نکتہ رس، جس کی نوائے شاعری
جس نے اہلِ دل کو پیغامِ فلک گیری دیا
شعر میں جس نے سمویا درد کی آواز کو
جس کے نغموں میں نہاں اِک آیتِ تسخیر تھی
"زندگی" رکھا تھا جس نے عشق کے مرجانے کا نام
جس کے سینے میں نہاں تھی گرمیِ قندیلِ عشق
پارسائی کو بھی جس کی کافری پر ناز تھا
طبعِ حق آگاہ جس کی وقفِ سوز و ساز تھی
جس کا عالم [illegible] رہتا، عالمِ سرشارِ عشق
جس نے محسوسات کو بخشا مذاقِ شاعری
[illegible] جس کا نصب العین تھا
[illegible] کی ہند کیا، ایران تک توقیر تھی
جس کا دل اِک ساز تھا غم کے ترانوں کے لیے
مستند تھی، معتبر تھا، جس کا فرمایا ہوا
شاہِ دلی کو بھی تھا جس کی شاگردی پہ ناز

وہ وقارِ ایشیا، وہ مایۂ ہندوستاں
وہ پرستارِ وفا، وہ غالبِ سحرالبیاں
ڈھل گیا تھا حسنِ فطرت جس کے محسوسات میں
جس سے وابستہ ہوئی ہر انجمن کی روشنی
دُھل گئی تھی کوثر و تسنیم سے جس کی زباں
منزلِ ہستی میں بھی مثلِ چراغِ رہبری
بستیوں کو رفعتوں سے آشنا جس نے کیا
ہم نوائے دل کیا نغماتِ سوز و ساز کو
درد تھا جس کی نوا میں، بات میں تاثیر تھی
عاشقی میں جان سے، جی سے گزر جانے کا نام
فرض تھی جس کے لیے پابندیٔ تکمیلِ عشق
جس کی رندی میں بھی اِک ایماں کا انداز تھا
لامکاں تک جس کے ذہن و فکر کی پرواز تھی
وادیٔ اُلفت میں تھا جو کارواں سالارِ عشق
شاعری کو جس کی جدّت نے عطا کی ساحری
اِک زمانے کی تڑپ سے جس کا دل بے چین تھا
جس کے دم سے شاعری کی عرش پر تقدیر تھی
حق نوا جس کی زباں تھی نکتہ دانوں کے لیے
سب پہ ہے، سب پر رہے گا، سب پہ تھا چھایا ہوا
جس کی اُستادی کا پرچم تھا بلند و برقرار

گو نہیں ہے آج وہ غالب ہمارے درمیاں
اُس کے نغموں سے مگر معمور ہے ہندوستاں



شفیق کوٹی (لاہور)

غالب

عکس ہے ہر لفظ حسنِ فکر کی تنویر کا
کس کو یہ حاصل ہوا ہے آئینہ تحریر کا
تو ہے غالبؔ آج بھی تیرا نہیں کوئی جواب
یہ کرشمہ ہے ترے افکارِ عالم گیر کا
آج بھی گن گا رہا ہے تیرا ہر پیر و جواں
آج بھی چرچا ہے تیری شوخیٔ تحریر کا
ہو رہی ہیں آج بھی شرحیں ترے اشعار کی
آج بھی ہر رُخ روا داستاں ہے تری تفسیر کا
کل بھی مکتوبات سے کرتے تھے ترے اکتساب
آج بھی ہے میں جاری طلسم تیرا سحر کا
لوگ کہتے ہیں کہ حالی نے تجھے زندہ کیا
میں تو کہتا ہوں یہ جادو ہے تری تحریر کا
زندگی کی اس سے بہتر اور کیا تفسیر ہو
"کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا"

وزیر پانی پتی (کراچی)

"دارائے سخن"

فکرِ دنیا میں سر کھپائے ہوئے
اپنی دنیا الگ بنائے گیا
طعنِ اغیار سے جہنم میں
ذہن کی جنتیں سجائے گیا
جنتوں پر بھی مسکرائے گیا
جہل کو آئینہ دکھائے گیا

جیسے کوتاہ قد ہیولوں میں!
روشنی کا منارۂ شب تاب
جسم دلّی کے محبسوں میں اسیر
آنکھ میں کوئے ماہتاب کے خواب
کتنے چہروں سے اُٹھ رہے تھے نقاب
وہ حقیقت شناسِ موج و سراب

کشتۂ جبرِ روزگار بھی تھا
تنگ دستی کا شاہکار بھی تھا
اپنے اہلِ وطن پہ بار بھی تھا
وہ جو روح القدس کا یار بھی تھا



اویس احمد دوراں

روایاتِ غالب کی خاطر

مرے ہم نشینوں کو یہ آرزو ہے
ہر اک شہر میں جشنِ غالب منا کر
ادب پرستاں کے سجا دیں
وہیں جس پہ ہے عالمِ نزع طاری
اسے نو عروسی کا جوڑا پہنا دیں
وہ اردو جو رسوا ہے گلیوں میں اپنی
اُسے لا کے عشرت کدہ میں بٹھا دیں

مرے ہم نشینوں سے کوئی یہ کہہ دے
کہ یہ آرزو نام ہے زندگی کا
ادب سے مرا دل جسے چومتا ہے
عقیدت کا سر جس کے آگے جھکا ہے
مگر دستِ قاتل کا وہ تیز خنجر
جو کتنے ہی حلقوم پر چل چکا ہے
بہت تیز ہے پیاسا لہو کا ابھی تک
لہو بسمل میں پیوست ہو کر اب بھی
ہر اک قریہ و شہر میں پھر رہا ہے
جگتوں میں بھیانک صدا دے رہا ہے
انگلیں اس کی خونی چمک ہے

مرے ہم نشینوں سے کوئی یہ کہہ دے
بقائے روایاتِ غالب کی خاطر
اس اک پیاسے بے آب خنجر کو، اپنی
اُمنگوں کے ہاتھوں سے اب توڑ ڈالیں
کہ یہ معرکے اور رَن کی گھڑی ہے

تسنیم فاروقی

مشعلِ فروزاں

لقب شہرِ تخیل، شہنشہِ ملکِ عروس
تری غزل میں پریشاں ہے زندگی کا خلوص
عبیر و مشک سے تو نے غزل کی مانگ بھری
بساطِ گیسوئے خوباں کو تو نے خوشبو دی
ترا کلام زمانے میں عیسیٰ ثانی ہے
ادائے جسمِ غزالاں کی ترجمانی ہے
جو شعلۂ غمِ دل، میر کے یہاں سے چلا
اُسی کی آنچ سے تیرا چراغِ فکر جلا
بیک چراغ، یہ صد رنگیاں، یہ حسنِ بیاں
غمِ حیات، غمِ دیگراں، غمِ جاناں
بنامِ نغمہ و مضراب و حسرت و نالہ
بہ قیدِ ساغرِ رنگیں شرابِ صد سالہ
خمیں مشربِ صہبا کا سلسلہ غالب
امیرِ میکدہ و میرِ قافلہ غالب
شکوہِ تیشہ و سنگ آج بھی ہے تیرا قلم
صنم گری پہ تری سر جھکا رہے ہیں صنم
فصیلِ وادیٔ گیتی پہ تو نمایاں ہے
ترا پیامِ جنوں، مشعلِ فروزاں ہے



مصحف اکمل قادری

فکرِ غالب

"[illegible] غالب اُن شاعروں [illegible] میں ہیں جو زندگی کو ماتم خانہ [illegible] اور دنیا کو اصل جنازہ خیال کرتے ہیں" (ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم)

جوہرِ غم ہی سہی تابشِ افکارِ حیات
تیرے آئینۂ احساس سے پھوٹی جو کرن
جوہرِ غم کو مگر تو نے بنایا خورشید
بن گئی سحرِ تمنا و نقیبِ اُمید

☆

تیری ایذا طلبی بن گئی عینِ راحت
زندگی قیدِ سلاسل سے گراں تر [illegible]
تیرے غم خانے میں کھلتے رہے گل ہائے مراد
[illegible] قید میں یا بھی زلف کی یاد

☆

مشکلیں تیرے لیے مژدۂ آسانی ہیں
اصل ایماں ہے اپنی [illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]

بے خودی [illegible]
اک زمانے [illegible]
[illegible]
[illegible] اندازہ [illegible]

☆

[illegible]
[illegible] تیرے اس آہنگِ تبسم پہ نثار
تیرا دل عظمتِ [illegible] رکھتا ہے
"جو ہوا غرقہ مئے بختِ رسا رکھتا ہے"



مفتونؔ کوٹوی

غالبِ بلند خیال

(قطعات)

کسے نصیب بجز غالبِ بلند خیال
یہ نثرِ دل کش و نظمِ حسین و فقرۂ چست
بجا ہے کہ بحرِ سخن گسترانِ پیشینی
"مباش منکرِ غالب کہ در زمانۂ تست"

غالب کے سوا کس میں ہے یہ شوخی و جرأت
اللہ سے اندازِ تخاطب ہی نیا ہے
"ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد ۵
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے"

ہر لفظ ہے گنجینۂ معنی کا اک طلسم[1]
دعویٰ ہے اتنے جوش سے کس نے نواز کا ۲
غالب نے خود کو، اردو زباں کو کیا بلند
محرم ہے اور کون نواہائے راز کا

غالب کے حسنِ فکر و نظر پر یہ کیوں ہٹے
وہ خوش نصیب جس کو میسر "نگاہ" ہو
بد طالعی ہے اصل میں غالب سے بدظنی ۶
"تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو"

ہر شعر میں اک بات نئی طرز شگفتہ
جلوہ و دماغ اور، ادا اور، زباں اور
دل اور کہاں اتنے مضامین و اسالیب ۳
لہجہ تک ہیں غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

افکار ہیں حسین، بیاں ہے حسین تر
جس شعر کو بھی دیکھیں سراپا جمال ہے
ہر ایک جملہ جدّت و ندرت سے پُربہار
غالب کا یہ کمالِ سخن، لازوال ہے

ہر خیال ایسا جسے کہتے ہیں سب حسنِ خیال
ہر ادا ایسی جسے حسنِ ادا کہتے ہیں
پھر بھی غالب سے رہے اہلِ زمانہ شاکی
"ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں"

تقریر دلپذیر، ظرافت سے پُرطرب
تحریر، عقل و شوخی و الفت کی ترجماں
وہ وضعِ دلربا، عام روش سے الگ تھلگ
ان کو سمجھیے غالبِ جوش ہم کے لساں

فلسفہ، منطق و تخئیل کی آمیزش ہو
اس کو جذبات و تاثر سے دیا جائے نکھار
اس میں ہو لطفِ زباں، حسنِ بیاں کی ہو جھلک
ہو خمیر ایسا تو ہو پیکرِ غالب تیار

لہ "گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے"



اختر بستوی

نقشِ غالب کی فریاد

میرے کمرے میں جو غالب کی بڑی تصویر ہے
اُس کے نیچے نقرئی حرفوں میں یہ تحریر ہے
"نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا"
رات جب دیوانِ غالب تھا مرے پیشِ نظر
بجھ گئی بجلی، اندھیرا چھا گیا ہر چیز پر
اُس اندھیرے میں مجھے محسوس کچھ ایسا ہوا
جیسے وہ نقشِ رخِ غالب سخن پیرا ہوا
"اے مرے نوعمر ساقی! میں نے کی تھی کیا خطا
کیوں مجھے قیدِ وجودِ کاغذی کر دی عطا
زندگی بھر آرزوئے مرگ میں مرتا رہا
"مجھ کو ہونے نے ڈبویا" کا گلہ کرتا رہا
چاہتا تھا میں، فنا ہو جائے یوں میرا وجود
ہوں نہ میرے واسطے وہم و گماں کی بھی قیود
کس لئے پھر مجھ کو زیبِ بزمِ امکاں کر دیا!
کیوں مجھے تصویر کے پردے میں عریاں کر دیا!"

محمد عبدالقادر ادیب

غالب کی غزل

اک تصور کا حسیں خواب ہے غالب کی غزل
اک درخشاں سا مہتاب ہے غالب کی غزل
چھیڑ اُٹھتے ہیں جس سے دلِ بے تاب کے تار
سازِ ہستی کا وہ مضراب ہے غالب کی غزل
یہ مرے جذبۂ بیدار نے محسوس کیا
ہر غزل گوہرِ نایاب ہے غالب کی غزل
اک پرستارِ ادب کے لئے اے سجدۂ شوق
مسجد و منبر و محراب ہے غالب کی غزل
بادہ نوشانِ ادب کے لیے اے ساقیِ فن
ساغرِ جم ہے مئے ناب ہے غالب کی غزل
حسن کی آنکھ میں سہمے ہوئے آنسو کی طرح
سینۂ عشق میں بے تاب ہے غالب کی غزل
اس کی ہر موجِ تخیل میں ہے دھارے کا شباب
ایک طوفاں ہے گرداب ہے غالب کی غزل
حافظ و رومی و خیام کے دل کی دھڑکن
حسنِ تخئیل کا اک باب ہے غالب کی غزل
نکہت و رنگ میں ڈوبا ہوا ہر مصرع تو
کتنی سرسبز ہے، شاداب ہے، غالب کی غزل
خسروِ فکر و شہنشاہِ تخیل کہیے
ابھی منت کشِ القاب ہے، غالب کی غزل
رقص کرتی ہے رسالے کی رگ و پے میں ادیب
صورتِ برق ہے، سیماب ہے، غالب کی غزل



شورام دیولکر
ترجمہ: بدیع الزماں خاور

(مراٹھی)

مرزا غالب

میرا غالب، نظر آرہا ہے مجھے
[illegible]غالب، نظر آچکا ہے مجھے

[illegible]لات کے دُودھیا بحر میں
بے نیازی سے غوطے لگاتا ہُوا
[illegible]میں سر سے پا تک نہاتا ہُوا
[illegible]ب میں ڈھل کے
محبوب کو، نرم سرگوشیوں سے رِجھاتا ہُوا
بن کے آنسو کی اِک بُوند
معشوق کی غم زدہ آنکھ میں جِھلملاتا ہُوا
[illegible] نظر آچکا ہے مجھے!

[illegible] کے دِلوں کو بڑھاتا ہُوا
[illegible] کی ڈھارس بندھاتا ہُوا
بھید جد[illegible]ت کے کھولتا
[illegible] سے جھنجھلاتا ہُوا
چہرہ و زلف و رُخسار کے شہر میں مُحرمانہ ادائیں دِکھاتا ہوا
[illegible] نظر آچکا ہے مجھے!

ضُعف سے تھرتھراتے ہُوئے ہاتھ میں
خوبصورت غزل کا خریطہ لئے
ریختے کی بگوری سے اپنے لبوں کو سجائے ہوئے احمریں
مجھ کو رنگیں غالب
سرِ انجمن آچکا ہے نظر، گنگناتا ہُوا۔

فکر میں ڈُوب کر اپنے محبوب کا چھپکے چھپکے تصوّر جماتا ہوا
عِشق کی آگ میں جل کے گاتا ہُوا
مُسکراتا ہوا
مست غزلوں کے ساغر لنڈھاتا ہوا
شوخ یاروں کے سر پر چھپکتے ہوئے،
مورپنکھوں کا لہرا اُڑاتا ہُوا

میرا پیارا اگری
میرا محبوب اسد
میرا غالب، نظر آچکا ہے مجھے
میرا غالب، نظر آرہا ہے مجھے!



ساجد الباقری
(راولپنڈی)

خالقِ الفاظ و معانی

سو سال کے بعد آج کی گفتار ہے غالب
اقلیمِ سخن کا وہی سردار ہے غالب

غالب سے غزل اور غزل سے ہے زمانہ
وسعت کے لیئے برسرِ پیکار ہے غالب

اِک شہرِ خموشاں کی فضا چار طرف ہے
ہر اِک یہی کہتا ہے کہ بیدار ہے غالب

صدیوں کے لیئے ہیئت و اسلوب کا وجدان
اِک نقص کا منبع ہے کہ دربار ہے غالب

دِل دادۂ ترسیلِ معانی کا تکلم کیسے ہو
شعروں کی زباں جرأتِ اظہار ہے غالب

اِک خالقِ صد پیکرِ الفاظ و معانی
فن جس پہ کرے ناز وہ فنکار ہے غالب

انسان ہے، انسان کی عظمت کا امیں ہے
ہر قوم کے انساں کا پندار ہے غالب

اب تک جو کہا ہم نے وہ تصدیق کریگا
ہر شعر میں اِک پرتوِ انوار ہے غالب

ہر لفظ میں موجود زمانے کے مہ و سال
اِک فکرِ رسا صورتِ سیار ہے غالب

ہر شعر کہا جس نے بلا قیدِ زمانہ
ہر عہد کے شاعر کا طرفدار ہے غالب

معنی کے سمندر سے فضاؤں تلک آملج
اے کشتِ ادب ابرِ گہربار ہے غالب

چھایا ہی رہے جس کا سدا رُوئے زمیں پر
حرفوں کی کہانی کا وہ کردار ہے غالب

کونپل کی طرح پھوٹ نکلتے ہیں معانی
ہر شعر میں گنجینۂ اشعار ہے غالب

سر جس کا جھکا ہی نہیں تنقید کے آگے
پانی ہے مگر صورتِ تلوار ہے غالب

کل آگے نکل سکتا ہے اُس ذہنِ رسا سے
شوریدہ سروں کے لیئے دیوار ہے غالب

ساجد ہی نہیں اور بھی کچھ لوگ ہیں، کہہ دیں
ہم جس کی رعایا ہیں وہ سرکار ہے غالب



بدیع الزماں خاور

اُردو زباں کی آبرو

السّلام اے شاعری کے بانکپن کے رازدار
السّلام اے حُسن و اندازِ سخن کے رازدار
السّلام اے عظمت و توقیرِ فن کے رازدار
السّلام اے رنگ و بُو کی انجمن کے رازدار
آنکھ سے اوجھل ہے تُو، موجود ہر محفل میں ہے
کر ہے بیدار زباں پر، یاد تیری دل میں ہے

تُو نے انساں کو سکھایا زندگی کا احترام
تُو نے سمجھایا جہاں کو شادی و غم کا مقام
تیرگی میں وہ چراغِ راہ ہے، تیرا کلام
ہر مسافر کو سناتا ہے جو منزل کا پیام
تُو کہ اِک فرہاد ہے تیشہ تری تحریر ہے
تیری ہر تخلیق گویا ایک جُوئے شیر ہے

ہوتے ہیں ظاہر ترے شعروں سے، اسرارِ حیات
تیرے حرفِ دل سے کھلتے ہیں رموزِ کائنات
تیرے نغمے ہے رقم کرتے ہیں دل کی واردات
بھر دیا ہے پیکرِ قرطاس میں رنگِ ثبات
لفظ و معنی کا ہے وہ جادُو ترے دیواں میں
رُوح کو ملتی ہے اِک خوشبو ترے دیواں میں

گو نہیں تیری بیاضِ شعر "الہامی کتاب"*
پھر بھی مشکل ہے کہ پیدا ہو سکے تیرا جواب
ہیں فلک پر ضوفشاں جب تک یہ مہر و ماہتاب
ساری دنیا میں رہے گا نام تیرا انتخاب
یہ مجھے معلوم ہے تُو داد کا طالب نہیں
کوئی بزمِ شعر میں تیرے سوا غالب نہیں

اب سمجھ میں آسکا ہے تیری غزلوں کا مزاج
ہو گئی ہے کل سے کچھ افزوں تری توقیر آج
عہدِ نو کی خسروی کا رکھ کے تیرے سر پہ تاج
کر رہی ہے پیش اِک دنیا ترے فن کو خراج

مانتے ہیں سب تجھے اُردو زباں کی آبرو
اِک زباں کیا، تُو تو ہے ہندوستاں کی آبرو

* میں دیوانِ غالب کو "الہامی کتاب" ماننے کے حق میں نہیں ہوں، کیونکہ اس سے انسانی فکر و دماغ کی عظمت پر حرف آتا ہے۔ خاور



نصیر کمباہیؔ

تخیّل کا خدا

تجھ سا شاعر نہ زمانے میں ہوا تیرے بعد
جو ترے رنگ میں ہو نغمہ سرا تیرے بعد
تیری پروازِ تصوّر، ترا اسلوبِ خیال
کون کہلایا تخیّل کا خُدا تیرے بعد
حسنِ تاثیر سے خالی ہی رہے ہیں یکسر
فکر و فن، شعر و ادب، صوت و نوا تیرے بعد
منزلِ اہلِ شعور اب بھی ہے ویراں ویراں
تجھ سا دیکھا نہ گیا راہنما تیرے بعد
تُو نے حسنِ حُسنِ بیاں کا تھا کیا خود دعویٰ
ہاں وہ اندازِ بیاں کھو ہی گیا تیرے بعد
شاعری جیسے محاورۂ سرِ بزم خاموش
جلوۂ فکر سیہ پوش ہوا تیرے بعد
آج ہر بزم میں اربابِ غزل کہتے ہیں
کس نے دیکھا ہے کوئی شعلہ نوا تیرے بعد

▲

اسحاق ملک حیدرآبادی

نقیبِ زمانہ

بلبلِ نغمہ سنج، رُوحِ چمن
محورِ ادوار و آفتابِ سخن
فطرتِ آسماں، خمیرِ زمیں
حاتمِ دل کے زر نگار نگیں
نکتہ رس، واقفِ زمان و مکاں
خود زباں چومتی ہے تیری زباں
ٹوٹتے ہیں علوم کے کس بل!
فکر تیری ہے پھر بھی لاینحل
ہر زمانے کا، ہر صدی کا نقیب
دوست تو دوست معترف ہیں رقیب
تیری قسمت نے یاوری کی ہے
مفلسی میں شہنشہی کی ہے
تنگدستی میں بے نوا نہ ہُوا
دردمند کس دوا نہ ہُوا
ذکرِ ماضی پہ مسکراتا تھا
حالِ دل پر ہنسی اُڑاتا تھا
خوگرِ رنج و غم رہا ہر آن
مشکلیں ایسی کر گیا آساں
شاعرِ بے مثال نقشِ قلوب
تو ہی غالب تھا، کُل جہاں مغلوب



یادِ غالب

عزیز اندوری

سُونی سُونی سی پڑی تھی محفلِ ذہن و شعور
فکر کی راہوں پہ طاری تھا غبارِ درد و غم
رُک گئے تھے راہ میں جذبات کے بڑھتے قدم
چہرۂ تحریک سے مفقود تھا تسکیں کا نور

تھے در و دیوار جہدِ عزم بے نقش و نگار
شہرِ احساس و عمل پر چھا رہی تھی مُردنی
کھو رہی تھی رُوحِ تازہ اپنی ساری تازگی
ہو رہا تھا منتشر شیرازۂ صبر و قرار

اور نظر آنے لگا ویران یہ دل کا نگر
مُضطرب ہوتی گئی ہر صُورتِ تسکینِ جاں
غیر ممکن سی نظر آنے لگی ترئینِ جہاں
گُھٹ رہی تھی جا رہی تھی سانس کی دھڑکن مگر

یادِ غالب اِک پیامِ عشق بن کر آ گئی
رات کی تاریکیوں میں نُور بن کر چھا گئی

غالب اِک کوی سمراٹ تھے
غالب ایک مہان کوی تھے
غالب ایک انمول رتن تھے
غالب تھے سرتاج، کلا کے
غالب پر گورَو ہے اور ابھیمان ہے ہم کو
ناز ہے ہم کو، فخر ہے ہم کو
غالب کا فن اور شخص
اِک بیش بہا ورثہ ہے ہمارا
بیش بہا سرمایہ اپنا
بیش بہا مریادا اپنی
غالب نے اس دیس کا سارے جگ میں
روشن نام کیا
اس دیس کا اونچا مان کیا
اونچا اس کا استھان کیا
غالب کی رچناؤں میں ہیں
سپنوں کے اُجول سندیسے
آشاؤں کے جگ مگ سپنے
عیش و طرب، سرمستی، شوخی اور رنگ و خوشبو کے نغمے
آنے والی کل کی تصویروں کے خاکے
غالب کی غزلوں کی فضا میں
ہمت، ساہس، جوش، عزائم اور اُمنگوں کی
[illegible] ہے
[illegible] را اندھیاروں
کوئی سمسیاؤں یا کبھی
[illegible] بن کر
جیسے کی لگن
جیسے کا ہے بس بل
لیکن ہم ...!
غالب کی بھاشا
اس جنم بھومی پہ
پھولنے پھلنے کبھی نہ دیں گے!!

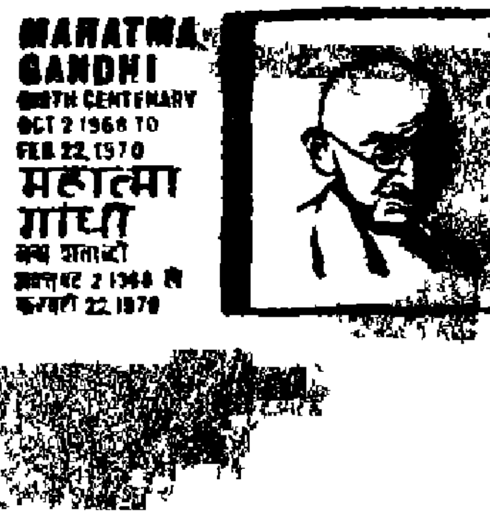
مشتاق

نظم و ضبط سے قوم کی تعمیر



نظم و ضبط ایک
لازمی شرط ہے،
اُن لوگوں کے لئے
جو ایک عظیم قوم
کے [illegible]
خواہشمند ہیں۔

مہاتما گاندھی



بقیہ "سید چین اور غالب کے انگریز ممدوح" صفحہ ۲۹۲ سے آگے

[illegible] عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد وہ عوام کی فلاح و بہبود کے کاموں میں لگ گیا۔

اِن چاروں افسروں کے حالات کی مرید چھان بین سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں صرف ایک لارڈ ایلگن ایسا افسر تھا جس کی زیادہ تر زندگی ہندوستان کے باہر گذری اور وہ محض ۱۸۵۷ء کے فسادات کے نتیجے میں وائسرائے کی حیثیت سے دلّی کے تحت پر نمودار ہوا تھا اور اصلاحات کا کام ادھورا [illegible] اچانک مرگیا، ورنہ باقی تینوں افسروں کے لیے ہندوستان کی سرزمین کوئی نئی نہ تھی۔ وہ ایک مدت تک ایک دوسرے کے ساتھ پنجاب کی فوج میں کام کر چکے تھے۔ فسادات کے بعد جب انہیں سے ایک یعنی لارنس کو ایلگن کی موت کی وجہ سے ہندوستان کا گورنر جنرل ہونے کا موقع ملا تو اُس نے اپنے ان دو پرانے ساتھیو کو بھی دلّی بلا لیا اور تینوں ملکر حالات کو معمول پر لانے کیلئے تدابیر تجویز کرنے لگے۔ اسطرح اِن چاروں افسروں کی جو کچھ اہمیت ہے وہ ہندوستان کے فسادات اور اسکے بعد واقعات کی وجہ سے ہے۔

اِن چاروں افسروں کی طرح ملکہ سے مُراد بھی ملکہ وکٹوریہ ہے جسنے حوادث کے خاتمے کے بعد ۱۸۵۸ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کو ختم کرکے سارے اختیارات [illegible] لئے تھے اور تھوڑی بہت اصلاحات نافذ کر کے ہندوستانیوں کے دل سے خوف کو دُور کرنے کی کوشش کی تھی۔

[illegible] تفصیلات کے بعد غالب کی اِن قصیدہ خوانیوں کے مقصد کو پانا کچھ مشکل نہیں۔ غالب ایک شہرت یافتہ شاعر تھے، دلّی کے رؤسا میں اُن کا شمار ہوتا تھا۔ [illegible] خوار رہ چکے تھے۔ ایسی صورت میں انگریزوں کی نظر میں اُن کا مشتبہ ہونا کچھ بعید نہ تھا۔ اس پوری قیامت کے گذر جانے کے بعد بھی وہ اِن حُدود [illegible] خدمت میں پیش کر سجدہ ریز نہ ہوئے تو یہ شک و شبہہ اور بڑھ گیا، لہذا غالب کیلئے ضروری تھا کہ وہ کوئی نہ کوئی ایسی صورت اختیار کرتے جس سے انگریزوں کے [illegible] شبہہ کو دُور کرنے میں مدد ملتی اور اس کیلئے قصیدوں سے اچھا اور کونسا ذریعہ ہو سکتا تھا چنانچہ انہوں نے قصیدے لکھے اور انکو خاص اہتمام سے شائع بھی کیا۔ [illegible] "سبد چین" کو غالب کی فارسی شاعری میں وہی درجہ حاصل ہے، جو اُن کی فارسی نثر میں "دستنبو" کو حاصل تھا۔ دونوں تاریخی [illegible] ہیں اور ادبی اہمیت کے کم۔

بقیہ "غالب اور غدر" صفحہ ۲۹۸ سے آگے

[illegible] فروری ۱۸۶۰ء پنجاب کے ماتحت سے جواب آیا کہ لارڈ صاحب بہادر فرماتے ہیں کہ ہم تحقیقات نہ کریں گے۔ بس یہ مقدمہ طے ہوا۔ میں کہ [illegible] اس حکم [illegible] نہ ہوا جب لارڈ صاحب بہادر کلکتے پہنچے، میں نے قصیدہ حسب معمول قدیم بھیجدیا۔ مع اس حکم کے واپس آیا کہ اب یہ چیزیں ہمارے پاس [illegible] کرو۔ میں مایوس مطلق ہو کر بیٹھ رہا اور حکام شہر سے ملنا ترک کیا۔ واقعہ اواخر ماہ گذشتہ یعنی فروری ۱۸۶۳ء میں نواب لفٹنٹ گورنر پنجاب دلّی آئے۔ اہالی شہر صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر صاحب کمشنر بہادر کے پاس دوڑے اور اپنے نام لکھوائے۔ میں تو بیگانہ محض [illegible] کسی سے نہ ملا۔ دربار ہوا۔ ہر ایک کا منگار ہوا۔ شنبہ ۸ فروری کو آزادانہ مستی میں پھول سنگھ صاحب کے ہے میں چلا گیا [illegible] نام کا ٹکٹ (اب یہاں ٹکٹ چھاپے گئے ہیں۔ فارسی عبارت یہ ہے "ٹکٹ آمادی دروں شہر بہ شرط ادای جرمانہ" سب صاحبوں پر حکم ہے [illegible] کردکوں نے ٹکٹ مقیم ہے اور کون ٹکٹ رکھتا ہے) صاحب سکریٹر بہادر کے پاس بھیجا۔ بلالیا۔ مہربان یا کروا [illegible] کی ملازمت کی [illegible] وہ بھی حاصل ہوئی۔ دو حاکم جلیل القدر کی وہ عنایتیں دیکھیں جو میرے تصور میں [illegible] [illegible] صورت نہ تھا۔ وہ طریق حسن طلب تیر خواہاں ہوئے تو میں گیا [illegible]

[illegible] حکام ہوگا۔ واللہ [illegible]



کفِ گل فروش
SATHE

صالحہ عابد حسین

حکایاتِ خوں چکاں

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خوں چکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

اس بات سے تو میں متفق نہیں ہوں کہ غالب کی قدر اُن کے دَور میں نہیں ہوئی یا اہلِ ذوق نے اُن کے کلام کی قدر نہیں کی، اس لئے کہ ادبی تذکرے، غالب کے ہم عصروں کے اور خود اُن کے خطوط اس بات کے گواہ ہیں کہ لوگ اُن کا احترام کرتے، اُن کے کلام کو سر آنکھوں پر جگہ دیتے اور اُن سے اصلاح و مشورہ لیتے تھے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ اُس وقت اُن کے کلام کی گہرائی تک پہنچنے اور اُن کے ذوق، اُپج اور ظرافت کو سمجھنے کی صلاحیت بہت کم لوگوں میں تھی۔ (آج بھی اُس کی گہرائی اور مقام کو سمجھنے والے کتنے ہیں؟) ان جواہرات کو جو اُن کے کلام میں بکھرے پڑے ہیں، پرکھنے کے لئے غالباً ایک مدت درکار ہوتی، اگر قسمت سے انہیں حالی جیسا صاحبِ ذوق، سخن شناس دوست نہ مل جاتا، جس نے پوری طرح اُن کے کلام کی خصوصیات کو پہچانا اور بڑی سادگی اور پُرکاری کے ساتھ اُن کو دُوسروں کے سامنے پیش کیا۔ "یادگارِ غالب" نے لوگوں کو چونکا دیا۔ اچھا تو یہ مشکل پسند شاعر ایسی ایسی باتیں کہہ گیا ہے! اُس وقت سے آج تک غالب پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ مخالفت میں کم، موافقت میں زیادہ۔ اُن کی مقبولیت روز بروز بڑھ رہی ہے۔ اُن کا کلام خواص اور عوام دونوں میں مقبول ہے۔ مختصر سے دیوانِ غالب کے بہتر سے بہتر (اور بدتر بھی) نسخے چھاپے گئے ہیں۔ بے شمار مضمون لکھے گئے ہیں۔ پچاسوں رسالوں کے خاص نمبر نکل چکے ہیں۔ اُن پر پچاسوں کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور اس سال تو اُن کی سو سالہ برسی سارے ہندوستان اور کئی دُوسرے ملکوں میں منائی جا رہی ہے۔ اس سلسلے میں بہت کچھ ہو چکا ہے، ہو رہا ہے اور ہوگا۔ سوچتی ہوں، غالب آج زندہ ہوتے (مگر کیوں ہوتے؟ کون شاعر اپنے فن کی صحیح عظمت پہچانے جانے تک زندہ رہا ہے؟) تو کیا کہتے؟ یہ تو ہرگز نہ کہتے

گُھلا کہ فائدہ عرضِ ہُنر میں خاک نہیں

اور نہ کفِ افسوس مل مل کر یہ کہا کرتے

اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس اہلِ دہر کو — سمجھا ہوں دلپذیر متاعِ ہُنر کو میں

اور نہ یہ شعر تو ہرگز نہ کہا ہوتا

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ — بگذر از مجموعۂ اُردو کہ بے رنگِ من است

۔ اعجاز صدیقی صاحب کے اصرار پر یہ مضمون لکھنا شروع کیا۔ آدھے کے قریب ہو پایا تھا کہ ایک حادثے سے دوچار ہو کر سیدھے ہاتھ میں فریکچر ہو گیا۔ باقی مضمون اسی حالت میں مکمل کر رہی ہوں کہ ابھی تک نہ ہڈی پوری جُڑی ہے نہ درد میں کمی آئی ہے۔ اور سرِعنوان شعر غالب اور میری دونوں کی حالت کا آئینہ دار بن گیا ہے ——— صالحہ



مگر کیا غالب سچ مچ اپنے اُردو کلام کو بے رنگ سمجھتے ہیں میرا تو ایسا خیال نہیں ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ابتدا میں بیدل سے غیر معمولی عقیدت، زمانے کے اثر، فارسی سے گہرے لگاؤ نے اُن کے کلام میں پیچیدگی اور مشکل پسندی کے عنصر کو بہت نمایاں کر دیا تھا۔ انہیں نئی نئی تشبیہوں استعاروں اور فارسی ترکیبوں کے استعمال کا بھی بہت شوق تھا اور اپنی ایک الگ راہ نکالنے کی لگن تھی۔ ساتھ ہی یہ احساس بھی کہ اُن کا کلام خواص یعنی اعلیٰ درجے کے شعر و ادب کا ذوق رکھنے والوں کے لئے ہے — واضح رہے کہ اُس وقت عوام اَن پڑھ تھے اور اُونچے درجے کے شاعر اپنے کلام کی عام مقبولیت کو معیار سے گرا ہوا سمجھتے تھے، اِحساس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ غالب میں انانیت اور خود پرستی کچھ ضرورت سے زیادہ ہی تھی۔

اِن سب باتوں کا مِلا جُلا اثر یہ ہوا کہ اُن کے کلام کو عوام بے چارے تو کیا خواص بھی اچھی طرح سمجھنے سے قاصر رہتے اور ان پر طرح طرح کے اعتراضات کئے جاتے۔

کلامِ میر سمجھے اور زبانِ میرزا سمجھے
مگر اِن کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

تب ہی تو غالب نے بے چارے کو یہ کہنا پڑا "گویم مشکل و گرنہ گویم مشکل"۔

"گویم مشکل" تو ٹھیک ہے مگر "نہ گویم مشکل" سے اُن کا کیا مطلب تھا؟ اگر شاعر صرف اپنے لئے شعر کہتا ہے تو نہ اُسے "گویم مشکل" کا گِلا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اور "نہ گویم مشکل" کی پریشانی۔ غالب بھی "جدید ترین" ادیبوں کی طرح یہ کہہ سکتے تھے کہ میں اپنی اظہارِ ذات کے لئے شعر کہتا ہوں، کوئی سمجھے نہ سمجھے میری بَلا سے۔ مگر وہ شاعری "تجریدیت اور پیچیدگی" کا قائل تھا۔ وہ جانتا تھا کہ شاعر کی ایک آواز ہوتی ہے، ایک پیام ہوتا ہے۔ جب جذبات، احساسات اور تجربات کی بھٹی میں تپ کر یہ آواز نکلتی ہے تو سیدھی دُوسرے دِلوں میں اُترتی چلی جاتی ہے اور سننے والا پکار اُٹھتا ہے کہ "یہ بھی میرے دل میں ہے"۔ اس آواز کو غالب کو دُوسروں تک پہنچانا تھا مگر کیسے پہنچائے؟ عام رنگ میں کہنا، لوگوں کے اعتراضات کے سامنے سپر ڈالنا اُس کی فطرت کے خلاف تھا۔ وہ کہے گا تو اپنے ہی انداز میں کہ جو شاعر لوگوں کی فرمائشوں اور عام تقاضوں کو سامنے رکھ کر شعر کہتا ہے، وہ بہت کچھ ہو سکتا ہے، مگر بڑا شاعر نہیں ہو سکتا۔ جس کلام میں شاعر کے ذہن و دماغ کی چھاپ، خونِ دل کی گرمی، جذبات اور احساسات کی آمیزش نہ ہو وہ تُک بندی ہو سکتا ہے شعر نہیں۔ غالب شعوری طور پر یہ باتیں جانتے تھے، اِس لئے اعتراضات اور ناقدریوں کی پروا کئے بغیر شعر کہتے رہے۔

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُن کو اُردو شاعری سے زیادہ اپنی فارسی شاعری پسند تھی۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ اُردو میں شعر کہنا چھوڑ دیتے اور اپنی ساری صلاحیتیں فارسی شاعری میں سمو دیتے۔ انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ کیوں نہیں کیا؟ اِس کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے۔ میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ اپنی زبان کی محبت اور لگن ہر بڑے ادیب کے دل میں ہوتی ہے۔ اور یہی لگن اُن کو اُردو شعر کہنے پر مجبور کرتی تھی — اور آج سبھی یہ بات جانتے ہیں کہ کتنا ہی بڑا اور ماہرِ زبان داں کیوں نہ ہو، اُس کے فن کی خوبیاں اور صلاحیتیں جس طرح نکھر کر اور اُبھر کر مادری زبان میں سامنے آتی ہیں وہ کسی اور زبان میں نہیں آ سکتیں۔ یہی وجہ تو ہے کہ بغیر کاوش اور کوشش کے بقول خود "دل لگی" ہی کے لئے اُردو میں جو کچھ کہا، اُس نے اُن کو شہرت اور مقبولیت کی سب سے اُونچی چوٹی پر پہنچا دیا ہے۔ اُن کے مشکل اور پیچیدہ اشعار کو چھوڑ کر باقی کلام پر اہلِ زبان کا تو کیا ذکر دُوسری زبان والے بھی جو تھوڑی بہت اُردو سمجھتے ہیں، اُن کے کلام پر سر دُھنتے اور بے حد متاثر ہوتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اُن کے مشکل اشعار کی قدر کرنے والے، اُن کی باریکیاں اور پیچیدگیاں سمجھنے والے اور حسن و شکوہ سے متاثر ہونے والے لوگ بھی موجود ہیں، جو ان شعروں کی نت نئی تعبیریں اور تفسیریں کرتے رہتے ہیں۔ لیکن آپ جانیں یہ زمانہ اکثریت کی پسند اور ذوق کا ہے اور غالب کا وہ کلام جس میں سادگی اور پُرکاری، دلپذیری اور دلکشی، درد و اثر کی دنیا پوشیدہ ہے، آج صاحبانِ ذوق کے لئے سُرمۂ نگاہ ہے اور عوام و خواص کے دل کی دھڑکن۔ اگر غالب نے شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنے کلام میں یہ سادگی اور اثر نہ پیدا کیا ہوتا تو آج وہ ہرگز اتنا بڑا شاعر نہ بن سکتا تھا جو لاکھوں کروڑوں آدمیوں کا محبوب ہے۔



[ادب] میں تو ہماری پیاری زبان میں ایک سے ایک بڑا شاعر پیدا ہوا ہے۔ ولی کی اولیت، میر کے درجے اور انیس کی عظمت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ لیکن غالب میں کوئی ایسی بات ضرور ہے جو اُسے ہر دوسرے شاعر سے ممتاز کر دیتی ہے۔ یہ بات کیا ہے آخر؟ درد و غم کے بادشاہ وہ میر سے بڑھ کر نہیں ہو سکتے۔ تصوف میں درد کا مقابلہ کون کر سکتا ہے۔ بیان اور بیان کی فصاحت انیس سے بڑھ کر کیسے ہو سکتی ہے؟ فلسفیانہ موشگافیاں اُن سے کہیں زیادہ اقبال نے کی ہیں۔ عشقِ مجازی کی بولتی تصویریں کلامِ داغ سے زیادہ کہیں بھی نظر آئیں گی۔ پھر غالب میں کیا بات ہے؟ اجازت دیجئے کہ یہ کہوں کہ ایک تو غالب کے یہاں یہ سب خصوصیات ایک حسین امتزاج کے ساتھ ملتی ہیں۔ اُن کے یہاں میر کا درد بھی ہے اور درد کا عشقِ حقیقی بھی۔ انیس کی قدرتِ کلام اور شکوہ بھی۔ اقبال کا فلسفہ اور داغ کا روزمرہ بھی۔ مگر اتنا ہی نہیں اُن کے یہاں اور بھی بہت کچھ ملتا ہے۔ اُن کے کلام کی ایک خصوصیت جو دوسرے بڑے بڑے شاعروں کے کلام میں پائی جاتی ہے یہ ہے کہ وہ ہمہ گیر اور عالمگیر جذبات کی آئینہ دار ہے۔ محض اپنے ماحول، زمانے اور وقتی حالات سے متاثر ہو کر کہے گئے شعر ایک خاص مدت تک مقبول اور پسندیدہ ہوتے ہیں۔ غالب کے یہاں ایسے اشعار بھی کم نہیں۔ لیکن اُن کے کلام کا ایک بڑا حصہ ان جذبات اور احساسات کی عکاسی، اُن خیالات کی ترجمانی، اُس فلسفۂ حیات کی تفسیر کرتا ہے، جو ہر دور اور ہر زمانے کے انسان کے دل کی آواز ہوتا ہے۔ اُن کا غم اور خوشی، اُن کی محبت و رقابت، کامرانی و ناکامی، اُن کی اِس دنیا اور اُس دنیا سب میں کوئی چیز ایسی ہے جو ہر قوم اور ہر دور کے انسان کی ترجمانی کرتی ہے۔ اسی لئے تو اُن کی بات سیدھی سننے والے کے دل میں اُترتی چلی جاتی ہے۔

مسائلِ تصوف پر صدیوں سے صوفی اور عارف گہرا مطالعہ کر رہے ہیں۔ اُردو شاعروں نے بھی اس پر بہت کچھ کہا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ کوئی بھی حقیقت کے چہرے سے ذرا سا نقاب نہ اُٹھا سکا کہ عارفوں کے قول کے مطابق یہاں اوّل و آخر سوا تحیّر کے اور کچھ نہیں۔ اسی حیرت کا کس عالمِ جذب میں ہمارا شاعر اظہار کرتا ہے ؎

جب کہ تجھ بن کوئی نہیں موجود — پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں؟ — عشوہ و غمزہ و ادا کیا ہے
شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے — نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہے
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں — ابر کیا چیز ہے، ہوا کیا ہے

ہمہ اوست کے فلسفے کو کس انداز میں بیان کیا ہے ؎

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا — ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

کبھی حقیقت بیان کرتا ہے کہ اُس ذاتِ واحد کو کوئی دیکھ ہی نہیں سکتا ؎

اُسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا — جو دُوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا

اور کبھی یہ بتاتا ہے ؎

قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کُل — کھیل لڑکوں کا ہوا، دیدۂ بینا نہ ہوا

یہ دیدۂ بینا دنیا میں کتنے لوگوں کو نصیب ہوتا ہے؟

غالب کے زمانے تک خالق کے سامنے بندگی اور عاجزی انسان کی شرافت اور اخلاق کا لازمی جزو سمجھی جاتی تھی۔ شاعر زاہد و واعظ سے شوخیاں کر لیتا، عاشقی مذہب پرستی کا مذاق اُڑاتا، مگر اِس سے آگے بڑھنے کی جرأت کس میں تھی۔ انسانی مزاج میں جو خودداری، خود پرستی اور سرکشی ہے اُس کا اظہار غالب ہی نے پہلے پہل کیا ؎

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم — اُلٹے پھر آئے، درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

اور اس شوخی کا جواب کہاں ملے گا؟ (اقبال بعد کی پیداوار ہیں)



پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق — آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند — گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں

اِس "جناب" کا انداز تو دیکھئے۔

جزا و سزا سے کون منکر ہو سکتا ہے مگر اِس دلچسپ شکایت کا انداز دیکھئے ؎

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد — یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

تلمیحات سے کام لیا اور اُس سے ایک خاص طرز یہ انداز پیدا کرنا غالب کی خصوصیت ہے۔ پروردگارِ عالم سے بھی وہ چوکتا نہیں ؎

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی، نہ طور پر — دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

اور عشق و محبت تو شاعر کا محبوب ترین موضوع ہے۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے، اُردو شاعری میں (جہاں تک غزل کا تعلق ہے) اِس کے سوا اور ملتا ہی کیا ہے — غالب بھی غزل کا شاعر ہے۔ اگرچہ اُس کی غزل میں ہمیں اور بھی بہت کچھ ملتا ہے، حکیمانہ نکتے، فلسفیانہ موشگافیاں حیات و ممات کے مسائل، کائنات کے اسرار، گناہ و ثواب، دنیا اور آخرت بھی اُن کا موضوع سخن بنتے ہیں اور یہاں بھی اُن کی انفرادیت قائم۔ یہی ہے حیات و ممات پر اپنے مخصوص شاعرانہ انداز میں قلم اُٹھاتا ہے تو سُننے والے تڑپ جاتے ہیں ؎

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں — خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

اِس حقیقت کو جانتے سب ہیں مگر غالب کے سوا اِس انداز میں بیان کس نے کیا ہے!

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا — نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

اور ؎

عمر بھر دیکھا کئے مرنے کی راہ — مر گئے پر دیکھئے دکھلائیں کیا

"دکھلائیں کیا" کا ٹکڑا اپنے اندر معنی کی ایک دنیا چھپائے ہوئے ہے۔ زندگی میں دُکھ اور غم اتنے ہیں کہ انسان ان مسرتوں کی طرف بہت کم دھیان دیتا ہے جو اُسے حاصل ہوتی ہیں اور شاعر تو زیادہ ہی حساس ہوتا ہے۔ فلسفۂ غم کو کس ادا سے دو مصرعوں میں سمو دیا ہے ؎

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں — موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جُز مرگ علاج — شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

گناہوں پر پشیمان ہونا انسانی فطرت ہے، مگر غالب کا اندازِ پشیمانی دیکھئے! دریائے رحمت آپ ہی آپ جوش میں نہ آجائے گا کیا؟ ؎

رحمت اگر قبول کرے کیا بعید ہے — شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا

اُسے عشقِ الٰہی اور طاعتِ معبود میں لاگ اور لگاؤ پسند نہیں ؎

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ — دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

اتنا ہی نہیں اُسے بہشت کی عام تعریف سے بھی اختلاف ہے ؎

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن — دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

لیکن سنجیدگی سے جب اس موضوع کو لیتا ہے تو اُس کا شعر عاشقوں کے دل کی آواز ہوتا ہے ؎

سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست — لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو

انسانی نفسیات پر اُس کی سیرت کی کمزوریوں، خواہشوں اور اُمنگوں پر بھی روشنی ڈالتا ہے ؎



ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال　　　ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

ہے دل اگر افسردہ ہے گرمِ تماشا ہو　　　کہ چشمِ تنگ شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد　　　پر طبیعت ادھر نہیں آتی

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی　　　اب کسی بات پر نہیں آتی

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے　　　بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے　　　ہوئے تم دوست جس کے دشمن اُس کا آسماں کیوں ہو

کوئی کہاں تک گنائے، اِس چھوٹے سے دیوان میں سیکڑوں ایسے اشعار موجود ہیں کہ ہر ہر شعر پر بڑے بڑے مضمون لکھے جا سکتے ہیں۔ یہاں بھی اگرچہ شاعر نے صرف اپنا تجربہ اور وارداتِ قلب بیان کی ہے، لیکن اس تجربے میں وہ وُسعت اور جذبے میں وہ گہرائی اور ہمہ گیری ہے کہ اُس کی آواز میں انسانیت کی آواز اور نوعِ انسانی کے جذبات شامل ہو گئے ہیں۔

لیکن بہرحال عشق و محبت غالب کا بھی سب سے محبوب موضوع ہے۔ اُن کا عشق کوئی افلاطونی عشق نہیں۔ اس میں اگرچہ عشقِ حقیقی کی جھلک بھی ہے اور عشقِ مجازی کی مُرقع کشی بھی۔ لیکن اس عشق و عاشقی میں بھی غالب کی انفرادیت نکھر کر اُجاگر ہوئی ہے۔ اُس نے عشق و محبت کی کیفیات کی بڑی پُراثر اور دلکش مرقع کشی کی ہے جس میں جذب ہے، کشش ہے، والہانہ انداز ہے، جاں بازی اور سرفروشی کا جذبہ ہے، گلہ و شکوہ، چھیڑ چھاڑ، طنز و ظرافت ہے، انانیت اور خودداری ہے، محبوب کے درجے کے ساتھ ساتھ عاشق کے مقام اور خودداری کا احساس۔ عشق کی تعبیر و تفسیر دو مصرعوں میں یوں کی ہے کہ دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا　　　درد کی دوا پائی، دردِ لا دوا پایا

حُسن و عشق کی کیسی مکمل تصویر کشی ہے

تُو اور آرائشِ خمِ کاکل　　　میں اور اندیشہ ہائے دور دراز

تو انتہائے حُسن ہے میں انتہائے عشق　　　دیکھے مجھے کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی

مرضِ عشق لا دوا ہے، یہ سبھی کہتے آئے ہیں مگر غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

پیدا ہوئی ہے کہتے ہیں ہر درد کی دوا　　　یوں ہو تو چارۂ غمِ اُلفت ہی کیوں نہ ہو

عشق کیا نہیں جاتا، ہو جاتا ہے۔ بڑا قدیم فلسفہ ہے یہ، غالب نے اس کو اس طرح بیان کیا کہ آج یہ شعر ضرب المثل بن گیا ہے

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب　　　کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

دکھ، غم، مصیبت کچھ ہو عاشق کے دل سے دوست یا محبوب کا خیال نہیں جاتا

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار　　　لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

آج ہزاروں موقعوں پر یہ شعر پڑھا جاتا ہے اور اکثر یہ محسوس ہوتا ہے کہ شاعر نے صرف اسی وقت کے لئے شاید یہ شعر کہا تھا۔

غالب کو بھی اپنے محبوب سے شکایت ہوتی ہے مگر اُس کی شکایت دُوسرے شاعروں (عاشقوں) سے الگ انداز کی ہے۔ اس میں تلخی نہیں ہوتی، طعنے تشنے نہیں ہوتے، گھٹیا پن (الّا ماشاء اللہ) نہیں ہوتا، ہاں طنز اور تُرشی، ظرافت کی چاشنی اکثر ہوتی ہے شکایت کا کیا پیارا اور لطیف انداز ہے

لاگ ہو تو اُس کو ہم سمجھیں لگاؤ　　　جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکہ کھائیں کیا

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن　　　خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

کہتا ہے

منہ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں　　　

منہ تک گئی کھلتے ہی کھولتے آنکھیں ہے ہے　　　خوب وقت آئے تم اس عاشقِ بیمار کے پاس



معلوم کتنا لطیف طنز ہے اس شعر میں ـــ

یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

شکایت اور ظرافت کا امتزاج ـــ

ہم کو ان سے وفا کی ہے امید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

اور اس شعر کی سادگی اور پرکاری تو اپنی مثال آپ ہے ـــ

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے
بے نیازی تری عادت ہی سہی

محبوب کی روایاتی ستم کیشیوں اور تغافل پسندی پر وہ طنز بھی کرتا ہے اور چوٹ بھی۔ کہیں انداز کھلنڈرا ہے، کہیں ظرافت اور تمسخر اور کہیں سنجیدگی سے انانیت اور خودداری کا اظہار ـــ

تمہیں کہو کہ گزارا صنم پرستوں کا
بتوں کی ہو اگر ایسی ہی خو تو کیونکر ہو

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
تمہیں کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے

بے نیازی حد سے گزری بندہ پرور کب تلک
ہم کہیں گے حال دل اور آپ فرمائیں گے کیا؟

شوخی سہی کلام میں لیکن نہ اس قدر
کی جس سے بات اس نے شکایت ضرور کی

اظہارِ عشق کا یہ والہانہ انداز دیکھیے جس میں شوق ہے، جذبہ ہے، بے قراری ہے، تمنا ہے اور "ہوس" ہے۔ مگر کہیں بھی محبت کے معیار سے عاشق کو گرتا ہوا نہیں پائیں گے ـــ

دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے
پندار کا صنم کدہ ویراں کیے ہوئے

چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو
سرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کیے ہوئے

پھر چاہتا ہوں نامۂ دلدار کھولنا
جاں نذرِ دلفریبیِ عنواں کیے ہوئے

مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس
زلفِ سیاہ رخ پہ پریشاں کیے ہوئے

پھر دل میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں
سر زیرِ بارِ منتِ درباں کیے ہوئے

غالب کے گہرے، اچھوتے، کھلنڈرے اور دلکش عشق کی یہ ذرا سی جھلک جہاں تہاں ان کے دیوان سے لی گئی ہے، اس سے آپ پورا اندازہ نہیں کر سکتے۔ ان کے عشق کے ڈانڈے کہیں کہیں عشقِ حقیقی سے بھی ملتے نظر آجاتے ہیں، لیکن زیادہ تر عشقِ مجازی کی کرشمہ سازیاں ہی ملیں گی۔ لیکن غالب کا کمال یہ ہے کہ اسی محبت کے آئینے میں ساری دنیا کو اپنی محبت کا عکس نظر آجاتا ہے۔ ظاہر ہے شاعر اپنی وارداتِ قلب بیان کرتا ہے، اپنے جذبات کی شدت اور تجربات کو شعر کا پیکر عطا کرتا ہے، مگر اس کے جذبات میں وہ گہرائی، احساسات میں وہ ہمہ گیری اور محبت کے اُتار چڑھاؤ اور نازک مقامات کو محسوس کرنے کی وہ بے مثل صلاحیت ہے کہ اس کا ہر شعر سننے والوں کے دل میں اترتا چلا جاتا ہے اور انہیں محسوس ہوتا ہے کہ اس لاثانی شاعر نے جو کچھ کہا وہ ان کے نہیں خود ان کے دل کی آواز ہے اور یہی غالب کی عظمت کی پہچان اور اس کی مقبولیت کا راز ہے۔

ڈاکٹر میمونہ دلوی

غالب کی تشبیہیں اور استعارے

تشبیہ اور استعارے زبان و ادب کے حسن و جمال کا لازمی عنصر ہیں۔ یہ کلام و بیان کو زیادہ موثر اور پُرحسن بنانے کا ایک ذریعہ بھی۔ ان کی مدد سے ایک بات میں وہ زور اور وسعت پیدا کی جا سکتی ہے جو ابلاغ و اظہار کا مقصد ہوتا ہے۔ مثلاً جب ہم کسی کو بلند فکر اور عالی حوصلہ کہنا چاہتے ہیں تو اسے شاہین یا عقاب کے نام سے یاد کرتے ہیں جو اپنی ان ہی صفات کے لیے مشہور ہیں۔ اسی طرح پری وش، ماہ وش، گلرخ اور کتابی چہرہ یا کنول جیسی آنکھیں کہنے سے ہم اس شے کو اُس شے کے برابر قرار دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں یہ امر قابل لحاظ ہے کہ جس طرح جمال مادہ سے پیدا ہوتا ہے اسی طرح تشبیہ اور استعارہ بھی مادہ کے لیے مشتق ہوتے ہیں۔ جب تک ہمارے ذہن میں کسی چیز کا واضح تصور موجود نہ ہو ہم اس کی مثال دہی کو استعمال نہیں کر سکتے۔ مثلاً جب ہم "چاند سا چہرہ" کہتے ہیں تو اس وقت ہمارے ذہن و فکر میں چاند کا حسن اور ہیئت FORM کا نقش موجود ہوتا ہے۔ اسی بات کو علم بیان کی کتابوں میں اس طرح ادا کیا گیا ہے کہ تشبیہ کا منصب یہ ہوتا ہے کہ پڑھنے والے کو معروف سے مجہول کی طرف لے جایا جائے۔ اردو، فارسی، عربی رسالوں میں علم بیان پر بکثرت کتابیں لکھی گئی ہیں جن میں مختلف صنعتوں کی تعریف سے لے کر ان کی متعدد قسموں اور فنی باریکیوں کی تفصیلات درج ہیں۔ لیکن صاحب مرآۃ الشعرا مولوی عبدالرحمن کے یہ الفاظ بہت دلچسپ ہیں کہ "تشبیہ وہ چیز ہے جو تراشۂ صدمات کو پرکالۂ آتش ساقی، سایہ کو چمکاتی، اور میت کو بت کر دکھاتی ہے۔ شعر کا زیور، ادا کا نشتر، اختراع کا منتر، کیا بتاؤں کہ کیا تشبیہ کی ذات میں مضمر ہے۔" استعارہ کی تعریف بھی اسی طرح ہے۔ مغربی نقاد اور انشا پرداز بھی تشبیہ اور استعارے کی غرض و غایت یہ قرار دیتے ہیں کہ "وہ واردات و جذبات کی تشریح، توضیح اور تصریح کریں۔" چنانچہ جب کوئی فنکار کسی تجربے اور جذبے سے گزرتا ہے اور چاہتا ہے کہ وہی مکمل کیفیت جو اس پر طاری ہوئی تھی، پڑھنے والے پر بھی طاری ہو، تو وہ تشبیہ یا استعارے کو اظہار بیان کا ذریعہ بناتا ہے اور معروف کیفیتوں یا چیزوں کا ذکر کر کے غیر معروف کیفیتوں اور تصورات کی وضاحت کرتا ہے۔

تشبیہ اور استعارہ دونوں کا شمار لوازمات شاعری میں کیا جاتا ہے لیکن شاعرانہ حسن کی یہ مشاطہ اپنے دائرۂ حرم سے باہر نکل کر نثر کے بازاروں میں بھی دلداری کا مظاہرہ کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس کے باوجود یہ شاعری کی امتیازی صفات میں داخل ہیں اور شاعری سے اس کا تعلق زیادہ گہرا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ جب کسی شے کا بیان مقصود ہو تو اس سے متعلق جو استعارہ یا تشبیہ ذہن میں در آتی ہے وہ زبان زد اور مشہور شعروں کی ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شاعری کی یہ مشہور اور مقبول عام صنعتیں خود اپنی موزونیت اور ہم آہنگی کی بدولت شاعر کی توجہ اپنی جانب مبذول کراتی ہیں۔ اُن کی اِن ہی صفات کی وجہ سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کی اپنی ایک مخصوص حد اور ایک مخصوص دنیا ہوتی ہے، جہاں صرف ان ہی کی حکمرانی ہے۔

چونکہ شاعر اور ادیب کے علاوہ عام شخص بھی اپنی روزمرہ  گفتگو میں تشبیہہ اور استعارے کو استعمال کرتا ہے اسی لئے اس
طرح سے یہیں ایک شاعر یا ادیب کا مقام اُسی وقت بلند ہو سکتا ہے جبکہ اس کا معیار حسن و ذوق اور انداز بیان عامیانہ
پن سے پاک ہو۔ تشبیہہ اور استعارے کا حسن اُسی وقت اثر انداز ہوتا ہے جب کہ اس میں ایک خاص ندرت اور جولانی
موجود ہو۔ نادر اور جدید تشبیہوں سے اپنی تحریر و تقریر کو مزین کرنا شاعر و ادیب و مقرر کی اعلیٰ صلاحیتوں پر صاد ہے۔ سیاہ رنگت بہت
کم لوگوں کے دلوں کو لبھا سکتی ہے بلکہ بعض خوش ذوق تو اس پختہ رنگ کی تاب بھی نہیں لا سکتے۔ لیکن جب جوش اپنے اشعار میں یہ تصویر
پیش کرتے ہیں

اے کہ گیسو کی طرح نرم و سیہ فام ہے تو — جسم بد دُور کہ خالِ رُخِ ایام ہے تو
تیرے عارض تجلی ہیں ساون کی گھٹاؤں — صبح وعدہ کی دل افروز جھلک شام ہے تو

تو ہماری آنکھوں کے سامنے ایک پُر شباب عورت کا دلکش عکس ابھر آتا ہے جس کے آبنوسی رخسار اور رنگت سی رنگین بصورت دیگر شاید اتنا متاثر
نہ کر سکتیں۔

زاویۂ نگاہ و فکر ہر زمانے اور ماحول کے مطابق بدلتے رہتے ہیں اور اسی نسبت سے مستعمل تشبیہہ اور استعارے بھی اپنے رُوپ
بدلتے رہتے ہیں۔ ان کی ندرت اور اچھوتا پن شاعر کی قدرت مشاہدہ، تجربے اور رنگین تصور کا مست پذیر ہوتا ہے۔ اور وہ خود اس کے زمانے
کے بدلتے ہوئے سیاسی و سماجی، معاشرتی و اقتصادی رجحانات کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ کل کا شاعر اپنی محبوبہ کی سیہ زلفوں کو گھٹا اور سنبل
سے تشبیہہ دیتا تھا۔ آج کارخانے اور مشینیں ہماری زندگی کا ایک اہم جزو بن گئی ہیں، ان کارخانوں کی چمنیوں سے نکلتا ہوا دھواں شاعر
کے لئے کبھی اس کی محبوب کے پیچدار گیسوؤں کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور کبھی اُس کی آہوں کا دھواں بن جاتا ہے۔
اس کے علاوہ تشبیہہ اور استعارے کے رُوپ اُس وقت بدل جاتے ہیں جب شاعر کا دماغ کسی خاص جذبے اور احساس سے
متاثر ہو۔ یہ حقیقت ہے کہ مسرور و شاداں شخص کو ساری کائنات ہنستی گاتی اور ناچتی ہوئی نظر آتی ہے۔ پھولوں کا تبسم اس کی روح پر
سرور و انبساط کی رحمتیں نازل کرتا ہے ہوا کا ہر جھونکا اس کے لئے فرحت و مسرت کے خزانے بکھیر دیتا ہے لیکن جب اس کا یہی سادہ دل رنجیدہ
اور غمگین ہو تو یہی کائنات ماتم کناں نظر آتی ہے۔ پھولوں کا خندہ جانے کیا اس کی بددماغی میں اضافہ کرتا ہے۔ اور ہوا کا ہر عطر بیز جھونکا
اُس کے لئے جہنم کی آگ کی لپٹوں سے مملو ہوتا ہے۔ انسانی جذبات کی گوناگوں کیفیات اور زندگی کے تضاد کو اُس بولتے ہوئے رُوپ
کے آئینوں میں اچھی طرح دیکھا اور پہچانا جا سکتا ہے۔ اس قسم کا تضاد ایک فنکار کی اندرونی کشمکش کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حزن
و ملال کے بوجھ تلے دب کر جب ایک شاعر کراہتا ہے تو 'ماہِ نو' کی حقیقت اس کے سامنے کچھ بھی نہیں ہوتی اور اسے دیکھ کر اس کے
ذہن میں اس قسم کی تشبیہہ پیدا ہوتی ہے ۔۔ "چاند ایک بیوہ کی چُوڑی کی طرح ٹوٹا ہوا" لیکن جب انسانی دل و دماغ سکون و
مسرت کے گہوارے میں جھولتے رہتے ہیں تو اسی ماہِ نو کو دیکھ کر شاعر پکار اُٹھتا ہے ۔۔ "مجھ سے مانگ بھرائی ہے عروسِ شام کی"
اسی طرح جب شاعر کے سامنے پیٹ اور بھوک کا دیو اپنا منہ پھاڑے آن کھڑا ہوتا ہے تو وہ چاند کی رُومان آفریں کرنوں کو بھول جاتا ہے
نگاہِ آتشیں رخ کی تمثیل کو پرے جھٹک کر صرف سورج کی گرمی اور گولائی کو اپنے ذہن میں قائم رکھتا ہے اور بے اختیار کہہ اُٹھتا ہے

روٹیاں گندمی روٹیاں
سرخ سونے کے ترشے ہوئے گول ٹکڑے
چاند کی مانند گول اور سورج کی مانند گرم (سردار جعفری)

یہ صرف ترقی پسندی کے نتیجہ میں نہیں ہے۔ بلکہ اس سے پہلے نظیر اکبر آبادی کہہ چکے ہیں ۔
پوچھا کسی نے یہ کسی کا مل فقیر سے — یہ مہر و ماہ حق نے بنائے ہیں کاہے کے



پولادہ ش کے پا با خدا کو کو خیر دے ہم تو نہ جا سکے نہ سورج ہیں جاتے
ماہا ہیں تو یہ نظر آتی ہیں روشنیاں

انفرادی احساسات بھی تشبیہ اور استعارے کے عمل دخل پر بڑی قدرت رکھتے ہیں۔ مختلف زبانوں کے شاعر اکثر اوقات ایک ہی نقطۂ خیال پر متحد ہو جاتے ہیں۔ زلف کو رات سے اور چہرے کو دن سے تشبیہ دینے کا رواج ہر ملک و ہر قوم کے ادب میں پایا جاتا ہے۔ فارسی کا شاعر کہتا ہے:

"آں سر زلف است و یا گوش کہ روز راست و شب است"

تو انگریزی میں بھی یہی عالمگیر کیفیت نظر آتی ہے جبکہ شاعر کہتا ہے:

Her face like the dawn and hair like the dusk

اور صبح و شام کے اس دلفریب امتزاج کو اردو کے ایک شاعر نے یوں بیان کیا ہے:

زلف تا مانگ عارض کو چھپا دیتی ہے صبح ہو جاتی ہے کبھی اور کبھی شام کے ساتھ

غرض یہ ہے کہ شب و روز اور صبح و شام کی گردش نے ایسی تشبیہ و استعاروں کی تازگی و ندرت میں کمی پیدا کر دی ہے اور ان کی فرسودگی محسوس ہونے لگی ہے برخلاف اس کے غالب محبوب کے جمالِ دلفروز کو "مہر نیمروز" کا نام دے کر ہمارے سامنے ایک نئی صورت حال پیش کرتے ہیں۔ یہاں مہر نگار یا مہرِ دوش کی تمثیل استعمال نہ کر کے انہوں نے اپنی جدتِ طبع کا ایک مزید ثبوت دیا ہے۔ انیسویں صدی کے درمیانی دور میں ہندوستانی تمدنی زندگی کے رجحانات بڑی تیزی سے بدل رہے تھے جس کے سبب نیا مدنی وقت کا تصور اس طرح زندگی کے ہر شعبے پر حاوی ہو رہا تھا کہ غالب بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ان کی زندگی کا یہ رخ اس طرح آشکار ہوتا ہے کہ وہ اپنے محبوب کے لئے ایک نرالی تشبیہ دینے دائرۂ خیال میں لے آتے ہیں اور اس کے حسن میں کئی گنا اضافہ کرتے ہیں۔

غالب کے کلام میں اس طرح کی جدت طرازی جگہ جگہ نظر آتی ہے۔ دراصل ان کی جدت پسندی کی بنیاد ہی پر ان کے فن کی بلند و بالا عمارت قائم ہے۔ اسی جدت پسندی کی بدولت غالب نے ایسی لفظی ترکیبیں اختراع کی ہیں جن کے اندر نہایت وسیع خیال سمویا ہوا ہے اور جو صفحہ دو صفحہ دیگر کئی سطروں میں بھی ادا نہ ہو سکتا۔ اسی فنکاری کی مدد سے غالب نے ایک نئی زبان تیار کی ہے اور خیالات کی ادائیگی کے لئے نئی نئی راہیں نکالی ہیں۔ خیالات کی جدت ہی انہیں جدید تشبیہیں اور استعارے بنانے پر آمادہ کرتی ہے اور ان کی مدد سے حسن کاری، معنی آفرینی اور اختصار کے علاوہ محاکات کی عمدہ مثالیں بھی ان کے کلام میں نظر آتی ہیں۔ بقول شیخ محمد اکرام "مرزا تشبیہات و استعارات کے بادشاہ ہیں، ہماری دنیائی شاعری میں ان کی مثال ملنی مشکل ہے۔" بالفاظ دیگر غالب نے بلاغت کا لطف پیدا کرنے اور اس کو دوبالا کرنے کا کام بھی شاعری کی اسی صنعت سے لیا ہے اور الفاظ کی محدود دنیا میں ایک جہانِ معنی کو آباد کیا ہے۔ شاعر کے دل میں پیدا ہونے والے احساسات کے ہجوم اور اس کے جذبات کے حشر کو اس لفظی صنعت گری کے پردے میں مقید کر لیا ہے۔ غالب کا دوسرا کمال یہ ہے کہ انہوں نے عام اور پامال خیال کو بھی اس حسن ادا سے پیش کیا ہے کہ اس میں ندرت اور تازگی پیدا ہو گئی ہے۔ اور نازک خیالی و معنی آفرینی کا ایسا حسین امتزاج ان کے استعاروں میں نظر آتا ہے کہ جس پر سادگی و پرکاری کا اطلاق پوری طرح ہوتا ہے۔

سیاہی جیسے گر جائے دمِ تحریر کاغذ پر
مری قسمت میں یوں تصویر ہے شب ہائے ہجراں کی

یا پھر حاصلِ الفت کے بارے میں جو تشبیہ استعمال کی ہے اس کا بیان ملاحظہ ہو۔

حاصلِ الفت نہ دیکھا جز شکستِ آرزو دل بہ دل پیوستہ گویا یک لبِ افسوس تھا



کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچے سے بہشت یہی نقشہ ہے ولے اس قدر آباد نہیں

زبان دادب کی ترصیع و تزئین کے سلسلہ میں محاورہ بندی کو بھی اہمیت دی جاتی ہے۔ محاورے کا اصل مقصد وہی ہے جو تشبیہ اور استعاروں کا ہوتا ہے یعنی حسن آفرینی کے ساتھ ساتھ معنی آفرینی اور اختصار۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ ہر محاورہ ایک استعارہ ہے دونوں میں فرق صرف اتنا ہے کہ محاورے کثرتِ استعمال سے روزمرّہ کا ایک جزو بن جاتے ہیں اور عام لفظوں کی حیثیت اختیار کر لینے کے باعث ان کی نُدرت اور دلکشی ختم ہو جاتی ہے۔ غالب سے قبل اور خود ان کے زمانے میں محاورہ بندی بہت زیادہ مقبول تھی کثرتِ استعمال کے لحاظ سے تو ذوق اور داغ کو اس فن میں سبقت حاصل ہے۔ غالب نے اپنے کلام میں محاورہ بندی پر زور نہیں دیا اُن کی انفرادیت بلکہ انانیت نے اس بات سے حیات جاودانی حاصل کرنے کی نہیں سوچی بلکہ اُنھوں نے اس کی مدد سے استعاروں کی ایک نئی دنیا آباد کی تاکہ ان کے نئے نئے خیالات کے اظہار کے لئے نئے نئے پیمانے نئی نئی شکل کے تیار ہو سکیں۔

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا
ہے صاعقہ و شعلہ و سیماب کا عالم آنا ہی سمجھ میں مری آتا نہیں گو آئے
دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا
اہلِ بینش نے بہ حیرت کدۂ شوخیِ ناز جوہرِ آئینہ کو طوطیِ بسمل باندھا

اکثر و بیشتر شاعروں نے شیوہ بارک خیالی اور طرزِ ادا کی نُدرت و لطافت کو دوبالا کرنے کے لئے دو تمثیلی تصویروں یا خیالی پیکروں کو ایک دوسرے کے سامنے لا کھڑا کیا ہے اور اس طرح تشبیہ و استعارے کی تخلیق کر کے سحر کی اثر آفرینی کو بڑھایا ہے لیکن جب "لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ" کو "جنت نگاہ و فردوسِ گوش" بنا کر پیش کیا جائے تو پھر محفل کے "ہر گوشۂ بساط" کے لئے جو رنگا رنگ پھولوں اور غنچوں سے مہک رہا ہے "داماں باغباں و کفِ گلفروش" جیسے برجستہ استعارے غالب ہی کے حسِ ذوق کا نتیجہ ہو سکتے ہیں۔ یہی حُسن ذوق شعلہ رنگ کی مئے ناب طرب و مسرت کے سازوں کو جو انسانی دل و دماغ کو مست و بیخود بنانے کی خاصیت رکھتے ہیں شاعر کی نگاہ میں "شیشۂ مئے سروِ سبزِ جوئے بار نغمہ" بنا کر پیش کرتا ہے اور سرسبزی و شگفتگی کا یہ خوں اُسے لہلہاتے چمن میں لے جاتا ہے۔ جہاں ایک دلکش اور حسین منظر نظروں کے سامنے ہے۔

جو تھا سو موجِ رنگ کے دھوکے میں مر گیا
اے وائے نالۂ لبِ خونیں نوائے گل

اور جب اس قدر دل خوش کن نظارے ہمہ وقت شاعر کی نظروں کے سامنے رقص کناں رہیں تو پھر محبوب کے جور و ستم بھی گوارا ہوتے ہیں عشرتِ قتل گہ کی تمنا اتنی بڑھ جاتی ہے کہ اُس کے لئے "عیدِ نظارہ ہے شمشیر کا عُریاں ہونا" اور پھر وہ اسی پر قناعت نہیں کرتا کہ "آ ہی جائے جاکِ گریباں" بن جائیں یا "آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں" کی شکل اختیار کر لیں بلکہ وہ تنگیِ صحرا کو چشمِ حسود دیکھتا ہے۔ اور اسی لئے کہتا ہے۔

نہ ہو گا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا
حبابِ موجۂ رفتار ہے نقشِ قدم میرا

ذوقِ عشق کی تسلی کی خاطر شاعر کو "تکرارِ دوست" بھی بہت عزیز ہے چنانچہ وہ

صورتِ نقشِ قدم ہوں رفتۂ رفتارِ دوست
دیدہ پُر خوں ہمارا ساغرِ سرشارِ دوست



[illegible] کی تکرار کرتا رہتا ہے۔ حسن و عشق کی [illegible] کے اس سلسلہ کو دیکھ کر عقل اُسے شعور کرتی ہے:

دل مت گنوا، خبر نہ سہی سیر ہی سہی
اے بے دماغ آئینہ تمثال دار ہے

ہو اس آئینہ تمثال دار میں ہم ایسے نقوش بھی دیکھ پاتے ہیں جو قیس و فرہاد عشق و جنوں کے مرقعوں سے مختلف ہیں۔ اس وقت ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ غالب صرف خیالی اور تصوراتی دنیا کے باشندے نہیں ہیں وہ جانتے ہیں کہ

"بزم خیال میکدہ بے خروش ہے"

اور وہ بھی اپنے زمانے کی [illegible] اور [illegible] سے متاثر ہوتے ہیں۔ سیاسی زبوں حالی اور معاشی بدحالی نے اُن کے خیالات، تصورات پر گہرے اثرات مرتسم کئے ہیں۔ اس کے ثبوت میں صرف یہ ایک شعر یا یہ ایک استعارہ پیش کرنا کافی ہوگا

رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے ان الفاظ میں اُن تمام واقعات اور حادثات کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے جو ایک عذاب ناگہانی کی شکل میں دلی اور اہلِ دلی پر نازل ہو رہے تھے۔ سکون و اطمینان کا کہیں پتہ نہ تھا۔ روزی کے ٹھکانے ہاتھوں سے چھینے جا رہے تھے۔ شاہی محلات سے لے کر غریبوں کی جھونپڑیوں تک ابتری و بدحالی کے نشانات پائے جاتے تھے۔ دلی کی زندگی عذاب بن گئی تھی۔ مغلوں کی صورت نہایت کمزور اور ناکارہ ہو گئی تھی۔ کبھی افغان آندھی کی طرح آدھمکتے۔ کبھی مرہٹوں کے حملے ہوتے۔ کبھی جاٹ اور روہیلوں نے چڑھائی کی تو کبھی امراء و رؤسا اور درباروں نے ظلم برپا کئے۔ رہی سہی کسر انگریزوں نے پوری کردی۔ زندگی مثل ایک اُڑتے ہوئے گھوڑے کی سی تھی، گھوڑا بھی کیسا؟ سرکش اور منہ زور" جس کی ضروریات زندگی کثیر تعداد تھیں۔ درست کیا جا رہا ہے نایاب!

زمانے کے حادثات کو شاعر نے "لگد کوبِ حوادث" کے نام سے یاد کیا ہے اور جب اس کی طاقت ان حوادث کی متحمل نہیں ہو سکتی اور وہ اپنے رنج و ملال کو الفاظ کے جامے میں قید کرنا چاہتا ہے تو اس کی تشبیہوں اور استعاروں میں بھی وہی کیفیت دکھائی دیتی ہے۔ وہ اپنی ذات کو دنیاوی کشمکش سے آزاد نہیں پاتا۔ "قیدِ حیات و بندِ غم" کا ایک سمجھنے والا فنکار صرف اپنی ذہنی مسرت میں کھو کر نہیں رہ جاتا کیونکہ اُس کا عقیدہ تو یہ ہے کہ

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

غالب کا کمال یہی ہے کہ وہ انسانی ذہن و فکر کو محشرِ خیال کہہ کر مخاطب کرتے ہیں اور اس طرح انسانی جدوجہد کی تاریخ احساسات و تاثرات کی گوناگوں ہنگامہ آرائیاں اور انسانی مزاج کے تلوّن و اعتدال کی کمی، کیفیات کو ان دو لفظوں کی ترکیب میں سمو دیتے ہیں۔ علم نفسیات کا طالب علم جانتا ہے کہ کس طرح ایک انسان اکیلا ہوتے ہوئے بھی اپنے خیالات کے ہجوم میں گھرا ہوا ہونے کی وجہ سے اپنے آپ کو کسی انجمن یا مجمع سے الگ متصور نہیں کر سکتا۔ ایک اور جگہ غالب نے انسانی دل کو "گزرگاہِ خیال" کہا ہے:

دل گزرگاہِ خیالِ مے و ساغر ہی سہی
گر نفس جادۂ سر منزلِ تقویٰ نہ ہوا

اور:

موجۂ گل سے چراغاں ہے گزرگاہِ خیال
ہے تصور میں ز بس جلوہ نما موجِ شراب

غالب نے دل کو گزرگاہِ خیال کہہ کر نفسیاتِ انسانی اور غور و فکر کے مسلسل دھاروں کا مرکز قرار دیا ہے۔ جس سے غالب کی جدتِ ادا اور ندرتِ خیال کا اندازہ آسانی سے لگایا جا سکتا ہے۔ ہمارے ایک اور بڑے شاعر میر کا ایک شعر ہے:

دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے
یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

دلی کے سیاسی ہنگاموں اور جنگ و جدل، اور دلی کے لٹنے اور برباد ہونے کی روداد کو پس منظر میں رکھ کر اس شعر کا مطالعہ کریں تو اس کی ساری معنویت اور خیال آفرینی اجاگر ہو جاتی ہے۔ اور بے اختیار اس شعر پر داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ دلی کے ان ہی حالات کے

پس منظر کو سامنے رکھ کر غالب کے اس شعر کو دیکھیے

اسد میں ہوں اور ماتمِ یک شہرِ آرزو　　توڑا جو تو نے آئینہ تمثال دار تھا

ماتمِ یک شہرِ آرزو کی تفصیلات اور جزئیات کا مطالعہ کریں تو ہمیں اُردو کے تمام شہر آشوب سامنے رکھنے ہوں گے جن میں مختلف ادوار کے متعدد شاعروں نے ہندوستان کی تاریخ کے ایک المناک باب کی تصویریں پیش کی ہیں۔ غالب نے اس مرکب تشبیہ کو اپنے دل کے سلسلے میں استعمال کیا ہے۔ انسانی فطرت کی سب سے بڑی خوبی کہیے یا کمزوری کہ اس کے دل میں سیکڑوں بلکہ ہزاروں تمنائیں اور آرزوئیں جنم لیتی ہیں۔ غالب نفسیاتِ انسانی کے مختلف پہلوؤں کو شعر میں سمونے میں ماہر ہیں اسی لئے وہ اپنے دل کو یک شہرِ آرزو کہتے ہیں۔ مگر صرف اس پر اکتفا نہیں کیا جا سکتا۔ اُن کا دل تو آئینہ بھی ہے اور آئینہ بھی کیسا؟ تمثال دار۔

توڑا جو تو نے آئینہ تمثال دار تھا

دل مت گنوا، خبر نہ سہی سیر ہی سہی　　اے بے دماغ آئینہ تمثال دار ہے

اُن کا دل تمثال دار ہو سکنے کی وجہ سے اس میں نہ صرف اُن کی شخصیت کی پرچھائیاں دکھائی دیتی ہوں گی بلکہ اُن کے ماحول اور اردگرد کی عکاسیاں بھی نظر آتی ہوں گی۔ یہ عکاسیاں اگر ہمہ وقت راحت فزا ہوتیں تو غالب یوں نہ کہتے

جلوہ زارِ آتشِ دوزخ ہمارا دل سہی　　فتنۂ شورِ قیامت کس کی آب و گل میں ہے
ہے دلِ شوریدۂ غالب طلسمِ پیچ و تاب　　رحم کر اپنی تمنا پر کہ کس مشکل میں ہے

اور اس وقت غالب کی فطرت ہمارے ذہن و فکر کے لئے ایک معمّہ بن جاتی ہے کہ نہ جانے اس شوریدہ دل میں اور اس طلسمِ پیچ و تاب کی سرزمین میں کیسے کیسے تفکرات جنم لیتے ہیں اس جلوہ زارِ آتشِ دوزخ کی تمازت اس ذہن و فکر پر کس طرح چھا کر رہتی ہے۔ ایسے موقعوں پر غالب کے ذہن و فکر کا ایک بلند اور روشن پہلو اُجاگر ہوتا ہے اور اُن کی وسعتِ بیان اور انتخابِ الفاظ ہم سے دادِ تحسین حاصل کرتے ہیں۔ اُن کے اکثر اشعار اپنی نادر تشبیہوں اور استعاروں کی بدولت فلسفہ کے دفتر بن جاتے ہیں۔ اور غالب اپنے عہد کے دوسرے شعراء سے کئی قدم آگے بڑھ آتے ہیں اور اُن کی جدت پسند طبیعت ایک نئے دائرۂ عمل میں گامزن نظر آتی ہے

رہا اک حیرت و وحشت ہیں اجزائے بہار　　سبزہ بیگانہ صبا آوارہ گل نا آشنا
اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب　　لطمۂ موج کم از سیلیٔ اُستاد نہیں
ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام　　مہرِ گردوں ہے چراغِ رہ گزارِ بادِ یاں

غالب کے یہاں چراغ، روشنی، دل کے جلنے اور سوزِ غمِ نہاں کا ذکر بار بار ملتا ہے:

دل مرا سوزِ نہاں سے بے محابا جل گیا　　آتشِ خاموش کی مانند گویا جل گیا
میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالب کہ دل　　دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا جل گیا
دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں　　آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

دل کو آتشِ خاموش، اور ایسا گھر جس میں آگ لگ گئی اور سب کچھ جل کر خاک ہو گیا، کہہ کر غالب ہمارے سامنے ایک ایسا سوالیہ نشان پیش کرتے ہیں جس کا جواب حاصل کرنے کے لئے ہمیں غالب کے عہد کے سیاسی و معاشی انتشار کے ساتھ ساتھ غالب کی اپنی زندگی کے نشیب و فراز، اُن کی ذاتی محرومیوں، معاشی تنگی اور ہمعصرانہ چشمکوں کو دیکھنا بھی ضروری ہے۔ شاعر کے حساس دل پر محبوب کے [illegible] سلوک اور جور و ستم کے ہاتھوں جو آگ جل اٹھی ہے وہ اُس کی عشقیہ داستان کی غمازی تو کرتی ہے مگر ساتھ ہی یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ایک آگ کیسی بھی ہے جو کسی اور کے ہاتھوں لگائی گئی ہے اور جس نے ذوقِ وصل اور یادِ یار تک کو جلا کر خاک کر دیا۔



تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں
تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

یہ آدمی کا ہی ظرف ہے کہ وہ اسے اوپر چھا جانے والی مصیبتوں کا ذکر کس انداز میں کرتا ہے۔ سوزِ نہاں سے دل کا جل کر خاک ہو جانا بھی غالب کی نگاہ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے اور وہ ان داغوں کو چراغاں کہہ کر پکارتے ہیں۔

دل نہیں تجھ کو دکھاتا ورنہ داغوں کی بہار
اس چراغاں کا کروں کیا، کارفرما جل گیا

دکھاؤں گا تماشا دی اگر فرصت زمانے نے
مرا ہر داغِ دل اک تخم ہے سروِ چراغاں کا

ایک چھوٹا سا دل جو ساری حرکات و کیفیات اور احساسات کا کارفرما ہے۔ شدّتِ غم نے اس پر داغ ڈال دیئے ہیں اور شاعر ان داغوں کو چراغاں کی حیثیت عطا کرتا ہے۔ دوسرے شعر میں اس کا دل ایک سرو ہے اور سرو بھی کیسا؟ جو چراغاں کی وجہ سے منوّر ہے۔ دل پر پڑے ہوئے داغ گویا اس سروِ چراغاں کے تخم ہیں۔ اپنے دل اور دل کے داغوں کا ذکر غالب کو محبوب ہے اور وہ ان کا بیان بہت محو ہو ہو کے کرتے ہیں۔

لوگوں کو ہے خورشیدِ جہاں تاب کا دھوکا
ہر روز دکھاتا ہوں میں اک داغِ نہاں اور

ہے تنگ سینۂ دل اگر آتش کدہ نہ ہو
ہے عارِ دل، نفس اگر آذر فشاں نہ ہو

آتش کدہ ہے سینہ مرا رازِ نہاں سے
اے وائے اگر معرضِ اظہار میں آوے

ہاتھ دھو دل سے یہی گرمی گر اندیشے میں ہے
آبگینہ تندیِ صہبا سے پگھلا جائے ہے

آتش، دوزخ میں یہ گرمی کہاں
سوزِ غم ہائے نہانی اور ہے

میرا خیال ہے کہ غالب کے مزاج کی گوناگوں کیفیات اور اُن کا نفسیاتی تجزیہ کرنے کے سلسلہ میں اس قسم کے اشعار ہماری رہنمائی کریں گے جن میں وہ اپنے سوزِ غم نہاں اور داغہائے دل کا بار بار ذکر کرتے ہیں اور اپنے دل کے لئے آتشکدہ اور دوزخ جیسے استعارے استعمال کرتے ہیں۔ ایسے چند اشعار کا ذکر ناگزیر ہوگا جن میں غالب نے "دل" کو موضوع بنایا ہے۔ دل، جو انسان کے زندہ و متحرک ہونے کا سبب ہے اور حساس بھی!

کاوش کا دل کرے ہے تقاضا کہ ہے ہنوز
ناخن پہ قرض اُس گرہِ نیم باز کا

ناگہاں اس رنگ سے خوں نابہ ٹپکانے لگا
دل کہ ذوقِ کاوشِ ناخن سے لذّت یاب تھا

درماندگی میں غالب! کچھ بن پڑے تو جانوں
جب رشتہ بے گرہ تھا، ناخن گرہ کشا تھا

جب کہ جہاں ناخن اور ذوقِ کاوش کا ذکر بھی بار بار ملتا ہے۔ بتائیے اُن کے دل میں وہ کون سی گرہ پڑ گئی تھی جس کو سلجھانے



کے لئے ماحول کی ضرورت اس نے ہمیشہ محسوس کی۔

غالب نے اپنے دل کو دیوان قرار دیا ہے اور اس کے نے تیرازہ بندی کی وجہ سے اوراق لخت دل منتشر ہو گئے کیو وہ محبوب کے خرام ناز کی وجہ سے اپنے دل کو محشرستان بیقراری ٹھہراتا ہے

نالۂ دل نے دئے اوراق لخت دل بہ باد
یادگار نالہ اک دیوان بے شیرازہ تھا

دل ہوا ہے خرام ناز سے پھر
محشرستان بے قراری ہے

کبھی تو غالب یہ کہتے ہیں کہ

جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہو گا
کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے

اور کبھی یہ بھی:

شرح اسباب گرفتاری خاطر مت پوچھ
اس قدر تنگ ہوا دل کہ میں زنداں سمجھا

ہوں اگر پرتو نقش خیال یار باقی ہے
دل افسردہ گویا حجرہ ہے یوسف کے زنداں کا

ہم بھی غالب کی طرح اسباب گرفتاری خاطر کی شرح کرنا نہیں چاہتے، اس وقت تو غالب کے اس استعارے سے بحث ہے کہ دل کی تنگی نے اسے زنداں بنا کر رکھ دیا ہے۔ اور دل کے زنداں میں جب نقش خیال یار کی دھندلی سی شبیہ موجود ہو تو پھر یوسف کے زنداں کے حجرے سے زیادہ مناسب در حقیقت تلمیح اور تشبیہ اور کونسی ہو سکتی ہے۔

بہرحال شعروں کے انتخاب سے غالب کی رسوائی مجھے منظور نہیں اگر حقیقتوں سے چشم پوشی بھی تو ناممکن ہے ان کی آشفتہ سرایگی اور شوریدہ سری کا اندازہ کیجئے۔

میں اور اک آفت کا ٹکڑا وہ دل وحشی کہ ہے
عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا

میر کے شعر کا احوال کہوں کیا غالب
جس کا دیوان کم از گلشن کشمیر نہیں

یہاں میر تقی میر کے دیوان کو گلشن کشمیر کہہ کر شاعر نے حق وطن ادا کر دیا ہے ہندوستانی رنگ و مزاج کی اگر تلاش ہو تو دیوان غالب میں تصوی آم، در مدح حکیم ذکی، کلکتہ کا ذکر اور روغنی روٹی کا بیان بھی دستیاب ہوتا ہے۔ وہ کبھی "سیم کے دانوں" کو "پیر دو رہ کی تسبیح کے دانے" قرار دیتے ہیں۔ اور کبھی ماہ صفر کے آخری چہار شنبہ کے سلسلے میں یوں کہتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

چھلے کہتے ہیں سیم ورزر دمہر و ماہ ماند
ننتے ہیں سونے روپے کے چھلے حضور میں،
یوں سمجھئے کہ بیچ سے خالی لئے ہوئے
لاکھوں ہی آفتاب ہیں اور بے شمار چاند

سہرا لکھتے وقت بھی غالب نے اسعار گلشن ان اختیار کیا ہے ارچ وہ لہایہ گرمی کی وجہ سے جو پسینہ ٹپک رہا ہے اسے رگ ابر گہربار کے نام سے یاد کرتے ہیں اور تار ریشم کو رگ ابر بہار کا نام دیتے ہیں۔ اسی طرح آموں کی تعریف میں شعر کہتے وقت ایک جگہ وہ آم کے



موتیوں کو شیرے کے تارے تشبیہ دیتے ہیں اور دوسری جگہ آم کو انگبیں کے سربمہر گلاس قرار دیتے ہیں، جنھیں رب الناس نے باغ جنت سے بھیجا ہے۔ "در مدح چکنی" غالب کی شاہکار نظم ہے جس میں تغزل کی ساری عنائیاں موجود ہیں۔ اور استعاروں کی گلکاری وسعت گری سے شاعر نے اس میں ایک بڑی حسین و جمیل فضا پیدا کر دی ہے۔ کف دست کو محل اور اس پر رکھی ہوئی چکنی سپاری کو وہ سویدا کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور اس چکنی ڈلی کے لئے مہر مکتوب عزیزان گرامی، مستی آلودہ سر انگشت حسینان، موسمے میں مہر منار، نقطۂ پرکار تمنا اور دمع میں قاب تریاق و رنگ میں سرۂ نوحیہ مسیحا جیسے استعاروں کے استعمال سے رمز و ایما کی نہایت دلفریب تصویریں پیش کرتے ہیں۔ ایسی مثالوں سے یہ حقیقت ثابت ہوتی ہے کہ واقعی استعارہ معنی آفرینی اور جدت ادا کا ایک زبردست وسیلہ ہے جسے رنگ تغزل دے کر شاعر ایک معمولی سی بات کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتا ہے۔

مندرجہ بالا تشبیہیں اور استعارے ان کے کلام میں سے "مشتے نمونہ از خروارے" کے طور پر پیش کی گئی ہیں۔ ورنہ حقیقت تو یہ کہ "سرتاپا کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست"۔ ایک طرف تو انھوں نے عام اور مستعمل الفاظ کو نئے رنگ اور نئے معنی پہنائے ہیں۔ دوسری طرف فارسی کے الفاظ و مرکبات کو بطور خاص استعمال کیا ہے۔ حق تو یہ ہے کہ اس لفظی صنعت گری کی کامیاب پیش کش کے لئے شاعر داد و تحسین کا مستحق ہے۔ یہاں علم بیان کا یہ اصول یاد رکھنا ضروری ہے کہ فنکار کا خیال جس قدر لطیف اور دقیق ہوگا۔ اور واردات جس قدر پیچیدہ یا بعید ہوگی اسی مناسبت سے فنکار تشبیہہ اور استعارے سے مدد لے گا۔ چنانچہ یہ جلیل القدر شاعر جن جذبات کے ابلاغ و اظہار کی کوشش کرتے ہیں وہ اکثر و بیشتر مرکب ہوتے ہیں اور جن کیفیات سے وہ متاثر ہوتے ہیں۔ وہ صرف پیچیدہ اور دقیق ہی نہیں ہوتیں بلکہ مرکب بھی ہوتی ہیں" چونکہ تشبیہہ اور استعارے کا منصب ایسی ہی اعلیٰ کیفیات اور واردات کی ترجمانی ہے اس لئے تشبیہہ اور استعارے مفرد ہونے کے ساتھ ساتھ مرکب بھی ہوتے ہیں۔ غالب کی بصیرت اس حقیقت سے آشنا ہے اور اسی لئے وہ مفرد و مرکب، پیچیدہ اور دقیق تشبیہہ اور استعاروں کو اپنے کلام کا ایک جزو لاینفک بناتے ہیں۔ اور اس کی توجیہہ بھی اس طرح کرتے ہیں۔

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر
مطلب ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام
چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بادۂ و ساغر و دشنہ و خنجر کے علاوہ گل و بلبل، ساغر اور مینا کی اصطلاحات سے ہمارے شاعروں نے نئے نئے معنی اور نئی نئی دنیائیں آباد کی ہیں اور انھیں علامات SIMBOL کے طور پر استعمال کیا ہے۔ غالب ایسی علامات کی اثر آفرینی سے واقف ہیں۔ وہ اپنے مخاطب کو مرعوب کرنے کے گر بھی جانتے ہیں اسی لئے وہ تشبیہہ اور استعارے تمثیل اور کنائے کا استعمال نہایت فراخدلی سے کرتے ہیں اور اس فنکاری کے لئے انھوں نے فارسی زبان و ادب سے فیض اٹھانے کی پوری پوری کوشش کی ہے۔ اور اردو زبان کے جالی دامن کو فارسی کے گلہائے رنگا رنگ سے بھر دیا ہے اُن کے یہاں پورے پورے مصرعے بھی بطور تشبیہہ یا استعارے کے موجود ہیں۔ اُس مشہور قصیدے میں جس کی ردیف "کھلا" ہے غالب نے اپنے اس فن کا مسلسل مظاہرہ کیا ہے۔ گنجینۂ گوہر، نگار آتشیں رُخ، بادۂ گلرنگ کا ساغر، جام زر، رات جانا آذر اور طلۂ عنبریں جیسی ترکیبیں اختراع کر کے غالب نے واقعی "باغ معنی کی بہار" دکھائی ہے۔

غالب نے اپنے خطوط میں بارہا اس بات کو دہرایا ہے کہ شاعری معنی آفرینی ہے قافیہ پیمائی نہیں۔ ان کے نزدیک اپنی شخصیت کے منفرد پہلو، اپنے مخصوص تاثرات اور اپنے مزاج کی گوناگوں کیفیات کے بیان کا نام شاعری ہے۔ غالب کی انفرادیت کی اس مخصوص



آواز کو جب کوئی سمجھ نہیں سکتا تو اسے لایعنی قرار دیتا ہے، جس کے جواب میں غالب نے یوں کہا:

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

غالب نے اپنے زمانے کے مروجہ اصنافِ سخن میں کوئی اضافہ نہیں کیا۔ نہ ہی ہیئت کے لحاظ سے اُن میں کوئی تبدیلی کی۔ غالب کی عظمت یہ ہے کہ انھوں نے ان اصناف میں اپنی جدتِ طبع سے کام لیا ہے۔ غزلیں لکھیں اور مسلسل غزلیں بھی لکھیں جو اس حقیقت کا ثبوت ہے کہ شاعر کے دل میں احساسات و جذبات کا ایک امڈتا ہوا طوفان ہے۔ یہ اُن کی قادر الکلامی کی دلیل ہے کہ وہ اپنے مربوط و مسلسل افکار کو قافیہ و ردیف کے تنگ و محدود دائرے میں سمو لے۔ غالب سے قبل صنفِ مرثیہ شہدائے کربلا کے غم و مصائب کے ذکر کے لئے مخصوص تھا۔ غالب نے مرثیہ نگاری کے ذریعہ اہلبیت سے اظہارِ عقیدت تو نہیں کیا لیکن منقبت اور دیگر چند اشعار کے ذریعہ اُس حقِ عقیدت کو ادا کر دیا ہے اور اسے شخصی اور ذاتی موضوع دے کر اُردو ادب کے لئے ایک نیا باب کھول دیا ہے۔ اس کے علاوہ قطعات اور رباعیات، مثنوی "در صفتِ انبہ" اور "ایں و آں" میں بھی اپنی انفرادیت قائم رکھی ہے۔
مختصر یہ کہ ان تمام اصنافِ سخن کو جنھیں انھوں نے برتا ہے، ایک نئی فضا دی، ایک نئی دنیا اور ایک نیا رنگ دیا، جس کا تعلق معنی کی نت نئی بوقلمونی سے ہے اور اس مقصد کے لئے الفاظ کا حسنِ انتخاب کیا تو کہیں اسے استعارہ بنا کر پیش کیا اور کہیں تشبیہ! انہی تشبیہوں اور استعاروں کے ذریعہ غالب نے قطرے میں دجلہ اور جُز میں کُل کے منظر پیش کئے ہیں۔ غالب کی یہ خود ساختہ فنکاری اپنے اندر جدت، عظمت اور بلندی کے ساتھ ساتھ زبردست تخلیقی قوت اور ایک وسیع و رنگا رنگ کائنات پوشیدہ رکھتی ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ایسی فنکاری میں جان اُسی وقت آتی ہے جبکہ خود شاعر کا تخیل جاندار ہو۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ غالب اس سلسلہ میں سب سے زیادہ تیز اور ذکی الحس ہے، بلند فکر کا مالک بھی ہے جس کا خود غالب کو بھی احساس تھا۔

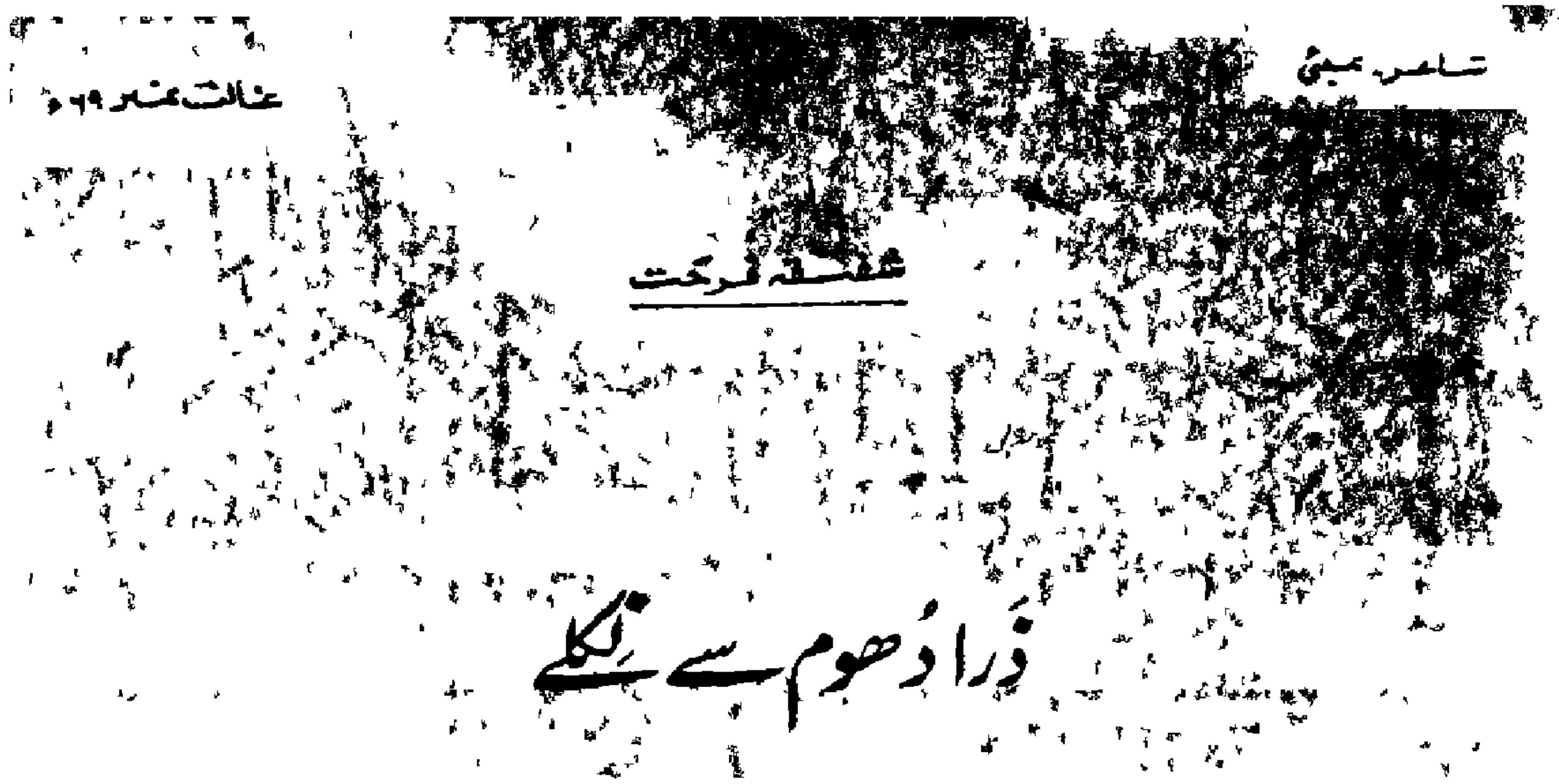
فکر میری گہر اندوزِ اشاراتِ کثیر
کلک میری رقم آموزِ عباراتِ قلیل
میرے ابہام پہ ہوتی ہے تصدق توضیح
میرے اجمال سے کرتی ہے تراوش تفصیل

قصیدے کے ان اشعار کا تعلّی غالب کے جوشِ فکر کی دلیل ہے۔ اس تعلّی کی روشنی میں دیکھیں تو اس کے کلام کا بیشتر حصّہ رمز و کنایہ، تشبیہ و استعارے سے رچا ہوا نظر آتا ہے۔ اس کی بزمِ خیال میں رنگا رنگی ہے، وہ جو لفظ بھی استعمال کرتا ہے اُس کی حقیقت سے کوئی آشنا نظر آتا ہے۔ اور اپنے ابہام و اجمال سے اپنے کلام میں ایسا فنکارانہ رنگ بھرتا ہے جو اپنی جگہ بے مثال ہے۔ مسعود ہے۔

سعید یا سعیدہ

میری جان نئے مہمان کا قدم تم پر مبارک ہو۔ اللہ تعالیٰ تمھاری اور اُس کی اور اُس کے بھائیوں کی عمر میں برکت دے۔ تمہاری طرزِ تحریر سے صاف نہیں معلوم ہوا کہ سعید ہے یا سعیدہ ہے۔ ثاقب اس کو عزیز اور غالب عزیز جانتا ہے۔ واضح لکھو کہ احتمال رفع ہو۔

—— غالب ——



شفیقہ فرحت

ذرا دھوم سے نکلے

اب تک یہی سنتے چلے آئے ہیں کہ "شامتِ اعمالِ ما صورتِ غالب گرفت" وہ بزم ہو یا تنہائی۔ کلاس روم ہو یا امتحان کا پرچہ یا کوئی اشتہاری بورڈ۔ غالب نے ہر ایک کو بے ہوش سا رکھا تھا۔ ایک سے ایک نامور ادبی پہلوان میدان میں آئے۔ اور غالب کے ایک شعر نے وہ چوکھی لگائی کہ چاروں خانے چت۔ "اڑھائی تین درجن شرحوں کو اوڑھنا بچھونا بنائیے۔ دامِ شنیدن کے ساتھ لاکھ دامِ فہمیدن و سمجھیدن بچھائیے۔ نتیجہ وہی خیال تھا سمجھا ہیں کہ چاروں طرف پر پھڑپھڑا کر منڈلا رہے ہیں۔ ..."

اور اب تھا ری عمر کم زمانے نے کروٹ کوئی تو اس کے پیچھے چچا غالب دیکھیں اب دادا کے عہدے پر پرموٹ کر دیا جائے پیچھا سے پڑے آپ کیا بھر رہے ہیں۔ اور ان کے مارے ہوئے ستائے ہوئے لوگ چیونٹیوں کی طرح بلوں سے نکل نکل کر بدلے لے رہے ہیں۔

ایک جشن کی صورت میں !! کیوں نہ ہو

"غالب کا نعرہ ہے ذرا دھوم سے نکلے"

وہاں عالم آب و گِل وہی ہند جہاں سے آپ جو اہلِ عوام کی ناقدری کے ہاتھوں بظاہر گردن اکڑائے مگر در پردہ روتے دھوتے رخصت ہوئے تھے آج وہیں ہندِ زبان ہندی آپ کی صد سالہ برسی کا جشن منا رہا ہے۔ بالکل اسی زور و شور سے جیسا کہ آپ کے زمانے میں شہر دلّی میں حضور بادشاہ کا جشنِ تاج پوشی منایا جاتا تھا ــــ"

آپ کے اشعار کے قتل کے بعد اب زمانے نے آپ پر جائے تو کر لی ہے۔ (کاش غالب کسی روزنِ زندانِ باغِ ارم سے جھانک کر اس رو دو چشیاں کے پیتیاں ہونے کا حاضر منظر دیکھ رہے ہوں ــ) تب تو انھیں چاہیے کہ اپنے کسی اسٹینڈرڈ دیوان سے ایسے تمام اشعار چپکے سے نکلوا لیں جن میں انھوں نے زمانے کی کج فہمی کی شکایت کی ہے۔ کیونکہ اب ہمشیرہ لتا منگیشکر اور برادرم طلعت محمود کے صدقے آپ کی غزل کا ایک ایک شعر نہ صرف ملک کے بچے بچے کی زبان پر ہے بلکہ اسے OVER SEAS بھی جانے کا شرف حاصل ہوا ہے۔

بہرحال ملاحظہ فرمائیے۔ عقیدت کے کیسے کیسے تیر ہیں جو اس مبارک موقع پر برسائے جا رہے ہیں ــ
چپے چپے پر بازار کا عدہ کے سرو قد پوسٹر یوں برکت سے چپکے ہیں کہ ہاتھ لگائے نہ بنے ــ
اور اس کی عبارت ــ

کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو "بتائے" نہ بنے !



غالب کی خواہش ایک ڈومنی تھی اس لئے ان تین دنوں میں سے کسی ایک دن شہر کی تمام ڈومنیوں کی خدمت میں ایک سپاسنامہ پیش کیا جائے۔ ان کے اعزاز میں دعوت ہو اور آخر میں اُن سے غالب کی غزلیں گانے کی فرمائش کی جائے۔

(۵) غالب کا مزار صرف ایک ہے اور ان کے پرستار ہر شہر میں۔ ان عقیدتمندوں کے جذبات اور ان کی سہولت کی خاطر ہر شہر میں ایک ایک مزار بنا دیا جائے جس میں دیوان غالب اور اس کی شرح کا کم سے کم ایک نسخہ دفن ہو ___ ۔

(۶) اُن کے اشعار کے پیچھے جو حالات چھپے ہیں اُن پر ریسرچ کی جائے اور ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں دی جائیں۔ مثال کے طور پر

"کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد"

اس شعر کے سلسلہ میں پوری چھان بین کی جائے کہ غالب کے مرنے کے بعد "سیلاب بلا" یعنی اُن کی محبوبہ نے کس سے عشق کیا ___۔

(۷) آم غالب کو بے حد پسند تھے اس لئے آموں کا ایک باغ "غالب باغ" کے نام سے لگوایا جائے۔ اور کسی آموں کی کسی خاص قسم کا نام "غالب آم" رکھ دیا جائے اور آموں کے موسم میں عقیدتمند باغ میں جائیں اور جشن آم منائیں

مگر ___ ایک شرط یہ ہے کہ آم کو پھل دینے تک۔ اور ظاہر ہے کہ "کون جیتا ہے اس پیڑ کے بڑھنے تک"۔ تو ایسی صورت میں اس تجویز پر فوری عمل یوں ہو سکتا ہے کہ آموں کے کسی ٹھیلے والے کے "ذوقِ ادبی" اور "شوقِ غالبی" کو بیدار کر کے اس سے درخواست کی جائے کہ وہ اپنے ٹھیلے کا نام "غالب آم اسٹال" رکھ لے (اس کے نتیجہ میں آمدنی میں جو اضافہ ہو اس میں نصف نصف کا شریک کر لینا بھی ٹھیک رہے گا)

مگر مناسب تو یہ ہوگا کہ غالبی (غالب سے عقیدت رکھنے والے حضرات و خواتین) خود ہی ایک ٹھیلہ خرید کر (یا کرائے پر لے کر ___ آموں کا بزنس شروع کر دیں۔ اس سے کوئی ایک نتیجہ ہو یا نہ ہو دو نتیجے کا ضرور برآمد ہو جائیں گے۔ یعنی آم کے آم۔ نام کے نام۔ دام کے دام!!

شراب سے بھی غالب کو عشق رہا ہے لہٰذا اس جذبۂ صادق کی قدر کرتے ہوئے کسی شراب کو ان کے نام سے منسوب کیا جائے اور چونکہ وہ خود ہی فرما چکے ہیں کہ "اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیئے" اس لئے ایک بار جس میں دن رات شراب ملا کرے کھول کر اُسے "میخانۂ غالب" کا نام دیا جائے۔ ہماری عظیم الشان قومی مفلسی کے باعث اگر اعلیٰ درجہ کا بار یا اعلیٰ درجے کی شراب ممکن نہ ہو تو "غالب مارکہ ٹھرا" اور "غالب بار" جیسا بھی کام دے جائے گا۔ غالب جیل گئے تھے لہٰذا کسی ایک جیل خانہ یا اس کی ایک کوٹھری کا نام "زندانِ غالب" رکھ دیا جائے اور ہندوستان کی تمام جیلوں میں دو دو چار چار قیدی داخل کر کے یوم غالب منایا جائے۔

غالب گھومنے پھرنے اور آوارہ گردی و صحرانوردی کے اس حد تک دلدادہ تھے کہ اسی حسرت میں مرنے کے بعد بھی کفن کے اندر پیر چلتے رہے۔ اس حسرت کو پورا کرنے کے لئے غالب کے صحت مند و توانا پرستار سال بھر تک (کہ جشن سال بھر تک منایا جائے گا ___) روزانہ آدھی رات کے بعد دس کلومیٹر کی پد یاترا کریں۔ وہ نہ صرف گھومنے کے شوقین تھے بلکہ ایسی راہوں کو پسند کرتے تھے جو پرخار ہوں اور جو آخری منزل بھی نہ ہوں لہٰذا کسی گلی۔ اصولوں میں اُلٹی، اُوبڑ کھابڑ نکیلے پتھروں سے بھری سڑک کا نام "غالب روڈ" یا کوئے غالب رکھ دیا جائے اور اس راستہ کے دونوں طرف ببول اور دوسرے کانٹے دار درخت کثرت سے لگائے جائیں۔ تاکہ ان کے کانٹے سڑک پر بکھرے رہیں اور غالب کا چاہنے والا انہیں دیکھ دیکھ کے خوش ہوتا رہے

کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا مرے آگے

ان اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب اکثر صحرا کی طرف نکل جایا کرتے تھے لہٰذا راجستھان کے ریگستان کو "صحرائے غالب" کا نام دیا جا سکتا ہے۔ رونے دھونے سے غالب کو خاص شغف رہا ہے کبھی ان کے آنسوؤں سے گھر تباہ ہو گیا۔ ڈوبے گیا کبھی آنسوؤں کے سیلاب میں تکیہ کی روئی اور آسمان بھی ان کے تیرتے رہے۔ آنسوؤں نے اس والہانہ عشق کی صورت میں کسی واٹر ورکس۔ سیلاب یا دریا کو بھی غالب سے وابستہ کیا جا سکتا ہے۔

ایسے وقتی کام تو ان گنت ہو سکتے ہیں لیکن جو سب سے اہم کام ہوگا وہ یہ کہ غالب کے اشعار نصاب سے ہٹا دئے جائیں۔ کیونکہ ان کا سمجھانا بھی مشکل اور سمجھانا بھی اور غالب نے اپنی زندگی میں کبھی کسی کو تکلیف نہیں پہنچائی اب مسلسل ہزاروں لاکھوں ننھے منّوں کو یوں عالم کرب و سکرات میں مبتلا دیکھ کر اور اپنے کلام کی شہادت کو محسوس کر کے وہ تڑپ تڑپ جاتے ہیں لہٰذا انہیں برسوں کی اس تڑپ سے نجات دلوائیے!

زرینہ ثانی

غالب کی شخصیت

غالب کی شاعرانہ عظمت سے کوئی کٹر سے کٹر نقاد بھی انکار نہیں کر سکتا۔ اُردو شاعری کو جو گراں بہا سرمایہ اُنھوں نے عطا کیا ہے، اُس کے احسان سے اُردو کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی۔ جدّتِ ادا و نُدرتِ بیاں، تخیّل کی بلندی و گلکاری، دلکشی و رعنائی، تشبیہات و استعارات کا تنوّع، احساسات کی دھیمی اور تیز آنچ، جذبات کا اتار چڑھاؤ، غرضکہ سب کچھ اُن کی غزلوں میں سمویا ہوا ملتا ہے اور یہی وہ سرمایہ ہے جس نے انھیں عظیم شاعر بنایا ـــــ اسی سرمائے کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے ہمارے ذہن نے غالب کی شخصیت کا بے حد دلکش اور حسین بت تراشا ہے ـــــ مگر جب اِس شاہکارانہ تصوّر میں ذرا بھی ٹھیس لگتی ہے تو ہم تلملا اُٹھتے ہیں۔ حقیقتاً انسانی نفسیات کچھ ایسی ہے کہ جب ذہن کسی بات پر مکمل اعتماد کر لیتا ہے تو مستحکم دلائل کے بغیر اسے متزلزل کرنا آسان نہیں ہوتا۔ لیکن جب ہم کلامِ غالب اور ان کی دیگر تخلیقات کا غیر جانبدارانہ اور غائر نظر سے مطالعہ کرتے ہیں تو غالب کی شخصیت کی وہ شاہکارانہ تصویر جو ہمارے ناقدین نے ہمارے ذہنوں پر اتار رکھی ہے کسی حد تک اپنی دلکشی و رعنائی کھو دیتی ہے اور پتہ چلتا ہے کہ اس انسانی پیکر میں جہاں بہت سی خوبیاں تھیں، وہاں کچھ خامیاں بھی تھیں۔

ادب کے کچھ اصول ہوتے ہیں۔ ادب اپنے ماحول کا آئینہ دار ہوتا ہے، ادب میں فنکار کی شخصیت کی جھلک بھی ملتی ہے۔ لیکن غالب اس اصول سے بالکل اس طرح مستثنیٰ نظر آتے ہیں جس طرح دوسرے اصولوں کے مستثنیات EXCEPTIONS ہوتے ہیں ـــــ اُن کا کلام اُن کی شخصیت کی صحیح آئینہ داری نہیں کرتا، ہاں اُن کے شاعرانہ مرتبہ کا دیانت داری سے تعیّن ضرور کرتا ہے ـــــ اگر ہم غور و خوض سے کام لیں تو غالب کی تخلیقات ہی سے ایسے عناصر منتخب کئے جا سکتے ہیں جو اُن کی شخصیت کے تضاد کو ظاہر کرتے ہیں۔ غالب کی شخصیت کا یہ تضاد اُس وقت اور بھی واضح ہو جاتا ہے جب اُن کے شاعرانہ کلام کے علاوہ اُن کے خطوط وغیرہ کا بھی مطالعہ کیا جائے۔

اس سلسلے میں پہلے غالب کے کلام کے اُن اہم امر کو پیشِ نظر رکھیں جو رجائی اور قنوطی، دونوں رجحانات کے مظہر ہیں۔ اس کے بعد ہمیں فیصلہ کرنے میں آسانی ہوگی۔ مثلاً غالب کبھی مایوس ہوتے ہیں تو یہ عالم ہوتا ہے ؎

دل ہوا کشمکشِ چارۂ زحمت میں تمام — مٹ گیا گھسنے میں اس عقدہ کا وا ہونا
کاو کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ — صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا
میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالب کہ دل — دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا جل گیا
جسے نصیب ہو روزِ سیاہ میرا سا — وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیوں کر ہو



توڑ بیٹھے جب کہ ہم جام و سبو پھر ہم کو کیا — آسماں سے بادۂ گلفام گر برسا کرے
جب توقع ہی اٹھ گئی غالبؔ — کیا کسی کا گلہ کرے کوئی

اسی طرح آہ بے اثر اور نالۂ نارسا پایا، سوز نہاں سے دل کا آتش خاموش کے مانند جلنا، دل سے ذوق وصل اور یادِ یار کا ختم ہو جانا جیسے کی امید نہ رکھنا، کسی امید کا بر نہ آنا، نا امیدی کی وجہ سے دامانِ خیالِ یار کا چھوٹا جانا، ان کے قنوطی رجحان کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ان کے یہاں اس رجحان کی وجہ ان کے ماحول کی انتشاری اور اضطراری کیفیت ہے۔ بلکہ صحیح تحریر کیا جائے تو یہ قنوطیت ان کی سطحِ لذت پرست کی دین نظر آتی ہے ۔۔۔ وہ زندگی کی مسرتوں کا آخری قطرہ تک نچوڑ لینے کے خواہش مند تھے۔ مسرتوں سے ہمکنار ہونے کی شدید تمنا ان کی فطرت میں رچ بس گئی تھی اور اس شدتِ احساس میں جب وہ ناکام ہوتے تو تلخی ہی تلخی محسوس کرنے لگتے اور اسی تلخاب کو پیتے پیتے ان پر قنوطیت چھا جاتی۔ لیکن ان کی شاعری کا عظم کو نشاط میں تبدیل کر لینے والا رجحان ان کی رجائیت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس کا دامن امیدی کی کرنوں سے جگمگانے لگتا ہے۔ اس کے بعد وہ خود میں اتنی تاب پاتے ہیں کہ ستم کے لئے مِسل مسل مزید کی تمنا کرنے لگتے ہیں اور ان کا دل راہ کو پُرخار دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔

اسی طرح وہ رنج کے خوگر ہو کر نہ صرف مشکلات کو آسان سمجھتے ہیں بلکہ حریصِ لذتِ آزار بھی ہو جاتے ہیں اور انھیں جفاؤں میں اس قدر لطف ملتا ہے کہ وہ سوچتے ہیں کہ محبوب مہرباں نہ ہو جائے۔ زخم تمنا کا اچھے یار کو دل سے لئے عشرت، اور عرقِ نمکداں ہو جانے کے ریش کے لئے لذتِ خیال سمجھنے لگتے ہیں اور سچ پوچھئے تو یہ رجائی کرنیں ہی ہیں جو انھیں اصل نظام کرتی ہیں۔ اس لئے کہ غموں کو مسخر کرنا آگیا ہے۔ انسان میں غم و اندوہ کا ضبط و دیا پائی اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب اُسے امید ہو اور رجائی عناصر سے اُس کا دل منور ہو ۔۔۔ غالبؔ میں امیدوں نے ضبط و دیارائی پیدا کی اور اسی ضبط و پارائی کی وجہ سے وہ خود کو برتر و افضل جانتے ہیں۔ پھر یہ رجحان اتنا شدید ہو جاتا ہے کہ زندگی کے باوجود اپنے آپ کو اس قدر آزاد و خود بین سمجھتے ہیں کہ در کعبہ وا نہ ہو تو واپس آنے کو تیار ہیں۔ یہ خود پرستی کا رجحان ہی ہے جو انھیں محبوب کے سجدہ نہ کرنے پر بھی راضی رکھتا ہے۔ اس لئے کہ "گوش منت کشِ گلبانگِ تسلی نہ ہوا" کبھی ناتوانی کا شکر اس لئے کرتے ہیں کہ اس ناتوانی کی وجہ سے حریفِ دمِ عیسیٰ نہ ہوئے۔ یہ خود پرستی صرف ان کی شعر و شاعری تک محدود نہیں بلکہ اصول لے ایسے معاصر پر کیا اساتذہ پر بھی نکتہ چینیاں کی ہیں اور دوسروں کی فضیلت و عظمت سے انکار کرتے رہے۔ اس سلسلے میں قتیلؔ اور غالبؔ کے طرفین میں جو معرکے ہوئے، قتیلؔ کے لئے اُن کے دل میں نفرت و حسد کا جو جذبہ تھا تو وہ اُن کے خطوط سے ظاہر ہوتا ہے جیسا اقتباسات ملاحظہ کیجئے۔

چودھری عبدالغفور کے نام "علائی کے واسطے اصل الاصول مناسبتِ طبیعت کے بعد تتبعِ کلام اہلِ زبان ہے لیکن نہ اشعار قتیلؔ و واقفؔ و شعرائے ہندوستاں کے اشعار سوائے اس کے کہ اُن کو موزونیِ طبع کا نتیجہ کہیے اور کسی تعریف کے شایاں نہیں۔ نہ ترکیب فارسی، نہ معنی نازک، ان الفاظ و سودہ جو خیال و دلستاں جانتے ہیں اور مہتدی نظر میں مندرج کرتے ہیں۔ وہ الفاظ فارسی یہ لوگ نظم میں خرچ کرتے ہیں۔"

"جب آپ لالہ قتیلؔ کے گڑھے ہوئے فقرے دیکھ چکے ہیں تو مجھ کو فقرہ تلاشی کی کیوں تکلیف دیتے ہیں"

صاحب عالم کو ایک خط کے آخر میں لکھتے ہیں: "آپ بیٹھیں اور اُس کے خرافات پڑھتے جائیں اور جو میں عرض کروں اس پر غور فرمائیں تب معلوم ہو کہ وہ کتنا لغو اور فارسی دانی سے کتنا بیگانہ تھا۔"

چودھری عبدالغفور کے خط میں روئے سخن صاحب کی طرف ۔۔۔ "قتیلؔ فرید آبادی اور غیاث الدین ملائے مکتبی کی قسمت کہاں سے لاؤں کہ تم جیسا شخص میرا معتقد ہو اور میرے قول کو معتمد سمجھے۔"

"اصل فارسی کو اس کھتری بچہ علیہ ما علیہ نے تباہ کیا، رہا سہا غیاث الدین رامپوری نے کھو دیا۔ ان کی قسمت کہاں سے لاؤں جو صاحب عالم کی نظر میں اعتبار پاؤں۔ نہیں کہتا کہ خواہی نخواہی میری تحریر کو مانو، مگر اُس کھتری بچے سے اور اُس کے معلم

۱۔ عودِ ہندی صفحہ ۔ ۲۔ عودِ ہندی صفحہ ۔ ۳۔ عودِ ہندی صفحہ ۔ ۴۔ عودِ ہندی صفحہ ۔ ۵۔ عودِ ہندی

شاعر عمیق



سے مجھ کو کتر نہ جانو ... ڈاکٹر عبدالوہاب بیمبر رفتا قتیل ... نہ تھا وہ واقف عظمت الاعظم نہ تھا۔ میں پریشاں نہیں ہوں
شعر نہیں جوں۔ مانتے ہو مانو نہ مانو تم جانو"

اس طرح کے ان کے خطوط میں بہت سے جملے ملیں گے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھیں قتیل سے سخت چڑھ تھی۔ کبھی کبھی تو ان جملوں میں رشک کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں۔ جبکہ قتیل کے متعلق محققین کی رائے ہے کہ[1] "وہ نہایت خوش اخلاق، صدا صفت انسان تھے۔ ایرانی زبان اور معاشرت سے پورا وقوف رکھتے تھے۔ تاریخ، عروض، قافیہ، الہیات، ریاضیات اور فارسی زبان میں [illegible] ہندوستان کے فارسی لکھنے والوں میں بعض نام بہت مشہور ہیں۔ حضرت امیر خسرو دہلوی، ابوالفضل فیضی، میرزا عبدالقادر بیدل، ناصر علی، ان میں صفِ اوّل کے لوگ ہیں۔ مولوی غیاث الدین عزت رامپوری، مرزا محمد حسن قتیل دہلوی، احسان اللہ [illegible] عبدالواسع ہانسوی، ملا محمد اکرام غنیمت کنجاہی، نورالعین واقف بٹالوی (ثم لاہوری) وغیرہ اگرچہ ان کے پائے کے نہیں، لیکن ہندوستانی فارسی نویسوں میں بہت مشہور و معروف ہیں۔" خیر یہ تو ضمنی بات تھی جس سے غالب کے خود پرستی کے پہلو کو سمجھنے میں مدد ملی۔ لیکن ہمیں اس بات کے اعتراف میں قطعی جھجک نہیں کہ خود پرستی کا یہ بت کبھی کبھی پاش پاش ہو جاتا ہے۔ اس کی مثال ہمیں شہزادہ جواں بخت کے سہرے والے واقعے سے ملتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ان خطوط سے بھی جن میں وہ ضروریاتِ زندگی کے لئے دوسروں کے آگے جبیں سائی کرتے نظر آتے ہیں۔ اسی طرح جب انگریزی اقتدار کا پرچم لہرانے لگتا ہے تو وہ ملکہ وکٹوریہ کی عظمت کے گیت گانے میں انگریز بہادر کی شان میں قصیدہ لکھ کر گزرانتے ہیں۔ وہاں سے جنگ جواب آنے پر بھی اپنی کوشش جاری رکھتے ہیں۔ علام [illegible] کو لکھتے ہیں[2] "لارڈ کیننگ صاحب سے بعد فتح دہلی میرا قصیدہ مجھ کو واپس بھیج دیا۔ صاحب سکرتر نے مجھ سے کہہ دیا کہ تم ایام غدر بادشاہ باغی کے مصاحب رہے اب گورنمنٹ کو تم سے راہ و رسم آمیزش منظور نہیں۔ ناچار چپ ہو رہا ہوں بے حیا ہوں۔ لارڈ ایلگن صاحب بہادر کے وقت پھر موافق معمول قصیدہ تہنیت کے مقامات پر بھیج دیا۔" یہاں ایسا لگتا ہے کہ یہ وہ خوددار غالب نہیں جو درِ کعبہ وا نہ ہونے پر واپس آنے کا ارادہ کرتے ہیں۔ یہی وہ فطرت ہے جس کی وجہ سے محبوب کا اس قدر خیال ہے کہ اس کا "دیدہ پُرخوں" محبوب کا ساغرِ سرشار بن جاتا ہے اور خود کے پتھر نہ ہونے پر اس لئے افسوس کرتے ہیں کہ پتھر ہوتے تو کم از کم محبوب کے در پر دائم تو پڑے رہتے۔ میرے نزدیک عشق کی فطرت ثانیہ کہہ کر نظرانداز بھی کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اپنی محبت میں رقیب کی شرکت گوارا کر لینا، محبوب غیر سے ربط ضبط بڑھائے تو اس لئے خوش ہونا کہ اس میں وفا تو ہے، پھر جب وہ دوسرے پر عاشق ہو جائے تو اس کے ستم کے مکافات سمجھتے ہوئے خود کو بہلانا سوائے خود پرستی کے بت کی شکستگی، شوقِ تسلی اور قنوطیت کے کچھ نہیں ۔۔۔ یہ قنوطی رجحان ہی ہے جو کبھی خود کو حقیر و بے زار سمجھنے پر مجبور کرتا ہے اور وہ اتنی کمزوری محسوس کرتے ہیں کہ جستجوئے محبوب کو بھی ترک کر دیتے ہیں، خون رنگ ہو کر اڑ جاتا ہے۔ دل میں گنجائشِ عداوتِ اغیار تو دور، خواہشات، ہوس یا اُمنگ باقی نہیں رہتی۔ اور نقشِ محبت بھی دل پر بار گزرتا ہے۔ پتہ نہیں چلتا کہ یہ ذہنی رجحان شاعر کا انداز ہے جو کہتا ہے ؎

ہے ننگِ سینہ دل اگر آتش کدہ نہ ہو
ہے عارِ دل نفس اگر آذر فشاں نہیں
کم سے جیبِ سینہ اگر دل نہ ہو دو نیم
دل میں چھری چبھو مژہ گر خوں چکاں نہیں

گردشِ رنگِ طرب سے ڈر ہے
غمِ محرومیِ جاوید نہیں

۱؎ قتیل اور غالب۔ ۲؎ ذکرِ غالب صفحہ ۱۴۳۔ ۳؎ عود ہندی صفحہ ۱۲۷



ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں　　کافر ہوں گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں
غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس　　برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم
زمانہ سخت کم آزار ہے بجانِ اسد　　وگرنہ ہم تو توقع زیادہ رکھتے ہیں

اسد بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے
تو مشقِ ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر

اسی طرح دنیا ان کے سامنے بازیچۂ اطفال، اورنگِ سلیماں ایک کھیل اور اعجازِ مسیحا ایک بات سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتے۔ بیدادِ دوست اُن کی جان کے لئے نویدِ امن معلوم ہوتی ہے۔

ان باتوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ غالبؔ ایک انسان تھا جو آس پاس کے لوگوں سے متاثر ہوتا ہے اور انہیں متاثر کرنے کی کوشش بھی کرتا ہے۔ ماحول کے رنگ کو قبول کرتا ہے اور باغی ہونے کی ہمت بھی رکھتا ہے۔ گردشِ دوراں کی تلخیوں سے آشنا بھی ہوتا ہے اور اسے کسی نہ کسی طرح سے عرقِ مئے ناب یا فراموش کرنے کی کوشش بھی کرتا ہے اور جس وقت جو رنج و غم آ جائے جس احساس سے وہ مغلوب ہو جائے یا جو جذبہ اُسے برانگیختہ کرے، اُسے نظم کرتا ہے۔ ویسے بھی غالبؔ کے ناقدین نے انہیں فلسفی بھی مانا ہے اور انفعالی بھی اور یہ حقیقت ہے کہ انہوں نے زبان و بیان میں جو اجتہادی کوشش کی، غزلوں میں جس نئے طرزِ ادا کی بنیاد ڈالی، حرفوں کو جس طرح مفہوم و معنی سے عبارت آمیز کیا، وہ ان کی فعلیت کی طرف اشارہ کرتے ہیں لیکن جب ہم انہیں ان کے ماحول کے سانچے میں فٹ کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ وہ اجتماعی تلخیوں سے نبرد آزما ہونے کے بجائے اپنی انفرادی خوشیوں کو مدِ نظر رکھتے ہیں اور اپنی مرفہ الحالی کی تکمیل کیلئے انگریز پرستی کی طرف مائل نظر آتے ہیں اور یہ وہ زمانہ تھا جبکہ محبانِ وطن نے ہندوستان کی آزادی کے خواب دیکھنے شروع کر دئیے تھے۔ حالانکہ یہ خواب بارہا شکستہ بھی ہوئے۔ آزادی کے شیدائیوں کی گردنیں اڑائی گئیں۔ دار پہ کھینچا گیا۔ کالا پانی کی سزائیں ہوئیں۔ غالبؔ کے احباب و آشنا بھی اس زد پر آ گئے۔ خود غالبؔ بھی شک و شبہ کی بنیاد پر ملوث ہوئے۔ ان باتوں کا ثبوت نہیں خودِ ہندی اور اردوئے معلّیٰ کے خطوط یعنی غالبؔ کی زبانی بھی ملتا ہے۔

غالبؔ کی شخصیت کا پیکر تراشتے وقت ہمیں انسانی فطرت کو مدِ نظر رکھنا چاہیئے اور افراط و تفریط سے ہٹ کر جادۂ اعتدال کو اختیار کرنا چاہیئے۔ انسان کے جذبات و احساسات زمان و مکان کے پابند ہوتے ہیں اور اس کی شخصیت کی اضافی کیفیتیں بھی بدلتی رہتی ہیں۔ وسعلیڈ نے خیاؔم کے یہاں متضاد کیفیات کا سبب بھی اسی کو قرار دیا ہے ــــ اس لئے جہاں غالبؔ کی شخصیت انسانی خصوصیات سے مزین ہے وہیں کچھ بشری خامیاں بھی نظر آئیں تو اُسے قبول کرنے میں قطعی جھجک نہیں ہونا چاہیئے اور نہ ہی ان سے چشم پوشی کرنا چاہیئے۔ ان خامیوں کا اعتراف ان کی شاعرانہ عظمت پر کسی قسم کا داغ نہیں۔

خوشبو کی تاریخ

"بھائی میکش آفریں ہزار آفریں تاریخ نے مزہ دیا۔ جانے وہ حرف کس مزے کے ہوں گے جن کی تاریخ ایسی ہے۔ دیکھو صاحب قلندر ہرچہ گوید دیدہ گوید۔ تاریخ دیکھی اُس کی تعریف کے جو ستائیں گے اس کی تعریف کریں گے۔ کہیں یہ تمہارے خیال میں نہ آوے کہ یہ خوش طلب ہے کہ ناحق تم دین محمد غریب کو دوبارہ تکلیف دو۔ ابھی رقعہ لیکر آیا ہے ابھی حرف لیکر آوے لاحول ولاقوۃ الا باللہ العلی العظیم۔ اگر غرض یہ ہے کہ تم یونہی کل میں لاؤ گے اور میاں دین محمد صاحب کے ہاتھ حرف بھجواؤ گے تو ہم کہیں گے تازہ بہ تازہ بہتر، بارہ سے بہتر۔"

ــــ غالب ــــ

عفت موہانی

مغنی آتش نفس

مرزا غالب اگرچہ اردو شعر کا ایک بے شمار پایہ ہیں، علم و ادب کو جو دولت غالب نے بخشی ہے کسی اور شاعر سے منسوب نہیں کی جاسکتی۔ [illegible] ہمہ گیری نے انہیں ٹیگور، حافظ، شیکسپیئر، گوئٹے اور براؤننگ کا مقابل بنا دیا ہے۔ ان میں ایک فلسفی کی عقل و ادراک، ایک صوفی کی نگاہ، دقیق اندازی اور ایک مصور کی سی باریکی ہے یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے کلام کا ایک ایک لفظ تاج محل ڈھال گئے ہیں۔

اگر کسی کمتر کو کسی برتر سے تشبیہ دی جائے تو گناہ اور سوء ادبی نہیں ہے تو یہ کہنا کچھ مبالغہ آمیز نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس وقت شاہ کی تقدیر میں اللہ جو تاج محل تعمیر کر دیا اور اس کے ہاتھ میں تعمیر کے پیام تھما دی، اور پھر سینکڑوں برسوں بعد اقلیم شعر و سخن میں دوسرا اسد اللہ پیدا ہوا اس کے ہاتھ میں اللہ نے زندۂ جاوید قلم تھما دیا۔

اسد اللہ خاں غالب کا زمانہ وہ تاریخی ہنگامی ملک انیسویں صدی عیسوی کا وہ عبوری زمانہ ہے جبکہ ہندوستان انقلاب عظیم سے دوچار ہو چکا تھا، مغربی شعر و سخن کے اثرات مشرقی شعر و سخن پر بلاواسطہ اور بے ارادہ پڑ رہے تھے، بہت کچھ مشرقی شعراء نے انقلاب سے سیکھا اور عموماً اپنے تاثرات دنیا کے سامنے بھی پیش کیے۔ ابتدائے آفرینش سے تدریجاً انسان کا ہر قدم، ترقی، تمدن اور تہذیب کی طرف اٹھتا ہے ہر دور کے آدمی نے اپنی دانست میں ترقی و تہذیب کی حدیں عبور کی تھیں لیکن آج کے دور پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ترقی منزل نہ تھی، راستہ تھا اور بہت قریب کا راستہ۔ ترقی کی منزل ہمیشہ مادی آنکھوں سے دور رہی ہے، اتنی دور کہ قیامت تک آنے والا انسان اپنے بزرگوں کے کارناموں کو اپنے لئے تحفت اور حرف آخر کبھی نہ کہے گا۔ اس کا دماغ کوئی نئی بات سوچے گا، نئی راہ کھولے گا، نیا راستہ ایجاد کرے گا اور اسی طرح ترقی کی منزل صرف ایک راستہ بن کر بہت پیچھے رہ جائے گی لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اچھے اچھے عہد میں [illegible] پیمانہ کار کا زمانے ہیں چھوڑ گئے، ایلورا اجنتا کی تہذیب صدیاں گزر جانے کے بعد آج بھی نئی در تعمیر کی ہے۔ سندھ کی کھدائی سے جتنے آثار قدیمہ کے دریافت ہوئے وہ اپنی نوعیت کے بہترین تاریخی و تمدنی اوصاف اپنے اندر پنہاں رکھتے ہیں۔ تاج محل پر کبھی [illegible] قیامت کا الزام نہیں رکھا جائے گا۔ لافانی کارنامے ہر عہد میں گو بہ نہ رہیں گے، مثلاً اصناف سخن میں بے مثال چیزیں ایسی ہیں [illegible] اور ہمیشہ زندہ رہیں گی۔ لاطینی میں ہومر اور [illegible] کے کارنامے، انگریزی میں ملٹن، بیکن، کوپر، [illegible] گولڈ اسمتھ وغیرہ کی تحریریں [illegible] میں شاہنامہ، حافظ و سعدی کا کلام، مثنوی معنوی مولوی روم کے بہت، قرآن در زبان پہلوی کا اعزاز بخشا گیا، سنسکرت میں مہابھارت، [illegible] کی چیزیں ایسی ہیں جن کیلئے ابدی کا حرف آخر واضح ہو چکا ہے۔

ہند کی تاریخ نے صرف تین ہی چیزیں اپنے باشندوں کو عطا کی ہیں تاج محل، لال قلعہ اور اردو۔ ویسے ان تینوں میں کوئی رشتہ [illegible] نہیں ہے لیکن [illegible] کے تینوں مربوط لازم و ملزوم ہیں۔ تاج حسن و عشق [illegible] شاعری [illegible]



غالب اور زبان اردو بھی حسن و عشق کی لازوال علامت ہیں جب تک ہمارا دہر پر تاج ہے محبت اور خوبصورتی کی کہانی زندہ ہے اور جب تک روئے زمین پر ہندوستان باقی ہے، غالب اور اردو بھی زندہ رہیں گے۔

صنفِ غزل جس پر زیادہ تر "علامہ" غالب نے طبع آزمائی کی، حقیقی معنوں میں بڑی کسمپرسی کے عالم میں تھی۔ شعر میں جو صنف سب سے زیادہ لطیف اور سہل ہے وہ غزل ہے۔ "طبعِ دشوار پسند" اور اظہارِ رفیع الشان کے لئے غزل ایک مستقل گم غفیر ہو چلا در ... لیکن حال شاعری ہے۔ اسی طرح جب غزل معشوق سے مخاطب اور سوقیانہ جذبوں کے اظہار کا ذریعہ محض تو پامال ہوتی چلی گئی۔ غالب کا احسان سب سے پہلے صنفِ غزل پر یہ مانا جائے گا کہ انھوں نے غزل کا رنگ روپ بالکل بدل دیا۔ پہلے پہل جب غالب کا شعری انداز بیان، معانی، اشعار اور جدید خیالی، دو وقوں کے سامنے آئی تو بہتیرے ذہنوں نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ جس طرح ایک مصنف یا مبلغ کی تحریر یا تقریر بعض ایسے اسلوب بیان، اور طرزِ اظہار کی بنا پر پسندیدہ یا ناپسندیدہ قرار دے دی جاتی ہے اسی طرح غالب بھی زیرِ ملامت بنا، اُن کی فارسی اور عربی آمیز اردو کو طرزِ تضحیک کا نشانہ بنایا گیا اُن کی معنی یاب شاعری ایک عرصہ تک چیستاں بنی رہی۔ اگرچہ اکثر جگہ غالب کا کلام فارسی کے شاعر بیدل کے رنگ میں رنگا ہوا نظر آتا ہے لیکن غالب کا اردو کلام جو فارسی میں ڈھل کر علاوہ زیادہ پسند نہیں کیا گیا اس کی سب سے بڑی وجہ غالب کا مقصد تر رفیع الشان اور دشوار ترین اظہارِ خیال ہے۔ علاوہ وہ فارسی کے عالم تھے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اُن کا فارسی کلام اتنا مشہور و مقبول نہیں جتنا اردو کلام ہے۔

ایک طویل عرصہ تک طعنہ کنایات برداشت کرنے کے بعد انھوں نے اپنا انداز سخن بدلا۔ لیکن اس پر بھی اُن کے اشعار پیچیدہ، حد درجہ دقیق، اور بلیغ ہیں۔ پھر بھی پذیرائی ستائش کی گئی۔ وہ مجبور ہوتے تھے عام فہم اور سہل الحصول شعر اُن کی طبیعت کے منافی تھا۔ جتنے بھی اردو اشعار کہے اُن میں زیادہ سے زیادہ فارسیت غالب رہی مثلاً ـ

شمار سبحہ مرغوبِ بتِ مشکل پسند آیا
تماشائے بیک کف بردنِ صد دل پسند آیا

اس شعر میں ترکیب فارسی ہے صرف "آیا" کو "آمد" سے بدل دینے پر پورا شعر فارسی بن جاتا ہے۔ اسی قسم کا ایک زیادہ معنی آفریں شعر ہے ـ

اسدؔ ہم وہ جنوں جولاں گدائے بے سر و پا ہیں
کہ ہے سر پنجۂ مژگانِ آہو پشت خار اپنا

تشریحات اور تلمیحات، معنی اور مفہوم کے دریا ہیں جو اُن کے اشعار میں بند ہیں۔ اجتہاد، انفرادیت، اور اپنا خاص طرز بیان وہ چیزیں تھیں جنھوں نے حقیقی معنوں میں غالب کو تمام متقدمین، معاصرین اور متاخرین پر غالب رکھا۔ اپنے طرز کے وہ موجد تھے اور جادۂ نو کے اکیلے راہ رو بھی۔ پھر قدرت نے بھی ظرفِ قدر جوار دیکھ کر عطائے مادہ کی۔ اگر جذبات کی صحت، ذوق کی بلندی، احساس کی پاکیزگی اور تصور کی صلابت آخر تک شاعر کی رہنمائی کرتی چلی گئی، اور شاعر نے انداز تغزل میں داخلیت وحقیقت، خارجیت و معنویت کو سامنے رکھا تو یقیناً وہ اچھے معیارِ شاعری سے بہتر نہ ہوگا۔ لیکن صنفِ غزل جتنی دلچسپ ہے اتنی ہی نازک۔ جن شعرائے کامل نے اس میں جد و جہد کر کے اپنے ذوقِ عالیہ کی تسکین کرنی چاہی ہے انھیں سے اس صنف کے مدارج معلوم ہو سکتے ہیں۔ امر واقعہ یہ ہے کہ جس راہ میں مصائب شکلِ محاسن نظر آئیں، اور تحسین کو تضحیک کے روپ میں پہچاننا دشوار ہو جائے جہاں ذرا سی لاعلمی، خفیف سی لغزش، مدح کو ذم سے بدل دے۔ اسفل کو اعلیٰ سے ممتاز کر دے اس کی نزاکتوں اور باریکیوں کا کیا ٹھکانا ہے خلاصہ یہ کہ تغزل میں قدم قدم پر مشکلیں ہیں۔ اور غالب نے اس مرحلے کو طے کرنے کی کوشش میں اپنے آپ کو فنا کر دیا ہے ہر چند کہ دنیائے شاعری نے انھیں بہت بڑے بڑے خطابات عطا کئے مگر پھر بھی ادب اُن کی حقیقی ستائش اور خدمت سے عہدہ برآ نہیں ہو سکا!



ایک طرز جدید کے بانی اور مجتہد کی حیثیت سے غالب نے بے شمار مشکلات کا سامنا کیا۔ طعن و تمسخر برداشت کیا۔ حکیم آغا جان عیش تو یہاں تک کہہ گزرے ؎

> اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے
> مزہ کہنے کا ہے جب اک کہے اور دوسرا سمجھے
> کلام میر سمجھے اور زبان میرزا سمجھے
> مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

[illegible] ہے کہ گولڈ اسمتھ کی طرح غالب بھی اپنے زمانہ میں late flowers رہے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ بعد کو [illegible] ایک طلسم ہے کہ گولڈ اسمتھ کے مرنے کے تقریباً بائیس تئیس سال بعد غالب نے ۱۷۹۶ء میں آگرہ میں جنم لیا۔ [illegible] فارسی ادب میں کامل دستگاہ حاصل کی۔ اس کے بعد مرزا بیدل کے رنگ میں شاعری کی۔ پھر فضل حق خیرآبادی سے ملاقات ہونے کے بعد مغلق اشعار کا سلسلہ بڑی حد تک ختم ہو گیا اور پھر غالب ایک عظیم شاعر کے روپ میں دنیا کے سامنے آئے۔

غالب نے غزل میں اپنے لیے جو نئی راہ پیدا کی وہ بڑی کٹھن تھی۔ وہ صرف ایک منفرد مطمح نظر کے سامنے تھا بلکہ وہ معاصرین و حاضرین کو بھی ایک خاص راہ دکھانا اور اس پر چلانا چاہتے تھے مگر اس میں ایک نفسی، کھلی اور غیر محسوس رکاوٹ اور بھی ہوئی کہ ایک مجتہد کی حیثیت سے اصول جدیدیت کا جو معیار دوسروں کے سامنے رکھا وہ پیچیدہ بن گیا۔ فرسودہ استعارات، تشبیہات اور مہمل تراکیب کو ترک کر کے غزل کو نئے اسلوب بخشے۔ گل و بلبل کی نغمہ سرائی ختم ہوئی، ہجر و وصال کی فرسودہ روایات نے دم توڑا۔ خال و زلف کی پیچیدہ راہوں کا اہتمام ہوا۔ حسن و عشق یک طرفہ تھا ختم ہوئے۔ صنف غزل کے جسم مردہ بدن نے نئی حرارت پائی۔ اور زندگی کھل کر انگڑائی لے کر جاگ اٹھی۔ جس آواز سے کوئی تقی اور پر شکوہ تھی اقلیم شعر میں وہ گونج پیدا ہوئی کہ پچھلے نوا سرا ہکلاتے ہوئے معلوم ہونے لگے۔ پھر بھی انھوں نے اپنی یکتائی کا ڈھنڈورا نہیں پیٹا بلکہ اس ایثار پر کمر بستہ نظر آئے۔ ؎

> ہاں اہل طلب کون سنے طعنۂ نایافت
> دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے

یا پھر یہی حسرت عمر بھر رہی ؎

> زبان اہل زباں میں ہے مرگ خاموشی
> یہ بات بزم میں روشن ہوئی زبانی شمع

> ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا
> گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

اور کہیں اس کشمکش کا اظہار نظر آتا ہے ؎

> مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل
> سن سن کے اسے سخنوران کامل
> آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
> گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

مذاق سلیم اور طبع لطیف کی شاہراہ ہر دیار ہی سے نہایت شفاف چلی آئی ہے۔ درحقیقت غالب کی آزادہ روی، ندرت، وسیع النظری، دشوار پسندی اور غیر تقلیدی طبیعت نے اسی صحیح راہ کا کھوج لگانا چاہا۔ مگر گزرے ہوئے شعراء کے نقش پا نے اس راہ کو اس قدر مسخ و محو کر دیا تھا کہ اس میں غالب کی رفتار اڑان کی سی لگتی ہے یہی وجہ ہے کہ ان کا طرز جدید اور اجتہاد بالکل اچھوتا ہے۔ بہرحال ان کے اجتہادی کلام اور منفردانہ طرز سخن کے جائزے کے لئے تو بڑی تفصیل کی ضرورت ہے۔

مطالعہ یا مشاہدہ یہ دو چیزیں شاعر کو حقیقی معنوں میں شاعر بناتی ہیں۔ غالب کا مطالعہ اور مشاہدہ دونوں ہی بے پناہ تھا یوں محسوس ہوتا ہے کہ عربی فارسی اور اردو الفاظ کا ایک سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ اور شاعر تنگی داماں کا شکوہ کناں ہے۔ انہی مجبوری کے تحت غالب نے کلام



میں بڑی اچھوتی، منفرد، اور نادرۂ روزگار بلکہ دور از کار وہم تشبیہیں اور ترکیبیں وضع کرتے ہیں ؎

میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں   وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

اندوہِ وفا کی ترکیب خالص غالبی ہے۔ اس کے علاوہ طرفگیِ اسلوب، تکلفِ بیان، بے ساختگی، ادا، رنگینیِ اظہار اور پُر درد شوخی بھی علاوہ بر کلامِ غالب کی خصوصیت ہے۔ جن صفات سے غالب کا شعر نہایت بلند معنی آفریں اور پُر شکوہ ہو جاتا ہے اور ذہن کو تخیل کی ایسی پرشکوہ بلندیوں کی طرف لے جاتا ہے۔ جو سادگیٔ اظہار میں ممکن نہیں ہوتی۔ حتیٰ کہ محض معمولی اور روزمرہ کے خیالات بھی اسلوب کی ندرت و جدت اور طرزِ ادا کی بے ساختگی و شوخی کا احساس لے کر نہایت دلکش اور دلچسپ ہو جاتے ہیں۔ اظہارِ ادا میں تکلف چھوٹے چھوٹے تصورات کو بھی گوارا بنا دیتا ہے۔ اس پر اگر خود شیلاءِ تصور میں بھی کوئی ندرت اور خصوصیت ہو تو تکلفِ اظہار اس میں اور بھی چار چاند لگا دیتا ہے ؎

دوستدار دشمن ہے اعتمادِ دل معلوم   آہ بے اثر دیکھی نالہ نارسا پایا
دل مرا سوزِ نہاں سے بے محابا جل گیا   آتشِ خاموش کی مانند گویا جل گیا
دل نہیں تجھ کو دکھاتا ورنہ داغوں کی بہار   اس چراغاں کا کروں کیا کارفرما جل گیا
بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغِ محفل   جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا
نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی ہوا ہوگا   قیامت ہے سرشک آلودہ ہونا تیری مژگاں کا
کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ   ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا
یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح   کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا
ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد   یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے
آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے   صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا
گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار   لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا
اے دلِ ناعاقبت اندیش ضبطِ شوق کر   کون لا سکتا ہے تابِ جلوۂ رخسارِ دوست!
قاصد کو اپنے ہاتھ سے گردن نہ ماریئے   اس کی خطا نہیں ہے یہ میرا قصور تھا
ڈھونڈے ہے اس مغنیِ آتش نفس کو جی   جس کی صدا ہو جلوۂ برقِ فنا مجھے
ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں   کافر ہوں گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں
رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج   مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں
کچھ تو دے اے فلکِ ناانصاف   آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی
زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب   ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے
پھر اسی بے وفا پہ مرتے ہیں   پھر وہی زندگی ہماری ہے
دلِ ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر   ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا
سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے   کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

قصہ مختصر کلامِ غالب اٹھا کر اوّل تا آخر دیکھ جائیے، یوں معلوم ہوتا ہے جیسے شہرِ دہلی کے دفتر بیت معرفتِ کردگار ذرا سی دنیا میں ایک دلکش چیستاں، ایت؟ جو حکوار تشریح میں ڈھال دیتی ہے۔ اور طرزِ ادا کی یہ خصوصیت صرف غالب کا حصہ ہے۔ اس سلسلے میں یہ اشعار پیش کیے جا سکتے ہیں جو تخیل کی ندرت، شوخی، بے ساختگی، رشک اور تصوف عرضیکہ تمام صفات کا جائزہ دلفریب پیمانے ہیں
رشک۔   قاتل کی اپنے ہاتھ سے گردن نہ ماریئے   اس کی خطا نہیں ہے یہ میرا قصور تھا



[illegible]

ہے ابرو کو تجھ سے مژدۂ غیر [illegible]
ہرچند [illegible] حکایت ہی کیوں نہ ہو

گزرا اسد مسرتِ پیغامِ یار سے
قاصد پہ مجھ کو رشکِ سوال و جواب ہے

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے
میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

شوخی:

اسد بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے
تو مشقِ ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پہ

جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو
اک تماشا ہوا گلہ نہ ہوا

اضطرابِ عشق کی حالت سراپا دیکھیا
غیر سے کی آہ لیکن وہ خفا مجھ پر ہوا

عالیٔ خیال:

تھی وہ اک شخص کے تصور سے
اب وہ رعنائیٔ خیال کہاں

اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ
اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا

لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا
لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

[illegible]

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

اے دلِ ناعاقبت اندیش ضبطِ شوق کر
کون لا سکتا ہے تابِ جلوۂ رخسارِ دوست

کیا آئینہ خانے کا وہ نقشہ تیرے جلوے نے
کرے جو پرتوِ خورشید عالم شبنمستاں کا

اس کی امت میں ہوں میں میرے رہیں کیوں کام بند
واسطے جس شہ کے غالب گنبدِ بے در کھلا

آج کیوں پروا نہیں اپنے اسیروں کی تجھے
کل تلک تیرا بھی دل مہر و وفا کا باب تھا

اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا

رفیع النظری:

پاتا ہوں داد اس سے کچھ اپنے کلام کی
روح القدس اگرچہ مرا ہم زباں نہیں

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود
قبلے کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

تالیفِ نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں
مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا

[illegible] کیا ہے میں ضامن ادھر دیکھ
شہیدانِ نگہ کا خوں بہا کیا؟

تازگیٔ مضمون:

پھر دیکھیے اندازِ گل افشانیٔ گفتار
رکھ دے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے

پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے
رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

سر کھجاتا ہوں جہاں زخمِ سر اچھا ہو جائے
لذتِ سنگ بہ اندازۂ تقریر نہیں

ظلم کر ظلم اگر لطف دریغ آتا ہو
تو تغافل میں کسی رنگ سے معذور نہیں

رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

دشوار پسندی:

جراحت تحفہ، الماس ارمغاں، داغِ جگر ہدیہ
مبارکباد اسد غمخوارِ جانِ دردمند آیا

بیاں کیا کیجیے بیدادِ کاوشہائے مژگاں کا
کہ ہر اک قطرۂ خوں دانہ ہے تسبیحِ مرجاں کا

غرضیکہ بے شمار خصوصیات کا حامل غالب کا کلام ہے جس میں اگر اشکالِ طبع، لطیف پیچیدگی، رفعتِ تصور، سخن گستری، سادگی و پرکاری، سلاست اور تاثر، طنز و تعریض، طعن و تشنیع، ظرافت کا تفصیل کے ساتھ جائزہ لیا جائے تو مختصر سا مضمون مستقل کتاب کی صورت اختیار کرے گا۔



شعرائے اُردو کے لئے غالبؔ فارسی شعرا کی تقلید میں یہ بھی ایک خصوصیت ہے کہ بیرایۂ تصوّر نہایت نازک اور اس پر ایک عظیم عمارت الفاظ و معنی کی کھڑی کردی جائے تخیّل کا جا کہ عام فہم ہو سکیں و پیچدار حجّتِ بیاں اختیار کرکے اچھا جامہ محت پیدا کر لیا جاے۔ بقول ضیاؔ بدایونی، اس قسم کی تصوّراتی تخلیقات کا بانی فغانیؔ ہوا تھا جن کے مقلد ایران میں محتشم کاشی، ورشفائی تھے اور ہندوستان میں عرفیؔ اور نظیریؔ، طالبؔ، کلیمؔ، اور بیدلؔ وغیرہ اسی طرز کلام کے دلدادہ تھے۔ اس قسم کے کلام میں اغلاق اور تعقید کا پایا جانا ناگزیر ہے۔ مبالغہ دُور از کار ایہام اور رعایت لفظی پر شعر کی ناقص عمارت کھڑی کی جاتی تھی، لیکن غالبؔ کی نازک خیالی عظیم المرتبت طرزِ ادا کا لباس پہن کر انتہائی بلند اور موثر ہو جاتی ہے۔

غالبؔ کا مقام متعین ہو چکا ہے۔ اگر انھیں خدائے سخن، شہنشاہِ اقلیم شعر کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ غالباً اُن کی شاعرانہ عظمت سے متاثر ہو کر بجنوری مرحوم نے ہندوستان کی الہامی کتب میں وید کے ساتھ ساتھ دیوانِ غالبؔ بھی شامل کر لیا تھا۔ غالبؔ اعیان و امثال کے شاعر ہیں۔ انھوں نے دُنیائے شعر کو ایک نیا اُفق عطا کیا۔ اپنی حکیمانہ بصیرت اور ژرف نگاہی سے شعر و سخن کے سلسلے ابدیت سے ملا دے!

جہاں نظم و غزل کی دنیا میں غالبؔ کی انفرادیت اور عظمت کے ڈنکے بجے ہیں، وہیں نثر نگاری میں بھی اُن کی انفرادیت اور اجتہادیت مسلّم ہے۔ نثر میں غالبؔ اپنے خطوط میں نمایاں ہیں۔ اُن کی تمام تر زندگی اُن کے خطوط میں سامنے آگئی ہے۔ "غالبؔ خستہ" کے بغیر اُردو ادب میں کوئی نوری کمی رہ جاتی، اگر ان کے خطوط نہ ہوتے خطوط نویسی میں انھوں نے جو طریقہ ایجاد کیا اور جتنی اختراعات کیں، اُن کو حسن التزام اور اہتمام سے استعمال کیا۔ اس کے غالبؔ ہی موجد اور وہی خاتم ہیں۔

۱۸۵۰ء تک وہ فارسی میں خط لکھتے رہے۔ لیکن جب بہادر شاہ ظفر نے انھیں تاریخ نویسی پر مامور کیا تب انھوں نے خطوط اُردو میں لکھنے شروع کئے۔ اس سلسلے میں القاب و آداب، مزاج پُرسی، خیریت طلبی کے قدیم دستور کو ترک کرکے بالمشافہ گفتگو کی سی مار ڈالی۔ اگر کبھی اپنے دوستوں کو القاب لکھتے بھی تو نہایت مختصر کبھی یہ القاب بھی ندارد اور اچانک نفسِ مضمون پر آجاتا جیسے

"ہاں صاحب تم کیا چاہتے ہو؟"

یا "مار ڈالا تیری جواب طلبی نے" وغیرہ

اُن کے خطوط کی سب سے بڑی خوبی جس نے بقول حالیؔ اُن کے مکاتیب کو ناول اور ڈرامے سے زیادہ دلچسپ بنا دیا تھا اُن کی شوخیٔ تحریر ہے جو اکتساب، تربیت یا مشق سے حاصل نہیں ہوتی۔ بلکہ خداداد جوہر ہے جو مکاتیب میر مہدی مجروحؔ، مرزا تفتہؔ، منشی جواہر سنگھ جوہرؔ، عبدالجمیل جنوںؔ، شہاب الدین ثاقبؔ، حاتم علی مہرؔ وغیرہ کے نام ہیں اُن میں نہ صرف حالاتی معلومات ہیں بلکہ غالبؔ کے دَور کی ساری تاریخ اِن خطوط کے مطالعہ سے نظر کے سامنے آجاتی ہے۔ اور اعلیٰ ترین انشا پردازی کے شاہکار اِن خطوط کی صورت میں بکھرے ہوئے ہیں۔ اگر غالبؔ ایک بلند پایہ شاعر نہ بھی ہوتے تو ایک صاحب طرز ادیب اور نثر نگار ہوتے۔

بہرحال غالبؔ کی گوناگوں خصوصیات پر نظر ڈالنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایوانِ شاعری کے وہ تنہا بادشاہ ہیں۔ اُن کے کلام تیریں سے دُنیائے شعر میں نئی گونج جاگ اُٹھی ہے در حقیقت غالبؔ نے خود کو "زیر دہ معنی آتش نفس" کہا ہے تو بالکل بجا کہا ہے۔ لیکن نے مہریٔ یارانِ وطن نے اُنھیں اپنے آپ کو سمجھنے کا موقع نہیں دیا ویسے سچ یہ ہے ؎

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے اندازِ بیاں اور

شمیم صادقہ

اِک محشرِ خیال ۔ غالب اور صنفِ نازک

[...]وں میں جیسے جیسے تیزروی آتی گئی ہے، ماحول کا ایک دھواں سا اٹھا ہے اور شخصیات، سیرت، فطرت اور ذہنیت کا لفظ [...] سا ہو گیا ہے۔ ظاہر ہے ذہنوں کے اس دھندلکے سے اصنافِ ادب کو بھی نجات نہیں۔ اس کے باوجود بھی اگر میں اس دھند میں اگر میں غالب کے آئینے میں کھوئے ہوئے نقوش تلاش کروں تو ممکن ہے، اربابِ نقد و نظر اسے سراب کہہ لیں لیکن میرا خیال ہے رنگوں کی روشنائی رہ گزاروں میں ملتی ہے جہاں سے ہم آپ یا کوئی بھی کبھی بڑی تیزی، بڑی الجھن اور بظاہر بےفکری سے گزر گئے ہوتے، اسی لئے کہیں چارہ بھی گر رہا۔ ایک طرف تو اس محشرِ خیال کا دھندلاپن جسے کسی سرد مہری کا جواب ہوتا ہے تو دوسری طرف اُس سرد مہری کا ایک اندرونہ سسکتی ہوئی محسوس ہوتی ہے جو اُس محشرِ خیال کا اثر رہ جاتی ہے۔ جو آدمی بجائے خود ہوتا ہے۔ اور پھر صورتِ حال یوں ہوتی ہے

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ
جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا

یعنی خواب و خیال کا واسطہ ایک طرف اور دوسری طرف سود و زیاں کے احساس کا بوجھ، یہی تو غالبیت ہے اور یہی نسوانیت بھی۔ زندگی کی اتنی سچی تعبیر کہیں اور نہیں ملتی۔ جسے ظفر نے عمرِ دراز کا دو حصہ کہا تھا۔ آرزو اور انتظار، اور جسے صرف کچھ انتظار سا ہی کہتا ہے ہر حال یہ تو سچ ہے کہ انتظار کی کیفیت ابدی اور ازلی ہوتی ہے لیکن اس کے دو عکس ہیں، محبت اور رسمی کبھی پلکیں نم ہوئی جاتی ہیں اور دلِ امید کے اُس کچے دھاگے کو جو اب ٹوٹا اور بس اب ٹوٹا ہوا کرتا ہے، بڑی مضبوطی سے تھامے رہتا ہے۔ دوسری طرف وہ انتظار ہے، جس کا ہر ایک لمحہ یادِ صبا کا خوشگوار جھونکا بن کے آتا ہے اور دھیمے اداس چہرے پہ یادوں کی رت کھیل جاتی ہے۔ لیکن یہ کیفیت تجربے کی دنیا میں بڑی گریزاں ہوتی ہے، انسان فطرتاً قنوطی ہوتا ہے۔ رجائیت اُس سے سہاری ہی نہیں جاتی۔ جیسے کہ پرچھائیاں بڑھتے بڑھتے دھندلی پڑنے لگتی ہیں۔ اور یہ شب و روز کی زنجیر جو شاید زندگی کہی جاتی ہے، خود اپنے ہی ویران جانے کی گھاس کھودتے ہوئے ختم ہو جاتی ہے۔ فرق یہ ہے کہ غالب نے جس داخلی [...] کا اظہار کیا ہے وہ اندر چھپی ہے اور جو اُس سے ملتی جلتی کیفیت گہرائیوں میں اتر جاتی ہے، اندر ہوتی ہے۔ دیکھئے ؎

اُگا ہے گھر میں ہر سو سبزہ، ویرانی تماشا کر
مدار اب کھودنے پر گھاس کے ہے میرے درباں کا

یہ گھر کی ویرانی، سبزے کی فراوانی، اور درباں کا گھاس کھودنا، بظاہر سی خیال آفرینی کی مثال ہے۔ لیکن اس عام مثال کے در پردہ غم کی ایک جاندار کیفیت ہے جیسے بھری بہار میں کوئی اپنے اندر وسیع و عریض قبرستان لئے ہوئے مسکرانے پہ مجبور ہو۔ یا خاموشی کے ابھرے پردے



میں اُن قبروں کو چھپائے جو دل کے اندر بنتی ہیں، ٹوٹتی ہیں کہ وہ جسم جسے مدتوں اپنے عمارت بنا تھا کسی زہریلے مرض کا شکار ہو کے خاکستر ہو جاتا ہے اور اس کی کرچیاں کھو کے سارے وجود میں یوں بچھا جاتی ہیں۔ غالب کا یہ شعر کتنا تاثراتی، معنوی اور گہرا ہے پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے جو ڈھکا ہوا تھا اب آیا اور چھا گیا گویا اس کی کیفیت تو اور بھی کرب ناک ہوتی ہے جب یہ

ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا

یا پھر یہ شعر پڑھئے ؎

محو حیرت میں یہاں جوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں

چراغ مردہ ہوں میں بے زبان، گور غریباں کا

زندگی اکثر جو دراصل بھی شکست کی آواز ہوتی ہے۔ اس کی تین صورتیں ہیں۔ پہلی گونج تو کوہساروں سے ٹکرا کے ایک چھنا کے اور تلواروں کی صدا بن جاتی ہے

گھر یہ چاہیے ہے خرابی مرے کاشانے کی

در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا

رفتہ رفتہ اس گونج کے چھنا کے میں کا طلسم اپنے اندر سمٹنے لگتا ہے، آواز مدھم ہونے لگتی ہے اور شکست کی آواز گہرائیوں میں اترتی ہوئی سی محسوس ہوتی ہے ؎

زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی

کیوں ترا راہگذر یاد آیا

نظر میں کھٹکے ہے بن تیرے گھر کی آبادی

ہمیشہ روتے ہیں ہم دیکھ کر در و دیوار

لیکن جب یہ آواز، یہ گونج اور یہ صدا گھٹ جاتی ہے تو ایک عجیب سی داخلی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ جہاں الفاظ کی صورت دم توڑتی ہوئی محسوس ہوتی ہے، جذبۂ اظہار کی رکھنے والی تشنگی اپسے غیر اہم اور بے معنی سا دیتا ہے یہ گھلاوٹ۔ یہ کیفیت اور یہ شدتِ احساس میر کا حصہ ہے۔ میر کے یہاں جو گھل مل جانے کی کیفیت اور شخصیت کے سحر کو تاثیر غم میں جذب کر دینے کا انداز ہے وہی کچھ کلیم عاجز ایک شعر میں ہے۔ یہ اشعار دیکھئے۔

پاس ناموس عشق تھا ورنہ

کتنے آنسو پلک تک آئے تھے — میر

میرا اور پوچھے کہ ہم شب مرے سوز دل کو چھوڑ دے

یہی بس دعا میں کروں ہوا اب کہ یہ غم کسی کو خدا نہ دے — عاجز

یہاں میر مقصود موسیقی کی کیفیت نہیں، بلکہ وہ شخصیت ہے جو اظہار کی نفاست اور بیان کی لطافت کے پردوں سے سلیقے کے دارس کے جھانکتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ غالب کے یہاں یہ انداز، یہ احساس، یہ ایثار اور یہ اثبات نہیں اس لئے کہ اس کے فکر کی گہرائی اور شعور کی گیرائی اُسے تہی دامنی کے شدید احساس سے بھی پرے لے جاتی ہے۔ شاید اسی لئے اپ اندر کی راستوں میں غالب کا خلوص نہیں چھوڑ کے جگا دیتے میں ناکام ہے اور ایک لمحے کے لئے جب ہم آپ یا کوئی بھی اپنے اندر کی قبروں اور دہن کے ویرانوں کو براہ راست دیکھتے ہیں تو میر اور صرف میر ہی سچائی کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ غالب اس اندر کی کیفیت کا ساتھ نہیں دے پاتا۔ اس لئے کہ اُس کے احساس کی آنچ متوازن اور مدھم ہے وہ رہ عبادت گذاری سے مطمئن ہے اور نہ ترک دنیا سے، اُسے نہ خوشی میں سکون ہے اور نہ غم میں۔ وہ ایک لمحہ حادوداں کا متلاشی ہے اور یہ تلاش ناکام بھی اُس کا درد ہے۔ اسی لئے وہ دلوں کو قابو میں کر کے آہستہ آہستہ بہت اندر تک اتر جاتا ہے۔ اس کے نزدیک انسان ایک مختصر خیال ہے پھر جہاں زندگی کی قبا احساس کے کانٹوں سے اُلجھ کے تار تار ہو رہی ہو، وہاں میر کا ایک پُر درد شعر وقتی طور پر متاثر کر سکتا ہے۔ ہمیں صدمہ بھی کر لیتا ہے لیکن مرہم کا مرہم اُدھ کا علاج



نہیں بن سکتا جس کے طور پر بظاہر ہم متاثر ہوتے ہیں۔ لیکن دراصل ہمارے اندر کی وہ کیفیت جو اکثر پیدا ہوتی ہے جس کا کوئی نام نہیں ہوتا اس جذبیت کو ہمارے سامنے ابھارتی ہے۔ اُس وقت غالب کا ایک خود شناس شعر ہی ذہن کو سکون دے سکتا ہے۔ اس کا اندازہ تو وہی کر سکتے ہیں جن میں آئینہ دیکھنے کے ساتھ ہی اُسے چکنا چور کر دینے کی بھی صلاحیت ہو۔ خود پرستی سے خودشکنی کی یہ منزل بظاہر بعید محسوس ہوتی ہے۔ لیکن نفسیات کے عقبی کدے میں جھانک کر دیکھئے تو اندازہ ہوگا کہ یہ دراصل مدارج ہیں اور وہ لوگ جو اپنے بڑے مقصد کے ساتھ قدم رکھتے ہیں وہ کہیں رُک نہیں جاتے۔ ان کی منزل رفیع و عظیم ہوتی ہے۔ اُن کا ایک پاؤں ایک زینے پر ہوتا ہے اور دوسرا دوسرے زینے پر۔ ہاں جب تھکن، اداسی سے ہم آہنگ ہوتے ایک کیفیت بن جائے اور اپنے اثبات کے لئے مجبور کر دے تو ایک وقفہ ضرور آتا ہے۔ غالب کے یہاں یہ وقفہ بھی ہے۔ دو زینوں کے بیچ رُکا ہوا سفر بھی ہے اور وہ منزل بھی جو غالب کی سیرت کا سب سے بڑا المیہ اور ان کی روح کا ناسور بن گئی تھی۔ اُن کے یہاں یہ ساری تدریجی کیفیتیں ملتی ہیں ؎

ہمہ ناامیدی ہمہ بدگمانی
میں دل ہوں فریبِ وفا خوردگاں کا

نہ کہہ کسی سے کہ غالب نہیں زمانے میں
حریفِ رازِ محبت مگر در و دیوار

کہتے ہیں جیتے ہیں اُمید پہ لوگ
ہم کو جینے کی بھی اُمید نہیں

جہاں میں ہو غم و شادی بہم ہمیں کیا کام
دیا ہے ہم کو خدا نے وہ دل کہ شاد نہیں

ان اشعار کی اُوپری سطح غم کا گہرا احساس پیش کرتی ہے لیکن دیکھنے کی بے کیفی زندگی سے بیزاری کے مترادف ہے لیکن زیادہ ڈوب کر دیکھنے کے بعد اُن کے اندر چھپی ہوئی اُس معصومیت، اُس پاکیزہ بے بسی اور اُس متضاد احساس کا اندازہ ہوگا جو انسانی ذہن و دل کا سب سے بڑا المیہ ہے اور اس کی سب سے بڑی سزا بھی۔ ان اشعار کے سیدھے سادے اور عام الفاظ اور ان کی ترتیب سے شخصیت کے راز عیاں ہوتے ہیں۔ ناامیدی، بدگمانی، فریبِ وفا، در و دیوار سے رازِ محبت کی بات، اُمید پہ جینا، جینے کی اُمید، جہاں کے شادی و غم اور دلِ ناشاد۔ ان سب میں ایک پس منظر ہے۔ سیاسی یورش، سماجی انحلال، تہذیبی زوال اور معاشرتی انحطاط کا۔ لیکن میں دلی کی تباہی، تہذیبی بساط کی بے بضاعتی اور نئی زندگی کے کھوکھلے معیار کے بھڑکیلے رنگوں کی چمک دمک کا تجزیہ نہیں کرنا چاہتی۔ اس لئے کہ غالب خود اپنے شعروں میں بالکل منفرد ہے، صرف ان حالات کا اثر یافتہ نہیں۔ اُس کی انفرادیت کا راز وہ خود ہے۔ ایسے یوں سمجھئے کہ دلی کی وہ تباہی، جو کبھی عصری تھی، اب اُس کے اثرات عالمی بن چکے ہیں۔ آج ساری دنیا ایک 'دلی' ہے۔ تہذیبی بساط آج بھی پارہ پارہ ہے اس لئے نہیں کہ بیرونی حملوں نے ہمیں برباد کیا ہے۔ بلکہ اس لئے کہ ہم خود اپنے آپ سے اور اپنے اندر چھپی ہوئی غیر شعوری قوتوں سے نالاں ہیں۔ شاید اسی لئے آج ہر ذہن ایک غالب ہے۔ وہی غالب جو کبھی ناآفریدہ گلشن کا عندلیب تھا۔ اسی لئے میں غالبیت کی بات کر رہی ہوں۔ غالب خود اپنے عہد کا ایک المیہ تھا اور آج وہی المیہ ہر ذہن کی تقدیر ہے اور اسی تقدیر میں اُس کی عظیم منزل کے نشانات چھپے ہوئے ہیں۔ غالب اس سطح سے ماورا نہیں ہے۔ اُس نے اُنہی پس منظر میں اظہارِ خیال کیا ہے جسے ہم انسانی اقدار کا پس منظر کہہ سکتے ہیں۔ اس کا ذہن اقبال کے 'مردِ کامل' کا ذہن تو نہیں، لیکن ایک سچے انسان کا ذہن ضرور ہے۔ غالب کے یہاں انسانی فطرت، انسانی خواب، آرزوؤں کی پامالی اور اس کے ردِ عمل کی صورت میں اُبھرنے والی متضاد تدریجی کیفیتیں، انسانی آنسو، غصہ، نفرت، گھٹن اور ہر ایک منزل پر ان سب کا منطقی عکس یعنی بغاوت، تضاد اور انکار غالب کے یہاں یہ سب کچھ ملتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ غالب کی شکست و ریخت بہت حد تک حالات کا حصار تھی۔ اُس کی کھلی ہوئی ناقدری اور ناشناسی نے اُس کی فکر میں ایسی گرہیں ڈال دیں



ہمیشہ وہ نا محرم سمجھا گیا۔ احساسات و اقرار کی خاص تمنا نے اُسے رنج تغزل سے محروم کر دیا۔ اُسے خود اپنی ذات سے محبت رہی کہ مجھ جیسا اعتقاد اور ایسا خلوص کبھی نہ حاصل کر سکا اور یہی کیفیت سیرتوں کا المیہ ہوتی ہے۔ اگر وہ خود اپنا اعتماد کرے، اپنے آپ کے لئے مخلص نہ ہو، خود سے ہمدردی نہ کر سکے تو وہ ایک نفسیاتی دباؤ کا شکار ہو جاتا ہے جو اُسے کہیں کا نہیں رکھتی۔ ست کے انداز سے خود کو تسلیم کرانے کی تمنا ہے۔ وہ ہر رنگ اور ہر قدر کا محروم ہو بیٹھتا ہے۔ غالب کے یہاں ایسے اشعار بہت ہیں۔ جن میں نہ موضوع کی ندرت ہے نہ فکر کی رفعت اور نہ بیان کا حسن۔ جیسے میرے خیال میں "بیتاں" کے بجائے "بستان" کہا جانا چاہئے یعنی ٹکڑوں کے ماسوں کا وہ جنگل جو چمن یا بستان بن سکتا تھا۔ لیکن دنیا کا پہلا پن کسی چیز کے آگے نہ سوچ سکا

"بیا دانوں میں جو سکا"، ارتیشہ بستاں کا

ہمیشہ تسکین کی دوسری منزل وہ ہے جہاں نہ ٹوٹنے والا عہدِ شکست، رنج اور فرار کے دامن میں پناہ ڈھونڈتا ہے

ابھی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو
آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا ہوں میں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پُرخار دیکھ کر

نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیے
بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن

گردشِ رنگِ طرب سے ڈر ہے
غمِ محرومیٔ جاوید نہیں

کم نہیں ہے وہ خرابی میں پہ وسعت معلوم
دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں

یہ مایوسی اور محرومی کی وہ منزل ہے جہاں گلستاں کے لُٹ جانے کے احساس کو کاغذی پھولوں کے ذریعے کم کیا جاتا ہے یعنی جب احساس کی گیرائی غمِ محرومی کو سہارنے میں ناکام ہو جاتی ہے تو اس احساس کی کیفیت ہی کم کر دی جاتی ہے۔ احساس کو بہلانے کی یہ کوشش اپنے اندر بے پناہ طوفان جیسی سمیٹے ہوتی ہے اور یہ شیشے کی وہ دُنیا ہوتی ہے جہاں ایک معمولی سی دستک، بالکل ایک آہٹ ہی سے خود فریبی کا طلسم ٹوٹ جاتا ہے اور ضبط کا طوفان بے پناہ جوش کے اُمڈ آتا ہے۔ آبلہ پائی پُرخار راستے اور ذوقِ سفر ہی سے کشمکشِ حیات کا مُثلث بنتا ہے۔ آبلہ پائی ایک حقیقت ہے پُرخار راستے دوسری سچائی انہیں دونوں حقیقتوں کے بیچ میں غالب اور مومن نے خود کو بہلایا لیکن اگر ہم غور کریں تو اندازہ ہو گا کہ ان دونوں منفی قوتوں کو ریزہ ریزہ کر دینے والا وہ بیج ہوتا ہے جسے 'ذوقِ سفر' کہتے ہیں۔ اور ایک باشعور فرد جو حساس بھی ہو، ان تمام احساسات کی سولی پہ ہمہ دم، ساری زندگی جیتا بھی ہے اور مرتا بھی ہے۔ زندگی سے بیکراں پیار اُس وقت اُمڈ آتا ہے جب زندگی کی اخلاقی اقدار ٹوٹتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ میں نے کہا نا! سوا لینے کی تمنا بشریت کا سب سے بڑا المیہ ہے۔ انسان اسی لئے بُرائیاں کرتا ہے اور نیکیاں بھی کرتا ہے۔ کبھی خودکشی کرتا ہے اور کبھی اخلاق کی سرد آنچ میں جل جل مرتا ہے اور زندگی کے دار پر لہو کے چھینٹے اڑا کے اُسے رنگین مانتا ہے غرض بھی کچھ کرتا ہے اور یہ تمنا اُس وقت دو آتشہ ہو جاتی ہے جب تلخ حقیقتیں اُسے جھنجھوڑ کے رکھ دیتی ہیں۔ اُس وقت غمِ محرومی ہی کی وادی سکون عطا کرتی ہے، رنگِ طرب کی تمنا ایک اصل ضرور ہے لیکن اس کے ساتھ آبلہ پائی کا سایہ لگا ہوتا ہے ٹھوکروں اور رحجانوں کا یہ ایسا جہان ہے جہاں اپنا آپ گنوا دینے کے بعد جو کچھ حاصل ہوتا ہے، وہ تہی دامنی کے شدید احساس کے سوا اور ہوتا بھی کیا ہے؟ یہی انجامِ حیات ہے اور یہی کائنات کا ماحصل، سب کچھ، اور پھر کچھ بھی نہیں۔



[illegible] ہم دراصل خواہشوں اور خوابوں کا ایک بیکراں دریا ہے، ہم ہزار موجوں کے ساتھ ساتھ، ساحل تک پہونچنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن جب ہم کنارے تک آجاتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ تمناؤں کے آبگینے تو کب کے چکنا چور ہو چکے ہیں [illegible] ایک دوسرے سے بہت دور ہوتی ہے ہم ٹوٹتے ہوئے ٹکڑے، اور اس میں بجائے ایک دوسرے سے منہ چھپا لیتے ہیں اور دریا یہ مگر قائم رہتا ہے۔ جب ہمیں اندازہ ہوتا ہے اس وقتی کیفیت کا جو سے حد سراب تھی، اور یہ کہ یہ سب کچھ فریب نظر ہے، فریب فہم ہے۔ غالب کو بھی اسی دائمی اور لازوال سچ کی تلاش ہے اور جب انسان کو جو اشرف المخلوقات ہے، یہ تمنا اور یہ بے بسی [illegible] ہے تو اس کے تھکے ہوئے وجود کو احساس محرومی کا احساس سکون دیتا ہے اور وہ خود کو یوں بہلا لیتا ہے ؎

شورِ غم بھی غنیمت ہے زندگی میں آخر
غموں کی دھوپ بھی کھلائی تو کیا ہوگا
"دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں"

[illegible] وہ نظروں سے کبھی کہاں رہتی ہے اس لئے کہ طبیعت اثبات چاہتی ہے۔ احساس کی آگ اور محرومی کی [illegible] انسان اندر سے جیتا اور مرتا رہتا ہے غالب کا یہ شعر پڑھئے ؎

سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے
کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

[illegible] اقرار کی یہ ایک عمدہ مثال ہے۔ یہ سارے اشعار اسی کیفیت کے ترجماں ہیں ؎

طبع ہے مشتاقِ لذت ہائے حسرت کیا کروں
آرزو سے ہے شکستِ آرزو مطلب مجھے

ہوں کشاکشِ نزع میں ہاں جذبِ محبت
کچھ کہہ نہ سکوں پر وہ مرے پوچھنے کو آئے

[illegible] حسرتِ دل چاہئے ذوقِ معاصی بھی
[illegible] یک گوشۂ دامن گر آبِ ہفت دریا ہو

[illegible] کا بھی اظہار ہے۔ لیکن اس میں وہ سچائی نہیں جو ناصر کے اس شعر میں ہے ؎

مدت ہوئی اک حادثۂ دل کو اور اب بھی
پہنچے ہے وہیں بات جہاں سے بھی چلے ہے

[illegible] غالب کے یہاں [illegible] کا کل نہیں، اسکے یہاں صرف بکھرے ہوئے ٹکڑے، بکھری ہوئی سچائی، بکھری ہوئی کیفیتیں اور بکھری ہوئی تمنائیں ہیں [illegible] وہ یقین اور وہ یکرنگی نہیں جسے میر کے یہاں روح کا مقام حاصل ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ٹوٹا ہوا دل ایک [illegible] کو جو غالب ہی سے حالات کی چٹان پہ پٹخ کے چکنا چور کر دیا تھا اُن کے اندر شیشے سے بھی نازک سی جو جذبات تھی [illegible] رہ احساس کا ایک آئینہ ہے اس کے یہاں عشق کی جذباتیت کے ساتھ "انا" کی [illegible]

[illegible] غالب کے فن کا سب سے حیات افروز پہلو ہے۔ غالب [illegible]

[illegible] کی شہادت دیتی ہیں، [illegible]



عام انسان ، شاید اسی لئے لوگ اُس کے خلوص اور اُس کے اخلاقی کردار کی سلامتی پر شک کرتے ہیں۔ اور یہ بھول جاتے ہیں کہ ایک ٹوٹا ہوا دل، ایک مضمحل روح، ایک کھویا ہوا انسان اپنی تمناؤں کی دھنک کے سات رنگوں میں خود کو الجھا دیا جاتا ہے اور ایک لمحۂ بے خودی تلاش کرتا ہے یا بھول کر قوسِ قزح کا ہر رنگ عارضی ہوتا ہے اپنے شہرِ آرزو ہونے کا خود غالب نے اعتراف کیا ہے ؎

اب میں ہوں اور ماتمِ یک شہرِ آرزو
توڑا جو تو نے آئینہ تمثال دار تھا

غالب کے وہ اشعار جن میں فرارِ حیات کی کیفیت ملتی ہے، بہت مشہور ہیں۔ ملاحظہ ہوں ؎

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار
اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

ان اشعار میں دنیا سے زیادہ اہلِ دنیا سے گریز کا جذبہ پیش کیا گیا ہے۔ ہم سخن، ہم زباں، ہمسایہ، پاسباں، تیماردار اور نوحہ خواں، یہی وہ حقیقتیں تھیں جن کی تلاش میں غالب عمر بھر سرگرداں رہا۔ اُس کی حیات، اُس کی شاعری اور اُس کی شخصیت واضح اعلان ہے کہ غالب کو کوئی بھی اپنا نہ مل سکا، جو اُسے سمجھ سکتا اور اُس سے اُس کے اندر کی باتیں کرتا۔ وہ اپنوں میں گھرا ہوا بھی ہمیشہ تنہائی کی آگ میں سُلگتا رہا۔ یہ تو ہر اُس فرد کا المیہ ہے جس کے یہاں خلوص کی انتہا اور اعتماد کی بیکرانی ہوتی ہے لیکن اسی کی وجہ لوگ غالب کی شخصیت کے اُس گوشے میں تلاش کرتے ہیں جہاں "انا" بہادر گریں ہوتی ہے حالانکہ یہ انا کی بات نہیں انا تو دراصل خود شناسی ہے، جس میں خود پرستی کا بھی ہلکا سا رنگ شامل ہوتا ہے۔ لیکن جب یہی انا مجروح اور برگشتہ ہو جاتی ہے تو اس میں ایسی ابریت آ جاتی ہے کہ انسان وہ سب کچھ کر گذرتا ہے، جو وہ خود سوچ بھی نہیں سکتا۔ حد یہ ہے کہ اکثر ایسی بزدل اور خوش فہم شخصیتیں دوسروں کا خون چوس کر اپنے بھی دامن پہ قے کر کے گل بوٹے بناتی ہیں اور خوش ہو لیتی ہیں۔ اور میرا خیال ہے جس انسان میں خود غرضی، خود پرستی اور خوش فہمی کا جذبہ اخلاق، ایثار اور بُردباری پر حاوی ہو جائے اُس کی انسانیت مر جاتی ہے۔ پھر نہ وہ مخلص انسان رہتا ہے اور نہ اچھا فنکار۔ لیکن غالب کی انا مجروح نہیں۔ اس میں نہ اقرار کی غیر اخلاقی تلملاہٹ ہے نہ خود پرستی کا وہ نشہ جو دراصل احساسِ کمتری کا ردِ عمل ہوتا ہے۔ اس کی تمناؤں کی "ہم سخنی" سے ابتدا ہوتی ہے اور "نوحہ خوانی" پر انتہا ہو جاتی ہے۔ یہ دونوں سرحدیں اور اس بیچ کی ساری منزلیں فطری اور صحت مند ہیں اپنائیت، خلوص اور دوستی کی تمنا کتنی معصوم ہوتی ہے، یہ کون نہیں جانتا ہم ہر روز اپنوں اور بیگانوں میں گھرے ہوتے ہیں۔ ان سب کے پیار اور ان سب کے لئے ایثار کے بیچ زندگی کے شب و روز کا کارواں گزرتا ہے لیکن اس کے باوجود اگر ہم غور کریں تو اندازہ ہوگا اُس ان کہی کا، جو ہزار گفتگو کے بعد بھی اپنی جگہ قائم رہتی ہے اور اُس آگہی کا جو اپنے لئے دوسروں کے اندر کبھی محسوس نہ ہو سکی۔ اُس خلوص کا جس کا یقین سائے کی طرح پاس سے آ کے گزر گیا جس کو پکڑا نہ جا سکے، چھو کے دیکھا نہ جا سکے۔ غالب کا المیہ بھی یہی ہے اُس کے ذہن میں تشکیک ہے، بے یقینی ہے، جذبے کی نارسائی ہے اور کم و بیش یہی احساسات ہر انسان کی تقدیر ہوتے ہیں۔ فرق صرف طرفِ فکر اور کاسۂ احساس کا ہوتا ہے ورنہ انسان تو جہنم بردوش پیدا ہی ہوتا ہے اور زندگی بھر بیگاریوں کو لئے لئے پھرنے کے بعد انہی شعلوں سے گزر کے اُس اندھیرے میں پہونچ جاتا ہے، جہاں نہ پھول ہیں، نہ شعلے محض انسانی تمناؤں پر اور پیروانِ انسانیت پہ بے حد تیرگیت ہے اور خوابِ آدمیت ہے



[illegible] تصور اور مسکراہٹ ہوتی ہے صدمات و احساسات کی گہری ہلکی دھجیاں ہوتی ہیں۔ غالب نے اسے محسوس کیا تھا۔ سمجھا تھا اور اس کا تجربہ کیا تھا۔ ایک حقیقت ہے اُسے اس قدر جھنجھوڑ ڈالا کہ بیباک اظہار کی دار پر بھی وہ خطر چڑھ گیا۔ دراصل غالب بھی گویا سچ کہہ دے سچ جو ہر عہد میں "دنیا" کا پیالہ رہتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ وہ "دیوتا" نہیں ہے پھر بھی اس کی رہ جھکنے والی غلط افکار نہیں بدل سکا ہے۔ اس نے "دنیا" کا پیالہ اپنے اندر انڈیل لیا ہے۔ سمتاب کا یہ شعر پڑھئے سہ

مجھے اب شے کا غم نہیں، جو ملال ہے تو بس اتنا ہے
ترے دل پر سختی گزری ہے مگر میں قریب تر نہیں

[illegible] ایک ہی سنگ سے اس کی تہ بہ تہ ریزہ ریزہ ہوتی ہیں۔ وہیں اُن کے دل میں شر کا احساس بھی موجود ہے۔ جیسے وہ "رقص شرر" کے غالب مسلسل دیکھنا چاہتا ہے تاکہ تجربوں سے آنسو نکل آئیں۔ [illegible] ہماری معاشرت کا نقص۔ اسے نہیں پیش کیا ہے اس لئے نہیں کہ غالب کے پاس اخلاقی شعور نہ تھا۔ یہ شعور تو تجربے کے ساتھ خود دکھتا ہے۔ ہوتا ہے پھر غالب تو ایک باغی مفکر تھا۔ پھر بھی اُن کے یہاں اخلاقیات کی صداقت نہیں تھی۔ اس کی وجہ اندر کی وہ تنہائی ہے جو تنہا رہتے ہوئے بھی سکون نہیں دے سکتی سہ

سب توڑ دیں زنجیریں اک رشتہ بھی نہیں رکھا کوئی
کیوں تنہا رہ کر آخر ہم دنیا میں گھر سے نکلتے ہیں

اور یہ دنیا میں گھرے رہنے کی تنہائی ہے جو اندر کی تنہائی کو ہر وقت سلگائے رکھتی ہے اور وہ خود اپنے بسی پر تڑپ کے رہ جاتا ہے۔ بقول عالی سہ

ہائے یہ اندر کی تنہائی جس کے لئے ہم چھوڑ آئے
تیرے شہر اور تیرے قریے اور اپنے ویرانے بھی

غالب یوں تو اسی شہر اور اسی قریے میں رہا مگر اس کا ذہن بہت دور تھا۔ اس نے ویرانے بھی تج دیئے تھے۔ یہ دوہری کشاکش ہی اس کی زندگی تھی اور یہی شاعری ہے۔ اس کے باوجود وہ انسانیت کے امکانات سے ناامید نہ تھا اسی لئے اس کی نظروں نے جہاں قابل تلافی اور ناقابلِ برداشت انسانی خامیوں کو حدت سے محسوس کیا اور یہ سمجھا کہ یہ خامیاں دور کی جاسکتی ہیں اور انھیں بنیادوں پر انسانیت کا محل تعمیر کیا جاسکتا ہے۔ اُن کی طرف اشارہ کئے بغیر نہ رہ سکا ہے۔ یہ اشعار پڑھئے جن میں اس کے احساس کی بے بسی ہے وعظ کا ابھار نہیں۔

اور یہ نظریے کا خود پرستانہ جواز سہ

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

نہ سنو گر برا کہے کوئی
نہ کہو گر برا کرے کوئی
روک لو گر غلط چلے کوئی
بخش دو گر خطا کرے کوئی
ہاں بھلا کر ترا بھلا ہوگا
اور درویش کی صدا کیا ہے

اور مایوسی کے ساتھ یہ شعر سہ

جب توقع ہی اٹھ گئی غالب
کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی



ابنِ مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

یہ یقیں کہ ؎

رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

انھیں غور سے پڑھیئے تو اس کشاکش کا اندازہ ہوگا۔ یہ اعتبار۔ یہ صلابت، یہ کردار کی گہرائی یہ خاموشی۔ یہ سچائی اور یہ نظریاتی استحکام غالب کا سب سے بڑا سرمایہ ہے اور جب میں ان ساری باتوں پر غور کرتی ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ غالب ہی نسوانی طبقے کا سب سے بڑا نباض اور صنفِ نازک کی نفسیات کا سب سے عظیم عکاس تھا وہ زندگی کے ٹھہرے ہوئے مقام، اور درمیانی وقفہ یہ بھی رہبری کرتا ہے، جہاں ذہن تھا ہوا ختم ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے اور وہ رنگین چھلی زندگی کے اُن لمحوں میں بھی مسیحائی کرتا ہے جہاں زندگی کے پاؤں شل ہوئے جاتے ہیں، اور گھٹ گھٹ کے آگے بڑھتی ہے۔ جب غالب یہ کہتا ہے ؎

گھر میں کیا تھا کہ ترا غم اُسے غارت کرتا
وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرتِ تعمیر سو ہے

تو جیسے اس شعر میں زندگی کے سارے رنگ سمٹ آتے ہیں۔ زندگی کے تفسیرا اور ہلکے رنگ، گہرے سوچ اور چھنتے ہوئے رنگ۔ زندگی کی سیاہی اور راکھ کا اجالا، سبھی کچھ۔ اور میرے خیال میں غالب، حساسات کے سفید رنگوں کا سب سے بڑا مصور رہے۔ اُس نے اس کیفیت کو بڑے سلیقے سے پیش کیا ہے ؎

شکوے کے نام سے بے مہر خفا ہوتا ہے
یہ بھی مت کہہ کہ جو کہیے تو گلا ہوتا ہے

شکوے تھے اتقدر کہ شکایت بھی نہ کی

میرا مطلب اُن اشعار سے نہیں جن میں اُس نے کھلی ہوئی بغاوت کی ہے اور ہر ایک سے دست و گریباں ہوا ہے بلکہ میرا مقصد بے کسی اور اس محرومی سے ہے جو ازلی اور دائمی ہے اور جس سے نجات کہیں بھی نہیں ملتی

اور جب کاغذی پیرہن والوں سے بھری ہوئی اس دنیا میں خود کو تنہا تنہا سی محسوس کرتی ہوں۔ تو مجھے غالب کے اس شعر سے مان کی تھپکیوں جیسا سکون تو نہیں ملتا، لیکن احساسات کا بوجھ ہلکا ضرور ہو جاتا ہے ؎

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

یہ تو ایک حقیقت ہے کہ خواب اور حقیقت کے بیچ آج بھی گہری کھائی ہے۔ فرق یہ ہے کہ پچھلی صدی نے اس پل بنا لیا تھا۔ آج تو وہ پل بھی ٹوٹ چکا ہے۔ اُس میں شگاف پڑ چکے ہیں اور اس ٹوٹتے ہوئے پل پہ قدم رکھتے ہی دل کانپ اُٹھتا ہے۔ دل گھبرا جاتا ہے تو جہاں میتھ نے خواب کو آرزوں کو مقتل بنا لینے کا دستور دیا ہے۔ سردار جعفری محبت جس کو مقتل تمنا کہتا ہے اور قطرہ قطرہ اجڑا ہوا ایسا دیار رکھتا ہے جہاں دفن کو دو گز زمیں بھی اپنی نہیں ہے۔ وہیں غالب ایک رہبر محسوس ہوتا ہے، جو اپنے سلجھے ہوئے ذہن کے اندر دھڑکتے ہوئے تشکیک کے شعلوں کی روشنی میں اُس مستقبل بعید کی رہبری کرتا ہے جو آج گرد و غبار میں اُلجھ گیا ہے اور یہ سچ ہے کہ حیات کے جواہر ریزے اسی گرد و غبار میں پنہاں ہیں۔ کسو لئے سوچا ؎

یہ کیسا عشق جراءت سا تھی کہ ہاتھ کو ہاتھ بھی نہ سوجھے
نظر کا میری تصور نہ یا بدل گیا رنگ روشنی کا
نہ پوچھ یہ راز کیا ہے، بھرم نہ کھل جائے زندگی کا

اور یہ احساس کہ ؎



لیکن غالب کو اِس پیکرِ خاکی کی زندگی کی اصلیت معلوم ہے اس لئے کہ اُس نے ہر وقت اس محشرِ خیال میں، خود محشرِ خیال کی حسرتوں کے ہاتھوں آرزوؤں کو کچلتے اور پامال ہوتے دیکھا تھا جو آرزو کی بکھری ہوئی کو خود نوچ کے پھینکتے اور روندتے ہوئے اُس کرب کو محسوس کیا تھا جو خود پیکر کو خود شکنی پہ مجبور کر دیتی ہے اس لئے کہ وہ خود اس بھری پُری مگر بے حد تنہا اُداس اور ویران دُنیا کے اپنے کا اسیر رہا ہے۔ اُس نے قدم قدم پہ دکھ مصیبت، نارسائی، غم اور بے کسی کا دھواں اُٹھتے ہوئے دیکھا تھا۔ اہلِ اقتدار کی مجروح انا کے ہاتھوں ایک نسل کے مستقبل اور ایک قوم کے وقار کی بربادی کو محسوس کیا تھا اُس نے کرچیات میں ان چھوٹی چھوٹی کنکریوں کے ذریعہ ان کے پیچھے چھپے ہوئے مصوّر کو بھی دیکھے تھے اس لئے کہ وہ خود اسی بھنور میں گھرا ہے اور حیات و موت کے بیچ جنگ ہے شاید اسی لئے وہ کہتا ہے

مدعا محوِ تماشائے شکستِ دل ہے
آئینہ خانے میں کوئی لئے جاتا ہے مجھے

تو اس سچائی سے انکار ممکن ہوتا ہے۔ اور یہ کہ ۔

یا رب ہمیں تو خواب میں بھی مت دکھائیو
وہ محشرِ خیال کہ دنیا کہیں جسے

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

یعنی یہ کہ غالب کے نزدیک انسان اور دُنیا دونوں ہی محشرِ خیال ہیں اور یہ ایک عظیم صداقت کے سوا کچھ اور نہیں۔ انسان اگر محشرِ خیال نہ ہوتا تو دُنیا میں دُکھ نام کی کوئی چیز نہ ہوتی احساس کا جسم ہر خوشی اور ہر لمحۂ انبساط کو جلا کے خاکستر نہ کر دیتا۔ اور زندگی ایک خوشگوار تجربہ ہوتی لیکن یہ سب کچھ بھی نہیں ہے اس لئے کہ انسان محشرِ خیال ہے، شہرِ آرزو ہے اور حقیقت یہ ہے کہ یہ سب نہ ہو تو پھر وہ انسان بھی نہیں رہتا۔ دوسری طرف یہ دُنیا ہے جو اپنی جگہ ایک الگ محشرِ خیال ہے۔ جو ہر قدم پہ ٹکراتی ہے۔ مخالف راستوں کی طرف مُڑتی ہے اور نظریات و احساسات کے آبگینے کو چٹانوں کے حوالے کر کے بے فکری کے ساتھ گنگناتی ہوئی آگے بڑھ جاتی ہے اور میرے خیال میں غالب کے فن میں جو آگہی اور صداقت کے خزانے ہیں وہ دراصل ایسا آئینہ ہے جس میں عہدِ جدید کے ہر فرد کو اپنا عکس دیکھ کے تسکین ہوتی ہے۔ میں تسکین اس لئے کہہ رہی ہوں کہ دوسرے آئینوں میں بھی اصلیت کے جلوے نظر آتے ہیں مگر انسانی ذہن کی بدلتی ہوئی کیفیتوں کا، اور اُس کی گھٹی کیفیت کا جس کا آج کوئی نام نہیں ہے، صرف غالب ہی ساتھ دے سکتا ہے۔ غالب کی غالبیت ایک نفسیاتی مرہم ہے، جو دُکھوں کو ٹھنڈک اور تسکین کی دولت عطا کرتی ہے۔ روح کی گہرائی کا احساس رکھنے والے جانتے ہیں کہ تسکین نہ نشتر میں ہے نہ مرہم آوری میں، نہ الفاظ کی کھوکھلی پھبتیوں میں۔ ایسے ہی دُکھوں کے لئے جو خود محشرِ خیال ہوتے ہیں اور ہر لمحہ ایک اور محشرِ خیال سے دست و گریباں، یہ جذبات و احساسات عام ہیں۔ لیکن جب میں غالب کو پڑھتی ہوں تو مجھے ایسا لگتا ہے جیسے غالب صرف انسانیت ہی کا مسیح ہے۔ غالب ہی اُس پل صراط کا رہبر ہے جس پر صنفِ نازک کا کارواں مشعل بہ دست اور صلیب بر دوش رواں دواں ہوتا ہے۔ اور شاید اسی لئے میں کہتی ہوں اس محشرِ خیال، غالب اور صنفِ نازک میں ایک رشتہ ہے، جو بے حد عظیم ہے اور از حد عمیق بھی!

رفیعہ شبنم عابدی

غالب کی شخصیت، اُس کے مقطعوں میں

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

دنیائے دلِ فانی بھی آب و آتش اور خاک و باد کا جہاں بے ثبات بھی اور زندگی نا سپاس بھی جو دم بھر میں ٹوٹ جاتا ہے مگر وہ لوگ جو موت کو زندگی کے ہاتھوں شکست دے جاتے ہیں، مرنے کے باوجود بھی نہیں مرتے موت اُن کے لئے بقول میر ایک وقفہ ہے ع

یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

وہ مر کے بھی امر ہیں، اُن کی زندگی، اُن کی کاوشیں اور اُن کے خیالات وہ نقش کالحجر ہیں جن کا مٹانا مشکل ہے۔

عہدِ مغلیہ کی دم توڑتی فضا اور برطانوی سامراجیت کے اُبھرتے ہوئے سورج کے ساتھ زندگی کا خیر مقدم کرنے والا اسد اللہ خاں بھی محض "سپہ گر" نہ تھا (حالانکہ سو پشت سے اُس کا پیشۂ آبا سپہ گری چلا آرہا تھا) بلکہ ایسا سخنور تھا جس کے لئے شاعری نہ صرف ذریعۂ عزت و شہرت ہی بلکہ اُس کے نام کو جاوداں کر گئی اور حقائقِ زندگی کا وہ مفکر جس نے اپنے متعلق یہ پیشین گوئی کر دی تھی کہ

کوکبم را در عدم اوجِ قبولی بودہ است
شہرتِ شعرم بگیتی بعد من خواہد شدن

واقعی دنیائے شعر و ادب پر ایسا چھایا کہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غالب ہو گیا اور دنیا اس کا اصلی نام تک بھول گئی۔

غالب کی شاعری عیش و عشرت کی حسین فضاؤں کے دم توڑنے کی کہانی ہونے کے باوجود بہار رُت کے دلکش و شیریں لمحات کے غم لیے کی داستاں بھی ہے۔ غالب نے جس دور میں سانس لی، جس دور میں زندگی کا ایک ایک لمحہ گزارا، جس دور میں حیات کی تلخ آشامیوں کا مقابلہ کیا وہ بڑا ہی سخت کٹھن اور ہمت آزما دور تھا۔ مغلیہ سلطنت کا زوال گویا پوری تہذیب، تمدن اور کلچر کا زوال تھا اور برٹش راج کا اُبھرتا ہوا سورج خطرے کی سرخی کا نشان تھا۔ یہی وہ دور ہے جس نے غالب جیسے خود پسند اور خوددار انسان کو جو درِ کعبہ وا نہ ہونے کی وجہ سے اُلٹا پھر آنے کا قائل ہے، انگریز سامراجیوں کی شان میں قصائد لکھنے پر مجبور کیا اور کلکتہ سے دہلی اور دہلی سے کلکتہ تک کا سفر کروا دیا اور وہ غالب جو ع "دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں" کہتا تھا کسی کے "آستانے" پر اتنا رویا کہ "رنج کا خوگر" ہو گیا اور پکار اُٹھا۔ ع

مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں



اپنے دور کی آزمائشوں سے گزرنے کو تو غالب گزر ہی گیا مگر اُس کی حسین و پُرکشش شخصیت کے لاتعداد پہلو کُچل کے رہ گئے۔ اُس کے قہقہے افسوؤں میں تبدیل ہو گئے مگر پھر بھی اُس کے ہونٹوں پر مُسکراہٹ رہی (چاہے وہ زہر خند ہی)۔ غالب ہنستا رہا اور ہنسی کھول کر ہنستا رہا۔ اور اُس کی اسی خصوصیت نے اُس کی شخصیت کو ناقابلِ فراموش بنا دیا اور اُس کی شاعری ہمیشہ کے لیے زندہ ہو گئی۔

یوں تو غالب کے ہر شعر سے اُس کی شخصیت کے کسی نہ کسی پہلو کا اظہار ہوتا ہے، لیکن غالب کے مقطعے اس کی شخصیت کو اُجاگر کرنے میں بہت مددگار و معاون ثابت ہوتے ہیں۔ بہت کم شاعروں کے مقطعے ایسے ہوں گے جن میں ان کی شخصیت کی جھلکیاں ملتی ہیں ورنہ عام طور پر یا تو لفظی رعایت سے کام لیا جاتا ہے یا پھر تعلّی۔ غالب کے مقطعوں کی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے کہیں بھی رعایت لفظی سے کام نہیں لیا اور نہ اپنے تخلص کا بے جا فائدہ اٹھایا ہے۔ بلکہ اس کا ہر مقطع اس کے قول و فعل، اس کے جذبات و احساسات، اور اس کے عادات و اطوار کا مظہر ہے زندگی کی آزمائشوں سے وہ جب بھی گھبرایا ہے اس نے خود کلامی سے کام لیا ہے اور خود ہی اپنے آپ کو بہلانے کی کوشش کی ہے۔ خود کلامی کی یہ خصوصیت شاید ہی کسی شاعر کے کلام میں اتنی خوبصورتی سے آئی ہو۔ اپنے مقطعوں میں غالب کہیں واعظ سے نوک جھونک کرتا ہوا ملتا ہے، کہیں یار سے چھیڑ چلتی ہے اور کہیں خضر و مسیحا کو نشانہ بنایا جاتا ہے، کہیں کوئی پُر لطف چوٹ ہوتی ہے اور کہیں طفلوں پر سنگ اٹھایا جاتا ہے۔

غالب کون تھا؟ کیا تھا؟ اس کے خیالات کیسے تھے زندگی کو وہ کس زاویہ سے دیکھتا تھا؟ اس کے دل میں کتنے زخم چھپے تھے؟ اس نے کتنے تیر کھائے تھے؟ کتنی ٹھوکریں کھائی تھیں؟۔ اگر یہ سب جاننا ہے تو صرف اس کے مقطعے پڑھ لیجئے۔ غالب کی زندگی کی مکمل تصویر آپ کے سامنے آ جائے گی

ابتدائی زندگی میں تو غالب کی یہ حالت رہی کہ وہ خود بھی نہ جان سکا کہ وہ کون ہے اور شاید یہی غالب کا سب سے بڑا المیہ ہے۔ لیکن اُس کی زندگی کے ساتھ اگر یہ عظیم المیہ پیش نہ آتا تو شاید غالب، غالب نہ ہوتا محض عہدِ مغلیہ کا ایک معمولی سپاہی ہوتا، جس کے ہاتھ میں شمشیر و سناں کی جھنکار تو ملتی ہے مگر "طاؤس و رباب" کی نغمگی سنائی نہ دیتی۔ بہرحال آخر دم تک غالب اپنی ہستی کے متعلق سوچتا رہا۔ اپنے وجود کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا ہے۔ مثلاً ـــــ

ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے غالب　　آخر تو کیا ہے، اے نہیں ہے

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے　　کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

ہوگا کوئی ایسا کہ جو غالب کو نہ جانے　　شاعر تو وہ اچھا ہے پہ بدنام بہت ہے

دیکھا اسد کو خلوت و جلوت میں بارہا　　دیوانہ گر نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں

اسد ہم وہ جنوں جولاں گدائے بے سر و پا ہیں　　کہ ہے سر پنجۂ مژگانِ آہو پشت خار اپنا

اور مختلف انداز سے بعد غالب نے خود ہی اپنے متعلق یہ فیصلہ صادر کر دیا کہ ؎

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

غالب کا یہ فیصلہ بڑا سچا ہے، اپنے متعلق فیصلہ کرنا شاید سب سے مشکل کام ہے، یہ غالب جیسے شخص ہی کی ہمت تھی جو بالاعلان یہ کہہ سکتا۔



یہ محض تعلی نہیں۔ بلکہ حقیقت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غالب صرف خود پسند تھا۔ اُس نے اپنے سے بہتر شعراء کے کمال اقرار کرنے میں بخل سے کام نہیں لیا بلکہ بڑی وسیع القلبی سے ایسی بات کا اقبال کیا ہے۔ مثال کے طور پر اُس کے یہ قطعے دیئے جا سکتے ہیں۔

ریختے کے تمہیں استاد نہیں ہو غالبؔ
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا

غالب اپنا تو عقیدہ ہے بقولِ ناسخؔ　　آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میرؔ نہیں

ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائی غالبؔ　　میرے دعوے پہ یہ حجت ہے کہ مشہور نہیں

غالب نے محض تعلی سے کام لیا ہے اور نہ صرف انکساری دکھائی ہے اور دوسروں کی عظمت کا اعتراف کیا ہے بلکہ اکثر اُس نے اپنا مذاق خود اڑانے کی کوشش بھی کی ہے۔ حالانکہ یہ جذبۂ استہزا زہریلا ہے۔ وہ ہنستا ہے مگر زہریلی ہنسی۔ اُس نے اپنے عیبوں پر خود ہنسنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ عیبوں پر ہنسنے کا یہ انوکھا طریقہ غالب ہی کا حصہ تھا۔ ایک خط میں لکھا ہے "اپنی حالت پر خود ہی ہنستا ہوں جب کوئی کی افتاد پڑتی ہے کہتا ہوں لو غالب کے ایک اور جوتی لگی۔ بہت اتراتا تھا۔ بڑا شاعر سا بنتا تھا" اور یہی بات اُس نے اپنے ان مقطعوں میں بھی کہی ہے

بنا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا　　وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

غالب وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا　　وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

چاہتے ہیں خوبرویوں کو اسدؔ　　آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں　　روئیے زار زار کیا، کیجیے ہائے ہائے کیوں

غالب خدا کرے کہ سوارِ سمندِ ناز　　دیکھوں علی بہادرِ عالی گہر کو میں

اور وقت کی سختی نے غالب کو زندگی کی ہول ناکیوں میں یوں اُلجھائے رکھا کہ "آزادہ رو ہوں" ہونے کے باوجود بھی وہ طلب سے بے نیاز نہ رہ سکا۔ لیکن اُس کی طلب میں بھی ایک حسن ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ غالب کا سا حسنِ طلب بڑے بڑے قصیدہ گو شاعروں کے ہاں بھی نہیں ملتا۔ وہ اپنے حالِ دگرگوں کا نقشہ اپنے ممدوح کو دلا اچھا کھینچتا ہے تو اس طرح ہے ـــ

غالب نہ کر حضور میں تو بار بار عرض
ظاہر ہے تیرا حال سب اُن پر کہے بغیر

غالب کی شخصیت ایک ہمہ گیر شخصیت تھی۔ اُس نے زندگی کو بطریقِ احسن گزارنے کی کوشش ہی نہیں کی بلکہ اُس کی زندگی کا بیشتر حصہ عیش و عشرت میں گزرا۔ نشاط و انبساط کی گھڑیاں گو ایک عرصہ دراز تک رہیں "نقش و نگارِ طاقِ نسیاں" ہو گئیں لیکن "رنگا رنگ بزم آرائیوں" کی یاد اس کے دل سے کبھی محو نہ ہو سکی۔ اس نے دنیا کو ہمیشہ "بازیچۂ اطفال" خیال کیا اور ہر مشکل کو آسان بنانے کی کوشش میں اُس کا سینہ لاکھوں تمناؤں کا زنداں خانہ بن گیا۔

دائم الحبس اس میں ہیں لاکھوں تمنائیں اسدؔ　　جانتے ہیں سینۂ پُرخوں کو زنداں خانہ ہم

[illegible] عشق



غالب نے محبت کی اور ا ہے دل کی گہرائیوں کے ساتھ محبت کی۔ اس کا عشق " افلاطونی عشق " نہیں۔ اس نے محبوب کے ہر خد و خال کو چاہا۔ اس کے سراپا کو سراہا اس کی دید کے لئے یا برسوں تک کے قدم لئے۔ مگر غالب کا محبوب بھی روایتی محبوب تھا۔ ظالم اور جابر بے رحم اور بے وفا، تغافل آشنا اور ستم کار لیکن غالب "رازِ محبت" کے رسوا ہونے کے باوجود اس کے خیال سے کبھی غافل نہیں رہا۔ اس کے محبوب کی پرچھائیاں اس کے شعروں میں عموماً اور اس کے قطعوں میں خصوصاً نظر آتی ہیں۔

طلسمِ جاں ہے غالب اس کی ہر بات ۔ عبارت کیا، اشارت کیا۔ ادا کیا

وہ گل جس گلستاں میں جلوہ فرمائی کرے غالب ۔ چٹکنا غنچۂ گل کا صدائے خندۂ دل ہے

غالب مجھے ہے اس سے ہم آغوشی آرزو ۔ جس کا خیال ہے گلِ جیبِ قبائے گل

غالب تمہیں کہو کہ ملے گا جواب کیا ۔ مانا کہ تم کہا کئے اور وہ سنا کئے

وہ آتا ہے مرے گھر وعدہ کیسا، دیکھنا غالب ۔ نئے فتنوں میں اب چرخِ کہن کی آزمائش ہے

محبوب کے عشق میں غالب اس قدر گرفتار ملا ہو گیا کہ در و دیوار سے رازِ دل کہے اور کبھی کبھی تو سر پھوڑنے تک کی نوبت آ گئی۔

سر پھوڑنا وہ غالبِ شوریدہ حال کا ۔ یاد آ گیا مجھے تری دیوار دیکھ کر

مر گیا پھوڑ کے سر غالبِ وحشی ہے ہے ۔ بیٹھنا اس کا وہ آ کر تری دیوار کے پاس

نہ کہہ کسی سے کہ غالب نہیں زمانے میں ۔ حریفِ رازِ محبت مگر در و دیوار

اور جب در و دیوار سے رازِ دل کہنے پر بھی قناعت نہ ہوئی تو غالب نے ہر عاشق کی طرح "پیام و سلام" کا سلسلہ شروع کیا۔ مگر اس میں بھی کبھی نامے کو طول دے دیا۔ کبھی نامہ بر کے ساتھ ساتھ ہو لیا اور کبھی اس پر رشک بھی کیا

نہ دے نامے کو اتنا طول غالب مختصر لکھ دے ۔ کہ حسرت سنج ہوں عرضِ ستم ہائے جدائی کا

ہوئے کیوں نامہ بر کے ساتھ ساتھ ۔ غالب اپنے خط کو ہم پہنچائیں کیا

گو اسد مسرتِ پیغامِ یار سے ۔ قاصد پہ مجھ کو رشکِ سوال و جواب ہے

غالب کا یہ جذبۂ رشک تو اتنا ابھرا ہے کہ وہ خدا تک پر رشک کر بیٹھتے ہیں۔

قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہم سفر غالب
وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

مگر غالب کی انتہائی محبت کے باوجود اس کے محبوب پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ وعدے تو کرتا رہا مگر وفا کرنا نہیں جانتا تھا اور غالب کی خودداری نے وعدہ خلافی کو گوارا نہ کیا۔



تم ان کے وعدے کا ذکر اُن سے کیوں کرو غالب
یہ کیا کہ تم کہو اور وہ کہیں کہ یاد نہیں

آخر جب کچھ بس نہ چلا تو غالب "وصل و عدے" پر اتر آیا مگر اس کا الزام محبوب کے سر تھوپنا بھی اُسے پسند نہ تھا۔

وصل و حجاب اُس سراپا ناز کا شیوہ نہ تھا
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

اور جب غالب کی "پیش دستی" اپنی انتہائی حدوں تک پہنچ گئی تو جواب میں بطورِ قیمت "جان" طلب کی گئی۔ مگر محبوب کی جانب سے اس کا بھی تقاضہ نہیں ہوا۔ غالب جان گیا کہ

جاں ہے بہائے بوسہ ولے کیوں کہے ابھی
غالب کو جانتا ہے کہ وہ نیم جاں نہیں

آخر معاملہ ہاتھ پاؤں دبانے پر طے ہوگیا۔ اور سہ

اسد خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
کہا جو اُس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے

اور جب نوبت یہاں تک پہنچی تو ناصح سے رہا نہ گیا۔ اس نے غالب کو ہر ممکن طریقے پر عشق سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ مگر

اس فتنہ خُو کے در سے اب اُٹھتے نہیں اسد
اس میں ہمارے سر پہ قیامت ہی کیوں نہ ہو

ناصح نے پھر سمجھایا۔

فائدہ کیا سوچ آخر تو بھی دانا ہے اسد
دوستی ناداں کی ہے جی کا زیاں ہو جائے گا

مگر "جی کا زیاں" اُن کے نزدیک کوئی اہمیت نہ رکھتا تھا وہ تو "خونِ دو عالم" بھی اپنی گردن پر لینے کو تیار تھے۔

اسد بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے
تو مشقِ ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر

اور اتنا بڑا الزام اُس نے محض اک دن کے انتظار میں لیا تھا جب وہ "سب کچھ" اپنے محبوب کے سامنے کہہ سکتا۔

مرے دل میں ہے غالب شوقِ وصل و شکوۂ ہجراں
خدا وہ دن کرے جو اس سے میں یہ بھی کہوں وہ بھی

ناصح کی یاوہ گوئی سے وہ اسی لئے بددل بھی نہیں ہوا اور نہ اُس سے لڑائی کی۔

نہ لڑ ناصح سے غالب کیا ہوا گر اُس نے شدت کی
ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر

غالب بُرا نہ مان جو واعظ بُرا کہے
ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

یہ سب اس لئے ہوا کہ غالب کا نظریۂ عشق بالکل مختلف تھا۔

عشق پر زور نہیں، ہے یہ وہ آتش غالب
جو لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

اور آخر



عشق نے غالب نکما کر دیا ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

اور جب وقت نے جذبۂ عشق کو حقائقِ زندگی کی میزان میں تولنا شروع کیا تو تمام پردے آنکھوں کے سامنے سے ہٹ گئے اور "تماشائے اہلِ کرم" دیکھنے کی غرض سے غالب "فقیروں کا بھیس" بنا کر نکل پڑا۔ لیکن اس کا ذکر آ رہا اس کے بس کی بات یہ تھی۔

دلِ نازک پہ اس کے رحم آتا ہے مجھے غالب
نہ کر سرگرم اس کافر کو الفت آزمانے میں

اور اس "الفت آزمائی" کی خاطر اس نے طعنوں سے کام لینا چاہا۔ مگر محبوب پہ اس کا بھی کوئی اثر نہ ہوا۔

نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے اے غالب
ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو

اور تب زندگی کی تلخیاں حقیقت کا روپ دھار کر اس کے سامنے آ گئیں اور اس کی شخصیت سر پا کرب بن کر رہ گئی۔ اُسے اُس تار گرہ کپڑے کی قسمت "پر بھی افسوس ہوا جس کی قسمت میں "عاشق کا گریباں" ہونا لکھا تھا اور تب وہ ایک چھوٹے سے خواب کے دیکھنے کی ہمت بھی نہ کر سکا۔

لوں دام بختِ خفتہ سے یک خوابِ خوش ولے
غالب یہ خوف ہے کہ کہاں سے ادا کروں

تب پہلی بار غالب کو یہ احساس ہوا کہ ؎

دل دیا جان کے کیوں اُس کو وفادار اسد
غلطی کی کہ جو کافر کو مسلماں سمجھا

اور اس نے سوچا ...

ہے اب اِس معمورہ میں قحطِ غمِ اُلفت اسد
ہم نے یہ مانا کہ دِلّی میں رہیں کھائیں گے کیا

مگر غربت بھی آئے راس نہ آ سکی ما نیوں نے اُسے اتنے غم دیئے تھے کہ وہ دیارِ غیر میں کسی سے کوئی شکایت بھی نہ کر سکا۔

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالب تم کو بے مہریِ یارانِ وطن یاد نہیں

... میں شاں کیا غالب کہ ہو غربت میں قدر بے تکلف ہوں وُہ مُشتِ خس جو گلخن میں نہیں

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالب کہ دل دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دُنیا جل گیا

بیگانگیٔ خلق سے بیدل نہ ہو غالب ... کوئی نہیں تیرا تو مری جان خدا ہے

گر انجمنِ یار کی کیا بات ہے غالب ہم بھی گئے واں اور تری تقدیر کو رو آئے



ہم کہاں کے دانا تھے، کس ہنر میں یکتا تھے ——— بے سبب ہوا غالب دشمن آسماں اپنا

بیدادِ عشق سے نہیں ڈرتا مگر اسد ——— جس دل پہ ناز تھا مجھے، وہ دل نہیں رہا

"عمرِ بیار" کی شدت میں "بے تابیٔ دل" کا یہ حال ہوا کہ "ہر تارِ بستر" اُس کو "خارِ بستر" نظر آنے لگا مگر اب زمانے کے ہاتھوں اُس کے ولولے دم توڑ چکے تھے۔

مارا زمانے نے اسداللہ خاں تمہیں

وہ ولولے کہاں، وہ جوانی کدھر گئی

اللہ ہمیشہ جینے ہنسانے والا یہ فنکار وقت کے ہاتھوں حسرت و یاس کا مرقع بن بیٹھا ہے

ہر رنگ اپنی کچھ اس شکل سے گزری غالب

ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

جو یکیں غالب لائیں سب تمام ——— ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

یاد ہیں غالب تجھے وہ دن کہ وجدِ ذوق میں ——— زخم سے گرتا تو میں پلکوں سے چنتا تھا نمک

بے خودی میں غالب کچھ سمجھ پڑے تو جانوں ——— جب رشتہ بے گرہ تھا ناخن گرہ کشا تھا

تاب لائے ہی بنے گی غالب ——— واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

ہر واقعہ کی سختی اتنی بڑھی کہ پیمانۂ صبر چھلک اُٹھا۔ پھر طوفاں کا آنا لازمی تھا۔

دل میں پھر گریہ نے اک شور اُٹھایا غالب ——— آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا سو طوفاں نکلا

میں نے روکا رات غالب کو وگرنہ دیکھتے ——— اُس کے سیلِ گریہ میں گردوں کفِ سیلاب تھا

بہت تھک کر رہ گیا غالب تو بولے اہلِ جہاں ——— دیکھا اپنا یہ ستیوں کو تم کہو ویراں ہو گئیں

[illegible]

ہم تو سمجھے کہ ملک کہتے ہیں

[illegible]

دھوئے گئی دو ہی کے تعمون غالب ——— [illegible]

آزادہ کاروئی ہم بجز ان ہوا اسد ——— [illegible]



مضمحل ہو گئے قویٰ غالب
وہ عناصر میں اعتدال کہاں

اور غالب کی جواب حالی دیکھ کر کسی غمخوار نے وعدہ کیا۔

[illegible] احوال بیاد [illegible] گے ہم اُس کو
وہ سُن کے بُلائیں یہ اجارہ نہیں کرتے

[illegible]

انتظار میں ہے ہماری جادۂ راہِ فنا غالب
کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

غالب کا حال محبوب کے گوش گزار ہوا تو وہ "زود پشیماں" خود ہی عیادت کو چلا آیا۔ لیکن افسوس ـــــ

مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالب
یار لائے مری بالیں پہ اُسے پر کس وقت

اور بے ساختہ اُس کے رقیبوں نے کہا۔

اسد اللہ خاں تمام ہوا
اے دریغا وہ رند شاہد باز

اس کے غمخواروں نے سوچا۔

مر گیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالب
ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسیٰ نہ ہوا

[illegible]

یہ لاشِ بے کفن اسدِ خستہ جاں کی ہے
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

کسی کے لبوں پر آگیا۔

آ ہی جاتا وہ راہ پر غالب
کوئی دن اور بھی جیے ہوتے

اور ـــــ

اس رنگ سے اٹھائی کل اس نے اسد کی نعش
دشمن بھی جس کو دیکھ کے غمناک ہو گئے

[illegible]اں تو یہ حال ہے کہ ـــ

ہوئی مدت کہ غالب مر گیا پر یاد آتا ہے
وہ ہر اک بات پر کہنا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا

[illegible] ے سو سال ہو رہے مگر اس کی یاد اب بھی ہمارے دلوں میں [illegible]
[illegible] جا یا وہ [illegible] کی شاعری ہے۔ [illegible]





اسد اللہ خاں بھی۔ جس میں زندگی کو "بچوں کا کھیل" سمجھنے والا بوڑھا شاعر بھی ہے اور غمِ ہستی سے گھبرا جانے والا ایک جوان فنکار بھی جو یہ کہتا ہے ـــــ

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

وہ بھی غالب ہے جو بچوں پر سنگ اٹھاتے وقت جسے اپنا سر یاد آیا تھا۔ اور وہ غالب بھی ہے جس کو "فرہاد کی کوہ کنی" منظور رہی اور جو مجنوں کو "سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود" کہتا تھا۔ وہ غالب بھی ہے جس کو "صلائے گل" "ذوقِ تماشا" کہتا تھا اور وہ اسدؔ بھی جو "حسرتِ تعمیر" کی خاک کے پاؤں دھو دھو کر پیتا تھا تاکہ کلام میں "مزہ" پیدا ہو۔ وہ شوخ عاشق بھی ہے جو یار سے محض اس لئے چھیڑ چھاڑ کا قائل ہے کہ اگر وصل نہ ہو تو حسرتِ وصل ہی پر قناعت کر لی جائے جو گوارا اور جنت، خدا اور خانۂ خدا تک پر ہنسنے کا حوصلہ رکھتا تھا اور جو خدا پر اپنے آپ پر لعنت ملامت بھی سمجھتا تھا۔

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالبؔ
شرم تم کو مگر نہیں آتی

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو غالبؔ یہ خیال اچھا

مگر اس کے باوجود بھی غالبؔ عقیدہ کا قائل تھا اور خدا اور اس کے رسول پر بھروسہ رکھتا تھا!

اُن کی امت میں ہوں میں میرے رہیں کیوں کام بند
واسطے جس شہ کے غالبؔ گنبدِ بے در کھلا

مقطعوں میں نہیں وہ غالبؔ بھی نظر آتا ہے، جو ہستی کے فریب میں نہ آ سکا اور جس نے "عالم کو حلقۂ دامِ خیال" سے زیادہ اہمیت نہ دی۔ اور وہ غالبؔ بھی ہے جو بعدِ مرگ بھی "بیکسیٔ عشق" پر اس لئے روتا ہے کہ یہ "سیلابِ بلا" میرے بعد کس کے گھر جائے گا

حقیقت تو یہ ہے کہ غالبؔ کے نزدیک شاعری تفریحِ طبع کے لئے نہ تھی بلکہ اُس کا خیال تھا۔

حسن فروغِ شمعِ سخن دُور ہے اسدؔ
پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی

اور اس "دلِ گداختہ" کے پیدا کرنے میں اُسے نہ جانے کتنی مشکلوں سے گزرنا پڑا تب کہیں جا کے سرِ مقصود اُس کے سامنے آئی اور وہ بڑے فخر سے یہ کہنے کی جرأت کر سکا کہ ـــــ

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے
جو لفظ کہ غالبؔ مرے اشعار میں آئے

غرض کہ غالبؔ کے اشعار "گنجینۂ معنی کا طلسم" صرف اس لئے بن گئے کہ اس میں اُس نے اپنی شخصیت کے ہر خوبصورت اور بدصورت پہلو کو پیش کر دیا۔ اُس کے وجود کا ایک ایک نقش اُس کے مقطعوں میں ابھر آیا اور حقیقت تو یہ ہے کہ غالبؔ نے گھر خاندانی وضعداری، روایات اور ماحول سے متاثر ہو کر عیش و عشرت کی وہ غلط راہیں نہ اپنائی ہوتیں جو ایک آدمی کو مکمل انسان نہیں بننے دیتیں، تو یقیناً وہ اپنے وقت کا بہت بڑا پیغمبر ہوتا۔ لیکن فی الحال تو ہمیں اُسی کے الفاظ میں یہ کہنا پڑتا ہے کہ ـــــ

یہ مسائلِ تصوف، یہ ترا بیان غالبؔ
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

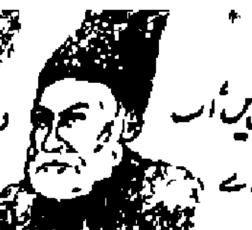

شوخیٔ تحریر

کنھیا لال کپور

غالب کے اڑیں گے پرزے

عالم بہشت میں مرزا غالب اپنے محل میں ایک پرتکلف مسند پر بیٹھے دیوان غالب کی ورق گردانی کر رہے ہیں اچانک باہر سے نعروں کی آواز آتی ہے۔ غالب کے اڑیں گے پرزے ــــ غالب کے اڑیں گے پرزے مرزا گھبرا کر لاحول پڑھتے ہیں اور دہلتے ہیں کہ یہ لوگ جنت میں بھی چین نہیں لینے دیں گے پھر چوبدار کو حکم دیتے ہیں باہر جا کر پتہ لگاؤ یہ لوگ کون ہیں اور کیا چاہتے ہیں۔ چوبدار خبر لاتا ہے کہ 'غالب شکنوں' کا ایک جلوس نکلا ہے جس کی رہنمائی یاس یگانہ اور طباطبائی کر رہے ہیں اور یہ جلوس شہنشاہ سراج الدین ابوظفر کے محل کی جانب بڑھ رہا ہے اتنے میں دیوان غالب کے سینکڑوں بلکہ ہزاروں پرزے فضا میں اڑتے ہوئے مرزا کے محل میں گرتے ہیں وہ ان کو اٹھاتے ہیں اور یہ دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں کہ ان پر ان کے اشعار کے علاوہ کچھ اور بھی لکھا ہے

کریدتے ہو جواب راکھ جستجو کیا ہے جوش محبت سے ہوا مرغی ہوئی جو راکھ کو کرید رہی ہے کریدتے کا لفظ یہاں کتنا غیر مناسب ہے۔ (طباطبائی) تو پھر وہ سر سے گرا ہے کہ اٹھائے نہ بنے واہ صاحب خدا کا شکر کیجئے کہ تو گھر سے گر پڑا ہے۔ اب اسے پھر اٹھا کر گردن تڑوانے کا ارادہ ہے کیا۔ پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا اجی صاحب کس کا دیدۂ تر؟ اپنا؟ ــ رقیب کا؟ ــــ محبوب کا؟ ــــ سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا یہ سر تشدد و تشدد بھی کس کا سر یاد آیا محبوب کا؟ اپنا؟ یا شیخ ابراہیم ذوق کا؟" دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا" کس کو دونوں جہان دے کے کون خوش رہا؟ یہ معمہ ہے یا مصرع؟ شمع تھکتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے یہ بھی خوب رہی! بجھ شمع رہی ہے اور دھواں 'میں'ـــ اٹھ رہا ہے (مجاز رکھنوی) ان کے ناحق ہوئے محتاج حنا میرے بعد کیوں صاحب اگر محروم حنا میرے بعد لکھ دیتے تو کیا حرج تھا یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب خدا لگتی کہیئے اس غزل میں آپ نے تصوف کی کونسی رمز بیان کی ہے اور ہم آپکو کیسے ولی سمجھ لیں کیا تیرہ سخن میں تصوف کھو گیا ہے یا مرکز رسا ہوئے ہیں؟ کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب۔ گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا وہ رقیب ہی کیا جس کے مقدر میں محبوب کی گالیاں ہوں۔ پھر آپ اور رقیب میں فرق ہی کیا رہا۔ میں اور اندیشہ ہائے دور دراز یہ بھی بتا دیا ہوتا وہ اندیشہ ہائے دور دراز کیا ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ آپ کی رکھیل ستواوے میں مصروف ہیں اور آپ انھیں نظر بند دیکھ رہے ہیں۔ آئینے میں کہی "شمار تما اگر نہیں آساں تو سہل ہے" یہ بات کیا ہی۔ اگر آساں نہیں تو سہل کیسے ہے؟ ایسے ہی میں کیسے کھائی اور رہیے۔ کیا کھائی ہے؟ کیا امراؤ بیگم کو طلاق دینے کا ارادہ ہے؟ یا ستم پیشہ ڈومنی کو اغوا کرنا چاہتے ہیں؟ نیند کیوں رات بھر نہیں آتی ظاہر ہے کہ شراب خوری کی وجہ سے آپ کا اعصابی نظام کمزور پڑ گیا ہے۔ نیند کیسے آئے؟ موت آتی ہے پر نہیں آتی جب آتی ہے تو اسے روک کیوں نہیں لیتے؟ لکھتے رہے جنوں کی حکایات خونچکاں "ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے" ۔ ہاتھ قلم ہو جانے کے بعد کیا پیر سے لکھتے رہے (طباطبائی) "بیٹھا رہا اگرچہ اشارے ہوا کئے" کون کس کو اشارے کرتا رہا۔ آپ؟ رقیب؟ یا محبوب؟



غالب اِن گستاخانہ شعروں کو پڑھ کر زیرِ لب مسکراتے ہیں اب وہ حیدر آباد کے بزرگ سے مخاطب ہوتے ہیں "غالب کے نزدیک شاعری ذہنی عیاشی کا بدل ہے انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اُسے اور ایسا ہے میں لکھا عمر بھر وہ غمِ عشق کا رونا روتے رہے۔ کاش انھیں معلوم ہوتا ___ "اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا"

"غالب نے جی بھر کر عشق کیا۔ عموماً خیالی محبوبوں سے۔ جس قدر مے ملی ہر شب پیتے رہے۔ عموماً قرض کی۔ پھر بھی اُنھیں شکایت رہی کہ اُن کے ارمان بہت کم نکلے انشاء اللہ کتنے بے صبر اور ناشکرے تھے وہ"

غالب اِس بزرگ کو پڑھ کر مسکراتے ہیں اور اب ایک بہت بڑا پردہ اٹھاتے ہیں۔

"وہ جسے ہم انگریزی میں اسٹریم آف کانشس نیس (STREAM OF CONSCIOUSNESS) کہتے ہیں مرزا کی تمام غزلوں میں رواں دواں ہے۔ مثال کے طور پر اُن کی مشہور غزل لیجئے جس کا مطلع ہے۔

کوئی اُمید بر نہیں آتی   کوئی صورت نظر نہیں آتی

ظاہر ہے ایّامِ غدر میں وہ چاندنی چوک سے گزر رہے ہیں اور اُنھیں محسوس ہوتا ہے کہ مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد اُس کی کسی اُمید کے بر آنے کا امکان نہیں۔ چاندنی چوک میں وہ سنّاٹا ہے کہ کہیں کوئی اچھی صورت نظر نہیں آ رہی۔ یک لخت اُن کا خیال گوروں کے ہاتھوں ہندوستانیوں کی پکڑ دھکڑ کی طرف لے جاتا ہے، اور وہ پوچھتے ہیں جب مرنا برحق ہے تو پھر گوروں کے ڈر سے نیند کیوں رات بھر نہیں آتی۔ گوروں سے اُن کا تخیّل اپنے شاگردِ رشید مولانا الطاف حسین حالی کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اور وہ حالی کو دل ہی دل میں چوک کر کہتے ہیں "جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد پر طبیعت اِدھر نہیں آتی" پھر وہ سوچتے ہیں یہ حالی بہت بڑا لور ہے لیکن اماؤ بیگم نے مدّت سے جان عذاب میں ڈال رکھی ہے۔ کیوں نہ اُسے ایک دن کھری کھری سنائی جائیں۔ پھر ڈرتے ہیں کہ کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔ اِس لئے فرماتے ہیں "ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں ورنہ کیا بات کر نہیں آتی" چونکہ وہ نشے میں ہیں اِس لئے اُنھیں مطلقاً علم نہیں کہ وہ اِس وقت کہاں ہیں اپنی مضحکہ خیز حالت پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں "ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی کچھ ہماری خبر نہیں آتی" معاً انھیں یاد آتا ہے کہ ظفر نے اُنھیں حج پر ساتھ لے چلنے کی پیش کش کی تھی لیکن وہ رندِ شاہد باز ہیں اِس لئے اُن کا حج قبول نہیں ہوگا کیف افسوس ملتے ہوئے فرماتے ہیں

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالب
شرم تم کو مگر نہیں آتی

اِس غزل کی یہ تاویل پڑھ کر مرزا ایک فلک شگاف قہقہہ لگاتے ہیں لیکن اُس سے اگلا پردہ پڑھ کر اُن کی ہنسی سنجیدگی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ "غالب شاعر نہیں افسانہ نگار تھے۔ اُنھیں مختصر ترین افسانے لکھنے میں کمال حاصل تھا اُن کے کچھ افسانے تو اپنے اختصار اور اپنی افسانویت کے باعث شاہکار کہے جا سکتے ہیں۔ مثلاً

کہاں میخانہ کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

(نوٹ) اِس افسانے کا مرکزی خیال یہ ہے کہ حاجی اور مُلّا شیخ ابراہیم ذوق جس کے زُہد کی دہلی میں دھوم ہے کل چوری چھپے شراب پیتے پکڑے گئے۔

ایک اور افسانے میں اُنھوں نے پاسبان کے ہاتھوں اپنے پٹ جانے کے واقعہ کو یوں بیان کیا ہے۔

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئی
اُٹھا اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

اور مندرجہ ذیل افسانہ تو ایک اچھے خاصے نفسیاتی ناول کا موضوع بن سکتا ہے۔



کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ
ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

ایسے اشعار انھیں سر پیٹنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ "ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں ایک وید مقدس دوسرا دیوانِ غالب۔ مولانا غالب نے اپنے بہترین اشعار میں وید منتروں کی بہت عمدہ تفسیر کی ہے۔ رگ وید میں ایک منتر آتا ہے جس کا مفہوم ہے۔ انسان ہونا ...

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

-مرو وید میں کہا گیا ہے خدا کی ذات کے سوا تمام چیزیں ہیچ اور معدوم ہیں مرزا اس نکتے کو یوں بیان کرتے ہیں۔

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

اتھر وید کے ایک منتر میں تلقین کی گئی ہے کہ یہ دنیا مایا ہے۔ غالب نے اس خیال کا اظہار اس طرح کیا ہے:

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسد
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

مرزا اپنا سر پکڑ کر رہ جاتے ہیں۔ وہ ایک منٹ کے سکوت کے بعد کہتے ہیں "توبہ توبہ غالب اور ویدوں کا مفسر۔ سعید جھوٹ کی اس سے بڑی مثال مشکل سے ملے گی یا خدا اس نے کیا کیا کیوں خواہ مخواہ انھیں کے آگے میں نے بجائی۔ یہ پُرزے پڑھ کر تو یوں محسوس ہوتا ہے۔ جیسے میرا دیوان ایک گورکھ دھندا ہے ارے بھئی میاں مہدی حسین مجروح شیفتہ ہرگوپال تفتہ ذرا ادھر آؤ اور اپنی آنکھوں سے دیکھو میرے دیوان کی کیا گت بنائی جا رہی ہے۔

یک لخت دروازے پر دستک ہوتی ہے اور اندر آنے کی اجازت ملنے پر منشی ہرگوپال تفتہ داخل ہوتے ہیں۔ "آداب عرض پیر و مرشد مبارک ہو۔ بہت بہت مبارک ہو"

"منشی ہرگوپال تفتہ! دیکھ نہیں رہے ہو کہ میرے پُرزے اُڑائے گئے ہیں اور تم مبارکباد پیش کر رہے ہو گویا میرے زخموں پر نمک چھڑک رہے ہو"

"پیر و مرشد! میں جانتا ہوں جن گستاخ ہاتھوں نے آپ کے پُرزے اُڑائے اور یہ بھی جانتا ہوں کہ اُن کا کیا حشر ہوا"

"حشر کیا ہونا تھا سنا ہے وہ شہنشاہ ظفر کے محل میں پہونچے۔ اور انھیں طعنہ دیا کہ انھوں نے مجھ ایسے ہیچداں کو کیوں منہ لگا رکھا تھا"

"گستاخی معاف مرزا صاحب۔ آپ نے غلط سنا جلوس کو شہنشاہ کے محل تک پہونچنے ہی نہیں دیا گیا فرشتوں کی ایک جماعت نے اُسے حراست میں لے لیا!"

"حراست میں لے لیا پھر اسے کہاں لے گئے؟"

"داور محشر کی عدالت میں"

"پھر؟"

"باری تعالیٰ نے جلوس کے رہنماؤں کو سخت ترین سرزنش کرنے کے بعد فرمایا۔ وہ بیان کرو کہ غالب کسی کے حرم میں اٹھی اٹھی کیوں نہ تمہارے پُرزے اڑا دیئے جائیں۔"

"اور بھی کچھ کہا؟"

"ہاں انھوں نے مزید فرمایا غالب کی صد سالہ برسی کے موقع پر جو عالم فانی میں منائی جا رہی ہے ہم حکم دیتے ہیں کہ دار البقا میں دیوانِ غالب سونے کے حروف میں شائع کیا جائے اور ہماری ذاتی لائبریری میں اُسے وہی مقام دیا جائے جو کلیاتِ شیکسپیئر کلیاتِ کالی داس

(باقی صفحہ ۳۹۱ پر دیکھئے)

یوسف ناظم

نئی یادگارِ غالب

نئی یادگارِ غالب لکھنے کی ضرورت یوں پیش آئی کہ اس سو سال کے عرصے میں غالب کے حالاتِ زندگی بہت بدل گئے۔ نہ صرف اُن کے حالاتِ زندگی بدلے بلکہ خاص ایڈیٹروں کی وجہ سے اُن کے کلام میں بھی کافی تبدیلیاں آگئیں۔ ان کے کلام نے اس عرصے میں کئی لوگوں کی شہرت کے دروازے کھول دیئے۔ بعض دیدہ دلیر لوگوں کا تو خیال ہے کہ اس بے روزگاری کے زمانے میں غالب نے بہتوں کو روزگار بھی فراہم کیا۔ کیوں نہ ہو۔

غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں

غالب کا اصل نام شروع ہی سے مرزا اسد اللہ خاں تھا شکر ہے کہ یہ نام خود انھیں بھی پسند تھا ورنہ انھیں اپنا نام بدلنے سے کون روک سکتا تھا اُن کے آگے تو ساری دنیا بازیچۂ اطفال تھی۔ ان کی عرفیت مرزا نوشہ تھی۔ اُن کے لیے یہی عرفیت مناسب تھی کیونکہ اُن کی والدہ کی عرفیت مرزا دولہا تھی — عرفیت بہت ضروری چیز ہے۔ یہ مبالغہ کے طور پر استعمال ہوتی ہے یہ خالص گھریلو چیز ہوتی ہے۔ ہر شریف آدمی کا ایک نہ ایک عرف ہونا ہی چاہیئے۔ آدمی جب عمر رسیدہ ہو جاتا ہے تو اسے عرف سے شرمانے اور جھجکنے لگتا ہے بعض صورتوں میں عرف ہوتے بھی اس قسم کے ہیں کہ آدمی کو شرمانا ہی پڑتا ہے لیکن مرزا غالب کا عرف کبھی اُن کی شرمندگی کا باعث نہیں ہوا۔ وہ پورے ہندوستان میں مرزا نوشہ ہی مشہور تھے جب اسد اللہ خاں بڑے ہوئے اور اِن کی مالی حالت سقیم ہوگئی تو لوگ انھیں نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ کے نام سے جانے لگے۔ غالب حلقۂ دامِ خیال میں تو رہتے ہی تھے لیکن اس حلقے کے علاوہ اُن کا ایک حلقۂ احباب بھی تھا جس میں وہ یوسفِ ہندی کے نام سے مشہور تھے۔ غالب کا یہ نام اُن کے محبوب کو بھی معلوم تھا اور جب غالب نے ایک مرتبہ محبوب کو یوسف کہہ کے مخاطب کیا تو وہ کچھ زیادہ خوش نہیں ہوا۔ بلکہ اُسے قدرے ناگوار ہی گذرا۔

یوسف اُس کو کہوں اور کچھ نہ کہے خیر ہوئی
گر بگڑ بیٹھے تو میں لائقِ تعزیر بھی تھا

یہ کون سا عشق ہے کہ عاشق، محبوب کو اپنے ہی نام سے مخاطب کرے۔ غالب کے یہ سارے نام اُن کی بدنامی کے لیے بہت کافی تھے، اسی لیے وہ شاعر تو اچھے ہیں پہ بدنام بہت ہیں۔

غالب کے دو تخلص تھے۔ اُس زمانے میں دو تخلصوں کا رواج عام تھا۔ ملک میں شاعر کم اور تخلص زیادہ تھے۔ آج معاملہ برعکس ہے۔ ایک ہی تخلص کے کئی کئی شاعر ایک ہی مشاعرے میں موجود رہتے ہیں۔ اور انھیں [illegible] اپنے نام سے شناخت کرنا پڑتا ہے۔ بعض وقت



ایسا ہوتا ہے کہ ایک دوسرا ایک نام پکارتا ہے اور ایک دم میں شاعر مالک کی طرف لپکتے ہیں۔ ان میں سے دو کو مشکل سے تھاما جاتا ہے۔ اُس زمانے میں دو تخلص اس لئے بھی ضروری تھے کہ ایک شاعر دو زبانوں میں شاعری کرتا تھا۔ مرزا نوشہ نے بھی اسی لئے دو تخلص رکھے تھے۔ غالب فارسی کے لئے اور اسد ریختے کے لئے۔ مرزا نوشہ نے اہلِ فارس کی ناقدری کی وجہ سے غالب والا تخلص بھی ریختے میں منتقل کر دیا۔ اُس زمانے میں اُردو کو ریختہ کہا جاتا تھا حالانکہ یہ ریختہ تو اب ہوئی ہے۔

غالب نے اُردو اور فارسی شاعری کے لئے کوئی ٹائم ٹیبل نہیں بنایا تھا۔ اور اُن کے علیحدہ علیحدہ گھنٹے نہیں مقرر کئے تھے۔ وہ ایک ہی وقت میں اُردو اور فارسی شعر کہتے اور ایک ہی زبان میں گرہیں ڈالتے تھے اسی بد انتظامی کی وجہ سے اُن کے اکثر فارسی اشعار اُردو میں آگئے ہیں مثلاً

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا ... (شمار سبحہ مرغوبِ بتِ مشکل نظر آیا   تماشائے بیک کف بردنِ صد دل پسند آیا)

اگر مرزا نوشہ اُردو اور فارسی اشعار کے لئے علیحدہ علیحدہ اوزار استعمال فرماتے تو یہ صورتِ حال نہ پیدا ہوتی۔ آگے چل کر جب شیفتہ نے اُن کا کلام مرتب کیا۔ تو انہیں وہی تکلیف ہوئی جو فرہاد کو جوئے شیر لانے میں ہوئی تھی ـــ فرہاد کے ذکر پر ہمیں یاد آیا کہ غالب، فرہاد کو کچھ زیادہ پسند نہیں فرماتے تھے۔ انہیں اس کا کام کرنا بالکل پسند نہیں تھا۔

عشق و مزدوریِ عشرت گہِ خسرو کیا خوب   ہم کو تسلیم نکو نامیِ فرہاد نہیں

ہاں قیس پر البتہ وہ فدا فدا تھے۔

جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار   صحرا مگر بہ تنگیِ چشمِ حسود تھا

فرہاد کی مذمت میں اور بھی کئی شعر کہے ہیں جو تاہے۔ بعض بلکہ ایسے ہی کہتے ہیں۔

غالب بڑے من کار تھے اس لئے وہ ہر تصویر میں مختلف نظر آتے ہیں۔ اصل میں وہ اپنی کلاہ، قیمتی عبا اور حقے کی نے سے پہچانے جاتے ہیں۔ اُن کی تصویروں میں یہی تین چیزیں اصلی ہیں باقی ساری چیزوں میں کتابت کی غلطیاں ہیں۔ ایک تصویر میں تو کتابت کی غلطی سے ایک عدد گاؤ تکیہ بھی موجود ہو گیا ہے حالانکہ گاؤ تکیہ سے لگ کر تصویر کھچوانے کا نادر مضمون غالب کے خیال میں کبھی نہیں آیا۔ یوں عیب سے کئی مضامین اُن کے خیال میں آئے گا ؤ تکیہ والی تصویر کسی مصور نے غالباً اُن کی وہ غزل پڑھ کر بنائی ہوگی جس کی ردیف تکیہ ہے۔ اچھا ہوا کہ مصور کی نظر سے غالب وہ تصویر نہیں گذری جس کی ردیف بستر ہے ورنہ غالب بستر پر بیٹھے نظر آتے۔

غالب ترکی النسل تھے۔ اسی لئے ہر کسی کو ترکی بہ ترکی جواب دیتے تھے۔ جب کوئی اُن سے کہتا، قبلہ آپ کا کلام ہماری سمجھ میں نہیں آتا تو غالب فوراً جواب دیتے۔

جی ہاں" مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا"

غالب کے بزرگوں نے اُن کی شاعری کے بارے میں کبھی باز پرس نہیں کی اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ غالب نے اپنی ننھیال میں پرورش پائی اور ننھیال میں لوگ نواسوں کو وہی آزادی حاصل ہوتی ہے جو گھر داماد وں کو سسرال میں حاصل ہوتی ہے۔ اس لئے غالب سے اُن کے بزرگوں نے کبھی نہیں کہا کہ میاں تلوار اٹھاؤ اور قلم رکھو غالب بے تکلفی سے شاعری کرتے رہے۔ انہیں مشکل اور ادق اشعار کہنے کا بہت شوق تھا۔ وہ عادتاً جو کچھ کر دیا ری طرح کم اشعار کہتے اور خوش ہوا کرتے تھے۔ دل میں کہتے دیکھتا ہوں لوگ کیسے میرے شعر کا مطلب سمجھتے ہیں۔ لیکن غالب بنا تو ہی رقم دل بھی تھے اس لئے انھوں نے سیدھی سادی اُردو میں بھی اشعار کہے ہیں۔ لیکن یہاں بھی اس کی احتیاط رکھی ہے کہ مطلب مشکل ہی سے سمجھ میں آئے۔

غالب سیدھی سادی شعر کہنے سے تھک جاتے خط لکھا کرتے ایک دن میں ایک ہی شخص کو دو دو خط لکھنے سے بھی گریز نہیں کرتے تھے محکمۂ ڈاک والوں سے کافی فائدہ تھا خط لکھنے کی انھیں اتنی مشق ہو گئی تھی کہ وہ لوگوں کو مشورہ دیتے تھے کہ

گر لکھوائے کوئی اس کو خط تو ہم سے لکھوائے   ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے۔



غالب آگرے میں پیدا ہوئے کیونکہ اُس زمانے کا یہی دستور تھا۔ غالب کی اہلیہ مرضی دلّی میں پیدا ہوئی تھیں بہرحال اُن کی ساری زندگی دلّی ہی میں گذری جو کہ انھیں پوری دلّی دیکھی تھی اسلئے انھوں نے اپنا ذاتی مکان نہیں بنوایا۔ ذاتی مکان ہو لیتے تو انکے سارے کوچوں اور محلوں میں کیسے رہتے کلے صاحب کا مکان، کوچہ بلّی ماراں، قاسم جان کی گلی اور حد معلوم کون کون سے کوچے غالب کا مسکن رہے۔ بغیر گھومے پورا شہر دیکھنے کا اس سے آسان طریقہ کسی اور شاعر کے ذہن میں نہیں آیا۔ غالب بڑا نکتہ رس دماغ رکھتے تھے۔

دلّی کے علاوہ غالب کو کلکتہ بھی پسند تھا اور شاید غالب ہی پہلے شاعر ہیں جنھوں نے کلکتہ دیکھا۔ سوداؔ، مصحفیؔ، ذوقؔ وغیرہ کو یہ موقعہ نہیں ملا۔ اس حیثیت سے بھی غالب کو قابلِ ذکر اہمیت حاصل ہے۔ کلکتہ کی نازنینوں کا ذکر اس سے پہلے اُردو شاعری میں کبھی نہیں ہوا تھا۔ غالب ہی نے اُردو والوں کو اِن سے متعارف کیا۔

کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں
اک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے
وہ سبزہ زار ہائے مطرّا کہ ہے غضب
وہ نازنیں بتانِ خود آرا کہ ہائے ہائے

کلکتہ کو تجارتی منڈی بنانے میں غالب کے اِن اشعار کو بھی دخل ہے۔

غالب شاعر تو غیر معمولی تھے ہی لیکن اس کے علاوہ وہ لڈو اور گیمس کے بھی بڑے ماہرین میں سے تھے۔ چوسر اور شطرنج میں اُن کا جواب نہیں تھا۔ یہ دونوں کھیل وہ ہمیشہ بائیں ہاتھ سے کھیلتے تھے، دایاں ہاتھ تو انھوں نے صرف خط لکھنے کے لئے رکھ چھوڑا تھا۔ جب تک وہ آگرے میں رہے منشی مسی دھر سے ہمیشہ اُن کا چوسر میں معرکہ رہا۔ چوسر اور شطرنج کے علاوہ غالب نے میدانی کھیلوں میں بھی نمایاں حصہ لیا۔ اور راجہ بلوان داس کی کئی پتنگیں کاٹ کے رکھ دیں۔ راجہ بلوان داس گھر کے رئیس تھے اور اعلیٰ سے اعلیٰ مانجا کنکوا کے رکھ سکتے تھے لیکن پتنگ صرف مانجے سے نہیں کٹا کرتی۔ غالب کے ہاتھ کی بات اُن میں نہیں آئی غالب رکھتے بھی عقابی نگاہ تھے اور آسمان کو سجدۂ مور سے زیادہ وقعت نہیں دیتے تھے۔

کیا تنگ ہم ستم زدگاں کا جہان ہے
جس میں کہ ایک بیضۂ مور آسمان ہے

بعض وقت البتہ آسمان انھیں زیادہ بڑا نظر آیا

آسماں بیضۂ قمری نظر آتا ہے مجھے

غالب کا یہ نقطۂ نظر پتنگ لڑانے میں بہت کام آیا اور راجہ بلوان داس کی ایک نہ چلی۔

غالب غذا کے معاملے میں کافی نفاست پسند تھے۔ طبعاً اور عملاً نان ویجیٹرین تھے لیکن چنا بھی بڑے شوق سے کھاتے تھے۔ اُن کے ہر کھانے میں چنا ضرور ہوا کرتا تھا۔ دال اور بیسن کی پھلی بھی اُن کی پسندیدہ چیزیں تھیں۔ بادشاہ سلامت کو اُن کی پسند کا علم تھا اور اکثر و بیشتر دال انھیں بطور تحفہ بھیجی جاتی تھی۔

بھیجی ہے جو مجھ کو شاہِ جمجاہ نے دال ... ہے لطف و عنایاتِ شہنشاہ پہ دال
یہ شاہ پسند دال بے بحث و جدال ... ہے دولت و دین و دانش و داد کی دال

اپنے ایک مصرعہ میں انھوں نے اتنی دالیں جمع کر دی ہیں کہ کسی کے گلائے نہ گلیں

بیسن کی پھلی کا ساگ بھی غالب کے لئے بڑی کشش رکھتا تھا۔ اُس زمانے میں بیسن کی پھلی ہوتی بھی بڑی طرح دار تھی۔ دیکھنے میں طرح دار پھلی



نظر آتی اور کھانے میں حلوۂ تر ہی معلوم ہوتی تھی۔

ان سیموں کے بیجوں کو کوئی کیا جانے — بھیجے ہیں جو ارمغاں شہِ والا نے
گن کر دیویں گے ہم دعائیں سو بار — فیروزہ کی تسبیح کے ہیں یہ دانے

غالب کیرالا یا آندھرا کے نہیں تھے اس لئے انھیں چاولوں سے کچھ زیادہ رغبت نہیں تھی۔ وہ روٹی بڑی شوق سے کھاتے تھے بالخصوص بیسنی روٹی انھیں زیادہ پسند آتی تھی کیونکہ بیسنی روٹی کھانے کے بعد نیند زیادہ آتی ہے۔

اُن کے گھر میں تو بیسنی روٹی اکثر پکتی ہی تھی لیکن شاہی مطبخ سے جو روٹی انھیں تحفے میں آتی تھی وہ بڑی خستہ ہوتی تھی۔

نہ پوچھ اس کی حقیقت حضورِ والا نے — مجھے جو بھیجی ہے بیسن کی روغنی روٹی
نہ کھاتے گیہوں، نکلتے نہ خلد سے باہر — جو کھاتے حضرتِ آدم یہ بیسنی روٹی

رہا میوہ تو میووں میں غالب کو سب سے زیادہ آم پسند تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آگے چل کر وہ عام پسند شاعر ہوئے۔ آموں سے انھیں رغبت ہی نہیں عقیدت بھی تھی اور وہ دل سے اس بات کے قائل تھے کہ آدمی جیسی مخلوق اس قدر ارفع و اعلیٰ قسم کا میوہ پیدا کر سکتی ہی نہیں۔

یا لگا کر خضر نے شاخِ نبات — مدتوں تک دیا ہے آبِ حیات
تب ہوا ہے ثمر فشاں یہ نخل — ہم کہاں ورنہ اور کہاں یہ نخل

غالب لباس کے معاملے میں بھی بڑے چوکنے رہتے تھے۔ ایک تو وہ خود خوبصورت آدمی تھے اس پر اُن کا نفیس لباس، معلوم ہوتا تھا

تھے ۔ اسد اللہ خاں قیامت ہے

وہ کشیدہ قامت تھے اسی لئے وہ کسی شاعر سے دکھتے نہیں۔ اُن کا چہرہ کتابی تھا اور صاف معلوم ہوتا تھا کہ نہ صرف انھوں نے کئی کتابیں پڑھیں بلکہ کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں ـــ ہمارا مشاہدہ ہے کہ جو لوگ بہت زیادہ کتابیں پڑھتے ہیں اُن کا چہرہ لائبریری کا ہو جاتا ہے ـــ

غالب صاحب کا بدن دُہرا تھا اسی لئے وہ نہ صرف دو زبانوں میں شعر کہتے تھے بلکہ نظم اور نثر دونوں اصنافِ ادب پر قدرت رکھتے تھے۔ جامہ واری اچکن اور مشروع کا تنگ مُہری کا پاجامہ پہنتے تھے۔ مشروع کے پاجاموں کی بات سن کر ہماری سمجھ میں آتا ہے کہ اُس زمانے کے لوگ کیوں "باغ و بہار" ہوتے تھے۔ قیاس کہتا ہے غالب ہی کے وقت میں مشروع کے پاجاموں کا رواج کم ہوتا جا رہا تھا یعنی بہار رخصت ہو رہی تھی۔ غالب نے اسی بات کی طرف یوں اشارہ کیا ہے۔

اے عندلیب وقتِ وداعِ بہار ہے

بعد میں خود غالب نے بھی سفید پاجامے پہنے پر خود کو یہ کہہ کر آمادہ کر لیا کہ

اے عندلیب چل کہ چلے دن بہار کے

غالب کے لباس کا سب سے شاندار حصہ اُن کی ٹوپی تھی۔ ٹوپی کے معاملے میں بھی غالب نے اپنا انفرادی رنگ برقرار رکھا۔ اردو کے کسی اور شاعر نے اتنی خوش وضع اور بلند و بالا ٹوپی استعمال نہیں کی۔ سودا اور ذوق تو شملہ باندھتے تھے۔ ناسخ ننگے سر رہتے تھے۔ انشاء اپنے مزاج کے مطابق چوگوشیہ ٹوپی پہنتے تھے۔ مرزا مظہر جانِ جاناں کشتی نما کارچوبی ٹوپی پہنا کرتے تھے لیکن مرزا غالب کی ٹوپی سیاہ تھی اور یہ انہی کے سر پہ زیب بھی دیتی تھی۔ اس ٹوپی کی نقل جس نے بھی کرنی چاہی خود اُس کے سر سے اُس کی اپنی ٹوپی بھی اتر گئی۔

اُس زمانے میں جوتوں کا رواج نہیں تھا اور عام طور پر لوگ جوتیاں ہی پہنا کرتے تھے یہی وجہ ہے کہ اردو میں جوتیاں چٹخانا، جوتیاں سیدھی کرنا، جوتیوں میں دال بٹنا وغیرہ محاورے پائے جاتے ہیں۔ (ڈھونڈے سے بھی جوتوں کا ذکر نہیں ملتا) غالب بھی جوتی ہی پہنا کرتے تھے جو ذرا نوک دار ہوتی تھی ـــ غالب کی کون سی ادا نکیلی نہیں تھی۔

غالب کے حالاتِ زندگی کے بارے میں آخری اہم اطلاع آپ کو یہ دی ہے کہ غالب مسّی بھی لگاتے تھے۔ اب وہ مسّی کیوں لگاتے تھے، یہ آپ معلوم کیجئے۔"

فکر تونسوی

غالب بنام فکر

شنبہ ۱۵ - دسمبر۔ فکر میاں! ہم تو تمہیں فکرِ رسا سمجھتے تھے، لیکن تم ہونق نکلے۔ ہماری سمجھ میں غلطی تھی تم میں نہیں۔ عزیزِ من! یہ سمجھ کر تمہیں خبر دے دی کہ ہم دہلی آ رہے ہیں، تم لے اُڑے اور اب خود دیکھتا ہوں ڈاک سے اخبار کے دو تراشے چلے آ رہے ہیں کہ مرزا نوشہ بہ نفسِ نفیس (!) صد سالہ برسی کی نگرانی کریں گے، سو دہلی تشریف لا چکے ہیں۔ تراشے کی تحریر سے یوں مترشح ہے جیسے تمہیں پولس کو اطلاع دینا مطلوب تھا کہ ایک سو سال سے جو فراری تھا، اب خود زیرِ دام آ گیا ہے۔ پکڑ کر بندی خانے لے چلو ___ خیر، ہم بھی کہاں دَبنے والے تھے۔ اعمالی خون اور شراب ناب دونوں بیک وقت رگوں میں دوڑتے ہیں۔ سو ایک مراسلہ لکھا قاطعِ برہان قسم کا اور ہرکارے کے ہاتھ اخبار کو روانہ کر دیا۔ کہ اسد اللہ خاں نامی ایک شخص جھانسی سے دہلی آیا۔ نام کا خان، کام کا مہاجن۔ کھاری باؤلی سے ملاوٹی ہینگ خریدتا اور بھاؤ پوچھتا پھرا۔ بھلا کہاں غالب اور کہاں ہینگ؟ فکر میاں ٹھہرے ایک مسخرے۔ ظرافت کے مارے لکھ دیا کہ غالب آئے ہیں۔ بلیماروں میں قیام رہے گا۔ اے مسخرے! تجھے یہ نہ سوجھا کہ اب پورے سو سال بعد تو وہ ملک الشعراء قرار پایا ہے، اب کیوں بلیماروں میں رہے گا۔ کسی امیر وزیر کا شیش محل اُس پر کیوں وا نہیں ہوگا۔ چنانچہ وہی ہوا۔ لوگوں کے ہجوم نے بلیماروں پر ہلّہ بول دیا۔ سنتا ہوں، لاٹھی چارج بھی ہوا، اور کلوخ اندوزی بھی۔ مگر بلیماروں کے ہر گھر سے کورا جواب ملا کہ ہم غالب نامی کو نہیں جانتے۔ یہاں تو گھڑے کمہار، کچھ بیمار قسم کے طبیب اور کچھ بھٹیارے رہتے ہیں ___ سو میاں! صبح کے اخبار میں ہمارا یہ مراسلہ بھی پڑھ لینا۔ اثر خاطر خواہ ہوگا، اتنا ہمیں یقین ہے۔ سنا ہے، جشن صد سالہ کمیٹی والے ہمارے مزار پر بھی بھٹکتے پھرے کہ شاید گوہرِ مراد یعنی غالب حاصل ہو تو گرفتار کر کے کوتوالی میں دے دیں۔ کہ غالب نہیں ہے بہروپیا ہے، جشنِ غالب فنڈ پر ہاتھ صاف کرنے کی نیت رکھتا ہے۔ مدعا اُن کا یہ تھا کہ ہم خود کیوں نہ ہاتھ صاف کریں۔ میاں فکر سنو، بجا مذمت ہو۔ ہمارا ٹھکانا دہلی میں صرف تمہیں معلوم یا ایک سیٹھ ملاقی رام کہ جس سے ہماری صاحب سلامت تھی۔ فاقہ مستی میں اُس کے سہارے پاؤ بھر شراب اور شوربہ گوشت کی ایک پلیٹ چلتی تھی۔ لہٰذا کسی تیسرے کو ہمارے قیام کی خبر کیوں دو۔ چند دن کے لئے تماشائے اہلِ کرم دیکھنے دو۔ تمہاری صحت اور عقل دونوں کے لئے

دعا کا طالب ___ غالب

ایضاً۔ پنجشنبہ۔ ۱۷ دسمبر



میاں خوش رہو کہ دہلی کہاں سے کہاں پہنچ گئی مگر تم [illegible] رم کی بوتل بھیج کر تم سمجھے کہ یہ خوش رہا اور یہاں یہ شرم کہ کیسے بتائیں کہ اس مادۂ سیاہ کار میں شراب کم اور سیاہ کاری بسیار تھی ۔ رم آہو تو سنا تھا کہ علمائے دہر کا اس پہ اتفاق تھا ، مگر یہ تو آہوئے رمیدہ نکلی ۔ یعنی ادھر اندر گئی ، ادھر لستہ ہرن کی طرح یہ جا ، وہ جا ۔ جیسے ہوا ہی نہیں تھا ۔ بس ہوا تھی کہ دماغ سے پاؤں تک پہنچی اور سرک گئی اور کچھ یوں سرک گئی کہ

" اور آنا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا "

خیر ۔ اس میں نہ تم گردن زدنی ، نہ ہم بے گناہ ۔ ایک اپنی طرف سے انکشاف کیا کہ دہلی میں یہ بدعت عام ہے ۔ دام شراب کے دو ، خالی آب لے لو ۔ فوج کے ٹوٹ جانے سے سول میں دھڑا دھڑ مال آ رہا ہے ۔ اس میں فوج کی کیا تقصیر ۔ رسوائی تو مے گساروں کی ہے کہ ایسے مال کی قبولیت انہی کے دم سے ہے ۔ دو چار قدح خواروں سے گفتگو پر معلوم ہوا کہ مرزا ! معیار مے کہ جسے تم یہی آ کر دیکھو ذکر کیا بہادر شاہ ظفر کے ساتھ ۔ اب تو افلاس کا دور دورہ ہے ، بلکہ افلاس اور مسادرت دونوں کا دور دورہ ہے ۔ دونوں کی ذات کافی گردنی ہے ، اس لئے اگر قدر دانی شعر ملحوظ خاطر ہے تو کسی چور بازاریئے ، کسی رشوت باز ، کسی کوتوال شہر کی بزم میں چلو ، جو مسادرت اور افلاس دونوں کی قبر پہ اپنی دکان کا جھنڈا گاڑے بیٹھا ہے اور بکا تا پھر رہا ہے کہ ہے کوئی مرتی ہوئی تہذیب کا وارث جو ہم سے یہ جھنڈا پگڑی پر خرید لے ۔

فکر میاں جی ! تم مجھ سے دہلی کا حال کیا پوچھو ۔ تمہیں لکھوں تو ڈھونڈو را پیٹ دو گے کہ ایسا غالب کہتا ہے ۔ اس لئے چپ ہوں ۔ ورنہ ہائے کیا دہلی تھی ، بلیماروں سے لال قلعے تک تماشائی فرش راہ بن جاتی تھیں کہ غالب آ رہا ہے ۔ کل جو لال قلعے سے گزر ہوا تو امیون گھول کر پیتی ہوئی ایک پیر تسمہ حسینہ کہ چہرے مہرے سے فرنگی لگتی تھی ، مجھ سے بولی " ہم انڈیا کے کلچر سے لو کرنا مانگتا ۔ ہمیں بتاؤ یہ لو کہاں ملے گا ؟ "

ہم نے از راہ تمسخر کہہ دیا کہ برلا مندر چلی جاؤ ۔ اس کے باہر کھڑی ہو کر جرس پیچو ، ہم اسے خدمت بنی نوع آدم سمجھیں گے ۔ ہماری تہذیب مروت سے بھری ہے ۔ مائدہ اٹھا سکو تو اٹھا لو ۔

میاں فکر ! یہ کہنے کے بعد لال قلعے کی دیوار کے ساتھ سر رکھ کر جو میں زار و قطار رویا ہوں کہ تو ہر راہ گیر یہ سمجھا کہ کوئی رفیوجی ہے ، فریاد کرتا ہے ۔ صرف دو چار کم بخت دہلی ایسے گزرے جو شک کرتے تھے کہ غالب ہے ۔ اس کی اطلاع دہلی کے لاٹ صاحب کو دی چاہیئے ۔ ایک لونڈا ، مشین بھیگنے میں بس دم بھر کی کسر ، ہمارے ارد گرد منڈلانے لگا ۔ پوچھا " صاحب زادے ! ہم میر تقی میر نہیں ہیں اور نہ یہ رونا ہمارے ہجر میں ہے ۔ تم کوچۂ عطاروں کے کوئی لونڈے ہو تو ہمیں اس سے کیا غرض ؟ " بس اکڑ گیا ۔ پھولے ہوئے نتھنوں سے کچھ اس طرح کی آواز آئی " سنو بھوں ! بچھان ! بڑے میاں رنس و مروت کی خبر لو ۔ بدھوؤں کے منہ نہ آؤ ، ہیکڑی نکال دوں گا ۔ سر بازار رسوا کر دوں گا ۔ دہاست کی بوٹی بوٹی نوچ کھاؤں گا " ــــــ ہم سمجھے کوئی جلاد زادہ ہے ۔ تیور ہمارے بھانپ گیا ۔ لیک کر ہماری قبا پکڑ لی ۔ بولا " ہم جلاد نہیں ہیں قبلہ ! اینگری ینگ مین ہیں ۔ پیشے سے رائٹر کہلاتے ہیں ۔ بڑے بڑے جغادری ، مرغ قبلہ نما ہمارے آشیانے میں پڑے تڑپتے ہیں " پوچھا " غالب نامی ایک مرغ تھا ، تمہارے آشیانے میں اس پر کیا گزرتی ہے ؟ " تڑاق سے بولا کہ وہ تو آشیانہ ہی چھوڑ کر فرار ہو گیا ۔ اب صد سالہ جشن غالب میں اس کے خلاف ایک مقالہ پڑھوں گا اور دوسری بار اس کا جنازہ اٹھواؤں گا " ــــــ ہم نے مرحبا کہا ۔ ایک جوتی



بعد میں جانے لوشی اُسے مرحمت کی۔ شکایت کرتا تھا بے چارے پر کیا گزری، لیکن فکر میاں! تاسف کے لونڈوں کے ہتھے چڑھ گیا ہے۔ ہماری ان کی کم ہے۔ بھنگ کا گلاس آٹھ آنے میں آتا ہے۔ دجانے کا ہاتھ ملتا ہوں کہ دہلی کا علم وادب عطاروں سے بچے گی کب تک ___ حظاکیش، غالب۔

الضاً یک شنبہ ۱۹ر دسمبر۔

فکر میاں جی کو گنہگار غالب کا سلام پہنچے۔ ذرا ہمارا استغنا تو دیکھو کہ کل دہلی کے بڑے لاٹ صاحب نے ہماری عزت افزائی کے لئے کار ارسال کی کہ مرزا غالب کو بٹھا کر مزارِ غالب پہ لے چلو، ہم آتے ہیں۔ ادھر ہمیں عزت اور بے عزتی کا فرق پشتوں سے معلوم تھا۔ ڈرائیور سے کہہ دیا، ہم گورے فرنگی سے رہ دیئے، اس کالے فرنگی سے کیا دبیں گے۔ گاڑی مع پیغام لوٹا دی کہ لے جاؤ اور کہو گورنر صاحب! عزت گورنر کی بھی ہوتی ہوگی، مگر شاعر کی زیادہ ہوتی ہے۔ شاعر کی عزت انہیں مقصود تھی تو خود آتے اور احترام سے لے جاتے۔ اب نہیں جائیں گے، کیونکہ پا گئے ہیں کہ شاعری اب ذریعۂ عزت نہیں رہی۔ اب تو صرف شاعری کا مزار ہی مزار ہے۔ باقی رہے نام اللہ کا۔ غالب سے مزارِ غالب کی عزت زیادہ ہے۔ مستورات کی بے حجابی اور بات کی بے حجابی دونوں دیکھتا ہوں اور کڑھتا ہوں۔ اچھا یہ بتاؤ لفٹنٹ گورنر کو ہمارے قیام دہلی کی اطلاع ملے، یہ کیسے ممکن ہوا۔ ضرور تم نے ہم پہنچائی ہوگی۔ میں تجر ممنوعہ تو نہیں لیکن بیچارے گورنر کو ہماری جنت سے نکلنا پڑا، تو اس کی ذمہ داری تم پہ ہے۔ خدا تم سے سمجھے اور گورنر صاحب کی کھوئی ہوئی عزت بحال کرے۔ اس رقعے کا جواب مت بھیجو۔ ہمارے قیام و طعام کا اہتمام کسی اور جگہ پہ ہوگیا ہے ___ تم سے نجات کا طالب، غالب۔

سہ شنبہ، ۲۲ر دسمبر۔

ارے میاں! کل والا رقعہ لکھ کر پچھتا رہا ہوں۔ یوں گھوڑ دہ تمہارے نام نہیں تھا میں اور تم پر شک کروں؟ گردن زدنی۔ راج دربار میں ہماری عزت بڑھے، اسی خاطر تم نے گورنر بہادر تک ہمارے وُرود کی اطلاع بھیج دی قصور تو ہمارا تھا کہ اپنی پرانی وضع نہیں بدل سکے۔ تم ہمارے بارے میں غلط فہمی نکال دو، مگر ایک بات گرہ باندھ لو۔ کہ استغنا سے اب بھی ہاتھ نہیں دھوئیں گے ___ اچھا ایک لطیفہ سنو کہ کل تمام خود بخود اپنے مزار کی طرف کھنچے چلے گئے۔ کار کو چھوڑ کر پا پیادہ۔ تم ہنسو گے، لیکن میاں! اس سے ایک تو استغنا برقرار رہا جو ہمارا اوڑھنا بچھونا ہے۔ دوسرے چھوٹی نمود و نمائش سے بچے کہ راج ورغن ہمارا استقبال کرتے، ہاتھی سونڈ اٹھا کر سلامی دیتے اور کوئی کالا چور آگے بڑھ کر گردن کی گل پوشی کر ڈالتا کہ جیسے قیدی کو زنجیر پہنا دیں ___ مزار پر قوالیاں ہو رہی تھیں قیدی بھی قفس کے ایک گوشے میں کھڑا ہو گیا۔ ایک رسالہ دار، سیاہ فام برعکس نہد نام زنگی کا فور، قسم کا قوال ہماری غزل گا رہا تھا۔ ع

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں

پہلے پہل تو اپنی فہم سے اپنی غزل ہی بالاتر معلوم ہوئی، مگر گوش ہوش لگا کر سنا تو قوال صاحب کچھ یوں لب کشا تھے کہ ع

کچھ حال صاحب میں کچھ لالہ جی میں نمایاں ہو گئیں

سر پیٹ لیا۔ احتجاج کرتے رہنے کہ افشائے راز کا خدشہ تھا۔ ایک مست الست سا انسان قریب سے گذرا قریب تھا انا الحق کا نعرہ لگائے کہ ہم نے جا لیا۔ کیوں صاحب! صورت شکل سے رہی، چال ڈھال سے تماشا



معلوم ہوتے ہو کہ پاؤں میں لغزشِ مستانہ ہے۔ کھایا پیا سب لشب تاو۔ جیب سے شیشے کی ایک صراحی سی نکال کر لہرائی اور بولا کہ ہم غالب کے شاگرد عزیز ہیں۔ ساحر تخلص کرتے ہیں۔ یہ جو سب دیکھتے ہو تصنع ہے فریب ہے۔ امراء اور رؤساء کی دہی عشرت کا سامان ہے۔ غالب حقیقی سے وصال اُن کے نصیب میں کہاں؟ ہم رند ہیں۔ غالب کے حقیقی محرم راز۔ یہ کہا اور تیزی سے مزار غالب کی سفید چادر پر شیشے کی صراحی انڈیل دی اور نعرہ لگایا "اے قبلۂ رندانِ جہاں! ایک عزیز ترین تمنا میں کشید کر کے لایا ہوں، قبولیت مرحمت ہو" ہمارے ہاتھ جھٹ دعا کے لئے اٹھ گئے۔ عرض یہ تھی کہ اے اہلِ عرش اہم نے اپنی طرف سے نذرانہ قبول کیا، تم اس پر تصدیق کی مُہر لگا دو"۔۔۔ ابھی چند ثانیے بھی نہیں گذرے تھے کہ دعا کا اثر سامنے آگیا۔ کوتوالِ شہر نے آگے بڑھ کر اُس مستِ الست کے بیڑیاں ڈال دیں کہ خلل ڈالتا ہے۔ سرکاری کارروائی میں رخنہ تعزیراتِ ہند کے خلاف ہے۔ بڑے وزیر صاحب سخت خفا ہوئے کہ یہ بدکردار سرکار اور غالب دونوں کی رو در روش میں اہانت کرتا ہے ۔۔۔ میاں فکر! اب لو ہماری اس دلی میں یہ کیسے فرشتے آگئے ہیں کہ ناحق پکڑ لیتے ہیں۔ ان گنجے فرشتوں کو ناحق میسر آگئے ہیں تو اپنی چندیا کو لہولہان کریں، دوسروں کے ماتھے کیوں چھیلتے ہیں۔ میں تو کل دہلی چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ ڈرتا ہوں، کوتوالِ شہر سے اپنی دیرینہ عداوت ہے۔ کہیں ہمیں بھی گرفتار نہ کر لے۔ حیلے تراشنے میں ماہر ہے۔ ہر صدی میں بہانے تراشنا اُس کا شیوہ رہا ہے۔ الزام لگا دے گا کہ ڈرائی ڈے پر مے گساری کر رہا تھا۔ حالانکہ دانائے راز نے کہا ہے کہ خود کوتوالِ شہر اور اُس کے حواری ڈرائی ڈے پر سب سے زیادہ مے خواری کے مرتکب ہوتے ہیں لیکن اُن پر ہاتھ کون ڈالے۔ خود ڈالے وہی شاہ کی مصاحبت سے خارج ہے۔ جشنِ غالب مبارک، ہمیں کیا عذر، لیکن ذرا یہ بھی تو سوچو کہ ایک سو سال میں بھی کوئی فرق نہیں پڑا۔ وہی غالب اور کوتوال جو کل تھا سو اب بھی ہے۔ جب تک شعر و ادب پر کوتوالِ شہر کا تسلط رہے گا، ناطقہ سر بگریباں ہی رہے گا اور غالب بار بار دہلی چھوڑ کر فرار ہوتا رہے گا۔ سو ہم تو چلے، تم خوش، تمہارا کوتوال خوش، تمہارا خدا خوش ۔۔۔ سوگواری کا قالب۔ غالب۔ ▲

ہم تخلص و ہمنام

"صاحب قصور تمہارا ہے۔ کیوں ایسے شہر میں رہتے ہو جہاں دوسرا میر مہدی بھی ہو۔ مجھ کو دیکھو کہ میں کب سے دلی میں رہتا ہوں۔ نہ کوئی اپنا ہمنام ہونے دیا نہ کوئی اپنا ہم عرف سے دیا نہ اپنا ہم تخلص ہم پہنچایا۔"

(بنام میر مہدی مجروح)

—— غالب ——

شراب اور گلاب

غذا معمود ہے۔ صبح کو قند اور شیرۂ بادام مقشر، دوپہر کو گوشت کا پانی، سرِ شام تلے ہوئے چار کباب، سوتے وقت پانچ روپیہ بھر شراب اور اسی قدر گلاب۔ خرف ہوں۔ پوچ ہوں۔ عاصی ہوں۔ فاسق ہوں۔ رُوسیاہ ہوں۔ یہ شعر میر تقی کا میرے حسبِ حال ہے ؎

مشہور ہیں عالم میں مگر ہوں بھی کہیں ہم
القصہ نہ درپئے ہو ہمارے کہ نہیں ہم

—— غالب ——

اعجاز رشید مرزا دہلوی

غالب اپنی صد سالہ برسی میں

غالب خود اپنی یاد میں ایک صدی پرانا دیوان بغل میں دبائے ایک بار پھر اس دنیا میں چلے آ رہے ہیں ۔ معتقدین ، مورخین اور معاصرین انکو الوداع الوداع کہنے کے لئے جمع ہیں لیکن کچھ لوگ ہنس رہے ہیں ناراض ہیں کوئی کہہ رہا ہے مرزا تمہارا نیل بگڑ رہا ہے ۔ تو کوئی کہہ رہا ہے اچھا ہے ٹیڑھی پسلی ایک ہو جائے گی کسی نے کہا حد ہے خود دور ہیں نقال ، معاند متعدد بار بار گھر کے لقب دے رہا ہے وہیں تم ہماری رہی سہی عزت بھی گنوائے جا رہے ہو ۔ اور کسی نے غالب کا مصرعہ غالب پر ہی چست کیا ۔ گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا
لیکن غالب اپنی دھن کے پورے سب کی سنتے رہے اور ایک ہی جواب میں سب کو لاجواب کر دیا ۔

در خورِ قہر و غضب جب کوئی ہم سا نہ ہوا
پھر غلط کیا ہے کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا (غالب)

غالب جب فرشِ زمیں پر آئے تو دیکھا کہ دنیا کا نقشہ بدلا ہوا ہے ہر چیز تیز رفتاری سے دوڑے چلی جا رہی ہے اور انسان اس دوڑ میں سب سے آگے ہے ۔ پیچھے مڑ کر دیکھنے کا ہوش نہیں کچھ لوگ ہیں کہ صبح سے شام تک دوڑنے کے باوجود صبح شام نہیں کر پاتے ۔ کچھ لوگ ہیں کہ صبح ان کی ہے شام ان کی ہے ۔ اک خود غرضی ہے اک قیامت ہے ۔ اک ہنگامہ ہے ایک ہڑبونگ ہے کہ مچی ہوئی ہے ۔ خدا کا خوف نہیں ۔ انسان کا خوف ضرور ہے کہ ایک دوسرے کو کھائے جا رہا کسی نہ کسی بات پر کسی نہ کسی نام پر ایک جنون کا طوفان اٹھتا ہے کشت و خون غارت گری کا بازار گرم ہوتا ہے ۔ انسانی تہذیب ننگی ہو جاتی ہے اور ایک وحشی ناچ ناچنے لگتی ہے ۔ انسانی قدریں گر چکی ہیں ۔ انسان سستا ہے ۔ انسانیت نایاب ہے نئے دور نے جہاں اور نئی نئی چیزیں بنائی ہیں وہاں چور بازار اور کالا بازار بھی بنایا ہے ۔ لطف یہ کہ یہ بازار کسی کو نظر نہیں آتا ۔ لیکن دنیا کا کاروبار ان بازاروں میں ہوتا ہے اور خوب ہوتا ہے غالب نے بہت سے بازاروں کے نام دیکھے اور سنے ۔ لیکن چور بازار اور کالا بازار نہ کبھی دیکھا نہ سنا غالب دنیا کا حال خاموشی سے دیکھتے رہے اور سوچتے رہے ۔ الٰہی یہ کیسا زمانہ ہے نئی روشنی میں یہ کیا اندھیر مچا ہے کہ آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھایا جا رہا ہے یہ سب دیکھ کر غالب کو اپنا ایک شعر یاد آیا ۔

بسکہ مشکل ہے ہر اک کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

غالب مکان کے لئے سرگرداں تھے ۔ لوگوں نے بتایا کہ حضرت اس زمانے میں گھر والی مل سکتی ہے لیکن گھر نہیں مل سکتا اور اگر مل سکتا ہے تو سلامی اور پگڑی سے ہی مل سکتا ہے ۔ غالب نے کہا بھائی ہمارے زمانے میں تو ایک ڈھونڈو ہزار گھر ملتے تھے ۔ البتہ گھر والی کے



نئے برسوں جو تیاں توڑ کر، بڑی مشکل ٹکٹ ملیں جا کر صورت نظر آتی تھی اس زمانے کی تو ریت ہی اُٹھ گئی ہے۔ جوں توں کر کے غالب نے بھی جدید دور کی رسم ادا کی اور مکان حاصل کیا۔

ابھی تھوڑا سانس ہی لیا تھا کہ دروازہ پر دستک ہوئی دیکھا تو معلوم ہوا کہ مردم شماری ہو رہی ہے۔ غالب نے کہا بھائی مردم شماری کے بجائے سیلہم مردم آزاری کے علاوہ شمار جمع کرو تو بہتر ہے جیرام تیرہ تالے کے بعد ان سے جان چھوٹی۔ غالب اپنا شعر زیر لب پڑھ ہی رہے تھے۔ سو

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

کہ پھر دستک ہوئی اور ایک تانتا سا بندھ گیا۔ ایک جاتا دوسرا آتا۔ الیکشن کا زمانہ تھا ہر ایک اپنی پارٹی کے اُمیدوار کو ریپبلک قوم قرار دیتا اور غالب کو ووٹ دینے کے لئے مجبور کرتا۔ غالب تنگ آگئے تو آخر کار اُنھوں نے کہا بھائی میں تو کسی کو جانتا بوجھتا نہیں۔ پھر بھلا کس کو ووٹ دوں۔ کون رہبر ہے یا رہزن۔ دل کا بھید تو خدا ہی جانتا ہے کہ کون کس لئے رہبر ہے۔

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک رہرو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں　　(غالب)

شام ہوئی غالب گھر سے نکلے ہی تھے کہ راستہ میں دیکھا ایک جگہ بڑا ہجوم ہے معلوم ہوا سیاسی جلسہ ہو رہا ہے کسی پارٹی کے لیڈر تقریر کرنے والے ہیں۔ غالب بھی تماشہ دیکھنے کے لئے بیٹھ گئے اور دل میں کہتے رہے۔

حسرت نامہ گر آئیں دیدہ و دل فرشِ راہ
کوئی مجھکو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائیں گے کیا

ابھی لیڈر صاحب نے مجمع کو مخاطب ہی کیا تھا کہ ایک ہنگامہ شروع ہوگیا اور بھگدڑ مچ گئی۔ غالب جان بچا کر ایسے بھاگے کہ گھر آکر ہی دم لیا لوگوں سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ یہ ہنگامے تو اس زمانے میں روزمرہ کی زندگی میں شامل ہیں۔ غالب یہاں آکر اب کچھ پچھتا رہے تھے اور سوچ رہے تھے۔

تاب لائے ہی بنے گی غالب
واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

غالب کے آنے کا مقصد ایک اہم ادبی جلسہ اور مشاعرہ میں حصہ لینا تھا مقررہ دن اور وقت پر جب وہاں پہونچے تو دیکھا کہ وہاں بھی ایک ہنگامہ برپا ہے۔ غالب نے سوچا کہ یہ مشاعرہ ہے یا اکھاڑہ۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا ترقی پسند۔ جدت پسند۔ قدامت پسند اور نہ معلوم کونسی کون سی پسند والے دست و گریباں ہیں۔ غالب نے کہا۔ ارے بھئی یہ کیسی پسند ہے کہ ایک دوسرے کے پسند نے سانٹے دے رہے ہیں۔ غالب سے نہ رہا گیا مشکل صاحب صدر تک پہنچے اور اُن سے کچھ کہنے کی اجازت طلب کی۔ غالب کی وضع قطع اور شخصیت دیکھ کر محفل میں سرگوشیاں سی ہونے لگیں پھر جب ایک خاموشی چھا گئی تو غالب مخاطب ہوئے

دوستو! غالب کی رُوح اپنے جسد خاکی میں نہیں۔ لیکن وہ سب کچھ دیکھتی ہے سُنتی ہے اور محسوس کرتی ہے۔ اسی لئے آپ سے ملنے کی ضرورت اور اشتیاق مجھے یہاں لے آیا۔ اور اب جو میں آپ کی محفل میں آیا ہوں تو چاہتا ہوں آپ سے دو دو باتیں کر دوں۔

شعر و ادب کے مسائل اپنے وقت کے لحاظ سے ہر دور میں ہوتے ہیں اس پر بحث و مباحثے بھی ہوتے ہیں مخالفت بھی ہوتی ہے۔ پھبتیاں بھی کسی جاتی ہیں پگڑیاں بھی اُچھلتی ہیں۔ لیکن یوں کیچڑ نہیں اچھالا کرتی۔ ادب کے نام پر بے ادبی پر اتر آنا کچھ شایانِ شان نہیں معلوم ہوتا۔

میں جانتا ہوں جو انتشار آپ کے ذہن میں ہے۔ آپ کی زندگی میں ہے وہی آپ کی محفلوں میں بھی ہو سکتا ہے یہ جتنا نئے



دور کی دین ہے۔ اور اس کی ذمہ داری آپ پر نہیں۔ آج آپ میں سے ہر ایک غیر مطمئن ہے۔ بے چین ہے۔ آپ کو خدا سے شکایت ہے۔ زندگی سے شکایت ہے۔ دنیا سے شکایت ہے۔ یہاں تک کہ خود اپنے آپ سے شکایت ہے اور آپ کا ذہن اور دل و دماغ شکایت سے کچھ اس طرح لبریز ہے۔

پُر ہوں میں شکوے سے یوں راگ سے جیسے باجا
اک ذرا چھیڑیئے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے
(غالب)

آج تقریباً ایک صدی بعد میں دنیا میں آیا ہوں تو دیکھتا ہوں وہی صبح ہے وہی شام ہے وہی زمیں ہے وہی آسماں ہے وہی موسم ہے وہی خزاں و بہار ہے۔ وہی شاعر ہے وہی اس کا احساس ہے۔ ایک طرف وہی عیش و نشاط ہے، دوسری طرف وہی بھوک اور پیاس ہے۔

پہلے ہم بادشاہ وقت کی شان میں قصیدے کہتے تھے۔ اب آپ اپنے لیڈروں اور وزیروں کی شان میں نظمیں کہتے ہیں اور کتابیں لکھتے ہیں۔ پہلے ہمیں خلعت و خطاب اور وظائف ملتے تھے آج آپ کو بھی انعام و اکرام اور خطابات سے نوازا جاتا ہے۔ پہلے بھی حسن و عشق شاعری کا محور تھا اور آج بھی اس سے مفر نہیں۔ پہلے شاعر اپنی وفا کے دعوے، محبوب کی جفا کے شکوے کرتا تھا، جیب و گریباں اور ویرانے کی باتیں کرتا تھا۔ رسوائی اور بدنامی کے باوجود اسے دیدار یار میسر نہ تھا۔ اسے سرفروشی کی تمنا تھی یا خاموشی سے عشق کی آگ میں جل جانے کی آرزو تھی۔ اس وقت محبوب تک پہنچنے اور عشق کی صداقت کے لئے بڑے امتحان تھے۔ جان کی بازی لگانی پڑتی تھی۔ آج کا شاعر کلب اور رقص گاہ کی بات کرتا ہے۔ اسے محبوب کی جفا و وفا کا شکوہ نہیں۔ اسے دنیا کی دوڑ میں جائز حصہ نہ ملنے کا غصہ ہے اور یہ صحیح ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ محبوب تک پہنچنے کے لئے آج بھی ایک امتحان ہے۔ جان کی بازی لگانے کی ضرورت نہیں۔ وفا کے دعوے اور جفا کے شکوے کی ضرورت نہیں۔ ہجر میں تڑپنے اور تارے گننے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ محبوب محل نشیں نہیں موٹر نشیں ہے۔ پردہ نشیں نہیں آزاد ہے۔ سمجھدار ہے۔ وہ چاکِ جیب و گریباں کے بجائے عاشق کی آمدنی دیکھنے کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ عشق کی قدریں بدل گئی ہیں ورنہ عشق اور اس کا اظہار وقت اور ماحول کے لحاظ سے دونوں جگہ شاعری میں موجود ہے۔

آج کا شاعر ہر طرح کی پریشانی میں مبتلا ہے۔ اُسے جنگ کا خوف ہے۔ بدلتے ہوئے زمانے کا ڈر ہے۔ یہ خوف اور یہ ڈر کوئی نیا نہیں ہے۔ معاش اور ہر طرح کی پریشانی اُس وقت بھی شاعر کو تھی۔ جنگ کا خوف بلکہ اس وقت تو خانہ جنگیوں کا خوف بھی تھا۔ جو بیرونی جنگ سے زیادہ خطرناک ہوتی ہیں۔ بدلا ہوا زمانہ ان لوگوں کے سامنے بھی تھا اور یہ بدلا ہوا زمانہ ہر دور میں رہے گا۔ بنیادی چیزیں جو پہلے تھیں وہ اب بھی ہیں صرف زندگی کا ڈھنگ بدل گیا ہے ورنہ زندگی وہی ہے۔ اس کا احساس بھی وہی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے بڑی بڑی حویلیاں تھیں اور بسات گھوڑوں کی گاڑیاں تھیں۔ ساہوکاری اور زمینداریاں تھیں اور آج بارہ منزلہ بلڈنگیں اور بلند و بالا عمارتیں ہیں۔ موٹر کاریں ہیں۔ بڑے بڑے تاجر اور کارخانے ہیں لیکن ان دونوں حویلیوں اور بلڈنگوں کے نیچے دبے ہوئے انسان کا احساس پہلے بھی وہی تھا اور آج بھی وہی ہے۔ آخر ایسا کیوں؟ اس وقت کے شاعر کو بھی اس کا احساس تھا اور وہ خود بھی زندہ رہنے کی کشمکش میں مبتلا تھا۔ اس کے سامنے بھی اپنے وقت کے لحاظ سے سماجی معاشی مسائل تھے۔ شہنشاہیت اور لوگوں کے بدلتے ہوئے مزاج۔ درباردارایاں، امراء کی ریشہ دوانیاں اور اُن کے درمیان اپنی پگڑی کو سنبھالنے کی بھی اُلجھن۔ جو ان لفظوں سے علیحدہ گوشہ نشیں تھے وہ تیر کی طرح اور بھی پریشان تھے۔ دنیا ان کے لئے اور بھی تنگ تھی۔ وہ شریف تھے، وضعدار تھے، اُن کی خودداری اور وقت کی مجبوریوں نے اُنکے انفرادی غم اور ذہنی اُلجھن کو حتی الامکان ظاہر نہ ہونے دیا۔ غم ہائے روزگار خود بخود غم جاناں میں سما گئے۔ شدتِ غم اور حدتِ دردِ غمِ دوراں کو بھی صورتِ غمِ جاناں میں سمو کر پیش کیا۔ اگر ہماری دنیا صرف گل و بلبل، حسن و عشق اور عیش و نشاط کی دنیا ہوتی ہے اور ہم ستم ہائے روزگار اور غمِ دوراں سے مستثنیٰ ہوتے تو شاید غالب کے دل سے یہ کبھی نہ نکلتا۔

فرصتِ کاروبارِ شوق کسے　　ذوقِ نظارۂ جمال کہاں

غمِ ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج　　شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک



قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں	موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں
دل کہ طاقت سے سوا ہو تو میں نبھوں کیونکر	دہر میں جو تسلیم درماں ہے تو سہی
رنج سے خوگر ہو انساں تو مٹ جاتا ہے رنج	مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل	انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

آج کا انسان بھی غم روزگار سے تنگ آکر غالب کے ہی ایک صدی پرانے شعر گنگناتا نظر آتا ہے۔ اور انسان کی یہ غزل اُن کے درد و کرب اور اس زمانے کی آئینہ داری نہیں آج کے ماحول دبی کیفیت اور بیزاری کی عکاسی بھی کرتی ہے اور آج بھی کسی کی زبان پر ان کی غزل یہ شعر آ ہی جاتا ہے۔

دیکھیے اے محبت مادر بہاری راہ تک اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

دوستو! غربت و مجاہدت پہلے بھی پریشاں تھی۔ آج بھی پریشاں ہے صاحبِ علم و ہنر پہلے بھی سرگرداں تھا۔ آج بھی سرگرداں ہے سفارش پہلے بھی ذریعہ کامیابی تھی آج بھی ہے۔ اور اس کے سہارے بیوقوف پہلے بھی مسند آرا ہوتے تھے آج بھی ہوتے ہیں۔ دولت پہلے بھی ذریعۂ عزت تھی آج بھی ہے۔ اس کے سامنے پہلے بھی سر جھکتے ہیں۔ سرمایہ کی طاقت پہلے بھی تھی آج بھی وہی چھایا ہوا ہے۔ مجبوروں کے لئے قسمت اور فلک کی گردش پہلے بھی تھی آج بھی ہے۔ بغیر کسی میراث کے صرف دو ہاتھ پاؤں لے کر پیدا ہونے والے کے لئے زندگی پہلے بھی سخت تھی آج بھی ہے۔ غرض بنیادی طور پر سب کچھ وہی ہے جو چیز بدلی ہے وہ زندگی کے ہر رخ اور ہر سمت پر احساس و شعور کی نئی تعبیر ہے۔ لیکن اس تعبیر کی اساس انہی پرانے نظام اور پرانی سماجی بنیادوں پر ہے۔ اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں، یہی اس دور کے انتشار کی وجہ ہے بالکل اس طرح جیسے عمل جراحی کے بعد ایک نئے دل کو نکال کر دوسرے جسم میں ڈال دیا جاتا ہے۔ لیکن وہ اس سے میل نہیں کھاتا اور اسے قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔

یہ ایک سماجی اقتصادی انتشار ہے لیکن آپ کی شاعری اور ادب میں یہ انتشار آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ نفرت، عصہ، تنگدلی اور تنگ نظری کی شاہ کس صورت میں نمایاں ہو رہا ہے۔ سیاسی جماعت بندی اور بھی فرقہ بازی کی طرح ایک غلط راہ اختیار کر رہا ہے۔ ادب کی اساس قومیت، وحدت، یک جہتی اور وسیع النظری پر ہے اور شاعری تو پھر حرفِ تعبیری ہے شاعری نئی ہو یا پرانی شاعری ہی تو ہے اور شاعر کسی دور یا کسی خیال کا بھی ہو شاعر کے سوا کچھ اور تو نہیں۔

ولی سے لے کر ایک جدید ترین شاعر تک سب ہی نے کچھ نہ کچھ آپ کو دیا ہے۔ اور آپ اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے۔ ماضی، حال اور مستقبل ہمیشہ ایک دوسرے سے وابستہ رہے ہیں۔ آج کا مستقبل کل کا ماضی ہوگا اور یہ ماضی یوں ہی ختم نہیں ہو جاتا۔ اسے ساتھ آنے والی نسلوں کے لئے ایک تاریخ ترتیب دیتا چلا جاتا ہے۔

جدید و قدیم شاعر کے ختم ہو چلے۔ اور ان کی شاعری آپ کی راہ روکے نہیں کھڑی ہے۔ وہ تو اپنا کام کر گئے۔ کام دکھا گئے اور سنگِ میل رکھ گئے۔ اب آپ اس ورثہ کو سینہ سے لگائیں۔ یا اس پر خاک ڈالیں۔ مجھے گلہ نہیں۔

نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

دوستو! تمہارا دور تو ستیں کھلی اور سائنس کا دور ہے پھر تم ان چھوٹی چھوٹی باتوں میں پڑے رہے تو آپس دوڑتے ہوئے زمانے کا ساتھ کیسے دو گے۔ تم کسی ازم یا کسی نسبت سے بھی تعلق رکھتے ہو اور آپس میں تمہارے اختلافات کچھ بھی کیوں نہ ہوں۔ لیکن بنیادی طور پر تم سب انسانیت پسندی سے تو ضرور اتفاق کرو گے۔ تمہارے سامنے اہم سے اہم مسائل ہیں انسان انسان کا خون پی رہا ہے۔ اس مرتی ہوئی انسانیت کو بچاؤ اور کچھ ایسا کرو کہ تمہارا کام دوسروں کے کام آئے تم رہو نہ رہو تمہارا کام اور تمہارا نام رہ جائے۔ ورنہ یہ دنیا کس کی ہے اور یہاں



کس کی رہی ہے۔ کس کی رہ جائیگی بس سدا رہے نام اللہ کا۔

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل
زنہار اگر تمہیں ہوسِ نائے و نوش ہے
دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے
ساقی بجلوہ دشمنِ ایمان و آگہی
مطرب بنغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے
یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
دامانِ باغبان و کفِ گلفروش ہے
یا صبح دم جو دیکھئے آکر تو بزم میں
نے وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے
داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے
آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

غالب جب تک اپنے دل کی باتیں اپنے خاص انداز میں کہتے رہے۔ محفل پر ایک سناٹا سا چھایا رہا۔ اس کے بعد جب قطعہ پڑھا تو اور سماں بندھ گیا۔ مقطع ختم ہوتے ہی داد و تحسین کی آوازوں سے ایک شور سا اٹھنے لگا۔ سب یہی چاہتے تھے کہ غالب کو سر آنکھوں پر بٹھائیں لیکن غالب یہ جاوہ جا۔ ایسے گئے کہ پھر کسی کو نظر آئے۔ شاید وہ کچھ کہنا چاہتے تھے۔ کہہ چکے تھے۔ انھوں نے اب اور یہاں ٹھہرنے کی ضرورت نہ سمجھی چنانچہ فرش زمیں سے جب واپس عرش پر پہنچے تو سب اُن کے استقبال کے لئے موجود تھے۔ سب ہی کو تشویش تھی اور معلوم کرنے کے لئے بے چین تھے کہ غالب پر کیا گزری۔ غالب نے مسکراتے ہوئے ایک ہی شعر میں اپنا جواب دے دیا۔

تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے یہ تماشہ نہ ہوا

اور پھر گویا ہوئے۔ ملائکہ! آپ جانتے ہیں کہ غالب کو نہ صرف داد و تحسین کی پروا تھی اور نہ اب ہے۔ اور نہ تھی کیوں۔

پاتا ہوں اس سے داد کچھ اپنے کلام کی
روح القدس گرچہ مرا ہم زباں نہیں

وہ ادائیں...

"سنو صاحب۔ شعرا میں فردوسی اور فقرا میں حسن بصری اور عشاق میں مجنوں۔ یہ تین آدمی تین فن میں سر دفتر اور پیشوا ہیں شاعر کا کمال یہ ہے کہ فردوسی ہو جائے۔ فقیر کی انتہا یہ ہے کہ حسن بصری سے ٹکر کھائے۔ عاشق کی نمود یہ ہے کہ مجنوں کی ہم طرحی نصیب ہو۔ لیلیٰ اس کے سامنے مری تھی، تمہاری محبوبہ تمہارے سامنے مری۔ تم اس سے بڑھ کر ہوئے کہ لیلیٰ اپنے گھر میں اور تمہاری معشوقہ تمہارے گھر میں مری۔ بھئی مغل بچے بھی غضب ہوتے ہیں۔ جس پر مرتے ہیں، اُس کو مار رکھتے ہیں۔ میں بھی مغل بچہ ہوں، عمر بھر میں ایک بڑی ستم پیشہ ڈومنی کو میں نے بھی مار رکھا ہے۔ خدا ان دونوں کو بخشے اور ہم تم دونوں کو بھی، کہ زخم مرگِ دوست کھائے ہوئے ہیں، مغفرت کرے۔ چالیس بیالیس برس کا یہ واقعہ ہے باآنکہ یہ کوچہ چھٹ گیا۔ اس فن سے بیگانۂ محض ہو گیا ہوں، لیکن اب بھی کبھی کبھی وہ ادائیں یاد آتی ہیں۔"

(بنام مرزا حاتم علی بیگ مہر)

—— غالب ——

بھارت چند کھنہ

دِل کے بہلانے کو غالب یہ جواب اچھا ہے

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا

"شوخیٔ تحریر" جس میں تحریر خطی یا لسانی تحریر ہونے کی وجہ سے پڑھنے کے ناقابل اور صرف روشنائی شوخ ہوتی ہے۔ عموماً کسی حاکم کی ہوتی ہے اگر حاکم، حاکم اعلیٰ ہو یعنی الیکشن جیت کر بڑے بڑے عہدے پر فائز ہوا ہو اور حکم کی اجرائی سے پیشتر الیکشن پر صرف کئے اخراجات تھوڑی بہت پا بھائی بھی کی گئی ہو، تو اس کی تحریر سے کوئی بے ضابطگی، کوئی ناانصافی، کوئی دھاندلی عمل میں آتی ہے اور ہر کسی کے دل سے فریاد اٹھتی ہے۔ روزمرہ میں اسی کو گلا کاٹنا کہتے ہیں، اگرچہ عملی طور پر کسی کا گلا کٹا ظاہر نہ ہو۔ ایسی تحریر سے کوئی حقدار اپنے حق سے محروم اور کوئی بغیر حق کے حقدار بن جاتا ہے۔

ہم نے یہ مانا کہ دلّی میں رہیں کھائیں گے کیا

بجا ارشاد فرمایا۔ ایسے لوگوں کے لئے جن کے پاس سوائے طبع کے اور کوئی چیز گرانقدر باقی نہیں رہی، مناسب ہے کہ اگر دلّی میں رہنا ہو تو غم الفت کی جگہ خالص غم کھائیں۔ ممکن ہے یہی ایک چیز آپ کو پریشانی اور ملاوٹ کے بغیر ملتی رہے۔ اس کے علاوہ گرمیوں میں دھوپ اور سردیوں میں پالا اور کہرا بھی کھائے جا سکتے ہیں۔

ع جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو

یہ الیکشن کے زمانہ کی بات ہے یہی وہ وقت ہوتا ہے جبکہ بلا امتیاز سب کو بلا کر، بٹھا کر، اٹھا کر، منا کر ووٹ اکٹھے کرنے کا کام سپرد کیا ہوتا ہے۔ یہی ایک وقت ایسا ہوتا ہے جب نیتا پبلک کے رہین منت اور ان کی عنایت کے طلبگار ہوتے ہیں۔ الیکشن کے بعد پانچ سال تک ان کو بالائے طاق رکھا جا سکتا ہے مگر الیکشن کے عین پہلے طوقِ زرّیں کے لئے حریفوں کو بھی قبلہ و کعبہ بنا لینے میں کوئی امر مانع نہیں ہوتا۔

ع ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں

زمانہ بڑا آشوب گراں کا ہے غیر ملکیوں سے ہر ملک کے لوگ نالاں ہیں، اس لئے مناسب ہوگا اگر اپنے ہی وطن کی اپنی لسانی ریاست میں ریاستی زبان میں عرضیاں لکھ کر مختلف محکموں میں دے دو۔ ایمپلائمنٹ ایکسچینج کے کارڈ کو راشن کارڈ کی طرح چالو اور تازہ رکھو۔ ان عام حربوں کے علاوہ خود کو علم جوتش کا عالم بتلاؤ، عرضی گزارتے وقت وزرا کی قسمت کا حال بتاؤ جس میں پردھان منتری بن جانے کے عنقریب ظہور پذیر ہونے میں کسی وعدہ کی قیادت کا ذکر اور کسی عہدے کے مل جانے کی بات بھی شامل ہو۔ غرض کہ اپنا حال بڑی خوبی سے کہہ کر محکموں کے افسروں پر دباؤ ڈلواؤ۔ پیروی کے لئے جاؤ۔ اپنی ڈگریوں کا حوالہ دو۔ اپنے رشتہ دار دل کی داستاں رقت انگیز لہجہ میں بیان کرو۔ موقع پا کر یہ بھی امید



مگر وہ کرفلاں شخص جو جنگ آزادی میں قید ہوا تھا دراصل آپ کے والد صاحب کی بہن صاحبہ کے سسر کی ماں کا پوتا تھا۔ اپنے مذہب کا حوالہ دو، جوالا مکھی کی طرح پھوٹ پڑو، کچھ دھوتیں دے ڈالو۔ کھدر ٹوپی پہن لو اور اُن کا دو شالہ اوڑھ کر سطح عام پر آؤ۔ اپنی شکل وصورت ایسی بنا لو کہ دور سے ہی پہچانے جاؤ کہ ایسا کرنے سے آپ کا حلیہ ہی کیوں نہ بگڑ جائے۔ وقت موقع دیکھ کر منیاؤں کے گلے میں پھولوں کے ہار پہناؤ۔ پیروں پر گر کر بے وزاری کرو، ان کے لیے مجسم مصیبت بن جاؤ تاکہ تمہیں پیچھا چھڑانے کی غرض سے وہ آپ کی غرض پوری کر دیں۔ پھلنے پھولنے اور پھیلنے کے لیے ایک حرب سچوں کو ہمیشہ یاد رکھو!

کیوں ترا راہ گذر یاد آیا؟

کسی خاص وجہ سے نہیں بلکہ اس لیے کہ راہ گذر کے موڑ پر راشن کی دوکان ہے جہاں سے شکر اور کیروسین حاصل کرنے کے لیے کیو میں کھڑا رہنا ضروری ہے۔

آخر اس شوخ کے ترکش میں کوئی تیر بھی تھا؟

کیوں نہیں۔ واہ صاحب یہ بھی کوئی بات ہے۔ البتہ ترکش کی شکل آجکل بدل گئی ہے۔ یہی ہینڈ بیگ کی شکل میں کندھے سے لٹکایا جاتا ہے یا ہاتھ میں تھاما ہوا ہوتا ہے۔ اس ترکش میں لپ اسٹک، پاؤڈر، غازہ ( ) وغیرہ سب ہی کچھ ہوتا ہے گا ہے گاہے اس کی مدد سے تیر چلائے جاتے ہیں۔ اگر لیلیٰ اس زمانے میں پیدا ہوتی تو اُس کا رنگ دیکھنے والوں کو شب دیجور کی یاد نہیں بلکہ تارہ گلاب کی رنگت کا سا دکھائی دیتا۔ مجنوں سادگی رہا ہے کسی شوخ کا اصلی رنگ وروپ اس کے منہ دھونے کے فوراً بعد ہی معلوم ہو سکتا ہے۔

کون لا سکتا ہے تاب جلوۂ دیدار دوست؟

صرف دو ہی صورتوں میں۔ اوّل یہ کہ جلوۂ دیدار دوست گہرے سبز رنگ کی عینک میں سے کیا جائے یا پھر جلوہ کسدہ بھوک سے اس قدر بے تاب ہو کہ دیدار دوست اُس کو گرم گرم تندوری روٹی نظر آئے۔

ہجوم گریہ کا سامان کب کیا میں نے؟

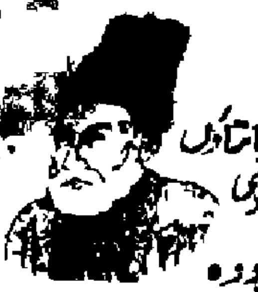
جب بغیر نوٹس دیئے ملازمت چھوڑ گیا، جب مالک مکان نے کرایہ کا گھر خالی کرنے کا نوٹس دے دیا، جب راشن کی دوکان پر راشن کے بجائے بعاش ملا، جب بیا مالیہ سال نے ٹیکسوں کو بے کرا گیا جب اپریل کے مہینہ میں موٹر رجسٹریشن ٹیکس، زندگی اور موٹر کے بیمہ کی ادائیگی کا وقت آن پہنچا، جب دھوبی نے میری نئی قمیص پھاڑ ڈالی اور جب بیوی نے ساڑیوں کے لیے ڈیزائنوں کا اشتہار دیکھ لیا۔ جب بل لکھنے پر اس میں سے صرف سسکیوں کی سی آواز نکلی جب ایک سہانی صبح موٹر اسٹارٹ کرنے کی کوشش کرتے ہوئے معلوم ہوا کہ اس کی بیٹری کی روح رات ہی بالکل عنصر جسمی سے پرواز کر چکی تھی!

جانوں کسی کے دل کی میں کیوں کر کہے بغیر؟

معاف فرمائیے مرزا صاحب مجھے جناب کی رائے سے اتفاق نہیں مندرجہ ذیل صورتوں میں دل کی بات کہے بغیر معلوم ہو جاتی ہے۔
جب مہینہ کی پہلی تاریخ کو مالک مکان کا کارندہ کرایہ کے مکان کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے، جب ریل کا بکنگ کلرک آپ کی سیٹ محفوظ کرتے ہوئے آپ کی طرف دلی نظروں سے دیکھتا ہے، جب بس میں چڑھنے کے بعد بس کنڈکٹر پاس آ کر کھڑا ہو جاتا ہے، جب بڑے صاحب کا چپراسی بڑے صاحب سے ملاقات کے بعد مسکراہٹ سے میری طرف دیکھتا ہے، جب ہوٹل ویٹر بل دینے پر میری طرف ترچھی نگاہوں سے دیکھتا ہے، جب نوکری کے انٹرویو میں ناقابل جواب سوال پوچھے جاتے ہیں، جب کسی تہوار کے بعد پوسٹ مین یا تار گھر کے عملے کے لوگ دروازے پر آ کھڑے ہوتے ہیں، جب عدالت کچھ کہے بغیر حاضر رہتی ہے۔

کیوں جل گیا نہ تاب رُخ یار دیکھ کر؟

اس لیے کہ دھوپ اور گرمی سے رُخ یار کا غازہ پگھل چکا تھا اور چہرے کی اصلی "خوبیاں" ظاہر ہو گئی تھیں۔ نیز اس لیے بھی کہ محدود آمدنی سے لامحدود آمدنی کا مقابلہ کرنے کی تشویش نے رُخ یار کی خوبیاں یکسر پھیلا دی تھیں۔



...سے ہوں کیا بتاؤں ... عجب ... ہیں

یہ بھی کوئی رازکی بات ... چھوٹی زبان

... سے ...

میں جانتا ہوں جو وہ ... لکھیں گے جواب میں

(الف) یہ بھی کہ ... میں کوئی خاندان حال نہیں ۔

(ب) اس سے پہلے جو راستہ تمہارے لئے منظور کیا گیا ہے اُس میں کوئی اضافہ نہیں ہو سکتا ۔

(ج) اگر سوال یہ کیا جائے کہ ہندوستان کی تاریخ میں بہادری لال کے متعلق تم کیا جانتے ہو۔ تو یقیناً جواب میں یہ لکھا جائیگا کہ وہ کچی کیوڑہ کا باپ تھا یا اگر انگریزی کے پرچے میں یہ سوال کیا جائے کہ U G L Y کا برعکس کیا ہوگا تو جواب لکھا جائے گا "یگلی"

جامعہ کے حکام نے اسٹوڈنٹس یونین سے مشورہ کئے بغیر بی۔اے کے امتحان کی تاریخ کا اعلان کر کے نہایت غیر ذمہ دارانہ طریقہ کا ثبوت دیا ہے ۔ اس لئے جامعہ کے حکام مقتدر کو ہدایت دی جاتی ہے کہ وہ فوراً سے پیشتر اپنے اس اعلان کو واپس لے لیں کیونکہ طلباء فی الوقت امتحان دینے کے موڈ میں نہیں ہیں۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو نصف تمام اہم عہدہ داروں کا گھیراؤ کیا جائے گا بلکہ ہر اُس مقام پر جہاں امتحان لیا جا سکتا ہے ناقابل استعمال بنا دیا جائیگا علاوہ ازیں اسٹوڈنٹس یونین نے یہ بھی فیصلہ کیا ہے کہ آئندہ جب کبھی امتحان کی تاریخ یونین کی مرضی کے مطابق مقرر کی جائے تو اس سے قبل ممتحنوں کی ایک فہرست یونین کی خدمت میں روانہ کر دی جائے تاکہ یونین کی عاملہ کمیٹی کے اراکین ممتحنوں سے ربط پیدا کر کے ان کو سوالات کے متعلق مناسب مشورہ دے سکیں نیز ایسا کرنے سے دوران امتحان کسی قسم کی بدنظمی اور افراتفری پیدا نہ ہو سکے گی اگر ایسا نہ کیا گیا تو دوران امتحان پیدا ہونے والے واقعات اور حادثات کی تمام تر ذمہ داری جامعہ کے حکام مقتدر کے سر پر ہوگی ۔ اگر آپ کسی اُردو ادبی رسالے کے لائف ممبر بن چکے ہیں اور لوہا حیدرآبادی (ایسی) رکنیت کا گذرا ن چکے ہیں تو صبر کیجئے آپ کے خطوط کا کوئی جواب نہیں آئے گا ۔

حیراں ہو دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں

اس میں حیران ہونے کی کیا بات ہے قبلہ ۔

اگر تم ہندوستانی فلم ایکٹر ہو اور ہسکریں پر کوئی مرنے کے لئے ایڑیاں رگڑ رہا ہے تو دل کو رونے اور جگر کو پیٹنے کی ضرورت نہیں جب تک ہسکرین پر مرنے والا عالم نزع میں تڑپ رہا ہو تم ایک ٹیون تیار کر لو اور اس کے مرتے ہی موقعہ کی مناسبت سے گانا شروع کر دو سینما میں مخلوق تمہاری اس حرکت کو برا نہیں سمجھے گی ۔

اگر تم ہندوستانی فلم دیکھنے والی مخلوق میں سے ہو اور تمہاری ولیمہ ہیروئن ریل گاڑی کے نیچے کچلی جا چکی ہے تب بھی رونے پیٹنے کی ضرورت نہیں ریلیگا ... ن مگر رونے کے بعد وہ آپ کو پٹری کی دوسری طرف بے ہوش پڑی نظر آئے گی اس حادثہ کی وجہ سے وہ اپنا حافظہ یا قوت بینائی یا گویائی کھو بیٹھی ہوگی مگر پھر بھی سوگ منانے کی کوئی وجہ نہیں کیونکہ ساڑھے تین گھنٹے کے فلم کے ختم ہونے سے پہلے پہلے وہ اپنی تمام خوبیاں حاصل کرے گی ... کوئی کے حسن کو حاصل کرنے کی کوشش ہی نہیں کی جاتی

ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

... رہے آپ کا گذر ۔ اس لسانی ریاست میں ہو سکتا ہے جس کی زبان آپ جانتے ہوں۔ اگر آپ کوئی بھی ریاستی زبان نہیں جانتے تو آپ کی حالت قابل رحم ہے مناسب ہوگا کہ کوئی ایک زبان سیکھ لیجئے اگر آپ عمر رسیدہ ہیں اور نئی زبان سیکھنے کے موقف میں نہیں، تو میرا مشورہ ہے کہ آپ ریل گاڑی کا سفر اختیار کریں، اگر خدا نے چاہا تو بہت جلد کوئی نہ کوئی ریل گاڑی آپ کو عدم آباد کے اسٹیشن پہنچا دے گی اور آپ ... زندگی کے تمام دکھ دردوں سے یکسر نجات پا جائیں گے ۔

کوئی کہے کہ شب مہ میں کیا بُرائی ہے

... ان سے یہ پوچھئے یا پھر اُن ملکوں سے جن کے شہروں پر جنگ کے دوران بمباری کی جاتی تھی ۔

تم اُن کے وعدے کا ذکر اُن سے کیوں کرو غالب



اس لئے کہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو موصوف ضرور اپنا وعدہ بھول جائیں۔ الیکشن سے پہلے کئے ہوئے وعدے بہت جلد بھول جاتے ہیں بشرطیکہ وعدہ کرنے والا الیکشن جیت گیا ہو۔

؎ آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے؟

اثر سے مراد اگر یہی ہوتا ہے یعنی آہوں کی بے اثری کا۔ آج کل صرف دو چیزیں اثر رکھتی ہیں۔ ایک زر اور دوسرا زور یعنی بااثر لوگوں سے ناطہ۔

؎ یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لئے

شاید اس لئے کہ لوگوں کو میری زبان سمجھ میں نہیں آتی اور ممکن ہے کہ میرے خیالات بھی آزاد ہندوستان کی ترقیوں اور SOCIALISTIC PATTERN OF SOCIETY کے نصب العین کے مُعارض ہوں۔
SOCIALISTIC PATTERN OF SOCIETY سے مراد یہ ہے کہ کم آمدنی والے لوگوں کا معیار زندگی نہ بڑھایا جا سکے تو یکسانیت پیدا کرنے کے لئے اونچی آمدنی والوں کے معیار زندگی کو گھٹا دیا جائے۔

؎ کس واسطے عزیز نہیں جانتے مجھے؟

اس لئے کہ کہیں آپ اپنا بوریا بستر باندھ کر اُن کے غریب خانے پر پہنچ کر حضرت داغ کی طرح مستقل طور پر نہ بیٹھ جائیں۔ اس گرانی کے زمانے میں بھلا کون عزیز کسی کو جانے گا جبکہ ہر کوئی اپنی جانِ عزیز کو بچانے کی فکر میں سرگرداں ہے۔

؎ کرتے ہو مجھ کو منعِ قدم بوسی کس لئے؟

شاید اس لئے کہ شکل و صورت سے بھی اور وضاحت سے بدی ٹپکتی ہے۔ ایسے لوگوں سے تو ہاتھ ملا کر احتیاطاً انگلیاں گن لینی پڑتی ہیں۔

؎ شب کو اُن کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہو گئیں

کپڑوں کو اگلے دن پہننے کے قابل رکھنے کے لئے۔ اس کے علاوہ ممکن ہے یہ واقعہ مئی جون میں ہوا ہو جبکہ گرمی اپنے شباب پر تھی اور بجلی کا کرنٹ اپنے معمول کے مطابق آف ہو گیا ہو۔ یا پھر کسی ڈانس میں شریک ہونے کی غرض سے غیر ضروری لباس اتار دیا گیا ہو۔

؎ بیٹھے ہیں رہ گزر پہ ہم کوئی ہمیں اٹھائے کیوں؟

خیر تو خیر آپ کو کیوں اٹھائے گا لیکن اس کا ضرور احتمال ہے کہ آپ کسی موٹر یا لاری کی زد میں آ جائیں۔ اس کے علاوہ اگر شکل و صورت سے آپ کا سیٹھ گری ہونا ظاہر ہو تو پولیس کا پہرہ آپ کے گرد لگ جائے گا اور شہر کے متعدد بیکار لوگ آپ کے درشن کرتے ہوئے ہی وقت گزاریں گے۔

؎ موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں؟

آزاد ہندوستانیوں کی حد تک سو فی صد صحیح ہے۔ جن کو غمِ عزت، غمِ رقیباں، غمِ بیکاری، غمِ کثرتِ اولاد، غمِ بیماری، غمِ مہمان نوازی، غمِ ٹیکس، غمِ وضعداری، غمِ ناواقفیتِ زبانِ سرکاری، غمِ محرومیِ وزارت سے نجات نہیں ــــ اور پھر غمِ عشق تو ہر ہندوستانی کو ورثہ میں ملتا ہے۔

؎ راہ میں ہم ملیں کہاں بزم میں وہ بلائے کیوں

راہ میں راشن کی دوکان کی طرف جاتے ہوئے ملئے یا سینما پاس کے کیو میں ملاقات کیجئے۔

؎ کہے سے کچھ نہ ہوا پھر کہو کہ کیوں کر ہو

خط لکھیے۔ ٹیلی گرام دیجئے۔ ٹیلی فون پر بات کیجئے۔

؎ نیند کیوں رات بھر نہیں آتی؟

گرمی ہوگی؛ مچھر بھیں بھیں کرتے ہوں گے کھٹمل بھی کاٹتے ہوں گے۔ یا پھر دو تین چھوٹے چھوٹے بچے باری باری سے رو رہے ہوں گے۔

شاعر۔ بمبئی

غالب نمبر ۱۹۶۹ء

محفل کے قدر شناس کا پارہ طلب ہوگا ٹیکس ادا کرنے کی تاریخ سر پر  آگئی ہوگی۔ یا پھر آپ کو ایک گہری اس تاریکی کھائی میں اُلجھے ہوئے پڑے ہوں جو لیٹ دولت مختلف ہستیوں کی لیت سا ہی کرتے کرتے خود اپنی لیت کو مٹی ہو اور جس کیا جو سمجھ ایسے ڈھیلے ہو گئے ہوں کہ جس میں ڈوب جانے کے بعد آپ ایسی کیفیت میں پہنچ گئے ہوں کہ گھٹنے آگے بڑھ کر آپ کی پیشانی کی بلائیں لینے لگے ہوں اور آپ کو اپنا جسم دو حصّوں میں برابر برابر تہہ ہوتا ہوا محسوس ہو رہا ہو۔

ہاری جیب کو اب حاجت رفو کیا ہے

مہینہ کی دوسری تاریخ سے نہ صرف جیب کو رفو کی حاجت نہیں رہتی بلکہ اگر جیب نہ بھی ہو تو کوئی مضائقہ نہیں۔

کیا ہے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

جہاں بات بنائے نہ بنے وہاں بات بن سکتی ہے۔ اگر کچھ خرچ کیا جائے مثلاً ریل کے سفر کے لئے جگہ، ملازمت میں ترقی اور لعنت ملامت کا ڈر ہے

لے کے رشوت پھنس گیا ہے دے کے رشوت چھوٹ جا

آتا ہے ابھی دیکھئے کیا کیا مرے آگے

اگر آپ موٹر پر سوار ہیں تو پھر سائیکل سوار، راہرو، کتے، گدھے، بکریاں، گائے، بھینس بھی سامنے آئیں گے اس لئے اپنی گاڑی کے بریک اچھی حالت میں رکھئے اور رفتار کو تیز۔

اگر آپ کسی دفتر میں ملازم ہیں تو ہر قسم کے کام آپ کے سامنے تکمیل کے لئے آئیں گے اور اگر آپ اپنے فرائض کی انجام دہی میں محض ایمانداری اور محنت کا استعمال کرتے ہیں تو پھر جب ترقی کا موقع آئے گا تو یقیناً کوئی اور آپ کے سامنے آجائے گا۔ کوئی ماہر پیروی۔ کسی کا سالا یا کسی دور تر السال کا رشتہ دار۔

اگر آپ دلّی کے کسی فیشن ایبل ریسٹوران میں جا بیٹھیں تو اسپائے تو دلی کے طرح ایک خوبصورت بل کی شکل میں آپکے سامنے آجائیں گے، جن کو پڑھ کر اور جیب ٹٹولنے کے بعد آپ یہی چاہیں گے کہ اس ریسٹوران کے اندر کے ماحول کی ہوا کھا کر ہی وہاں سے باہر نکل آئیں۔

تب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پھر کیا کرے کوئی

ہندوستان میں گداگری کے انوکھے طریقے ہیں۔ سر بھی بیٹھا جاتا ہے اور پیٹ بھی۔ اس ورزش سے اگر ہاتھ ٹوٹ تو پھر گا مارنا شروع کردو لوگ آغاز کے جملے سے ہی ہل جائیں گے اور اگر آواز بھی نہیں تو رونا اختیار کیجئے یا محض دردناک آوازیں لگائیے ہندوستانی گداگروں کے پہچانے میں ذرا بھی دشواری محسوس نہیں کرتے۔

ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

اگر موٹر والے آکر قبرستان میں نہ پہنچ گئے ہوتے تو "ہوا خوری" کسی پاداش میں جیل کی آہنی سلاخوں کے پیچھے ضرور ہوتے۔

مجھ سے کیا پوچھتا ہے کیا لکھئے؟

تم مکمل کیفیت اور تحریر لکھ کر لے آؤ میں نیچے خوبصورت دستخط ثبت کر دوں گا

بقیہ صفحہ ۲۷۳ "غالب کے اڑیں گے پُرزے"

اور کلیات طرازی کو حاصل ہے"

"خالقِ کون و مکاں احمارا کس زباں سے شکریہ ادا کروں"

غالب سجدے میں گر جاتے ہیں اور جب اُٹھتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ ــــ

دیوانِ غالب کے پُرزوں نے خوبصورت اوراق کی صورت اختیار کر لی ہے جن پر اُن کی غزلیں سونے کے حروف میں لکھی گئی ہیں ــــ

اختر بستوی

مرزا غالب ۔ ایک قلمی انٹرویو

۱۴ فروری [illegible] کو مرزا غالب نے صبح کا اخبار مطالعے کے لئے اٹھایا تو اس کے دوسرے ہی صفحہ پر اشتہار نظر سے گزرا،

"سپہری نگر کو اپنی آئندہ رنگین فلم کے لئے نئے فنکاروں کی تلاش ہے۔ جلد ہی شروع ہونے والی اس فلم میں ہیرو ہیروئن اور موسیقار کے ساتھ ساتھ مکالمہ نویس اور نغمہ نگار بھی نئے ہوں گے۔ خواہش مند حضرات مندرجہ ذیل پتہ پر درخواستیں بھیجیں یا ۱۴ فروری کو دس بجے دن میں براہ راست انٹرویو میں شریک ہوں۔

سپہری فلمز ۶۹ آرٹسٹ منزل، لیمنگٹن روڈ بمبئی۔"

غالب نے اخبار بند کرکے خود اپنے آپ سے کہا، "چلو میاں غالب! اس فلم لائن میں بھی قسمت آزمائی کر دیکھو یعنی اسٹوڈیو بیابانی کرو۔ اچھے بھلے جنت میں مزے اڑا رہے تھے، شرابِ کوثر کے جام پہ جام چڑھا رہے تھے، اور حور و غلماں سے دل لگا رہے تھے کہ یکایک نہ جانے جی میں کیا آئی جو یوں اپنی جان مصیبت میں پھنسائی۔ خدا کے حضور میں ایک عرضداشت بھجوائی کہ مجھے دوبارہ زندگی عطا کی جائے، اور میری رُوح کو اسی پرانے قالب میں ایک بار پھر ہندوستان جانے کی اجازت دی جائے۔ میاں تم نیا ہندوستان دیکھنا چاہتے تھے، آزادی کے بعد اپنے وطن کی "اٹھان" دیکھنا چاہتے تھے، پورے ہو گئے نا تمہارے ارماں؟ خوب دیکھ لیا نا آزاد ہندوستان؟ اب جی بھر گیا ہوگا؟ سارا نشہ اُتر گیا ہوگا؟ جس دلی میں تم سو سال پہلے خلق کے محبوب تھے، اور ہر فرد و بشر کے لئے جنسِ مرغوب تھے، اسی دلی میں کیسی کیسی جوتیاں چٹخائیں اور خاک اڑائیں۔ اگلی قاسم جان کی گلی جہاں کسی زمانے میں تمہاری اقامت تھی، جاکر دیکھا تو اس کی عجیب شکل و شباہت تھی۔ نہ وہ پہلے جیسے مکان، نہ وہ پرانی وضع قطع کے انسان، اور ہاں وہ ان کی شستہ زبان، اللہ اللہ نہ وہ دلی رہی اور نہ وہ اہلِ دلی۔ پہلے تو تمہیں دلی میں سرکاری پنشن جیسی کوئی چیز ملتی تھی اور قرض کی مے بھی لے کے پینے کو مل جاتی تھی مگر اب یہاں تو کوئی ملازمت بھی نہ پا سکے، کسی شخص سے آتشِ نے دو دو ادھار بھی نہ دلا سکے۔ نجم الدولہ دبیر الملک اور نظام جنگ کے خطابات بھی بیکار ہوئے، انھیں توس کر جیب سے بیزار ہو گئے۔ تم نے کہاں کہاں نہ عرضیاں دیں اور کیسی کیسی نہ کوششیں کیں، لیکن کسی محکمے کا افسر کیا، کسی مدرسے کی معلمی بھی نہ مل سکی۔ آخر جب دلی میں ہر تدبیر بے سود، اور ہر راہ مسدود دیکھی تو اسے اپنی بدقسمتی سمجھتے ہوئے اور اہلِ وطن کا گلہ کرتے ہوئے، دلی والوں سے منہ موڑا اور اہلِ بمبئی سے ناتہ جوڑا۔ یہاں آنے سے قبل احباب سے سنا کرتے تھے کہ بمبئی میں خلقت کا اژدہام ہے اور روزگار عام ہے۔ مگر یہاں پہنچے تو جانا کہ شنیدہ کبھی مانندِ دیدہ نہیں ہوتا۔ خلقت کا اژدہام تو حقیقتاً اتنا زیادہ ہے کہ ہر طرف گھما گھمی ہے لیکن روزگار کے معاملے میں وہی دلی جیسی نفسی نفسی ہے۔ "کار" رکھنے والے یہاں اہلِ اقتدار ہیں، لیکن وہ جو فنکار ہیں، اس صنعتی مقام پر بھی بیکار ہیں۔ مگر اُن



خود خوش نصیب شاعروں اور ادیبوں کے، کہ جن کی علمی دنیا تک رسائی ہے اور جنھوں نے علمی رسالے اور غیر شاعرانہ لکھ کر تھوڑی بہت دولت کمائی ہے۔ تم یہاں محض شاعری کا غم اٹھائے ہوئے، اور خود کو ایک ہیں تجارت مانے ہوئے آگئے تھے۔ تمھارا دم کوئی یوسف تھے اور نہ کبھی کوئی مصر تھا جو یہاں تمھارا کوئی خریدار مل جاتا یا جس کلام کی بدولت کوئی روزگار مل جاتا۔ فراغت کو رہنا تو در کنار یہاں تو پیٹ بھرنے کو دو دال اور سر چھپانے کو ایک مکان پانا بھی دشوار ہے۔ دودن سے فاقے کر رہے ہو صرف ٹھنڈا پانی پی کر پیٹ بھر رہے ہو۔ آج قسمت سے یہ اشتہار نظر آیا ہے سخت مایوسی کے عالم میں ایک سلسلۂ روزگار نظر آیا ہے۔ چلو حصولِ معاش کے اس وسیلے کو بھی دیکھ لو، روزی روٹی پانے کے اس حیلے کو بھی دیکھ لو۔ جنت میں سعادت کس مثنوی سے ملا تھا کہ کسی زمانے میں خود تمھاری زندگی پر بھی ایک فلم بنی تھی، جس کی کہانی منٹو بھائی نے لکھی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ فلم والوں کی یہ کمپنی تمھیں سر آنکھوں پر بٹھائے اور تم سے اپنی نئی فلم کے لئے گانے لکھوائے۔"

مرزا نے سمبری فلمز کے انٹرویو میں شریک ہونے کا ارادہ کر کے اخبار ایک طرف ڈال دیا اور اٹھ کر رنگ اڑ کر بکس میں سے اپنی وہ بوسیدہ جامہ نکالا جو نہایت ہی قیمتی کپڑے کی بنی ہوئی تھی اور جس پر زردوزی کا کام کیا ہوا تھا۔ پہلے تو کچھ دیر مرزا جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی اور رفو کی ہوئی اس بیش قیمت جامہ کو حسرت سے دیکھتے رہے اور پھر ایک ٹھنڈی سانس بھر کر انھوں نے اسے زیب تن کر لیا۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے وہ لمبی سی دار ٹوپی بھی سر پر رکھ لی اور وہ سرخ زری کا نرم سلیم شاہی جوتا بھی پاؤں میں ڈال لیا جسے پہن کر کسی زمانے میں وہ بڑے کر و فر کے ساتھ قلعے جایا کرتے تھے۔ پھر معاً انھیں خیال آیا۔ کاش آج وہ ہوادار بھی ہوتا جس میں سوار ہو کر وہ دلی کی سڑکوں پر نکلا کرتے تھے لیکن اس خیال کے آتے ہی وہ ہنس دئیے اور خود سے مخاطب ہو کر بولے "واہ بھئی غالب تم بھی شیخ چلی کی طرح خیالی پلاؤ پکانے لگے، حقائق کو بھول کر تصورات کے گھوڑے دوڑانے لگے! اب اس زمانے میں ہوادار کہاں؟ اور اگر ہوں بھی تو ان کا کرایہ ادا کرنے کے لئے تمھارے پاس درہم و دینار کہاں؟ اب تو ہر خاص و عام ٹیکسیوں میں سفر کرتا ہے، پٹرول کی گاڑی میں بیٹھ کر فراٹے بھرتا ہے۔ مگر تم تو اس میں بھی نہ بیٹھ پاؤ گے۔ چار و ناچار پیدل ہی منزلِ مقصود تک جاؤ گے۔ چلو اب جلدی اس کھولی سے نکلو ورنہ وقت نکل جائے گا اور پھر ناکامی و نامرادی کے سوا کچھ نہ ہاتھ آئے گا۔"

مرزا غالب اپنی رفتار بمشکل سنبھالتے ہوئے انتہائی عجلت کے عالم میں اپنے دوست کی کھولی سے باہر آئے اور ایک راہگیر سے منزلِ مقصود کا پتہ پوچھ کر پیدل ہی چل دئیے۔ راستے میں مسخروں اور من چلے اُن پر آوازے کسے اور فقرے چست کئے لیکن وہ سب سے بے پروا بے تکلف قدم رکھتے ہوئے آگے بڑھتے گئے اور کم و بیش دو گھنٹے بعد سمبری فلمز کے دفتر کے سامنے کچھ اس طرح پسینے میں تر اور ہانپتے کانپتے ہوئے پہنچے جیسے کوئی ٹھیلہ کھینچنے والا دن بھر بار برداری کرنے کے بعد شام کو اپنے مالک کی کوٹھی پر پہنچتا ہے ——— وہاں پچاس ساٹھ امیدوار پہلے ہی سے موجود تھے جن میں نمک سک سے درست حسین و جمیل دوشیزائیں بھی تھیں اور جگمگاتے ہوئے سوٹ بوٹ میں ملبوس خوبرو نوجوان بھی، لمبے لمبے بالوں اور میلے کچیلے ہاتھوں والے سازندے بھی تھے اور بھیگی مسیں والے شعرا اور ادبا بھی۔ اس مجمع میں کچھ اس قسم کا اجتماعِ ضدین نظر آرہا تھا جیسے کسی سماجی جلسے میں یو پی کے ترقی اضلاع کے دہقانی اور نفیس دہلی تال کی شہری آبادی کے مہذب اشخاص یکجا ہوں یا کسی سیاسی میٹنگ میں مزدور سبھا کے کارندے اور زمیندار پارٹی کے خوش پوشاک رہنما اکٹھا ہوں ——— مرزا غالب جب اپنی درباری سج دھج میں وہاں پہنچے تو کچھ حضرات تو اس طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگے جیسے انھیں پیرس کے کسی کیفے میں کوئی الف لیلوی شہزادہ نظر آگیا ہو اور کچھ افراد اس طرح مسکرانے لگے جیسے انھوں نے عشوی راجہ کبیر کو کوئی مزاحیہ پارٹ ادا کرتے دیکھ لیا ہو۔ فلم کمپنی کے دفتر کے دروازے پر ایک وردی پوش چپراسی بیٹھا ہوا تھا۔ وہ پہلے تو کچھ دیر مرزا کو گھور گھور کر دیکھتا رہا اور پھر اُن کے قریب آکر انھیں نیچے سے اوپر تک دیکھتا ہوا بولا "کیوں بھائی تم تو ٹرنگ سے سیدھا ادھر چلا آیا؟ کس فلم میں کام کرتا ہے یار؟ کوئی کاسٹیوم فلم معلوم ہوتا ہے۔ تبھی تو ایسا فائنٹ ڈریس میں ہے۔ بولو تم کو کیا کام ہے؟ سیٹھ سے ملنا مانگتا ہو تو ہم اُسے جا کر بول دے۔" مرزا نے حیران ہو کر چپراسی کے چہرے کی طرف دیکھا لیکن جب اُسے ہر طرح سنجیدہ پایا تو کسی قدر ناراض ہو کر بولے۔



"میاں یہ کس قسم کا لب و لہجہ ہے؟ ہمکلامی کا یہ کون سا طریقہ ہے؟ یہ اندازِ تخاطب تو اُسے زیب دیتا ہے جو لنگوٹیا یار ہو۔ تم سے تو میری صاحب سلامت بھی نہیں ہے، کبھی کی کوئی واقفیت بھی نہیں ہے۔ یہ طرزِ تخاطب تو ایک طرح کی بے ادبی ہے، بلکہ سراسر بدتمیزی ہے۔"

تمھیں بتاؤ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے"

چپراسی کی سمجھ میں غالب کی پوری بات تو آئی نہیں ہے لیکن وہ "بدتمیزی" کا لفظ ضرور سمجھ گیا اور آپے سے باہر ہو کر بولا "تم ہم کو بدتمیز بولا؟ دماغ پھر گیا ہے تمھارا؟ ہم اکھا بمبئی گھوما ہے۔ تم ہم سے لوم مار رہا ہے" اور یہ کہتے کہتے اُس نے آستینیں چڑھا لیں۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر ایک صاحب، جو شکل و شباہت اور وضع قطع سے شاعر معلوم ہوتے تھے، لپک کر اُن دونوں کے قریب پہنچے اور انھوں نے پہلے چپراسی کو سمجھاتے ہوئے کہا "ارے بھائی یہ بہار کے ملنے سے آدمی ہیں۔ انھیں معلوم نہیں کہ بمبئی والے کس طرح گفتگو کرتے ہیں۔ تم بھی ذرا سی بات پر گرم ہو گئے۔" اور پھر مرزا کی طرف مڑ کر بولے "حضرت آپ بھی عجیب آدمی ہیں! اتنا بھی نہیں سمجھے کہ اس شہر میں رہنے والوں کا فطری اندازِ کلام بھی یہی ہے اور خواہ مخواہ کبیدہ خاطر ہو گئے۔

یہ مٹھو ہے، سیٹھ کریم بھائی کا خاص مُنہ لگا ملازم، جو سنچری فلم کے مالک ہیں۔ آپ غالباً نغمہ نگاروں کے انٹرویو میں شریک ہونے کے لئے تشریف لائے ہیں؟ تو جناب مٹھو کو اپنا نام بتا دیجئے۔ یہ اندر جا کر آپ کے نام کا اندراج کرا دیگا۔" یہ سن کر غالب نے ایک لمبی سانس کھینچی اور فرمایا "میر صاحب اگر یہ بات ہے تو میں درگذر کئے دیتا ہوں اور اس ملازم کی گستاخ کلامی سے قطع نظر کرتا ہوں۔ مجھ ناچیز کو عوام مرزا اسد اللہ خاں کہہ کر بلاتے ہیں اور اہلِ فن غالب کہہ کر مسندِ علم و دانش پر بٹھاتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ میں اس وقت ذلیل و خوار ہوں، اور عوام و خواص دونوں کی نظروں میں شرمسار رہوں۔"

مرزا کا ارشاد ختم کرنے سے پہلے تو وہ صاحب جو جب پہلے چھوڑوں سے مٹھو اور اُن کے درمیان صلح صفائی کرائی تھی اور پھر اُنھوں نے مٹھو کو مخاطب کر کے کہا "بھائی مٹھو ان کا نام مرزا اسد اللہ غالب ہے اور یہ گیت لکھنے والوں کے چناؤ میں آئے ہیں۔ تم جا کر لسٹ میں ان کا نام بھی لکھوا دو۔"

مٹھو چونک کر بولا "مرزا غالب؟ یہ تو ایک فلم کا نام ہے! ارے بابا کائے کو لوٹ بناتا ہے؟ ہم بھی وہ فلم دیکھ چکا ہے۔" پھر کچھ سوچ کر کہنے لگا "اچھا اب سمجھا! مرزا غالب فلم کا ہیرو بھی گیت گاتا تھا، جس پر چودھویں بیگم عاشق ہو گیا تھا، اور یہ بابو بھی گیت گاتا ہے۔ اسی لئے اس نے اپنا مارکٹ چڑھانے کو ایک ہٹ گیت گانے والا کا نام رکھا ہے۔" اور یہ کہہ کر مٹھو ہنستا ہوا دفتر کے اندر چلا گیا۔

کافی دیر کے انتظار کے بعد انٹرویو شروع ہوا۔ سب سے پہلے ہیرو اور ہیروئن کے انتخاب کے لئے امیدوار بلائے جانے لگے۔ ہیروئن کے لئے جن لڑکیوں کے نام پکارے جاتے تھے، وہ پہلے اپنے وینٹی بیگ سے آئینہ نکال کر اپنے چہرے کو جلدی جلدی دیکھتی تھیں، بالوں کو درست کر کے ہونٹوں پر دوبارہ لپ اسٹک کی تہہ چڑھاتی تھیں اور پھر کچھ اس طرح لچکتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھتی تھیں جیسے کہ شہروں کی چالاک نوجوان بیویاں پہلی تاریخ کی شام کو اپنے شوہروں کی آمد پر دروازہ کھولنے کے لئے بڑھا کرتی ہیں اور اسی طرح ہیرو کے چناؤ کے لئے جن نوجوانوں کو بلایا جاتا تھا وہ اندر کا رُخ کرنے سے قبل اپنی ٹائی کی گرہ درست کرتے تھے، کوٹ کی اوپری جیب سے چھوٹی سی کنگھی نکال کر جلدی جلدی بال سنوارتے تھے اور پچھلی جیب سے رومال برآمد کر کے جوتے جھاڑتے تھے اور پھر کوٹ کے پچھلے حصے کو داہنے اور بائیں دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر پیچھے کی طرف کھینچ برابر کرتے ہوئے اندر جایا کرتے تھے۔

ہیرو اور ہیروئن کے انتخاب کے بعد موسیقاروں کی باری آئی اور پھر سب سے آخر میں مکالمہ نویس اور نغمہ نگار کے چناؤ کے لئے ادبا اور شعرا بلائے جانے لگے۔ ان حضرات کی حالت بھی نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں سے کچھ بہت زیادہ مختلف نہیں تھی۔ جب کسی شاعر یا ادیب کی طلبی ہوتی تو اُس کے چہرے پہ یکایک بدحواسی سی طاری ہو جاتی اور وہ اپنی آدھی پی ہوئی سگریٹ کسی دوسرے ساتھی کی طرف بڑھا کر تیر دانی کی شکنیں برابر کرنا شروع کر دیتا یا اُلجھے ہوئے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کر کے اُنھیں برابر کرنے کی ناکام کوشش کرنے لگتا اور اُس کے بعد اپنی بیاض سنبھالتا اور کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے کچھ اس طرح جھجکتا ہوا دروازے کی طرف بڑھتا گویا وہ کسی ایسے مشاعرے میں کلام سنانے کے لئے جا رہا ہو جس میں ہوٹنگ یقینی ہو۔

خدا خدا کر کے مٹھو نے مرزا غالب کا نام پکارا اور اُنھیں اندر جانے کا اشارہ کیا مگر بہت ہی سکون کے ساتھ اپنی جگہ سے اٹھے اور بڑے



بڑے باوقار انداز میں چلتے ہوئے ایک عجیب سی شان بے نیازی کے ساتھ کمرے میں داخل ہو گئے۔ وہاں قدم رکھتے ہی مرزا کو کچھ ایسا محسوس ہوا گویا وہ یکایک کسی شداد کی جنت میں داخل ہو گئے ہیں۔ قیمتی ساز و سامان سے آراستہ و پیراستہ کمرہ، دیواروں پر حسین و جمیل نیم عریاں تصویریں آویزاں، جگہ جگہ خوبصورت اور سنگ سنگی مجسمے نصب، مختلف شکلوں کے ماربل کوریں برتنوں میں رنگ رنگی پھلیاں سی تیرتی ہوئی۔ وسط میں نصف دائرے کی شکل میں اسپرنگ دار کوچ کے پے ہوئے آرام دہ صوفے، اور ان کے سامنے صاف و شفاف شیشے کی لمبی سی میز ـــ دفتر کیا تھا اچھا خاصا عشرت کدہ تھا۔ جس میں تین اشخاص بیٹھے ہوئے تھے۔ اوّل سیٹھ کریم بھائی جو اس بری حالت میں انگور جیسا نظر آتا تھا۔ سیاہ کھردرا چہرہ، تنگ شکن آلود پیشانی، چھوٹا سا بے ڈول سر اور موٹی بھدی گردن۔ سیاہ رنگ کی ڈھیلی ڈھالی پتلون اور گہری نیلی رنگ کی شرٹ میں ملبوس صوفے میں دھنسا ہوا تھا۔ دوم شخص کا ڈائرکٹر ریحمن تھا۔ کسی بھوئیرے جسے سے مشابہ تھا۔ سوکھا دراز قد چہرہ جس میں جگہ جگہ ہڈیاں ابھری ہوئی اور ٹھوڑی جیسا سہمو ماہر کو نکلا ہوا جھوٹے جھوٹے بھورے رنگ کے بال، اندر کو دھنسی ہوئی مٹیلی زرد آلود آنکھیں گرے سوٹ پہنے اکڑا ہوا بیٹھا تھا۔ تیسرے منشی لیاقت علی تھے۔ پتلے دبلے سے انسان جن کی سیاہ اچکن میں سے ابھرا ہوا کوٹ صاف نظر آرہا تھا۔ سنہری فریم کی عینک اُن کی ناک کی پھننگ پر رکھی ہوئی تھی اور عینک کے اوپر پیشانی کا سلسلہ کافی دور تک چلا گیا تھا کیونکہ ان کے سر پر بال بس اتنے ہی رہ گئے تھے جتنے کرکٹ کے میچ میں ہوتے ہیں۔

مرزا غالب جب کمرے میں داخل ہوئے تو سیٹھ کریم بھائی نے ذرا آگے بڑھ کر حیرت بھری آنکھوں سے انھیں اس طرح دیکھا جیسے کوئی دیہاتی طالبِ علم شہر کے ٹیڈی لڑکوں کو دیکھتا ہے اور پھر جب وہ میز کے قریب پہنچے تو ٹھہر کر پوچھا "تم کون ہے جی؟"

ڈائرکٹر ریحمن نے سامنے رکھے ہوئے کاغذ پر نظر دوڑاتے ہوئے کہا "یہ گیت کار کے چناؤ کے لئے ایک کینڈیڈیٹ ہیں۔"

سیٹھ کریم بھائی نے پھر سوال کیا "تمہارا نام کیا ہے جی؟"

مرزا کو یہ سوال سن کر ایک بار پھر غصہ آگیا اور وہ تیوریوں پر بل ڈال کر بولے "جناب آپ کا بھی وہی اندازِ گفتار ہے جو آپ کے ملازم کا شعار ہے، وہ تو خیر ناسمجھ ہونے کے سبب قابلِ معافی ہے مگر آپ کا یہ طرزِ تخاطب تہذیب و شائستگی کے یکسر منافی ہے۔"

سیٹھ نے منشی لیاقت علی کی طرف نظریں گھما کر دریافت کیا "منشی جی، یہ گیت بنانے والا کیا بولا؟ اپن تو کچھ نہیں سمجھا۔"

منشی جی نے اپنی عینک کے پیچھے سے غالب کو سر سے پاؤں تک گھور دیکھتے ہوئے جواب دیا "حضور یہ خالص قسم کی اُردو بول رہے ہیں۔"

سیٹھ کریم بھائی نے اپنی اکڑی ہوئی گردن کو دوبارہ صوفے کی پشت پر رکھتے ہوئے پُرسکون لہجے میں کہا "اچھا ایسا مانگ، بات ہے تو مانا ہم ہی اس کا انٹرویو لو اپن کے دماغ میں تو اِس کا کوئی بات نہیں گھسیں گا۔"

منشی جی نے عینک سیدھی کی اور میز پر پڑے ہوئے کاغذ کو پڑھ کر پوچھا "آپ کا نام مرزا اسداللہ خاں غالب ہے؟ یہ تو ہو بہو وہی نام ہے جو بہادر شاہ ظفر کے استاد کا تھا۔"

غالب نے جواب دیا "جی ہاں میں وہی شاعرِ دل گرفتہ ہوں یعنی وہی غالبِ خستہ ہوں جو کبھی دربارِ ظفر میں دادِ سخنوری دیا کرتا تھا ــ اور جھولیاں بھر بھر کر انعام لیا کرتا تھا۔ خدا سے دوسرا جنم مانگ کر دوبارہ دنیا میں آیا ہوں اور اس جنم میں گذشتہ جنم سے بھی زیادہ بدبختی ساتھ لایا ہوں۔ دلّی میں ہر در سے ٹھکرایا گیا اور ہر گھر سے بھگایا گیا۔ اب بمبئی میں ٹھوکریں کھا رہا ہوں اور جی ہی جی میں اپنے کئے پر پچھتا رہا ہوں۔ دو وقت کی روٹی کے لالے پڑ گئے ہیں، دولتے دوڑتے پاؤں میں چھالے پڑ گئے ہیں۔ آج آپ کا اشتہار دیکھ کر یہاں آیا ہوں اور یہ التجا لایا ہوں کہ جناب مجھے اپنی فلم کے گانے لکھنے کا موقع عطا کریں اور میرے کرم فرمائیں۔"

منشی لیاقت علی نے سیٹھ کریم بھائی کو مخاطب کر کے فرمایا "سیٹھ جی یہ تو بہت بڑے شاعر ہیں۔ اِن کے بارے میں ایک فلم بھی بن چکی ہے جس کا نام "مرزا غالب" تھا۔ آپ ہی اُس فلم کے ہیرو تھے۔" سیٹھ نے چونک کر کہا "کیا بولا؟ یہ مرزا غالب کا ہیرو ہے؟ ارے منشی لیاقت علی تم اپن کو بیوقوف بناتا؟ مرزا غالب کا ہیرو تو بھارت بھوشن تھا۔ اب اُس کا مارکٹ خلاص ہو چکا ہے۔ کوئی پروڈیوسر اُس کو اپنی فلم



نیا ہیرو نہیں لیتا؟" اور پھر سیٹھ جی غالب کی طرف رُخ کر کے ایک زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے بولے "ارے بھائی بھارت بھوشن جی! تم ابھی پرانی فلم کا ڈریس پہن کر آیا ہے۔ بائی گاڈ بہت اسمارٹ لگتا ہے۔ مگر اب ہم تم کو ہیرو نہیں لے سکتا۔ اپن ابھی ہیرو کا کنٹریکٹ کر چکا۔ اب اپن کو گیت بنانے والا مانگتا۔ تم گانے لکھے گا کیا؟"

منشی لیاقت علی نے کھنکار کر سیٹھ کریم بھائی کو ٹوکتے ہوئے کہا "نہیں نہیں سیٹھ جی یہ بھارت بھوشن نہیں ہیں۔ یہ تو مشہور شاعر مرزا غالب ہیں۔ آپ کی نئی فلم میں گانے لکھنا چاہتے ہیں۔"

یہ سن کر سیٹھ جی کھسیانے ہو گئے اور انہوں نے ترش لہجے میں فرمایا "منشی لیاقت علی! تم یہ کیسا الٹے سیدھے والا بات بولتا؟ ابھی کہا کہ یہ مرزا غالب فلم کا ہیرو ہے کیا اپن نہیں جانتا کہ اُس فلم میں ہیرو کا پارٹ بھارت بھوشن نے کیا تھا؟ اگر تم ایسا ہی گول مال کریں گا تو اپن تم کو ڈسمس کر دیں گا۔"

ڈائرکٹر برکش شرما جو اب تک چپ چاپ بیٹھے ہوئے تھے بیچ بچاؤ کراتے ہوئے بولے "ارے نہیں نہیں سیٹھ جی آپ کو غلط فہمی ہوئی۔ منشی جی کا مطلب دراصل کچھ اور تھا۔" اور پھر انہوں نے بات کا رُخ دوسری طرف گھمانے کے لئے مرزا غالب سے مخاطب ہو کر کہا "میاں تو مرزا صاحب آپ کو فلمی گیت لکھنے کا کچھ تجربہ ہے؟ میرا مطلب ہے آپ نے کبھی مشق کے طور پر کسی کہانی کی کوئی سچوئیشن ذہن میں رکھ کر کوئی گیت لکھا ہے؟" مرزا صاحب نے جواب دیا "صاحب آپ نے ہمیں کوئی داستان گو سمجھا ہے کہ کہانیوں سے ہمارا سابقہ ہو اور قصوں سے واسطہ ہو؟ میں تو میدانِ شعر و سخن کا مرد ہوں اور طبقۂ شعوراں کا ایک فرد ہوں۔"

منشی لیاقت علی نے بیچ میں دخل دیتے ہوئے کہا "مگر مرزا صاحب فلموں میں تو آپ کو کہانیوں پر غور کرنا ہوگا اور سچوئیشن کے مطابق گیت لکھنا ہوگا۔"

غالب نے ایک آہِ سرد کھینچتے ہوئے جواب دیا "ہاں صاحب آپ نے بجا فرمایا۔ حیف! میری شامتِ اعمال نے مجھ سے کیا کیا نہ کروایا۔ اب تو پیٹ بھرنے اور تن ڈھکنے کے لئے جو آپ کہتے ہیں وہی کروں گا۔ علم و ادب سے گریزاں ہو کر قصے کہانیوں کا دم بھروں گا۔"

شرما جی نے کہا "اچھا تو یا لکھا ہوا کوئی رومینٹک ڈوئیٹ سنائیے۔"

مرزا غالب نے استعجابیہ طور پر ان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "یہ کس شے کا نام ہے؟ کیا یہ کوئی نئی صنفِ کلام ہے؟"

منشی جی نے جلدی سے لقمہ دیا "یعنی کوئی رومانی دوگانہ پیش کیجئے۔"

مرزا صاحب پھر بھی کچھ نہیں سمجھے اور انہوں نے باری باری دونوں کی طرف سوالیہ نگاہیں اٹھاتے ہوئے فرمایا "قبلہ نماز تو یگانہ ہی تھی اور کبھی کبھی بیگم کا دل رکھنے کو دوگانہ بھی پڑھی تھی، مگر فلمی دنیا میں دوگانے کا کیا مفہوم ہے؟ یہ امر اس ناچیز کے لئے قطعی نامعلوم ہے۔"

ڈائرکٹر صاحب نے کہا "جناب دوگانہ اُس گیت کو کہتے ہیں جسے ہیرو اور ہیروئن مل کر گاتے ہیں۔"

مرزا صاحب بُرا سا منہ بنا کر بولے "استغفراللہ! مجھے بھی آپ حضرات نے کوئی نوٹنکی والا سمجھا ہے، جو اس قسم کا بے ہودہ گانا سنانے کے لئے کہا ہے۔"

سیٹھ کریم بھائی نے صوفے کی پشت سے بھاری موٹی اور بھدی گردن اٹھاتے ہوئے اظہارِ خیال فرمایا "شرما جی یہ شاعر بالکل کنڈم ہے۔ یہ ڈوئیٹ نہیں بنا سکتا تو اپن اس سے کنٹریکٹ نہیں کریں گا۔ تم جلدی سے دوسرا کوئی بڑھیا رائٹر لانے کو بولو۔"

منشی لیاقت علی نے قدرے گھبرا کر کہا "سیٹھ جی یہ بہت بڑے شاعر ہیں آپ انہیں یوں جواب نہ دیجئے۔"

سیٹھ جی بگڑ کر بولے "تم کیسا بے تُک بات کرتا منشی جی؟ اپن بڑے بڑے گیت بنانے والوں سے کنٹریکٹ کر چکا ہے۔ اپن نے سپری فلمز کی آٹھویں فلم میں ساحر کو لیا تھا جس کا ہر سانگ ہٹ ہوتا۔ یہ بڈھا کیا ساحر سے بڑا سانگ رائٹر ہے؟ تم اس کو سائن کیوں کرتا؟ کیا یہ بھارا مانگنے والا لگتا؟"

ڈائرکٹر شرما نے پھر بیچ بچاؤ کراتے ہوئے کہا "ارے سیٹھ جی یہ بات نہیں ہے۔" اور پھر معاملے کو رفع دفع کرنے کے لئے وہ دوبارہ مرزا صاحب سے



ہمکلام ہو گئے "ہاں تو مرزا جی آپ کوئی ٹریجڈی سانگ سنائیے"

غالب نے جواب دیا "حضرت آپ کی اصطلاحوں کو سمجھنے سے میں قطعی قاصر ہوں کیونکہ ایک صدی قبل شاعر ہوں خدا کرم فرمائیے کہ ایسے صراحت و وضاحت سے کہا دیجئے"

منشی جی بولے "یعنی کوئی غمگین نغمہ جسے سن کر لوگوں کے دل بھر آئیں گیت نہ سہی آپ کوئی حزنیہ غزل سنائیے"

مرزا صاحب نے [illegible] ان کی بیاس پیتے ہوئے کہا "ہاں یہ ممکن ہے لیجیے میری ایک غزل سماعت فرمائیے اور اسے سن کر مجھے ملازمت مرحمت فرمائیے"

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار
اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

مرزا غالب اشعار سناتے رہے اور منشی لیاقت علی اور ڈائرکٹر زنجیر شرما آنکھیں بند کئے عالم خود فراموشی میں اُن سے محظوظ ہوتے رہے مگر سیٹھ کریم بھائی کا چہرہ لحظہ بہ لحظہ غصے سے سرخ ہوتا گیا اور آخرکار وہ بے ترتیب کر کھڑے ہو گئے اور چیخ کر بولے "بند کرو ایسا بے کار ہے ہمیں نہیں مانگتا۔ تم بیکار آدمی ہے۔ تم اس کو مرزا غالب فلم بنانا مانگتا۔ ابھی اگر جاہل ہوتا اور تم سے یہ گانا لکھوا لیتا تو سہراب مودی اپنا کی فلم کمپنی پر کورٹ کیس ٹھوک دیتا۔" یہ کہتے کہتے انھوں نے گمشتی بھائی جسے سن کر منیو اندر داخل ہو گیا۔ سیٹھ جی نے اس سے کہا "اس گیت سنانے والے کو یہاں سے چلتا کرو یہ چار سو بیس ہے"

ابھی کا کباڑا کر دیگا۔ اور دیں سے قبل کہ منشی جی اور ڈائرکٹر صاحب کچھ کہہ سکیں چپڑاسی نے مرزا صاحب کا ہاتھ پکڑ کر انھیں کمرے سے باہر کر دیا۔ مرزا غالب نے وہاں سے نکل کر اپنا عرق آلود پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے زیر لب یہ مصرعہ دہرایا کہ

بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

اور تھکے تھکے قدموں سے اپنے دوست کی کھولی کی طرف اس طرح روانہ ہو گئے جیسے کوئی بیا اور اناڑی وکیل شام کو کچہری سے رخصت ہوتا ہے

حسرتِ مُصافحہ

"حال تصویر کا یہ کہ میں نے اُسے سر پر رکھا، آنکھوں سے لگایا۔ گویا چھوٹے صاحب کو دیکھا، لیکن اس کا سبب نہ معلوم ہوا کہ نواب صاحب نے ہم سے بات نہ کی۔ خیر دیدار تو میسر ہوا، گفتار بھی اگر خدا چاہے گا تو سن لیں گے دیکھو منشی صاحب آئینے کی تصویر کی صنعت کو سب پسند کرتے ہیں۔ فقیر اس کا معتقد نہیں۔ اب دیکھو حضرت کی تصویر میں کہنیوں تک ہاتھ کی تصویر ہے۔ آگے پیچھے اور نیچے کا پتہ نہیں مکالمہ ایک طرف، مصافحہ کی بھی حسرت رہ گئی"

(نام سیف الحق سیاح) —— غالب ——

انجم عرفانی

غالب یونیورسٹی میں

غالب نے ٹائی کی ناٹ درست کرتے ہوئے آواز لگائی۔

"بیگم ارے بھئی دیکھ رہا ہوں کہ آج بھی میں لیٹ ہو جاؤں گا۔ غضب خدا کا۔ نو بجنے والے ہیں اور ہم ہیں کہ ابھی تک تیار بھی نہ ہو سکے۔"

بیگم نے کچن سے دیگچی اور کف گیر کے سرگم کی لے پر جواب دیا۔

"خدا کی پناہ! آپ تو ذرا میں سارا گھر ہی سر پر اٹھا لیتے ہیں۔ میں کیا یہاں ایسی کمر سیدھی کر رہی ہوں یا کوئی جاسوسی ناول پڑھ رہی ہوں۔"

(اس کے بعد پس منظر کی موسیقی تیز تر ہو گئی)

غالب نے ٹائی کی ناٹ درست کی۔ سر پر کریم لگا کر بالوں میں کنگھا کیا۔ ایسی فرنچ کٹ داڑھی میں چمک پیدا کرنے کے لئے اُس پر ہاتھ پھیرا۔ اتنے میں بیگم ٹرے میں ناشتہ لئے کمرے میں داخل ہوئیں۔ غالب کو ابھی تیار نہ پا کر ان کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ گرج کر بولیں "خود تو تیار نہیں ہوئے اور ہمارے لئے فرمان پہ فرمان جاری کئے جا رہے ہیں۔"

غالب نے موقع کی نزاکت محسوس کرتے ہوئے مصالحت آمیز لہجے میں جواب دیا "بھئی مجھے تو بس تیار ہی سمجھئے۔ اصل جھنجھٹ تو کمبخت ٹائی کی ناٹ ایڈجسٹ (ADJUST) کرنے میں ہوتی ہے، سو اس سے میں عہدہ برآ ہو چکا ہوں۔ کیا کروں، ٹیریلن کی قمیص پر ناٹ اِدھر اُدھر سرک ہی جاتی ہے۔ اگر زیادہ کس دوں تو اپنے آپ کو منصور علیہ الرحمۃ سمجھنے لگتا ہوں۔"

بیگم آنکھیں نکال کر بولیں "ابھی تو آپ نے ایک ہی ہفت خواں طے کیا ہے۔ آپ کو ابھی یہ موا موری دار پتلون بھی تو چڑھانا ہے۔ اتنی دیر میں تو میں حلوا بھی بنا لاتی۔"

حلوے کے نام پر غالب سوچ میں پڑ گئے کہ مفت میں ایک نقصان ہوا چاہتا ہے۔ صلح جویانہ انداز میں بولے "پتلون پہننے میں تو کوئی دیر نہیں ہوگی۔ آپ حلوا تیار ہی کر لیں۔ ہاں تب تک ہم اپنی مونچھوں سے بھی نپٹ لیتے ہیں۔"

بیگم کے چہرے پر پیار کا ایک رنگ پھیل گیا۔ مسکراتی ہوئی ترچھی نگاہوں سے اُن کو گھورتی ہوئی کچن کی طرف پلٹ گئیں۔ غالب نے اپنی ڈرین پائپ (DRAIN PIPE) پتلون کو ہینگر سے اُتارا اور برش سے صاف کیا۔ پھر بڑے اہتمام سے آہستہ آہستہ اُسے پہننے لگے۔ اس سلسلہ میں توازن برقرار رکھنے کے لئے کئی بار سرکس کا کمال بھی کرنا پڑا۔ خدا خدا کر کے پتلون چڑھائی۔ قمیص کی شکنیں درست کیں۔ ٹائی کو دوبارہ ہلا جُلا کر دیکھا۔ نیلی نوک کے جوتے پر برش پھیرا اور بیگم کو آواز دی "لیجئے ہم تیار ہو گئے۔"

"بسم اللہ کیجئے۔ حلوا بھی بس آیا ہی چاہتا ہے۔" بیگم کی آواز کھنکی۔

ناشتہ بھی ہو چکا۔ اُس سے فارغ ہوتے ہوتے نو بج گئے۔ غالب نے رسٹ واچ کو دیکھتے ہوئے کہا "اُف آج پھر میں یونیورسٹی



لیٹ بیٹھوں گا۔" اور ناشتہ چھوڑ کر کھڑے ہو گئے۔
بیگم چیخیں۔ "توبہ کیا جلدی ہے؟ اگر دو چار منٹ دیر سویر ہو بھی گئی تو کون سی آفت آجائے گی۔ ناشتہ تو ٹھیک سے کیجئے۔"

غالب نے بڑی بے چارگی سے اُن کی طرف دیکھا اور بولے "بیگم آپ نہیں سمجھیں گی کہ" "جی ہاں، ہم بھلا کاہے کو سمجھیں گے۔ ہم تو ٹھہرے نرے جاہل۔۔۔۔"

بیگم باقاعدہ اسٹارٹ لینے والی تھیں کہ غالب نے جلدی سے سنبھالا لیا اور بولے "نہیں نہیں خدا کے لئے غلط نہ سمجھئے۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ ذرا سی بھی دیر میرے لئے کتنی ضرر رساں ہے۔ اس کا آپ کو اندازہ نہیں۔ دراصل پہلا پیریڈ لنگوسٹک (LENGUISTIC) کا ہوتا ہے۔ آپ سمجھتی ہیں نا لنگوسٹک (LENGUISTIC)

"توبہ میرے باپ دادا نے بھی یہ فرنگی زبان کبھی نہیں پڑھی تھی، میں کیا جانوں، یہ کیا بلا ہے؟" بیگم منمنائیں۔

غالب نے سمجھاتے ہوئے کہا "لنگوسٹک لسانیات کو کہتے ہیں۔ لسانیات تو آپ سمجھتی ہوں گی۔ اس میں مختلف زبانوں کی پیدائش اُن کے ارتقاء، عہد بہ عہد تبدیلیوں وغیرہ کے بارے میں چھان بین کرنی ہوتی ہے۔ میرے لئے مشکل یہ آپڑی ہے کہ اس میں تمل اور تلگو کی بابت زبانیں، اس کے علاوہ لبندا، پشاچہ وغیرہ جیسی کون کون سی خرافات زبانوں کا ذکر ہوتا ہے، جس سے میرے فرشتے بھی واقف ہونا پسند نہیں کریں گے اور اُن زبانوں میں غزل کا ایک صاف شعر بھی نکالنا ناممکن ہے۔ ارے فارسی، عربی یا ژند پاژند وغیرہ کے بارے میں پڑھانا ہوتا تو میں خود اُستادوں کو پڑھانے لگتا۔ مگر قسمت کا کھیل ہے کہ آج یہ بھی دن دیکھنے پڑ رہے ہیں۔"

قسمت کا ذکر آیا تو بیگم نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا "قسمت کی باتیں نہ کیجئے۔ اس کے ہاتھوں در بدر ٹھوکریں کھاتے پھر رہے ہیں۔ کسی پل چین نہیں۔"

غالب نے دیکھا کہ اب بیگم کا پسندیدہ ٹاپک چھڑ گیا ہے۔ اس پر وہ گھنٹوں کیا، ہفتوں بے تکان بول سکتی ہیں، اس لئے انہوں نے جلدی سے موضوع بدلتے ہوئے کہا "نواب امیر الدین کی سالگرہ میں آپ نے کون سا نئے ڈیزائن کا نکلس دیکھا تھا سوچتا ہوں اس کے "برلا" کے ہاں جو میں نے اُن کے ستر ہویں پوتے کے لئے سہرا لکھا تھا، وہاں سے چیک آجائے تو آپ کے لئے بھی ویسا ہی نکلس خرید دوں۔"

بیگم کی آنکھوں میں مسرت کی چمک آگئی۔ فرائی انڈے کی طشتری غالب کی طرف بڑھاتے ہوئے پیار سے بولیں "آپ نے انڈے تو بالکل کھائے ہی نہیں اتنی سخت محنت کر رہے ہیں۔ تندرستی رہے گی کہ جائے گی۔ کوئی جنرل ٹانک بھی نہیں لیتے۔ "ہمدرد" والوں نے "سینکارا" کی تعریف میں مفت ہی قصیدہ لکھوا لیا، مگر اُس کی ایک بوتل بھی نہیں بھجوائی۔" پھر غالب کی طرف انتہائی محبت آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا "نواب شمس الدین کی سالی حج کرنے گئی تھیں تو مکہ سے وہ ہار لائی تھیں۔ بالکل جدید طرز کا ہے سنا ہے پیرس کی کسی مشہور کمپنی کا بنا ہوا ہے، مگر اس کی قیمت بہت زیادہ ہے، ہماری اوقات سے باہر ہے۔" کہتے کہتے اُن کا لہجہ بڑا ہی حسرت ناک ہو گیا۔

غالب تو صرف موضوع گفتگو بدلنا چاہتے تھے مگر بیگم تھیں کہ ہر بات کی تان اپنی مفلسی ہی پر توڑ رہی تھیں۔

کافی کے پیالے میں شکر گھولتے ہوئے بیگم نے یاد دلایا "ہندوستان لیور (آئل) کے نئے جنرل منیجر کے لئے آپ نے جو مبارک باد لکھی تھی، ابھی تک وہاں سے کوئی جواب نہیں آیا۔"

"کل اتوار تھا، اس لئے بینک اور پوسٹ آفس بھی بند تھے۔ آج شاید بینک ڈرافٹ آجائے۔ اُس رقم کا تو مجھے بھی شدت سے انتظار ہے۔ سردی شروع ہونے والی ہے۔ کم از کم ٹیری اُول (TERRY WOOL) کا ایک سوٹ، ایک شال اور ایک ہاف سوئٹر، موزے، دستانے اور ایک جوڑا جوتا تو ضرور خریدنا ہے اور اگر گنجائش ہوئی تو ایک مفلر اور اوور کوٹ (OVER coat) بھی۔ اُسی میں سے بیس ٹکا جمع کر دی ہے" غالب نے ایک لمبی فہرست پیش کر دی۔



"ناناؔ اور ڈالمیا کے یہاں سے؟"

"وہاں سے بھی اب تک چیک آجانا چاہیے تھا جانے کیوں دیر ہو رہی ہے۔"

"آل انڈیا ریڈیو سے جو آپ کو بلایا گیا تھا، سرجیت ایک پروگرام دینے کے لیے، اُس کا کیا ہوا؟"

"میری آواز ٹیسٹ کی گئی تھی۔ معلوم ہوا کہ ریڈیو کے نازک آلات اور با ذوق نستعلیق سامعین میری آواز کی کرختگی اور لہجے کا بے ہنگم پن برداشت کرنے سے قاصر ہیں۔" غالب نے ایک زہر خند کے ساتھ جواب دیا اور کافی کے بڑے بڑے گھونٹ لینے شروع کر دیے ــــ بیگم جلدی جلدی سائیکل صاف کرنے لگیں کافی ختم کرنے کے بعد اُنہوں نے کتابیں اور فائلیں کیریئر میں دبائیں۔ قد آدم آئینے میں اپنا آخری بار جائزہ لیا۔ بالوں پر ہاتھ پھیرا اور انگلش دھن میں سیٹی بجاتے ہوئے باہر نکلے۔ بیگم دروازے پر کھڑی ہو گئیں۔ سائیکل پر سوار ہوتے ہوئے غالب نے ہاتھ ہلا کر اُنہیں "ٹاٹا" کہا اور رفتار تیز کر دی۔

چوراہے پر پہنچ کر اُنہوں نے ہیرا تمولی سے چار عدد سادہ پان لیے اور احتیاط سے منہ میں رکھ لیے کیپسٹن سگریٹ کی ایک ڈبیہ لے کر جیب میں رکھ لی۔ پھر سڑک پر جا بجا گلکاری کرتے ہوئے یونیورسٹی کی طرف روانہ ہو گئے۔ اگلے موڑ تک جاتے جاتے جب منہ میں تھوڑی گنجائش ہو گئی تو انہوں نے بجلی کے پول کے سہارے سائیکل روکی اور اُس پر بیٹھے ہی بیٹھے ایک سگریٹ سلگا کر ہونٹوں میں دبائی۔ گھڑی میں دیکھا تو نو بج کر پچیس منٹ ہو رہے تھے۔ سگریٹ کا ایک لمبا کش لے کر اُنہوں نے سائیکل دوبارہ اسٹارٹ کی اور رفتار بتدریج بڑھاتے گئے۔ پانچ منٹ کے اندر وہ یونیورسٹی کے کمپاؤنڈ میں داخل ہو گئے اور اگلے دو منٹ میں اپنے کلاس میں۔

کلاس چل رہا تھا۔ غالب پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے اور لکچر سننے لگے۔ ڈاکٹر ہمہ داں جو ادب کے مختلف اصناف پر بڑی گہری نگاہ رکھتے تھے۔ ایک ایک موضوع پر کئی کئی کتابیں لکھ چکے تھے اور حیرت سے یورپ بھی ہو آئے تھے، ہندوستان کی قدیم زبانوں کی ساخت اور اُن کی نشو و نما پر دھواں دھار لکچر دے رہے تھے، جس میں جا بجا یورپین ماہرینِ لسانیات کے افکار و خیالات کا حوالہ دیتے جا رہے تھے۔ زبان کی خیالی ترقیوں اور فرضی تعاملات کی دور از کار دلیلیں اور ممکن تبدیلیوں کی ہوائی باتیں کرتے جا رہے تھے۔ غالب حیرت سے اُن کی مدلل اور فکر انگیز تقریر سُن رہے تھے اور دل میں کہہ رہے تھے ـــ

"کاٹ رہے ہیں ٹھوں میں کیا کیا یہ" کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

لسانیات کے بعد اُردو ادب میں رُومانوی تحریک کی بحث شروع ہو گئی۔ اُردو ادب میں رُومانوی اثرات کی تلاش میں مغربی ادب کے ذخیروں کو کھنگالنے لگے۔ بات روسو کے اُس مشہور قول سے شروع کی کہ "انسان آزاد پیدا ہوا ہے مگر جدھر دیکھو وہ پا بہ زنجیر ہے" اور انقلاب فرانس سے ہوتے ہوئے انگلینڈ کے صنعتی انقلاب اور یورپ کے اوباش اور مدکردار شاعروں اور ادیبوں کی زندگیوں میں رُومانوی اثرات کی جلوہ آرائیاں تلاش کی جاتی رہیں۔ غالب زیرِ لب مسکرانے لگے۔ یکایک پروفیسر کی نظر اُن پر پڑ گئی اور اُنہیں جیسے بریک لگ گیا۔ جھلا کر بولے "What is this nonesense mr GHALIB"

غالب نے متانت سے جواب دیا: "روسو سے بہت پہلے کتنے ہی مشرقی مفکرین نے ایسی صد ہا باتیں کہی اور لکھی ہیں پھر وہی کیوں سب سے پہلا رُومانی شخص؟ جب کہ ہمارے ادب کی روایات یورپ سے نہیں، عربی اور فارسی سے مستعار ہیں۔ ہمارے چمن میں شیراز و بخارا اور بغداد و بیجاپور کے گلاب کھلتے ہیں لندن اور پیرس کے نہیں۔ کیا یہ ضروری ہے کہ رومانیت کی جو تعریف انگریزی ادب میں کی گئی ہے اُس کا اطلاق ہمارے ادب پر بھی ہو؟ ویسے بھی ولی کی رومانیت میں کیا شبہہ ہے۔ اُس نے بھی تو اپنے عہد سے بغاوت کی تھی۔ حُسن کی سرمستیوں اور جلوہ آرائیوں میں وہ سر تا پا غرق رہا اور والہانہ انداز میں محبت کے نغمے گاتا رہا۔ میر کی الم پسندی اور غم دوستی، سوداؔ کا شکوہ، نظیر کی عوامیت اور زندگی سے قربت، انیس و

شاعر ...



دہر کی ماضی پرستی، عہدِ وسطیٰ کے مافوق الفطرت کردار وں سے بے پناہ لگاؤ، رزم و بزم کے ہنگامے، پیر حسن کی عشقیہ اور بیانیہ شاعری، خود میری شاعری، جو عام طرز سے ہٹی ہوئی ہے اور غور و فکر کی دعوت دیتی ہے۔ اس کے علاوہ میری نثر جو ہمارے ادب سے بالکل ایک الگ شے ہے۔ کیا ہمارے یہاں ایک فطری انقلاب نہیں بپا رہا۔ کیا ہمارے ... ارتقا کے مختلف ادوار کو نہیں دیکھا ہے؟ کیا ہم ایسی تحریکوں سے دوچار نہیں ہوتے رہے ہیں پھر کیوں ہر بات ماننے میں مغرب سے سند ڈھونڈ کر لاتے ہیں اور اپنی ہر بات کا آغاز وہیں سے کرتے ہیں۔

غالب ابھی نہ جانے اور کتنی دیر تک بولے جاتے۔ کلاس میں سناٹا چھا گیا تھا۔ پروفیسر کے چہرے پر پسینے کے بے شمار قطرے ... وہ گھبراہٹ میں اپنی مختلف جیبوں میں رومال تلاش کرنے لگا۔ رومال اُس کے سامنے ہی میز پر پڑا تھا۔ غالب نے میز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "جناب رومال ادھر ہے" کلاس میں جیسے زلزلہ آ گیا اور غالب کلاس کے باہر نکل آئے۔

غالب ایک خالی کلاس میں آکر بیٹھ گئے۔ اتنے میں چپراسی اُس روز کی تازہ ڈاک لایا۔ اُن کے نام کئی رسالے آئے تھے۔ اس کے علاوہ بے شمار خطوط بھی تھے۔ غالب نے رسالوں کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا، پھر خطوط کی طرف متوجہ ہوگئے۔ ان میں دوستوں کے خطوط تھے، کچھ شاگردوں کے۔ کچھ خطوط ایڈیٹروں کے تھے، جن میں جدید غزلوں اور جدید ترین نظموں کی فرمائش کی گئی تھی۔

غالب نے اُن خطوط کو ایک طرف ڈال دیا۔ کچھ خطوط پرستاروں کے تھے، جن میں مختلف طبقوں کے افراد تھے کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلبا و طالبات سے لے کر دفتر کے بابو اور فلم اسٹار سبھی قسم کے لوگ شامل تھے۔ غالب نے طالبات اور فلم اسٹار کے خطوط چھانٹ کر ایک طرف کر لئے اور بقیہ ڈاک کو اپنے پلاسٹک کے بیگ میں ڈال دیا۔ پھر ایک سگریٹ سلگا کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی اور بڑے اطمینان سے ایک ایک خط کو کھولنے لگے۔ کچھ لفافوں میں دلنشیں تحریروں کے ساتھ ساتھ دلکش تصویریں بھی تھیں۔ غالب سگریٹ کے کش کے ساتھ اُن کا بغور مطالعہ کرتے اور تصویروں کو مختلف انداز سے دیکھتے جاتے۔ اُن کے ہونٹوں پر یہ شعر لرز رہا تھا ؎

چند تصویرِ بتاں چند حسینوں کے خطوط بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا

غالب ابھی ڈاک سے فارغ بھی نہیں ہوئے تھے کہ دفعتاً ایک ٹیڈی گرل جھپاک سے اُن کے کمرے میں داخل ہوئی اور بڑے ہی سُریلے انداز میں "ہیلو مائی پوئٹ" کہہ کر اُن سے مصافحہ کیا، جس پر معانقہ کا شک گزرتا تھا۔ غالب نے مسکرا کر اُسے بھی ایک کرسی پیش کی۔ تھیکس کی تہذیبی بیکاری اور جو ستونوں کی بے پناہ آندھی چلا کر کمرے کی محدود فضا میں اُس نے ہیجان پیدا کر دیا۔ کرسی پر بیٹھتے ہی اُس نے اپنا خوبصورت وینٹی بیگ کھول کر ایک چھوٹا سا معطر رومال نکالا اور اپنے پالے ہوئے خون رنگ" ناخنوں پر پھیرنے لگی۔ پھر ایک چھوٹا سا آئینہ نکال کر اپنے ہونٹوں کے زاویئے درست کرنے لگی۔ غالب نے جلدی جلدی تمام خطوط اور تصویروں کو بیگ میں رکھ کر زپ کھینچ دی، پھر اُس کی طرف متوجہ ہوئے۔

"اور کہیے محترمہ رابعہ خاتون آپ پھر یہیں؟"

"اوہ! نو!" اُس نے ہونٹوں کو قدرے سکیڑ کر کہا "دیکھیے مسٹر غالب، میں رُوبی ہوں، صرف رُوبی اتنا بڑا اور پُرانا نام مجھے ذرا بھی سُوٹ نہیں کرتا"

"آئی ایم ویری ساری" غالب نے معذرت چاہی۔

"یُو آر مائی مائی لو، ہر بار بھول جاتے ہیں" اُس نے پیار سے شراب کا ڈرم لُڑھاتے ہوئے کہا "میری کتاب کا نام "غالب۔ سب سے بڑا انقلابی" (GHALIB THE GREATEST REVOLUTIONIST) رہے گا پہلے انگریزی میں آکسفورڈ سے



پبلش کراؤں گی۔ اس کے بعد اردو ورژن میں آپ سے ٹرانسلیٹ کراؤں گی۔ آپ کا کیا خیال ہے؟" اُس نے فوراً انداز میں گردن کو قدرے خم کر کے پوچھا۔

غالب نے ٹالنے کی غرض سے جلدی سے کہا۔ "جو مزاج یار میں آئے۔"

"آپ کی لائف کی بھرپور عکاسی کرنے کے لئے آپ سے ذرا قریب رہنے کی ضرورت ہوگی تاکہ آپ کی صحیح صحیح تصویر پیش کر سکوں، ورنہ حالی کی "حیاتِ غالب" اور عبد اللطیف کی "غالب" کی طرح اس پر بھی کشتگی کا الزام آ جائے گا۔" کہتے کہتے وہ اور قریب کھسک آئی۔

غالب کرسی پر دوسری طرف جھکتے ہوئے بولے۔ "جی ہاں، بجا ارشاد ہے۔"

رُوبی نے یک بیک چونک کر کہا۔ "آپ اس گوشۂ ویراں میں کیوں بیٹھے ہیں۔ چلئے کنٹین چلتے ہیں۔" پھر وہ ناگن کی طرح لہرا کر کرسی سے اٹھی۔ معلق سا ڈوپٹہ کو شانوں پر جمایا اور جمپر کے مختصر دامن کو کھینچ کر گھٹنوں سے نیچے کیا اور غالب کو بازو سے پکڑ کر دروازے کی طرف بڑھی۔ غالب نے اس برق پارہ کو تنگ لباس میں مقید دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آ جائے ہے　　　میں "تجھے" دیکھوں، بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

کینٹین سے نکل کر غالب لائبریری کی طرف بڑھے تاکہ اخباروں کی سرخیاں دیکھ لیں۔ رُوبی کو انہوں نے اُس کی چند سہیلیوں کے حوالے کر دیا تھا۔ ابھی وہ یونیورسٹی ہی میں تھے کہ علامہ صہبائی مل گئے۔ علیک سلیک کے بعد غالب نے اُن کا حال دریافت کیا۔ علامہ نے بتایا کہ ان کی دن رات کی ان تھک محنت اور مسلسل دوڑ دھوپ سے وہ مدرسہ اب جیب سے ڈگری کالج ہو گیا ہے۔ وہی اس کے کرتا دھرتا ہیں۔ بڑی مشغولیت رہتی ہے اس لئے کہیں آنا جانا نہیں ہو پاتا ہے۔

غالب نے کہا۔ "اگر فارسی یا اردو میں کوئی ٹیوشن ہو تو مجھے دلوا دیجئے۔"

علامہ نے جواب دیا۔ "آج کل فارسی یا اردو میں کون ٹیوشن پڑھتا ہے۔ ہاں انگریزی، سائنس یا حساب میں کہیئے تو دلا دوں۔"

غالب نے مایوسی سے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "ان مضامین میں تو مجھے خود ہی ٹیوشن لینے کی ضرورت ہے۔"

علامہ نے پھر پوچھا۔ "آخر آپ کو یونیورسٹی میں داخلہ لینے کی کیا ضرورت پڑ گئی؟"

غالب نے رومال سے آنکھوں کے بھیگے ہوئے گوشوں کو خشک کرتے ہوئے جواب دیا۔ "ایک زمانہ تھا مرحوم دلّی کالج میں پروفیسری کے لئے بلایا گیا اور ذرا سی بات پر میں نے اس آفر کو ٹھکرا دیا تھا۔ آج کمبخت اسٹر کالجوں میں بھی معمولی نوکری کے لئے یونیورسٹی کی ڈگری مانگی جاتی ہے۔ کئی جگہوں پر کوششیں کیں، کتنی ہی سفارشیں گذاریں، مگر سبھی BOARD OF EDUCATION کے سرد قوانین کی موٹی موٹی بے حس فائلیں پیش کرتے ہیں۔ نوکری نہیں۔ آخر تھک ہار کر جو تھوڑے بہت زمیں داری بانڈ تھے، انہیں کو بیچ کر یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ جامعہ اردو علی گڑھ والوں کو اللہ جنت نصیب کرے کہ ان کی بدولت شارٹ کٹ سے مجھے ایم اے میں داخلہ مل گیا، ورنہ "کون" پھر جیتا تری زلف کے سر ہونے تک۔"

علامہ صہبائی بہت متاثر ہوئے۔ دلگیر آواز میں بولے۔ "خدا جلد آپ کو اس کڑی آزمائش سے کامیاب و کامراں نکالے۔"

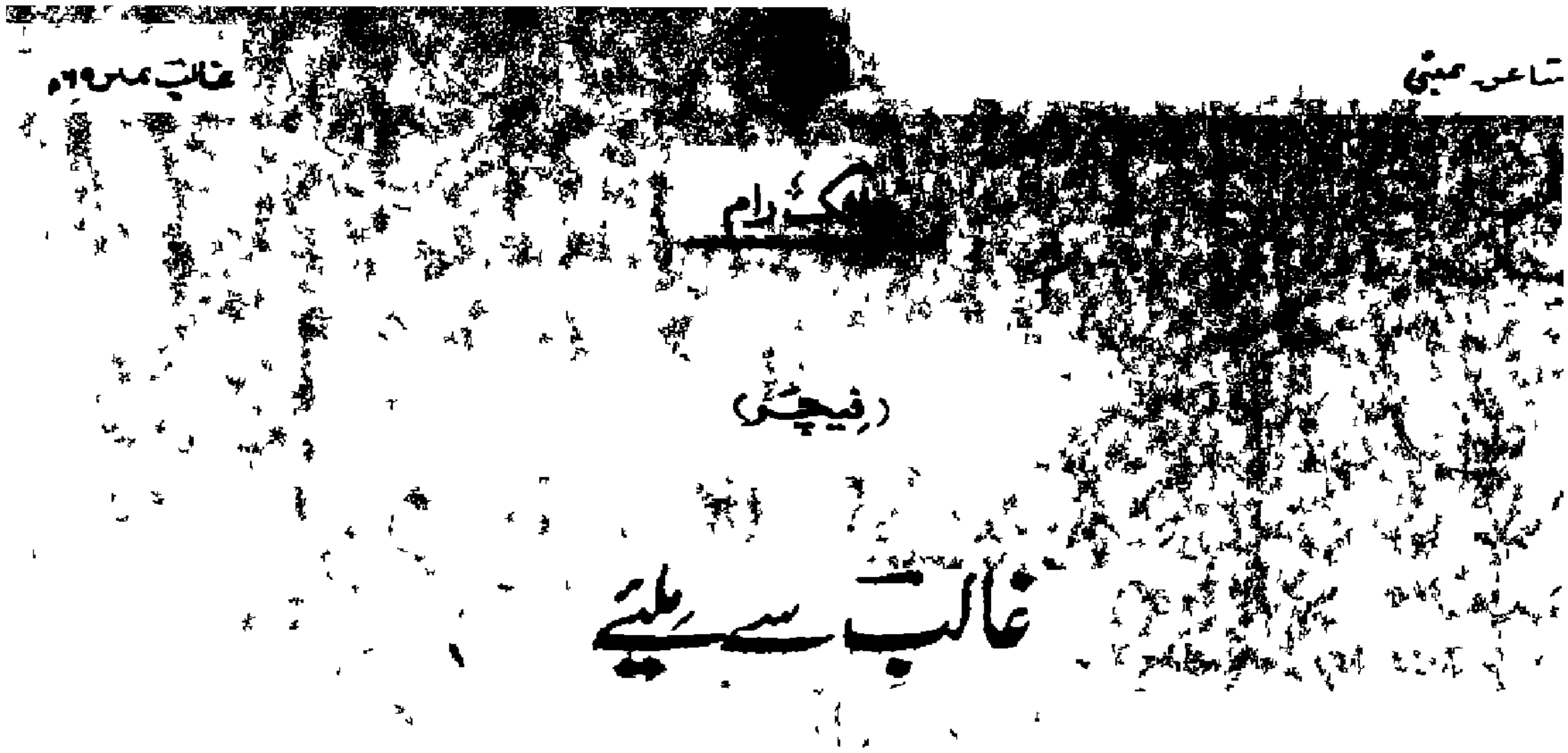
غالب نے حسرت سے جواب دیا۔ "ابھی دیکھتے جایئے حالات کی سنگینی اور ستم رانی کب تک اسی طرح برقرار رہتی ہے۔ ہمارے اور ساتھی کسی نہ کسی ٹھکانے لگ ہی گئے، ایک صرف ہم ہیں کہ ؎

رَو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھئے تھمے　　　نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

حکیم مومن خاں مومن کو دیکھئے کہ "ہمدرد" کی سول ایجنسی لے لی ہے اور مزے میں دن کاٹ رہے ہیں۔ شیخ ابراہیم ذوق کو حکومت ہند نے پدم بھوشن کا خطاب اور پانچ ہزار سالانہ کی پنشن باندھ دی ہے۔ اصطبلوں کو انہوں نے موثر گیراج میں

(باقی ۴۳۶ پر دیکھئے)


پردۂ ساز
SATHE



ڈرامہ

(فیچر)

غالب سے ملئے

راوی: جو لوگ اس جہان سے اٹھ چکے ہیں، ان میں سے کچھ ایسے ہیں جن کے بارے میں اکثر جی چاہتا ہے کہ کاش ہم اُن کی زندگی میں اُن سے مل سکتے۔ اُن میں سے ایک غالب بھی ہیں۔

غالب سے اب ملنا تو ممکن نہیں، لیکن آج کی صحبت میں ہم آپ کو تین ایسے اصحاب سے ملائیں گے جو غالب سے مل چکے تھے اور جو اپنی ملاقاتوں کا حال آپ کے لئے لکھ کر چھوڑ گئے ہیں۔ یہ حضرت غوث علی شاہ قلندر، خواجہ عزیز لکھنوی اور میر تقی میر بلگرامی ہیں۔

آئیے پہلے غوث علی شاہ سے ملئے۔

غوث علی شاہ قلندر سلسلۂ قادریہ کے مشہور بزرگ گذرے ہیں۔ اُن کے ملفوظات بڑے مشہور ہیں، جن میں اُن بچاسوں مقامات کا ذکر ہے جہاں جہاں کی انہوں نے سیاحت کی تھی اور بیسیوں اُن اصحاب کے نام ملتے ہیں جن سے انہیں ملنے کے مواقع حاصل ہوتے تھے۔ میرزا غالب سے اُن کی ملاقات زینت المساجد میں ہوئی جہاں وہ چھ مہینے گوشہ نشین رہے۔ وہیں اُن کی اور میرزا کی ملاقاتیں رہا کیں۔ اب اِن ملاقاتوں کا حال انہیں کی زبانی سنیے۔

غوث علی شاہ: ایک روز ہم مرزا نوشہ کے مکان پر گئے۔ نہایت حسنِ اخلاق سے ملے۔ لب فرش تک آکر لے گئے۔ تمام حال دریافت کیا۔ ہم نے کہا کہ مرزا صاحب ہم کو آپ کی ایک غزل بہت ہی پسند ہے، علی الخصوص یہ شعر ؎

تو نہ قاتل ہو کوئی اور ہی ہو   تیرے کوچے کی شہادت ہی سہی

مرزا غالب: صاحب یہ شعر تو میرا نہیں، کسی استاد کا ہے۔ شعر نہایت اچھا ہے۔ میں نے اِس زمین میں کچھ شعر کہے ضرور ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

(مرزا غالب ہلکے ترنم میں اپنے اشعار سناتے ہیں)

غالب: عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی   میری وحشت تری شہرت ہی سہی

قطع کیجے نہ تعلق ہم سے   کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے   غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی

عمر ہر چند کہ ہے برق خرام   دل کو خون کرنے کی فرصت ہی سہی

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے   بے نیازی تری عادت ہی سہی

یار سے چھیڑ چلی جائے اسدؔ
گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

غوث علی شاہ: جب تک میں دلی میں مقیم رہا، مرزا صاحب نے دستور سا لیا تھا کہ تیسرے دن زینت المساجد میں ہم سے ملنے آتے اور ایک خوان کھانے کا ساتھ لاتے۔ ہر چند ہم نے عذر کیا کہ یہ تکلیف نہ کیجئے مگر وہ کب ماننے والے تھے۔ ہم نے ساتھ کھانے کے لئے کہا تو کہنے لگے کہ میں اس قابل نہیں ہوں۔ بے حوار، رو سیاہ، گنہگار، مجھ کو آپ کے ساتھ کھاتے ہوئے شرم آتی ہے۔ البتہ اُولش کا مضائقہ نہیں۔ ہم نے بہت اصرار کیا تو طشتری میں لے کر کھایا۔



شاعرِ عجمیٔ

راوی: ایک روز کا ذکر ہے کہ مرزا رجب بیگ علی سرور لکھنؤ سے آئے۔ مرزا نوشہ سے ملے۔ اثنائے گفتگو میں پوچھا۔

رجب علی بیگ سرور: مرزا صاحب! آنکہ اردو زبان کس کتاب کی عمدہ ہے۔؟

غالب: چہار درویش کی!

رجب علی بیگ سرور: اور فسانۂ عجائب کیسی ہے؟

(مرزا غالب قطعِ کلام کرتے ہوئے کہہ اٹھتے ہیں)

غالب: اجی لاحول ولاقوۃ، اس میں لطفِ زبان کہاں۔ ایک تک بندی اور بھٹیار خانہ جمع ہے۔

راوی: اُس وقت تک مرزا کو یہ خبر نہ تھی کہ یہی میاں سرور ہیں۔ جب چلے گئے تو حال معلوم ہوا۔ سب افسوس کیا اور کہا،

غالب: ظالمو! پہلے سے کیوں نہ کہا۔

راوی: دوسرے دن مرزا، غوث علی شاہ کے پاس آئے اور قصہ سنایا۔

غالب: حضرت! یہ امر مجھ سے نادانستگی میں ہو گیا۔ آئیے آج اُن کے مکان پر چلیں اور کل کی مکافات کر آئیں۔

غوث علی شاہ: ہم اُن کے ہمراہ ہو لئے اور میاں سرور کی فرودگاہ پر پہنچے۔ مزاج پرسی کے بعد مرزا نے عبارت آرائی کا ذکر چھیڑا اور میری طرف مخاطب ہو کر بولے،

غالب: جناب مولوی صاحب! رات میں نے "فسانۂ عجائب" کو کھول کر دیکھا تو اُس کی خوبیٔ عبارت اور رنگینی کا کیا بیان کروں۔ انتہائی فصیح و ملیح عبارت ہے۔ میرے قیاس میں تو ایسی عمدہ نثر نہ پہلے لکھی گئی، نہ آگے لکھی جائے گی اور کیوں نہ ہو، اس کا مصنف اپنا جواب نہیں رکھتا۔

غوث علی شاہ: غرض اِس قسم کی بہت سی باتیں بنائیں۔ اپنی خاکساری اور اُن کی تعریف کر کے میاں سرور کو نہایت مسرور کیا۔ دوسرے دن اُن کی دعوت کی اور ہم کو بھی بلایا۔ اس وقت بھی میاں سرور کی بہت تعریف کی۔ میرزا صاحب کا مذہب یہ تھا کہ دل آزاری بڑا گناہ ہے۔

(وقفہ)

غوث علی شاہ: ایک دن ہم نے مرزا صاحب سے پوچھا، مرزا صاحب، آپ کو کسی سے محبت بھی ہوئی؟

غالب:

غالب: ہاں حضرت علی مرتضیٰ سے۔۔۔ اور آپ کو؟

غوث علی شاہ: واہ صاحب! آپ تو مغل بچہ ہو کر علی مرتضیٰ کی محبت کا دم بھریں۔ ہم اُن کی اولاد کہلائیں اور محبت نہ رکھیں۔ کیا یہ بات آپ کے قیاس میں آ سکتی ہے؟

(وقفہ)

راوی: ایک روز غوث علی شاہ قلندر اپنے مریدوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے کہ کسی نے مرزا غالب کے انتقال کی خبر سنائی۔

غوث علی شاہ: انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ہم واسطے خدا کے ہیں اور اُسی کی طرف لوٹ جائیں گے۔ افسوس ہمارے یہ دوست بھی ہمیں داغِ مفارقت دے گئے۔ نہایت خوب آدمی تھے۔ عجز و انکسار بہت تھا۔ فقیر دوست، مدحہ غایت اور خلیق از حد۔ اور فنِ شاعری میں تو اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ ایک روز ہم اُن کے پاس گئے تو انہوں نے اپنا یہ قطعہ سنایا ہے۔

(غوث علی شاہ یہ فارسی قطعہ مدھم آواز میں گنگناتے ہیں)

فرصت اگرت دست دہد مغتنم انگار
ساقی و مئی و ترانے و سرودے

زنہار ازاں قوم نہ باشی کہ فریبند
حق را بسجودے و نبی را بدرودے

(کسی ساز کی آواز) ــــــ وقفہ ــــــ (FADE OUT)

راوی: خواجہ عزیز الدین فارسی کے بڑے باکمال شاعر تھے۔ بزرگوں کا وطن کشمیر تھا، لیکن یہیں ہی میں لکھنؤ چلے گئے اور پھر وہیں کے ہو کے رہ گئے۔ خواجہ نے کشمیر کا سفر متعدد بار کیا تھا۔ ایک سفر کے دوران میں دہلی میں مرزا غالب سے بھی ملاقات کی تھی۔ اُس ملاقات کا حال انہیں کی زبان سے سنیے۔

خواجہ عزیز لکھنوی: ایک مرتبہ ہم لکھنؤ سے کشمیر جا رہے تھے۔ اتفاق سے کچھ دیر کے لئے دہلی اُتر پڑے۔ سرائے میں قیام کیا۔ پھر اسٹیشن پر جانے کے لئے بگھی منگوائی۔ ابھی بگھی آ رہی تھی کہ یکایک ہم کو خیال ہوا کہ حسنِ اتفاق سے دہلی آنا ہوا ہے تو مرزا غالب سے بھی ملاقات کر لینی چاہئے۔ فوراً بلی ماروں کا محلہ دریافت کر کے جانے کو مستعد ہوئے۔ کچھ دور چل کر

لوگوں سے پتہ دریافت کیا۔ اتنے میں ایک ملاقاتی مل گئے۔
کہنے لگے، چلئے میں مرزا صاحب سے ملاقات کرا دوں۔
مرزا صاحب کا مکان پختہ تھا۔ ایک بڑا پھاٹک
تھا، جس کی ڈول میں ایک کمرہ اور کمرے میں ایک چارپائی
بچھی ہوئی تھی۔ اُس پر ایک نحیف الجثہ آدمی، گندمی رنگ،
اسّی یا سی برس کا ضعیف العمر لیٹے ہوئے ایک کتاب سینے
پر رکھے ہوئے، آنکھیں گڑوئے ہوئے پڑھ رہے تھے۔ یہ
مرزا غالب تھے غالباً دیوانِ قاآنی ملاحظہ فرما رہے ہیں۔

خواجہ عزیز: ہم نے سلام کیا لیکن بہرے اِس قدر تھے کہ اُن کے
کان تک آواز نہ گئی آخر کھڑے کھڑے واپس آنے کا قصد
کیا تھا کہ غالب نے چارپائی کی پٹی کے سہارے کروٹ بدلی
اور ہماری طرف دیکھا۔

خواجہ عزیز لکھنوی: آداب عرض کرتا ہوں قبلہ!

غالب تبسمات آئیے آئیے۔ آپ کو آئے ہوئے دیر تو نہیں ہوئی۔

خواجہ عزیز: جی نہیں، آپ کے آرام میں مخل ہوا۔

(غالب مطلع کلام کرتے ہوئے کہتے ہیں)

غالب: بھائی آنکھوں سے تو کچھ سوجھتا بھی ہے لیکن کانوں سے
بہت کم سنائی دیتا ہے۔

خواجہ عزیز: مرزا صاحب نے ہم لوگوں کا نام و نشان پوچھا، پھر کہا،

غالب: مجھ سے ملنے آئے ہو تو ضرور کچھ نہ کچھ کہتے ہو گے۔ کچھ اپنا
کلام بھی سناؤ۔

خواجہ عزیز: ہم لوگ تو آپ کا کلام آپ کی زبانِ مبارک سے سننے
کی غرض سے آئے تھے۔

غالب: خیر، مجھ سے سن لینا، پہلے اپنے شعر تو سناؤ۔

خواجہ عزیز: بہتر، حکم کی تعمیل کرتا ہوں۔ (خواجہ عزیز یہ شعر
تحت اللفظ پڑھتے ہیں)

ہمہ مصرِ داغ از رشکِ حنائے کہ من دارم
زلیخا کور شد از حسرتِ حوالے کہ من دارم

غالب: بھئی خوب۔ لیکن "مہ مصر" نئی ترکیب ہے۔ "مہ کنعان" تو
سنا تھا، "مہ مصر" سننے میں نہیں آیا۔

خواجہ عزیز: قبلہ، صائب کہتا ہے



قصّہ ہر زلیخا بہر ہم چو ماہِ مصر یکے
چناں شود کہ چراغ پدید گردد روشن

غالب: بھئی بہت خوب کیا پیارا مطلع نکالا ہے تم نے۔

(لرزتی آواز میں غالب تحت اللفظ عجب لطف اور مزے سے
اِس مطلع کو پڑھتے ہیں)

ہمہ مصر است داغ از رشکِ حنائے کہ من دارم
زلیخا کور شد از حسرتِ حوالے کہ من دارم

(جب مرزا غالب دوسرا مصرع ختم کرنے کے قریب ہوتے ہیں تو
اندر سے ملازمہ بی وفادار کے قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے)

بی وفادار: سرکار، بیگم صاحبہ انتظار کر رہی ہیں۔ خاصہ دیر سے تیار ہے۔

غالب: بی وفادار! اب تو کھانا لگوا دو۔

خواجہ عزیز: حضرت رخصت فرمائیے۔ اب ہمیں اجازت دیجئے۔

غالب: ابھی آئے اور ابھی چل دئے۔ تشریف تو رکھئے۔

خواجہ عزیز: پھر کبھی حاضر ہوں گے۔ آج صرف تھوڑی دیر کے لئے
دہلی اُتر پڑے تھے۔ ریل کا وقت بالکل قریب ہے اور بگھی
سرائے میں کھڑی ہے۔ اسباب بندھا ہوا رکھا ہے۔ یا مرکاب
آپ سے ملنے آئے تھے اب اجازت چاہتے ہیں۔

غالب: آپ کی عنایت اِس تکلیف فرمائی سے یہ تھی کہ میری صورت اور
کیفیت ملاحظہ فرمائیں۔ ضعف کی حالت دیکھی کہ اُٹھنا بیٹھنا
دشوار ہے۔ بصارت کی حالت دیکھی کہ آدمی کو پہچانتا نہیں ہوں۔
غزل پڑھنے کا انداز ملاحظہ کیا۔ کلام سنا۔ اب ایک بات باقی
رہ گئی ہے کہ میں کیا کھاتا ہوں اور کتنا کھاتا ہوں۔

خواجہ عزیز: اتنے میں کھانا آگیا۔ دو پھلکے اور ایک طشتری میں
بُھنا ہوا گوشت، جس میں کچھ میوہ بھی پڑا ہوا تھا۔ پھلکے کا
باریک پرت لے کر دو چار نوالے مشکل کھائے اور کھانا بڑھا
دیا۔ اب دیر ہو چکی تھی۔ ہم لوگوں نے اجازت لی اور رخصت
ہو گئے۔

(کسی سارنگی آواز ——— فیڈ آؤٹ)

راوی: میر قصیر بلگرامی کے بزرگوں کا وطن بلگرام تھا۔ خود اُن کی ولادت
مارہرہ میں ہوئی لیکن پانچ ہی برس کی عمر میں بہار کے مردم خیز
قصبہ "آرہ" میں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔



کم عمر ہی تھے کہ شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ پندرہ برس کے تھے کہ حیرؔ بلگرامی کے شاگرد ہوئے۔ بیس برس کے تھے کہ اماؔن علی کے شاگرد ہوئے۔ پچیس سال کی عمر میں مرثیہ گوئی کا شوق پیدا ہوا اور دبیرؔ کے سلسلے میں داخل ہوئے۔ ۱۲۸۰ھ کے لگ بھگ فارسی کی طرف متوجہ ہوئے اور اس رشتے سے کہ حضرت صاحبِ عالم مارہروی اُن کے ماما تھے وہ غالبؔ کے شاگرد ہوئے اور ۱۲۸۲ھ میں ایک لمبا سفر کر کے مرزا غالبؔ کی خدمت میں پہنچے اور دو ڈھائی ماہ تک اُن کے پاس مقیم رہے۔ آپ ان سے مرزا غالبؔ کی ملاقات کا حال سنیے،

صفیرؔ بلگرامی۔ ۱۲۸۰ھ میں، میں اپنے ماما حضرت صاحبِ عالم مارہروی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہاں حضرت غالبؔ کا چرچا اور اُن کا ذکر بہت پایا۔ ماما صاحب سے اور غالبؔ سے ایک ربطِ خاص تھا، مگر لطف یہ کہ ملاقات کی نوبت عمر بھر نہ آئی۔ میں نے خواہش ظاہر کی کہ حضرتِ غالبؔ کا شاگرد ہو اور ایک عریضہ چند غزلوں کے ساتھ مارہرہ سے روانہ کیا۔ حضرت غالبؔ نے آٹھویں دن جواب میرے خط کا لکھا اور غزلیں اصلاح دے کر واپس کر دیں۔ اُس وقت سے خط و کتابت رہی۔ یہاں تک کہ حضرت کے اشتیاق نے ۱۲۸۲ھ میں بے اختیار دہلی چلنے کی تحریک کی۔ اپنے منجھلے ماموں حضرت شاہ عالم کے ساتھ مع چند ملازموں کے روانۂ دہلی ہوا۔ آموں کا موسم تھا۔ حضرت صاحبِ عالم نے اپنے باغ کے آموں کا ایک ٹوکرا بھر کے قریب دو ہزار کے، میرے ساتھ کر دیئے۔ میں علی گڑھ سے دہلی روانہ ہوا۔ دس بجے سب کو دہلی پہنچا۔ شہر حمایار قلعے کے پیچھے سڑک سے صبح کو جامع مسجد کو باہر سے دیکھتا ہوا، محلّہ بلّی ماراں میں حضرت غالبؔ کے پاس پہنچا۔ حضرت برآمدے میں بیٹھے کلی پی رہے تھے۔ گرمی کے دن تھے۔ صفر کا مہینہ تھا۔ حضرت کا لباس اُس وقت یہ تھا۔ پاجامہ سیاہ لوٹے دار، دو لیا کالی دار، جعہ شرح قد کا، بدن پر مرزائی۔ سر کھلا ہوا۔ سرخ و

سفید رنگ۔ داڑھی دو انگل کی۔ مونچھیں بڑی۔ قد لمبا۔ ولایتی چہرہ۔ آنکھوں میں نور موجود تھا۔ کان کی سماعت میں کچھ ثقل آچلا تھا۔ ماموں حضرت شاہ عالم کو دیکھتے ہی بشاش بشاش ہو گئے۔ اس کے بعد میں سامنے موجود ہوا۔ پوچھا،

غالبؔ: شاہ صاحب! آئیے آئیے۔ آپ کا مزاج اچھا ہے؟ اور یہ آپ کے ساتھ کون صاحب ہیں؟

صفیرؔ بلگرامی۔ میں ہوں آپ کا پیار مند اور حلقہ بگوش صفیرؔ!

شاہ عالم یہ میرے بھانجے سید فرزند احمد صفیرؔ بلگرامی ہیں۔ آپ کی زیارت اور اشعار پر اصلاح لینے کے لئے مارہرے سے حاضر ہوئے ہیں۔

غالبؔ، کیسی باتیں کرتے ہیں۔ میری زیارت! میں عاصی، بے نوا، رُوسیاہ۔ یہ تو میرے مخدوم اور میرے دوست روحانی کے فرزند ہیں۔ رہی اصلاحِ اشعار، تو اس واسطے کو میں نے یوں سمجھ لیا ہے کہ میں مولا علیؑ کا بوڑھا غلام ہوں، جنہوں نے اپنی اولاد میں سے ایک صاحبزادہ میرے سپرد کر دیا ہے۔ اور حکم دیا ہے کہ تو اس کے کلام کو دیکھ لیا کر۔ ورنہ میں کہاں اور یہ ریاضت کہاں۔

صفیرؔ بلگرامی، ماما صاحب اکثر آپ کو یاد فرماتے ہیں۔

غالبؔ اُن کا کرم ہے، مہربانی ہے۔ حضرت اب کیسے ہیں؟ بہت دنوں سے ان کا کوئی والا نامہ تشریف نہیں لایا۔

صفیرؔ بلگرامی: اچھے ہیں۔ اپنے معمولات کے علاوہ خانقاہ کی ذمہ داریوں کی وجہ سے بہت مشغول رہتے ہیں۔ آپ نے مارہرہ آنے کا اُن سے وعدہ کیا تھا۔ اُنہوں نے یاددہانی کے لئے مجھے چلتے وقت کہہ دیا تھا۔

غالبؔ خداوند مجھے مارہرے بلاتے ہیں اور میرا قصد مجھے یاد دلاتے ہیں۔ اُن دنوں کہ دل بھی تھا اور طاقت بھی تھی، شیخ شمس الدین مرحوم سے بطریقِ تمنا کہا تھا کہ جی یوں چاہتا ہے کہ برسات میں مارہرے جاؤں اور دل کھول کر اور پیٹ بھر کر آم کھاؤں، اب وہ دل کہاں سے لاؤں اور وہ طاقت کہاں سے پاؤں۔ نہ آموں کی طرف رغبت، نہ معدہ میں اتنے آموں کی گنجائش۔



(پہلو بدل کر) ۔۔۔ وقفہ ۔۔۔ بے تکلف عرض کرتا
تھا، اب آم کھاتا تھا، اتنے کہ پیٹ اپھر جاتا
تھا اور دم پیٹ میں نہ سماتا تھا۔ اب بھی کھاتا
ہوں، مگر دس بارہ۔ اگر پیوندی آم بڑے ہوئے تو پانچ سات۔

(غالب ایک ٹھنڈی آہ بھر کر یہ شعر پڑھتے ہیں)

دریغا کہ عہدِ جوانی گذشت
جوانی مگو، زندگانی گذشت

غالب: آؤ ہم تم حضرت صاحب عالم کے پاس چلیں اور ربیع الکبیر
اُن کے لئے مبارک سے تنلیں۔ میں سلام کروں گا۔
تم سناکہ غالب یہی ہے۔ اہلِ دہلی میں آپ کے دیدار کا
طالب یہی ہے۔ میں نے عرم قدموسی کیا، پیر و مرشد
نے مجھے گلے لگالیا۔ فرماتے ہیں "غالب تو اچھا ہے؟"
عرض کرتا ہوں کہ "الحمد للہ، حضرت کا مزاجِ مقدس
کیسا ہے؟" ارشاد ہوا "مولوی سید برکات حسن میری
بہت تعریف کرتے رہتے ہیں" "جناب یہ اُن کی خوبیاں
ہیں۔ میں ایسا نہیں جیسا وہ کہتے ہیں۔ کاش وہ میری
رنجوری کا حال کہتے۔ ضعفِ قویٰ اور اضمحلال کی کیفیت
سناتے، تاکہ میں اُن کے کلام کی تصدیق کرتا۔ اُن کی غمخواری
اور دردمند نوازی کا دم بھرتا

"اے وائے رنجوریٔ دیدار، دگر ہیچ"

اب اس موسم میں سفر کیا کروں حضرت کے دیکھنے کے
واسطے متحمل رنجِ سفر ہوں گا تو جاڑے میں، اس برسات
۔۔۔۔

(قدموں کی آہٹ۔ کلو وارد ہوتا ہے)

کلو: سرکار، نواب ضیاءالدین خاں صاحب تشریف لائے ہیں۔
غالب: انہیں لے آ اور دیکھ، حقہ ٹھنڈا ہوگیا ہے دوبارہ چلم بھر دے۔
صفیر بلگرامی: نواب ضیاءالدین صاحب تشریف لے آئے۔ حضرت
نے مجھے اُن سے ملایا۔ وہ وجیہہ آدمی، رئیسوں کی وضع
پر تھے۔ کرتہ پہنے، غلطہ دار پاجامہ، سر پر ٹوپی، حریب
ہاتھ میں۔ حضرت نے اُن سے میرا حال کہا اور فرمایا "یہ میری
ملاقات کو آرہ سے آئے ہیں۔" اس کے بعد پھر اُن سے

سرگوشی ہوئی۔ جب وہ اٹھ گئے اور دوپہر قریب ہوئی تو
حضرت اُٹھے اور مجھے اور میرے ساتھیوں کو اپنا تمام مکان
دکھایا۔ ہر جگہ نشان دیتے جاتے تھے کہ یہ مقام فلاں کام
کے لئے اور یہ فلاں کام کے واسطے۔ آخر زینے کے پاس
آئے اور چھت پر چلے۔ ہم لوگ بھی ساتھ تھے۔ اُوپر جاکر
دیکھا تو بہت بڑی چھت تھی اور اس کے کونے پر ایک
کمرہ گلی کے رُخ سا بنا ہوا تھا۔ ۔۔۔ (دُور آواز)

غالب: دیکھئے، یہ میری فرودگاہ ہے۔ یہی میرے بیٹھنے
اُٹھنے، سونے جاگنے، جینے مرنے کا محل ہے۔ بلا مبالغہ کہتا
ہوں کہ یہاں آدھی رات تک دھوپ رہتی ہے۔ ہوں،
ہوں، ہوں (ہنستے ہیں)

غالب: آپ سمجھے؟

صفیر: جی ہاں، یعنی گرمی کے دن اور دہلی کی گرمی اور تمازتِ آفتاب
سے در و دیوار اس قدر۔۔

غالب: جلتے ہیں کہ آدھی رات تک اُن کی گرمی فرو ہوتی ہے۔

(دونوں ہنستے ہوئے زینے سے اترتے ہیں)

غالب: اس مکان کے دکھانے سے میرا مطلب یہ تھا کہ میرے مکان
میں گنجائش نہیں اور آپ مہمانِ عزیز ہیں، اس لئے
ضیاءالدین خاں صاحب کا مکان جو جامع مسجد کے قریب
ہے، آپ کے واسطے تجویز ہوا ہے۔ گو تھوڑا سا دُور ہے،
مگر آرام بہت ملے گا

صفیر: میں تو آپ سے قریب ہی رہنا چاہتا تھا۔

غالب: کچھ ایسا دُور بھی نہیں ۔۔۔ (پکارنا۔ آواز) کلوا

(خاموشی۔ وقفہ)

(آواز۔ کلو پیارعلی ارے تم سب کہاں چلے گئے؟)

پیارعلی: (دُور کی آواز) آیا سرکار (پیارعلی ہانپتا ہوا آتا ہے)
جی سرکار!

غالب: ان لوگوں کو ضیاءالدین خاں کے مکان تک پہنچا دیجئے۔

صفیر: نواب صاحب کا مکان عالی شان تھا ایک بڑا پھاٹک
سڑک کے کنارے، جس پر ایک سنگِ خوش نما، اس کے
اندر ایک جاں فزا تروتازہ، اس کے بعد ایک دیوان



عالی شان، فرش فروش سے آراستہ، سجا سجایا غرض بہت خوب مکان تھا۔ شہر کے اہم سب چیدہ آدمی تھے، اس مکان کے ایک کونے میں سما گئے۔ اچھی اچھی طرح بیٹھے بھی نہ پائے تھے کہ پانچ خوان، جن پر خوان پوش خوش نما پڑے تھے، آئے۔ معلوم ہوا، کھانا ہے۔ بہت خوش گوار اور مزے دار تھا۔ قورمہ، قلیہ، شیرمال، پلاؤ، زردہ، شیر برنج، متنجن، کباب، پراٹھا، سب کچھ تھا۔ ایک خوان میں کچھ آم بھی تھے۔ کھانے کے بعد آم جو کھائے میٹھا، صورت حرام نظر آئی۔ بالکل کھٹے۔ میں پورب کے آم کھائے ہوئے تھا، بڑی نفرت ہوئی۔ اپنے ساتھ کے آم نکال کر کھائے۔ اُن سے کہیں بہتر پائے۔ پھر تو میں نے نصف ٹوکرا حضرت غالب کی خدمت میں بھیج دیا۔ وہاں سے تھوڑی دیر کے بعد ایک رُباعی لکھ کر آئی، جس کا آخری مصرع مجھے یاد رہ گیا ہے۔

"کھانا ہے اسے اگر یہ پیارے ہیں آم"

اور سب آم منگا لیئے۔

صفیر: ایک دن قریب دوپہر کے پلنگڑی پر لیٹے ہوئے تھے اور میں قریب ہی کے حاضر تھا۔

غالب: کیوں حضرت، برف کا پانی پیو گے؟

صفیر: کوثر کا پانی ملتا ہو تو پلوائیے۔

غالب: (ہنستے ہوئے) ضرور، ضرور (پکار کر) ابے لڑکے پیارے علی

پیارے علی: جی سرکار، آپ نے مجھے پکارا۔

غالب: ٹھنڈے کنویں سے پانی لے آؤ۔

صفیر: لیکن حضور نے تو برف کا پانی کہا تھا۔

غالب: (قہقہہ لگا کر) برف ہی کا ہے میر صاحب برف ہی کا ہے۔

(وقفہ ــــ صفیر کا پانی پینا)

صفیر: واقعی بہت سرد ہے ــــ اور بہت شیریں ہے۔

غالب: اس پانی کا شکر کس منہ سے ادا کروں۔ اتنا میٹھا کہ پینے والا گمان کرے کہ یہ پھیکا شربت ہے۔ سُبک۔ گوارا۔ بے شبہ چشمۂ آبِ حیات کی کوئی سوت اس میں ملی ہوئی ہے۔ خیر، اگر یوں بھی ہے تو بھائی آبِ حیات عمر بڑھاتا ہے مگر اتنا شیریں کہاں ہوگا۔

صفیر: ایک دن مرزا مجھ سے کہنے لگے۔

غالب: آپ کہتے ہوں گے کہ غالب خود اچھی اچھی چیز کھاتا ہوگا اور میرے کھانے کے لئے معمولی پلاؤ، قورمہ، شیرمال وغیرہ بھیج دیتا ہوگا۔ میرا کھانا بھی آپ دیکھ لیجے۔

صفیر: گیارہ بجے دن کو آپ کا کھانا ایک سینی میں آیا۔ ایک دسترخوان بچھایا گیا۔ اس پر ایک چینی کے پیالے میں شوربا اور ایک تانبے کی رکابی میں پاؤ بھر گوشت کی بوٹیاں اور ایک رکابی تانبے کی خالی۔ پھر مرزا کے ایک رفیق آ کر بیٹھے۔ اُنہوں نے پھلکوں کے کنارے توڑ کر ٹکڑے کئے اور خالی رکابی میں رکھے پھر ایک چمچے سے تھوڑا گھی اور شوربا لے کر اُن ٹکڑوں کو ملایا اور خوب ملا کر حلوے کی طرح بنا کر لقمے کے اندازے ایک طرف رکابی میں رکھ دیا۔ اتنے میں حضرت پلنگڑی سے اُترے اور دسترخوان پر آ بیٹھے۔ پہلے وہ دونوں لقمے نوش جان فرمائے۔ اُس کے بعد آدھا پیالہ شوربا پی گئے۔ بعد اس کے دو پھلکوں کے دو چھلکے لے کر شوربا ملا ملا کر کھائے، اس پر بقیہ شوربا پی لیا اور کھانا ختم کر دیا۔

غالب: لو بھائی، کھانا ختم ہوا۔ بس میری غذا یہی ہے۔ شب کو پاؤ بھر بادام نمک میں تلوا کے کھا لیتا ہوں (وقفہ)

صفیر: ایک دن پنکھے کے میلے میں دس روپے دیکر بیچے غریبوں کی طرح مجھے بھی پھرایا۔ وہ میلہ بھی قابلِ دید تھا۔ دہلی کا میلہ کیا کہنا ہے۔ جامع مسجد کو دیکھا، تبرکات کی زیارت کی، چوک کی سیر روز کرتا تھا۔ بازاروں میں پھرتا تھا مگر دہلی عجیب مقام ہے جہاں کسی کو کسی سے کام نہیں۔ چیزوں کی خریداری کرو، دام پوچھو، چیز لو، دام دو۔ کسی نے کبھی نہ پوچھا کہ تم کون ہو، کہاں کے رہنے والے ہو۔ ایک دن مرزا غالب مجھے مولوی صدر الدین صاحب آزردہ کے پاس لے گئے۔ خواجہ امان صاحب مرحوم بوستانِ خیال میری ملاقات کو چند بار تشریف لائے اور بہت تپاک سے ملے۔ دو مرتبہ مشاعروں میں گیا۔ غرض دہلی میں کئی ماہ رہا۔ قلعہ کی خوب سیر کی۔ حضرت غالب سے بہت فیض اٹھایا اور اُن کی صحبت سے بہت لطف اندوز ہوا۔

رمضان ۱۲۸۲ھ میں میں آرہ چلا گیا۔ جب تک حضرت غالب کے ہوش و حواس درست رہے خط و کتابت جاری رہی۔

ڈاکٹر حامدی کاشمیری

حسرتِ تعمیر!

(غالب کی شخصیت اور آرٹ پر ایک اسٹیج ڈرامہ)

کردار

غالب ___ امراؤ بیگم ___ مولانا فضلِ حق ___ حکیم رضی الدین خاں ___ منشی نبی بخش حقیر
حالی ___ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ ___ میر مہدی مجروح ___ متھرا داس ___ درباری مل ___
مالکِ مکان ___ کلو ___ مداری ___ چند گورے سپاہی وغیرہ ___

[پردہ اٹھنے پر ایک دیوان خانہ نظر آتا ہے، جس میں چاندنی کا فرش ہے۔ صدر میں قالین اور دو تین گاؤ تکیے۔ ایک طرف تپائی پر مٹی کی صراحی ہے۔ پاس ہی چند گلاس، کمرے میں ایک دیوان لگا ہوا ہے۔ اس پر ایک گاؤ تکیہ ہے۔ دائیں ہاتھ کی طرف پھول ہے۔ پیتل کا گلدان چند کتابیں بکھری ہوئی ہیں۔ پاس ہی کاغذ، قلم اور دوات ہے۔ تکیے کے قریب چاندی کا پاندان ہے۔ دیوان کے قریب ایک خالی پلنگڑی ہے۔ کمرے کے بائیں طرف ایک چھوٹا سا عقبی کمرہ دکھائی دے رہا ہے۔]

غالب: (اسٹیج کے دائیں طرف سے دیوان خانے میں داخل ہوتے ہیں۔ کمرے پر ایک سرسری سی نظر ڈالتے ہیں۔ چہرے پر تھکاوٹ اور افسردگی ہے۔ رومال سے ماتھے کا پسینہ پونچھتے ہیں۔ کھڑے کھڑے کچھ سوچتے ہیں۔ آنکھوں میں وحشت اور بے چینی ہے۔
(تحت اللفظ پڑھتے ہیں گمبھیر آواز میں)

گریہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانے کی
در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا
وائے دیوانگیِ شوق کہ ہر دم مجھ کو
آپ جانا اُدھر اور آپ ہی حیراں ہونا

(رک کر) صحرا صحرا بھٹکتا ہوں اور صحراؤں کی خاک چھاننے سے مجھے کوئی تدبیر روک نہیں سکتی۔ ایک جگہ ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں۔ اب دیوانگی سے سر بھی وبالِ دوش ہو رہا ہے اور صحرا میں کوئی دیوار بھی نہیں میرے خدا ___ اُف ___ وہ! تنہائی کا یہ عالم۔ یہاں میرا سایہ بھی مجھ سے بھاگتا ہے۔ آرزو آرزو کی شکست کا نام ہے۔ دل کی شکست، ایک آئینہ کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے اور میں آئینہ خانے میں حیران کھڑا ہوں۔ کتنا سناٹا ہے! میں بھی گویا خاموشی کی تصویر ہوں۔ میری خاموشی میں لاکھوں خوں گشتہ آرزوئیں پوشیدہ ہیں (چونک کر، دائیں بائیں دیکھتے ہیں) ارے، میں کن خیالوں میں کھو گیا؟ کوئی ہے؟ کلو میاں، مدار خاں ___ مداری۔ کتنی خاموشی ہے! ___ یہ سب لوگ کہاں چلے گئے۔ اُف، کتنی گرمی ہے۔ آگ برس رہی ہے۔ ارے



گھر میں کوئی ہے۔ نہ جانے سب کہاں مر گئے ہیں۔
بیگم تو بس جانے نماز سے اُٹھنے کا نام نہیں لیتیں
کہاں ہے، آسی پر ہیزگار اور متّقی خاتون کو کس رُوسیاہ
کے پلے باندھا گیا ہے۔

کلّو: (اندر آکر) سرکار — سرکار آپ تشریف لائے ہیں؟

غالب: میاں تم کو اس میں اب بھی شک ہی ہے دلچسپ آدمی ہے،
"ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے"۔

کلّو: نہیں سرکار (کھسیانی سی ہنسی ہنس کر) آئیے حضور، میں آپ
کا جُبّہ ٹانگ دوں ذرا۔

غالب: یہ لو بھائی۔ (کلّو جُبّہ لے کر کھونٹی پر ٹانگ دیتا ہے)

کلّو: کوئی شربت لاؤں آپ کے لئے، کہئے تو شربتِ بادام لے آؤں۔

غالب: خالص ٹھنڈا پانی پینا چاہتا ہوں۔ اور ہاں کلّو حقّہ تازہ
کر کے لاؤ۔

کلّو: جو حکم سرکار، ابھی لاتا ہوں (کلّو صُراحی سے پانی کا گلاس
بھر لیتا ہے اور غالب کو پلاتا ہے۔ غالب جُوتی اُتار کر دیوان
پر گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھتے ہیں) سرکار؟

غالب: کیا بات ہے؟

کلّو: ابھی کچھ دیر پہلے حکیم صاحب آئے تھے۔

غالب: حکیم صاحب، کون حکیم صاحب؟

کلّو: حکیم رضی الدین خاں صاحب۔

غالب: اوہ سمجھا، اچھا تو وہ بیٹھے نہیں؟

کلّو: نہیں حضور، پھر آنے کو کہہ گئے ہیں۔

غالب: خوب! (سوچتے ہوئے)

احباب چارہ سازیٔ وحشت نہ کر سکے
زنداں میں بھی خیال بیاباں نورد تھا

(کلّو سے) اور ہاں، بیگم کہاں ہیں؟ ہمارے آنے کی
اطلاع نہیں کر دی؟

کلّو: ہاں سرکار، اطلاع تو کر دی لیکن ...

غالب: لیکن کیا؟

کلّو: وہ عصر کی نماز کے بعد ...

غالب شام کی نماز کی نیت باندھ رہی ہیں (ہنس کر)

یہی کہنا چاہئے ہونا؟ خوب۔ اس ایک بات کو تو محض
صوم و صلوٰۃ اور وظیفہ خوانی سے کام ہے، لیکن ایک
ہم ہیں کہ — کہ خدا سے ناکردہ گناہوں کی حسرت کی داد
طلب کر رہے ہیں۔

امراؤ بیگم: (اندر آکر) اے ہے کیا کہہ رہے ہو تم۔ ابھی گھر
میں قدم نہیں رکھا کہ لگے اوٹ پٹانگ باتیں کرنے۔ صبح
کے نکلے ہو اور اب گھر کی یاد آئی ہے۔ (نوکر سے) تم جاؤ
کلّو اور شامی کباب کی پلیٹ اِن کے لئے لاؤ۔ انہیں بھوک
لگی ہوگی۔

غالب: خوب کہا بیگم، اب گھر کی یاد آئی ہے ؎

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

امراؤ بیگم: یہ گھر دشت لگ رہا ہے تو اسے بدلتے کیوں نہیں؟

غالب: عمر بھر یہی تو کرتا رہا ہوں۔ دردر کی خاک چھاننا ہی ہمارا
مقدر ٹھہرا۔ یاد نہیں بیگم؟ برسات میں ہمارا کیا حال ہوا۔
دیوان خانے کا حال محلسرا سے بدتر ہوا۔ تم کہتی رہیں، ہائے
دبی، ہائے مری۔ میں مرنے سے نہیں ڈرتا، فقدانِ راحت
سے گھبراتا ہوں۔ چھت چھلنی ہے۔ ابر دو گھنٹے برسے تو
چھت چار گھنٹے برستی ہے —

؎ اُگ رہا ہے در و دیوار سے سبزہ غالب
ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

امراؤ بیگم: بالکل صحیح ہے۔

غالب: (یاد کرتے ہوئے) اچھا یہ بتاؤ، تمہارے دتّے وہ جو ایک
کام کر گیا تھا۔

امراؤ بیگم: ہاں ہاں۔ اُس مکان کی محل سرا کو دیکھنے کو کہہ گئے تھے۔

غالب: دیکھی تم نے؟

امراؤ بیگم: جی ہاں، میں گئی تھی وہاں۔

غالب: کہو، کیسا مکان ہے۔ مجھے تو دیوان خانہ بہت پسند آیا۔

امراؤ بیگم: مکان تو ٹھیک ہے، لیکن — لیکن محل سرا مجھے —
کچھ — پسند نہیں۔

غالب: کیوں، اُس میں کیا بُرائی ہے؟



امراؤ بیگم: (آہستگی سے خوف آلود لہجے میں) سنا ہے بلائیں رہتی ہیں۔

غالب: (ہنس کر) ٹھیک ہے... تم سے بھی بڑھ کر کوئی بلا ہے؟

امراؤ بیگم: (روٹھ کر) جی ہاں، میں تم کو بلا ہی نظر آتی ہوں۔ میں کہتی ہوں تم کو ہو کیا گیا ہے؟

غالب: مجھے کچھ نہیں ہوا ہے صرف سچی بات زبان پر آتی ہے، اس لئے کہ جھوٹ کہنے کی مجھے عادت نہیں۔

گردم زن مہ شیطاں طوق لعنت
سپیر و مدار رہ تکریم و تذلیل
لیکن مدار اسیری طوقِ آدم
گرباں تر آمد از طوقِ عزازیل

امراؤ بیگم: (غصّے میں) ہاں ہاں، میں تمہارے لئے طوقِ لعنت ہی ہوں نا! کاش مجھے موت ہی آتی۔

غالب: موت؟ (ہنستے ہیں) پچھلے دنوں اسی شہر میں وبا پڑی لیکن ایک ستّر برس کے بڈھے اور ستّر برس کی بڑھیا کو نہ مار سکی، تف بریں وبا!

امراؤ بیگم: تم کو بس ایسی ہی الٹی سیدھی باتیں سوجھتی ہیں۔ سچ مچ اب بوڑھے ہونے کو آئے لیکن یہی عادتوں سے باز نہ آئے۔ یہ موئی شراب ایسی منہ سے لگی ہے کہ

غالب: چھٹی نہ شراب پر اب بھی کبھی کبھی
پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں

لیکن سچ تو یہ ہے:

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
یک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیئے

(ہنس کر) لیکن تمہیں اس سے کیا تکلیف ہوتی ہے؟ تم نے تو اپنے کھانے پینے کے برتن الگ کر رکھے ہیں۔

امراؤ بیگم: (رکتے ہوئے) یہ تو ہے، لیکن

غالب: (مضطرب ہو کر) بیگم، تم مجھ سے میری قوتِ گفتار چھین لینا چاہتی ہو۔ میرے اندر کے نغموں کو موت کی نیند سلا دینا چاہتی ہو، تاکہ میں گھٹ گھٹ کر مر جاؤں۔ نہیں ـــ نہیں،

تم اتنی ظالم نہیں ہو ـــ تم اتنی ظالم نہیں ہو ـــ تم جانتی ہو کہ جام رقص میں آ جاتا ہے اور میرے ہونٹوں پہ نغموں کے ستارے روشن ہوتے ہیں۔

پھر دیکھئے اندازِ گل افشانیِ گفتار
رکھ دیجئے پیمانۂ و صہبا مرے آگے

کلّو: (جلدی سے اندر آ کر) سرکار سرکار۔ حکیم صاحب اور مولانا فضلِ حق صاحب تشریف لائے ہیں۔

غالب: (تکیہ کے سہارے اٹھتے ہوئے) پُرسکون لہجے میں، انہیں اندر لے آؤ۔

امراؤ بیگم: اچھا میں کچھ کھانے کے لئے بھجواتی ہوں۔ دوا بھی تو تیار کر رکھی ہوگی۔

غالب: نہیں بیگم، ابھی کچھ کھانے کی خواہش نہیں۔ طبیعت بجھ سی گئی ہے۔ دل کی یہ حالت ہو گئی ہے کہ سانس لینا بھی مشکل ہو رہا ہے۔ تسلیم و رضا کا میں قائل تو ہوں، لیکن جب رنج و غم اپنی طاقت سے زیادہ ہوں تو کیا کروں؟ دل تو دل ہی ہے پتھر نہیں ہے، گھبرا جاتا ہے (لمبی آہ کھینچ کر) کیا کروں؟ خانہ داری کی ضرورتیں ہیں کہ بڑھتی ہی جا رہی ہیں اور اپنے پاس تو بس اللہ کا نام ہے۔ گھر میں جو آتا تھا سب ختم ہوا۔

کوئی امید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

امراؤ بیگم: (آہ کھینچ کر) خدا کارساز ہے۔ تم خدا پر بھروسہ رکھو۔

غالب: زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالبؔ
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

(حکیم رضی الدین خاں اور مولانا فضلِ حق آتے ہیں)

غالب: (لفظوں کو پھیلاتے ہوئے) آئیے حضرات آئیے، تشریف لائیے۔

(دونوں آداب کہہ کر بیٹھ جاتے ہیں)

حکیم صاحب: مرزا صاحب کہئے طبیعت کیسی ہے؟

غالب: بس زندہ ہوں (خیالوں میں ڈوب کر) سوچتا ہوں زندگی غم کا زنداں بن گئی ہے۔ اپنے زندانِ غم کی تاریکی کا کیا حال کہوں۔ روزن پر رکھی ہوئی سعید روئی صبح کی روشنی سے کم نہیں معلوم ہوتی۔

مولانا: آج کچھ تھکے تھکے سے نظر آ رہے ہیں آپ۔ کیوں کیا بات ہے؟

غالب: جب سے کلکتہ سے لوٹا ہوں، مضمحل سا ہو گیا ہوں۔ دو سال



تک وہاں دفتروں کی خاک چھانی۔ کئی کوششیں کیں۔ لیکن بے سُود۔ اسٹرلنگ صاحب، وہی جو گورنمنٹ کے سکریٹری ہیں، نے وعدہ کیا تھا کہ تمہارا حق تم کو ضرور ملے گا لیکن مرحان میلکم گورنمنٹ نے ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا (آہ کھینچ کر) اپیل میں گئی تو سمجھو سراسر ناکام ہی ہوگی

مولانا: آپ نے ولایت میں جو اپیل کی تھی ؟

غالب: مگر وہاں بھی کچھ نہ ہوا۔ (کلّو طشتری میں آم لے کر آتا ہے طشتری رکھ دیتا ہے۔ اُلٹے پاؤں باہر جاتا ہے، پھر آتا ہے)

کلّو: سرکار، منشی صاحب ہیں۔

غالب: (خوشی کے ساتھ) بھائی لے آؤ اُنہیں۔ اُن سے کیا تکلف ہے۔ گھر کے آدمی ہیں۔ (مولانا سے) یوں کہیئے مولانا رکھ لی مرے خدا نے مری بے کسی کی شرم"۔ اور ایک ایسے شخص کو میرے گھر بھیج دیا، جو میرے زخموں کا مرہم اپنے ساتھ لایا

مولانا: آپ کا مطلب منشی نبی بخش حقیر سے ہے ؟

غالب: بالکل صحیح کہا آپ نے۔ کئی روز سے گھر کی رونق سے ہوئے ہیں۔ (منشی نبی بخش حقیر آتے ہیں)

منشی جی: آداب عرض کرتا ہوں۔

غالب: آئیے آئیے منشی صاحب قبلہ (کھڑے ہو کر ہاتھ ملاتے ہیں) خوب آئے۔ بس آپ ہی کی کمی تھی واللہ!

منشی جی: ذرّہ نوازی ہے!

غالب: آپ نہ آتے تو آموں کا مزہ ہی جاتا رہتا۔

منشی جی: (مسکرا کر) کیوں، ایسا کیوں ہوتا ؟

غالب: (شوخی سے) یہ حکیم صاحب سے پوچھئے، جو آم سے کوسوں دُور بھاگتے ہیں۔

منشی جی: (تعجب سے) بھلا یہ آم نہیں کھاتے ؟

حکیم صاحب: اجازت ہو تو ایک چشم دید واقعہ سناؤں ؟

غالب: ضرور سنیں گے حضرت۔

منشی جی: ارشاد، ارشاد۔

حکیم صاحب: ابھی ابھی ایک گدھے والا اپنے گدھے لیے ہوئے گلی سے گذرا۔ آم کے چھلکے میں پڑے تھے۔ گدھے نے سونگھ کر چھوڑ دیا، کھایا نہیں۔

منشی جی: (تعجب سے) اچھا ؟

حکیم صاحب: ہاں ہاں (ہنس کر) دیکھئے مرزا صاحب، آپ آموں کی بڑی تعریفیں کرتے ہیں، لیکن آم ایسی چیز ہے، جسے گدھا بھی نہیں کھاتا۔

غالب: (ہنس کر) بے شک گدھا نہیں کھاتا۔ (سب ہنستے ہیں، حکیم صاحب شرمندہ ہوتے ہیں) لیکن مولانا ۔۔۔ منشی صاحب آپ تو آم کھائیں گے ؟

مولانا: ضرور کھائیں گے صاحب، لیکن زحمت نہ ہو، آم پر کچھ اشعار عنایت کیجئے، تاکہ لطف دوبالا ہو۔

غالب: چند شعر یاد آ رہے ہیں، ملاحظہ ہوں۔

منشی جی: ؎ نامے آموں کا کچھ بیاں ہو جائے
خامہ نخل رطب فشاں ہو جائے

غالب: سُن لیجئے ؎

نظر آتا ہے یوں مجھے یہ ثمر ۔۔۔ کہ دواخانۂ ازل سے مگر
آتشِ گُل پہ قند کا ہے قوام ۔۔۔ شیرے کے تار کا ہے ریشہ نام
صاحبِ شاخ و برگ و بار ہے آم ۔۔۔ ناز پروردۂ بہار ہے آم

مولانا: بہت خوب!

منشی جی: واہ وا ۔۔۔ واہ وا۔ مزہ دوبالا ہو گیا (حکیم صاحب صرف سر کو ہلاتے ہیں۔ اُن کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں۔ کلّو آم کی طشتری سے منشی صاحب اور مولانا اور غالب کو آم دیتا ہے)

مولانا: یہ تو خیر شاعری ہوئی، آپ یہ بتائیے مرزا صاحب، آم کی کیا کیا خوبیاں ہونی چاہئیں ؟

غالب: بھئی میرے نزدیک تو آم میں صرف دو باتیں ہونی چاہئیں میٹھا ہو اور بہت ہو (سب ہنستے ہیں۔ حکیم صاحب بھی قہقہہ لگاتے ہیں)

منشی جی: مرزا صاحب اب کوئی غزل ارشاد فرمائیے۔

غالب: آپ کا حکم ہے، تو مجھے انکار کی مجال نہیں۔ آپ کی سخن فہمی کا کھلے دل سے معترف ہوں قبلہ۔

منشی جی: یہ تو آپ کی محبت ہے بندہ پرور!



غالب: مرض کیا ہے ؎

[illegible] بسکہ ہر اک اُن کے اشارے میں نشاں اور
کرتے ہیں محبت تو گزرتا ہے گماں اور
[illegible] وہ کہے ہیں۔ سمجھیں گے مری [illegible]
[illegible] جھٹے مجھکو ان اور
[illegible] ہوتے بہت شکی میں
ہم [illegible] مکوں میں ہیں سنگ بگراں اور
ہے خوں جگر جوش میں دل کھول کر روتا
ہوتے جو کئی دیدۂ خوں نابہ فشاں اور
ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

منشی جی: کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور۔ سبحان اللہ!

[illegible]

غالب: آدب بجالاتا ہوں۔

حکیم صاحب: واہ واہ۔ کیا معنی آفریں ہے!

مولانا: بھئی آپ نے تو دریا کو کوزے میں بند کر دیا۔ واہ وا

اچھا اب اجازت چاہیں گے۔

منشی جی: میں بھی بازار تک جا رہا ہوں۔ [سبھی باری باری آداب کہہ کر نکل جاتے ہیں]

[غالب تنہا رہ جاتے ہیں۔ چہرے پر سوچ کی پرچھائیاں پھیلتی ہیں۔ سامنے پڑی کتاب اٹھا لیتے ہیں۔ ورق الٹتے ہیں۔ کتاب رکھ دیتے ہیں۔ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ کمرے میں چند قدم چلتے ہیں۔ چہرے پر اداسی اور سائے رقص کر رہے ہیں]

غالب: (دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے) ؎

دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے — آخر اس درد کی دوا کیا ہے

(سوچتے ہوئے چہرے پر حیرت اور تجسس) ؎

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار — یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے
جبکہ تجھ بن نہیں کوئی موجود — پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں — غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے
شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے — نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہے

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں — ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

(چہرے پر الجھن) یہ کائنات اور اس کے مظاہر — کتنے راز بکھرے پڑے ہیں۔ انسانی ذہن پریشان ہو جاتا ہے (لا تسکین فریب سادہ دلی — ہم ہیں اور راز ہائے سینہ گداز) ہر طرف رنگا رنگ جلوے ہیں جو دامن دل کو تھام لیتے ہیں، اور انسان دیکھتا ہی رہ جاتا ہے لیکن مجھے حیرت ہے کہ شاہد کس حساب میں ہے جب کہ شہود، شاہد اور مشہود ایک ہے اور — اور اس دنیا میں جو کچھ ہم دیکھ رہے ہیں، ہم خواب میں جاگے ہوئے ہیں اور خیالوں کے دام میں گرفتار ہیں، لیکن میری روح کی پوشیدہ گہرائیوں سے آواز آتی ہے ؎

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

کلو: (گھبرایا ہوا اندر آتا ہے) حضور، حضور، متھرا داس آئے ہیں۔

غالب: (محویت سے چونکتے ہوئے) متھرا داس؟ اوہ — اچھا پھر نازل ہوئے وہ، کیا مصیبت ہے۔

کلو: (غالب کی پریشانی کو بھانپ کر) اجازت ہو تو کہوں سرکار گھر میں نہیں ہیں۔

غالب: نہیں کلو، یہ ہماری وضع کے خلاف ہے۔ متھرا داس کو اندر لے آؤ۔

(زیر لب گنگناتے ہوئے) ؎

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

[موٹی توند والے متھرا داس اندر آتے ہیں]

غالب: آئیے، متھرا داس جی آئیے۔

متھرا داس: (تیز لہجے میں پھولی ہوئی سانس کے ساتھ) عجیب مصیبت ہے صاحب۔ پچھلے مہینے کی تیسری کو روپے لوٹانے کا وعدہ تھا، لیکن جناب وہ وعدہ کیا ہوا (مشکل سے سانس لے کر) اور پھر میں نے دکان سے کتنی بار لونڈے کو بھیجا، لیکن وہ خالی ہاتھ ہی لوٹا۔ عجیب مصیبت ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ دکان چھوڑ کر آنا کتنا مشکل ہے اور پھر ان دنوں روپے کی سخت ضرورت ہے۔ آج مجھے پھر دکان



چھوڑ کر آیا تھا۔ عجیب مصیبت ہے۔

غالب: مجھے افسوس ہے، آپ کو زحمت کرنی پڑی، لیکن

متھرا داس جی اِن دنوں ذرا ہم تہی دست ہیں۔

کیا کریں، مجبوری ہے

متھرا داس: عجیب مصیبت ہے، ہم کھڑے تھوڑے ہیں ہم بھی مجبور

ہیں صاحب۔ دنیا میں کون مجبور نہیں؟ اور ہاں دکان بھی

اگر اسی طرح چیزیں اٹھتی رہیں اور دام وصول نہ ہوئے

تو ہمارا دیوالہ پٹنے میں کیا دیر ہے؟

غالب: [ملتجی سے پسینہ پونچھتے ہوئے] بات یہ ہے کہ ابھی

قلعے سے تنخواہ وا گذاشت نہیں ہوئی، کل پرسوں تک

ہو جائے گی۔ میں خود روپے لے کر حاضر ہو جاؤں گا۔

آپ اطمینان رکھیے ــ کہیے آپ کے لئے کیا منگاؤں۔

[کالو کو آواز دیتے ہوئے] کلو میاں!

متھرا داس: عجیب مصیبت ہے۔ بس بس رہنے دیجئے۔ ہم کچھ اور نہیں

چاہتے۔ صرف ہمارے روپے جلد لوٹائیے گا مہربانی ہوگی

[متھرا داس جاتے ہیں۔ غالب انھیں جاتے ہوئے دیکھتے

ہیں۔ اطمینان کی سانس لیتے ہیں اتنے میں وہاں سے

درباری مل اور مالک مکان داخل ہوتے ہیں]

غالب: (سکتے کے عالم میں) آئیے آئیے آج ہماری خوش قسمتی

عروج پر ہے۔ مہربانوں کا تانتا بندھا ہوا ہے۔

درباری مل: (ترش سے تیلے لہجے میں، ناک پر عینک سنبھالتے ہوئے)

مرزا صاحب، صبر کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ انسان کب تک

صبر کرے۔ تین مہینے ہونے کو آئے، لیکن آپ صرف وعدے

پر ٹالتے گئے ہاہاہا۔ ایسے کیسے چلے گا۔ لیکن اپنے پاس

کام کچا نہیں ہے۔ اپنے پاس اقرار نامہ موجود ہے۔ میں

عدالت میں جا کر نالش کروں گا۔

غالب: درباری مل جی اعتبار ایسا قہر نہ کیجئے۔ آج صبح ہی کو

عدالت کا کارندہ دو ڈگریاں لے کر آیا تھا۔ آپ ــــ

آپ چند روز اور صبر کیجئے۔ ست تک پائی پائی ادا نہ

کروں گا، اس دنیا سے اٹھوں گا نہیں۔

درباری مل: لیکن منش کی زندگی کا کیا اعتبار؟ زمانہ خراب ــــ

آگیا ہے۔ ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ پر بھروسہ نہیں۔

غالب: آپ مجھ پر بھروسہ کیجئے اور ــــ

مالک مکان: [موٹی عینک کے اوپر سے دیکھتے ہوئے]

ہوں ــــ سمجھا۔ اس کا مطلب ہے، ابھی قلعے سے تنخواہ

نہیں آئی ہے اور نہ ہی پنشن ملی ہے، لیکن مجھے

روپے کی سخت ضرورت ہے۔ ہاں، چار مہینے کا کرایہ ــ

پورے چار مہینوں کا کرایہ ادا کرنا باقی ہے۔ میں کہتا ہوں

ــــ میں کہتا ہوں اگر اتوار کی صبح تک سارا کرایہ وصول

نہ ہوا تو مکان خالی کرنے کا نوٹس دے دوں گا، سمجھے؟

غالب: (برہم ہو کر) آپ زحمت نہ کیجئے۔ میں خود ہی مکان چھوڑ

رہا ہوں۔

مالک مکان: کیا کہا؟

غالب: ــــ لیکن پہلے آپ کی ساری رقم ادا کر دوں گا۔

درباری مل: بس ایسی ہی باتوں سے روز ٹالتے ہیں۔

مالک مکان: خیر اتوار تک دیکھتے ہیں، یہ ٹال مٹول کب تک چلے گی۔

[دونوں جاتے ہیں۔ غالب لمبی سانس لیتے ہیں۔ سر پر ہاتھ

پھیرتے ہیں۔ سوچتے ہیں۔ دائیں بائیں دیکھتے ہیں۔ آنکھیں

دھواں دھواں ہیں]

غالب: (خود کلامی) اُف ــــ اوہ!

ــــ رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج

مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

کیا زمانہ آگیا ہے۔ سانس گھٹ رہی ہے۔ کتنی تمنائیں

سینے کے زنداں میں قید ہو کر رہ گئی ہیں۔ یہ گھٹن ــــ اُف

جگر پھٹ رہا ہے۔ سوچتا ہوں جگر کے ٹکڑے ہونے تک

دل کو کس طرح سنبھالوں؟ زندگی کی ٹھوس حقیقتوں پر نظر

پڑتی ہے تو لرز اٹھتا ہوں۔ اب دیکھئے، اخراجات ہیں کہ

بڑھتے ہی جا رہے ہیں۔ آمدنی وہی ایک سو باسٹھ۔ تنگ

آگیا ہوں۔ گذارہ مشکل ہو گیا ہے۔ اب تو روزمرہ کا کام

بھی بند ہونے لگا (سوچتے ہوئے) کیا کروں؟ کہاں سے

گنجائش نکالوں۔ قہر درویش برجان درویش۔ پچھلے

دنوں سے صبح کی تبرید متروک۔ ناشتے میں گوشت آدھا۔



بات کی شراب و گلاب موقوف۔ میں بائیس روپے
بیٹھا بچا۔ روزمرہ کا خرچ چلا رہا ہوں جیسی تیسی
پھر بھی کوئی جیتا ہے۔ یہ ــــ بھی کوئی ــ جینا ہے۔
وسوسوں کی کشمکش، اب حالت یہ ہو گئی ہے کہ خود کو
پہچانا نہیں جاتا۔ کیا میں واقعی وہ ہوں جو ایبک ترکوں کی
نسل سے ہے اور افراسیاب کے خاندان سے تعلق رکھتا ہے
جس کی جوانی عیش و عشرت میں رنگ لی، عرقِ شراب ــ
ہوئی، جس کا کام معشوق فریبی تھا، جس کا ہر لمحہ
زہرہ جبینوں کے ساتھ گذرتا تھا، جس کی وضعداری اور
خود بینی کا زمانے بھر کو اعتراف ہے، جس نے کالج کی پروفیسری
اس لئے ٹھکرا دی کہ کوئی حاکم پیشوائی کو نہیں آیا، جسے
مال و زر اور جاہ و جلال سے زیادہ اپنی قلندری اور
آزادگی پسند ہے، جسے تعریف کی خواہش ہے نہ صلے
کی پروا۔ جس کا سر کسی کے سامنے نہ جھکا ؎

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

دریا کی لہروں کو دیکھ کر اگر مجھے یہ گماں گذرے کہ دریا نے
مجھے دیکھ کر ماتھے پر بل ڈالے ہیں تو میں ہرگز اس کا پانی نہیں
پیوں گا، بلکہ پیاسا مر جانا پسند کروں گا، لیکن ــ لیکن
اب میں وہ غالب نہیں رہا ہوں ــ میں ــ وہ نہیں رہا
ہوں میں اپنے چہرے کو پہچان نہیں سکتا ــ
نہ گل نغمہ ہوں نہ پردہ ساز میں ہوں اپنی شکست کی آواز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز ــ شکست کی آواز !!
پس منظر میں غمناک آواز میں یہ غزل گائی جاتی ہے ؎

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک
عاشقی صبر طلب اور تمنا بیتاب
دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک
ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک
غمِ ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج

شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

شام کے سرمئی سائے پھیلتے ہیں۔ غالب کے چہرے پر
درد و کرب کی لکیریں ابھرتی ہیں۔ وہ چند قدم چلتے ہیں اور
زیرِ لب یہ شعر پڑھتے ہیں) ؎

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید   ناامیدی اس کی دیکھا چاہیے

[اس کے بعد عقبی کمرے میں جاتے ہیں۔ وہاں تکیے کے سہارے
بیٹھتے ہیں۔ سر کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہیں۔ نگاہیں خواب
ناک ہو جاتی ہیں اور پلکیں آہستہ آہستہ جھکتی ہیں۔ پس منظر
میں موسیقی کے ہلکے سُر وقت کی رفتار کا احساس دلاتے
ہیں۔ روشنی آہستہ آہستہ مدھم ہو جاتی ہے اور سائے پھیل
جاتے ہیں اور پھر مکمل اندھیرا چھا جاتا ہے۔ اندھیرا پل دو
پل چھایا رہتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ اندھیرے نہایت
آہستگی کے ساتھ صبح کے آثار پھوٹنے لگتے ہیں۔ اندھیرے
چھٹتے ہیں اور اسٹیج اس صبح جمیل کا منظر پیش کرتا ہے۔ یہ
تبدیلی صرف بیک کا پردہ گرانے سے عمل میں آتی ہے جو
پہاڑ اور درختوں کا منظر پیش کرے۔ کمرے کا سامان
اور عقبی کمرہ تاریکی میں چھپ جاتا ہے۔ پس منظر میں پرندوں
کی چہکار، موسیقی کی لہریں، غالب داخل ہوتے ہیں۔ نگاہوں
میں خواب کی کیفیت، چہرے پر امید کا نور، جوانی کا عالم،
کتابی چہرہ، گھنی لانبی پلکیں، سُرخ و سپید رنگ، دائیں
بائیں حیرت سے دیکھتے ہیں]

غالب: (گل کھلے غنچے چٹکنے لگے۔ اور صبح ہوئی دیر بدواں کے پیچھے)

؎ آمدِ بہار کی ہے جو بلبل ہے نغمہ سنج
اڑتی سی اک خبر ہے زبانی طیور کی

میرے خدا یہ میں خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں، خواب
ــ خوابِ آرزو، بہاروں کا خواب! ؎

ہاں نشاطِ آمدِ فصلِ بہاری واہ وا
پھر ہوا ہے تازہ سودائے غزل خوانی مجھے

آج ــ آج مرغِ سحر کا نالہ میرے لئے دودھاری
تلوار نہیں، آج ہر داغِ دل سروِ چراغاں نظر آتا ہے۔
پہاڑ اور جنگل بلبلوں کے نغموں سے آباد ہو گئے ہیں



پھولوں نے کھلکھلا کر ہنسنے رستے حاک پڑے ہیں۔ گھٹائیں جھوم رہی ہیں۔ آج میرے دل میں تخلیق کا جنون تازہ ہوا ہے جمن کی بہاروں نے میرے لفظوں میں رنگینی بھر دی ہے اور نقش نقش میں معانی کی جو شوخی ہوئی۔ فکرِ سخن کا نشہ مستی گھول رہا ہے، لیکن ___ لیکن ___ (سوچوں کی کشمکش) لیکن لالہ و گل کے چہرے کا رنگ پریشاں کیوں ہے؟ یہ ٹھیک ہے کہ ہر طرف لالہ و گل کے چراغ جل رہے ہیں، لیکن ___ لیکن یہ چراغاں آندھی کے راستے پر تو نہیں؟

ع غنچہ تا شگفتنہا برگِ عافیت معلوم
باوجودِ دل جمعی، خوابِ گل پریشاں ہے

[پس منظر میں جھکڑ چلنے کی آواز، بجلی چمکتی ہے]

اُف یہ آندھی کے جھکڑ۔ پھول لرز رہے ہیں۔ اُف پھولوں کے خواب پریشاں ہیں۔ ہر نقش فریادی ہے۔ ہر گلِ تر ایک چشمِ خوں فشاں۔ بلبل لبِ فریاد ہے اور پھول جگر چاک۔ یہ بہار ہے یا خزاں ___

ع خزاں کیا، فصلِ گل کہتے ہیں کس کو، کوئی موسم ہو
وہی ہم ہیں، قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے

[پس منظر میں ساز و رباب کی طربیہ آواز۔ غالب متوجہ ہوتے ہیں اور ساز کی آواز کے ساتھ غزل گائی جاتی ہے غالب اضطراب کو بھول کر اپنی حرکات اور چہرے کے تاثرات سے غزل کی داخلی کیفیات کا اظہار کرتے ہیں، آہستہ آہستہ غزل میں گم ہوتے ہیں] ع

پھر اس انداز سے بہار آئی	کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی
دیکھو اے ساکنانِ خطۂ خاک	اس کو کہتے ہیں عالم آرائی
سبزہ و گل کو دیکھنے کیلئے	چشمِ نرگس کو دی ہے بینائی
ہے ہوا میں شراب کی تاثیر	بادہ نوشی ہے بادپیمائی

غالب: کیا بہار سچ مچ آئی ہے؟ ہاں ہاں، ہوا میں شراب کی تاثیر ہے۔ یہ لالہ و گل، یہ جوشِ بہار، یہ بادلوں کی مستانہ خرامی، یہ روشنی اور رنگ، لیکن ___ لیکن تمہارے بغیر گلستاں پر آگ برس رہی ہے۔ یہ صبحِ بہار میرے لئے شامِ غم سے کم نہیں۔ تم کہاں ہو؟ کس رنگ و بو کی دنیا میں گم ہو؟ تمہاری دنیا میں زمین سے آسمان تک رنگ ہی رنگ ہیں۔ رنگوں کی برسات اور یہاں ہر چیز کو آگ لگی ہوئی ہے آتی ہے ___ تم وہاں ندی میں پھولوں کے چراغوں کا عکس دیکھ رہی ہو اور یہاں پلکوں سے خوں کے آنسو جاری ہیں ___ لیکن ___ لیکن ___ (طربیہ موسیقی کی لہریں) مجھے محسوس ہوتا ہے کہ گلشن میں آج ایک نیا بندوبست ہے۔ ایک نیا اہتمام ___ یہ کس کیلئے ہے؟ کون آرہا ہے؟

ع یہ کس بہشت شمائل کی آمد آمد ہے
کہ غیرِ جلوۂ گل رہگذر میں خاک نہیں

[اسٹیج کے عقبی حصے سے جوانگوں سایوں میں لپٹی ہوئی "اک نگارِ آتشیں رُخ سر کھلا" نظر آتی ہے۔ غالب اُسے دیکھتے ہیں، چونکتے ہیں، حیرت میں ڈوب جاتے ہیں، اُسے پہچاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ خوابوں کا ایک مجسمہ معلوم ہوتی ہے]

غالب: (حیرت اور مسرت کے جذبات کے ساتھ) تم؟ کیا سچ مچ تم ہی ہو؟ میری محبوب ___ لیکن تم یہاں کیسے؟ تم مجھے چھوڑ کر چلی گئی تھیں۔ ایک زمانے سے کان تمہارے پیغام کو ترستے تھے اور آنکھ دیدار سے محروم تھی۔ برسات کی ___ اندھیری راتیں کاٹنا میرے لئے ناممکن ہو گیا تھا۔ تم نے عمر بھر کا پیمانِ وفا باندھا تھا، لیکن عمر ہی کو پائداری نہیں۔ انسان لمحوں میں زندہ رہتا ہے اور ہر لمحہ اُسے موت کے قریب کرتا ہے۔ تم ___ تم رسوائی کی شرم سے خاک میں چھپ گئیں اور ___ اور میں تڑپتا رہا ___ تڑپتا ہی رہا۔ اور تمہیں پکارتا رہا۔ ہاں یاد آیا تمہاری موت پر میرا لکھا ہوا مرثیہ ___؟ (سوز و درد کے ساتھ)

ع زہر لگتی ہے مجھے آب و ہوائے زندگی
یعنی تجھ سے تھی اِسے ناسازگاری ہائے ہائے
شرمِ رُسوائی سے جا چھپنا نقابِ خاک میں
ختم ہے اُلفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے



[محبوبہ شوخی اور الہڑپن کے ساتھ قہقہہ لگاتی ہے]

غالب: نہیں نہیں، تم خاک میں نہیں چھپی ہو، تم زندہ ہو
تم زندہ ہو۔ یہ میرا واہمہ تھا، واہمہ
تم یقیناً زندہ ہو میری آنکھیں دھوکہ نہیں دے سکتیں۔
وہی لانبی سیاہ پلکیں وہی نیرنگِ نظر، وہی رخساروں
کی آگ، وہی قلم کا کل، وہی نازک بدن، وہی عطر پیراہن
اور یہ حنا آلود انگلیاں

[محبوبہ انہماک سے سنتی ہے۔ انگلیوں کو دیکھتی ہے شرماتی
ہے۔ ہاتھ پیچھے ہٹا لیتی ہے۔ مسکراتی ہے۔ چند قدم
[redacted] کے ساتھ چلتی ہے]

دیکھو تو دلفریبیٔ اندازِ نقشِ پا
موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کتر گئی

[محبوبہ شرماتی ہے اور نہیں ریشمی گھونگھٹ میں آدھا
چہرہ چھپاتی ہے]

غالب: ؎ دوستی کا پردہ ہے بیگانگی
منہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیے

[محبوبہ دھیرے دھیرے چہرے سے پردہ سرکاتی ہے]

غالب: ؎ نظارے نے بھی کام کیا واں نقاب کا
مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی

[غالب محبوبہ کے قریب آتے ہیں۔ چہرے پر جذبات کے
متنوع رنگ لئے ہوئے محبوبہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہیں۔
وہ آنکھیں جھکا لیتی ہے]

غالب: نگاہِ بے محابا چاہتا ہوں تغافل ہائے تمکیں آزما کیا

[محبوبہ کی نگاہوں میں التفات کی روشنی، ہونٹ متبسم]

غالب: ؎ ہے صاعقہ و شعلہ و سیماب کا عالم
آنا ہی سمجھ میں مری آتا نہیں گو آئے

(وارفتگی کے عالم میں) آخر کار وہ حسین لمحے آ ہی گئے، جب
دوری اور ہجر کی کالی رات گذر گئی اور صبحِ وصال کے
[redacted] آج میری محبوبہ میرے پاس ہے۔
میں اور میری محبوبہ! وہ بات کرتی ہے تو دیواروں کی تصویروں
میں جان پڑتی ہے۔ وہ قدِ گلستاں کے ساتھ چلتی ہے تو

سرو و صنوبر سائے کی طرح ساتھ ساتھ پھرتے ہیں۔ آج
جس میں حسن موسیقی ہے۔ چنگ و رباب کی جادوئی آواز
سن کر جان نکلی جا رہی ہے۔ ؎

لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ
یہ جنتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے

[پس منظر میں موسیقی کی نشاطیہ لہریں]

(خوابناک لہجہ) یہ میرے خوابوں کا گلشن جو صرف میرے
خوابوں میں آباد ہے یہاں صبا آزادی کے ساتھ محوِ خرام
ہے۔ یہاں پھولوں کی سانسیں خوشبو سے معطر ہیں۔
پھولوں کے ہجوم ایک دوسرے کے پیچھے دوڑے جا
رہے ہیں۔ یہاں بلبلوں کے زمزمے ہیں، نغموں کی جوئباریں
ہیں، ٹھنڈی ہوائیں ہیں اور نظر افروز شادابیاں

؎ جار موجِ اٹھتی ہے طوفانِ طرب سے ہر سو
موجِ گل، موجِ شفق، موجِ صبا، موجِ شراب

[محبوبہ قریب آتی ہے اور غالب کو محبت سے دیکھتی ہے]

غالب: خوابوں کی اس دنیا میں کسی غیر کا سایہ نہیں میری محبوبہ۔
یہاں کسی کی حکمرانی نہیں چلتی۔ یہاں حسرتیں نہیں، مجبوریاں
نہیں، آہ و فریاد نہیں۔ یہاں مسرتیں ہیں آزادیاں ہیں
اور کامرانیاں ہیں۔ اس دنیا میں تصورِ نا آفریدہ گلستاں
میں نغمہ خواں ہوتا ہے۔ یہاں صرف پرواز کی خواہش
ہے اور آگے بڑھنے کا مستانہ جذبہ ــــ اور اس گلشنِ خواب
میں تم ہو تم، میری بہارِ ناز، اور تمہاری محبت۔

؎ کس منہ سے شکر کیجئے اس لطفِ خاص کا
پرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں

(محبوبہ شرماتی ہے)

؎ اوب ہے اور یہی کشمکش تو کیا کیجے
حیا ہے اور یہی گومگو تو کیونکر ہو

[محبوبہ مسکراتی ہے اور شگوفہ بار درخت کے پاس بیٹھتی
ہے۔ غالب قریب آکے بیٹھتے ہیں اور اس کی ٹھوڑی کو کانپتی
انگلیوں سے اوپر اٹھاتے ہیں]

غالب: "میں اور حظِ وصل، خدا ساز بات ہے"۔ میری آنکھوں کے



آگے صرف تجلیاں کوند رہی ہیں۔ لیکن تم بات نہیں کرتیں۔ میں تشنۂ دیدار ہی نہیں، تشنۂ تقریر بھی ہوں ـــــ ہاں جب زبان دل کا ساتھ نہیں دیتی تو آنکھوں کی خاموشی بھی بولتی ہے۔

[غالب اُس کی آنکھوں میں ڈوب جاتے ہیں۔ اپنا ہاتھ اُس کے شانے پر رکھتے ہیں اور اُس کے کھلے بالوں کو چھوتے ہیں]

غالب ؎ نیند اُس کی ہے، دماغ اُس کا ہے راتیں اُس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

[محبوبہ کے حنائی ہاتھ کو ہاتھوں میں لیتے ہیں]

؎ دل سے مٹنا تری انگشتِ حنائی کا خیال
ہو گیا گوشت کا ناخن سے جدا ہو جانا

[حنائی انگلیوں کو دیکھنے کے بعد آنکھوں میں دیکھتے ہیں]

؎ دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی
دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی

[دفعتاً محبوبہ چونکتی ہے اور فوراً کھڑی ہو کر ہرنی کی طرح چوکڑی بھرتے ہوئے دور چلی جاتی ہے۔ غالب دیوانہ وار پیچھے جاتے ہیں]

غالب: اللہ اللہ! یہ نزاکت۔ "ہاتھ آئیں تو انہیں ہاتھ لگائے نہ بنے" نہیں نہیں، آج تم میرے پاس ہو اور تم مجھ سے دور نہیں رہ سکتیں۔ میں ـــــ میں تم کو اپنے سینے میں چھپا لوں گا۔

؎ عجز و نیاز سے تو وہ آیا نہ راہ پر
دامن کو آج اُس کے حریفانہ کھینچیے

[محبوبہ کے بدن پہ جھرجھری سی دوڑتی ہے، وہ تھرتھر کانپتی ہے]

غالب (حیرت سے)

؎ میں مضطرب ہوں وصل میں خوفِ رقیب سے
ڈالا ہے تم کو وہم نے کس پیچ و تاب میں

[غالب دیوانہ وار ہاتھ اُس کے دامن کی طرف بڑھاتے ہیں۔ اتنے میں پس منظر میں زور کا بھیانک قہقہہ گونج اٹھتا ہے۔ غالب کا ہاتھ اٹھا کا اٹھا رہ جاتا ہے۔ محبوبہ سہم کر الگ کھڑی ہو جاتی ہے]

غالب (سکتے کے عالم میں) اُف! یہ بھیانک قہقہہ ـــــ کون؟ (خاموشی) نہیں۔ کوئی نہیں۔ یہاں کوئی نہیں آ سکتا۔ یہاں کسی غیر کا گذر ممکن نہیں۔ یہ میرا واہمہ تھا، واہمہ

آواز [گمبھیرتا کے ساتھ] ہاہاہا ـــــ یہ تمہارا واہمہ نہیں ـــــ حقیقت ہے۔

غالب (سخت الجھن میں) ہیں؟ لیکن تم کون ہو؟ ـــــ بولو، جواب دو۔

آواز: میں تمہارا دوست ہوں۔

غالب: دوست؟ نہیں نہیں۔ یہ دوست کی آواز نہیں ہو سکتی۔

آواز: مجھے پہچانو غالب، میں تمہارا ہمدرد ہوں۔ عشق کے جس راستے پر تم جا رہے ہو، وہ تباہی کا راستہ ہے۔

غالب: تباہی کا راستہ؟ ـــــ نہیں نہیں، یہ جھوٹ ہے۔

؎ عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی، دردِ لا دوا پایا

آواز: غلط۔ عشق نے تمہیں غم کے زنداں میں ڈال دیا ہے۔

غالب: ؎ غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم

آواز: لیکن عشق کا غم تمہاری جان کھا کر رہے گا۔

غالب: ؎ غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غمِ عشق گر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا

آواز: ہاہاہا ـــــ یہ خود فریبی ہے بے وقوف۔ آج میں تمہارے دل کی آواز تمہارے کانوں تک پہنچا کے رہوں گا۔

غالب: (غصے میں) لیکن تم کون ہو؟

آواز: تمہاری آواز ـــــ تمہارے اندر کی آواز ـــــ

غالب: تم کہنا کیا چاہتے ہو؟

آواز: تمہاری محبوبہ، جو تمہارے سامنے مہر و وفا اور شرم و حیا کی تصویر سی کھڑی ہے [غالب کی توجہ آواز سے ہٹ کر محبوبہ کی طرف جاتی ہے] جو غالب کو متوحش نگاہوں سے تک رہی ہے] دراصل تم کو فریب دے رہی ہے۔



غالب: قریب؟

آواز: ہاں قریب۔

غالب: محبت رُوح کی روشنی ہے اور وفا کی خوشبو۔

آواز: لیکن یہ تمہاری محبوبہ نہیں بن سکتی، یہ ہرجائی ہے غیروں کے ساتھ پھرتی ہے۔ غیروں سے آنکھیں لڑاتی ہے۔ اس کا [illegible] غیر سے اخلاص [illegible]

غالب: [تشنج کی حالت میں اپنے آپ سے] "رشک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص، حیف!" — لیکن یہ جھوٹ ہے عورت کی محبت سچی ہوتی ہے۔ وہ ایک مرد کو چاہتی ہے اور دوسروں کی طرف آنکھ بھی نہیں اُٹھاتی — لیکن اس کا غرور، اس کی بیگانگی، اس کے ظلم و ستم، بات بات پر بگڑنا، خوابوں میں آکر مجھے پریشان کرنا، راتوں کو رقیب کے ساتھ پھرنا — اُف، وہ مجھے ہمیشہ اذیت پہنچاتی رہی ہے، لیکن اُس نے میری بات نہ سُنی، کبھی نہیں

مجھے اُس سے کیا توقع بہ زمانۂ جوانی
کبھی کودکی میں جس نے نہ سُنی مری کہانی

وہ غیروں کی طرف تیر بہ نظروں سے دیکھتی ہے اور میں اُس کی مست پلکوں کی چبھن محسوس کر کے رہ جاتا ہوں۔ یہ سچ ہے، وہ — وہ بے وفا ہے، بے وفا [محبوبہ کی طرف دیکھتے ہیں۔ اُس کی بھولی صورت سے متاثر ہوتے ہیں] کیا تم سچ مچ وفا نہ کرو گی، ہوں؟ نہیں نہیں، یہ نہیں ہو سکتا، یہ غلط ہے۔ میری محبوبہ پیکرِ وفا ہے۔ اُس کے سینے میں بھی دھڑکتا دل ہے۔ اُس کے دل میں بھی ارماں ہیں۔ وہ خواب دیکھتی ہے۔ میرے قریب آنے کی خواہش رکھتی ہے۔

ضد کی ہے اور بات، مگر خو بُری نہیں
بھولے سے اُس نے سیکڑوں وعدے وفا کئے

[محبوبہ سے] اے یارِ عزیز۔ رشک میرا دشمن ہے اور تم — تم میری راحتِ جاں ہو۔ آؤ تم کو سینے سے لگا لوں۔

غالب اُس کی طرف بڑھتے ہیں اور پیش دستی کرنے لگتے ہیں۔ اتنے میں زور سے بادل گرجتے ہیں اور بجلیاں

چمکتی ہیں۔ محبوبہ تھرتھر کانپتی ہے۔ سایوں میں تحلیل ہو کر اسٹیج سے غائب ہو جاتی ہے اور غالب ہاتھ پھیلائے حیران و ششدر کھڑے رہ جاتے ہیں اور اندھیرے میں غائب ہو جاتے ہیں۔ مکمل اندھیرا چھائے رہتا ہے۔ اتنے میں سین کا پردہ اُٹھتا ہے۔ مدھم سی روشنی پھیلتی ہے اور پھر غالب عقبی کمرے میں بیٹھے آنکھوں کو سہلاتے ہوئے، خواب سے بیدار ہوتے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔ وہ اُٹھتے ہیں۔ چہرے پر اداسی کی کیفیت لیے کمرے میں ٹہلتے ہیں۔ موسیقی کی لہریں وقت کے گذرنے کا احساس دلاتی ہیں

غالب: دکھے ہوئے لہجے میں

وہ بادہ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اُٹھیے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی

خواب اور بیداری — اُف!

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ
جب آنکھ کھُل گئی تو زیاں تھا نہ سود تھا

[رات کے سناٹے اُجاڑ میں مضطرب ٹہلتے ہیں] اب تم چلی گئیں اور ہم پر قیامت گذر گئی۔ میرا خوابِ آرزو بکھر گیا۔ تمام تنہائی کا یہ اضطراب، یہ مختصر درد، یہ بے قراری، ابھی تک اُس کے جسم کی خوشبو میرے مشامِ جاں میں بسی ہوئی ہے۔ وہ کہاں گئی میرے خدا؟ پھولوں کے جلوے راکھ ہو گئے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے، ایک دریائے خواب بہہ رہا ہے۔ اُس کے بغیر میرا گھر ویرانہ ہے۔ در و دیوار کی بربادی کا خیال کرتا ہوں اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے ہیں [چہرے پر درد کے آثار، آنکھوں سے آنسو بہتے ہیں]

خونے جو آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں

[تکیے کے سہارے بیٹھ جاتے ہیں]

اب میں ہوں اور ماتمِ یک شہرِ آرزو
توڑا جو تو نے آئینہ تمثال دار تھا



[پس منظر میں درد انگیز آواز میں یہ غزل گائی جاتی ہے]

ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے
اک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے
اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل
زنہار اگر تمہیں ہوسِ نائے و نوش ہے
دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے
ساقی بہ جلوہ دشمنِ ایمان و آگہی
مطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے
یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے
یا صبح دم جو دیکھیے آ کر تو بزم میں
نے وہ سرور و سوز، نہ جوش و خروش ہے
داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

[غزل گائے جانے کے دوران روشنی اور سائے پھیلتے ہیں۔ ایک شمع جو جل رہی تھی، بجھ جاتی ہے اور کمرے میں مکمل تاریکی چھا جاتی ہے۔]

[منظر]

(کمرے میں روشنی پھیلتی ہے۔ غالب کھڑے ہیں۔ چہرے پر فکر و تردد کے آثار)

غالب: (خود کلامی) میں نے زندگی تو گزار ہی دی، مگر کیسی کیسی مصیبت سے گزاری۔ مہینے کے مہینے غمِ فراق میں کاٹے، سالہا سال بے کیف گزارے۔ ہائے کوئی مجھ سے پوچھے، جب ساون بھادوں کی گھٹائیں جھوم کر آتی ہیں اور میرا پیالہ شراب سے خالی ہوتا ہے۔ دنیا بھر میں مسرت کی بہاریں ناچتی تھیں اور میں اپنے گھر کا دروازہ بند کئے پڑا رہتا تھا۔ یہ تو جب کی باتیں ہیں اور اب ـــــ اب تو قیامت کا عالم ہے۔ غدر کا ہنگامہ روزوں پر ہے [پس منظر میں ہنگامہ اور شور کی آوازیں] نفسی نفسی کا عالم ـــ نہ کوئی کسی کا یار ہے، نہ غمگسار۔ ایک کو دوسرے کی خبر نہیں۔ خون کی ندیاں بہہ رہی ہیں۔ قتل ہونے والوں میں کوئی میرا اُمیدگاہ تھا۔

کوئی میرا شفیق، کوئی میرا دوست، کچھ شاگرد، کچھ معشوق، سو وہ سب کے سب خاک میں مل گئے۔ ہائے اتنے یار مرے کہ جو اب میں مروں گا تو میرا کوئی رونے والا بھی نہ ہوگا ؎

گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے
زہرہ ہوتا ہے آبِ انساں کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے
گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا

(دہراتے ہیں)

؎ چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے
گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا

ہاں یاد آیا، میر مہدی مجروح کے خط کا جواب لکھنا ہے۔ اب تو یہی چند احباب رہ گئے ہیں جن کے دم سے زندہ ہوں اور خط و کتابت ہی دل کا واحد سہارا ہے۔ میں اس بے کسی اور تنہائی میں صرف خطوں کے سہارے جیتا ہوں۔ یعنی جس کا خط آیا، میں نے جانا وہ شخص تشریف لایا ـــ

[دیوان پر بیٹھ کر خط لکھتے ہیں اور پس منظر سے غالب کی آواز میں خط پڑھا جا رہا ہے]

آواز: بھائی کیا پوچھتے ہو، کیا لکھوں، دلی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر ہے۔ قلعہ، چاندنی چوک، ہر روز مجمع جامع مسجد کا، ہر ہفتے سیر جمنا کے پل کی، ہر سال میلہ پھول والوں کا۔ یہ پانچوں باتیں اب نہیں، پھر کہو دلی کہاں؟ ہاں کوئی شہر قلمرو ہند میں اس نام کا تھا۔ مسجد جامع سے راج گھاٹ دروازہ تک بلا مبالغہ ایک صحرا لق و دق ہے۔ اینٹوں کے ڈھیر جو پڑے ہیں، وہ اگر اٹھ جائیں تو ایک ہو کا عالم ہو جائے۔ قصہ مختصر شہر صحرا ہو گیا۔ [کلو آتا ہے اور چیزوں کی صفائی کرتا ہے]

غالب: لو میاں کلو یہ دو خط لیٹر بکس میں ڈال آؤ۔

کلو: بہتر سرکار۔ [خط لے کر لفافوں میں ڈالتا ہے۔ ٹکٹ لگا کے بند کرتا ہے اور جانے لگتا ہے۔ پھر مڑتا ہے] حضور، وہ خطوط دیکھے، جو دوپہر کو ڈاک کا ہرکارہ دے گیا تھا۔ ہاں دیکھ لئے۔ مرزا حاتم علی بیگ مہر اور مرزا تفتہ کے



... خطوط تھے۔ آنکھیں روشن ہوگئیں۔ واہ شاہ ...
... بیچارا دیکھو بیگم کیا کررہی ہیں؟
... نماز ادا کررہی تھیں۔
غالب ہیں، یہ کیا، جب تو جھوٹ نماز، کمال ہے، بیگم نے کھڑکو
... پوری کی مسجد سا ...
[... اتنے میں امراؤ بیگم اندر آتی ہیں، تلو جا ملے]
امراؤ بیگم (ناراضگی کے ساتھ) اٹے ہے، جب دیکھو میری نماز کے
پیچھے ہاتھ دھوکر پڑے ہو۔ آخر تمہاری مغفرت کیسے ہوگی۔
نماز تو کبھی پڑھتے نہیں ہو۔ روزہ تو خیر بہت بڑی چیز ہے۔
غالب: یہ تو ٹھیک ہے بیگم، لیکن یاد رکھنا تم سے ہمارا حشر
اچھا ہوگا۔
امراؤ بیگم: وہ کیسے بھلا؟
غالب: تم تو آہی پہلے تہمد والوں کے ساتھ ہوگی، جن کے تہمد
میں مسواک سدھی ہوگی۔ ہاتھ میں ایک ٹوٹی دار بدھنی
ہوگی۔ سر منڈے ہوں گے اور ـــــ اور ہمارا حشر
بڑے بڑے جلیل القدر بادشاہوں کے ساتھ ہوگا۔
امراؤ بیگم (تعجب سے) ہوں!
غالب: جیسے فرعون، نمرود، شداد اور مونچھیں چڑھائے ہوئے
اکڑتے ہوئے چلے جا رہے ہیں۔ چار فرشتے ادھر ہونگے
چار ادھر۔
امراؤ بیگم: بس بس رہنے بھی دو۔ تم تو پاگل ہوگئے ہو۔ میں جاتی
... بہت سا کام ہے۔ [جاتی ہیں]
(غالب کھڑے ہو جاتے ہیں۔ چہرے پر کشمکش کے آثار)
غالب: انسان کیا ہے؟ اس کی آفرینش کا راز کیا ہے؟ کائنات
کی تخلیق کا راز کیا ہے؟ انسان کا انجام کیا ہے؟ نیکی
اور بدی کیا ہے؟ مادہ اور روح، زندگی اور موت کیا
ہے؟ مسرت اور غم کے کیا معنی ہیں؟ ـــــ کتنے سوالات
ہیں جو دل و دماغ میں ہیجان بپا کرتے ہیں۔ انسان
پاگل ہو جاتا ہے۔ کیا یہ سب نظر کا فریب ہے؟ جس کا
ہم تماشا کرتے ہیں۔ کیا عالم کی صورت صرف نام ہی نام
ہے اور تمام وجودی چیزیں وہم ہی وہم ہیں؟

آواز: ... ہوگئے!
غالب (حیرت سے) کون؟ ـــــ سمجھا تم پھر آگئے!
آواز: میں گیا ہی کہاں تھا؟ سائے کی طرح تمہارے
ساتھ ساتھ رہتا ہوں۔
غالب: میرے ساتھ؟
آواز: ہاں ہاں تمہارے ساتھ۔ میں تمہاری سوچوں کو بھٹکنے
سے روکتا ہوں۔
غالب (طنزیہ ہنسی) ہاہا ـــــ میری سوچوں میں آفاق گم ہے،
اور تم ہو کس شمار و قطار میں؟ میں کبھی کبھی سوچتا ہوں
کہ ـــ کہ میں تمام عمر بے یقینیوں کے صحراؤں میں بھٹکتا
رہا ہوں۔ میں نے شاعروں، صوفیوں، پیغمبروں اور فلسفیوں
کے افکار کا مطالعہ کیا۔ برسوں تک میں غور و فکر میں ڈوبا
رہا، لیکن ـــــ لیکن میری آوارہ نظری نہ گئی اور اب
ـــــ اب ایمان و یقین کی روشنی میرے وجود کی
گہرائیوں سے پھوٹ رہی ہے۔ یہ روشنی الہام ہے
ـــــ کائنات آئینۂ آگہی ہے جس میں حسن حقیقت
کے جلوے بہار نچھاور کرتے ہوئے ہیں۔ وجود ایک
وحدت ہے اور لافانی!
آواز: (طنزیہ قہقہہ) کیوں خود کو جھٹلا رہے ہو؟ یہ شعر کس
نے کہا ہے؟
غالب: کونسا شعر؟
آواز: ؎ ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے
غالب: یہ ـــــ یہ میرا شعر ہے۔ ہاں ـــــ ہاں ٹھیک ہے کہ
عالم ایک دامِ خیال ہے۔ میں اس سے کب انکار کرتا
ہوں، لیکن میں حقیقت کے وجود سے منکر نہیں ہوں۔
ہر سمت وہی وہ نظر آتا ہے۔
آواز: پھر تمہاری ہستی کیا ہے؟
غالب: ؎ دل ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر
ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا
آواز: یہ کہو کہ تم کچھ بھی نہیں ہو۔ محض پرتو۔ پھر ـــــ پھر



ندی: گناہ اور غم کہاں سے آتے ہیں؟

غالب: جب نظر کے حجابات اٹھتے ہیں تو دیکھنے والا اور دیکھے جانے والا ایک ہو جاتے ہیں۔ ندی بیکی کا حصہ بن جاتی ہے۔ غم اور درد کا احساس راحت کو بڑھاتا ہے۔ ذرہ صحرا بن جاتا ہے۔ فاصلے مٹ جاتے ہیں۔ وحدت کو فروغ ملتا ہے اور انسان ترکِ رسوم کرتا ہے۔ ملتیں مٹ جاتی ہیں اور ایمان کا شعلہ چمک اٹھتا ہے اور پھر زندگی اور موت کی گتھیاں خود بخود حل ہو جاتی ہیں۔ موت زندگی کا لطف بڑھاتی ہے اور نشاطِ کار کا جذبہ تیز کرتی ہے۔

آواز: یہ سب ذہنی اختراع ہے۔

غالب: (اضطراب کے ساتھ) نہیں نہیں، یہ ذہنی اختراع نہیں یہ زندگی کے جلوے ہیں جو جراؤں اور سہاروں کا روپ دھارتے ہیں اور زندگی کا حسن بڑھاتے ہیں۔ اور چشم کو ہر رنگ میں وا ہونے کی دعوت دیتے ہیں۔

آواز: یہ کیوں نہیں کہتے کہ اس طلسمِ رنگ و بو میں تم صرف تماشائی ہو۔

غالب: میں محض تماشائی نہیں ہوں۔ میں اپنی ذات سے ایک انجمن ہوں ــــ ایک محشرِ خیال۔ ہستی کا سارا ہنگامہ مجھ سے ہے۔ میرے دل میں آرزو ہے، شوق ہے، تڑپ ہے۔ میری شخصیت میں کتنی قیامتیں چھپی ہوئی ہیں ــــ لیکن ــــ لیکن تمہیں اس سے کیا مطلب؟ تم مجھے ناحق الجھنوں میں مبتلا کرتے ہو ــــ تم ہو کون؟ سامنے کیوں نہیں آتے؟ تم خاموش ہو گئے؟ کہاں گئے تم؟ ــــ اب چلا گیا ــــ کس طرح ہر لمحہ میرا تعاقب کرتا ہے اور میرے فکر و نظر میں انتشار پیدا کرتا ہے

[غالب پسینے میں عرق، تکیے کے سہارے بیٹھتے ہیں اور سر کو ہتھیلی کا سہارا دیتے ہیں]

[کلّو اندر آتا ہے]

کلّو: سرکار، صحن میں چند مہمان آئے ہیں۔

غالب: (سنبھلتے ہوئے) کون ہیں؟

کلّو: مولانا فضلِ حق، مولوی حالی اور نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ تشریف لائے ہیں۔

غالب: خوب، چلو ہم بھی صحن میں جاتے ہیں، وہاں مونڈھے لگے ہی ہیں (سوچ کر) نہیں کلّو، انہیں اندر ہی لے آؤ۔ یہ دیکھو پاؤں کی تکلیف پھر بڑھ گئی ہے۔

کلّو: اچھا سرکار [کلّو جاتا ہے۔ مولانا فضلِ حق، شیفتہ اور حالی اندر آتے ہیں]

غالب: آئیے آئیے کہئے کیسے مزاج ہیں۔

مولانا: خدا کا فضل ہے۔

حالی: تسلیم عرض ہے قبلہ۔

غالب: کہئے کیا حال ہے حضرت کا؟

غالب: ــ

ان کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پر رونق

وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

شیفتہ: مرزا صاحب سچ تو یہ ہے کہ آپ کی محبت کھینچ لاتی ہے

غالب: یہ قسمت۔ دل کو دل سے راہ ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ تمہاری شفقت یہ نہیں بار ہے شیفتہ۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے جب تم جوئے کے الزام میں قید ہوا اور میرے قریبی رشتے دار انجان بن گئے اگر تم میری خبرگیری نہ کرتے تو نہ جانے میرا کیا حال ہوا ہوتا۔ اس واقعے سے متاثر ہو کر میں نے کہا تھا، شاید تمہیں یاد ہو۔

ــ

مصطفیٰ خاں کہ دریں واقعہ غمخوارِ من است

گر بمیرم چہ غم از مرگ عزادارِ من است

حالی: خوب!

شیفتہ: مرزا صاحب کی عنایت ہے۔

مولانا: مرزا صاحب میرا خیال ہے کہ اب آپ کا اردو دیوان چھاپ جانے کو جانا چاہئے۔

غالب: (خوش ہو کر) آپ کی رائے کی میں ہمیشہ قدر کرتا رہا ہوں آپ نے مشورہ دیا تو مرزا بیدل کے رنگ میں لکھنا میں نے چھوڑ دیا۔

شیفتہ: اور سچی بات تو یہ ہے کہ آپ کا اصلی رنگ نکھر آیا۔

غالب: بھائی آپ لوگوں کی رائے پر مجھے ہمیشہ اعتماد رہا ہے۔



مولانا: مرزا صاحب آپ کو یاد ہوگا جب آپ شعر کہتے
آئے تھے تو آپ کی مشکل پسندی پر لوگ کتنا
طنز کرتے تھے۔

غالب: ہاں بھائی میں بھولا کب ہوں۔

شیفتہ: مُلّا عبدالقادر رام پوری نے تو ایک بے معنی شعر آپ سے
منسوب بھی کیا تھا۔

حالی: ہاں وہ شعر ___ کیا تھا؟ لیجیے یاد آیا ہے۔

پہلے تو روغنِ گل بھینس کے انڈے سے نکال
پھر دوا جتنی ہے گل بھینس کے انڈے سے نکال

غالب: کیا زمانہ تھا وہ بھی! [ہنستے ہیں، سبھی ہنستے ہیں]

مولانا: آپ کے اردو دیوان میں بیدل کے طرز کے چند شعر بھی
جائیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔

غالب: میں آپ کی نکتہ رسی کا قائل ہوں مولانا۔

حالی: قطع کلام معاف ___ آپ کے ایک شعر کو کوشش کے
باوجود سمجھ نہ سکا۔

غالب: (ہنس کر) ہاں!

آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

اچھا وہ کونسا شعر ہے؟

حالی: ___ قمری کفِ خاکستر و بلبل قفسِ رنگ
اے نالہ نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے

غالب: ارے بھئی اے کی جگہ جز پڑھو، معنی خود سمجھ میں آجائیں گے۔

حالی: اگر آپ اے کی جگہ جز کا لفظ ہی رکھ دیتے یا مقبول
کئے دوسرا مصرع اس طرح کہتے۔

اے نالہ نشاں تیرے سوا عشق میں کیا ہے

تو مطلب صاف ہو جاتا۔

غالب: (بے چین ہو کر) ٹھیک ہے مطلب صاف ہوتا، لیکن
اس طرح طرزِ بیان کی انفرادیت ختم ہو جاتی۔ میں روایتی
شاعر نہیں ہوں۔ شاعری کو معنی آفرینی سمجھتا ہوں۔ میرے
مُبہم بیان پر فصاحت قربان ہوتی ہے اور ___ اور
عام روش مجھے ہرگز پسند نہیں۔ لوگوں کو میرا کلام
پسند نہ ہو تو مجھے پروا نہیں

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہے مرے اشعار میں معنی نہ سہی

[اتنے میں میر مہدی مجروح آتے ہیں]

مجروح: آداب عرض کرتا ہوں قبلہ!

غالب: آؤ بھائی میر مہدی مجروح، آؤ، کیا حال ہے (کلّو کو
پکارتے ہوئے) اے میاں کلّو، پان لاؤ۔

مجروح: نہیں مرزا صاحب، میں پان نہیں لوں گا۔ آپ کی
مزاج پرسی کو حاضر ہوا ہوں۔ کہیے کیا حال چال ہیں؟

غالب: بھائی کچھ نہ پوچھو ان دنوں ہمارا کیا عالم ہے۔ معاش
کے دو ہی ذریعے تھے۔ سرکاری پنشن اور قلعے کی تنخواہ۔
سو دونوں گئے۔ اب گزارہ ہو تو کیونکر ہو۔ جس قدر کپڑا،
اوڑھنا اور بچھونا گھر میں تھا سب بیچ بیچ کر کھایا۔ گویا
اور لوگ روٹی کھاتے ہیں اور میں کپڑا کھاتا ہوں ___
پنشن اگر مل بھی گئی تو بھی کام چلتا نظر نہیں آتا اور نہ ملی
تو کام ہی تمام ہے۔ مشکل یہ ہے کہ دونوں صورتوں میں
اس شہر کی آب و ہوا راس آتی معلوم نہیں ہوتی۔ ضرور
شہر چھوڑنا پڑے گا۔

شیفتہ: ایسا نہ کہیے گا مرزا صاحب۔

غالب: بھائی اب رسوائی کے سامان میں کونسی کمی باقی رہ گئی ہے۔

جسے نصیب ہو روزِ سیاہ میرا سا
وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو

یہ میاں کالے صاحب کی مہربانی تھی کہ قلعے کی ملازمت
دلوائی تھی اور خاندانِ تیموری کی تاریخ لکھنے کا کام ملا
تھا، لیکن اب وہ بھی گیا۔ اُف ___ اوہ (کراہتے ہیں)
پیر میں سخت درد ہو رہا ہے۔

مجروح: (محبت سے) لائیے میں آپ کے پاؤں دبا دوں۔

غالب: بھئی تو سید زادہ ہے، کیوں مجھے گناہ گار کرتا ہے۔

مجروح: ایسا ہی ہے تو مجھے کچھ اُجرت دے دیجئے گا۔

غالب: اچھا یہی سہی۔ (مجروح پاؤں داب رہے ہیں۔ مولانا فضل
حق، شیفتہ اور حالی آداب کہہ کے جاتے ہیں) ۔



مجروح: زحمت نہ ہو تو کوئی غزل ارشاد ہو۔

غالب: بھائی تمہارا اصرار ہے تو ایک غزل سناتا ہوں۔

مجروح: ارشاد۔

غالب: وہ فراق اور وہ وصال کہاں — وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں
فرصت کاروبارِ شوق کسے — ذوقِ نظارۂ جمال کہاں
تھی وہ اک شخص کے تصور سے — اب وہ رعنائیِ خیال کہاں
ایسا آساں نہیں لہو رونا — دل میں طاقت جگر میں حال کہاں
فکرِ دنیا میں سر کھپاتا ہوں — میں کہاں اور یہ وبال کہاں
مضمحل ہو گئے قویٰ غالب!
اب عناصر میں اعتدال کہاں

مجروح: بہت خوب! بہت خوب!

غالب: چند شعر اور سنیے، طبیعت آمادہ معلوم ہوتی ہے۔

مجروح: ارشاد، ارشاد!

غالب: ؎ رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار
اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

مجروح: سبحان اللہ!

غالب: اچھا بھئی میر مہدی اب بس کرو۔ شام ہو رہی ہے۔ گورے سپاہی ادھر ادھر پھرتے رہتے ہیں۔

مجروح: اچھا، اب اجازت چاہتا ہوں لیکن حضور میرے پیر دابنے کی اجرت؟

غالب: بھائی اجرت کیسی؟ تم نے میرے پاؤں دابے، میں نے تمہارے پیسے دابے، حساب برابر ہوا۔

[مجروح ہنستے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ غالب تنہا رہ جاتے ہیں۔ سوچوں میں محو ہو جاتے ہیں۔ دفعتہً پس منظر سے آواز آتی ہے]

آواز: دلی اجڑ گئی۔ تہذیب کی بساط الٹ گئی۔ مغلیہ سلطنت کی عالی شان عمارت خاک بوس ہو گئی اور آخری مغلیہ تاجدار بہادر شاہ ظفر کو جلاوطن کیا گیا۔

غالب: تم ۔۔۔ تم ۔۔۔؟

آواز: ہاں میں ہوں، سنو غالب دار و گیر کا بازار ابھی گرم ہے۔ گھر سے باہر قدم رکھنا مشکل ہے۔ تم گھر کے زنداں میں قید ہو گئے ہو۔ سوچو تو تمہاری زندگی میں کتنا سناٹا ہے!

غالب: سناٹا! ۔۔۔ ہاں یہ سچ ہے، لیکن ۔۔۔ لیکن میں زندگی سے مایوس نہیں ہوں ۔۔۔ میں زندگی سے مایوس نہیں ہو سکتا ۔۔۔ مجھے ۔۔۔ مجھے زندگی سے محبت ہے، بے پناہ محبت! میں اس کی ہر ادا سے پیار کرتا ہوں۔ میرا یقین غیر متزلزل ہے۔
؎ رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

آواز: یہ تمہاری خوش فہمی ہے۔

غالب: نہیں، یہ حقیقت کا شعور ہے۔ جس تہذیب اور کلچر کی ہم نے خونِ جگر سے آبیاری کی، بے شک وہ تباہ ہو گیا۔ آندھی کے وہ تند و تیز جھکڑ چلے کہ سارا گلستاں برباد ہو گیا اور گہری تاریکیاں چھا گئیں، لیکن ۔۔۔ لیکن میں نے اس تاریک رات میں ایک نئی پھوٹتی ہوئی روشنی کی جھلک دیکھ لی ہے۔

آواز: تم نے؟

غالب: ہاں میں نے ۔۔۔ وقت برق رفتار ہے۔ تبدیلیاں زندگی کا مقدر ہیں اور تبدیلیاں ہی زندگی کو حسن اور سوز و ساز عطا کرتی ہیں۔ پرانی تہذیب کے ملبے پر ایک نئی دنیا تعمیر ہو رہی ہے۔ ایک نیا دور آ رہا ہے۔ یہ سائنس اور صنعتی ترقی کا دور ہے۔ سائنس نے انسان کو ترقی کا ایک نیا شعور دیا ہے۔

آواز: لیکن یہ تمہارے زخموں کا مداوا نہیں غالب۔ سوچو تو، تمہیں زندگی نے زخموں، آہوں اور کراہوں کے سوا کیا دیا۔ کیا کیا صدمے تمہیں اٹھانے پڑے۔ جوئے کے الزام میں تم قید ہوئے۔ سات بچوں کی لاشیں



اپنے ہاتھوں دفنا چکے ہو۔ عارف کی جواں مرگی نے
تمہیں کسی لائق نہیں رکھا ۔۔۔
دل میں آنسوؤں کی گیلی، کیوں غیروں کو
پیار کرتے ہو۔ کیا کیا رحم نہیں کھائے ہیں ۔۔۔ عارف کی
جواں مرگی نے میری دنیا کو تاریک کر دیا (آہستہ
سر کو پکڑتے ہوئے) ۔۔۔ میں ۔۔۔ میں نے کب جگرداری
کا دعویٰ کیا ہے۔ میں بھی انسان ہوں، پتھر نہیں ہوں۔
میرے سینے میں ایک حساس دل ہے۔ میں ہیبت صدموں
سے کیوں نہ گھبرا جاؤں

[باہر دور سے گولیوں کے چلنے کی آوازیں۔ غالب گھبراہٹ
میں اِدھر اُدھر دیکھتے ہیں۔ خاموشی چھا جاتی ہے]

[دوسرا نوکر مداری ہانپتا ہوا آتا ہے]

غالب (گھبرا کر) کیوں مداری، کیا خبر لائے ہو؟

مداری: سرکار، منجھا وہاں آیا تھا۔

غالب: وہی جو میرزا یوسف کی ڈیوڑھی پہ رہتا تھا؟

مداری: ہاں سرکار۔

غالب (بے چین ہو کر) کیا کہا اس نے؟

مداری: کہتا تھا ۔۔۔ کہتا تھا کہ سپاہی اُن کے مکان میں بھی گھس
گئے تھے اور سارا سامان لے گئے اور آج آدھی رات گذرے
میرزا یوسف ۔۔۔ کا ۔۔۔ انتقال ہوا۔

غالب: ہائے میرا بھائی! انا للہ وانا الیہ راجعون۔ [باہر
ملا جلا شور، دوڑ دھوپ کی آوازیں، چیخیں، گولیوں کی
آواز بہ نزدیک سے آتی ہے۔ کلو گھبرایا ہوا آتا ہے]

کلو: سرکار غضب ہو گیا!

غالب (انتہائی گھبراہٹ میں) کیا ہوا کلو؟

کلو: چند گورے سپاہی دیوار پھاند کر محلے میں گھس آئے ہیں۔
مہاراجہ پٹیالہ کے سپاہیوں نے انہیں روکنے کی بہت
کوشش کی، لیکن ایک نہ چلی [اتنے میں تین چار سپاہی
سندوقیں تانے اندر گھس آتے ہیں۔ انہوں نے محلے کے
ایک دو آدمیوں کو گرفتار کیا ہوا ہے]

سپاہی: (گرج کر) ہم تم کو پکڑ کر لے جائے گا۔

غالب: (گھبراہٹ کے ساتھ) ہم کو؟

دوسرا سپاہی: ہاں تم کو ۔۔۔ مرزا غالب کو۔

غالب: کس جرم کی پاداش میں؟

سپاہی: یہ ہم نہیں جانتا مانگتا۔ کرنل براؤن کا آرڈر ہے۔ چلو
جلدی کرو۔

غالب: (بے بسی کے عالم میں) اچھا تو چلو۔

جانے والے زلف میں زنجیر سے بھاگیں گے کیا
ہیں گرفتارِ وفا زنداں سے گھبرائیں گے کیا

کلو!

کلو: سرکار؟

غالب: کلو ذرا میرا جبہ دینا اور کلاہ بھی [جبہ اور کلاہ پہنتے ہیں
اور سپاہیوں کے ساتھ چلنے لگتے ہیں۔ اسٹیج پر کلو اور
مداری بے بسی میں ہاتھ ملتے ہیں۔ اسٹیج خالی ہو جاتا ہے۔
اندھیرا چھا جاتا ہے]

[منظر]

(غالب پلنگڑی پر گاؤتکیے سے ٹیک لگائے بیٹھے ہیں۔ کلو
اندر آتا ہے)

غالب (بڑھاپے اور نقاہت کے عالم میں) کلو ذرا پانی پلا دینا۔

[کلو پانی دیتا ہے۔ غالب مشکل سے اٹھ بیٹھتے ہیں۔ کلو
جانے لگتا ہے]

کلو!

کلو: (پلٹ کر) حضور!

غالب: ذرا کاغذ اور قلم دان دینا (کلو کاغذ اور قلم دان دیتا ہے)

[غالب کاغذ پر جھکتے ہیں، پس منظر میں خط کی عبارت
پڑھی جاتی ہے]

آواز: ناتوانی زوروں پر ہے۔ بڑھاپے نے نکما کر دیا ہے۔ ضعف،
سستی، کاہلی، گراں جانی، رکاب میں پاؤں ہے، باگ
پر ہاتھ ہے۔ بڑا سفر دور و دراز درپیش ہے۔ زادِ راہ
موجود نہیں، خالی ہاتھ جاتا ہوں۔ اگر ناپرسیدہ بخش
دیا تو خیر، اور اگر باز پرس ہوئی تو سقر مقر۔ ہائے کسی
کا کیا اچھا شعر ہے



ے اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

غالب: اوہ، انگلیاں اکڑ گئیں اور درد کرنے لگیں کلّو میاں آؤ۔

کلّو: سرکار!

غالب: یہ خط لو اور ڈاک میں ڈال آؤ، اور ہاں مرزا تفتہ کی غزل کی اصلاح بھی کر چکا ہوں، یہ بھی ڈاک میں ڈال دو۔

(کلّو جاتا ہے۔ امراؤ بیگم آتی ہیں)

امراؤ بیگم: کتنی بار تم سے کہا کہ پلنگ پر لیٹے رہو اور لکھنے پڑھنے سے باز رہو۔ تم ہو کہ اپنی ضد سے باز نہیں آتے۔

غالب: کہاں کا لکھنا پڑھنا بیگم، میں تو اب مشق فنا میں غرق ہوں۔ بوعلی سینا کے علم اور نظیری کے شعر کو ضائع، بے فائدہ اور موہوم جانتا ہوں۔ زندگی بسر کرنے کو کچھ تھوڑی سی راحت چاہئے۔ باقی حکمت اور سلطنت اور شاعری اور ساحری سب بکواس ہے۔

امراؤ بیگم: (افسردہ لہجے میں) ہماری قسمت ہی خراب ہے۔ آخری عمر میں کیا کیا دھکے کھانے پڑتے ہیں۔ غدر کے ہنگامہ میں اپنے تمام زیورات اور قیمتی کپڑے میاں کالے صاحب کے مکان پر بھجوا دیئے تھے۔ خیال تھا، وہاں محفوظ رہیں گے سب اُن کو مانتے تھے، مگر کالے صاحب کا مکان بھی تاراج ہوا اور میرا سارا سامان لُٹ گیا۔

غالب: چلو یہی سہی کسر بھی پوری ہو گئی۔

ے سفینہ جب کہ کنارے پہ آ لگا غالبؔ
خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہیئے

لیکن اکثر سوچتا ہوں بیگم اور سوچ سوچ کر تڑپتا ہوں کہ زمانے نے میری قدر نہ کی، یاد ہے بیگم؟

امراؤ بیگم: کیا؟

غالب: یوسف کو اُس کے بھائیوں نے چند کھوٹے رُولوں کے عوض سوداگروں کے پاس بیچ دیا تھا ـــ ہاہا ـــ

امراؤ بیگم: تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔

غالب: نہیں بیگم، میرا دماغ اب ٹھیک ہو گیا ہے اور اب مجھ پر ظاہر ہوا کہ اس ملک میں عرضِ ہنر بےکار ہے۔

ے ہرگز کسی کے دل میں نہیں ہے مری جگہ
ہوں میں کلامِ نغز ولے ناشنیدہ ہوں

ہیں۔ میں اب موت کے انتظار میں ہوں۔ حیران ہوں کہ موت کو کس کا انتظار ہے، لیکن ـــ لیکن دل میں حسرتوں کے داغ ہیں۔ اپنے پیچھے کچھ بھی نہیں چھوڑا ہے اور بیوہ بیوی کی مفلسی کا خیال مر کے بھی چین نہیں دے گا۔

ے میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالبؔ کہ دل
دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا جل گیا

امراؤ بیگم: کیسی باتیں کرتے ہو تم! لیٹ جاؤ ذرا۔ میں جاتی ہوں اور برف کا پانی بھجواتی ہوں۔ (جاتی ہے۔ غالب ایک مجلّد کتاب دیوانِ قاآنی پڑھنے لگتے ہیں۔ کتاب رکھ دیتے ہیں۔ چہرے پر گہری سوچ کی پرچھائیاں۔ فکرِ سخن میں غرق ہوتے ہیں)

غالب: (خود کلامی) جب، جب میں فکرِ سخن میں کھو جاتا ہوں اُس وقت اگر تمہارا گذر میرے ضمیر میں ہو، تم دیکھو گے کہ میرا دل پگھل رہا ہے اور میرے جگر میں آگ کا دریا بہہ رہا ہے۔

ے عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا
جس دل پہ ناز تھا مجھے، وہ دل نہیں رہا
جاتا ہوں داغِ حسرتِ ہستی لئے ہوئے
ہوں شمعِ کشتہ، درخورِ محفل نہیں رہا
مرنے کی اے دل اور ہی تدبیر کر کہ میں
شایانِ دست و بازوئے قاتل نہیں رہا
گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

آواز: ہاہاہا ـــ تم نے آخر شکست تسلیم کر ہی لی۔

غالب: (چونک کر) تم ـــ؟ کیا تم مرتے دم تک میرا پیچھا نہ چھوڑو گے؟

آواز: نہیں غالبؔ، غالبؔ سے الگ کیونکر رہ سکتا ہے؟

غالب: تو کیا تم ـــ؟

آواز: ہاں میں تمہاری آواز ہوں، تمہاری رُوح کے سناٹے میں گونجتی ہوئی آواز ـــ اچھا ہوا، تمہیں احساس تو ہوا کہ تمہارے دل کی موت ہو چکی ہے۔ تم بجھی ہوئی شمع ہو اور حسرتوں کا

(باقی ۲۵۷ پر دیکھئے)

اظہر افسر

(ڈراما)

غالب

کردار

مرزا غالب ۔ نواب ذوالفقار علی خاں آذر ۔ میر مہدی مجروح
حکیم محمود خاں ۔ حکیم احسن اللہ خاں ۔ چاندی ۔
نواب ضیاء الدین احمد خاں ۔ نیاز علی ۔ کلیان ۔

مرزا غالب کے مکان کا مردانہ حصہ ۔ قدیم طرز کا ایک خوبصورت دالان ۔ داہنی جانب تخت بچھا ہے جس کے ایک طرف اوٹ ہے ۔ تخت پر اور نیچے اجلی چاندنی کا فرش ہے ۔ نیچے فرش پر وسط میں زرد رنگ والا بڑے بڑے پھولوں کا عمدہ قالین بچھا ہے ۔ قالین پر گاؤ تکیے بھی رکھے ہیں ۔ کھونٹیوں پر مرزا غالب کے کچھ کپڑے لٹکے ہوئے ہیں ۔

پردہ اٹھتا ہے تو مرزا غالب قالین پر بیٹھے قلمدان کے اندر کچھ دیکھ رہے ہیں ۔

کلیان جس کا بھرا بھرا جسم ہے، اوسط قد ہے، معمولی کپڑے کا سفید پاجامہ، گھٹنوں والا انگرکھا جو نیچے کو پھیلا ہوا ہے۔ سر پر ململ کی نقشی ٹوپی ہے جس سے سفید بال نظر آ رہے ہیں گلے میں ریٹھوں کی مالا ہے ۔ ڈاڑھی مونچھ چٹ ہے ۔ بائیں جانب سے داخل ہوتا ہے ۔

کلیان: حضور، نواب ذوالفقار علی خاں آئے ہیں ۔

غالب: (کشیدہ قامت، چوڑا چکلا جسم، ڈاڑھی سفید بھک، سامنے کے دو دانت ٹوٹے ہوئے، زردی مائل نقشی ململ کا انگرکھا، سفید ایک برکا پاجامہ ۔ اس وقت ننگے سر ہیں ۔ سر پر بہت ہلکے ہلکے سفید بال ہیں ۔ چہرے کی رنگت اس عمر میں بھی چمپئی ہے ۔ بڑی بڑی غلافی آنکھوں سے جس کی طرف دیکھ لیتے ہیں اُسے مسحور کر دیتے ہیں ۔ کلیان کو دیکھ کر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں) ــــ نواب صاحب کو بلاؤ ۔

(کلیان بائیں جانب جاتا ہے اور ایک لمحے بعد بائیں جانب سے نواب ذوالفقار علی خاں، جن کی عمر پچاس کے لگ بھگ ہے، تل چاولی ڈاڑھی گورا رنگ اور لمبا قد ہے ۔ سفید ململ کے کرتے پر چھینٹ کا فرغل پہنے ہیں ۔ سفید ہی ایک برکا پاجامہ ہے ۔ چال ڈھال سے پتہ چلتا ہے کہ کبھی اچھے دن گذار چکے ہیں ۔ کلیان کے ساتھ داخل ہوتے ہیں)



نواب: تسلیمات بجالاتا ہوں۔

غالب: (سلام کا جواب دیتے ہوئے) بہت دنوں بعد غریب خانے کا رُخ کیا۔ تشریف رکھیئے۔ (کلیاں چلا جاتا ہے)

(مرزا غالب اور نواب ذوالفقار علی خاں قالین پر پاس پاس بیٹھتے ہیں)

نواب: دیکھئے مرزا صاحب اس بار بھی آپ نے اپنا حُسنِ وفات نکالا تھا یعنی ۱۲۷۷ ہجری "غالبِ مُرد علط نکلا۔"
(ہنستے ہیں)

غالب: بھئی ۱۲۷۷ ہجری کی بات غلط نہ تھی، یعنی اس سن میں مجھے مرنا چاہیے تھا، مگر میں نے وبائے عام میں مرنا اپنے لائق نہ جانا۔ وجہ کیا کہ اس میں میری کسرِ شان تھی۔ بعد رفعِ فساد ہوا کے سمجھ لیا جائے گا۔

(غالب اور نواب دونوں ہنستے ہیں)

نواب: مطبع سید الاخبار میں چھپا آپ کے اردو دیوان کا ایک نسخہ ہمدست ہوا۔ انتخابِ کلام لاجواب ہے داد نہ دینا زیادتی ہے۔

غالب: نواب صاحب آپ عاصی کے اردو کلام کی تعریف فرماتے ہیں اور میں شرماتا ہوں۔ حضرت، یہ غزلیں کاہے کو ہیں، پیٹ پالنے کی باتیں ہیں۔ میرے فارسی کے قصیدے جن پر مجھ کو ناز ہے، کوئی ان سے لطف نہیں اٹھاتا۔ اب دیکھئے قدر دانی اس بات پر منحصر ہے کہ گاہ گاہ حضرت ظلِ سبحانی فرما بیٹھتے ہیں کہ بھئی بہت دن سے کوئی سوغات نہیں لائے۔

نواب: سوغات؟

غالب: جی ہاں یعنی نیا ریختہ۔ ناچار کبھی کبھی یہ اتفاق ہوتا ہے کہ کوئی غزل کہہ کر لے جاتا ہوں۔ ابھی مطبع دارالسلام سے تصحیح و ترتیب کے بعد میرا فارسی کلام میخانۂ آرزو سرانجام کے نام سے نواب ضیاء الدین احمد خاں نے شائع کیا ہے۔

نواب: بجا فرمایا آپ نے (رُک کر) منشی شیو نارائن مالک مطبع مفیدِ خلائق آگرہ نے لکھا ہے کہ آپ نے گھر کا مطبع چھوڑ کر اپنا دیوان میرٹھ بھیج دیا۔

غالب: ہاں بھئی، ابتدا میں میں کیا جانتا تھا کہ منشی شیو نارائن کون ہے۔ جب یہ جانا کہ شیو نارائن بنسی دھر کا پوتا ہے تو معلوم ہوا کہ یہ میرا فرزندِ دلبند ہے۔ اس کو ہمارے خاندان کی آمیزش کا حال معلوم نہیں۔

نواب: جی۔

غالب: شیو نارائن کے دادا کے والد، عبد نجف خاں ہمدانی میں میرے نانا مرحوم خواجہ غلام حسین خاں کے رفیق تھے۔ جب میرے نانا نے نوکری ترک کی اور گھر بیٹھے، تو اس کے دادا نے بھی کمر کھولی اور پھر کہیں نوکری نہ کی۔ یہ باتیں میرے ہوش سے بہت پہلے کی ہیں۔

نواب: بجا فرمایا۔

غالب: مگر جب میں جوان ہوا تو دیکھا، منشی بنسی دھر اور خاں صاحب ساتھ ساتھ ہیں۔ شیو نارائن کے باپ مجھ سے دو ایک برس بڑے ہوں یا چھوٹے ہوں، انیس یا بیس برس کی میری عمر اور ایسی ہی عمر اُن کی۔ اختلاط اور محبت باہم۔ شطرنج آدھی آدھی رات گزر جاتی تھی۔ چونکہ اُن کا گھر بہت دور نہ تھا اس واسطے جب چاہتے تھے، چلے آتے تھے، چلے جاتے تھے۔

نواب: جی۔

غالب: اب میں نے بڑی تفصیل سے شیو نارائن کو لکھا ہے، کہ بھائی بارہ برس کی عمر سے کاغذ نظم و نثر میں مانند اپنے نامۂ اعمال کے سیاہ کر رہا ہوں (پھر نواب کی طرف دیکھ کر) اب سب شیو نارائن ہی سے چھپواؤں گا۔ (اچانک مرزا غالب کا چہرہ کبیدہ خاطر ہو جاتا ہے، لیکن دوسرے ہی لمحے مرزا چہرے پر بشاشت لا کر نواب ذوالفقار علی خاں کے فرغل کو دیکھتے ہیں)

غالب: بھئی کیا عمدہ چھینٹ کا فرغل آپ نے پہنا ہے۔



نواب: اچھا ہے۔

غالب: خوب ہے۔ یہ چھینٹ آپ نے کہاں سے لی مجھے اس کی وضع بہت بھلی معلوم ہوتی ہے۔

نواب: جی ـــــ

غالب: آپ مجھے بھی فرغل کے لئے یہ چھینٹ منگوا دیں۔

نواب: مرزا صاحب، یہ فرغل آج ہی بن کر آیا ہے اور میں نے اسی وقت پہنا ہے۔ اگر آپ کو اس قدر پسند ہے تو یہی حاضر ہے۔

غالب: جی تو یہی چاہتا ہے کہ اسی وقت آپ سے چھین کر پہن لوں، مگر آپ ... مکان تک کیا پہن کر جائیں گے؟

(مرزا غالب ادھر ادھر دیکھتے ہیں اور پھر کھونٹی پر سے اپنا نہایت قیمتی مالیدہ کا جبہ اتار کر دیتے ہیں۔ نواب ذوالفقار علی خاں اپنا چھینٹ کا فرغل اتارتے ہیں۔ مرزا غالب اُن سے فرغل لے کر نہایت تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے اُسی کھونٹی پر لٹکا دیتے ہیں، جہاں سے اُنھوں نے اپنا قیمتی جبہ لیا تھا۔)

(دونوں کھڑے ہیں)

غالب: تشریف رکھیے۔

نواب: اب اجازت دیجئے۔ تسلیمات۔ میرا خیال ہے ... رہتی دنیا تک آپ کا نام صرف آپ کے اُردو کلام ہی کے باعث ہمیشہ ہمیشہ تابندہ رہے گا۔ تسلیمات۔

غالب: تسلیمات۔

(نواب ذوالفقار علی خاں بائیں جانب سے چلے جاتے ہیں۔ مرزا غالب کچھ سوچتے ہوئے ٹہل رہے تھے۔ دائیں جانب سے کلیان اور بائیں جانب سے میر مہدی مجروح داخل ہوتے ہیں۔ میر مہدی مجروح کے ہاتھ میں کچھ اخبار ہیں۔ کلیان سر پر کھانے کا خوان لئے ہوئے ہے۔ ہاتھ میں نقشی کپڑا ہے۔)

غالب: (مجروح کو دیکھ کر) اے جناب ... صاحب السلام

مجروح: تسلیم حضرت آداب۔

مجروح: (بڑے ادب سے اپنے اُستاد کو سلام کرتے ہیں)

(کلیان تخت پر نقشی کپڑا بچھا کر مختلف پیالے اور رکابیاں رکھتا ہے)۔ (مرزا غالب ذرا سی دیر کے لئے دائیں جانب لگے لوٹے کے پیچھے جاتے ہیں اور لوٹ آتے ہیں تو اُن کے ہاتھ بھیگے ہوئے ہیں۔)

غالب: (تخت پر بیٹھتے ہوئے) آؤ کھانا کھالو۔

مجروح: جی نہیں، میں ابھی کچھ دیر ہوئی، کھا کر چلا تھا۔

غالب: (اشارہ کرتے ہوئے) اِن پیالوں کو دیکھو اور برتنوں کی کثرت کا خیال کرو تو میرا دستر خوان یزید کا دسترخوان معلوم ہوتا ہے اور جو کھانے کی مقدار کو دیکھو تو بایزید کا۔

(مجروح مسکراتے ہوئے پاس ہی تخت پر بیٹھ جاتے ہیں)

غالب: تم تو جانتے ہو میری مرغوب غذا بس ایک ہی ہے وہ ہے گوشت اور کچھ نہیں۔ پہلے ایک وقت بھی بغیر گوشت کے نہ رہ سکتا تھا۔ مشکل کے دن بھی کھچڑی یا شوربا نہیں کھایا۔ آج کل خوراک بہت کم ہو گئی ہے۔

مجروح: جی۔

غالب: صبح سویرے کسی قدر شیرۂ بادام پیتا ہوں۔ اس وقت پاؤ سیر گوشت کا قورمہ، ایک پیالے میں بوٹیاں ہیں، دوسرے میں شوربا۔ اس پیالے میں پھلکے کا چھلکا شوربے میں ڈوبا ہوا ہے اور اس پیالی میں ایک انڈے کی زردی ہے۔ اس پیالی میں ذرا سا دہی بس۔ شام بھنے کباب یا سیخ کے کباب (ایک لقمہ لیتے ہوئے) کھٹی چنے کی دال اگر ہو چکی تھی تو لے آتے یا مجھ سے کہا ہوتا میں منگوا دیتا۔ آج کسی چیز میں چنے کی دال نظر نہیں آتی۔

کلیان: حضور دال تو گھر میں موجود ہے، منگوانے کی حاجت نہیں۔

غالب: پھر ـــ؟



کلیان: حضرت مرزا اما قرکی دُلہن بگا بیگم چنے کی دال نہیں کھاتیں۔

غالب: اوہو، تو یہ بھی اپنے شوہر عارف پر گئیں اور خدا سے بڑھ گئیں۔

مجروح: خدا سے بڑھ گئیں؟ حضرت وہ کیسے؟

غالب: چنا تو وہ چیز ہے جس پر خود اللہ میاں کی رال ٹپک پڑی تھی۔ چنے نے ایک دفعہ جناب الٰہی میں فریاد کی تھی کہ دنیا میں مجھ پر بڑے ظلم ہوتے ہیں۔ مجھے دَلتے ہیں، پیستے ہیں، ٹھونستے ہیں اور مجھ سے سیکڑوں کھانے کی چیزیں بنا کر کھاتے ہیں۔ جیسا مجھ پر ظلم ہوتا ہے اور کسی پر نہیں ہوتا۔

مجروح: جی۔

غالب: (لقمہ لیتے ہوئے) وہاں سے حکم ہوا کہ اے چنے! تیری خیر اسی میں ہے کہ تو ہمارے سامنے سے چلا جا، ورنہ ہمارا بھی یہی جی چاہتا ہے کہ تجھ کو کھا جائیں۔

مجروح: خوب!

غالب: تو، چنا تو وہ چیز ہے جس پر خود اللہ میاں کی رال ٹپک پڑی تھی۔ جب بہو چنا نہیں کھاتیں تو یہ خدا سے بھی بڑھ گئیں کہ نہیں؟

(مرزا غالب اور مجروح ہنستے ہیں۔ پھر مجروح بیٹھے بیٹھے ایک اخبار کھولتے ہیں)

غالب: یہ اخبار کیسا ہے؟

مجروح: جی پندرہ جولائی کا آگرے کا اخبار سعد الاخبار ہے۔

غالب: کوئی خاص اطلاع ہے؟

مجروح: (پڑھتے ہیں) لکھا ہے، اِن دنوں شاہ دیں پناہ نے جناب معلی الالقاب مرزا اسداللہ خاں کو بہ فرطِ عنایت اپنے حضور طلب کرکے ایک کتاب تواریخ کے لکھنے پر جو تیمور کے زمانے سے سلطنتِ حال تک ہو، مامور کیا ہے اور شش پارچہ بیش بہا خلعت اور رقوم جواہر سے سرفراز فرمایا ہے۔ [۳۴]

غالب: (مسکراتے ہیں) پرانی اطلاع ہے۔

مجروح: آگے لکھا ہے، یقین ہے کہ تواریخ مذکور دلچسپ اور متین عبارت میں لکھی جائے گی کہ ہر ایک اس کے لطفِ عبارت سے فیض یاب ہوگا ——— غالب تہنیت نامہ بھیج چکا ہے۔

غالب: بھائی وہ مل گیا اور بات کافی آگے بڑھ گئی ہے کتاب ہے "مہر نیم روز"۔ پہلے تو حضرت بہادر شاہ ظفر کا خیال تھا کہ خاندانِ تیمور کی تاریخ یعنی صاحبقراں امیر تیمور سے لے کر حکمرانِ عہد تک کے حالات قلم بند ہوں۔ چنانچہ امیر تیمور کے حالات سے کتاب کا آغاز ہوا۔ پھر حضرت ظہیر الدین بابر بادشاہ تک کی سرگذشت مکمل کر دی۔ اب حضرت ہمایوں بادشاہ کی جلاوطنی اور واپسی تک کی داستان لکھ لی ہے۔

مجروح: سبحان اللہ!

غالب: اب حضرت بہادر شاہ ظفر نے حکم دیا ہے کہ تاریخِ دنیا کے آغاز سے لکھی جائے اور آئندہ کے لئے حکیم احسن اللہ خاں کو مدد اور مشوروں کے لئے مقرر فرمایا ہے۔ پہلے خود ہی کُتبِ تاریخ سے واقعات کا انتخاب کرتا تھا، اب اِس نئے حکم کے مطابق واقعات کے اقتباس و انتخاب کا کام انجام دیں گے حکیم احسن اللہ خاں اور میرے پاس بھیج دیں گے۔ میں انہیں فارسی میں منتقل کر دوں گا۔

مجروح: جی!

غالب: ارادہ ہے کہ پہلی کتاب مہر نیم روز میں آغاز سے ہمایوں بادشاہ کی جہاں گردی اور جہاں گیری کے حالات اجمال سے لکھوں اور دوسرے حصّے میں جلال الدین اکبر بادشاہ سے لے کر بادشاہِ عصر ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ کے عہد تک کے حالات نسبتاً زیادہ تفصیل سے قلمبند کر دوں۔

مجروح: اور اِس دوسرے حصّے کا نام؟

غالب: ماہِ نیم ماہ۔



مجروح۔ سبحان اللہ۔ ماہِ نیم ماہ۔ انوکھی ترکیب
سبحان اللہ۔
(مرزا غالب تخت پر سے اُٹھتے ہیں اور اوٹ
میں ہاتھ صاف کرنے کے لئے چلے جاتے ہیں۔ مجروح
اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ کلیاں دائیں جانب سے
داخل ہوکر برتن اُٹھا لے جاتا ہے۔)
مجروح حضرت یہ کتب آپ چھپوائیں گے؟
غالب (بائیں جانب سے داخل ہوتے ہوئے) میاں کیا باتیں
کرتے ہو۔ میں کتابیں کہاں سے چھپواؤں گا۔ روٹی
کھانے کو نہیں۔ شراب پینے کو نہیں۔ اِدھر جاڑے
آ رہے ہیں۔ لحاف توشک کی فکر ہے۔ میرا شاگرد
منشی ہرگوپال تفتہ موجود ہے۔ اُس کو میں نے لگا دیا
ہے۔ ہاں خوب یاد آیا، کل سے تین نامے رکھے ہیں،
اُن کے جواب لکھنے ہیں ــــــ مرضی ہو تو آؤ میں لکھوا
دوں۔
مجروح: جی حضور ــــ ضرور۔
(مرزا غالب قلمداں کے پاس بیٹھ کر اُسے کھولتے ہیں۔
پاس ہی مجروح ایک گھٹنا اونچا کرکے بیٹھ جاتے ہیں۔
غالب قلمداں میں سے کچھ تختے نکالتے ہیں اور مجروح
کو دیتے ہیں پھر ایک پر والاقلم اور دوات بھی۔
دو تین تختے خود سنبھال لیتے ہیں)
غالب: سب سے پہلے لکھو حاتم علی مہر کو ــ بندہ پرور آپ کا
مہربانی نامہ آیا۔ محبت جیسے باتوں نے غم سے کسی کو
[illegible]
خود شکوہ دلیل وضعِ آزار لس است
آید بہ زباں ہر آنچہ از دل سردد
مجروح (لکھ کر مرزا غالب کی طرف دیکھتے ہیں) جی ا
غالب لکھو۔ غیر شکوے سے بُرا نہیں مانتا۔ مگر شکوے
کے فن کو سوائے میرے کوئی نہیں جانتا۔ شکوے کی
خوبی یہ ہے کہ راہِ راست سے مُنہ نہ موڑے اور مع ہدا
... کے واسطے جواب کی گنجائش نہ چھوڑے کیا

غالب: ... یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ مجھ کو آپ کا فرخ آباد
جانا معلوم ہوگا تھا۔
مجروح۔ جی۔
غالب: اسی واسطے خط نہیں لکھا تھا۔ کیا میں یہ نہیں کہہ
سکتا کہ میں نے اِس عرصے میں کئی خط بھجوائے اور وہ
اُلٹے پھر آئے۔ آپ شکوہ کاہے کو کرتے ہیں۔ اپنا گناہ
میرے ذمّے دھرتے ہیں۔ نہ جاتے وقت لکھا کہ میں
کہاں جاتا ہوں نہ وہاں جاکر لکھا کہ میں کہاں رہتا
ہوں۔ کل آپ کا مہربانی نامہ آیا۔ آج میں نے اس
کا جواب لکھوایا۔ کہئے ایسے دعوے میں صادق ہوں
یا نہیں۔ دردمندوں کو ستانا اچھا نہیں ہے۔
خدا سے میں بھی چاہتا ہوں اور وہ مہر فروغ مرزا حاتم علی مہر
والسلام۔
مجروح۔ سبحان اللہ حضرت۔ سبحان اللہ ــــ سبحان اللہ۔
غالب: اے میاں سبحان اللہ، سبحان اللہ کیا کئے جاتے ہو
اُردو عبارت لکھنے کا تم نے بھی اچھا ڈھنگ نکالا
ہے کہ مجھ کو بھی رشک آنے لگا ہے۔
مجروح میں نے حضرت؟
غالب: سُنو، دلّی کے تمام مال و متاع و زر و گوہر کی لوٹ
پنجاب احاطے میں گئی۔ یہ طرزِ عبارت خاص میری
تھی۔ میری دولت تھی سو ایک ظالم پانی پت انصاریوں
کے محلّے کا رہنے والا لوٹ لے گیا مگر میں نے
اُسے بحال کیا۔
(مجروح اُٹھ کر تسلیمات بجالاتے ہیں)
غالب: مگر بھائی عبارت لکھنے کا ڈھنگ کیا ہاتھ آیا ہے کہ
تم نے سارے جہاں کو سر پر اُٹھایا ہے ــــ ایک
غریب سیّد مظلوم میرن صاحب کے چہرۂ نورانی پہ
خوبصورت سا نکلا ہے اور تم کو سرمایۂ آرائشِ گفتار بہم
پہنچا ہے۔
مجروح: (ہنستے ہیں) جی حضرت۔
غالب: لو بھئی، دوسرا نامہ لکھو۔



مجروح، جی ارشاد ہو۔
غالب، حضرت ولی نعمت، آیۂ رحمت سلامت۔
مجروح، نواب محمد یوسف علی خاں والیٔ رام پور کے نام؟
غالب، ہاں۔ لکھو، آداب بجا لا کر عرض کرتا ہوں کہ سو
روپے کی ہنڈوی بابت مصارف نومبر ۱۸۵۹ء بھیجی
اور روپیہ وصول میں آیا اور صرف ہو گیا اور میں دستولہ
ٹھوکا اور ننگا رہا۔ تم سے نہ کہوں تو کس سے کہوں۔
اس مشاہرۂ مقرر کے علاوہ دو سو روپے اگر مجھ کو اور
بھیج دیجئے گا تو جلا لیجئے گا۔
مجروح جی حضرت۔
غالب، لیکن اس شرط سے کہ اس عطیۂ مقرری میں محسوب
نہ ہو اور بہت جلد مرحمت ہو۔ زیادہ حد ادب۔ تم
سلامت رہو قیامت تک اور ہر برس کے ہوں دن
پچاس ہزار۔
تمہاری سلامتی کا طالب، غالب۔
مجروح، جی حضرت۔
غالب، ابھی ابھی نواب ذوالفقار علی خاں آ کر آئے تھے۔ یہ
اُن رؤسا اور عمائدین میں سے ہیں، جن کی گردش روزگار
کے باعث حالت بے حد سقیم ہو گئی ہے۔
مجروح۔ لیکن حضرت جہاں تک عاصی کو یاد پڑتا ہے، میں نے
انہیں مالیدہ ہی کے محل میں جاتے دیکھا ہے۔
غالب، تم سے ملاقات ہوئی تھی؟
مجروح، جی ہاں یہیں ڈیوڑھی کے سامنے۔
غالب، تو بس اس بات کو ایسے ہی تک رہنے دو۔
مجروح حضرت میں سمجھا نہیں؟
غالب، (مسکراتے ہیں) سمجھنے کی چنداں ضرورت بھی نہیں۔
(آہستہ آہستہ اسٹیج پر اندھیرا چھا جاتا ہے۔ ایک
طرف سے یار علی اور دوسری طرف سے کلیان قدیم
وضع کے روشن لیمپ لئے آتے ہیں اور محرابوں میں
رکھ دیتے ہیں۔ اسٹیج پھر سے روشن ہو جاتا ہے۔
غالب، لو بھئی اب ہم تھک گئے ؎

مضمحل ہو گئے قویٰ غالب
اب عناصر میں اعتدال کہاں
(مرزا غالب اٹھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور انگرکھا
اُتار کر کرتے یا جامے سے تخت پر لیٹ جاتے ہیں۔
میر مہدی مجروح قلم دوات ایک طرف رکھ کر مرزا
غالب کے پیروں کے پاس بیٹھ جاتے اور پیر دبانے لگتے ہیں)
غالب، ارے ارے بھئی یہ کیا کرتا ہے؟ تو سید زادہ ہے،
مجھے کیوں گنہگار کرتا ہے!
مجروح کیا حرج ہے۔
غالب، واہ حرج کیوں نہیں۔
مجروح، (پیر دباتے ہوئے) ایسا ہی خیال ہے تو پیر دابنے کی
اُجرت دے دیجئے گا۔
غالب، ہاں اس کا مضائقہ نہیں۔
مجروح، حضرت آپ نے حاتم علی مہر کو ایک مکتوب میں تحریر
فرمایا تھا کہ کوئی ستم پیشہ ڈومنی ...
غالب ہائے ہائے کیا بات یاد دلا دی تم نے سید!
مجروح، کیا یہ صحیح ہے؟
غالب، ہاں، بہت پرانی بات ہے۔ (پس منظر میں سارنگی
کی درد ناک لے ابھرتی ہے) ایک رات میں قلعے کے
مشاعرے سے مضمحل و ملول، بے حد اداس اور
دل شکستہ لوٹ رہا تھا کہ اچانک ایک اونچے سے
مکان سے کسی کے گانے کی آواز سنائی دی۔ کوئی میری
ہی غزل گا رہا تھا۔
(چاندنی کی آواز ابھرتی ہے جو بے حد دلکش آواز میں
گا رہی ہے)
چاندنی (پس منظر)

؎ آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہوتے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہوتے تک
عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب
دل کا کیا رنگ کروں خون جگر ہوتے تک
ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن



خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل
گرمیٔ بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

(گانے کے دوران میر مہدی مجروح برابر اپنے اُستاد کے پیر دباتے رہتے ہیں)

مجروح: کون تھی یہ حسینہ

غالب: چاندنی

مجروح: ملاقات ہوئی تھی

غالب: کچھ ملاقاتیں ۔۔۔ وہ دن، دن عید کے تھے، راتیں شبِ برات کی تھیں۔

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

مجروح: اب کہاں ہے وہ؟

غالب: خبر نہیں۔ کچھ ہی دنوں بعد ایسی غائب ہوئی کہ آج تک اُس کی شکل دکھائی نہ دی (ایک سرد آہ کھینچتے ہیں)

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں

(مرزا غالب اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور سر جھکائے آہستہ آہستہ ٹہلنے لگتے ہیں۔ دائیں جانب سے کلیا بھایت چکیلا چاندی کا حقہ مع پیچوان لاتا ہے اور ایک طرف [illegible]۔ چاندنی کی آواز پس منظر ابھرتی ہے)

چاندنی: (پس منظر)

آہ کو چاہئے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

(مرزا غالب قالین پر گاؤ تکیہ سے لگ کر بیٹھ جاتے ہیں اور پیچوان سنبھال کر حقے کے کش لیتے ہیں۔ فکر میں غرق ہیں)

غالب: دیکھو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

مجروح: (میر مہدی مجروح اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں) حضرت مجھے اجازت دیجئے۔

غالب: جاؤ گے؟

مجروح: جی!

غالب: اچھا بھئی۔ (مرزا غالب بھی اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور محراب سے شمع دان لے کر بائیں جانب چلتے ہیں)

مجروح: قبلہ آپ کیوں تکلیف فرماتے ہیں، میں اپنا جوتا پہن لوں گا۔

غالب: (مسکراتے ہیں)۔ جی میں آپ کا جوتا دکھانے کو شمع دان نہیں لایا، بلکہ اس لئے لایا ہوں کہ کہیں آپ میرا جوتا نہ پہن جائیں۔

(مرزا غالب اور مجروح دونوں ہنستے ہیں۔ فضا ایک بار پھر شگفتہ ہو جاتی ہے)۔ (مجروح چلے جاتے ہیں اور مرزا غالب شمع دان واپس لوٹ کر محراب میں رکھ دیتے ہیں۔ اچانک چھم چھم سُنائی دیتی ہے۔ مرزا غالب گھوم کر بائیں جانب دیکھتے ہیں۔ وہاں زرد رنگ کالمبی آستینوں کا کرتہ سُرخ مخمل کا پاجامہ، کالے مخمل کی صدری اور دھانی دوپٹہ اوڑھے اس طرح کہ دوپٹے کا گھونگھٹ نکلا ہوا ہے (۲۵ سالہ ایک حسینہ، چاندنی" کھڑی ہے)

غالب: (حیرت سے) چاندنی

چاندنی: جی

غالب: چاندنی ۔۔۔ تم یہاں؟

چاندنی: کیوں میں یہاں نہیں آسکتی؟

غالب: وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم اُن کو، کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

چاندنی: یقین تو نہیں آتا ۔۔۔؟

(چاندنی آہستہ آہستہ ادا سے چلتی غالب سے کچھ دور گاؤ تکیے سے لگ کر بیٹھتی ہے۔

چاندنی: دل کو ہم صرفِ وفا سمجھے تھے کیا معلوم تھا
یعنی یہ پہلے ہی نذرِ امتحاں ہو جائے گا۔



غالب: سب کے دل میں ہے جگہ تیری جو تو راضی ہوا
مجھ پہ گویا اک زمانہ مہرباں ہو جائے گا

چاندنی: (نہایت آہستہ)
گر نگاہِ گرم فرماتی رہی تعلیم ضبط
شعلہ خس میں جیسے خوں رگ میں نہاں ہو جائیگا
(انکھیوں سے مرزا غالب کی طرف دیکھتی ہے۔)

غالب: بلائے جاں ہے غالب اسکی ہر بات
عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا
(چاندنی مسکراتی ہے)

غالب: چاندنی —!

چاندنی: جی —!

غالب: چاندنی تمہارے گھر جو شب ماہ گزری تھی، وہ میں تادمِ زیست فراموش نہیں کر سکتا۔ ہائے وہ دل!

چاندنی: وہ فراق اور وہ وصال کہاں
وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں

غالب: کہاں چلی گئی تھیں؟

چاندنی: کون میں؟

غالب: ہاں۔

چاندنی: میں تو کہیں نہیں گئی تھی۔ دیکھئے اب بھی آپ کے سامنے بیٹھی ہوں۔

غالب: پھر آتے برسوں بعد

چاندنی: (ہنستی ہے)

غالب: تم نے اس رات میری وہ غزل کس ادا سے سنائی تھی، "کسی کو دے کے دل کوئی نواسنجِ فغاں کیوں ہو"

چاندنی: "نہ ہو جب دل ہی پہلو میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو"

غالب: آج پھر سناؤ گی؟

چاندنی: ہاں۔

غالب: تو پھر سناؤ۔

چاندنی: (دلکش آواز میں گاتی ہے)
کسی کو دے کے دل کوئی نواسنجِ فغاں کیوں ہو
نہ ہو جب دل ہی پہلو میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو
وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو
قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو
یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں
عدو کے ہو لئے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو
نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالب
ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پہ مہرباں کیوں ہو

چاندنی: آپ کے اشعار میں بے حد دکھ اور بلا کا غم ہے۔

غالب: لعمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانئے
بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایکدن

چاندنی: خوب، سبحان اللہ!
(مرزا غالب چاندنی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں)
(کسی کے پیروں کی آہٹ ہوتی ہے۔ چاندنی ہاتھ چھڑا لیتی ہے۔)

چاندنی: کوئی آ رہا ہے (اٹھ کھڑی ہوتی ہے) میں چلتی ہوں۔
(غالب بھی اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ چاندنی جلدی جلدی دائیں جانب چلی جاتی ہے۔ بائیں جانب سے یار علی آتا ہے)

یار علی: حضور حکیم محمود خاں آئے ہیں۔

غالب: یار علی — (مرزا غالب سر پکڑ کر تخت پر بیٹھ جاتے ہیں) حکیم صاحب سے کہو تشریف لائیں)
(حکیم محمود خاں جن کا گورا چٹا رنگ ہے۔ عمر ۵ سال ہے۔ تل چاولی داڑھی ہے۔ سفید ایک برکا یا جامہ، تالب پر چڑھی ہوئی سفید نقشی ٹوپی اور سلیم شاہی پہنے بائیں جانب سے داخل ہوتے ہیں)

غالب: حکیم صاحب بڑے بے موقع آئے۔

حکیم محمود خاں: بے موقع؟ وہ کیسے؟ میں تو روز اسی وقت آتا ہوں۔

غالب: ابھی ابھی وہ ماہ رو میرے گھر تھا، لیکن آہٹ سنکر چلا گیا۔



حکیم محمود خاں ۔ ماہ رُو ۔۔۔ کون ؟

غالب چاندنی ۔

حکیم محمود خاں : (حیرت سے) چاندنی ۔۔۔ چاندنی اور یہاں ؟ کیا کہتے ہیں آپ ! اُسے مرے تو آج کئی برس گزر گئے

غالب : اب یہی آپ نے پہچانا ۔ (حکیم محمود خاں اپنا سیدھا ہاتھ مرزا غالب کے ماتھے پر رکھتے ہیں)

حکیم محمود خاں : بدن تو ٹھیک رہا ہے ۔ آپ کو تیز بخار ہے ۔

غالب بخار ؟

حکیم محمود خاں : بڑے زور کی تپ چڑھی ہے ۔ آپ لیٹ جائیے ۔ (پکارتے ہیں) نیاز علی !

(مرزا غالب تخت پر لیٹ جاتے ہیں ۔ حکیم محمود خاں نبض دیکھ رہے ہیں کہ سارا اسٹیج آہستہ آہستہ تاریک ہو جاتا ہے اور پھر روشن ہوتا ہے تو منظر وہی ہے مگر مرزا غالب نہایت نحیف و نزار تخت پر لیٹے آہستہ آہستہ کراہ رہے ہیں ۔ تخت کے ایک طرف حکیم محمود خاں اور دوسری طرف حکیم احسن اللہ خاں بیٹھے ہیں ۔ دونوں سر سے پاؤں تک سفید لباس میں ہیں ۔ فرق صرف یہ ہے کہ حکیم احسن اللہ خاں ایک بہت بڑے سبز نگ کی انگوٹھی پہنے ہیں ۔ ایک طرف نواب ضیاء الدین احمد خاں رخشاں ، جن کا قد چھوٹا سا ہے ۔ گورا رنگ ہے نازک نازک نقشہ ، غلافی آنکھیں ، چگی ڈاڑھی ، چھریرا بدن ، سفید پاجامہ ، ہلکے کاسنی رنگ کا انگرکھا ، غالب پر چڑھی ہوئی چوگوشہ ٹوپی پہنے ہیں ۔ کھڑے ہیں ۔ پائنتی نیاز علی اور کلیان سر جھکائے کھڑے ہیں)

غالب ، (کراہتے ہوئے) آہ ۔۔۔ کون ، اے جناب السلام علیکم ۔ حضرت آداب ۔ کہو صاحب آج اجازت ہے ، میر مہدی مجروح کے خط کا جواب لکھنے کی ۔

حکیم احسن اللہ خاں ، بخار بے حد تیز ہے ۔

غالب ، (بخار میں اسی طرح بڑبڑاتے ہوئے) صاحبقران ثانی حضرت شاہ جہاں نے اپنے دربار کے شاعر کلیم کو سیم و زر اور لعل و گوہر سے تُلوایا تھا ۔ میں تو بس اتنا چاہتا ہوں کہ زیادہ نہیں تو آپ کسی سخی حضرات کو حکم دیں کہ وہ ایک بار میرے کلام ہی کو کلیم کے کلام کے ساتھ تولنے کی زحمت گوارا فرمائیں ۔ شہرت شعرم بگیتی بعد من خواہد شدن ۔

حکیم محمود خاں ، کل چودہ فروری ۱۸۶۹ء کے اکمل الاخبار اور اشرف الاخبار دونوں میں مرزا صاحب کا بیان چھپا ہے کہ میرے احباب میرے حال سے اطلاع پائیں ۔ دوستوں کی خدمت گزاری سے میں کبھی قاصر نہیں رہا اور خوشی و خوشنودی سے کام کرتا رہا اب جب کہ نکما ہو گیا ، نہ حواس باقی ، نہ طاقت ، پھر اب کیا کروں ۔

ضیاء الدین احمد خاں ، جی ہاں قبلہ ! میں نے بھی پڑھا ہے ۔ لکھوایا ہے کہ اگر کسی صاحب کو میری طرف سے کچھ رنج و ملال ہو تو خالصتاً للہ معاف فرمائیں ۔ اگر جوان ہوتا تو احباب سے دعائے صحت کا طلبگار ہوتا ۔ اب جو بوڑھا اور ضعیف ہو گیا ہوں تو مغفرت کا خواہاں ہوں ۔

حکیم احسن اللہ خاں ، چار پانچ سال پہلے جو سارے بدن پر پھوڑوں نے انہیں آگھیرا تھا ، جتنا خون بدن میں تھا ، سب پیپ بن کر نکل گیا ۔

حکیم محمود خاں برس سوا برس پہلے قولنج کا بھی سخت حملہ ہوا تھا ۔

حکیم احسن اللہ خاں ، سن کیا ہے جواب دیں صالح کی تولید ہو ۔ خود مجھ سے کہتے تھے آٹھویں رجب ۱۲۸۳ ہجری کو بہتر برس پورے ہو گئے ۔ تہترویں میں قدم رکھ چکا ہوں ۔

غالب ، (کراہتے ہوئے ہی) کلیان ۔

کلیان ، جی حضور ۔



غالب: مرزاجیوں کو بلاؤ۔

ضیاءالدین احمد خاں: عارف کے لڑکے کو پوچھتے ہیں

غالب: اور بگا بیگم کی دُختر کو بھی۔

کلیان: جی حضور

(پسِ منظر چاندنی کی آواز اُبھرتی ہے)

چاندنی: (پسِ منظر)

؎ "آہ کو چاہیئے اک عمر اثر ہونے تک"

غالب: (کراہتے ہوئے)

مُند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالب
یار لائے مرے بالیں پہ اُسے پر کس وقت

کلیان: حضور اطلاع کی ہے، کچھ دم میں آیا چاہتے ہیں۔

غالب: (کراہتے ہوئے ہی) ؎
دمِ واپسیں برسرِ راہ ہے عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

اللہ — اللہ

(مرزا غالب اُٹھنے کی کوشش کرتے ہیں مگر گر پڑتے ہیں۔ گردن ڈھلک جاتی ہے۔)

حکیم احسن اللہ خاں: (چادر کھینچ دیتے ہیں) انا للہ وانا الیہ راجعون۔

(اوٹ کے پیچھے سے ایک چیخ سنائی دیتی ہے)

حکیم محمود خاں: رشکِ عُرفی و فخرِ طالب مُرد
اسد اللہ خانِ غالب مُرد

یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غالب
گرمیٔ بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک

(پسِ منظر چاندنی کی درد بھری آواز اُبھرتی ہے)

چاندنی: ؎ غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جُز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

(سب سر جھکائے کھڑے ہیں۔ پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے)

بقیہ "غالب یونیورسٹی میں" صفحہ ۴۰۲

تبدیل کرا کے کرائے پر اُٹھا دیا ہے۔ عبدالغفور سرور کو دیکھئے علی گڑھ میں چودھری سے بیٹھے ہیں اور بزم اُردو کی رونق بڑھا رہے ہیں۔ میر مہدی مجروح علمی دنیا کے "راجہ" بن بیٹھے ہیں۔ اور تو اور نہ جانے کتنے ہی میرے بارے میں اُلٹی سیدھی باتیں لکھ کر محقق اور اسکالر ہو گئے ہیں اور ایک ہم ہیں کہ

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

غالب کے ہونٹوں پر ایک زہریلی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور علامہ صہبائی اس کی تاب نہ لا کر جلدی سے مصافحہ کر کے آگے بڑھ گئے۔

اخباروں کی سُرخیاں دیکھ کر غالب وائس چانسلر چیمبر کی طرف روانہ ہوئے۔ کشمیر کے مسئلے سے لے کر ویٹ نام کی روز بروز بڑھتی ہوئی جنگ سے امنِ عالم کو لاحق خطرہ، مشرقِ وسطیٰ میں اسرائیل اور عربوں کی تازہ جھڑپیں، نہر سویز کا جھگڑا، سیکیورٹی کاؤنسل کا تعطل، ہندوستان میں فیملی پلاننگ کی ناکامی، بھیانک قحط کے آثار، کانگریس کے زوال کے اسباب وغیرہ صدہا مسئلوں کی سُرخیاں اُنھوں نے دیکھ ڈالیں، مگر اُن کے دماغ میں اس وقت صرف ایک ہی مسئلہ بمبار جیٹ کی طرح لگاتار چنگھاڑتا ہوا چکر کاٹ رہا تھا۔ وہ تھا فیس کی ادائیگی کا اہم ترین اور نازک مسئلہ۔ تین مہینے لگاتار فیس نہ جمع کرنے کی صورت میں نام کٹ جانا یقینی تھا اور فی الحال فیس کی ادائیگی کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس سلسلے میں وائس چانسلر سے ملنا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ اپنے لئے کوئی مناسب وظیفہ بھی جاری کرانا تھا۔ ضروری سفارش کے خطوط اُن کی جیب میں پڑے کھڑکھڑا رہے تھے۔

وائس چانسلر کے کمرے کے دروازے پر چپراسی اسٹول دیوار سے لگائے آرام سے سو رہا تھا۔ غالب نے قدرے زور سے کھنکھار کر اسے اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا، مگر وہ اُسی طرح غافل پڑا اونگھتا رہا۔ غالب نے چاہا کہ شانوں سے پکڑ کر جگائیں۔ مگر پھر خیال آگیا کہ

کدا سمجھ کے وہ چُپ تھا مری جو شامت آئے
اُٹھا اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

اس لئے کمالِ دُور اندیشی سے کام لیتے ہوئے اُنھوں نے اپنے کمزور جُوتے کو فرش پر ڈرتے ڈرتے ٹپکا کہ اس کی دھمک ہی سے اُس کی آنکھ کھل جائے، مگر اُس کمبخت کے کانوں پر جُوں تک نہ رینگی۔ شاید سینڈ شو پکچر دیکھ کر آیا تھا اور رات کی بقیہ نیند یہاں پوری کر رہا تھا۔ غالب اُس کے برابر سے کئی بار گزرے، زور زور سے کھنکارا، فرش پر جوتے سے آواز پیدا کی، مگر وہ خوابِ راحت کے مزے لیتا رہا۔ کافی دیر ہو گئی اور غالب اُس کے جاگنے کا انتظار کرتے کرتے دق ہو گئے تو یہ شعر پڑھتے ہوئے مایوس لوٹ گئے۔

گل کھلے، غنچے چٹکنے لگے اور صبح ہوئی
سرخوشِ خواب ہے وہ نرگسِ مخمور ابھی

(ڈرامہ)

مرزا غالب

(ایک دو سین)

شیوا لکن کی حویلی — ۱۸۵۷ء

افراد تمثیل

[illegible]	مرزا غالب
مہیش	لالہ مہیش داس
امراؤ	بیگم مرزا غالب
بنتی بیگم	مرزا کی بہو
کلو	ملازم
کلیان	کہار
مغلانی	وفادار
باقر	باقر بن عارف
حسین	حسین بن عارف
سارجنٹ	فرنگی سارجنٹ
[illegible]	فرنگی دو سولجر
[illegible]	
غوث	
نزل	
[illegible]	
مکان	بلی ماراں (دہلی)
[illegible]	۱۸۴۷ء اور ۱۸۶۹ء

[توپ دغنے کی آواز کے ساتھ پردہ ہٹتا ہے تو مرزا کی نشست کا منظر نظر آتا ہے۔ تخت بچھا ہے۔ اس پر قالین، سرہانے تکیے لگا ہوا۔ بازو دو چار کتابیں پڑی ہیں۔ ہاتھ میں نشک لئے ہوئے مرزا بیٹھے ہیں۔ سات سالہ بچہ حسین علی خاں ننگے پاؤں دوڑتا ہوا قالین پر سے گزر جاتا ہے۔ مرزا بائیں ہاتھ کو قالین صاف کرنے لگتے ہیں۔ کلو خاں داخل ہوتا ہے]

کلو: حضور، صہبائی توپ سے اڑا دیئے گئے۔ کہتے ہیں ایک ہی ساعت میں اُن کے خاندان کے کوئی بیس افراد کو چیلوں میں ختم کر دیئے گئے اور جو بچ رہے اُنہیں گورے راجگھاٹ لے گئے۔

مرزا: (نشک پھینک تخت سے نیچے اتر کر) مولوی امام بخش صہبائی؟ ہائے میرے دوست! شاید اسی دن کے لئے ٹامسن نے اُنہیں دلی کالج کی مدرسی کیلئے چنا تھا۔

ع یاراں کا وستی غم بحراں ہوا اسد
سینہ کہ تھا دفینہ گہرہائے راز کا

(بے تابانہ ٹہلنے لگتے ہیں اور ایک طرف کو مڑ کر) آہ صہبائی! رہ رہ کر اُن کا یہ شعر یاد آتا ہے۔



مجھے دیکھ کر تیغ کو دیکھتے ہیں
غرض یہ کہ ہو خونِ ناحق کسی کا

یہ خونِ ناحق نہیں تو اور کیا ہے؟ یہ غضب !۔
میں افراد مٹے جاتے ہیں۔

کلّو : احمد حسین کو پھانسی کی سزا ہوئی۔ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ، ابجاد، رند، مفتی صدرالدین آزردہ خیرآبادی شبہ پر گرفتار ہیں۔ حصور شہر ایک چھاؤنی بن گیا ہے۔ قدم قدم پر پہرے بیٹھے ہیں۔ جگہ جگہ پھانسیاں گڑھی ہیں۔ گلیاں لاشوں سے پٹی پڑی ہیں۔

مرزا : کہو دلّی بادشاہی قتلِ عام کا منظر پیش کر رہی ہے۔

کلّو : کہتے ہیں اب بلّی ماروں کی بھی خیر نہیں۔

مرزا : مہاراجہ پٹیالہ نے گوروں سے وعدہ لیا ہے کہ بلّی ماران میں خاندانِ شریفی کے مکانات محفوظ رہیں گے۔ اہلِ محلّہ کی حفاظت اُن کی سپاہ کرے گی۔ ہاں حکیم محمود خاں کا کیا حال ہے؟

کلّو : کہتے ہیں وہ ایک انبوہ کے ساتھ قطب الدین سوداگر کی حویلی گئے ہیں۔ وہاں گورا گرل ہے۔

مرزا : راجہ صاحب کی حمایت کے باوجود شریف خانی حکیموں کی بھی باری آگئی؟ ہائے ہائے کوچے کوچے سے امیر غریب سب نکل گئے اور جو رہ گئے تھے، وہ نکالے گئے جاگیردار، پنشن دار، اہلِ حرفہ، کوئی نہیں بچا۔ پھر بھی منشی ہیرا سنگھ کہے جا رہے ہیں کہ بلّی ماران محفوظ رہے گا۔ رہے نام اللہ کا۔

کلّو : حضور کیوں نہ ہم لوہارو یا پیلی بھیت ...

مرزا : (بات کاٹ کر) میاں کلّو، میرا شہر میں ہونا تیرافگن کی بارہ دری میں میری موجودگی کا حکّام کو پتہ ہے، مگر چونکہ میری طرف سے بادشاہی دفتروں میں سے یا مخبروں کے بیان سے کوئی بات نہیں پائی گئی، اس لئے طلبی نہیں ہوئی، ورنہ جہاں بڑے بڑے جاگیردار بلائے ہوئے یا پکڑے ہوئے آئے ہیں وہاں میری کیا حقیقت۔ اپنے گھر بیٹھا رہوں گا۔ گھر سے باہر نکلنے کا سوال کیا۔

کلّو : مالکوں کی خاموشی، داد نہ فریاد۔ دال نہ سہی دلیہ سہی، آئے تو کیونکر کہاں سے آئے۔

مرزا : مانا کہ اُن میں میرے دوست بھی خواہ بھی ہیں، یار غار بھی۔ لیکن اس سب کی خاموشی خطرناک ضرور ہے۔ کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے۔ نہ سرا نہ جزا، نہ تعریف، نہ آفرین، نہ عدل، نہ لطف، نہ کرم۔ بوڑھا، مفلس، ناتواں، قرضدار، زیست سے بیزار اور مرگ کا امیدوار کہاں جائے، کیا کرے۔

جسے نصیب ہو روزِ سیاہ میرا سا
وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو

(دو سولجر دھب دھب داخل ہوتے ہیں۔ کلّو گوروں کو دیکھ کر پریشان ہوتا ہے)

سولجر : ول ہیں مرزا نوشہ تم ہے؟

مرزا : آؤ آؤ بھائی، اس حقیر کا نام مرزا نوشہ ہے۔ صاحب لوگ جان صاحب مہرباں بسیار دوستاں بھی کہتے ہیں۔ کہو کیا بات ہے، کیسے آئے؟

سارجنٹ : Tell him that colonel Brown wants to see him immediately

سولجر : کرنل براؤن تم کو ڈیکھنا مانگتا۔

مرزا : (کھسیانی ہنسی ہنس کر) ہاہاہا کرنل براؤن؟ ٹھیک ہے۔ آخر باری آہی گئی۔

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالبؔ
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

(باقر علی خاں اور حسین علی خاں داخل ہو کر مرزا سے لپٹ جاتے ہیں)

باقر : دادا جان یہ گورے کیوں آئے ہیں؟

حسین : کیا چاہتے ہیں؟

مرزا : باقر علی خاں، حسین علی خاں گھبراؤ نہیں بچو۔ یہ ہمارا کیا بگاڑ لیں گے، شاید پوچھ گچھ ہو تو ہو، تم بھی چلو ہمارے ساتھ (سولجر اور سارجنٹ کی طرف دیکھ کر) بھائی ٹھہرو، ہم ابھی آتے ہیں۔



(مرزا اندر جاتے ہیں۔ پیچھے ہوئے گوروں کو گھورتے لگتے ہیں تو کلو دونوں بچوں کو اپنی بانہوں میں کھینچ لیتا ہے)

He appears to be a politic-[illegible]
ian rather than a [illegible]
had better put some ques-[illegible]
tions to him—?

Oh! no, we need'nt Whether
he is a politician poet or [illegible]
patriot, the Colonel [illegible]
his face better.

([illegible] مرزا کو آتا ہوا دیکھ کر)

Come on, let us move [illegible]
he comes

(مرزا زین چڑھا اور سر پہ پاپاخ اوڑھے ہوئے داخل ہوتے)

[illegible]: Yes sir. (باقاعدہ کھڑا ہو جاتا ہے)

مرزا: چلو بچو، چلو دوستو سے

خستگی کا تم سے کیا شکوہ کہ یہ
ہتھکنڈے ہیں چرخِ نیلی فام کے

(وہ سوچ اور ساجد آگے پیچھے، بیچ میں مرزا، دونوں بچے اور کلو جاں چلتے ہیں۔ دوسری جانب سے حواس باختہ امراؤ بیگم، مغلانی اور بستی بیگم داخل ہوتی ہیں)

مغلانی: [illegible] حضور کوٹ چلے۔ بیگم صاحبہ آپ نے کیوں جانے دیا۔ (پھٹی پھٹی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھتی ہے۔ پیر لڑکھڑا جاتے ہیں تو بیٹھ جاتی ہے)

[illegible] (ونگ کے قریب جاکر واپس ہوتی ہیں) یا اللہ! یہ کیسی قیامت آئی۔ کیا میری دعاؤں کا یہی صلہ ہے؟
(چھت کی طرف دیکھتی ہیں)

بستی بیگم: اماں۔ (ہراساں ہوکر)

امراؤ بیگم: بہو! بستی بیگم۔ صبر سے کام لو بیٹی۔

مغلانی: (بیٹھی ہوئی) یہ کیا ہو گیا بیگم صاحبہ! (بیگم کی طرف گھورتی ہے)

امراؤ: (مغلانی کے قریب جاکر جھک جاتی ہیں۔ سر کا پلو ڈھل جاتا ہے) مغلانی اُنہوں نے کہا ہے ماما

ہم کہاں کے دانا تھے، کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہوا غالبؔ دشمن آسماں اپنا

(رونے لگتی ہیں)

بستی بیگم:

(مغلانی اٹھتی ہے۔ تینوں ونگ کے قریب جاتی ہیں۔ امراؤ بیگم اندر جاتی ہیں۔ بستی بیگم نہایت مضطرب ٹہلتی ہیں۔ زمین پر ہاتھ ٹیک لیتی ہیں اور سر کو بُری طرح جنبش دیتی ہیں۔)

بستی بیگم: بچوں کو بھی ساتھ لے گئے ہیں (چھت کی طرف دیکھنے لگتی ہیں۔

امراؤ: (داخل ہوکر) ہاں بہو اُن کی بیچ کو کوئی بیچ بھی سکتا ہے۔؟ گھبراؤ! دل گواہی دیتا ہے کہ خیر و خوبی سب آئیں گے۔

بستی بیگم: کاش آج وہ زندہ ہوتے!

امراؤ: تیرا شوہر عارف، آہ بیٹی زین کی یاد دلا کر تو نے میرے سب ہی ہوش اُڑا دیئے۔

(سر کو ہاتھ لگا کر ونگ کے اندر جاتی ہیں)

بستی بیگم: (بیٹھی ہوئی سر کو جنبش دے کر ہاتھ سینے پر رکھ لیتی ہیں)

سنبھلنے دے مجھے اے نا امیدی کیا قیامت ہے
کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

امراؤ: بہو (داخل ہوکر) بستی بیگم۔ (بستی بیگم کے قریب جھک کر)

بستی بیگم: اماں جان (چونک کر امراؤ سے لپٹ جاتی ہے)

امراؤ: فلک سے عدل سے ہے مدعا ہے
اس ستمگر کو انفعال کہاں

بستی بیگم: اماں جان آج میں آپ کی زبان سے ابا جانی کے اشعار سن رہی ہوں۔ کیا واقعی آپ نے اُن کا شعر پڑھا؟ (خوشی کا اظہار، ساتھ ہی تحت کے ایک



پانے سے گلابی روشنی دونوں پر پڑتی ہے)

امراؤ تمام عمر اُن کے اشعار کے سوا میں نے سنا ہی کیا ہے اور دیکھا ہی کیا ہے۔ مغلانی! (مغلانی کو آواز دیتی ہیں) (گلابی روشنی غائب ہو جاتی ہے)

مغلانی جی بیگم صاحبہ (داخل ہو کر)

امراؤ ڈیوڑھی تک چل کر دیکھ نا۔ آدمی آدمی انتر کوئی ہیرا کوئی کنکر کرنل ٹھہرا فرنگی افسر۔ جانے کیا حکم سنائے۔

مغلانی: جی بہت اچھا۔ (جاتی ہے)

بنتی بیگم: جانے وہ جنگے مردانے میں کیسے داخل ہو گئے۔

امراؤ: اے بہو، تم نے نہیں دیکھا۔ میں دالان میں تھی۔ مارے کسی کے دھم سے کودنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے آنکھ اٹھا کر دیکھا تو وہ دونوں کوسے دھپ دھپ مردانے کی طرف دوڑے جا رہے تھے۔ جب ہی میرا ماتھا ٹھنکا کہ ہو نہ ہو، آفت ناگہاں کے ہرکارے ہو گئے، سو وہی نکلے۔ یہاں آن کر دیکھا تو آنکھوں تلے اندھیرا آ گیا۔ وہ جو گئے ہیں تو اللہ کرے دہی مچھلی لیتے آئیں۔

بنتی بیگم: آمین!

مغلانی: (داخل ہو کر) بیگم صاحبہ، وہ کھٹکا کھڑا ہے (پلّو کے کونے کو بل دے کر)

بنتی بیگم: کیا بات ہے مغلانی، الٹے پاؤں چلی آئیں؟

مغلانی: بی بی پہرہ لگا ہے سکھوں کا۔ کہتے ہیں کالے شاہ صاحب کی حویلی بھی لٹ گئی۔

امراؤ: ہائے ہائے میاں کالے کے گھر بھی بی بی کی جھاڑو پھر گئی۔ میں نے اپنا گہنا پاتا، کپڑا لتّا اُن کے ہاں رکھوا دیا تھا کہ ظلِ سبحانی کے مرشد ہیں، سبھی ان کا احترام کیا کرتے ہیں، شاید محفوظ رہے

بنتی بیگم: اماں معلوم ہوتا ہے گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس گیا۔

امراؤ: ملا سے بہو۔ یہاں تو جان کے لالے پڑے ہیں۔ وہ جو آ جاویں تو سمجھو جان بچی لاکھوں پائے۔

مغلانی: اچھا ہوا بیچنگے بچھ لے نہیں گئے۔

امراؤ: تیرا گھس گیا، مادہ وری میں دھرا ہی کیا ہے۔ اے اور کیا

لے جاتے، زندگی جو لے گئے ہیں ساتھ!! ــــــ

بنتی بیگم: سچ کہا اماں نے، زندگی جو لے گئے ہیں۔ کتنے گھر برباد نہیں کئے۔ سوداگروں نے کتنوں کی آہیں نہیں لیں، لیکن یہ نہ جانا کہ کبھی اُن کے بھی دن آئیں گے۔ یہ بھی زندگی کو ترسیں گے کہ

"بے صدا ہو جائے گا یہ ساز ہستی ایک دن"

مغلانی: (ایک جانب کو دیکھ کر) لیجئے بیگم صاحبہ وہ کہکشاں چمکی ــــ باقر میاں اور حسین میاں دوڑے دوڑے آ رہے ہیں۔

(دونوں بچے دوڑتے ہوئے داخل ہوتے اور دادی سے لپٹ جاتے ہیں)

باقر دادی جان وہ دیکھئے دادا جان تشریف لا رہے ہیں وہاں گوروں سے خوب باتیں ہوئیں، خوب ہنسی ہوئی۔

حسین، ہاں خوب باتیں ہوئیں، خوب ہنسی ہوئی اماں جان (بچے بنتی بیگم کی طرف بڑھتے ہیں۔ بنتی بیگم بچوں کو اپنی باہوں میں لئے یہ دیکھ کر کہ مرزا آ رہے ہیں، اندر جاتی ہیں۔ اُن کے پیچھے امراؤ بھی اندر جاتی ہیں۔ مغلانی ہٹ کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ مرزا تو تہ اور کالے خاں داخل ہوتے ہیں)

مرزا: ؎ چھوڑی اسدؔ نہ ہم نے گدائی میں دل لگی
سائل ہوئے تو عاشقِ اہلِ کرم ہوئے

مغلانی: حضور، بیگم صاحبہ دریافت فرماتی ہیں کہ کیا ہوا؟

مرزا: ہوتا کیا۔ حکیم محمود خاں بھی تھے، اُنکی زبانی معلوم ہوا کہ عبدالرحمٰن خاں والیٔ جھجر اور ناہر سنگھ راجہ بلب گڈھ پکڑ لئے گئے۔ ظلِ سبحانی کے فردِ جرم لگی ہے ــــ

امراؤ: (دیگ کے قریب سے) انسان ایک جان دو جان کو رو سکتا ہے۔ یہاں تو ہزاروں جانوں پر بنی ہے ــــ کہئے فرنگی افسر نے کیا کہا؟

مرزا: کرنل براؤن؟ پہلے سوال کے جواب ہی پر آنکھ پھاڑ پھاڑ کے دیکھنے لگا۔ آدمی برا نہیں۔ کلاہ پر نظر پڑی تو پوچھا۔ مین تم مسلمان؟ میں نے کہا۔ آدھا مسلمان۔



امراؤ۔ یا اللہ!

[illegible] ۔ پوچھا، کیا مطلب؟ میں نے کہا، شراب پیتا ہوں، سؤر نہیں کھاتا۔

امراؤ۔ اللہ اللہ ایسے وقت بھی طبیعت کی شوخی نہ گئی۔

مرزا۔ ابھی تک کس کے سہارے تو اب تک زندہ ہوں، لیکن جو کچھ پیش آنے والا ہے، اس کے تصور ہی سے دل گھبراتا ہے۔ انگریز حکام اس رو سیاہ درویش کو خطاوار سمجھتے ہیں۔ سنا ہے کسی گوری شنکر نے کمشنر دہلی کو اطلاع دی ہے کہ سراج الدین بہادر شاہ ظفر نے جب دربار کیا تو مرزا نوشہ نے سکہ کہہ کر گزرانا۔ ابھی تو یہ بات راز میں ہے۔

امراؤ۔ ہائے اللہ [illegible]

مرزا۔ بے چارہ گوری شنکر کیا جانے کہ مرزا اسد اللہ خاں نے در پردہ کیا کیا اور کیا نہیں کیا۔ چلو احتیاط کام آ ہی گئی۔ ورنہ جو حشر صہبائی کا ہوا، وہی مرزا نوشہ کا ہوتا۔

امراؤ۔ اللہ رحم کرے۔

مرزا۔ سکے کا وار مجھ پر ایسا چلا جیسے کوئی چھرا یا کراب۔ اب کس کو کہوں، کس سے گواہی لاؤں کہ سکے ذوق نے کہے تھے۔ جو دلی اردو اخبار میں چھپے ہیں۔ کہیں سے وہ اخبار مل جائے تو شاید کام بن جائے۔

امراؤ۔ خدا کرے اخبار مل جائے۔

مرزا۔ یہ دھڑکا ایسا لگا ہے کہ کچھ نہ پوچھو۔ پنشن یقیناً بند ہو جائے گی۔ یہ نقصان ناقابلِ برداشت۔ شاید کپڑے کھانے کی نوبت آ جائے ۔

نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا
رہا کھٹکا نہ چوری کا، دعا دیتا ہوں رہزن کو

امراؤ۔ شاید اسی خیال نے کچھ بھی لیں انداز کرنے نہ دیا۔ اب تو کپڑا لتا بھی ....

مرزا۔ (بات کاٹ کر) ہائے ہائے رئیس زادوں میں گنے جاتے تھے۔ پورا خلعت سرپیچ مالائے مروارید حضرت [illegible] جواہر۔ ہائے وہ ربط و ضبط جو ہم رئیس زادوں [illegible] رہا، اب کہاں [illegible]

امراؤ۔ سکہ تو تم نے کہا نہیں، پھر ڈر کاہے کا؟

مرزا۔ اور اگر کہا بھی تو قلعے کی ملازمت کے تعلق سے ۔ اپنی جان اور حرمت بچانے کو کہا۔ یہ گناہ نہیں اگر گناہ ہے بھی تو ایسا سنگین نہیں کہ معاف نہ ہو۔ سبحان اللہ گولہ انداز کو گولہ مار دو سا ما، توپیں لگا دو اور بیگ گھر کو تو معاف ہو جائے، مگر شاعر کے دو مصرعے معاف نہ ہوں۔

مغلانی۔ (ڈیوڑھی کی طرف اشارہ کر کے) حکیم صاحب لالہ مہیش داس آ رہے ہیں۔

امراؤ۔ شکر ہے وہ آ گئے۔

(امراؤ، مغلانی اندر جاتی ہیں۔ مہیش داس اور کلیان داخل ہوتے ہیں۔ کلیان کندھے سے شراب کی گٹھری اتارتا ہے)

مرزا۔ لالہ مہیش داس، آؤ آؤ، آپ کا مزاج کیسا ہے؟ (سلام کرتے ہیں)

مہیش۔ عنایت ہے حضور کی۔ اچھا ہے۔ (آداب بجا لاتے ہیں)

مرزا۔ کلیان، اماں تم کہاں تھے۔ کب گئے، کیوں گئے۔ کرنل براؤن نے تاکید کی ہے کہ نہ میں گھر سے نکلوں اور نہ کسی ملازم کو بے ضرورت نکلنے دوں۔ یہ کیسے لے آئے۔

مہیش۔ قند اگرچہ ہے اور نہ اولڈ ٹام، تاہم کاسٹی لیں کا مزہ دیتی ہے۔ خالص انگوری ہے۔ راجہ نرپیندر سنگھ کے پیش دست جو حویلیوں کا کرایہ اگا کر جمع کرواتے ہیں ان کے پاس سے صرف دس بوتل حاصل کر سکا۔

مرزا۔ شکریہ۔ آپ کا دیسی ٹھرا کنٹیل ہی، میرے لئے جتنا سے بھی زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ آپ میرے شاگرد ہیں۔ آپ نے میرا خیال رکھا۔ ڈوبتے کو عین بھنور سے نکال لیا ۔

شرمندہ رکھتے ہیں مجھے بادِ بہار سے
مینائے بے شراب و دلِ بے ہوائے گل

مہیش۔ کلو میاں لے جاؤ (کلو گٹھری لے جاتا ہے)

مرزا۔ ہاں میاں کلو توشہ خانے میں رکھ دینا، جہاں ہمارے برتن علاحدہ رکھے ہیں، مگر دیکھو فتح پور سیکری کی مسند



سے ذرا ہٹ کر جانا۔ وہاں حضرت موسٰی کی بہن گھر کی مدارالمہام ہیں۔ حکم صادر نہ کر دیں کہ غیر شرعی چیز گھر میں نہ لائی جائے۔

ہیش: نہ الزام میں نے کہا بیگم صاحبہ کا یہ احترام؟

مرزا: خدا آپ کی عمر دراز کرے۔ چاہے اس شرابی کی دعا قبول ہو کہ نہ ہو، اس نے جو چاہا سو ملا، اس لئے دعا کا قبول ہونا بھی ضروری ہے۔ موسٰی کی بہن کا احترام کیوں نہ کرتا کہ

مسجد کے زیرِ سایہ اک گھر بنا لیا ہے
یہ بندۂ کمینہ ہمسایۂ خدا ہے

ہیش: (دیگ کی طرف دیکھ کر) کلیان، دیکھنا کہار کیا لے آئے ہیں، لے جانا زنان خانے۔ (کلیان جاتا ہے)

مرزا: (دیگ کی طرف دیکھ کر) اوہو، یہ لبالب چھندا یہ سب کیا ہے ہیش داس؟

ہیش: شاید حضور کو پتہ نہیں۔ گھر میں اناج ختم ہو چکا ہے۔ بیگم صاحبہ نے کلیان کے ذریعے کچھ روپے منگوائے تھے۔ پھر میرے پاس تھے تو مہینے بھر کا غلہ تلوا لیا گیا۔ دلی آج جس قیامتِ صغریٰ سے گذر رہی ہے اس کا ذکر کیا کروں۔ گرانی آسمانوں سے باتیں کر رہی ہے۔ چنا، گیہوں بیس سیر، بیس بائیس سیر، گھی سوا دو سیر تھا، اب دو سیر سے بھی کم مل رہا ہے چنا گیہوں اٹھارہ سیر ا

مرزا: اس بربادی چنے نے بھی اپنی قدر و قیمت میں اضافہ کر لیا۔

ہیش: جی ہاں، ورنہ بقول حضور کے، خدا اُسے کھا جاتا (دونوں ہنستے ہیں) اور ہاں (آہستہ) دو سیر بادام بھی خرید لئے گئے ہیں۔

مرزا: یہ اچھا کیا آپ نے۔ تلے ہوئے بادام ہوں تو عرق بہ آسانی حلق سے اُتر جاتا ہے، اگرچہ کہ ؎

غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی
پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں

ہیش: مجھے پتہ ہے بادام گویا دسترخوان پر چٹنی کا کام دیتا ہے۔

مرزا: دسترخوان کا نام آیا ہے تو کہتا ہوں۔ پندرہ آم کھانے والے۔ اس پر یہ پریشانی بے سروسامانی نہ کھانا نہ برف۔ اس پر یہ غوغائے طومار اور یہ قیامت۔ لالہ ہیش داس اب اس نادری قتلِ عام سے بچاؤ کہاں؟

ہیش: بجا ارشاد ہے قبلہ۔

مرزا: سب کے تیر لگیں گے، سب دار پر چڑھیں گے۔ بات کچھ ایسی ہی ہے۔ وہ بھی دن تھے جب کسی واقعے کی خبر سنی، جب تک اخبار کا دو ورق دیکھ نہیں لیا، دل کو چین نہیں آتا تھا اور واقعے کی تہہ میں پہنچنے کی ہوشا کانہ خواہش ہوتی تھی، مگر آج اسی قدر دم بخود ہوں۔ اتنا بڑا ہنگامہ برپا ہو گیا۔ میں نے کوئی اخبار دیکھا اور نہ گھر سے باہر قدم رکھا۔

ہیش: قبلہ کچھ سنا آپ نے، مظفرالدین حیدر خاں اور ——— ذوالفقارالدین حیدر خاں کے بارے میں؟

مرزا: کیوں کیا ہوا؟ (چونک کر)

ہیش: سیکڑوں کی طراں (طرح)، یہ خاندان بھی اپنے شاندار محلات چھوڑ کر بھاگ نکلا۔ جس طرح اور گھر لوٹے گئے اُن کے گھر بھی نہ صرف لوٹے گئے، بلکہ کسی نے ان کے مکانات کے پردوں اور سائبانوں میں آگ لگا دی۔ در و دیوار، پتھر تک جل گئے راکھ ہو گئے۔ نواب ضیاءالدین اور حسین مرزا لاپتہ ہیں۔

مرزا: یہ کیسی ہولناک خبر سنائی آپ نے ہیش داس۔ اب تک دلی کی تباہی کی داستان سنتا رہا۔ صبر کرتا رہا (چاروں طرف دیکھ کر کہ کوئی سن نہ لے) حتیٰ کہ میاں کالے کی حویلی بھی لُٹ چکی ہے اور ہمارا بھی سب کچھ لُٹ گیا، لیکن میری زبان سے اُف تک نہیں نکلی کہ ؎

رو کر جی کے بے سد ہو گیا ہے غالب
دل رک رک کے بند ہو گیا ہے غالب

ہیش: آہا۔ غم کی انتہا کا اظہار کن الفاظ میں کیا ہے حضور نے کہ دل کے تار جھنجھنا اٹھے۔

مرزا: چاہا تھا کہ وقت کی طرح ہر آفت کو ٹھکراتا ہوا گذر جاؤں لیکن آپ نے جو دردناک خبر سنائی ہے اُس نے دل کو



بے قرار کر دیا۔ انسان ہوں۔ حق گدازِ سخن اسد
ہوا جو بو سخن ہوں۔ قصیدہ، قطعہ، رباعی،
غزل فارسی اور ہندی دس ہزار سے کچھ اوپر لکھے
ضیاء الدین، ناظر حسین مرزا ہندی فارسی نظم و نثر کے
مسودات مجھ سے لے کر اپنے پاس جمع کر لیا کرتے تھے شاید
اس آگ سے اب کوئی پُرزہ بھی ان کے گھر نہیں بچا ہوگا
کیوں۔ جو آتش بجاں کا کلام تھا، جل گیا ہوگا ——

مہیش: ؎ سایہ میرا مجھ سے مثلِ دُود بھاگے ہے اسد
پاس مجھ آتش بجاں کے کس سے ٹھہرا جائے ہے

مرزا: اور کیا۔ کوئی دو چھپے ہوئے ہندی کلام کا ایک نسخہ
رامپور بھیجا ہے۔ شاید وہ سلامت رہے۔ سچ کہتا ہوں
مہیش داس میری اولاد کے زندہ نہ رہنے کا مجھے کوئی
رنج نہیں رہا کہ اپنی تخلیق ہی کو اپنی اولاد سمجھا کیا لیکن
یہ لو اب وہ بھی نذرِ آتش ہو رہی۔ نذرِ آتش ؎
لذتِ سوزِ دروں کیا بتاؤں؟

دل مرا سوزِ نہاں سے بے محابا جل گیا
آتشِ خاموش کی مانند گویا جل گیا

مہیش: سوداگروں کی آگ نے سب کو لپیٹ لیا۔

مرزا: یہ انگریز اپنی ابتدائی شکست کا بدلہ لے رہے ہیں، اس
وقت سب ایک ہو کر مقابلہ کرتے تو ان سوداگروں کا
نام و نشان تک مٹ جاتا۔ ان کے دوسرے سطح چلے
سے یہ ہوا کہ جان و مال، عزت و ناموس، مکان و مکیں
آسمان و زمین اور آثارِ ہستی سراسر لٹ گئے۔ اس
فتنۂ پُر آشوب میں شاید ہی کوئی میرا جاننے والا بچا
ہو اور نتیجہ ؎

دل میں پھر گریہ نے اک شور اٹھایا غالب
آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا سو طوفاں نکلا

مہیش: بجا ارشاد ہے حضور۔ قدردانِ علم و فن اب کہاں۔ وہ
سورما اب کہاں۔

مرزا: لوہارو میں، ثناء اللہ خان محمد جیسے رستم ایسا کام کر
گئے علاوہ مومن، شیفتہ، مظفرالدین، آزردہ،

مولوی فضل حق آزردہ جنہوں نے ہمارے قلم کا رُخ
بدل دیا اور وہ علائی، رند، صہبائی یہی تو تھے جن کی
خاطر میں نے دلی کو اپنا وطن قرار دے لیا۔ ہائے ہائے
اُن کی وہ ہنگامہ آرائیاں، اُن کی وہ محفل مناسبتیاں
وہ صحبتیں ؎

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

کلّو: (داخل ہو کر) حضور، مرزا یوسف بیگ خاں کا نوکر ابھی
ابھی خبر لایا ہے کہ حضور کے برادرِ خورد مرزا یوسف
بیگ خاں پانچ دن سے مسلسل بخار میں مبتلا تھے۔
رات انتقال کر گئے۔

مرزا: کیا کہا۔ مرزا یوسف میرا بھائی انتقال کر گیا؟ ہائے
غضب۔ وہ ایسے وقت میں مجھ سے جدا ہو رہا جبکہ
میرے پاؤں میں حکمِ نادری سے بیڑیاں پڑ چکی ہیں۔
افسوس کیا یہ داغ بھی باقی تھا ؎

ہو گئیں غالب بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

کلّو: حکم۔

مرزا: ہاں اس کا لاشہ وہاں بے گور و کفن پڑا ہوگا۔ جاؤ
بیگم سے کہو کہ کفن کا انتظام کریں۔ (کلّو جاتا ہے مہیش
کی طرف دیکھ کر) مہیش داس۔

مہیش: ارشاد بندہ پرور۔

مرزا: بھائی کیا بتاؤں ؎

گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا
بحر اگر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا

مہیش: حضور فکر نہ کریں، بندہ حاضر ہے۔

مرزا: مہیش داس ؎

افسردگی نہیں طرب انشائے التفات
ہاں درد بن کے دل میں مگر جا کرے کوئی

کلّو: (داخل ہو کر) حضور بیگم صاحبہ ارشاد فرماتی ہیں کہ —
چادریں وغیرہ جن چیزوں کی ضرورت ہو تو شہ خانے سے



لے لی جائیں۔

مرزا ، ہاں جاؤ، جلدی کرو (کلّو جاتا ہے) مہیش داس
آپ بھی اُن کے ساتھ جائیں تو بہتر ہے۔ چاہو تو
راجہ صاحب پٹیالہ کے کسی سپاہی کو ساتھ لے لیا جاؤ۔

ہستی کا اعتبار بھی غم نے مٹا دیا
کس سے کہوں کہ داغ جگر کا نشان ہے

(کلّو اور کلیان چادریں اور گلاب کی ایک بوتل لئے داخل ہوتے ہیں)

مہیش ، چلو چلیں (مہیش داس آگے کو بڑھتے ہیں)

مرزا ، ٹھیک ہے۔ سر راہ ہے، اگر کسی نے ٹوکا تو کہنا مرزا نوشہ کے بھائی کی میّت دفنانے جا رہے ہیں ——
(چادریں دیکھ کر) ہائیں، ٹھہرو۔ میں ابھی اندر جاتے ہیں)

مہیش تعجب ہے قبلہ کے چہرے کی رونق اُڑ گئی۔

کلّو ، سگے بھائی کی میّت میں شریک ہونے سے قاصر ہیں۔ شاید اسی بات کا رنج ہے۔

(مرزا دوشالہ لئے داخل ہوتے ہیں)

مرزا ، یہ لو (دوشالہ کلّو کو دے کر) میّت پر اُڑھا دینا۔ جاؤ۔ اور ہاں کیا نام، ہاں تہوّر خاں۔ تہوّر خاں کی مسجد کے صحن میں جگہ کافی ہے، وہیں کہیں گڑھا کھدوا کر میّت اُس میں اُتار کر مٹی سے پاٹ دینا۔ جاؤ اللہ نگہبان۔
(مہیش، کلّو اور کلیان جاتے ہیں۔ مرزا مڑتے ہیں۔ اسٹیج کا رنگ زرد ہوتا ہے)

(خود کلامی)

کس سے محرومیٔ قسمت کی شکایت کیجے
ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا

مجھ جیسا بخت آور کہیں پیدا ہوگا بھی؟ اللہ کا پیارا جس نے مجھے پیار کیا، وہ اللہ کو پیارا ہو گیا۔ میرے دل کی حالت سوائے میرے خدا کے، کوئی نہیں جانتا۔ آدمی کثرتِ غم سے سودائی ہو جاتا ہے۔ عقل جاتی رہتی ہے۔ اگر اس ہجومِ غم میں میری قوتِ متفکرہ میں فرق آ گیا ہے

تو کیا عجب ہے بلکہ اس کا باور نہ کرنا غضب ہے۔ پوچھو غم کیا ہے، غمِ فراق، غمِ عزت، ایک عزیز کا ماتم اس قدر سخت ہوتا ہے عزیز داروں کا ماتم دار ہو، زندگی اُس کو کیونکر نہ دشوار ہو ——

عمر بھر دیکھا کئے مرنے کی راہ
مر گئے پر دیکھئے دکھلائیں کیا

(مرزا مڑتے ہیں۔۔) اندھیرا چھا جاتا ہے۔ حواس باختہ چاروں طرف گھورنے لگتے ہیں کہ بجلی کی روشنی کا ایک حلقہ اُن کے وجود پر پڑتا ہے۔ بجلی کی کڑک کی آواز سنائی دیتی ہے اور مرزا کی شبیہ اُسی لباس میں جس لباس میں مرزا ہوتے ہیں، زمین سے نمودار ہوتی اور ہمکلام ہوتی ہے)

شبیہ آج کیوں پروا نہیں اپنے اسیروں کی تجھے
کل تلک تیرا بھی دل مہر و وفا کا باب تھا

(اسٹیج کا رنگ تبدیل ہوتا ہے)

مرزا میں نے روکا رات غالب کو وگرنہ دیکھتے
اُس کے سیلِ گریہ میں گردوں کفِ سیلاب تھا

شبیہ احباب چارہ سازیٔ وحشت نہ کر سکے
زنداں میں بھی خیال بیاباں نورد تھا

مرزا چُپ رہو۔ عوعانہ ہو، جیرجاٰنہ ہو، شیون نہ ہو، نالہ نہ ہو۔ جاؤ مجھے اپنے تخیّل میں گُم ہو جانے دو۔ شاید سمجھوں کہ کچھ ہوا ہی نہیں۔ سب زندہ ہیں، کوئی مرا ہی نہیں۔ میں کیوں کسی کے لئے روؤں۔ وہ جن کی تہذیب، جنکے نظریات اور جن کے ادب سے میں نے بغاوت کی، کیا وہ بھی میرے لئے روتے ہیں؟ میں روؤں تو کیا دوست احباب کے لئے روؤں۔ گرتے ہوئے وقار کے لئے روؤں یا تحصیلِ روزگار کے لئے روؤں۔ زندگی مجھ سے انتقام لیتی ہے تو لینے دو۔ انتقام اور اُس سے؟ جس کے دامنِ حسرت میں آگ لگ چکی، جس کے ارمانوں کو خاک میں ملا دیا گیا (تیور بدل کر) اے گردشِ افلاک ادھر آ، میں یہاں ہوں (دعا میں ہاتھ اُٹھا کر) رنج والم



غم واندوہ کے بادلو برس پڑو، اس قدر برسو کہ پھر
مہ برسے پاؤ گے۔ جانے کہیں سیلاب بلا میرے
[illegible] ایک کھٹکے کی آواز، ہائیں یہ آواز شاید
[illegible] ضمیر کی آواز ہے۔ شش، شش لے دل چشم حوالہ
خاموشی میں بھی نوا پرواز ہے۔ (ہمہ تن گوش)

[illegible] تنگ دست، تہی دست، خوددار، خودپرست!
تیری خودی کو، تیری انا کو کیا ہو گیا تھا، جو تو نے اوروں
کے آگے اپنے آپ کو جھکا دیا۔ تو نے ان کے آگے اپنے
ہاتھ پھیلائے جو تیرے آگے تنکے کا درجہ رکھتے تھے۔ کسی
پہ قصیدہ لکھ دیا، کسی کے تاریخ لکھ دی۔ غم روزگار
اور امیرانہ ٹھاٹھ کی ہوس نے اس قدر نیچا گرا دیا کہ
تحت الثریٰ کو جا پہنچا۔ کیا وہ تیرا ہی تخیل تھا؟ کیا وہ
تیری ہی آہ اور تھی جو طور کی ساکت و صامت چٹان پر
گو بجی تھی ؎

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

[illegible] ؎ آگ سے پانی میں بجھتے وقت اٹھتی ہے صدا
ہر کوئی درماندگی میں نالے سے لاچار ہے

شبیہ: درماندگی کا بہانہ سا۔ کس کا جگر تھا جو اس طرح مار
کر گرتا، اوروں کو چونکا دینے والے انساں تو نے اپنے
آپ پر بھی نظر ڈالی؟ اپنے دل کو بھی ٹٹولا تھا ؎
گر تجھ کو ہے یقینِ اجابت دعا نہ مانگ
یعنی بغیر اک دلِ بے مدعا نہ مانگ
اس طرح دلِ بے مدعا کی تمنا کرنے والے تو یوں بھی
مطمئن تھا ؎

ساغرِ جم سے مرا جامِ سفال اچھا ہے
وہ گدا جس کو نہ ہو خوئے سوال اچھا ہے
لیکن دنیا جہان کے سوالی تو خود اپنے نظریات پر قائم نہ
رہ سکا۔ وہ جو تیرے تبحرِ علم، تیری ہمہ دانی کے صدقے
تیری بارگہِ ادب میں زانوئے ادب تہہ کرتے تھے تو نے
ان کے چھوٹے طمطراق کے آگے اپنے گھٹنے ٹیک دیے۔

دل کے درد کو چھپایا اور یہ کہہ کر آنسو پونچھ لیے کہ ہے
سائلِ فقیروں کا ہم بھیس غالب
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

غالب: فقیر دل [illegible] !! (سر پیٹ لیتے ہیں، مٹھی سے
پیشانی مار لیتے ہیں)

؎ ڈھانپا کفن نے داغِ عیوبِ برہنگی
میں ورنہ ہر لباس میں ننگِ وجود تھا

شبیہ: حسنِ کلام، طرزِ ادا پر بار کرنے والے قلم کار ؎
ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں، خلوت ہی کیوں نہ ہو
لیکن اے سراپا محشرِ خیال ؎
آگ اس دل میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

مرزا: دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا جل گیا

شبیہ: فکرِ دنیا میں سر کھپا ڈالا تو کہاں اور یہ وبال کہاں
ہائے مرزا
۱۔ تو نے چاہا کہ تیرا معشوق شہزادہ تخت پر بیٹھے، لیکن وہ مر چکا۔
۲۔ تو نے دعائیں مانگیں کہ تیرے ہوا خواہ جیتے رہیں،
لیکن موت کے فرشتے نے انہیں دبوچ لیا۔
۳۔ تو نے تمنا کی کہ انگریز تجھے سر آنکھوں پر بٹھائیں
لیکن تو شیکسپیئر نہیں تھا۔
۴۔ تو نے نئے حکمرانوں کے وجود کو گوارا کیا، لیکن
تو مجبور، وہ منصور۔
۵۔ تو نے جان نثارانِ وطن کی طرف داری کی اُن
سورماؤں کو جنگِ آزادی پر ابھارا۔ جو تیرے جان
نثار رہے اور وہ جب سر سے کفن باندھ کر نکلے تو
اے وظیفہ خوار تو نے کہا ؎
گلشن میں بندوبست بہ رنگِ دگر ہے آج
قمری کا طوق حلقۂ بیرونِ در ہے آج

مرزا: یا پروردگار، کس سے کہوں کہ ؎
ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی (بآوازِ بلند)



شبیہہ اور جب ناتوانی نے سر اُٹھایا تو چلا اُٹھا ؎

لے عافیت کنارہ کر اے انتظام چل

سیلاب گریہ در پئے دیوار و در ہے آج

مرزا : یہ شبستان ہے سراسر شبستان۔ شہیدانِ وطن کی جانِ مرزا حضر سلطان نے مجھے خاک و خون میں ملتے۔ دیا کہ لہو بھی رگوں میں روانی نہیں رہی اور آج میں خون کے آنسو

غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی

کہ کرے تعزیتِ مہر و وفا میرے بعد

(مرزا بیمہ گولی پر اُتر آتے ہیں)

شبیہہ صبر صبر۔ اے جانِ ادب، امامِ فن، جانِ سخن تیرے بعد تیرے فن، تیرے کلام کو اہلِ نظر آنکھوں سے لگائیں گے ــــ اور گواہی دیں گے ؎

سب کو مقبول ہے دعویٰ تری یکتائی کا

یہ غلط کب ہے کہ تجھ سا کوئی پیدا نہ ہوا

مرزا : کیا میری قسمت میں حضر کی عمر لکھی ہے کہ دیکھ سکوں کہ وہ میرے کلام کو سر آنکھوں سے لگا رہے ہے۔ رہنے دو ان طفل تسلیوں کو اور وہ بھی ایک محرومِ تمنا کے روبرو جو جانتا ہے کہ ؎

ہے جنوں اہلِ جنوں کے لئے آغوشِ وداع

چاک ہوتا ہے گریباں سے جدا میرے بعد

شبیہہ : اے شہنشاہِ مملکتِ ادب، اے حکمرانِ قلمروئے سخن اس قدر تنگ نظری ؟؟

مرزا : (غصہ ہو کر)

اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس اہلِ دہر کا

سمجھا ہوں دل پذیر متاعِ ہنر کو میں

شبیہہ : ؎ غالب مرے کلام میں کیونکر مزا نہ ہو

پیتا ہوں دھو کے خسروِ شیریں سخن کے پاؤں

مرزا : (چونک کر) کیا مطلب ؟

شبیہہ کیا یہ مقطع ابوالحسن یمین الدین خسرو کی خدمت میں اُن کی زندگی میں کہا گیا تھا ؟

مرزا : نہیں۔ انہیں مرے پانچ سو تیس برس گزر چکے۔ وہ تو میں نے ان کے خیالات کی تعریف میں اُن کے کلام کو پڑھنے کے بعد یہ مقطع کہا تھا۔

شبیہہ : بالکل اسی طرح آنے والی نسلیں تیرے کلام کو پڑھ کر اُس کی تعریف کرنے پر مجبور ہوں گی اور یقیناً شاعر، ادیب تیری نظم، تیری نثر کو آنکھوں سے لگائیں گے، مگر ہاں تیرے انوکھے غم سے کوئی سروکار نہ ہوگا کہ تیرا غم تیرے دم کے ساتھ ہے۔ اس لئے ؎

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد

عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

مرزا : میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا

میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا

(مرزا پر روشنی کا حلقہ پڑتا ہے۔ وہ آگے بڑھتے ہیں۔ شبیہہ جو زمین سے اُبھر آئی تھی، زمین میں دھنس جاتی ہے)

عدم سے پرے، عرش کے قریب۔ رنج والم کی دنیا سے دور، بہت دور، بے حس ؎

ہوا جب غم سے یوں بے حس تو غم کیا سر کے کٹنے کا

نہ ہوتا گر جدا تن سے تو زانو پر دھرا ہوتا

میں نے کہا ــــ نہیں ــــ نہیں، میں نے کچھ کہا؟ یا کسی نے کچھ سنا ؟ ہاہاہا۔ . .

؎ بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ

کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

(روشنی کا حلقہ مرزا پر بدستور قائم ہے۔ مرزا مٹھیاں کھینچ لیتے، ریں گھورنے لگتے اور جسم کو ٹھٹھر لیتے ہیں۔ حلقے کی تیز روشنی مدھم پڑنے لگتی ہے۔)

(پردہ)

۲ شیر افگن کی بارہ دری

بلی ماران ۱۸۶۹ء

[تخت پر مرزا لیٹے ہوئے ہیں، جس پر



دوشالہ پڑا ہے۔ سرہانے تخت سے لگا ہوا کلو بیٹھا ہے۔ کلیان داخل ہوتا ہے (کلو کلیان کو اشارہ کرتا ہے کہ آواز نہ ہونے پائے اور اُٹھ کر کلیان کے قریب آتا ہے)

کلیان: آنکھ لگی ہے؟

کلو: ہاں ابھی ابھی لگی ہے (سردی محسوس کر کے) جاڑا دم توڑ رہا ہے

کلیان: پھر بھی ہے تو۔

کلو: آج فروری کی پندرہ تاریخ ہے۔ سردی تو ہو گی ہی۔

کلیان: کمزوری بہت ہے۔ محمد ساتھ ہی کرت ہیں۔

کلو: ۱۸۶۹ء تہتر واں سال ہے۔ وہ جو کہتے ہیں، ایک ضعیفی و صد بیماری۔ یوں بھی کلیان سن ستاون ہی سے صحت گرنے لگی حضور کی۔ اٹھاون میں قولنج کا حملہ ہوا۔ دو سال پھوڑوں میں مبتلا رہے۔ جتنا خون تھا، بلا مبالغہ نکل گیا۔ ۱۸۶۲ء میں فتق کی شکایت نے نمود کیا۔

کلیان: ویسے میں رام پور گئے حضور۔

کلو: وہ تو قیامت کا سفر تھا۔ واپسی میں اچانک رام گنگا میں طغیانی آئی۔ پل بہہ گیا۔ ہم ادھر، حضور ادھر۔ یکبارگی گر پڑے۔ پاؤں میں چوٹ بھی آئی، لیکن وہ چوٹ دل کی چوٹ سے زیادہ گہری نہیں تھی کہ بے سیل و مرام لوٹے تھے گرتے پڑتے مراد آباد کی سرائے پہنچے۔ بھوکے پیاسے رات کاٹی۔

کلیان: وہ رات ہم سے بھلا وے ناہی جاوے کلو میاں۔

کلو: ایک کمبل میں رات کیا بسر کی بڑھاپے نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔ تب ہی سے اعضا مضمحل ہو گئے غذا بھی کم ہو گئی۔ ۱۸۶۶ء کے بعد سے تو بالکل کم۔ تین تلے ہوئے کباب چھ گھڑی رات گئے پانچ روپیہ بھر گلاب اور اسی قدر عرق . . .

کلیان: بادام تو کب کے چھوٹے۔

کلو: تلے ہوئے بادام کا ذکر کیا ہے تم نے تو وہ دن یاد آگئے ہیں جب حضور مرزا آتے تو کہتے، اے للّو یہاں آؤ تا مٹھی بھر بادام طشتری سے ڈالتے اور کہتے، کھاؤ میری مرغی کے بچے یوں ہی چگا کرتے ہیں۔ اب سے سامنے کے دو دانت ٹوٹے تو مسّی کا لگانا چھوڑ دیا۔ بال سفید ہوئے تو داڑھی چھوڑ دی۔ سر منڈوانے لگے۔ داڑھیں گر گئیں تو تلے ہوئے بادام بھی چھوٹ گئے۔

کلیان: داڑھی تو چھوڑے ہیں بھٹیاری کی سرائے سے ـــ

کلو: آج سات دن سے غشی طاری ہے۔ جب ذرا ہوش آتا ہے تو سر تکیے پر رکھ کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگتے ہیں اور زبان پر یہ مصرع

اے مرگِ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے

کلیان: تس پر کانوں کا پیٹ بہرہ پن تجھ کو سنے ہے۔

کلو: ایک سر ہزار سودا۔ حضور کو گھر کی فکر نے ادھ موا کر دیا۔ صرف ہم ہی پر ساٹھ روپے مہینہ اُٹھتے ہیں۔ بیگم صاحبہ، بگا بیگم صاحبہ، جیندو بیگم، باقر علی خاں، حسین علی خاں، مغلانی، دعادار، بلی، مور، کبوتر، بٹیر، مرغ، طوطا، مینا، امیرانہ ٹھاٹ کی زندگی کا قرینہ۔ اگر وہ سات بچے جو چھٹیوں میں مرتے گئے، زندہ ہوتے تو جانے آج کس قدر رقم اُٹھتی۔

کلیان: سچی بات کہت ہو کھیا جی۔

کلو: آمد ایک سو ساٹھ، خرچ مہینے تین سو سے کوڑی کم نہیں۔ پورے ایک سو چالیس کا گھاٹا رقم آوے تو کہاں سے؟

کلیان: (تخت کی طرف دیکھ کر) یہ لو کروٹ بدلے حضور۔

مرزا: (کروٹ بدل کر آواز دیتے ہیں) کلو!

کلو: (نزدیک جا کر کان مرزا کے منہ کے قریب کر کے) ارشاد

مرزا: بھائی ضعف کا یہ عالم ہے کہ اٹھ نہیں سکتا۔

کلو: اُٹھنے کی کیا ضرورت ہے، لیٹے رہیے (دوشالہ ٹھیک سے اُڑھاتا ہے اور کلیان کی طرف متوجہ ہوتا ہے) کلیان ابھی ابھی طبیعت کچھ سنبھلی ہے اور کچھ بڑبڑا بھی رہے ہیں۔



کلیان: ہاں میاں صحت یا جاویں حضور بس ہم یہی
چاہت ہیں۔
مرزا (اٹھنے کی کوشش کرکے) ذرا ہاتھ بڑھانا۔
(کلو بغل میں ہاتھ دے کر اُٹھاتا ہے)
مرزا: (قدرے اُٹھ کر) آہ۔ اے مرگِ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے
کلو: کچھ کھائیے گا؟
مرزا۔ (سنبھل کر)
دمِ واپسیں برسرِ راہ ہے عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے
کلو: طبیعت کیسی ہے حضور کی (کان کے قریب منہ لیجا کر)
مرزا: مرزا جیون بیگ کہاں ہے۔
کلو: یہیں تو کھیل رہی تھی بچی (کلیان سے) کلیان دیکھنا
جیدو بیگم کدھر ہے۔
کلیان: جی (آواز دیتا ہے) اے جیدو بی (اندر جاتا ہے)
کلو: شاید معظم زمانی بیگم کے کمرے میں ہے۔ کلیان گیا ہے
لے آئے گا۔
کلیان: (داخل ہوکر) وہ تو سوتی ہے۔ بیگا بیگم کہتی ہیں،
جو ہی بچی جاگے ہے، بھیجتی ہوں (قریب جاکر)
کلو: جب وہ آئے گی، ہم کھانا کھائیں گے۔
(مرزا تکیے پر سر رکھ لیتے ہیں۔ کلو سرہانے سے اپنا
ہاتھ ہٹا لیتا ہے اور تخت سے لگ کر بیٹھ جاتا ہے۔
کلیان اندر جاتا ہے تو اندھیرا چھا جاتا ہے۔ بادل
کی گرج کی آواز سنائی دیتی ہے)

تحلیل

[دھیرے دھیرے اسٹیج پر سبز روشنی پھیلنے لگتی ہے
انگور کی بیل کا منڈوا ابھرنے لگتا ہے۔ چاروں طرف
انگور کے خوشے دکھائی دیتے ہیں۔ بیل کی اوٹ سے
دونوں جانب سے چھ چھ لڑکیاں سفید لباس میں ملبوس
برآمد ہوتی ہیں۔ بائیں جانب کی لڑکیوں کے ہاتھوں
میں مٹی کے آبخورے اور دائیں جانب کی لڑکیوں کے
کندھوں پر مٹی کی صراحیاں ہوتی ہیں۔ اسٹیج کا رنگ
گہرا سبز ہوتا ہے۔ آخر میں بیل کی چھت سے ایک
نہایت خوبصورت دوشیزہ گل بدن (ساقیا) نمودار
ہوتی ہے۔ ساز کی آواز اونچی ہوتی ہے۔ ساقیہ بھی سب
رقص و سرور میں مشغول ہو جاتی ہیں)
آواز۔ ساقیا۔ (گل بدن)

کورس ہمایا ساروں کے ساتھ

ساقیا: بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے
لڑکیاں: ساقی بہار موسمِ گل ہے سرور بخش
پیاں سے ہم گزر گئے پیمانہ چاہیئے
ساقیا: پھر دیکھئے اندازِ گل افشانیِ گفتار
رکھ دے کوئی پیمانۂ و صہبا مرے آگے
لڑکیاں: پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے
ساقیا: گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے
(سبز روشنی صندلی روشنی میں متبدل ہوتی ہے، تو
بڑی بڑی سیاہ زلفوں والا صوفی صندلی جبہ کندھے پر
صندلی رومال ہاتھ میں عصا لئے ہوئے بیل کی اوٹ سے
نمودار ہوتا ہے۔ لڑکیاں تعظیم کو جھک جاتی ہیں)
آواز۔ صوفی۔ (رقص و سرود شروع ہوتا ہے)

دوسرا کورس ملنگ سازوں کے ساتھ

صوفی: ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا
لڑکیاں: نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا
صوفی: نوازش ہائے بیجا دیکھتا ہوں
شکایت ہائے رنگیں کا گلہ کیا
لڑکیاں: نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا
صوفی: سن اے غارت گرِ جنسِ وفا سن
شکستِ قیمتِ دل کی صدا کیا



[اسٹیج کا اصلی رنگ سُرخ ہوتا ہے۔ شوقی
الکورکی میں کی اوٹ میں غائب ہو جاتا ہے۔
اسٹیج کے بیچوں بیچ ریں سے بڑی سی کنول کی
کلی اُبھر آتی ہے۔ کنول کے دو بڑے بڑے پتے
سایہ فگن ہوتے ہیں جن پر پانی کے قطرے موتی سے
نظر آتے ہیں۔ کلی کھلنے لگتی ہے تو خوبرو سی غزل
(لڑکی) کنول سے نکلتی ہے۔ لڑکیاں فرش راہ ہوتی
ہیں۔ جب اٹھتی ہیں تو سب کے ہاتھوں میں قلم کے
قلم ہوتے ہیں اور سب غزل کے آگے جھک جاتی ہیں۔
سہارہ رقص شروع ہوتا ہے۔ اسٹیج کا رنگ گلابی
رنگ میں تبدیل ہوتا ہے]

آواز: غزل (خوشی)

کورس دھانی ساز کے ساتھ

غزل: بینداُس کی ہے دماغ اُس کا ہے راتیں اُسکی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

لڑکیاں: کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

غزل: میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھُل گیا
بلبلیں سن کر مرے نالے غزل خواں ہو گئیں

لڑکیاں: جاں فزا ہے باد جس کے ہاتھ میں جام آ گیا
بس نہیں چلتا کہ پھر خنجر کفِ قاتل میں ہے

غزل: رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

(گلابی روشنی گہری اودی روشنی میں تبدیل ہوتی ہے
جیسے اندھیرا چھا رہا ہو ـ پورا منظر تبدیل ہو جاتا ہے
اودی روشنی چراغوں کی۔ روشنی میں تبدیل ہوتی ہے
تھوڑی دھندلا سا منظر نظر آتا ہے۔ تخت پر مرزا بیہوشی کی
حالت میں لیٹے ہوئے ہیں۔ تکیہ پر سر کیا رکھا، ہمیشہ
کے لیے سو گئے۔ کلو تخت کے پاس سے اُٹھ کر جاتی
قریب جا کر مرزا کی نبض دیکھتا ہے اور پریشان
ہو جاتا ہے)

کلو: کلیان! (آواز دیتا ہے)

کلیان: جی میاں (داخل ہو کر)

کلو: بھائی دوڑو، یہ نبض نہیں ـــ ـــ
جلدی جاؤ اور حکیم احسن اللہ خاں اور حکیم محمود خاں
کو لے آؤ۔ دوڑو (کلیان دوڑتا ہوا جاتا ہے)

امراؤ: (داخل ہو کر) کیا بات ہے کلو میاں۔

کلو: بیگم صاحبہ حکیم احسن اللہ خاں اور حکیم محمود خاں کو بلایا
ہے۔ بیگم صاحبہ وہ آتے ہی ہوں گے۔ آپ کچھ دیر
یہاں جانے میں رہیں۔ بی بی بیگم صاحبہ میں ابھی حاضر
ہوتا ہوں۔

(امراؤ جاتی ہیں، کلو تخت سے لگ کر بیٹھ جاتا ہے۔
ہائے اللہ میرے حضور! حق مغفرت کرے۔ قیامت
کی پیدا آگئی مرزا نوشہ کو)

آواز: ہوئی مدت کہ غالب مر گیا پر یاد آتا ہے
وہ ہر اک بات پر کہنا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا

(بجلی کڑکتی ہے اور چمکتی ہوئی روشنی کے ساتھ دیوار کا
ایک حصہ گر پڑتا ہے۔ اندھیرا چھا جاتا ہے اور سُرخ
روشنی کی جاتی ہے۔ عقب میں گری ہوئی دیوار کے
حلقے میں چھوٹا سا کمرہ نظر آتا ہے جس میں تخت بچھا
ہے اور اس پر امراؤ بیگم میتّی دعا کو ہاتھ اُوپر اٹھائے
ہوئی ہیں۔ ماروملائی اور البتی بیگم کھڑی ہیں۔ عقبی
آواز سُنائی دیتی ہے)

سرگاں ـ مالکمی ـ دھیمے ساز ـ

عقبی آواز

اُٹھ گیا تھا جو مایہ دارِ سخن — کس کو ٹھہرائیں اب مدارِ سخن
مظہرِ شانِ حسنِ فطرت تھا — معنیِ لفظِ آدمیت تھا
ایک روشن دماغ تھا نہ رہا — شہر میں اک چراغ تھا نہ رہا

(پردہ)

ابراھیم یوسف

(ڈراما)

مغلوبِ غالب

افرادِ تمثیل

میرزا غالب	
امراؤ بیگم	میرزا غالب کی بیوی
کلّو اور کلیان	میرزا غالب کے نوکر
وفادار	میرزا غالب کی ملازمہ

چند گورے اور کالے سپاہی
کچھ ہمسائے اور میرزا یوسف کا نوکر

منظر

[میرزا غالب دالان میں ایک گاؤ تکیے سے لگے بیٹھے ہیں۔ سامنے پیچواں رکھا ہے۔ چہرے سے پریشانی اور فکرمندی ظاہر ہو رہی ہے۔ کبھی کبھی پیچواں کا کش لیتے ہیں۔ کچھ دیر بعد امراؤ بیگم دالان میں آتی ہیں۔ اُن کے چہرے پر پریشانی کے ساتھ ساتھ غصہ بھی ہے۔ میرزا غالب انہیں غور سے دیکھتے ہیں۔ امراؤ بیگم جھلاہٹ سے]

امراؤ بیگم: ان صاحب زادوں نے تو ناک میں دم کر رکھا ہے۔ ایسی ضد کرتے ہیں کہ

میرزا غالب: کیا مقدمہ درپیش ہے بیگم، جو لوں آپے سے باہر ہوئی جا رہی ہو۔

امراؤ بیگم: کیا مقدمہ درپیش ہوگا، بس ضد ہے کہ میٹھا پانی پئیں گے۔ کل بارش کا مدّت تمام ایک گھڑا پانی جمع کیا تھا سو وہ آپ کے لئے رکھ چھوڑا ہے۔ لاکھ سمجھایا کہ تمہارے دادا جان کے لئے ہے مگر سمجھتے ہی نہیں۔

میرزا غالب: بیگم! وہ بارش ہی کا تو پانی ہے آبِ زمزم تو نہیں جو آپ اس کی اس طرح حفاظت کر رہی ہیں۔

امراؤ بیگم: لیکن کھاری پانی آپ کے مزاج کو موافق نہیں آتا۔ بچے بالے ہیں۔ کھاری پانی ہی پی لیں۔

میرزا غالب: کھاری پانی کسے خوش آتا ہے۔ پانی انہیں پلا دیجئے۔ (بلند آواز سے) وفادار۔ اے بی وفادار (ملازمہ اسی جانب سے آتی ہے جدھر سے امراؤ بیگم آئی ہیں اور میرزا غالب کے سامنے مؤدب کھڑی ہو جاتی ہے) صاحب زادوں کو بارش کا جمع کیا ہوا پانی پلا دو۔ کل پانی کیا برسا کہ آب رحمت برسا کہ ہم گنہگاروں کے حلق تر کر گیا۔

(وفادار خاموشی سے چلی جاتی ہے۔ امراؤ بیگم اس کے جانے کے بعد)

امراؤ بیگم: بس آپ کی انہی ناز برداریوں نے تو انہیں اور ضدی بنا دیا ہے۔

میرزا غالب: بیگم اب وہ ہم سے آپ سے ضد نہیں کریں گے تو اور کس سے کریں گے۔ آپ دیکھتی ہیں کہ وہ مجھے کس طرح دق کرتے ہیں۔ سگے پیر میری چادر پر چڑھ آتے ہیں (مسکرا کر



آج تو چھوٹے صاحب نادرے گھر سے ایک روپیہ
قرضِ حسنہ مانگ رہے تھے۔

امراؤ بیگم: لیکن صبر کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ اس طرح تو
بچے ستیاناس ہو کر رہ جائیں گے۔

میرزا غالب: (بات ٹالنے کے انداز میں) ارے ہاں بیگم، لوا ــــ
[illegible] الدین احمد خاں نے آپ کے وظیفے کے روپے بھیجے
یا نہیں؟

امراؤ بیگم: جی، ابھی تک تو نہیں بھیجے۔

میرزا غالب: ویسے تو وہ روپیہ وقتِ مقررہ پر بھیجتے رہے ہیں۔

امراؤ بیگم: جی ہاں، اس بار جانے کیوں تاخیر ہو گئی۔

میرزا غالب: وہ خود محصور ہوں گے۔ شہر تو روز رخ کا نمونہ بنا ہوا ہے
اگر ایک دو روز کے اندر روپیہ نہیں آیا تو بس اللہ ہی اللہ ہے۔

امراؤ بیگم: توشک خانے میں اب کچھ بھی نہیں ہے۔ تمام کی فکر
الگ کھائے جا رہی ہے۔

میرزا غالب: (مسکرا کر) بیگم، آپ تو بلاوجہ ہی شروع کر
دیں گی۔ مگر میرا کیا ہوگا اور پھر صاحب زادے ہیں۔ ابھی
تو ان پر دوسرے قرض بھی نہیں ہوئے۔

امراؤ بیگم: خدا کے لئے اس سخت وقت میں تو یوں تمسخر نہ کیجئے۔

میرزا غالب: واللہ بیگم! سچ کہتا ہوں۔ خیر مجھے بھی جانے دیجئے۔ آخر
گھر میں کلو ہے، کلیان ہے، پیار علی اور ایاز ہیں۔
دو ا اور دوا دار ہے۔ یہ کس جرم کی پاداش میں بھوکے
رہیں گے اور اگر بھوکے رہیں گے تو دل میں یہی کہیں گے کہ صاحب
سخاوت کرتا ہے تو بس پوری تول دیتا ہے مگر یہ کمبخت
تو ایسا صاحب ہے کہ ڈنڈی مارتا تو کجا، تولنے کے بھی [illegible]

امراؤ بیگم: اب یہ لوگ بچے نہیں ہیں کہ حالات کو نہ دیکھ رہے
ہوں (کلو دفعتاً آتا ہے۔ امراؤ بیگم اُسے دیکھ کر)
یہ لیجئے، وہ کلو آ گیا۔

میرزا غالب: کیوں میاں کلو، کیا خبر لائے؟ اب شہر کا کیا حال ہے؟
(پسینہ پونچھتے ہوئے) دھائیں دھائیں گولیاں چل
رہی ہیں سرکار۔ کیا گناہ گار، کیا بے گناہ، جو بھی

سامنے آ جاتا ہے، گولی کا نشانہ بنتا ہے۔

میرزا غالب: کچھ میرزا یوسف کی بھی خبر پائی؟

کلو: سرکار! شہر میں تو ایک قیامتِ صغریٰ
بپا ہے۔ میں نے تو اپنی سی پوری کوشش کی، مگر
مہاراجہ پٹیالہ کے آدمیوں نے دیوار کی دوسری جانب
جانے ہی نہیں دیا۔

میرزا غالب: مجھے اس کی فکر کھائے جا رہی ہے۔ وہ دیوانہ محض
ہے۔ جانے کس وقت کیا کر بیٹھے۔

کلو: ویسے ماما اور ملازم وہاں موجود ہیں۔ جونہی حالات
تھوڑے بھی سازگار ہوں گے، میں اُن کی خبر لینے
جاؤں گا۔

(میرزا غالب خاموش ہو جاتے ہیں اور سوچتے ہیں۔
پھر ایکدم کلو کی طرف دیکھ کر)

میرزا غالب: ارے ہاں میاں کلو، کچھ کلیان کا بھی پتہ ہے؟

کلو: وہ تو صبح ہی سے لاپتہ ہے۔ خدا جانے زندہ بھی ہے
یا کسی گورے کی گولی کا نشانہ بن گیا۔

میرزا غالب: خدا اُسے اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ میں نے
اُسے ایک ولایتی چغہ اور ایک شامی رومال ڈھائی
گز کا دیا تھا کہ دلال کو دے کر روپیہ لے آئے کہ
شکم پُری کا سامان فراہم ہو۔

کلو: سارے بازار چوپٹ پڑے ہیں سرکار۔ دام گرہ میں
ہوں بھی تو کس کی ہمت ہے کہ مہاجن کی دوکان تک
جائے اور کون مہاجن ایسا ہے کہ دوکان کھول کر
سودا سلف دے۔

میرزا غالب: (ٹھنڈی سانس بھر کر) بس تو اب توکل ہی پر
گزارہ سہی۔ (خاموش ہو جاتے ہیں۔ پھر کچھ دیر بعد)
کاش کلیان ہی کچھ میرزا یوسف کی کوئی خبر لے آئے۔
واللہ! اُس کا خیال آتا ہے تو دم سینے میں گھٹنے
لگتا ہے۔

امراؤ بیگم: جانے بے چارے کس حال میں ہیں۔ ایسے وقت
میں اُن کی بیوی اور لڑکی کا انہیں تنہا چھوڑ کر چلے جانا



چلا جانا کچھ مناسب نہ تھا۔

میرزا غالب، آخر وہ بیگ بخت بھی کیا کرتی۔ میرزا یوسف دیوانہ اور شہر نمونۂ کربلا۔ آخر کس کے سہارے پڑی رہتی۔

امراؤ بیگم، کچھ روز کے لئے یہاں اٹھا آتیں۔ جوں ہی بچوں ہی اُن کا بھی گذارہ ہو ہی جاتا۔ اب یہ بھی نہیں تھا کہ دو تین دن میں ہم بیمار ہو تیں۔

میرزا غالب، یہ کسے خبر تھی بیگم کہ ہوا کا رُخ یوں پلٹے گا، ورنہ کیا ممکن تھا کہ میں میرزا یوسف کو وہاں تنہا چھوڑ دیتا۔

(مسکرا کر) بیگم! واللہ اب تو روزِ قیامت پر بھی یقین کرنے کو جی چاہنے لگا۔

امراؤ بیگم، دیکھئے آپ نے پھر

میرزا غالب (بات کاٹ کر) سچ کہتا ہوں بیگم، جب یہاں یوں نفسی نفسی ہے تو وہاں کیا عالم ہوگا۔ مگر پھر سوچتا ہوں وہاں بھی کچھ نیک نفس ایسے ضرور مل جائیں گے جو مجھ جیسے انسان کی دستگیری کر سکیں۔ (باہر شور و غل اور چیخ پکار۔ میرزا گھبرا کر) یہ کیا ماجرا ہے۔ (کلو کی طرف دیکھ کر) میاں کلو، جا کر خبر تو لاؤ۔

(کلو تیز تیز قدموں سے چلا جاتا ہے۔ میرزا غالب کھڑے ہو جاتے ہیں اور پریشانی کے عالم میں ٹہلنے لگتے ہیں۔ کچھ دیر بعد کلو آ کر)

کلو، سرکار! کچھ گورے دیوار کود کر اندر گھس آئے ہیں اور مہاراجہ پٹیالہ کے سپاہیوں سے تکرار کر رہے ہیں۔ وہ گھر میں گھسنا چاہتے ہیں۔

میرزا غالب، لاحول ولا قوۃ الا باللہ (امراؤ بیگم سے) بیگم! آپ اندر جائیے۔ جانے یہ کمبخت کیا فساد پیدا کریں۔

(امراؤ بیگم تیز تیز قدموں سے جدھر سے آئی تھیں اُسی طرف سے چلی جاتی ہیں۔ میرزا غالب برآمدے میں ٹہلتے رہتے ہیں۔ کچھ دیر بعد دو تین گورے اور ایک دو ہندوستانی سپاہی اندر آتے ہیں۔ ایک گورا میرزا کو دیکھ کر)

پہلا گورا ول تم ہی مرزا نوشہ ہے؟

میرزا غالب ہاں میں ہی مرزا نوشہ ہوں۔

پہلا گورا تم ہی بادشاہ دہلی کی غزلیں بناتا تھا؟

میرزا غالب، ہاں، میں ہی یہ مزدوری کرتا تھا۔

دوسرا گورا مزدوری کرتا تھا یا اُس کا نوکر تھا؟

میرزا غالب، اِسے مزدوری سمجھو یا نوکری، مگر اس فتنۂ آشوب میں میں نے کسی مصلحت میں دخل نہیں دیا۔

دوسرا گورا ہم یہ کیسے جانیں کہ تم بادشاہ دہلی کا وفادار نہیں۔

میرزا غالب، نہ میں کالوں کے زمانے میں کہیں گیا اور نہ گوروں کے زمانے میں گھر سے نکلا۔ کرنل براؤن صاحب کے زبانی حکم پر یہاں میری اقامت کا معاملہ تھا اور اب تک کسی حاکم نے وہ حکم نہیں بدلا۔

پہلا گورا، تو پھر تم کو کرنل براؤن کے سامنے اپنی صفائی دینا ہوگی (میرزا غالب کچھ سوچتے ہیں) کیا سوچتا ہے تمہیں ضرور کرنل براؤن کے سامنے چلنا ہوگا۔

میرزا غالب، خیر بھائی چلتا ہوں (آگے بڑھتے ہیں) چلئے۔

(آگے آگے میرزا غالب اور پیچھے پیچھے گورے اور کالے سپاہی جاتے ہیں۔ وفادار تیز تیز قدموں سے آ کر کلو سے)

وفادار، بیگم صاحبہ فرماتی ہیں کہ تم بھی سرکار کے ساتھ چلے جاؤ اُن کی خبرگیری رکھنا۔

(کلو تیز تیز قدموں سے اُن لوگوں کے پیچھے پیچھے مکان سے چلا جاتا ہے۔ وفادار تنہا کھڑی رہ جاتی ہے کہ امراؤ بیگم آتی ہیں۔ چہرے پر سخت زردی ہے اور ٹکٹکی باندھے اُس طرف دیکھتی رہتی ہیں جس طرف میرزا غالب گئے ہیں۔ وفادار چند سکنڈ خاموش کھڑی اُن کو دیکھتی رہتی ہے۔ پہلے تو آنکھوں میں آنسو آتے ہیں اور پھر یکدم ہچکیوں سے رونے لگتی ہے۔ امراؤ بیگم وفادار کو دیکھ کر)

امراؤ بیگم، وفادار! کچھ خدا کے لئے اس وقت یہ رونے دھونے کی نحوست نہ پھیلاؤ۔ خدا گواہ، مجھے اس سے بڑی وحشت ہوتی ہے۔ جانے کیوں بدشگونی نظر آتی ہے۔



(وفادار سر جھکائے روتی رہتی ہے۔ امراؤ بیگم اس کے رونے سے متاثر ہو کر اس کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیر کر اپنے آنسو ضبط کرتے ہوئے)

بیٹی خدا سے لو لگاؤ، وہی مشکل کشا ہے۔ وہی ہر مشکل آسان کرے گا۔

وفادار: (آنسو پونچھ کر ہچکیوں پر قابو پا کر) خدا ان گوروں کا ستیاناس کرے۔ کم بختوں نے شریف اور شریر کا فرق ہی مٹا دیا ہے۔

امراؤ بیگم: وہاں اور وہاں نے نیک و بد میں کبھی فرق کیا ہے؟ بس خدا ہی اپنے محفوظ رکھے تو ان سے چھٹکارا ہو۔

وفادار: لیکن بیگم صاحبہ! سرکار کو کبھی اس ہنگامے سے واسطہ نہیں رہا۔ کبھی کبھی قلعے جایا کرتے تھے سو وہ بھی مجبوری میں کہ بادشاہ سلامت کا حکم تھا۔

امراؤ بیگم: خدا پر نظر رکھو بیٹی اور دعا کرو کہ خدا ان کو اپنے حفظ و اماں میں رکھے، اور سلامتی سے واپس لائے۔

وفادار: گورے کیا ہیں، قہر الٰہی ہیں۔ سنتی ہوں سارے شہر کو ملیامیٹ کر دیا ہے۔

(کلیان داخل ہوتا ہے۔ دھوتی باندھے ہے اور سر پر ایک لمبی سی چوٹی ہے۔ بغل میں کپڑے میں لپٹی ہوئی ایک بوتل اور کاندھے پر بورا ہے۔ بورا زمین پر رکھ کر کپڑے میں لپٹی ہوئی بوتل اس پر رکھتا ہے اور امراؤ بیگم کی طرف دیکھ کر آنکھوں میں آنسو بھر کر)

کلیان: بیگم صاحبہ! ابھی میں نے دیکھا کہ سرکار کچھ گورے سپاہیوں کے ساتھ

(آواز رندھ جاتی ہے اور اپنی آستین سے آنسو پونچھتا ہے۔ امراؤ بیگم اس کی طرف دیکھ کر پریشانی کے لہجے میں)

امراؤ بیگم: بھئی تم لوگ مجھے دیوانی بنا کر ہی دم لوگے۔ (چند سیکنڈ خاموش رہ کر) کدھر جا رہے تھے وہ لوگ؟

کلیان: حاجی قطب الدین سوداگر کے مکان کی طرف۔ وہیں کچھ گوروں کا کیمپ ہے۔

امراؤ بیگم: تیری ان سے بات چیت ہوئی؟

کلیان: جی نہیں، میں خود نظر بچا کر چلا آیا کہ دیکھوں کیا بات ہے۔ کچھ تدبیر کروں۔ (امراؤ بیگم خاموش رہتی ہیں۔ کلیان کچھ سوچ کر) اگر آپ حکم دیں تو میں پنڈت شو جی رام یا منشی ہیرا سنگھ جی کی خدمت میں جاؤں۔ شاید وہ کچھ تدبیر کر سکیں۔

امراؤ بیگم: (سوچتے ہوئے) وہ بھی ایسے وقت میں گھر سے کیوں نکلنے لگے۔

کلیان: بیگم صاحبہ! مسلمان کی شکل دیکھ کر گورے گولی مار دیتے ہیں مگر ہندو سے کچھ زیادہ مار پرس نہیں کرتے۔ اسی لئے تو گنگے سر پھرتا ہوں کہ چوٹی نظر آتی رہے۔ اور ہاں بیگم صاحبہ، ان گوروں نے میاں کالے صاحب کے گھر میں تو ایسی جھاڑو پھیری ہے کہ ایک تار تک نہ بچا ہوگا۔

امراؤ بیگم: (گھبرا کر) کیا کہتا ہے کلیان! وہ تو مذہبی آدمی ہیں۔ ان کو اس ہنگامے سے کیا نسبت؟

کلیان: سچ کہہ رہا ہوں بیگم صاحبہ۔ میں ادھر ہی سے آرہا ہوں۔ ساری حویلی کھنڈر سی ہوئی ہے۔

امراؤ بیگم: الحمد للہ علیٰ کل حال۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) جانے کون سے گناہ کئے ہیں جس کی سزا مجھے یوں مل رہی ہے۔

کلیان: بیگم صاحبہ، ایک میاں کالے صاحب ہی کا کیا رونا، سارا شہر کھنڈر بن چکا ہے۔

(امراؤ بیگم خاموش رہتی ہیں۔ تھوڑی دیر بعد میرزا غالب چہرے پر پریشانی مگر ہونٹوں پر مسکراہٹ لئے داخل ہوتے ہیں۔ میرزا غالب کو دیکھ کر امراؤ بیگم کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں اور بے اختیار ان کی زبان سے نکلتا ہے)

امراؤ بیگم: خدا تیرا لاکھ لاکھ شکر و احسان ہے۔ (میرزا کی طرف دیکھ کر) آپ کو کوئی صدمہ تو نہیں پہنچا؟

(میرزا غالب گاؤ تکیے سے لگ کر بیٹھ جاتے ہیں اور مسکراتے ہوئے)

میرزا غالب: ے تھی خبر گرم کہ غالبؔ کے اڑیں گے پرزے



دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

بیگم! واللہ آج تو میرے آدھے مسلمان ہونے نے میری جان بچالی۔

امراؤ بیگم، خدا نا پسند کرے کسی اور وقت کے لئے اُٹھا رکھئے۔ اس وقت تو یہ کلماتِ کفر زبان سے نہ نکالیے۔

مرزا غالب، عقل کا سدہ ہوں، سچ بیگم۔ جھوٹ نہیں بولتا۔ اگر پورا مسلمان ہوتا تو نواب احمد بخش خاں کی بھتیجی اور الٰہی بخش خاں معروف کی بیٹی آج بیوہ ہو گئی ہوتی۔

انا للہ و انا الیہ راجعون (امراؤ بیگم دروازے کی طرف مڑتی ہیں) واللہ بیگم کہاں تشریف لے جا رہی ہیں، امرِ واقعہ تو سنتی جائیے۔

امراؤ بیگم، میں شکرانے کا دوگانہ ادا کر لوں، پھر حاضر ہوتی ہوں۔

مرزا غالب، دوگانہ بھی ادا کر لیجئے گا۔ اب سنئے، جب میں کرنیل براؤن کے سامنے پیش ہوا تو اُس نے میرے سر پر سیاہ پوستین کی چوگوشہ ٹوپی، ایک برکا سفید پاجامہ، سفید ململ کا انگرکھا اور اس پر یہ قبا دیکھ کر کہا، ویل تم مسلمان ہے؟ میں نے کہا ہاں آدھا۔ اس پر وہ حیران ہوا اور کہا۔ آدھا کیسا؟ میں نے کہا شراب پیتا ہوں، سؤر نہیں کھاتا۔ وہ مسکرایا اور باعزت میری رہائی کا حکم دے دیا۔ اب فرمائیے، پورے مسلمان کو یہ سعادت نصیب ہوتی؟ کبھی انگریز قوم کی انصاف پروری کا قائل ہونا پڑتا ہے۔

(امراؤ بیگم مسکراتی ہیں اور پھر جانے کے لئے مڑتی ہیں۔

مرزا غالب انہیں دیکھ کر) بیگم ایک بات تو بتلائیے۔

امراؤ بیگم، (پلٹ کر مرزا غالب کو دیکھ کر) جی فرمائیے۔

مرزا غالب، (مسکرا کر) بیگم! کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ نے تمام زندگی جو نمازیں پڑھی ہیں، انہی میں سے دو رکعت میری رہائی کے نام پر وضع کرا دیں۔

امراؤ بیگم، (مسکرا کر) آپ بھی کیسی باتیں کرتے ہیں؟

(مرزا کی نظر بورے پر رکھی ہوئی بوتل پر پڑتی ہے بہت تیزی سے اُٹھ کر بوتل اُٹھاتے ہیں۔ کپڑے میں لپٹی بوتل نکال کر)

مرزا غالب، واللہ بیگم خدا مانگنے پر موت نہیں دیتا، مگر بے مانگے شراب ضرور دیتا ہے (بوتل کو غور سے دیکھ کر) اولڈ ٹام۔ (کلیان کی طرف دیکھ کر) کیوں بھئی کلیان اِس سب کی کیا تفسیر ہے؟

کلیان میں سامان لے کر دلال کے پاس گیا تھا، اُس نے سامان رکھ لیا اور کہا، رقم بلّے پر پہنچا دی جائے گی۔

مرزا غالب، اب دلال جائے بھاڑ میں۔ (بوتل اُوپر کر کے کلیان کو دکھلاتے ہوئے) میں اِس کی تفسیر پوچھ رہا ہوں۔

کلیان راستے میں واپسی پر لالہ مہیش داس مل گئے۔ انہوں نے آپ کو یہ تحفے میں بھیجی ہے (بورے کی طرف اشارہ کر کے) اور پنڈت شیو رام جی نے کچھ غلّہ ساتھ کر دیا تھا کہ آپ کو تکلیف نہ ہو۔

مرزا غالب، (امراؤ بیگم کی طرف دیکھ کر) قسم ذاتِ پاک کی بیگم اب سقر مقدر نہیں، بہشتِ جاودانی میرے نصیب میں ہے۔ کہیں آپ کیسے؟

امراؤ بیگم، (مسکرا کر) فرمائیے۔

مرزا غالب، عاصی ہوں، گنہگار ہوں۔ زندگی میں کوئی نیکی کا کام نہیں کیا، مگر اچھے دوست بنانے کا۔ دنیا میں جو میری بے کسی پر یوں رحم کھا کر کھانے کو غلّہ اور پینے کو شراب دیتے ہوں گیا وہ روزِ حشر کچھ اپنی نیکیاں میری جھولی میں نہ ڈال دیں گے کہ میں میزانِ عدالت میں رکھ سکوں اور خدا سے عرض کروں کہ میں ہوں روسیاہ نجات کا طالب غالب۔

(امراؤ بیگم کچھ دیر خاموش رہ کر)

امراؤ بیگم، کلیان خبر لایا ہے کہ میاں کالے صاحب کی حویلی کو گوروں نے ڈھا ڈالا۔

(مرزا غالب کلیان کی طرف دیکھتے ہیں)

کلیان، جی ہاں میں اُدھر ہی سے آ رہا ہوں۔ ساری حویلی اینٹوں اور پتھروں کا ڈھیر بنی ہوئی ہے۔

مرزا غالب، (ٹھنڈی سانس بھر کر) ایک میاں کالے صاحب کی



دلّی کا کیا رونا بیگم، سارا شہر کھنڈر ہے
ازراہِ احتیاط زبان نہیں ہلا سکتا، ورنہ
دلّی جو ایک شہر تھا عالم میں "انتخاب" اب کیا
ہے، یا تو اینٹوں کا ڈھیر، یا پتھروں کا انبار۔
ایک ہُو کا عالم۔

امراؤ بیگم، مگر میاں کالے صاحب کی حویلی!

مرزا غالب، (رات کاٹ کر، میاں کالے صاحب کی حویلی کس گنتی
میں ہے بیگم (ٹھنڈی سانس بھر کر، اگر کوئی سیاح
آئے تو دیکھے، چاوڑی، اجمیری دروازے کا بازار،
اُردو بازار، خلاصی بیگم کا کوچہ، خان داران کی حویلی،
اِن سب کے کھنڈر گیا پھرے اور کہے اِسی شہر کو
دلّی والے عالم میں انتخاب کہتے تھے؟

امراؤ بیگم مگر میاں کالے صاحب کی حویلی میں تو میں نے اپنے
قیمتی زیورات اور قیمتی پوشاکیں منتقل کر دی تھیں۔

مرزا غالب، (غور سے امراؤ بیگم کا چہرہ دیکھ کر کسی قدر پریشانی
کے لہجے میں) اور بیگم آپ نے اِس امر کی ہمیں اطلاع
تک نہیں دی؟

امراؤ بیگم، میں نے سوچا تھا کہ میاں کالے صاحب مذہبی آدمی
ہیں، نہ اُن سے باز پُرس ہوگی اور نہ کسی قسم کی دارو گیر۔
فسادی بھی اُن کے تقدس کی بنا پر اُن کا احترام ضرور
کریں گے اور یہ قیمتی اشیاء وہاں محفوظ رہیں گی۔

مرزا غالب، میرا دارو گیر سے بچ رہنا کرامت اسد اللّٰہی ہے مگر
یہ نقصان قہرِ الٰہی ہے۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر)
ــــ نہ لُٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا
رہا کھٹکا نہ چوری کا دُعا دیتا ہوں رہزن کو
(میرزا غالب خاموش فکرمند سے ہو کر بیٹھ جاتے ہیں
امراؤ بیگم اور وفادار آہستہ آہستہ چلی جاتی ہیں کلیان
حقّے کا لوٹا اُٹھا کر اُسی طرف چلا جاتا ہے۔ کچھ دیر
بعد کلّو دارو غہ آتا ہے۔ میرزا غالب کلّو کو دیکھ کر)
بھئی میاں کلّو! مجھ بوڑھے کو یوں ستانا کیا واجب
ہے۔ میں اپنی ہی فکر میں پریشان تھا، جو پلٹ کر دیکھا
ہوں تو میاں کلّو غائب۔ کیسی وحشت ہوئی
کہ الامان والحفیظ!

کلّو، بندہ پرور! میں نے سوچا فراش خانے کی
طرف سے سرسوں گلی سے ہوتا چلوں۔

مرزا غالب، (کسی قدر بے چینی سے) پھر میرزا یوسف کی کچھ خبر لائے؟

کلّو، ماما اور ملازم کو پریشان کر رکھا ہے۔ جب گولیوں
کی آواز سنتے ہیں، گھر سے باہر تشریف لے آتے ہیں
کل رات کچھ گورے گھر میں گھس آئے تھے۔

مرزا غالب، خدا اُس دیوانے کے حال پر رحم فرمائے۔ کوئی ناخوشگوار
واقعہ تو پیش نہیں آیا؟

کلّو، ماما اور ملازم کے گڑگڑانے پر اور تو کچھ نہیں کیا،
کچھ سامان ضرور اُٹھا کر لے گئے۔

مرزا غالب، الحمد للّٰہ علی احسانہ۔ اِس لوٹ کھسوٹ میں نہ شہرا
بھائی بچا، نہ چھوڑا۔ (چند سیکنڈ خاموش رہ کر)
بھئی ماما اور ملازم کو سمجھا دیا ہوتا کہ احتیاط
برتیں، کہیں خدانخواستہ . . .

کلّو، وہ دونوں خود اُن کی وجہ سے پریشان ہیں۔ دونوں نے
ڈیوڑھی میں بستر ڈال رکھے ہیں، مگر وہ ہیں کہ برابر
اُن سے باہر جانے کے لیے جھگڑا کرتے رہتے ہیں۔ ابھی
بھی جھگڑا کر رہے تھے۔

مرزا غالب، پھر ــــ؟

کلّو، بہزار دقّت اُنہیں اندر کیا۔ گورے ہیں کہ برابر
آس پاس منڈلا رہے ہیں۔ آس پاس کے کئی مکانوں
کو لوٹ چکے ہیں۔

مرزا غالب، میاں کلّو! کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ اُسے کسی طرح یہاں
لایا جا سکے۔

کلّو، سرکار! کوئی سیانا آدمی ہو تو احتیاط برتے اور چلا
آئے، مگر . . . .

مرزا غالب، مہاراجہ پٹیالہ کے آدمیوں سے گفتگو کرو، شاید وہ کچھ
تدبیر کر سکیں۔

کلّو، وہ کیونکر ساتھ جائیں گے۔ اُنہیں حکم ہے کہ وہ صرف



اس علاقے کی نگرانی کریں۔

مرزا غالب: نگرانی کیا خاک کریں گے۔ اُن میں اتنی جرأت تو ہے نہیں کہ باہر جاکر پانی ہی لا سکیں، بہرحال ہو سکتا ہے کہ وہ کچھ سخت گیری کریں اور دیوانہ جان سے نہ جائے۔

کلّو: آپ حکم فرماتے ہیں تو میں اُن سے بات کروں گا، بہت ممکن ہے، کوئی تدبیر نکل آئے۔

مرزا غالب: ہاں بھئی، مجھ پر یہ احسان کرو۔ واللہ یہ احسان خاص میری ذات پر ہوگا۔

کلّو: سرکار! احسان کیسا۔ زندگی بھر آپ کا نمک کھایا ہے اگر یہ جان بھی آپ کے کسی کام آئے تو سمجھوں جان کی قیمت پائی۔

مرزا غالب: کیا کہوں کہ جی اُسے دیکھنے کو کس قدر بے چین ہے، مگر از راہِ احتیاط گھر سے قدم نہیں نکال سکتا۔

کلّو: اِن گوروں کے لشکر نے تو فتنۂ دجّال کو بھی شرما دیا ہے۔ وہ قیامت ڈھائی ہے کہ ہر شخص نفسی نفسی چلا رہا ہے۔

مرزا غالب: (ٹھنڈی سانس بھر کر) میاں! یہ نہ گوروں کا فتنہ ہے اور نہ کالوں کا عذاب۔ یوم الحساب ہے کہ ہر ایک اپنے گناہوں کا حساب چکا رہا ہے۔

(میرزا یوسف کا بوڑھا نوکر گھبرایا ہوا آتا ہے۔ اس کے چہرے پر پریشانی اور وحشت ہے۔ میرزا غالب کو دیکھ کر)

نوکر: حضور سرکار!

(خاموش ہو جاتا ہے اور آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ میرزا غالب گھبرا کر کھڑے ہو کر نوکر سے بے چینی سے)

مرزا غالب: للہ میاں کچھ تو بولو۔ مجھ ستم رسیدہ کی زندگی یوں وبال نہ کرو۔

نوکر: حضور۔ سرکار۔ ایک گورے کی گولی سے

مرزا غالب: (ٹھنڈی سانس بھر کر) شہید ہوگئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر) میاں! یہ واقعہ کیونکر ہوا۔

نوکر: چند گورے گلی میں گھس آئے تھے۔ دھڑا دھڑ گولیاں چلا رہے تھے۔ میں نے ہرچند روکا مگر مجھ بوڑھے سے بے قابو ہو کر باہر نکل گئے اور ان کم بخت گوروں نے یہ سوچا کہ دیوانے آدمی ہیں، دھائیں دھائیں گولیاں چلا دیں۔

(میرزا غالب بے حد پریشانی کے عالم میں دالان میں ٹہلنے لگتے ہیں۔ کلّو کچھ دیر بعد)

کلّو: میں جاکر کچھ محلّے والوں کو جمع کرتا ہوں تاکہ ـــــ

مرزا غالب: ہے کون جو آوے گا۔ گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں۔

نوکر: میں نے پٹیالے والے سپاہیوں سے کہا تھا، اُن میں سے ایک کچھ لوگوں کو جمع کرنے گیا ہے۔

مرزا غالب: مگر آئے گا کون، "واقعہ سخت ہے اور جان عزیز"

کلّو: اگر کوئی نہ بھی آوے تو حضور کے نمک خوار تو ہیں۔

مرزا غالب: غسّال کہاں سے آئے گا۔ گور کفن کہاں نصیب ہوں گے۔ کفن کے لئے کون سرا پنی جان ہتھیلی پر رکھے گا (ٹھنڈی سانس بھر کر) لوگ اپنے رونق اور تباہی کے غم میں مرتے ہیں، مگر اس وقت جو غم مجھ کو ہے، اُس کو بیان بھی نہیں کر سکتا۔ زندہ ہوں مگر زندگی وبال ہے۔

(ایک سپاہی اور چند لوگ گھر میں آتے ہیں)

پہلا شخص: مرزا صاحب! ہمیں بے حد افسوس ہے کہ ـــــ خدا اس شہید کو جنت الفردوس عطا فرمائے۔

مرزا غالب: میاں، آپ حضرات آئے، میری عزت بڑھائی، یہ کیا کم ہے مگر

دوسرا شخص: آپ فکر نہ فرمائیں۔ ہم سے جو کچھ بن پڑے گا حتی المقدور اُس میں کوتاہی نہ کریں گے۔ ہم قبرستان جانے کی طرف جاتے ہیں، جو تدبیر بن پڑے گی وہ ضرور کریں گے۔

مرزا غالب: خدا آپ کو اس کا اجر دے گا۔ میرزا یوسف تو دیوانہ تھا، مگر میں تو ہوش و حواس میں ہوں۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ میں آپ کے ساتھ نہ چلوں۔

دوسرا شخص: آپ کا گھر سے نکلنا مصلحت وقت نہیں ہے آپ



بقیہ ڈرامہ حسرتِ تعمیر صـ۳۲۴

تشریف رکھئے اور ہمیں اجازت دیجئے۔

غالب: مگر میاں اس وقت عسال اور گور کن کا کہاں ہے اِنتظام

پہلا شخص: یہ فرائض تو ہم خود ہی انجام دے لیں گے، مگر مزار کا اس وقت ملنا واقعی امرِ محال ہے۔

مرزا غالب: (کلو کی طرف دیکھ کر) میاں کلو! بیگم سے کہو گھر سے سفید چادریں دے دیں (آنکھوں میں آنسو بھر کر) بالکل نئی ہی، پرانی چادریں ہی سہی (کلو گھر کے اندر چلا جاتا ہے۔ مرزا غالب سب لوگوں کی طرف دیکھ کر) واللہ حضرات آپ مجھ پر وہ احسانِ عظیم فرما رہے ہیں کہ تا زندگی نہ بھول سکوں گا۔

پہلا شخص: حضرت آپ کیا فرماتے ہیں۔ کیا ہم آپ کے مرتبے سے واقف نہیں اور پھر حقِ ہمسائگی بھی کوئی چیز ہے، ہم آپ کے احسانوں اور محبت کو کیونکر فراموش کر سکتے ہیں، جو آپ ہم پر فرماتے رہے ہیں۔

(کلو دو چادریں لے کر آتا ہے۔ مرزا غالب چادریں دیکھ کر)

مرزا غالب: میرا یوسف! یہ ۔کہا تیرا بھی کوئی بھائی تھا۔ جب موت آئے گی، تیرے پاس آ رہوں گا۔ اپنی بے کسی اور مجبوری کی کس سے داد چاہوں گا (سب لوگوں کی طرف دیکھ کر) حضرات! خدا حافظ۔

(سب لوگ آہستہ آہستہ چلے جاتے ہیں۔ غالب تنہا کھڑے رہ جاتے ہیں۔ کچھ دیر بعد امراؤ بیگم آہستہ آہستہ آتی ہیں۔ اُن کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔ مرزا اُنہیں دیکھ کر) آپ کی آنکھوں میں آنسو؟ بیگم! یہ شکر کا مقام ہے نہ شکایت کا۔ غالب رحمۃ اللہ علیہ کا یہ شعر کس قدر حسبِ حال ہے:

"ہو چکیں غالبؔ بلائیں سب تمام"

(ٹھنڈی سانس بھر کر گاؤ تکیے کے پاس بیٹھ جاتے ہیں اور خلاء میں گھورتے ہوئے)

"ایک مرگِ ناگہاں کچھ کیا انتظار ہے"

داغ لے کر جا رہے ہو ـــ"

غالب: یہ ٹھیک ہے، لیکن ـــ لیکن میں دنیا اور زندگی کی حقیقت کو پا چکا ہوں۔ حسرتوں اور ٹھوکروں کے باوجود میرا سر بلند ہے اور میں خیال کی روشن بلندیوں سے کائنات کو دیکھتا ہوں ـــ میں زندہ ہوں، میرا فن زندہ ہے، میرا شعور زندہ ہے۔ میرا جسم خاک میں مل جائے گا، لیکن میری آواز زندہ رہے گی۔ میری شاعری کی دھوم سارے جہاں میں ہوگی۔

آواز: ہا ہا ہا ـــ تمہارے خیالوں کے تیور اب بھی نہیں دبے ہیں، لیکن غالب دیکھو تو تمہاری جسمانی حالت کیا ہو گئی ہے۔ بیماریوں نے تمہیں بے جان کر رکھا ہے۔ ضعف کی حالت تو دیکھو، اُٹھنا بیٹھنا دشوار ہو گیا ہے۔ بصارت کی یہ حالت ہے کہ آدمی کو پہچانتے نہیں ہو۔ سماعت کا یہ عالم ہے کہ بات مکرر کہے بغیر نہیں سنتے ہو ـــ تم ڈھلتے سورج ہو غالب!

غالب: (متاثر ہو کر) ہاں ـــ ہاں یہ سچ ہے ـــ ہاں یہ سچ ہے!

[غالب کے جسم پر تھرتھری طاری ہوتی ہے، ہاتھوں میں رعشہ۔ دیوار کا سہارا لیتے ہیں۔ مشکل سے پلنگڑی پر آ کے بیٹھتے ہیں۔ کلو آتا ہے اور غالب کو پانی پلاتا ہے]

[کلو جاتا ہے۔ غالب تنہا رہ جاتے ہیں۔ ماتھے کو ہتھیلیوں سے سہارا دیتے ہیں۔ سوچتے ہیں۔ چہرے پر حسرت، آنکھوں میں موہوم سی اُمید]

غالب: [لہجے میں حسرت اور اُمید کا امتزاج]

کوئی دن گر زندگانی اور ہے ۔۔۔ اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے
آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں ۔۔۔ سوزِ غم ہائے نہانی اور ہے
بارہا دیکھی ہیں اُن کی رنجشیں ۔۔۔ پر کچھ اب کے سرگرانی اور ہے
ہو چکیں غالبؔ بلائیں سب تمام ۔۔۔ ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

ایک مرگِ ناگہانی اور ہے ـــ ایک ـــ مرگِ ناگہانی ـــ اور ہے!

[سر تکیے پر رکھتے ہیں۔ آنکھیں مُوند لیتے ہیں اور پردہ گرتا جاتا ہے]

[ختم]



خط جلدی ڈاک میں ڈالیے
تاکہ وہ اُسی روز نکل جائیں

ڈاک گھروں کے لئے سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ لوگ خط لیٹر بکس میں اُس وقت ڈالتے ہیں جب ڈاک گھروں کے بند ہونے کا وقت قریب ہوتا ہے۔ چنانچہ دن ڈھلے اُن کے ہاں کام کی بھرمار ہو جاتی ہے اور خطوں کے دیر سے پہنچنے کا امکان بڑھ جاتا ہے۔
اگر آپ اپنے خط وقت پر ڈاک میں ڈالیں گے، تو وہ اُسی دن نکل جائیں گے، اور بلا تاخیر اپنی منزل پر پہونچ جائیں گے۔

اپنے خط ابھی ڈاک میں ڈالیے، شام تک انتظار کیوں؟



بھارتی محکمہ ڈاک و تار

davp 68/484



نئی سخنوری

مذاکرۂ انتخاب

غالب : ایک گفتگو

عمیق حنفی • سید وقار حسین • شمیم حنفی

(یہ گفتگو عمیق حنفی کے مکان پر ۲۲ نومبر ۱۹۶۸ء کو ٹیپ ریکارڈ کی گئی۔ اس گفتگو کی ریکارڈنگ کے لیے شرکا، مس احمدی سلیم خان کے ممنون ہیں)

عمیق حنفی :- ڈاکٹر شمیم حنفی صاحب اور پروفیسر وقار حسین صاحب، تقریب یہ ہے کہ غالب کی صد سالہ برسی کے سلسلے میں بہت سی باتیں کہی اور لکھی جا رہی ہیں۔ اس سلسلے میں ہم تینوں کو بھی گفتگو کرنی ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ ہم لوگ اس موضوع پر یوں گفتگو کریں کہ خاص طور سے آزادی کے بعد ہم نے یہ دیکھا کہ اُردو کے جدید شعرا زیادہ سے زیادہ میر کی طرف راغب ہوئے اور میر کے طرزِ فکر اور شعور سے ایک ہم آہنگی کا احساس کیا اور کچھ دن بعد یہ چیزیں ختم سی ہو گئیں یعنی میر کا جو REVIVAL ہوا تھا ایک جگہ ختم ہو گیا اور اب غالب کا از سرِ نو REVIVAL شروع ہوا ہے۔ زیادہ سے زیادہ لوگ اس کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں۔ یہ صرف میں نے محسوس کیا ہے یا آپ بھی یہی محسوس کرتے ہیں؟

شمیم حنفی :- صاحب، میرے خیال میں ناصر کاظمی وغیرہ نے جس زور و شور کے ساتھ اپنی ابتدائی شاعری میں میر کو دریافت کیا اُس کی رفتار اِس لیے رفتہ رفتہ کم ہونے لگی کہ میر کی شاعری کا رجحان بنیادی طور پر داخلی تھا۔ اس رجحان میں عقل اور جستجو کے وہ عناصر شامل نہیں تھے جو غالب کے یہاں بہت واضح اور نمایاں ہیں۔ اس کے برخلاف فرار کی ایک خواہش اور گرد و پیش سے آنکھیں چرانے کا عنصر زیادہ نمایاں تھا۔ میرا خیال ہے کہ غالب نے اطمینانی جستجو اور تشکیک کی فضا سے زیادہ قریب ہے۔ اس فضا نے ہمارے زمانے کا احاطہ کر رکھا ہے، اور اسے اُسی وقت اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے جب ہماری آنکھیں محض اپنی ذات پر مرکوز نہ ہوں بلکہ کائنات کی رنگا رنگی کا جائزہ بھی لے رہی ہوں۔ چنانچہ ناصر وغیرہ نے بھی شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ ضرور محسوس کیا ہوگا کہ کسی ایک منزل پر، کہ حالی احساس کے سہارے شاعری زیادہ دنوں تک نہیں چل سکتی۔ میر سے ہم آہنگی کا جذبہ شاید اسی لئے دھیرے دھیرے کمزور پڑتا گیا۔ اب یہ سوال کہ غالب کا REVIVAL کیوں شروع ہو رہا ہے۔ اس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ ان کے عہد سے ایک گہری ہم آہنگی ہم اپنے زمانے میں محسوس کرتے ہیں۔ غالب جس زمانے میں سانس لے رہے تھے وہ قدروں کی شکست و ریخت کا تھا۔ اس وقت ایک بہت بڑی تہذیب مغلیہ حکومت اور اس کے تہذیبی اور فکری نظام سے عبارت تھی، مٹ رہی تھی اور اس کے ساتھ ہی ساتھ ایک نئی تہذیب ہندوستانی اُفق پر نمودار ہو رہی تھی۔ آج کی تہذیب اُس تہذیب کی ارتقائی شکل ہے۔ غالب نے اپنے زمانے میں



یہ بھی دیکھا کہ سائنس اور صنعت کی کرشمہ سازیاں انسانی تہذیب کے تانے بانے بدل رہی ہیں۔ اس کا عذاب و ثواب سب کچھ آج ہمارے سامنے ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ابھی یہاں پوری طرح مشینی تہذیب کا ظہور نہیں ہوا ہے لیکن اس کی چاپ تو اب بہت صاف سنائی دے رہی ہے۔ شاید اس لئے ہم غالب سے اپنے آپ کو زیادہ قریب پاتے ہیں۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انکے یہاں سامنے کی تمام اشیاء کو پرکھنے، جانچنے اور حیرت کے ساتھ ان کے بارے میں معصومانہ لیکن ذہین سوالات کرنے کا انداز ملتا ہے۔ یہی انداز نئے ذہن کی خصوصیت بھی ہے۔ غالب کی طرف زیادہ تیزی کے ساتھ ہماری توجہ کا سبب غالباً یہ بھی ہے کیوں وقار صاحب؟

وقار حسین: صاحب، میرا خیال یہ ہے کہ ہمارے یہاں کسی بھی شاعر کی طرف پیش قدمی یا اس کا REVIVAL اکثر کچھ جذباتی لہروں کے تحت ہوتا ہے اور ایسا بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ دو چار لوگوں نے تو واقعی کسی شاعر کے ساتھ کوئی ذہنی ہم آہنگی محسوس کی اور اس کی طرف بڑھے، اس کے رنگ میں اشعار کہے لیکن بہت جلد ایسا ہوا کہ کئی لوگوں نے اس شاعر کی تقلید کو صرف فیشن سا لیا۔ میر کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ میر کے سلسلے میں میرا خیال یہ بھی ہے کہ بعض شعراء نے اپنی IMAGE میر پر PROJECT کر دی اور انھوں نے اپنی تصویر میر کی تصویر میں دیکھنے کی کوشش کی، بلکہ یہ تک کیا کہ اپنے ذہن کی محدودیت، اپنے جذبات کی مہملیت اور اپنے سارے علاقائی، مذہبی اور سیاسی تعصبات کی بنیادیں میر کی شاعری اور شخصیت میں دکھانے کی کوشش کی۔ تھوڑے دنوں تک تو یہ سلسلہ جاری رہا لیکن پھر ختم ہو گیا کہ ایسے سلسلوں کو ختم ہی ہو جانا چاہیئے۔ جہاں تک غالب کے REVIVAL کا تعلق ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ کوئی REVIVAL نہیں ہے۔ چونکہ اس وقت ان کی صد سالہ برسی منائی جا رہی ہے اس لئے اس کا چرچا ہونا فطری ہے۔ میں تو نہیں سمجھتا کہ پچھلے چند برسوں میں ہم بطور خاص غالب کی طرف متوجہ ہوئے ہیں، بلکہ میرا خیال ہے کہ غالب سے ہمارا تعلق پچھلے سو سال سے مستقل چلا آ رہا ہے اور انھیں سمجھنے سمجھانے کی کوششیں ہمارے یہاں ہوتی رہی ہیں اور ہوتی رہیں گی۔

عتیق حنفی: شمیم صاحب! آپ نے اپنی گفتگو میں فرمایا کہ غالب کے زمانے میں جو تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں، وہ ہمارے زمانے کی تبدیلیوں سے کافی مماثل ہیں، اِس معنی میں کہ غالب کے زمانے میں ایک پرانی تہذیب ٹوٹ رہی تھیں اور بکھر رہی تھی۔ وہ قدروں کی شکست و ریخت کا زمانہ تھا اور ہمارا زمانہ بھی ایسا ہی ہے۔ آپ نے یہ بھی کہا کہ غالب کے زمانے میں ایک نئی تہذیب آنکھ کھول رہی تھی اور اس کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔ یہ باتیں بیشتر نقادوں نے اپنے مضامین میں کہی ہیں، لیکن غور طلب مسئلہ یہ ہے کہ واقعی وہ تبدیلی جو اس زمانے میں ہو رہی تھی۔ غالب تک ایک ذاتی اور شعری تجربہ بن کر پہونچ رہی تھی یا نہیں، کیونکہ جہاں تک میرا خیال ہے انگریزی تہذیب کا پورا تسلط اس وقت تک غالب کی دلّی اور غالب کے آگرے پر نہیں ہوا تھا۔ انگریزی تہذیب لکھنؤ تک اس وقت تک اِس شکل میں نہیں پہونچی تھی جیسی کہ کلکتہ میں تھی تو کیا محض کلکتہ کا سفر جو ایک نہایت مختصر سا واقعہ ہے، غالب کی زندگی میں اتنا اہم واقعہ تھا کہ اس نے غالب کی شاعری اور زندگی کو بدل کر رکھ دیا۔

شمیم حنفی: یقینی طور پر بات کچھ ایسی ہی تھی۔ یہاں میں یہ بھی کہنا چاہوں گا کہ ہمارے یہاں آزادی کے بعد جب میر کے REVIVAL کی آواز تیز تھی، اِس کا سبب یہ بھی تھا کہ فسادات کے بعد ہماری جو نسل جوان ہوئی اس نے سیاست کے اِس المناک عذاب کو بھگتنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی محسوس کیا کہ شاید انسان کی عقل اس کی تمام سیاست اور مادّی زندگی کے اعمال ایک عذاب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اِس لئے اُس سے دوری ہی سکون کا راستہ دکھا سکتی ہے۔ اِس لئے آزادی کے بعد ابھرنے والے بعض شعراء نے اپنی فکر میں ایسے رجحانات کو جذب کرنے کی کوشش کی جو انھیں ہوش کے بجائے غفلت کی طرف لے جا سکیں۔ اس کے برخلاف غالب نے دنیا کو آئینۂ آگہی کہا ہے۔ کلکتے کا سفر اُن کی زندگی میں ایک نہایت اہم واقعہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ حال سے زیادہ



مستقل کے شاعر تھے۔ یہاں وہ واقعہ بھی دہرایا جا سکتا ہے جب سرسید کی فرمائش پر انہوں نے آئینِ اکبری کی تقریظ لکھی تو اس میں سرسید کو صاف لفظوں میں یہ بھی بتایا کہ ہر زمانہ ایسا ایک آئین رکھتا ہے جس کے سامنے گذشتہ زمانے کا نظام اور قوانین پارینہ ہو جاتے ہیں۔ یہ باتیں ظاہر ہے کہ سرسید کو اس وقت پسند نہیں آئی تھیں۔ ہمارے ساتھ مصیبت یہ ہے کہ ہم سرسید کو مسلمانوں کے تہذیبی اور فکری نشاۃ ثانیہ کا پہلا قائد سمجھتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ اس سلسلے میں تاریخی اعتبار سے سرسید کے مقابلے میں غالب کا نام پہلے آنا چاہئے، کیونکہ ان کا ذہن سرسید سے پہلے جدید تہذیب کو خوش آمدید کہہ چکا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ غالب کی دلی اس وقت تک انگریزی تہذیب سے آشنا نہیں ہو سکی تھی۔ انگریزی حکومت کے قیام کے باوجود وہاں کی تہذیبی زندگی میں پرانے سیاسی نظام کے اثرات غالب تھے، لیکن ساتھ ہی یہ بھی واقعہ ہے کہ غالب نے انگریزوں کو محض ایک برتر سیاسی قوت کے بجائے ایک برتر اور ترقی یافتہ تہذیب کی علامت بھی سمجھ لیا تھا اور یہ عقیدہ بھی رکھتے تھے کہ اسے انہیں قبول کئے بغیر کوئی چارہ کار نہیں۔ سرسید اور ان کے حلقے کے لوگوں نے اس سلسلے میں بڑی انتہا پسندی کا ثبوت دیا جبکہ غالب نے توازن کو برقرار رکھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ غالب مغربی تہذیب کی حمایت کے باوجود اس کی عظمت اور شخصیت کا احساس رکھتے تھے اور انگریزوں کی تہذیب اپنی فکری برتری کے باوجود شخصیت سے خالی تھی۔ یہ کسی تعصب کی بنا پر نہیں کہہ رہا ہوں۔ پرسیول اسپیر اور متعدد مغربی مورخین نے بھی یہ بات کہی ہے۔ سب سے بڑی چیز یہ تھی کہ غالب اس وقت اپنی شخصیت کے بکھرنے کے احساس سے بھی دوچار تھے۔ چنانچہ ان کا وہ مصرع "میں ہوں اپنی شکست کی آواز" اسی حقیقت کا پتہ دیتا ہے۔ وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ نئے حالات میں انہیں اپنی شخصیت کی از سر نو دریافت کرنی ہے۔ یہی مسئلہ آج ہمیں بھی درپیش ہے۔ مظاہر کی دنیا سے گذر کر ہم بالآخر اپنی ہی ذات کی طرف واپس آتے ہیں۔ غالب نے بھی اس طرح مظاہر کی دنیا سے اپنا رابطہ استوار رکھا اور اپنی شخصیت کے احساس سے بھی غافل نہیں ہوئے۔ اس رویے نے انہیں نئے افکار کے معاملے میں بہت متوازن بنائے رکھا اور اسی لئے یاد ہیں ان سے ایک قربت محسوس کرتا ہے۔

وقار حسین صاحب! میں یہاں شمیم صاحب سے اختلاف کرتے ہوئے عرض کروں گا کہ غالب کو اپنی تہذیب کے بیتے کا المیاتی احساس تو یقیناً تھا لیکن نئی تہذیب کے خدوخال سے وہ پوری طرح آگاہ نہیں تھے۔ میرا خیال یہ ہے کہ انہوں نے نئی تہذیب کی بہت ہی سطحی تصویریں دیکھی تھیں۔ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ وہ صاحبِ ادراک تھے اور انہوں نے آنے والے دور کے بارے میں بہت کچھ سوچا ہوگا، لیکن انہوں نے کیا سوچا اور کیا محسوس کیا، اس کا کوئی واضح خاکہ ہمیں ان کی شاعری میں نہیں ملتا۔ میرا خیال یہ بھی ہے کہ نئی تہذیب کے قدم جمانے کا عمل غالب کے لئے کوئی باقاعدہ شعری تجربہ نہیں بن سکا اور ان کی شاعری میں ہمیں پرانی قدروں کے مٹنے کا جو احساس ملتا ہے وہ زیادہ اہم ہے۔

عتیق حنفی: اس کے معنی یہ ہوئے کہ آپ مجھ سے اتفاق کرتے ہیں۔

شمیم حنفی اس کے معنی یہ بھی نہیں ہوئے کہ آپ مجھ سے اختلاف کرتے ہیں۔

وقار حسین: میں یہ بھی کہوں گا کہ غالب نے جس شکستِ ذات کا احساس کیا ہے وہ کسی مخصوص زمانے کا مسئلہ نہیں ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ یہ انسان کا ازلی اور ابدی مسئلہ ہے۔ دنیا کے پہلے انسان سے آخری انسان تک یہ مسئلہ کسی نہ کسی صورت میں ضرور موجود رہتا ہے اور خارجی عوامل اس میں اتنا زبردست رول ادا نہیں کرتے جتنا کہ داخلی عوامل کرتے ہیں۔

عتیق حنفی: بے شک!

وقار حسین: اور جہاں تک غالب اور جدید ذہن کے تعلق کا سوال ہے تو عین ممکن ہے کہ بعض شعراء اپنے عہد کو غالب کے عہد سے ملا کر دیکھیں لیکن قدروں کی شکست، ایمان اور عقیدے کا فقدان، تشکیک، ذہنی اور جسمانی تھکن، یہ مسائل آج اپنی شدت پر ہیں۔



ہو چکے ہیں کہ دنیا کے تمام حساس اور باشعور لوگوں کا مسئلہ بنے ہوئے ہیں۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ لہر غالب سے اٹھی تھی اور براہ راست ہم تک پہنچی ہے۔ بالفرض یہ مان بھی لیا جائے کہ آج کی کشمکش کی ابتدا غالب کے یہاں دیکھی جا سکتی ہے، تب بھی میں یہ کہوں گا کہ جدید شاعر کو اپنے عہد کی پہنائی کا احساس دلانے میں اُس کے ذاتی فکر و احساس کے علاوہ مغربی ادیبوں کا بہت بڑا احسان ہے۔ پھر ——

شمیم حنفی، میں قطع کلام کی معافی چاہتے ہوئے کہنا چاہوں گا کہ انسان کی داخلی شخصیت بہر حال اُس کے خارجی حالات ہی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ یعنی اُس کی تربیت اور تنظیم میں ہم خارجی عوامل کی اہمیت سے انکار نہیں کر سکتے۔ غالب نے ظاہر ہے کہ غزل میں شعر کہے ہیں۔ اُن کی شاعری کی یہ بہت بڑی خصوصیت ہے کہ اُنہوں نے بے حد ایجاز و اختصار کے ساتھ اشاروں میں باتیں کہی ہیں، اِس لئے اُن سے کسی تفصیل کی توقع نہیں کر سکتے۔ پھر یہ کہ بنیادی طور پر غزل ایک داخلی صنف ہے، اس لئے نئی تہذیب کے مفصّل بیان یا رپورٹ کی توقع غالب سے کرنا غلط ہوگا۔ سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ غالب کا ذہن ہمیں اُس عہد کے دُوسرے شعراء کے ذہن سے بہت مختلف نظر آتا ہے۔ اُس زمانے میں ذوق، مومن اور شیفتہ بھی شعر کہہ رہے تھے۔ کسی کی توجہ محض صحتِ زبان کی طرف تھی۔ کسی نے حُسن و عشق کی حکایت ہی کو اپنا مستقل موضوع بنا لیا اور کسی نے یہ سمجھ لیا کہ مبالغہ سے پرہیز ہی اچھی شاعری کی ضمانت ہے۔ ایک ایسی فضا میں غالب کا اپنے عہد کے ادبی مذاق سے بالکل الگ ہو جانا جب کہ ظاہر ہے نشر و اشاعت کی سہولتیں بھی نہیں تھیں اور بس کچھ صحبتوں یا چھوٹے موٹے مشاعروں میں اپنی شاعری کو دُوسروں کے سامنے پیش کرنے کا موقع ملتا تھا، غالب کا ایک اہم کارنامہ ہے۔ بڑی بات یہ ہے کہ غالب نے عام مذاق کی پروا نہیں کی اور اپنے مخصوص رنگ کی پیروی کرتے رہے۔ اُن کے نزدیک اُن کا ذہن ہی سب سے زیادہ معتبر تھا اور یقیناً وہ اُس عہد کے لئے اجنبی تھا۔ یہی خصوصیت غالب کے ذہن کو ہم سے قریب کرتی ہے کیونکہ ہمارے اور اُن کے سوچنے کا انداز بڑی حد تک ایک ہی راہ کی نشان دہی کرتا ہے، اِس لئے میں نے یہ بات کہی تھی کہ غالب نے اپنے عہد کی تبدیلیوں کو اچھی طرح سمجھا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ اُن کی واقفیت محدود رہی ہو اور وہ سائنسی ایجادات یا مشینوں کی افادیت سے پُوری طرح واقف نہ رہے ہوں لیکن وہ یہ ضرور محسوس کر رہے تھے کہ یہ چیزیں ہماری شخصیت کی داخلی ہیئت پر بھی بڑی تیزی سے اثر انداز ہوں گی۔ آج بھی ہم یہی محسوس کر رہے ہیں۔

وقار حسین، ایک بات اور ہے۔ وہ یہ کہ تمام اچھے غزل گو شعراء کے یہاں خارجیت سے ایک طرح کی رُوگردانی اور خارجی اور ٹھوس تجربوں کو ایک طرح سے ABSTRACT کرنے کا رُجحان ملتا ہے۔ یہی رُجحان ہمیں غالب کے یہاں بھی ملتا ہے۔ میرا خیال کچھ ایسا ہے کہ غالب اور دُوسرے غزل گو شعراء یہ جانتے تھے کہ خارجی واقعات کی حیثیت مستقل نہیں ہوتی اور وہ اپنی ایک علامتی حیثیت تو یقیناً رکھتے ہیں لیکن اُن کی ٹھوس اور MATERIAL شکل بہت جلد فنا ہو جاتی ہے اِس لئے غالب اور دُوسرے تمام ممتاز غزل گو تمام خارجی تجربات کا رس نچوڑتے تھے اور اس سے جو ایک علامتی مفہوم اُن کے ذہن میں آتا تھا، اُسے دو مصرعوں میں سمو دیتے تھے۔ TEMPORAL کو ETERNAL میں دیکھنا اور دکھانا ہر فن کار کا سب سے بڑا کام ہے۔

شمیم حنفی، ہاں! تو یہی بات میں نے بھی کہنی چاہی تھی۔

وقار حسین، وہ تو ٹھیک ہے، لیکن جہاں تک تہذیب کے ادراک کا تعلق ہے، اِس سلسلے میں یہ عرض کروں گا کہ غالب نے اُس وقت شاید مناسب یہی سمجھا کہ ایک تہذیب کے مٹنے اور دُوسری تہذیب کے قیام تک جو عرصہ آتا ہے اُس میں بہتر یہ ہے کہ آدمی ان مسائل کے بارے میں سوچے جن کا تعلق کسی زمانے سے نہیں ہے۔

عمیق حنفی، صاحب! اصل میں ہم خواہ کتنا ہی نیا ذہن رکھتے ہوں یا کتنی ہی نئی شاعری کی بات کرتے ہوں، ہم سب لوگ جس زمانے



میں پڑھتے ہیں اور ہم جس طرز تعلیم [illegible] رہے ہیں، اس میں دو مختلف مکاتب فکر ہی کا دخل زیادہ ہے اور ان میں میں سمجھتا ہوں کہ سب سے اہم مکتب فکر ترقی پسند مسلک کا تھا۔ ترقی پسند نقادوں نے کسی بھی شاعر کی شخصیت کو اس کے ماحول کے ساتھ کچھ اتنا گڈمڈ کر کے ہمیں پڑھایا اور اس کے بارے میں ہمیں بتایا کہ ہم مجبور ہو جاتے ہیں کہ جب بھی کسی بڑی شخصیت کے فن یا شعور یا احساس کا جائزہ لیں یا اس کی فکر کا تجزیہ کریں تو ہم یہ دیکھنے لگتے ہیں کہ اس کا سماجی یا تہذیبی پس منظر کیا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ کسی بھی فن کار یا کسی بھی انسان کی شخصیت کی تعمیر میں اس کی تعلیم اور اس کا گرد و پیش بہت بڑا حصہ لیتے ہیں لیکن جہاں تک میرا خیال ہے، یہ محض ترقی پسند نقادوں کا ایک واہمہ ہے جس نے ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ واقعی ایک نئی تہذیب نے غالب کے زمانے میں یا ۱۸۵۷ء سے پہلے ہندوستان میں جنم لینا شروع کر دیا تھا اور غالب کی شخصیت اس سے بُری طرح متاثر ہوئی تھی یعنی وہ تمام تبدیلیاں جو ریل کے انجن کی شکل میں یا ڈاک اور تار کے محکمے کی صورت میں نمودار ہوئی تھیں اور جن کا ذکر ہمیں غالب کے یہاں کہیں کہیں مل جاتا ہے یا فارسی میں غالب نے لندن کے بارے میں "آئینِ اکبری" کی تقریظ لکھی تھی

تو بہ لندن کا ندران رخشندہ باغ شہر روشن گشتہ در شب بے چراغ

نغمہ ہا بے زخمہ از ساز آورند حرف چوں طائر بہ پرواز آورند

وغیرہ۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان باتوں کی اُن کی شاعرانہ شخصیت میں کوئی مستقل حیثیت نہیں ہے۔ اصل میں بنیادی چیز جو غالب کی طرف ہم بار بار لوٹتے ہیں، اس کا سبب یہ ہے کہ غالب نے جو بھی باتیں کہی ہیں وہ اپنی ذات پر محمول کر یا اپنی ذات کے آئینے میں دیکھ کر کہی ہیں۔ ایسی صورت میں وہ ہم سے شعوری طور پر یا فکری طور پر ہم آہنگ نہیں ہیں بلکہ اُن کا طرز احساس اور ہمارا طرز احساس تقریباً ایک ہے۔ اس میں شک نہیں کہ تہذیبی تبدیلیاں انہوں نے بھی دیکھیں اور ہم بھی دیکھ رہے ہیں۔ اصل میں انیسویں صدی کے نصف آخر کے بعد سائنس اور ٹیکنالوجی کی وجہ سے تبدیلی کی رفتار اتنی تیز ہو گئی کہ ہم جس چیز کو وسیلۂ رحمت سمجھنے لگے تھے، وہی آگے جا کر بلائے جان ثابت ہونے لگی۔ ہمارے عہد میں ایٹمی تہذیب نے جنم لیا۔ ہم نے دیکھا شروع شروع میں ہم کھوئے کھوئے رہ گئے۔ ایک تحیر ہم میں پیدا ہوا کہ بہت جلد وہ وقت آئے گا، جب ہمارے بیٹے یا پوتے یا نواسے چاند پر پکنک منایا کریں گے۔ اس طرح سے غالب نے کلکتے میں جس نئی تہذیب کی جھلک دیکھی تھی اور جس FEELING کا اظہار کیا تھا، اپنی شاعری میں، وہ محض ایک استعجاب کی FEELING ہے۔ یہ تمام باتیں محض عارضی چیزیں تھیں۔ ان سے غالب کی شاعری میں کوئی خاص تبدیلی واقع ہوئی ہو، یہ ضروری نہیں۔ غالب کی شاعری کا امتیاز یہ ہے کہ وہ ایک ORIGINAL ذہن رکھتے تھے، جو روایتی یا تقلیدی قطعی نہیں تھا اور نقال بھی نہیں تھا کہ فوراً کسی چیز کی عکاسی کر بیٹھے۔ وہ ذہن ایسا بھی نہیں تھا جو محض پرانے پن کی وجہ سے مرعوب ہو جائے یا محض نئے پن کی وجہ سے خائف ہو جائے۔ یہ صحیح ہے کہ انہوں نے اپنے ان فارسی اشعار میں ایسے ہی نئے پن کا اظہار کیا ہے۔ بہت مشہور شعر ہیں۔ بہت سے لوگوں نے اپنے مجموعوں پر بھی نقل کئے ہیں

پیامن میاور اے پسر سر رید آدر را نگر ہر کس کہ شد صاحب نظر دینِ بزرگاں خوش نہ کرد

اس میں شک نہیں کہ غالب نے دینِ بزرگاں کو خوش کبھی نہیں کیا۔ دوسرا شعر ہے

تو اے کہ محو سخن گسترانِ پیشینی مباش منکرِ غالب کہ در زمانۂ تست

اس کے معنی یہ ہیں کہ سخن گسترانِ پیشینی کی طرف نہ تو ان کا رویہ اتنا معتقدانہ تھا کہ وہ بالکل لکیر کے فقیر بن کر رہ جاتے۔ جو بزرگوں نے کھینچی تھی، اور نہ ہی اپنے ہم عصروں سے وہ بہت مرعوب تھے۔ تو غالب نے اردو میں اس شاعری کو ترویج



[illegible] میں اظہارِ ذات کی شاعری کہلاتی ہے اور یہ اظہارِ ذات اگر [illegible] صرف میر میں [illegible]

شمیم حنفی: اس میں شک نہیں۔

عمیق حنفی: ایسی صورت میں ہم لوگ اپنی ذات کا اظہار کرنا چاہتے ہیں اور شخصیت کی تلاش میں ہیں جیسے غالب تھے لیکن غالب بھی ہماری ہی طرح اس شخصیت کی تلاش اپنے گرد و پیش میں نہیں، اپنے ماحول میں نہیں، بلکہ اپنی ذات میں کرنا چاہتے تھے۔ تو یہ انفس و آفاق کا جو مسئلہ ہے یا وحدت الوجود کا جو مسئلہ ہے وہ غالب کی شاعری میں ایک شاعرانہ حیثیت رکھتا ہے فلسفیانہ حیثیت نہیں رکھتا یا ایک سیاسی حیثیت اس کی نہیں ہے ہم لوگ بھی سیاست سے ڈرتے نہیں۔ سیاست آج کے وقت کا سب سے بڑا عذاب ہے۔ یہ عذاب ہم لوگ نہیں لائے ہیں لیکن اسے ہمیں بھگتنا ہے اور ہم لوگ بھگت رہے ہیں۔ بہرحال سیاسی قسم کی شاعری جیسی کہ بعد میں شروع ہوئی، اس سے ہم لوگ بھی نالاں ہیں، یعنی کہ سیاست کے اشارے پر جس قسم کی شاعری کی جاتی ہے۔ غالب کے زمانے میں سیاست کی ایسی منظم، مربوط اور جماعتی صورت نہیں پیدا ہوئی تھی جیسی کہ ہم آج دیکھ رہے ہیں۔

شمیم حنفی: مجھے آپ کی بہت سی باتوں سے اتفاق ہے لیکن ایک بات میں یہاں اور بھی کہنا چاہوں گا کہ غالب نے ان تمام مسائل کو . . . .

عمیق حنفی: میں قطع کلام کی معافی چاہتا ہوں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ غالب کسی کلچرل مسئلے کا شاعر نہیں ہے۔

وقار حسین: اصل بات یہ ہے کہ ادب میں نظریاتی COMMITMENT کا مسئلہ ہمارے عہد کی پیداوار ہے۔ اس زمانے میں یہ مسئلہ تھا ہی نہیں اور اگر یہ مسئلہ پیدا ہوا تو اس صدی کی ابتدا میں، اور اسے جو سب سے زیادہ فروغ ہوا وہ ۱۹۳۶ء سے ہوا۔ آج کا شاعر چونکہ COMMITMENT سے گریزاں ہے اس لئے وہ قدیم شعرا سے زیادہ ہم آہنگی محسوس کرتا ہے۔ آج کے شاعر کو COMMITMENT سے گریزاں ہونا چاہئے یا نہیں یہ ایک الگ بحث ہے جس کا یہاں محل نہیں ہے۔

شمیم حنفی: میں آپ کی بات سے اختلاف نہیں کرتا، لیکن میں عرض کرنا چاہتا تھا کہ غالب نے ان تمام مسائل کا جائزہ بہرصورت ایک نیم فلسفیانہ زاویۂ نظر سے لیا تھا۔ یعنی اُن کی شاعری میں فکر کا جو عنصر ملتا ہے اُسے ہم کسی بھی صورت میں پس پشت نہیں ڈال سکتے۔

عمیق حنفی: میرا خیال ہے کہ یہاں لفظ فکر کا استعمال لفظ فلسفہ سے بہتر ہوگا کیونکہ غالب کا کوئی مربوط فلسفہ نہیں تھا۔

شمیم حنفی: زندگی کی طرف ایک رویہ تھا جو کسی بھی شخص کا ہو سکتا ہے۔ غالب زندگی کے تمام مسائل اور معاملات کے بارے میں ایک رائے رکھتے تھے اور یہ رائے اُن کے اپنے شعوری تجزیے کا نتیجہ ہوتی تھی۔ غالب کے سلسلے میں یہ بات بھی صحیح ہے کہ اُنہوں نے شاعری میں اپنا ایک نیا راستہ نکالنے کی کوشش کی۔ اچھی اور بڑی شاعری کا اپنے جی میں ایک معیار قائم کیا۔ تفتہ کو ایک خط میں اُنہوں نے یہ بات لکھی تھی کہ شاعری صنعت گری نہیں بلکہ معنی آفرینی ہے۔ نئے راستے کی تلاش کا جذبہ ان کے یہاں ہمیشہ بیدار رہا۔ خطوط نگاری میں بھی اُنہوں نے ایک ایسی تہذیبی فضا میں نیا راستہ پیدا کیا۔ جب اردو میں خط لکھنا بھی بہت سے لوگ علمی وقار کے منافی سمجھتے تھے۔ جدت کی ساری کوششیں غالب کے یہاں سوچے سمجھے منصوبے کا نتیجہ ہیں، اسی لئے میں یہ سمجھنے پر مجبور ہوں کہ غالب نے اپنے زمانے کے مسائل کا تجزیہ فکری زاویۂ نظر سے کیا۔ اور ان سے ایسے نتائج اخذ کئے جو اس عہد کے دوسرے شعرا کے لئے یقیناً نئے تھے۔



وقار حسین: غالب کے سامنے صرف اپنے زمانے کے مسائل ہی نہیں تھے۔ جن مسائل کا تذکرہ آپ کے یہاں ہے، وہ کسی ایک زمانے سے مخصوص نہیں ہیں۔ دراصل وہ مسائل [illegible]

عمیق حنفی: میرا تو خیال یہ ہے کہ وہ انسان کی ذات اور شخصیت سے متعلق مسائل ہیں۔

شمیم حنفی: یہ بات بالکل صحیح ہے۔ میں بھی اس سے متفق ہوں۔ غالب اور ترقی پسندوں میں فرق یہ ہے کہ ترقی پسندوں نے کائنات کے وسیلے سے ذات کو سمجھنے کی کوشش کی جب کہ غالب نے ذات کے وسیلے سے کائنات کو دیکھا۔ یہاں فرق یوں سمجھئے کہ MEDIUM [illegible] کے مقابلے میں ذات کے مرتبے کا۔

[illegible]: I AM INCLINED TO AGREE WITH YOU TO [illegible] لیکن ترقی پسندوں کے یہاں عرفانِ ذات یا شخصیت کی تلاش کا کوئی سوال ہی نہیں۔ وہ ایک خاص قسم کے اجتماعی نظام پر مُصر ہیں، جس میں فرد کی کوئی حیثیت نہیں رہ جاتی۔

[illegible] کہتا ہوں کہ غالب اپنی شخصیت کے احساس سے کبھی غافل نہیں رہے۔ یہ روایت انہیں میر سے ملی۔ میر بھی کبھی اپنی ذات یا نفسِ انفرادی کی طرف سے کبھی بے خبر نہیں رہے۔

وقار حسین: کیا اپنی انفرادیت اور شخصیت کا احساس خواجہ میر درد اور آتش کو نہیں تھا؟

شمیم حنفی: خواجہ میر درد اور آتش کے یہاں یہ احساس ضرور تھا، لیکن اس کی حیثیت عمومی تھی۔ اُن کا تعلق تصوف کے افکار سے جذباتی تھا اور غالب کا علمی۔ اسی لئے آتش اور درد کے یہاں انسان کی ذاتی شخصیت ایک بہت بڑے کل کا جزو بن جاتی ہے۔

وقار حسین: آپ کا مطلب یہ ہے کہ آتش اور درد کے یہاں COMMITMENT زیادہ مضبوط ہے؟

شمیم حنفی: ان کے یہاں COMMITMENT اپنی ذات کے بجائے ایک وسیع تر حقیقت سے ہے۔ ایسی حقیقت جس کا عرفان وہ اپنے شعرِ حیات کی تکمیل سمجھتے تھے۔

عمیق حنفی: میرا خیال ہے کہ درد صوفی شاعر تھے اور غالب تصوف پسند شاعر تھے۔ یعنی درد کا شخصی اور ذاتی مسلک ہی تصوف تھا اور وہ اس پر باقاعدہ عمل پیرا تھے۔ غالب تصوف میں ایک رُوحانی اور ذہنی کشش ضرور محسوس کرتے تھے اور یہ ایک بہت بڑا فرق ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ میر درد تو COMMITTED تھے تصوف کے مسلک سے۔ غالب کے یہاں اس قسم کا کوئی COMMITMENT نہیں پایا جاتا۔ غالب نے تصوف سے انسان دوستی کی قدر اخذ کی اور وحدۃ الوجود کا مسئلہ لیا اور اس بات کو شاعرانہ احساس کے ذریعے ثابت کرنے کی کوشش کی کہ یہ جُزو اور کُل کا سارا جھگڑا فرضی ہے۔

وقار حسین: آتش کے یہاں اپنی قلندری پر فخر کرنے کا جذبہ ملتا ہے۔

شمیم حنفی: یہ [illegible]۔ اس کے باوجود درد اور آتش کے شاعرانہ رویئے میں انفرادیت کی تڑپ اتنی واضح نہیں ہے جتنی غالب کے یہاں ہے۔ آتش کے یہاں اس انفرادیت کا احساس دراصل اُن کے لہجے سے پیدا ہوتا ہے۔ غالب کی خوبی یہ ہے کہ اُن کے یہاں آتش اور درد جیسا ڈوبنے کا انداز نہیں ملتا۔ ہر چند کہ وہ کائنات کو ایک ایسی وحدت سمجھتے ہیں جس میں اُن کی ذات [illegible] لیکن انہوں نے مظاہر اور موجودات پر شبہہ کی نظر بھی ڈالی ہے اور بیدل کی طرح سوالات بھی [illegible] مثال کے طور پر اُن کی وہ غزل

> جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود ۔ پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
> یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں ۔ غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے
> سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں ۔ ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے



شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے
نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہے

وغیرہ وغیرہ۔ یہ سوالات اس بات کا ثبوت دیتے ہیں کہ شاعر اپنے آپ کو کائنات کا ایک جزو سمجھنے کے باوجود اپنی ذات کے مطلب سے غافل نہیں ہے اور اس پر نہ صرف شبہے کی نظر ڈالتا ہے بلکہ اس سے باقاعدہ سوالات بھی کرتا ہے۔ یہ ایک قسم کی نفسیاتی جستجو کا اشاریہ ہے۔ یہی جستجو غالبؔ کی شخصیت کا انفرادی نشان ہے۔ ان اشعار میں انہوں نے بظاہر خدا کو مخاطب کیا ہے لیکن ان کے سوال کی گرفت میں خودی بھی آگئی ہے۔

وقار حسین: لیکن وہ کونسی چیز ہے جو غالبؔ کو میرؔ سے جدا کرتی ہے اور میرؔ کے مقابلے میں غالبؔ کا امتیازی نشان کیا ہے؟

شمیم حنفی: یہ سوال بہت اہم ہے وقار صاحب! میرؔ شعور کے اعتبار سے اپنے ہم عصروں میں سوداؔ سے بھی محدود شاعر تھے۔ غالبؔ تو سوداؔ سے بھی آگے ہیں۔

وقار حسین: آپ کا مطلب یہ ہے کہ میرؔ کا ذہنی اُفق اس قدر وسیع نہیں تھا جس قدر کہ غالبؔ کا؟

شمیم حنفی: میرؔ کے یہاں احساس کی سچائی اور گہرائی یقیناً زیادہ تھی۔

وقار حسین: اور اس معاملے میں وہ شاید غالبؔ سے آگے تھے۔

شمیم حنفی: جی ہاں لیکن احساس کی گہرائی اور شعور کی وسعت دو بالکل الگ چیزیں ہیں۔

وقار حسین: ELIOT نے انگریزی شاعری میں فکر و احساس کے جدا ہو جانے اور داخلیت اور خارجیت میں ربط ٹوٹ جانے کا ماتم کیا ہے۔ اس کا خیال یہ ہے کہ ساری قباحت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب فکر اور احساس دو مختلف چیزیں بن جاتے ہیں اور جب ظاہر کی دنیا کا باطن کی دنیا سے رشتہ باقی نہیں رہتا۔ ابھی آپ نے غالبؔ کے سلسلے میں بھی فکر اور احساس کا تذکرہ کیا ہے۔ ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ غالبؔ کے یہاں فکر اور احساس یک جان تھے یا نہیں اور انہوں نے باہر کی دنیا کا اندر کی دنیا سے ربط کس طرح قائم کیا تھا؟

شمیم حنفی: بات یہاں سے شروع ہوئی تھی کہ میرؔ غالبؔ کے مقابلے میں کیسا شعور رکھتے تھے۔ میرؔ خود نگر یا دوسرے لفظوں میں دُروں بیں تھے۔ قصہ مشہور ہے کہ اُن کے کمرے میں ایک دریچہ تھا جو ایک باغ میں کھلتا تھا، لیکن میرؔ کو اس باغ کے وجود کا غالباً علم تک نہ ہوا۔ انہوں نے اپنی ذات سے ماورا ہو کر دنیا کو دیکھنے کی کبھی کوشش نہیں کی، جب کہ اُن کے ہم عصروں میں سوداؔ نے اپنے گرد و پیش کی زندگی کا زیادہ دلچسپی اور گہرے تعلق سے مطالعہ کیا جس کا اندازہ ان کے بعض قصائد کی تشبیب اور آشوبِ روزگار سے متعلق اشعار سے ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ میرؔ کی شاعری احساس کے اعتبار سے زیادہ سچی شاعری تھی، لیکن وہ شاعری اتنی وسیع نہیں تھی۔ غالبؔ نے خارجی تجربات کو اپنی شخصیت میں اس طرح جذب کر لیا ہے کہ وہ ان کے احساس کا ایک حصہ بن گئے ہیں۔ بڑی شاعری کی یہ بھی ایک خصوصیت ہوتی ہے کہ کوئی خارجی تجربہ داخلی تجربے کی شکل اختیار کر لے۔ کیا خیال ہے عتیق صاحب آپ کا؟

عتیق حنفی: اس حد تک تو میں آپ سے متفق ہوں کہ غالبؔ کے یہاں شعور کی گیرائی اور احساس کی گہرائی ایک ساتھ ملتی ہے، لیکن میں بہت بڑا معتقدِ میرؔ ہوں اور میں سمجھتا ہوں کہ میرؔ کے یہاں بھی شعور اور احساس کا بہت ہی شاعرانہ اور فن کارانہ امتزاج ہوا ہے۔ مثلاً اُن کا وہ شعر "دل خرابہ جیسے دلّی شہر ہے"۔ دل کو وہ ہمیشہ دلّی مانتے تھے اور دلّی ہی اُن کی دنیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنی ذات کی شکست و ریخت اور باہر ہونے والی شکست و ریخت کو ایک ہی چیز سمجھتے تھے، لیکن یہ سچ ہے کہ میرؔ کے یہاں احساس کا غلبہ ہے اور غالبؔ کے یہاں شعور کا۔

شمیم حنفی: مطلب یہ ہوا کہ احساس اور فکر و شعور الگ الگ چیزیں ہو گئیں۔ !



وقار حسین: میرا خیال ہے کہ میر اور غالب کی عظمت اسی میں ہے کہ اُن کے یہاں فکر اور احساس دو مختلف چیزیں نہیں ہیں۔

عمیق حنفی: میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ غالب کے یہاں فکر، احساس اور شعور تینوں کا توازن ملتا ہے، جبکہ میر کے یہاں کہیں کہیں احساس فکر و شعور پر غالب آجاتا ہے۔

شمیم حنفی: اچھا، اس سلسلے میں آپ یہ بھی دیکھئے عمیق صاحب کہ سب سے بڑا فرق جو ہم میر اور غالب کو پڑھتے وقت محسوس کرتے ہیں، وہ یہ ہے کہ میر کے اشعار میں ہم اپنے آپ کو کھوتا ہوا پاتے ہیں، جب کہ غالب کے اشعار پڑھتے وقت [illegible] ہم اپنے آپ کو دریافت کر رہے ہیں۔ اس طرح ہمارے ذہن میں اپنی ہی ذات، ایک سوالیہ نشان بن جاتی ہے اور بہت کچھ جاننے اور سمجھنے کی خواہش اُبھرتی ہے۔ ایک خلش کا احساس بھی ہوتا ہے۔ یہ خلش غالب کے یہاں بہت نمایاں ہے۔ اُن کے یہاں ایک SPIRIT OF ADVENTURE کا بھی پتہ چلتا ہے، جس نے انہیں ایک جنت پر بھی قانع نہیں رکھا اور انہوں نے یہ شعر بھی کہا

[illegible] دوزخ کو بھی جنت میں ملالیں غالب   سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی

یعنی غالب وسیع تر فضاؤں کے متلاشی رہے، جب کہ میر کی توجہ اپنی ذات کے ہی حالوں سے کبھی الگ نہیں ہوئی۔ انہوں نے اپنی شخصیت کی باطنی دیواروں میں خود کو اس طرح سمیٹ لیا تھا کہ باہر کی دنیا اُن کی نظر میں کسی قدر حقیر بھی تھی اور وہی برتری کا احساس شاید اُن کے نزدیک دنیا کو وہ اہمیت بھی نہیں عطا کرتا تھا کہ وہ اُس کی طرف زیادہ توجہ کرتے۔ یہی سبب ہے کہ میر نے جو مرثیے لکھے ہیں اُن میں وہ دلگیری نہیں جو سودا کے مراثی میں ملتی ہے جب کہ داخلی کیفیتوں کے اظہار پر میر صاحب سودا سے زیادہ قادر تھے۔ اصل میں میر صاحب کی خود نگری نے خود اپنے غم کا احساس اُن کے اندر اتنا شدید کر دیا تھا کہ وہ کوئی بھی دوسرا غم اس سے بڑا اور برتر سمجھنے پر آمادہ نہیں تھے۔

عمیق حنفی: چونکہ بات سودا کی نکل چکی ہے تو میرا خیال ہے کہ سودا اور ذوق کی قسم کے شاعر۔۔۔

شمیم حنفی: آپ سودا اور ذوق کو ایک خانے میں نہ بند کیجئے۔

عمیق حنفی: معاف کیجئے مجھے آپ کی اس تاکید کے باوجود سودا اور ذوق کو ایک ہی خانے میں رکھنے میں کوئی تامل نہیں ہے کیونکہ ان میں بیشتر معاملات میں مماثلت پائی جاتی ہیں۔

وقار حسین: دونوں کی قماش ایک تھی، گو سودا ذوق سے بہتر شاعر تھے۔

عمیق حنفی: سودا اور ذوق کے اشعار دیرپا اثر نہیں چھوڑتے۔ شمیم صاحب! جو نکتہ آپ نے اپنی گفتگو میں پیدا کیا تھا کہ میر کے کلام میں ہم کھو جاتے ہیں اور غالب کو پڑھتے وقت خود کو دریافت کرتے ہیں، میں اُس کی داد دینا چاہتا تھا، لیکن بیچ میں عمل نہیں ہوا۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ میر کا کلام اتنا بڑا سمندر ہے کہ اُس میں غوطہ لگانے کے بعد آدمی بہت دیر ہی میں اُبھرتا ہے لیکن میر کا غم ذات اپنے اندر ایک کائنات سموئے ہوئے ہے، اِس میں بھی کوئی شک نہیں ہے۔

شمیم حنفی: احساس اور فکر کے سلسلے میں ہمارے سامنے ایک اور مسئلہ آتا ہے۔ غالب کے یہاں فکر کی تہہ در تہہ صورتوں کی وجہ سے پیچیدگیاں پیدا ہوگئی ہیں۔ میر کے یہاں ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ میر کی شاعری احساس کی شاعری ہے۔ اُن کا احساس گہرا، تیکھا اور شدید ہے، لیکن پیچیدہ نہیں ہے۔ غالب کی شاعری چونکہ فکر کی شاعری ہے، اِس لئے اِس میں ایسی الجھنیں پیدا ہوگئی ہیں کہ بعض اوقات انہیں سمجھنے کے لئے کسی قدر ذہنی ریاضت بھی درکار ہوتی ہے۔



ہر چند کہ غالب کی بہت سی شرحیں لکھی گئی ہیں لیکن آج بھی اُن کے اشعار کے مفاہیم پر اختلاف موجود ہے۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا غالب نے جان بوجھ کر اِس پیچیدگی کو راہ دی یا یہ اُن کے شعری عمل کا ایک فطری نتیجہ تھا؟

وقار حسین: میرا خیال یہ ہے کہ غالب کے یہاں جو پیچیدگی پیدا ہوئی یا جس ابہام کا ہمیں احساس ہوتا ہے وہ اس ہیئت کی وجہ سے ہے جس میں غالب نے شعر کہے۔ غالب نے اپنے اظہار کے لئے زیادہ تر غزل کے فارم کو چنا ہے۔ غزل میں دو مصرعوں میں بات مکمل کرنی پڑتی ہے۔ قافیہ اور ردیف کی قید بھی ہوتی ہے۔ اِس طرح اپنے مفہوم کو دو مصرعوں میں ادا کرنا غالب کے لیے بڑا دشوار کام تھا کیونکہ اُن کا احساس اور فکر اتنی منفرد تھی اور اُن کے یہاں اِس قدر وفور تھا کہ بعض اوقات اُن کے لئے یہ مشکل ہو جاتا تھا کہ وہ اپنے جذبے کو دو مصرعوں میں کس طرح بند کریں۔ اسی لئے میرا خیال ہے کہ باوجود عجیب و غریب فارسی ترکیبیں تراشنے کے، وہ کبھی کبھی ناکام رہے یا انہوں نے اتنے اختصار سے کام لیا کہ ابہام پیدا ہو گیا۔ غالب کے یہاں ابہام کا مسئلہ دراصل ہیئت کا مسئلہ ہے۔

عمیق حنفی: وقار صاحب معاف کیجئے گا، میں اِس سلسلے میں آپ سے اختلاف کروں گا۔ چونکہ غزل کے دُوسرے بہت سے شاعر ہیں مثلاً داغ اور جگر وغیرہ۔ یہ لوگ مقبولِ عام ہیں اور عوام الناس میں سمجھے جاتے ہیں، اس لئے میں یہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں کہ غالب کے یہاں ابہام غزل کی ہیئت کی وجہ سے ہے۔ اصل میں مَیں یہ ماننے کے لئے سِرے سے تیار ہی نہیں ہوں کہ غالب کے یہاں ابلاغ کا کوئی مسئلہ موجود ہے یا غالب کے یہاں ابہام ہے۔ میں غالب کے یہاں محض اشکال کو تو تسلیم کر سکتا ہوں کہ وہ مشکل شاعری ہے، دقیق ہے۔ ہر اُس شاعر پر ابہام اور اہمال کا الزام اُس کے معصروں نے یا بعد میں آنے والے چھوٹے ذہن کے لوگوں نے لگایا ہے، جو اُسے سمجھ نہیں سکے۔ ہر اُس شاعر پر جس نے جدت پسندی یا روایت سے بغاوت کی، یہ الزام لگایا گیا ہے۔ مثال کے طور پر میر کو بھی دقیق شاعر کہنے والے لوگ اُس کے زمانے میں موجود تھے اور آج بھی موجود ہیں۔ غالب پر بھی یہی الزام عائد ہوا اور اقبال پر بھی اور آج تمام نئے شاعروں پر بھی یہی الزام عائد کیا جاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ابلاغ کا مسئلہ فکر و احساس کے مسئلے سے جُڑا ہوا ہے۔ جب تک قاری یا سامع اور شاعر کے احساس میں کوئی رابطہ نہیں پیدا ہوتا یا قاری یا سامع شاعر کے احساس میں شرکت نہیں کرتا، اُس وقت تک شاعری سمجھ میں نہیں آئے گی۔ مثلاً غالب کا ایک شعر ہے جسے تقریباً تمام شارحین نے مہمل قرار دیا ہے۔ وہ شعر یہ ہے۔

یوں بدگماں ہے مجھ سے کہ آئینے میں مرے
طوطی کا عکس سمجھے ہے زنگار دیکھ کر

یہ شعر مجھے مہمل نظر نہیں آتا۔ اِس میں کلیدی الفاظ ہیں بدگماں، طوطی، آئینہ اور زنگار۔ اصل میں یہ شعر لفظوں کا شعر ہے۔

وقار حسین: یہ شعر بہرحال مہمل نہیں ہے۔

عمیق حنفی: مہمل نہیں ہے، لیکن بڑا شعر بھی نہیں ہے۔

شمیم حنفی: میرا خیال ہے کہ وقار صاحب کا یہ مطلب نہیں تھا کہ غالب کے یہاں کسی قسم کا اہمال ہے۔ انہوں نے کہا تھا کہ غالب کے یہاں پیچیدگی ہے اور یہ پیچیدگی ہیئت کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے اِس لئے کہ غالب کی فکر بہت وسیع تھی۔ آپ نے عمیق صاحب! موازنہ داغ اور جگر سے کیا اور کہا کہ یہ لوگ بھی غزل گو ہیں، پھر اُن کے اشعار کیوں مبہم نہیں ہیں؟ میرا خیال ہے کہ اِس قسم کے شعرا کے یہاں خیال اور جذبہ اس قدر محدود ہوتا ہے کہ اُسے سمجھنے میں دشواری بھی نہیں ہوتی اور وہ بڑی آسانی سے دو مصرعوں میں سما بھی جاتا ہے۔ غالب جو کچھ سوچتے اور محسوس کرتے تھے کبھی کبھی الفاظ اس کے متحمل نہیں ہو پاتے تھے۔



وقار حسین: غالب کو جو تنگنائے غزل کی شکایت تھی۔ ہیئت کے سلسلے میں ایسی کہی ہوئی بات میں ایک اضافہ اور کرنا چاہوں گا، وہ یہ کہ غالب کے کلام میں ایک بہت بڑا حسن غزل کی ہیئت کی وجہ سے پیدا ہوا اور اُن کی بیشتر فن کاری بھی اسی ہیئت کے توسط سے نمایاں ہوئی۔ دو مصرعوں کی شرط کڑی تھی، لیکن غالب جیسے مرد میداں نے ہارنا سیکھا ہی نہیں تھا۔ وہ اپنے بھرپور فکر و احساس کو غزل میں سمونے کے لئے سر دآزما ہوگئے اور اس طرح اُنہوں نے ایک فنی جہاد کیا۔ غالب کو اگر غزل کے بجائے کوئی اور وسیع فارم مل جاتا تو عین ممکن تھا کہ اُن کی شاعری کے کئی قابلِ قدر فنی پہلو ہمارے سامنے نہ آتے۔

شمیم حنفی: پیچیدگی دراصل غالب کے موضوعات میں بھی تھی۔ میر نے بھی غزل ہی میں شعر کہے لیکن اُن کے یہاں ایسی کوئی الجھن نہیں ہے، کیونکہ اُن کا سوچنے اور محسوس کرنے کا طریقہ اور فکر و احساس کا دائرہ غالب سے مختلف تھا۔

عمیق حنفی: پیچیدگی اصل میں بات میں نہیں ہوتی بلکہ فکر و احساس میں ہوتی ہے جس کے لئے کبھی کبھی مناسب الفاظ نہیں ملتے تو شعر پیچیدہ ہوجاتا ہے۔

وقار حسین: لیکن کہنے والے کے لئے شعر پیچیدہ نہیں ہوتا۔

عمیق حنفی: میرا خیال ہے کہ اس میں دخل قاری یا سامع کی سمجھنے کی صلاحیت اور کوشش کو بھی ہوتا ہے۔ اُردو غزل کا ایک عیب یہ بھی ہے کہ وہ آسانی سے سمجھ میں آنے والی شاعری کے ضمن میں آتی ہے۔ اس طرح غزل کی شاعری ایک طرح کی CODES کی شاعری ہے۔

وقار حسین: جی ہاں، غزل کی علامتیں محدود ہیں۔

عمیق حنفی: غالب نے علامتوں کو نئے معنی پہنائے۔

وقار حسین: اور نئی علامتیں بھی وضع کیں۔

عمیق حنفی: نئی تلمیحات لائے، نئے اشارے کئے۔ اسی لئے اُنہیں سمجھنے میں کہیں کہیں دشواری ہوتی ہے۔ میں اسے ابہام کے بجائے اِشکال کہوں گا۔ ایک مثال میں اور دوں گا۔ میرے دوست محمد علی تاج نے ایک شعر کہا تھا:

واہ رے حسن سرِ راہ گزر   دل آشنا نظر آتا ہے مجھے

اس شعر پر بھوپال کے چند بڑے اساتذہ نے اعتراض کیا کہ یہ شعر بے معنی ہے۔ یہاں تک کہ آثر لکھنوی اور آسی گنوری اور شاید نوح ناروی سے فتوے منگائے گئے۔ اساتذہ کی اکثریت نے بے معنی شعر قرار دیا، کیونکہ اس شعر میں علم الکلام کے اصولوں کے مطابق نہ دلالتِ لفظی وضعی ملتی ہے نہ دلالتِ لفظی عقلی۔ میرا خیال ہے کہ یہ شعر بہت سیدھا سادہ ہے آپ لوگ بھی مجھ سے اتفاق کریں گے۔

وقار حسین / شمیم حنفی: بے شک!

شمیم حنفی: خیر، اُن لوگوں کی بحث چھوڑیئے جو شاعری کو پہاڑے یا حساب کے کسی سوال کی طرح سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ غالب کا معاملہ اس سے جدا گانہ ہے۔ مجھے یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ غالب نے اپنی انفرادیت کے اظہار کے لئے جان بوجھ کر بھی کچھ پیچیدگی پیدا کی۔ فارسی میں وہ سب سے زیادہ متاثر بیدل سے تھے جس نے عام روش سے ہٹ کر اپنا ایک نیا راستہ نکالا تھا، لیکن غالب کی پیچیدگی ہمارے بعض جدید شعرا کی پیچیدگی سے یقیناً مختلف ہے جو بہت عام اور معمولی باتوں کو اس لئے پیچیدہ بنا کر پیش کرتے ہیں کہ وہ عام نہ معلوم ہوں اور اہم سمجھی جائیں۔ انہیں شاید یہ



خوف ہوتا ہے کہ یہی باتیں اگر سادہ اور سہل انداز میں کہی گئیں تو اُن کی کوئی وقعت نہیں رہ جائے گی۔

وقار حسین: اس میں تو کوئی شک نہیں کہ غالب ایک منفرد اظہار چاہتے تھے اور اُن کا سوچنے اور محسوس کرنے کا طریقہ اُن کے ہم عصروں سے مختلف تھا، لیکن میرے خیال میں وہ ابہام کو شعوری طور پر شعر میں راہ دینے کے قائل نہیں تھے۔

عمیق حنفی۔ میرا بھی یہی خیال ہے کہ غالب کا اشکال بالارادہ یا مصنوعی نہیں ہے بلکہ فطری ہے۔

وقار حسین: میرا تو خیال ہے کہ غالب تو کجا، اُن کے بہت بعد تک بھی ابہام کو شعر میں جگہ دینا کوئی مستحسن فعل نہیں سمجھا جاتا تھا۔ یہ قصہ بہت بعد میں شروع ہوا۔ ابہام کو مسلک کی طرح اختیار کرنا کچھ ہمارے ہی زمانے کی خصوصیت ہے۔ اس سلسلے میں غالب کے ایک ہم قافیہ شاعر کی طرف اشارہ کافی ہے۔

شمیم حنفی: یہ صحیح ہے۔ غالب کے یہاں جو پیچیدگی ملتی ہے وہ عام طور پر اُن کے انفرادی شعری عمل کا پتہ دیتی ہے اور یہی بات انہیں اُن کے ہم عصروں سے الگ کرتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہم سیدھے سادے اور سپاٹ غزلیہ اشعار کو پڑھنے کے اتنے عادی ہو چکے ہیں کہ جب کبھی ہمیں کوئی شعر عام روش سے ہٹا ہوا نظر آتا ہے تو ہم اُسے پیچیدہ سمجھ بیٹھتے ہیں۔

عمیق حنفی: ابہام، اشکال، اہمال وغیرہ سب کا نفسیاتی جواز تو ہے، لیکن ابہام کو شعوری طور پر شعر میں برتنا یقیناً مستحسن نہیں ہے۔ اصل میں وہ شاعر جو ایک اوریجنل ذہن رکھتا ہے اور ORIGINAL احساس رکھتا ہے، جب اپنا شعری سفر شروع کرتا ہے تو اس کے سامنے اظہار کا مسئلہ ایک نہایت پیچیدہ شکل میں سامنے آتا ہے۔ پہلے پہل اس کا ذہن مروجہ تلمیحات، الفاظ اور علائم کی مدد سے اپنا اظہار کرنا چاہتا ہے۔ اس میں گڑبڑ پیدا ہوتی ہے۔ فکر و احساس ہوتا ہے نیا اور الفاظ ہوتے ہیں پرانے، جن کی پہلے سے ایک متعین معنوی فضا ہوتی ہے۔ لہذا نئے اور پرانے کا ایک ٹکراؤ ہوتا ہے۔ غالب کے یہاں ہی نہیں، بہت سے شعرا کے یہاں ابتدا میں کلام مشکل ہے لیکن رفتہ رفتہ زیادہ مانوس ہو جاتے ہیں اور سہل گوئی کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ ایسی صورت میں غالب کے ادبی سفر کی ابتدا میں یہ خواہش ضرور نظر آتی ہے کہ جو بات بھی کہی جائے، وہ نئی اور نئے ڈھنگ سے کہی جائے، لیکن چونکہ الفاظ کی نشست و برخاست اور دروبست سب پرانا تھا اور غالب کا زورِ فکر و احساس کی انفرادیت پر ہے اس لئے لفظ و معنی میں کہیں کہیں مکمل ہم آہنگی نہیں پیدا ہو پاتی۔

شمیم حنفی: ایسا اکثر ہوتا ہے عمیق صاحب! اس وقت مجھے ممتاز یاشی کے دو شعر یاد آ رہے ہیں۔

لپکا مرے خیال کا کوندا کچھ اس طرح
چاروں طرف جو لفظ پڑے تھے، پگھل گئے

اور

رنگوں کے اہتمام میں صورت بگڑ گئی
لفظوں کی دھن میں ہاتھ سے معنی نکل گئے

غالب کی ابتدائی شاعری کے بارے میں میں اب بھی یہی کہوں گا کہ وہاں اصل مسئلہ خیال کی وسعت یا لفظوں کی حد بندی کا نہیں تھا، بلکہ محض نئی راہ نکالنے کا شوق کارفرما تھا۔

عمیق حنفی: نہیں، خیال اور احساس بھی نیا تھا۔

شمیم حنفی: میں غالب کی شاعری کے اُس دور کا ذکر کر رہا ہوں جب اُن کے پاس کوئی بڑا خیال بھی نہیں تھا اور اُن دنوں وہ اس قسم کے اشعار کہہ رہے تھے ؎

شمارِ سبحہ مرغوبِ بتِ مشکل پسند آیا
تماشائے بیک کف بردنِ صد دل پسند آیا



ہوائے سیرِ گل آئینۂ بے مہریٔ قاتل
کہ اندازِ بخوں غلطیدنِ بسمل پسند آیا

میں اب بھی یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ اِن اشعار میں معنی کی کوئی ایسی دنیا آباد ہے جو اُس سے پہلے
دوسرے شعرا نے نہیں دیکھی تھی۔ گھسی پٹی باتیں ہیں۔ بس لہجہ انوکھا اور اُلجھا ہوا ضرور ہے۔
یہ رنگ تقلیدی سی ہے۔

وقار حسین: صاحب! غالب کی شاعری بہر حال اتنی مشکل نہیں جتنی بتائی جاتی ہے۔ بعض اوقات تو مجھے یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ میری فہم و فراست کا عجز اور میری کم کوشی ہے کہ غالب کے بعض اشعار پوری طرح میری سمجھ میں نہیں آتے۔ ایسا میں محض بر بنائے عقیدت نہیں کہہ رہا ہوں۔ مجھے ایسے ساں کی معروضی سچائی کا احساس دل اور دماغ دونوں کے واسطے سے ہوتا رہتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک بات اور بھی ہے۔ غالب جو IDIOM استعمال کرتے تھے میری مراد اُن کی شاعری [illegible] سے ہے تو ہمارے عہد کے IDIOM اور شاعری کے DICT ON سے کافی دُور ہٹ چکا ہے۔ غالب [illegible] پر فارسی کی بہت گہری چھاپ ہے اور اب ہمارے لسانی مذاق میں فارسی کو وہ دخل نہیں رہا، جو پہلے [illegible] اس لیے ہی بعض اوقات غالب کے شعر اجنبی لگتے ہیں۔

[illegible] شاعری میں تصنع کا گمان ضرور ہوتا ہے۔ وقار صاحب! میں آپ کی رائے سے اتفاق کرنے کے باوجود اِس دلچسپ حقیقت کو فراموش نہیں کر سکتا کہ جن لوگوں نے غالب پر مہمل ہونے کے الزامات عائد کیے، وہ فارسی سے بخوبی واقف تھے اور اُن کے مزاج میں بھی فارسیت کا غلبہ تھا۔

وقار حسین: خیر! غالب کے یہاں پیچیدگی اگر پیدا ہوتی ہے تو زیادہ حیرت نہیں ہونی چاہیے۔ کہ اُنہوں نے دو مصرعوں میں جو کچھ کہا ہے وہ بہت زیادہ ہے۔ حیرت تو اس بات پر ہوتی ہے کہ اب جب کہ ہم آزاد نظم لکھنے لگے ہیں اور ہم نے ہیئت کی بہت سی پابندیاں توڑ دیں تب بھی عالم یہ ہے کہ ابہام بے حد ہے اور اکثر کھودئیے پہاڑ نکلا چوہا ہے۔

عمیق حنفی: ابہام کی شکایت زیادہ ہوتی ہے۔ لوگ نہ جدید شاعری کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور نہ سمجھانے کی۔

شمیم حنفی: تو کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ نئی شاعری میں جب کہ ہم نے ہیئت کے سلسلے میں بہت سی آزادیاں لے لی ہیں، اِس قسم کا ابہام جائز ہے؟ میرا مطلب اُس ابہام سے ہے جس کی شکایت کچھ سمجھ دار لوگ بھی کرتے ہیں۔

عمیق حنفی: اگر ہے تو جائز نہیں ہے۔

وقار حسین: مگر اصولاً ابہام کم ہونا چاہیے تھا۔ ان تمام LIBERTIES کے بعد ابہام یقیناً کم ہو جانا چاہیے تھا۔

عمیق حنفی: ہُوا ہے، یقیناً کم ہوا ہے۔ میں غالب کے یہاں کسی ابہام کو سِرے سے تسلیم ہی نہیں کرتا۔ خیر اب ہم لوگ اِس مسئلے پر غور کریں کہ ایسا کیوں ہے کہ غالب جیسا مشکل شاعر روایت پسندوں میں بھی مقبول ہے، ترقی پسندوں میں بھی اور ہم لوگوں میں بھی۔

شمیم حنفی: صاحب! دراصل اچھی شاعری ہر اُس شخص کو پسند آتی ہے جو اُسے سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور بُری شاعری اکثر صرف اُس کے خالق ہی کو پسند آتی ہے۔ غالب کے سلسلے میں یہ بھی ہوا کہ بعض لوگوں نے فیشن کے طور پر یا محض کم علم اور بد مذاق کہے جانے کے خوف سے غالب شناسی کا اعلان کیا۔ یہ بھی ہوا کہ بعض لوگوں نے اپنے مسلک اور ذوق سے مطابقت رکھنے والے اشعار ڈھونڈ لیے اور انہیں کی روشنی میں غالب کو پوری طرح سمجھنے کا دعویٰ کر بیٹھے۔ [illegible] کسی بھی شاعر کو اِس طرح خانوں میں بانٹ کر سمجھنا اُس کے ساتھ ناانصافی ہے۔ سب سے بڑی بات [illegible] غالب کی شاعری ایک ایسا ذہن رکھتی ہے جو ہر زمانے میں اُن لوگوں کو اپیل کرے گا جنھیں شاعری میں



فکر کے ماہر کی تلاش رہتی ہے۔

عمیق حنفی: میرا خیال ہے کہ ترقی پسندوں کے لئے غالب اور میر کے ناموں میں ایک PROPAGANDA VALUE ہے یا مصلحت، ورنہ غالب جیسا SOPHISTICATED شاعر اور میر جیسا دروں بیں شاعر ان لوگوں کو کیسے پسند آسکتا ہے جو شاعری میں مبلغانہ خارجیت کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔

شمیم حنفی: ترقی پسندوں کے سلسلے میں غالب کا ذکر کرتے وقت میں آپ سے اختلاف کروں گا۔ اصل میں غالب کے یہاں جس کشمکش، انتشار اور بے اطمینانی کی پرچھائیاں ملتی ہیں وہ ایک جاگتے ہوئے ذہن کا پتہ دیتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف اندازِ نظر اور فکری رویے رکھنے والے ایسے لوگ جو شاعری کو ایک جاگتے ہوئے حساس اور فن کارانہ ذہن کی چیز سمجھتے ہیں اُسے پسند کرتے ہیں۔

وقار حسین: اصل میں غالب مہذب ذہن رکھنے والے لوگوں کا شاعر ہے۔ پھوہڑ یا بے سلیقہ لوگ اُسے سمجھنے کا دعویٰ ضرور کر سکتے ہیں اور عقیدت کا اظہار بھی کر سکتے ہیں، لیکن غالب کے مزاج اور زبان دونوں میں جو ایک مخصوص SOPHISTI-CATION تھا، اس تک رسائی ہر کس و ناکس کے بس کا روگ نہیں ہے۔ ہاں یہ ضرور کہوں گا کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ فعال اور مہذب ذہن رکھنے والے تمام لوگ ایک ہی مکتبِ فکر سے وابستہ ہوں یا زندگی کی طرف ایک ہی رویہ رکھتے ہوں۔ شعر فہمی سیاسی، علمی یا فلسفیانہ عمل نہیں ہے بلکہ بنیادی طور سے وجدان اور ذوق کا معاملہ ہے۔

عمیق حنفی: غالب کے یہاں کسی قسم کا کوئی COMMITMENT نہیں ہے۔ نہ مذہب سے نہ کسی فلسفے سے اور نہ کسی مخصوص طرزِ سیاست سے۔ سیاسی گروہ بندی تو اس وقت اس صورت میں موجود ہی نہیں تھی۔ یہ عذاب ہمارے وقت کا ہے۔ خیر اس بحث کو چھوڑا جائے۔ اب غالب کی شخصیت کے ایک اور گوشے پر باتیں کر لی جائیں۔ غالب کے یہاں اتنی فکری گہرائی اور سنجیدگی کے ساتھ ساتھ طنز اور ظرافت بھی تھی۔ حالی نے انہیں حیوانِ ظریف کہا ہے۔ غالب ایک مصرع میں بڑی سنجیدہ بات کرتے ہیں اور دوسرے میں اس کا مذاق اُڑا دیتے ہیں۔

وقار حسین: صاحب! میں تو یہ کہوں گا کہ غالب کا ایک نہایت قابلِ قدر وصف یہ تھا کہ وہ اپنے آپ پر ہنس سکتے تھے اور بڑے افسوس کی بات ہے کہ ہمارے بہت سے جدید شعرا اس وصف سے محروم ہیں۔

عمیق حنفی: یہ سچ ہے۔

شمیم حنفی: جی ہاں! غالب کے یہاں یہ بڑی توفیق کی بات تھی کہ انہوں نے اپنا مذاق بھی اُڑایا۔ اس طرح دراصل وہ اپنی شخصیت کا تحفظ کرنا چاہتے تھے۔ انہیں ہمیشہ یہ احساس رہا کہ اُن کی داخلی شخصیت زندگی کے خارجی مسائل سے پسپا نہ ہو سکے، اس لئے انہوں نے اپنی محرومیوں پر ہنسنے کی عادت بھی ڈالی۔

عمیق حنفی: غالب کے یہاں جو مزاح ملتا ہے وہ بہت اعلیٰ درجے کا ہے جو ایسے ویسے لوگوں کے سر سے گزر جاتا ہے۔ غالب کی ظرافت زیادہ تر طنز اور WIT کی ظرافت ہے جو بہت لطیف و ملیح ہوتی ہے۔

شمیم حنفی: غالب کے یہاں چھیڑ چھاڑ کے اشعار بھی کافی ملتے ہیں۔ مثلاً اُس غزل کے بعض شعر جس کی ردیف "پانوں ہے" یا یہ اشعار۔

لے تو لوں سوتے میں اُس کے پانوں کا بوسہ مگر — ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہو جائے گا

اور

میں گیا تھا واں تو اُن کی گالیوں کا کیا جواب — یاد تھیں جتنی دعائیں صرفِ درباں ہو گئیں

لیکن ساتھ ہی ساتھ ایسے اشعار بھی ہیں جن میں مزاح کے باوجود ایک اُداسی کی کیفیت بھی ملتی ہے۔ یہی کیفیت اُن کے



مزاح کو گہرائی عطا کرتی ہے اور وہ ہمارے لئے خالص مزاح نہیں رہ جاتا، بلکہ ایک لمحۂ فکریہ بھی ساتھ لاتا ہے ۔

مجھ تک کب اُن کی بزم میں آتا تھا دورِ جام ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں!

کیا اس شعر کے مزاح میں محرومی کی کسک نہیں ہے ؟

وقار حسین: اپنے آپ پر خلوص اور نیک دلی کے ساتھ ہنسنا اور گاہ بہ گاہ اپنی حماقتوں اور کوتاہیوں کا خوش دلی کے ساتھ اعتراف اور احساس دراصل خود شناسی کی بلند منزلوں میں سے ایک ہے۔ یہ منزل احتسابِ نفس، معروضیت SELFSACRIFICE اور SELFNEGLECT سے عبارت ہے لیکن عرفانِ ذات کی اِس منزل کے راستے میں خود ترحمی اور جھوٹی انا کا جنگل پڑتا ہے۔ غالب اِس جنگل کو عبور کر گئے۔ ہمارے کئی ترقی پسند شاعر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس جنگل میں کھو گئے اور بہت سے نئے شعرا ہنوز اس جنگل میں بھٹک رہے ہیں۔ غالب جیسا انانیت پسند شاعر اپنے آپ کو اِس رنگ میں بھی دیکھ سکتا تھا ۔

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا، مری جو شامت آئے اُٹھا اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

یا

میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہیئے غیر سے تہی سُن کے ستم ظریف نے مجھ کو اُٹھا دیا کہ یوں

اور اِس سے بڑھ کر ۔

چاہتے ہیں خوب رُویوں کو اسدؔ آپ کی صورت تو دیکھا چاہیئے

عمیق حنفی: نئے شاعر کا یہ مقدر اس لئے نہیں ہے کہ آج کے جو حالات ہیں وہ ہر لحظہ اُس کی ذات کا قیمہ بناتے رہتے ہیں۔

شمیم حنفی: غالب کا زمانہ بھی کچھ کم انتشار اور پراگندگی کا نہیں تھا۔

عمیق حنفی: بھائی صاحب! تلوار کے سامنے جی داری دکھانا اور بات ہے اور ایٹم بم کے مقابل رہنا اور بات۔ وہاں صرف شہر یا سلطنت کے غارت ہونے کا مسئلہ تھا، آج ساری دنیا کے غارت ہونے کا سوال ہے۔ اُس وقت صرف ایک تہذیب مٹ رہی تھی۔ آج ساری انسانیت خطرے کی زد پر ہے۔

شمیم حنفی: یہ صحیح ہے لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ تباہی اور بربادی کا ہر مظہر ایک اضافی حیثیت رکھتا ہے۔ غالب نے اپنے عہد کے انتشار اور کرب کو جس شدت کے ساتھ محسوس کیا تھا، ضروری نہیں ہے کہ آج کے انتشار کو ہر شخص اتنی ہی شدت کے ساتھ محسوس کر رہا ہو۔ پھر غالب بجائے خود اِس تباہی کا شکار ہوئے تھے اور اپنی ذاتی عزت، ملکیت اور روایت کے بکھرنے اور لٹنے کا دُکھ سہا تھا۔ اُن کے لئے یہ تجربہ شخصی اور ذاتی حیثیت بھی رکھتا تھا اور اجتماعی بھی۔

وقار حسین: غالب کا پیشۂ آبا سپہ گری تھا اور اُن کے عہد تک سپاہیانہ اقدار کی ایک اہمیت تھی جو ہمارے زمانے میں بڑی حد تک ختم ہو چکی ہے۔ یہ اقدار اُس زمانے میں شرفا کی امتیازی خصوصیات میں سے تھیں۔

عمیق حنفی: اس کا سبب یہ ہے کہ جنگ اُس وقت ایسی اجتماعی شکل میں نمودار نہیں ہوئی تھی جیسی کہ اب ہے اور سپاہی اُس دور میں ATHLETE کی طرح تھا۔ اب جب کہ جنگ کی حشر زا ہولناکی کا شعور آفاقی ہو گیا ہے اور کسی بھی جنگ کے دونوں فریق اس کی تباہ کاریوں کا مکمل احساس رکھتے ہیں، ایسی صورت میں سپہ گری کوئی عملی اور افادی قدر نہیں رہ گئی ہے۔

(باقی صفحہ ۴۸۲ پر دیکھئے)

مذاکرۂ دہلی

ذکرِ غالب

شرکاء : ڈاکٹر محمد حسن ۔ ڈاکٹر قمر رئیس ۔ ڈاکٹر بشارت ردولوی اور جناب شہاب جعفری ۔
جگہ : قیام گاہ شہاب جعفری ، اے دس ، ماڈل ٹاؤن ، دہلی ۹
تاریخ : سنیچر ۲۱ دسمبر ۱۹۶۸ء ، وقت ۲ ½ بجے سہ پہر ۔
ڈاکٹر بشارت ردولوی دیر سے پہنچے ۔ رسمی سلام دعا اور خیر و عافیت کے استفسار کے بعد مذاکرے کا آغاز اس طرح ہوا :

قمر رئیس : ایک صورت تو یہ ہے کہ ہم لوگ غالب کی کسی ایک یا دو تین غزلوں کو سامنے رکھ کر اُن کے تنقیدی تجزیے سے گفتگو شروع کریں ۔ میں نے میر کی بعض غزلوں کے ساتھ یہ عمل کیا تو بڑے اچھے نتائج برآمد ہوئے ۔ دوسری صورت یہ ہے کہ غالبیات پر تنقیدی نقطۂ نظر سے جو کچھ لکھا گیا ہے اس پر محاکمہ کیا جائے ۔ تیسری صورت یہ ہے کہ غالب اور عہدِ جدید پر گفتگو ہو ۔ اس ضمن میں بعض حضرات نے یہ بھی کہا ہے کہ غالب کے کلام میں صرف چار پانچ اشعار ایسے ہیں جو عصرِ جدید کی SENSIBILITY کے آئینہ دار ہیں ۔

شہاب جعفری : بھئی کمال ہے ۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ وہ سارا کا سارا جدید ہے ۔

قمر رئیس : ایک صورت یہ بھی ہے کہ غالب کے مقطعوں کا مطالعہ کیا جائے ۔

شہاب جعفری : ہاں یہ بھی دلچسپ ہوگا ۔ اس سے ذات کے بارے میں غالب کے تصورات کا علم ہو سکتا ہے ۔

قمر رئیس : ڈاکٹر محمد حسن صاحب ! آپ کا کیا خیال ہے ؟

محمد حسن : بھئی آپ لوگ اسی طرح بحث کرتے رہیئے ، میں تو لکھ رہا ہوں ۔ (قہقہہ)

قمر رئیس : یہ خوب رہی ۔ ایک صورت یہ ہے کہ ہم میں سے کوئی اُسے رومانی شاعر ثابت کرے اور دوسرا جدید ، تیسرا کلاسیکی ۔

شہاب : مگر تینوں کے رستے آخر میں جا کر مل جائیں گے ۔

قمر رئیس : کیونکہ شخص ایک ہے ۔

محمد حسن : ہم اس بات پر کیوں نہ گفتگو کریں کہ غالب میں کیا بڑائی ہے اور واقعی غالب عظیم ہیں بھی یا یہ محض ہمارا تعصب ہے ۔



ہاں آج کل سیاسی مصلحتوں کی سا پر بھی غالب کا چرچا بہت ہو رہا ہے۔ غالب کی عظمت کے بارے میں حکم لگانے کے لئے سب سے پہلے ہمیں اُس کی شاعری اور شخصیت کا جائزہ لینا اور اُس کے تصوّرِ حیات پر غور کرنا ہوگا۔

[illegible]: شاعری پر یا تصوّرِ حیات پر؟ سب سے پہلے کس سِرے سے شروع کرنا چاہیئے۔۔۔

قمر رئیس: شاعر کی عظمت کو پرکھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم پہلے اُس کے تصوّرِ حیات پر غور کریں۔

شہاب: یہ تو مسلّمہ ہے کہ وہ عظیم شاعر ہے۔

محمد حسن: کیوں؟

شہاب: اِس کی وجہ اُس کی مقبولیت ہے اور یہ کہ وہ دلوں کو چھُوتا ہے۔ دُوسری وجہ اُس کے تصوّرِ حیات میں مُضمر ہے۔ تیسرے اُس کے تخلیقی اظہار میں اور چوتھے اس کی شخصیت۔!

محمد حسن: شخصیت کیوں؟ اِس سے آپ کی مُراد یہ ہے کہ غالب کا کردار اور اس کی شخصیت میں جاذبیت ہے۔ یہاں ہم اپنی بحث کو صرف غالب کی شاعری تک محدود رکھیں تو اچھا ہوگا۔

شہاب: غالب کے کردار سے نہیں، میری مُراد غالب کے تخلیقی کردار سے ہے۔

قمر رئیس: یعنی کس حد تک وہ اپنی شاعری یا خطوط میں اپنے آپ کو نمایاں کر سکا ہے۔

محمد حسن: تصوّرِ حیات کے ضمن میں دو سوالات پر خاص طور پر غور کرنا ہے۔ ایک یہ کہ بعض لوگوں کو غالب کے کسی مرکزی تصوّرِ حیات ہی سے انکار ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ غالب کے کلام میں رُوحانی ہم آہنگی کی کمی ہے۔ ڈاکٹر عبداللطیف نے اِس تصوّر کو بڑی شدّت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ غزل گو شاعر کے ہاں یوں بھی کسی مرکزی تصوّرِ حیات کا پتہ لگانا آسان نہیں ہوتا۔ دُوسرا سوال یہ ہے کہ بالفرض ان کے ہاں کوئی تصوّرِ حیات موجود ہے تو وہ تصوّرِ حیات کس حد تک اُن کا اپنا ہے؟ ایسا تو نہیں کہ وہ مستعار ہو مثلاً بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ صوفی تھے اور ان کا تصوّرِ حیات متصوّفانہ تھا۔ یادگارِ غالب میں مولانا حالی نے بھی اِس پر زور دیا ہے کہ وحدت الوجود پر اُن کا ایمان تھا۔

قمر رئیس: میرا خیال ہے کہ اُن کی بنیادی عظمت تصوّرِ حیات ہی میں مضمر ہے۔ آپ اُسے فلسفہ نہ کہیں بلکہ ان کا اندازِ نظر کہیں اِس میں تضاد موجود ہے۔ غزلوں میں بڑا حصّہ ایسا ہے جو روایتی مضامین سے بھرا ہوا ہے۔ ان میں پرانے فارسی شعرا کے مضامین کو اُنہوں نے اپنے طور پر اور کہیں کہیں بہتر طور پر پیش کرنے کی کوشش کی ہے مگر ایسے اشعار بھی بکثرت ہیں جن میں بعض مضامین کی تکرار موجود ہے جس سے ان کے محبوب موضوعات اور تصوّرات کا اندازہ ہوتا ہے۔ دراصل انہیں کی روشنی میں غالب فہمی ممکن ہے۔ ان کی عظمت کا انحصار میرے نزدیک ان کی انسان دوستی پر ہے۔

محمد حسن: کیا یہ انسان دوستی اُن کے دور کے کسی اور شاعر کے ہاں بھی موجود ہے؟

قمر رئیس: کسی اور شاعر کے ہاں وہ اس طرح ڈوب کر نہیں آئی۔ صرف میر کے ہاں ہے اور دُوسرے کسی شاعر کے ہاں نہیں ہے۔ نظیر کے ہاں دل کو خون کرنے والی بات پیدا نہیں ہوئی ہے۔

شہاب: تصوّرِ حیات اور انسان دوستی کو ذرا الگ کر کے دیکھنا مناسب ہوگا۔ جہاں تک تضاد کا تعلق ہے میں نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ درد صوفی تھے مگر اُن کی شاعری صرف اُس سطح کی شاعری نہیں ہے جس طرح اقبال کے ہاں اسلام محض عقیدہ نہیں رہ گیا ہے ایک فلسفۂ حیات بن گیا ہے۔ غالب کے ہاں یہ مربوط نظامِ فکر درد سے مُستعار ہے۔ غالب کے ہاں مکمل فلسفہ نہیں ملتا مگر ایک مرکزی نقطۂ نظر ضرور ملتا ہے جو ہمیں محسوس کرا دیتا ہے کہ وہ انساں دوست



ہے۔ غالب کی پوری شاعری ایک مکمل نظم ہے اور ایک symmetry رکھتی ہے۔ اس کا مرکزی نقطہ خود اس کی شخصیت ہے۔

قمر رئیس: آپ کا فرمانا بجا، مگر بعض باتوں سے مجھے اختلاف ہے۔

شہاب: دو باتیں اور عرض کردوں۔ غالب کے زمانے میں معاشرہ زوال پذیر تھا۔ صوفی بھی درد کی طرح فنا فی اللہ کی طرف مائل ہونے کے بجائے فنا فی المحود ہو رہے تھے۔ ایسے حالات میں جس طرح درد کے ہاں عظمتِ آدم کا تصور ملتا ہے اسی طرح غالب کے ہاں بھی عظمتِ انسانی کا تصور موجود ہے۔

قمر رئیس: مگر دونوں کے انسان دوستی کے تصور میں بنیادی فرق ہے۔ دو چیزیں ایسی ہیں جو ان کے اس تصور کو سیراب کرتی ہیں ایک عقلی نقطۂ نگاہ، دوسرے مادی لذت پرستی۔ درد کے ہاں متصوفانہ، وجدانی اور الہیاتی نقطۂ نظر ہے۔ غالب زندگی کو اس کے بجائے عقلی اور مادی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔ مجروح کے نام ایک خط میں انہوں نے فقہ کا مذاق اڑایا ہے اور دوسرے عقلی علوم کی طرف توجہ دلائی ہے۔ خود غالب کی شخصیت میں مذہب اور تصوف سے زیادہ عقلی علوم کا عمل دخل رہا ہے۔

شہاب: سر سید کی آثار الصنادید پر بھی جو تقریظ انہوں نے لکھی اس میں بھی اسی بات پر زور دیا تھا کہ مُردہ پرستی چھوڑو اور نئے دور کی ترقیوں پر نظر کرو۔

قمر رئیس: عقل کی مدح و ستائش مثنوی ابرِ گہربار (ساقی نامہ) میں ہے۔ اور بھی کئی جگہ اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ میں کسی کو سنگ اٹھوکا نہ دیکھوں۔ یہ خیال یہ کرب درد بھی عقلی علوم کی دین ہے۔

محمد حسن: بھائی پہلی بات تو یہ ہے کہ ہم واقعی غالب کو کسی نقطۂ نظر کے لئے پڑھتے ہیں یا اس کے شعر کا جادو اس کے علاوہ کہیں اور بھی ہے۔ جہاں تک تصوف اور عقلی علوم کا معاملہ ہے انہیں درد کا مقلد کہنا تو دشوار ہے البتہ درد کی مثال ضرور ان کے سامنے موجود تھی۔ پھر تصوف میں مذہب کی تنگ نظری سے نکلنے کی کئی گنجائشیں ہیں اور ایسی منزلیں بھی آتی ہیں جو دہریت سے قریب معلوم ہوتی ہیں۔ پھر بھی کیا ہم کسی شاعر کو اس نقطۂ نظر کی وجہ سے پڑھتے ہیں؟

شہاب: ہم شاعر کو اس کی شاعری کی وجہ سے پڑھتے ہیں۔

قمر رئیس: مجھے اس سے اختلاف ہے، ہم نقطۂ نظر ہی کی وجہ سے پڑھتے ہیں۔ فیض کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ ان کی چھوٹی چھوٹی نظموں میں بھی ان کا نقطۂ نظر جھلکتا ہے۔

شہاب: اقبال اور ڈانٹے کے نقطۂ نظر سے اتفاق نہ کرتے ہوئے بھی ہم ان کی شاعری کو پسند کرتے ہیں۔ ڈانٹے رسول اللہؐ اور حضرت علیؓ کو اپنے طربیۂ خداوندی میں دوزخ کے ساتویں طبقے میں دکھاتا ہے لیکن اس کے انداز نظر سے اختلاف کے باوجود اس کا انکار ممکن نہیں کہ وہ اپنے دور کی زندگی کو اسی طرح PROJECT کر رہا ہے۔

قمر رئیس: یہ تو SUSPENSION OF DISBELIETY والی بات ہوئی، لیکن انسانیت دشمن نظریہ رکھنے والا کوئی شخص یقیناً بڑا شاعر نہیں ہو سکتا۔

محمد حسن: اب ذرا اس مسئلے پر ایک نئے زاویئے سے غور کریں۔ غالب نے اردو شاعری کی روایت کو میر اور نظیر کی منزل میں پایا، ان دونوں شاعروں نے عوامی بول چال، لب و لہجہ اور سادگی کو بھی اپنایا اور نظیر نے تو عوامی زندگی کی اس طرح عکاسی کی کہ شاعری کو عوامی سطح سے اس قدر قریب کر دیا کہ اس کی مثال دشوار ہے۔ لیکن غالب نے پھر اردو شاعری کو فارسی پیچ پر لا ڈالا اور میر اور نظیر کی ادبی روایت کو اس سمت میں بڑھایا۔ کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایک



...مقابلے غالب کے ہاں میر اور نظیر کا عمل الٹ دیا گیا تھا اور شاعری پھر پیچھے کی طرف لوٹ گئی ہے۔ اصل غالب کے زمانے کو دہنی قیادت کی ضرورت تھی۔ یہ ذہنی قیادت یا سمدھا کی ہی سمت ... کا کام میر اور نظیر کے بس کا نہ تھا۔ وہ اپنے دور کے علما اور فضلا کی صف میں شامل ہو گئے ... کچھ تو خاندانی وجاہت کے سبب سے جس پر وہ بار بار فخر کرتے ہیں کچھ اپنی بصیرت اور دانش کی بنا پر

قمر رئیس: اس زمانہ میں تین تحریکیں تھیں۔ ایک وہابی تحریک جس نے ایک الگ راہ نکالی تھی، جس سے وہ الگ رہے۔ دوسری خانقاہی تحریک۔ اس سے بھی وہ الگ رہے۔ تیسری انگریزوں کے خلاف تحریک جس سے وہ عملی طور پر الگ رہے۔ اس سے وابستہ لوگوں کے بارے میں مثلاً فضل حق کے بارے میں غالب کا خیال ہے کہ وہ مذہب کا غلو رکھتے تھے۔ ... اور یہی ان کی تباہی کا باعث ہوا۔ البتہ غالب کو اس کا احساس ضرور تھا کہ نئی اقدار پیدا ہو رہی ہیں۔ غالب خود کو ... وابستہ کرتے ہیں۔ البتہ یہ مسلّم ہے کہ وہ انہیں واقعی آگے بڑھا رہے تھے یا ان کے پیچھے، مگر یہ دوستی کا حد سے ...

شباب: ... دیکھ کر دیکھیں کہ ہمارا زمانہ بھی اتھل پتھل اور شکست و ریخت کا زمانہ ہے تو ایسا لگتا ہے کہ ایسا ہی زمانہ ... ایسے زمانوں میں شخصیتیں تین چار سطحیں رکھتی ہیں اور مختلف سطحوں پر ان کے مختلف APPROACH ... ایک سطح وہ ہے جہاں وہ پست اور نامناسب حرکتیں کرتا نظر آتا ہے۔ اشعار میں بھی گھٹیا پن ہے مثلاً ماہر ... کے پاؤں والی غزل۔ دوسری سطح وہ ہے جہاں خوشحال طبیعت اور عاشقانہ مستی اور شوخی نمایاں ہو جاتی ہے۔ تیسری سطح وہ ہے جہاں فلسفہ اور انسان دوستی ابھر کر سامنے آتے ہیں۔

قمر رئیس: لیکن ان کی انا تو ان تینوں سطحوں میں حاوی رہی ہے۔

شباب: اب ہم اس مسئلے پر آ جاتے ہیں۔ یہ الگ الگ دائرے ایک دوسرے کے اندر گم ہوتے ہوئے دائرے ہیں۔ INTE-LLECTUALLY ذہنی طور پر وہ خوشامد اور وظیفہ خواری دونوں کو غلو سمجھتا ہے۔ چنانچہ اس شعر میں بے پناہ طنز موجود ہے ؎

غالب وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا　　　وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

قمر رئیس: اگر وہ کسی نچلے طبقے میں پیدا ہوتے تو انہیں خوشامد کرنے یا ہاتھ پھیلانے میں ذلت محسوس نہ ہوتی، مگر ان کی ٹریجڈی یہ ہے کہ وہ امیر زادے تھے اور انہیں امرا و رؤسا کے آگے ہاتھ پھیلانے میں ذلت آمیز کرب محسوس ہوتا ہے۔ لیکن دھیرے دھیرے سفرِ کلکتہ کے بعد وہ انسان کے عام درد و کرب میں شریک ہونے لگتے ہیں۔ ان کی عظمت ابرِ گہربار کے آخری دو حصوں میں نمایاں ہوتی ہے۔

محمد حسن: سوال یہ ہے کہ غالب کے دور میں طبقوں کی نوعیت کیا تھی اور غالب کی ہمدردیاں کس طبقے کے ساتھ تھیں۔ دوسرے یہ کہ غالب کا تعلق میر و نظیر کی روایت سے کیا تھا۔ کیا انہوں نے عوامی سطح سے قریب ہونے کے عمل کو الٹ دیا؟ ہندوستان الگ الگ ٹکڑوں میں بٹ گیا تھا اور اگر انگریز نہ آتے تو شاید ہندوستان کے الگ الگ ٹکڑے ہو جاتے، مگر پورے ملک میں صنعتی انقلاب شاید نہ آتا اور یوں بھی ہندوستان میں جو کچھ صنعتی انقلاب کا اثر یورپ سے آیا وہ خود بھی پوری طرح سرمایہ دارانہ نہیں تھا بلکہ جاگیرداری اور سرمایہ داری کا مرکب تھا۔

قمر رئیس: ڈاکٹر عرفان حبیب نے اس زرعی انقلاب کی نوعیت اور اس کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے۔ زوال کا اصل سبب یہ تھا کہ پیداوار کرنے والے طبقے کو لوٹا کھسوٹا گیا تھا اور وہ طبقات ... (شارب ردولوی داخل ہوتے ہیں)



محمد حسن: آئیے شارب صاحب۔ بروقت آئے۔ دیر آید درست آید۔

قمر رئیس: تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ وہ طبقہ اب مدافعت کرنے لگا تھا اور اُس کے اندر بے چینی کے آثار تھے۔ غالب کے ہاں مغلیہ تہذیب کا سارا طمطراق جدت اور قیام ہے اور اُس کی رُوح میں اس دَور کے انسان کے دُکھ درد میں شرکت کا احساس موجود ہے۔

شارب: مگر سوال یہ ہے کہ یہی فارم اور یہی بات اس دَور کے دُوسرے شاعروں کے ہاں بھی ہے مگر وہ خصوصیت کیا ہے جو صرف غالب کے ہاں ہے۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ میر اور نظیر کی طرح براہِ راست عوام سے غالب اتنے قریب نہیں معلوم ہوتے۔

محمد حسن: میں ایک بات اور واضح کردوں، ایک زمانہ تو وہ تھا کہ اُردو میں لوگ محض تفریحاً شعر کہتے تھے اور اصل ذریعۂ اظہار فارسی کو جانتے تھے۔ پھر اُردو کو فارسی کی نہج پر ڈھالنے کا شوق پیدا ہوا۔ میر شاید پہلا بڑا شاعر ہے جو صرف اُردو کا شاعر تھا اور جس نے فارسی نہج پر ڈھالنے کے بجائے اُردو کا ایک الگ شعری آہنگ پیدا کرنے کی کوشش کی یہی بات نظیر کے بارے میں کہی جا سکتی ہے، لیکن غالب پھر اُردو کو فارسی آہنگ سے قریب لے جاتے ہیں۔ کیا یہ ترقیٔ معکوس نہیں ہے؟

شہاب: اِس سلسلے میں میر و نظیر ہی کو نہیں، ناسخ کے اثرات کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ غالب نے لکھنؤ کے دبستانِ شاعری سے بھی اثر قبول کیا ہے۔ ناسخ کے کلام سے غالب نے IMAGE کا استعمال بھی سیکھا۔

شارب: دراصل غالب نے اُردو شاعری کو عوام سے دُور کرنے کی کوشش نہیں کی۔ لوگوں کے ذہنوں پر فارسی کی شیرینی کا جادو تھا۔ گو اب اچھے اچھے ذہن اور سب لوگ بھی اِس سے لُطف نہیں لے پاتے تھے۔ کیونکہ فارسی دانی کا چرچا کم ہونے لگا تھا۔ غالب نے اِس صورتِ حال کو پرکھا اور فارسی کی شیرینی اور حسن کاری کو اُردو کے لباس میں پیش کرنے کی کوشش کی۔ اُن کی عظمت کے لئے صرف اتنا کافی نہیں ہے۔ دراصل اُنہوں نے بعض روایات سے انحراف کیا یا انہیں پہلے سے کہیں بہتر شکل دے دی۔ مثلاً تصورِ عشق غالب کے ہاں بالکل منفرد انداز رکھتا ہے۔ غالب نے اسے HUMANISTIC اور LIVING TOUCH دے دیا جو اس دَور میں نیا اور انقلابی تصور تھا۔ مثلاً ؎

اسدؔ بہارِ تماشائے گلستانِ حیات — وصالِ لالہ عذارانِ سرو قامت ہے

یا

خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار — کیا پوجتا ہوں اُس بتِ بیداد گر کو میں

عشق کا یہ تصور اس دَور کے لوگوں کے ہاں نہیں مل سکتا۔ بعض دُوسری چیزیں ہیں جن میں تفکر، گہرائی اور گیرائی کی گنجائش بہت کم رہ گئی تھی۔ بعض نئی چیزوں کا اثر قبول کیا اور اپنے مخصوص اسلوب اور DICTION کے ساتھ اُنہیں پیش کیا۔

قمر رئیس: کچھ خلط مبحث ہو گیا۔ دراصل شاعرانہ DICTION اور THOUGHT CANTENT فکری سرمایہ کا تعلق جداگانہ نوعیت کا ہے۔ انتہائی متشکل زبان میں بھی عوام کی زندگی کے متعلق جذبات و احساسات کا اظہار کیا جا سکتا ہے۔ بحیثیت مجموعی جس انسان کا کردار غالب کے ہاں اُبھرتا ہے وہ زیادہ تر عوامی زندگی سے گہرا ربط رکھنے والا انسان ہے۔ جہاں تک DICTION کا تعلق ہے میر جذبے کو جذبے کی طرح شعر میں پیش کرتے ہیں۔



ان کی شاعری جذباتی شاعری ہے۔ غالب جذبے کو جذبے سے الگ کر کے عقل، ذہن اور شعور کی بھٹی میں تپا کر پیش کرتے ہیں۔ زندگی ہزار شیوہ ہے۔ اس میں تجزیہ لیا بھی ہے، عاشق اور رند بھی ہوتا ہے غالب اسے جذباتی لب و لہجہ میں پیش نہیں کرتے، بلکہ عقلی اور فکری آہنگ کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

شہاب : ان کی شاعری INTELLECT کی شاعری ہے۔ بنیادی چیز REASON ہے۔

محمد حسن : شاعری میں بنیادی چیز جذبہ ہوتا ہے یا فکر؟

قمر رئیس : اُن کی شاعری جذبات میں ارتعاش پیدا کرتی ہے۔ وہ بیک وقت پوری شخصیت کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہے۔ اس موقع پر شاعرانہ زبان کے متعلق کولرج اور ورڈزورتھ کے اعلان نامے کا ذکر آئے گا۔ دونوں نے سادہ عوامی زبان کو ذریعۂ اظہار بنانے کا اصول تسلیم کیا، مگر ۱۲ سال بعد کولرج نے اس سے انحراف کیا اور کہا کہ ہر تجربے کی اپنی زبان ہوتی ہے اور اس کا ارتفاع اور شعریت بھی اُسی کے مطابق ہوتی ہے۔

شارب : اس کے علاوہ غالب کے نقطۂ نظر اور شاعرانہ انداز بیان پر جو اثرات کلکتہ کے سفر نے پیدا کئے ہیں اُن کو بھی ذہن میں رکھنا چاہیے۔

محمد حسن : کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ غالب کے ذہن پر سفرِ کلکتہ کے اثرات کو ہمارے بعض نقاد ضرورت سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ وہ کلکتہ ۱۸۲۸ء میں گئے اور ان کی شاعری میں سادگی کا چلن شیخ محمد اکرام اور دوسرے نقادوں کے بموجب بہت بعد میں شروع ہوا۔

شارب : مگر غالب پر سفرِ کلکتہ کا اثر تو ہے۔

شہاب : دراصل غالب کے ہاں تضادات پائے جاتے ہیں۔ بڑا تضاد تو یہ ہے کہ وہ خود جاگیردارانہ خاندان سے تعلق رکھتے تھے لیکن عصری حقیقتیں انہیں اس طبقے سے باہر کھینچتی تھیں۔ اُن کی مثال ہمارے دور میں جوش ملیح آبادی کی سی ہے جو خود جاگیردارانہ طبقے سے تعلق رکھتے ہیں مگر اپنے طبقے کے مفادات میں محدود نہیں رہتے، بلکہ اُن کی ہمدردیاں اپنے طبقے سے باہر کے طبقوں سے ہیں۔

قمر رئیس : دراصل ان کے یہاں جذباتی اور ذہنی دونوں کشمکش ہیں۔ جذباتی کشمکش کا تعلق اُن کے ذاتی مسائل سے ہے مثلاً رسوائی، موت، بچوں کا مرنا وغیرہ جس کی وجہ سے مایوسی، اور محرومی کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ اسے ان کی ذہنی اور فکری کشمکش سنبھال لیتی ہے۔ قدیم جاگیردارانہ نظام کی قدروں اور سماجی رشتوں کا احساس اور اس کے بعد نئے ذہن کے طلوع ہونے کا احساس ان کی اس ذہنی کشمکش کی بنیاد ہے جس نے ان کی جذباتی کشمکش کو سہارا دیا۔ وہ محسوس کرتے ہیں کہ باوجودیکہ ہم برباد ہیں مگر آج بھی زندگی خوشیوں سے معمور ہے (معنی نامہ کے ابتدائی حصے میں یہ احساس نمایاں ہے) اور اس سے ہم فیضیاب ہو سکتے ہیں۔

شہاب : اگر غالب کے پاس یہ INTELLECTUAL سطح نہ ہوتی تو وہ میر سے بھی زیادہ قنوطی ہوتے۔ ان کی INTELLECTUAL شخصیت نے انہیں بچا لیا۔

محمد حسن : بحث اب ایسے موڑ پر آگئی ہے جب میں آپ تینوں حضرات سے گذارش کروں کہ اپنے تاثرات کے ثبوت کے طور پر یا یوں ہی اپنے تین تین پسندیدہ اشعار سنائیں۔ (تھوڑی دیر خاموشی)

قمر رئیس : یاد کیجئے تو غالب کے سبھی اشعار ہی یاد آتے ہیں۔

محمد حسن : مثلاً؟

بہرا ہوں میں تو چاہئے [illegible] ... [illegible] ہوں بات مکرر کہے بغیر (قہقہہ)

محمد حسن: اچھا کچھ [illegible] شعر [illegible]

شہاب: میرے پسندیدہ اشعار یہ ہیں —

ہے [illegible] کا وجود [illegible] — [illegible] امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

[illegible] ہوں [illegible] — [illegible] راہ گذر یاد آیا

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ [illegible] — [illegible] اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

قمر رئیس۔ میرے پسندیدہ اشعار یہ ہیں —

قد و گیسو میں قیس و کوہکن کی آزمائش ہے — جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے — جوشِ قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے

شارب: میرے پسندیدہ اشعار یہ ہیں —

ہاتھ دھو دل سے یہی گرمی گر اندیشے میں ہے — آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلا جائے ہے

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد — مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم — ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

اور جناب آپ کے پسندیدہ اشعار؟

محمد حسن: سنیئے —

سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ الفتِ ہستی — عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس — برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا — کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

آخر میں اس مسئلے پر غور کر لیجئے کہ غالب عہدِ جدید میں کیوں مقبول ہیں۔

قمر رئیس۔ غالب ہر دور میں مقبول رہے ہیں۔ عہدِ جدید بھی اپنے کو غالب سے قریب پاتا ہے۔ اپنے دور کی حقیقتوں کا احساس انہیں ہر دور سے قریب کر دیتا ہے۔ حلقۂ شام و سحر کا احساس ہی حلقۂ شام و سحر سے آزاد کر سکتا ہے۔ انسانی احساسات کو وہ جس حد تک اپنے احساس کے آئینے میں دیکھ سکے، اسی قدر وہ عصری اور آفاقی ہو گئے۔ میر کے ہاں جذباتی سطح ہے۔ غالب نے اسے INTEELECTUAL سطح پر پیش کرنے کا RISK لیا ہے۔ ان کے یہاں اس انسان کی جدوجہد کی جھلکیاں مل جاتی ہیں جو زندگی سے لطف لیا چاہتا ہے۔ جو داخلی اور خارجی سطح پر کشمکش، تصادم اور تلاش کے عناصر سے دوچار ہے۔ وہ سب معاملات پر حاوی نہیں ہے۔ اہتزاز، سکون اور روشنی کی وجہ سے غالب اس دور سے قریب ہیں۔

شارب: آپ نے تو کوئی بحث طلب نکتہ ہی نہیں اٹھایا۔

شہاب: اس پوری گفتگو سے اس سوال پر روشنی پڑتی ہے کہ تمدنی اور تاریخی حیثیت سے غالب کا زمانہ ہمارے زمانے کے مماثل ہے۔ اکھل پتھل، سیاسی اور سماجی تبدیلیوں کا احساس اور پھر ایک طرح کی تنہائی کا احساس جس میں LONELINESS اور ALONENESS دونوں احساسات شامل ہیں۔

قمر رئیس: اور ALIENATION اور ISOLATION وغیرہ؟



شہاب: ALIENATION تو نہیں کہیں گے، مگر وہ بھی FIT کیا جا سکتا ہے۔
شارق: غزل کی شاعری میں تشریح و تعبیر کی اتنی گنجائش ہے کہ وہ بھی ثابت کیا جا سکتا ہے۔
شہاب: LONELINESS ہجوم میں تنہائی کا احساس سب فنکاروں میں ہوتا ہے۔ اقدار کے ٹکراؤ [illegible] تھے۔ سماجی پہلوؤں سے عقیدوں کے ٹکراؤ میں غالب ایک لہر کی طرح کبھی ادھر کبھی اُدھر گردش کرتے رہے ہیں۔ اس زمانے میں جو تیز تر تبدیلیاں ہو رہی تھیں، ہمارے زمانے میں تجدیدیت اور MORDERN LIVING کا ٹکراؤ ہے۔ ان دونوں میں ٹکراؤ ہے۔ ایک طرف جاگیردارانہ نظام کے انحطاط کا ٹکراؤ ہے۔ عقیدے، مذہب [illegible] کی عقلی اور سائنسی اقدار کا تصادم ہے۔
قمر رئیس: مگر یہ کشمکش آج سے ۱۵۰ سال پہلے کی ہے اور اس زمانے میں وہ اس کشمکش سے صحت مند طریقے پر نکل گیا۔ اس [illegible] وہ زیادہ جدید ہے یا آج کل کے "جدید"۔
شہاب: مگر ہمیں ایسی چیزیں جدید دور میں بھی مل جاتی ہیں جو ہمارے اور غالب کے درمیان مشترک ہیں۔
قمر رئیس: سوال یہ ہے کہ اس تنہائی میں اور اس تنہائی میں جو غالب کے ہاں تھی (اگر تھی، تو) کوئی فرق ہے یا نہیں۔ کیا شکست و ریخت کے احساس کی یہ SUBLIMITY غالب کی مقبولیت کی وجہ کہی جا سکتی ہے؟ اور کیا یہ دور ختم ہو جائے تو غالب کی مقبولیت ختم ہو جائے گی؟
[illegible] [illegible] کی نوعیت برابر بدلتی رہی ہے۔ حسرت موہانی کو غالب اور وجوہ سے عزیز تھے۔ ترقی پسندی کے دور میں انہیں دوسری وجوہ سے مقبولیت حاصل ہوئی۔ آج کے دور میں اُن کی مقبولیت کے اسباب جداگانہ ہیں۔ غالب کا [illegible] اور اس ردِ عمل کا TREATMENT بھی ایسا ہے جو غالب کو ہمارے لئے مقبول بناتے ہیں۔ میر کے بارے میں [illegible] لکھا ہے: میر بڑا شاعر ہے۔ غالب بڑا فنکار ہے۔ اس CRAFTSMANSHIP سے شاعر بڑا نہیں ہوتا [illegible] ذوق سب سے بڑا شاعر ہوتا۔
شارق: تنہائی اور شکست و ریخت کا مسئلہ قابلِ غور ہے۔ غالب کے ہاں تنہائی نہیں ہے۔ یہ دونوں ہر عہد میں ہوتی ہیں۔ اور ہر فرد اس سے متاثر ہوتا ہے اور اُن کا تعلق اُس تنہائی سے نہیں ہے جس کا پروپیگنڈا ہمارے دور میں ہو رہا ہے وہ [illegible] تھے۔ انہوں نے اپنے ہر تجربے اور ہر مشاہدے کو اپنی شاعری کا جزو بنایا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اُس کے تجربے اور [illegible] ترقی پسند عہد میں بھی اور اب جدید عہد میں بھی متاثر کرتے رہے اور مقبول ہوتے رہے ہیں۔ عظیم شاعر کو ہر زمانے کی [illegible] نے اپنانے اور اسے اپنے طور پر INTERPRET کرنے کی کوشش کی ہے، اس لئے جدید ذہن [illegible] تنہائی تلاش کرتے ہیں۔ ان کی عظمت اور اپیل انہیں باتوں کی وجہ سے ہے۔
شہاب: [illegible] وضاحت ضروری ہے۔ جدیدیت کے علمبرداروں میں دو قسم کے لوگ ہیں۔ ایک وہ جو تنہائی کو سیاسی اور DIPLOMATIC یا کسی اور طرح کی مصلحتوں کے لئے استعمال کرتے ہیں۔
[illegible] اس میں IMPLIED ہے ___ تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ وہ ان مصلحتوں کی بنا پر IDEAL کرتے ہیں۔ دوسرے وہ ہیں جو تنہائی کو نعمت یا بشارت یا دولت نہیں سمجھتے، بلکہ اپنے [illegible] ہیں۔ بہت سے ایسے شاعر ہیں جن کے ہاں تنہائی اوڑھی ہوئی چیز ہے جو واقعی تنہائی ہوتی ہے وہ مقدس [illegible] بھی ہمارے ادیبوں کے ہاں نہیں ہے۔ ایک منٹ کے لئے میں آج کے اخبار سے گجراتی ادیب

اُنّا سنکر جوشی کی تقریر سے یہ اقتباس  پڑھنا چاہتا ہوں۔

"The technostructure... ng of the society is drying up the channels of life, man feels lonely in crowded cities and is denied ... centre from where he can function as a human being."

دونوں سے لکھنے والے ہی جو اسے EXPLOIT کر رہے ہیں۔ فرد اور کائنات کے بارے میں جو تصور ہے۔ اُن کی عقلیت کا جو تصور ہے وہ ہمارے لئے بڑا قابلِ قدر ہے۔

قمر رئیس، غالب کے زمانے میں جاگیردارانہ نظام تھا۔ اس زمانے سے آج کی تنہائی کا مختلف تصور ہونا چاہیئے۔

شہاب، میں عرض کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ ہمارے دور میں عام اور سکہ بند روش سے برابر DEVIATIONS ہو رہے ہیں اور کچھ اسی قسم کے DEVIATIONS سے غالب دوچار تھے۔

قمر رئیس، ایسا تو نہیں ہے کہ غالب ہمیں تاریکی کے دور میں بعض انسانی رشتوں پر ایسا ایمان بخشتا ہے جو ہمیں اس دور میں نہیں مل رہا ہے۔

شہاب، انسانیت کا فقدان تنہائی کا مسئلہ پیدا کر رہا ہے انسانیت کیا ہے اور اسے کیا ہونا چاہیئے؟

قمر رئیس، انسانیت کی تلاش اور انسانی رشتوں کا احساس تو جدیدیت کی شاعری میں عنقا ہے کیونکہ یہ شاعری زیادہ تر نفی پر۔ غالب کی شاعری کشمکش، کرب، تشکیک، غم و الم کے باوجود ہمیں انسان پر اعتماد بخشتی ہے۔

شہاب، میں اسے تو مانتا ہوں مگر انسانیت کا فقدان کا ماتم بھی تو انسان دوستی کا نشان ہے۔ اگر شاعر لائحہ عمل بتانے کے بجائے صرف بیزاری اور تبدیلی کی خواہش پیدا کرتا ہے اور نقاب کا صرف ایک گوشہ ہی اٹھاتا ہے تو بھی کافی ہے۔ اور غالب کی عظمت اس میں ہے کہ اس نے نقاب کا ایک گوشہ اُٹھایا اور تبدیلی کی خواہش اور انسان دوستی کو پورے کرب، دردمندی اور بصیرت کے ساتھ پیش کیا۔

اتنے میں چائے آ گئی۔ لوگ چائے کی طرف متوجہ ہوئے۔ احباب نے طے کیا کہ اس بحث کا اختتامیہ محمد حسن لکھیں اور محمد حسن کا خیال ہے کہ یہ بحث اگر اسی طرح قارئین کے سامنے پیش کی جائے تو زیادہ اچھا ہے۔ محمد حسن کو جو کچھ کہنا ہوگا وہ الگ سے پھر کبھی۔ ▲

بقیہ "غالب ـ ایک گفتگو" ص ۴۷۳

وقار حسین، سپہ گری سے مراد صرف تلوار چلانا اور جنگ میں حصہ لینا نہیں ہے بلکہ یہ زندگی کی طرف حوصلہ مند لوگوں کا ایک رویہ ہے جو دکھ سہتے ہیں مصیبت جھیلتے ہیں، لیکن اپنی انفرادیت کا تحفظ کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ ویسے غالب کی ظرافت میں اُن کے ذاتی مزاج اور CONSTITUTION کو بھی بڑا دخل تھا۔

شمیم حنفی، یہ سچ ہے۔ میر اور سودا نے دلّی چھوڑ دی تھی، لیکن ذوق نے اپنا تکیہ نہیں چھوڑا۔ یہ بھی انفرادی مزاج کی بات تھی۔

عمیق حنفی، اصل بات یہ ہے کہ DISILLUSIONMENT کا سلسلہ غالب کے عہد میں اپنی ابتدائی منزلوں میں تھا اور ہم آج اس کا عروج دیکھ رہے ہیں۔ کہئے صاحب اب کیا؟

وقار حسین، ایک مرگِ ناگہانی اور ہے! ▲


مہمات
غالب



[illegible] لاری

دیوانِ غالب (اُردو) مع شرح

(مرتبہ: حسرت موہانی)

[illegible] پہلے دیوانِ غالب کی کچھ شرحیں منظرِ عام پر آچکی تھیں جیسے :

۱ وثوقِ صراحت — از عبدالعلی والہ حیدرآبادی (مطبوعہ مطبع محمد نظامی حیدرآباد ۱۸۹۶ء)

۲ حلِ کلیاتِ غالب — از مولانا احمد حسن شوکت میرٹھی (مطبوعہ مطبع شوکت المطابع میرٹھ ۱۳۱۷ھ ۱۸۹۹ء)

۳۔ شرحِ دیوانِ غالب — از مولوی حیدر علی نظم طباطبائی (مطبوعہ مطبع سعید الاسلام حیدرآباد ۱۳۱۸ھ ۱۹۰۱ء)

۴ [illegible] — از محمد عبدالواحد واحد (مطبوعہ مطبع محمد نظامی حیدرآباد ۱۳۱۹ھ ۱۹۰۱ء)

لیکن بقول نادم سیتاپوری "دیوان مع شرح کا طرزِ تدوین مولانا حسرت موہانی کی جدتِ طبع کا رہینِ منت ہے اس سے پہلے غالب کی جو شرحیں شائع ہوئیں اُن کا نام شرحِ دیوانِ غالب ہی رکھا گیا۔ دیوان کا اضافہ سب سے پہلے مولانا حسرت کی شرح میں نظر آتا ہے" [۲]

"دیوانِ غالب (اُردو) مع شرح" کا پہلا ایڈیشن ۱۹۰۵ء میں دُوسرا ایڈیشن ۱۹۰۶ء میں تیسرا ایڈیشن ۱۹۱۱ء میں (مطبوعہ اُردو پریس علی گڑھ) چوتھا ایڈیشن ۱۹۱۶ء میں (مطبوعہ الناظر پریس لکھنؤ) اور پانچواں ایڈیشن ۱۹۲۲ء میں (مطبوعہ انوار المطابع لکھنؤ) شائع ہوا۔ تیسرا، چوتھا اور پانچواں ایڈیشن میری نظر سے گزرا ہے۔ اس کے بعد کا کوئی ایڈیشن نہ تو میری نظر سے گذرا ہے اور نہ ہی اُس کے متعلق کوئی حوالہ ملا ہے۔

میرے پیشِ نظر اس کتاب کا تیسرا ایڈیشن ہے جو اُردو پریس علی گڑھ کا چھپا ہوا ہے۔ یہ ۱۸×۲۲/۸ کی تقطیع میں ۱۷۶ صفحات پر مشتمل ہے اس کی تقطیع کے متعلق حسرت لکھتے ہیں: [۳]

"طبعِ اوّل میں کتاب کی تقطیع ۲۰×۳۰ چھوٹی تھی طبعِ ثانی میں ۲۰×۲۶ اور اب طبعِ ثالث میں ۱۸×۲۲ کی متوسط تقطیع قرار دی گئی ہے اور آئندہ یہی قائم رہے گی۔" [۳]

---

[۱] مولانا خیر بہوروی، "مقالہ اشارات غالب کے مطالعہ کے لئے" ماہنامہ نگار لکھنؤ، شمارہ مارچ ۱۹۵۰ء ص ۴۱

[۲] نادم سیتاپوری، غالب کے کلام میں الحاقی عناصر، ص ۲۵۳

[۳] دیوانِ غالب (اُردو) مع شرح (طبعِ ثالث) دیباچہ طبعِ ثالث، ص ۲



اس کے شروع میں دیباچہ اوّل، دیباچہ طبع ثانی اور دیباچہ طبع ثالث کے عنوان سے دو صفحات پر مشتمل دیباچے ہیں جن سے سببِ تالیف، طریقِ شرح اور تینوں اشاعتوں کے فرق پر واضح روشنی پڑتی ہے۔

سببِ تالیف کے سلسلے میں حسرت لکھتے ہیں۔

" جس زمانے میں راقم حروف علیگڑھ کالج میں تعلیم پاتا تھا وہاں "اُردوئے معلیٰ" کے نام سے ایک مفید علمی انجمن قائم تھی جس میں کالج کے بامذاق طالب علم مختلف علمی مسائل پر عموماً اور اساتذۂ اُردو کے کلام پر خصوصاً مضامین لکھا کرتے تھے انجمن مذکور کے اکثر اعضا ایسے بھی تھے جو برائے شوق و رمدہ دلی جلسہائے انجمن میں وقتِ مقررہ سے پہلے پہنچ جاتے تھے اور آغازِ جلسہ تک غالب کے مشکل اور نازک اشعار کے معانی و مطالب کی نسبت بحث ہوا کرتی تھی۔ چنانچہ راقم کو بھی حلِّ دیوانِ غالب کا خیال اسی ذریعے سے پیدا ہوا۔

اگرچہ بوجوہ چند در چند اس انجمن کا وجود قائم نہ رہ سکا اور اکثر احباب کا زمانۂ قیام کالج بھی ختم ہو گیا عرصہ کہ وہ محفل ہی درہم ہو گئی۔ لیکن راقم کے دل میں شرح دیوانِ غالب کا خیال قائم رہا اور کچھ دنوں میں پورے دیوان کی شرح تیار ہو گئی۔" [1]

اور طریقِ شرح کے متعلق یوں رقمطراز ہیں۔

" بعض احباب کی یہ رائے تھی کہ پہلے دیوان ہو اُس کے بعد شرح۔ لیکن راقم نے بلحاظِ آسانیٔ ناظرین اس طریق کو ترجیح دی کہ ہر غزل کے بعد اُس کے مشکل اشعار کا مطلب درج کر دیا جائے تاکہ بار بار ورق اُلٹنے کی زحمت نہ اٹھانا پڑے۔ ادائے مطلب اشعار میں سب سے زیادہ لحاظ اختصار اور سادگی کا رکھا گیا ہے یعنی جہاں تک ہو سکا ہے شعر کا صرف ایک مفہوم مختصر عبارت میں صاف صاف لکھ دیا ہے۔ مشکل الفاظ کے لغوی معنی علیحدہ لکھنے کے بجائے اشعار کی شرح کے ضمن میں اس طور پر ادا کر دیئے کہ قلیل تامل سے خود بخود واضح ہو جائیں۔ مبتدیوں کے لئے یہ اختصار شاید نامناسب ثابت ہو لیکن راقم نے محض مبتدیوں کے خیال سے کتاب کی طوالت کو جائز نہ رکھا۔" [2]

حسرت نے اشعار کی تشریح میں حالی کی "یادگارِ غالب" اور اپنے پیش رَو شارحین کی شرحوں سے بھی استفادہ کیا ہے۔ چنانچہ دیباچۂ طبع اوّل میں انہوں نے اس کا واضح الفاظ میں اعتراف کیا ہے۔ اس سلسلہ میں اُن کے پیش نظر واکہ حیدر آبادی، شوکت میرٹھی اور نظم طباطبائی کی شرحیں رہی ہیں نظم طباطبائی کی شرح کے متعلق لکھتے ہیں:-

" شرح دیوانِ غالب از مولوی سیّد علی حیدر صاحب طباطبائی۔ یہ شرح سب شرحوں سے بہتر ہے۔ راقم حروف کو یہ اُس وقت ملی جب کہ دیوان کی شرح چھپ چکی تھی۔ تاہم قصائدِ غالب کی شرح میں اس سے بہت کچھ مدد ملی جس کا شکریہ ادا کرنا ضروری ہے۔" [3]

دوسرے ایڈیشن میں حسرت نے کافی ترمیم و اضافہ کیا ہے۔ اس کے متعلق "دیباچہ طبع ثانی" میں لکھتے ہیں:-

" طبع اوّل میں بعض اشعار کی شرح بہت مختصر اور اس لئے مبہم رہ گئی تھی۔ اس ایڈیشن میں حتی الامکان یہ نقص رفع کر دیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں جن بعض اشعار کا مفہوم ہی مؤلف کے ذہن میں غلط آیا تھا، اُن کے صحیح مطالب غور و فکر کے بعد از سرِ نو تحریر کئے گئے ہیں۔ اِس بات میں مولوی سید حیدر علی طباطبائی کی شرح دیوانِ غالب کے علاوہ خصوصاً جناب محمد فاروق دیوانہ گورکھپوری سے بھی قابلِ قدر مدد ملی جنہوں نے ایک خاص عقیدت مندانہ ذریعے سے ترمیم شرح طبع ثانی کی جانب حسرت کے ساتھ توجہ دلا کر راقم حروف پر ممنون احسان کیا۔" [4]

تیسرے ایڈیشن میں بہت معمولی رد و بدل کیا گیا ہے۔ حسرت ہی کے الفاظ میں "معمولی حیف ترمیم و توضیح کے سوا طبع دوم و سوم میں اور کوئی فرق نہیں" [5]

---

[1] دیوانِ غالب (اُردو) مع شرح، طبع ثالث، دیباچہ طبع اوّل ص ۱ [2] دیوان غالب (اردو) مع شرح (طبع ثالث) دیباچہ طبع اوّل ص ۱، ۲۔

[3] " " " " " " " ص ۱ [4] " " " " " دیباچہ طبع ثانی ص ۲

[5] " " " " " دیباچہ طبع ثالث ص ۲



چوتھے ایڈیشن میں بعض اشعار کے مطالب میں جا بجا ترمیم و توضیح مزید ہے اور کہیں کہیں آخر کے سے وہ تو وقت میں بدلا۔ تیسرے، چوتھے اور پانچویں ایڈیشن کی تقطیع اور تعداد صفحات یکساں ہے۔

میرے پیش نظر جو ایڈیشن (طبع ثالث) ہے، اُس کی ترتیب اس طرح ہے:

دیباچہ ۱-۲ ، مقدمہ ، غالب کا حال ۱-۶ ، مرزا کی شاعری ۷-۱۶ ، دیوان مع شرح ۱-۱۵۶ ، ضمیمہ ۱۵۷-۱۵۸۔

دیباچہ کے مشمولات کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ مقدمہ میں حسرت نے غالب کی مختصر سوانح حیات پیش کرنے کے بعد اُن کی شاعری کا تفصیل سے جائزہ لیا ہے۔ حسرت کی تنقیدی رائیں صرف پُرانے تذکروں یا حالی کی "یادگار غالب" کی رایوں کا اعادہ نہیں بلکہ ان میں ایک انفرادیت ملتی ہے اور وہ اُن کی اپنی سوچی سمجھی رائیں ہیں۔ وہ غالب کی شاعری کی لفظی اور معنوی خوبیوں کا جائزہ لینے کے بعد لکھتے ہیں۔

"ان چند مخصوص خوبیوں کے علاوہ مرزا کا کلام شاعری کے عام محاسن کے اعتبار سے بھی ممتاز نظر آتا ہے۔ استعاروں کی ندرت۔ تشبیہوں کی تازگی اور اشاروں کی نزاکت و لطافت کی مثالوں سے مرزا کا دیوان بھرا پڑا ہے۔ مبتذل مضامین اور متبذل بازاری الفاظ پیر فحش اور ہجو سے مرزا کا کلام بالکل پاک ہے۔ مرزا کی شاعری عاشقانہ ضرور ہے لیکن انھوں نے عشق کے معنی قدمائے دہلی یا رِندِ لکھنوی کے مانند بوالہوسی کے نہیں لئے ہیں اور اس لئے اُن کے خیالات میں درستی اور ثقاہت کے علاوہ متانت اور شائستگی کی ایسی شان پائی جاتی ہے جس کی مثال شعرائے لکھنؤ کے کلام میں ناپید ہے اور متاخرین شعرائے دہلی کے کلام میں کیا ہے۔

ہم نے مرزا کی شاعری کے باب میں جو کچھ لکھا ہے وہ اُن کی مجموعی حیثیت کے لحاظ سے لکھا ہے، ورنہ از قبیل شاذ اُن کے دیوان میں ایسے اشعار اور الفاظ بھی موجود ہیں جن پر مذاقِ صحیح اور زبان دانوں کی جانب سے اعتراض وارد ہو سکتے ہیں۔"[2]

دیوان کا متن دیوانِ غالب کے تیسرے ایڈیشن پر مبنی ہے جو ۲ محرم الحرام ۱۲۷۸ھ مطابق ۲۹ جولائی ۱۸۶۱ء کو مطبع احمدی دہلی میں (بہ اہتمام امو جان) غالب کی زندگی میں چھپا تھا۔ بقول مالک رام یہ ایڈیشن اتنا غلط چھپا تھا کہ غالب نے ایک نسخے کی نظر ثانی اور تصحیح کر کے مطبع احمدی کے مالک محمد حسین خان کو دیا، جنہوں نے اُسے محمد عبدالرحمن خان مہتمم مطبع نظامی کانپور کے پاس بھیج دیا۔[3] مطبع نظامی نے اسے ذی الحجہ ۱۲۷۹ھ مطابق جون ۱۸۶۳ء میں شائع کیا۔ معلوم نہیں کیوں حسرت نے مطبع نظامی کے نسخے کی موجودگی میں مطبع احمدی کے نسخے کو متن کی بنیاد بنایا۔

آخر میں دو صفحات کا ضمیمہ ہے جو ۲۹ اشعار پر مشتمل ہے۔ اس کے متعلق ص ۱۵۷ پر حسرت لکھتے ہیں:

"اس ضمیمہ میں وہ غزلیں اور اشعار ہیں جو راقم حروف کو مختلف ذرائع سے حاصل ہوئے ہیں اور جو مطبوعہ دیوانِ غالب میں موجود نہیں۔"

اور ص ۱۵۸ پر لکھتے ہیں:

"قاضی القضاۃ کلکتہ مولوی سراج علی خاں موحد مرہانی کی فرمائش سے مرزا نے اپنے دیوان اُردو و فارسی کا خود انتخاب کر کے اس کا نام "گلِ رعنا" رکھا تھا۔ راقم کے پاس اس کا ایک نسخہ موجود ہے۔ چنانچہ یہ اشعار اُسی سے نقل کئے جاتے ہیں۔"[4]

---

[1] دیوانِ غالب (اُردو) مع شرح (طبع چہارم)، دیباچہ طبع چہارم ص ۲۔ [2] ایضاً (طبع ثالث)، مقدمہ ص ۱۴ و ۱۵۔ [3] مالک رام، ذکرِ غالب (اشاعت پنجم)، ص ۲۵

[4] مالک رام اپنے مقالہ "گلِ رعنا۔ غالب کا گمشدہ انتخاب" مشمولہ "قدر ذاکر" میں (ص ۸۰، حاشیہ) لکھتے ہیں، "حسرت مرحوم کو نام کی مشابہت کے باعث یہاں سہو ہوا ہے۔ مرزا نے یہ انتخاب مولوی سراج الدین علی خاں موحد مرہانی کی فرمائش پر نہیں کیا تھا۔ موحد تو غالب کے کلکتہ پہنچنے سے پہلے انتقال کر چکے تھے۔ یہ انتخاب دوسرے صاحب مولوی سراج الدین احمد کیلئے مرتب ہوا تھا جیسا کہ مرزا نے اُس کے دیباچے میں لکھا ہے۔" مالک رام کو "گلِ رعنا" کا ایک مکمل نسخہ مل گیا ہے۔ حسرت کے پاس جو نسخہ تھا، وہ ناقص تھا۔"



حسرت کے ان دونوں بیانات میں تضاد ہے۔ صفحہ ۱۷۵ پر وہ لکھتے ہیں کہ یہ اشعار مختلف ذرائع سے حاصل کئے گئے ہیں اور صفحہ ۱۷۹ پر اُس کا ماخذ "گلِ رعنا" قرار دیتے ہیں۔ دراصل یہ تمام اشعار "گلِ رعنا" سے لے گئے ہیں۔
حسرت نے ہر شعر کی شرح نہیں لکھی ہے، بلکہ صرف مشکل اشعار کی شرح لکھنے پر اکتفا کیا ہے۔ مثال کے طور پر پہلی غزل میں صرف دو شعروں کی شرح لکھی گئی ہے۔ یہی حال دیگر غزلوں اور قصائد وغیرہ کا ہے بعض بعض غزلیں تو پوری کی پوری بغیر شرح کے نقل کر دی گئی ہیں۔ اشعار کا مطلب لکھنے میں بھی حسرت نے بے جا اختصار سے کام لیا ہے۔ زیادہ تر اشعار کی شرح انہوں نے بہت مختصر لکھی ہے، جو محض اشارہ یا نوٹ ہو کر رہ گئے ہیں۔ کم ہی اشعار کی شرح میں کسی قدر تفصیل سے کام لیا گیا ہے۔ اب چند اشعار کے مطالب بطور نمونہ پیش کر رہا ہوں، جس سے حسرت کی شرح کی خوبیوں اور خامیوں کا صحیح اندازہ ہو جائے گا۔

(۱) نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا   کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

"نقش بمعنی تصویر۔ تصویر چونکہ کاغذ پر ہوتی ہے، اس لئے اُسے فریادی کہا۔ کیونکہ ولایت میں فریادی کاغذی پیرہن پہن کر عدالت میں جاتے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ ہستی چونکہ موجبِ ملال و آزار ہے، اس لئے تصویر بھی اپنے صانع کی بزبانِ حال شکایت کرتی ہے کہ مجھ کو ہست کر کے کیوں مبتلائے رنجِ ہستی کیا۔ (ماخوذ از عود ہندی)
مقصودِ شاعر یہ ہے کہ ہستی بہرحال (یعنی اگرچہ مثلِ ہستیٔ تصویر اعتبارِ محض ہو) موجبِ آزار ہے۔"[1]

(۲) کہتے ہو نہ دیں گے ہم دل اگر پڑا پایا   دل کہاں کہ گم کیجے ہم نے مدعا پایا

"ہم نے مدعا پایا یعنی ہم آپ کا مطلب سمجھ گئے کہ آپ نے ہمارا دل پایا ہے، اور یہ باتیں کہ اگر ہم تیرا دل پائیں گے تو نہ دیں گے دل پالینے کے بعد کی ہیں۔ یعنی جیسے لوگ کوئی گمشدہ چیز پاکر چھپڑنے کے لئے مالک سے کہا کرتے ہیں۔"[2]

(۳) ترے سروِ قامت سے اک قدِ آدم   قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

"اس کے ایک معنی تو یہی ہیں کہ تیرے سروِ قامت سے فتنۂ قیامت کمتر ہے۔ اور دوسرے یہ معنی بھی ہیں کہ تیرا قد اُس میں سے سوایا گیا ہے اس لئے وہ ایک قدِ آدم کم ہو گیا ہے۔ (یادگارِ غالب)
یا یہ کہ فتنۂ قیامت و فتنۂ قامت دونوں موجود فی التصور ہیں اور اس لحاظ سے برابر ہیں لیکن باعتبار وجود ظاہر سروِ قامتِ یار سے فتنۂ قیامت بقدر یک قدِ آدم کم ہے۔"[3]

(۴) کوئی دن گر زندگانی اور ہے   اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے

"یعنی اگر کچھ اور زندگی ہوئی تو ہم ترکِ محبت کی کوشش کریں گے۔"[4]

(۵) موت کا ایک دن معین ہے   نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

"نیند کے لفظ پر زور دے کر پڑھنے سے مطلب صاف ہو جاتا ہے۔ یعنی موت کا البتہ ایک دن متعین ہے کہ اُسی روز آئے گی۔ آخر نیند کیوں نہیں آتی؟ کیا یہ بھی موت ہو گئی کہ بوقتِ معین ہی آئے گی۔"[5]

(۶) شبنم بہ گلِ لالہ نہ خالی ز ادا ہے   داغِ دلِ بیدرد نظرگاہِ حیا ہے

"گلِ لالہ پر شبنم کے قطرے نہیں بلکہ عرقِ شرم ہے۔ لالہ کو شرم اس بات کی ہے کہ اُس کے دل میں داغ تو ہے لیکن درد نہیں۔"[6]

(۷) قمری کفِ خاکستر و بلبل قفسِ رنگ   اے نالہ نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے

"جگر سوختہ کا کوئی نشان سوائے نالے کے باقی نہیں۔ پہلا مصرع بطور تمہید لکھا ہے کہ جس طرح قمری عشقِ سرو میں ایک کفِ خاکستر

---

[1] دیوانِ غالب (اُردو) مع شرح (طبع ثالث) ص۱، [2] ایضاً ص۶۴، [3] ایضاً ص۹۵، [4] ایضاً ص۹۵ [5] ایضاً ص۱۳ [6] ایضاً ص۱۳



اور ہمیں مستیِ محفل میں رنگ ہی رنگ رہ جاتی ہے اُسی طرح ہمارے جگرِ سوختہ کا کوئی نشاں محرماں کے نہیں باقی رہا ہے۔ کلامِ غالب کو مقبولِ عام بنانے میں جن کتابوں نے نمایاں حصہ لیا ہے ان میں شرحِ حسرت کو ایک امتیاز حاصل ہے۔ اِس سلسلے میں حالی کی یادگارِ غالب کے بعد اسی کتاب پر نظر پڑتی ہے ورنہ شوکت میرٹھی جیسے شارحین نے تو کلامِ غالب کو چیستاں بنا کر رکھ دیا تھا۔ نظم طباطبائی نے بھی غالب کے اکثر اشعار کو مہمل قرار دے کر غالب کی مقبولیت کو نقصان پہنچانے کی بالواسطہ کوشش کی تھی۔ لیکن حسرت کا رویہ ان شارحین کے برعکس تھا۔ وہ غالب کے مداح ہی نہیں بلکہ پرستار تھے جس کا اظہار اُن کے مقدمے سے بھی ہوتا ہے۔ انہوں نے غالب کے معنی خیز اور مشکل اشعار کی عام فہم زبان میں تشریح کی اور اختصار کے باوجود اُن کے مفہوم کو اچھی طرح واضح کر دیا۔ علاوہ ازیں انہوں نے اپنی شرح کی قیمت بھی بہت کم رکھی۔ اِس کی قیمت مع محصول ڈاک صرف ایک روپیہ تھی۔ اِس طرح ان کی شرح زیادہ سے زیادہ ہاتھوں میں پہنچی اور ۱۷ سال کے قلیل عرصے میں اُس کے پانچ ایڈیشن شائع ہوئے اس سے شرحِ حسرت کی مقبولیت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

الغرض غالب کے کلام کو مقبولِ عام بنانے میں شرحِ حسرت کی خدمات کو کبھی بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔



اجتہاد۔ "مرزا غالب اور فنِ تاریخ گوئی" پر اظہارِ خیال کر کے مضمون ختم کر دیا ہے۔

یکم فروری ۱۹۳۲ء کے شمارۂ "شاعر" سے دیوانِ غالب کی پہلی غزل "نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا" کی شرح شروع ہوتی ہے۔ شرح میں یہ التزام رکھا گیا ہے کہ ہر غزل کا نمبر دے کر پوری غزل جلی قلم سے لکھوائی گئی ہے اور درمیاں کی مالی میں اشعار کے نمبر دیئے گئے ہیں اور ان ہی نمبروں کے اعتبار سے ایک ایک شعر کی الگ الگ شرح کی گئی ہے۔ شعر کا نمبر دے کر پہلے مشکل الفاظ کے لغوی (اور اگر ہوئے تو) مجازی معنی دئے گئے ہیں۔ یہ صراحت بھی کر دی گئی ہے کہ لفظ فارسی ہے یا عربی۔ مذکر ہے یا مونث۔ اگر وہ لفظ مخفف ہے تو پورا لفظ کیا ہے۔ مفرد اور مرکب الفاظ ہی نہیں، بلکہ تراکیب کے معنی بھی پہلے سمجھا دیئے گئے ہیں تاکہ قاری کو الفاظ کی مدد سے خود شعر کا مطلب سمجھنے میں آسانی ہو۔ الفاظ و تراکیب کے معنی سمجھا دینے کے بعد وہ مفہومِ شعر کی طرف آتے ہیں جو اشعار زیادہ پیچیدہ ہیں اُن کا مفہوم بیان کر دینے کے بعد مزید تشریح کر دیتے ہیں۔ بعض اشعار کی شرح کافی طویل ہے۔ اشعار کی شرح طویل ہو یا مختصر شارح کی کوشش یہی ہے کہ غالب کا مشکل سے مشکل شعر اپنے پورے پس منظر کے ساتھ آئینہ ہو جائے۔ مثال کے طور پر چند غزلوں یا اُن کے اشعار کی شرح یہاں پیش کی جاتی ہے:

غزل ۵

دل مرا سوزِ نہاں سے بے محابا جل گیا ۱ آتشِ خاموش کی مانند گویا جل گیا
دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں ۲ آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

(۱) سوزِ نہاں (ف)، پوشیدہ گرمی۔ دل کا سوز۔ محابا (ع)، مذکر۔ لحاظ۔ مروت۔ پاسداری۔ اعانت

مفہوم۔ میرا دل عشق کی پوشیدہ آگ سے بغیر پاس و لحاظ خاموش آگ کی طرح چپکے چپکے جل گیا۔ لفظ "گویا" اس شعر میں "خاموش" کی رعایت ہے۔

(۲) مفہوم: اپنے دل کی ویرانی اور آتش سامانی کا ماتم کرتے ہیں کہ دل میں ایسی آگ لگی جس نے ذوقِ وصل اور یادِ یار کو بھی باقی نہ چھوڑا۔ اب اس آگ کو رشک کی آگ کہہ لیجئے یا محض آتشِ محبت۔ آتشِ محبت مان لینے سے شعر کی جدباتی سنجیدگی بہت بڑھ جاتی ہے۔

غزل ۲۵

گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگیِ جا کا ۱ گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا
یہ جانتا ہوں کہ تو اور پاسخِ مکتوب ۲ مگر ستم زدہ ہوں ذوقِ خامہ فرسا کا
حنائے پائے خزاں ہے بہار اگر ہے یہی ۳ دوامِ کلفتِ خاطر ہے عیشِ دنیا کا
غمِ فراق میں تکلیفِ سیرِ باغ نہ دو ۴ مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بیجا کا
ہنوز محرمیِ حسن کو ترستا ہوں ۵ کرے ہے ہر بُنِ مو کام چشمِ بینا کا
دل اُسکو پہلے ہی ناز و ادا سے دے بیٹھے ۶ ہمیں دماغ کہاں حسن کے تقاضا کا
نہ کہہ کہ گریہ بمقدارِ حسرتِ دل ہے ۷ مری نگاہ میں ہے جمع و خرچ دریا کا
فلک کو دیکھ کے کرتا ہوں اُسکو یاد اسدؔ
جفا میں اُس کی ہے انداز کارفرما کا

۱۔ اِس شعر میں شوق کو اضطرابِ دریا اور دل کو گہر سے تشبیہہ دی ہے۔ فرماتے ہیں کہ میرا شوق تنگیِ دل کا گلہ گذار ہے کہ



دل میں بسنے سے وہ جوش کا دریا [illegible] جوش ہی ہوتا چاہیے، باقی نہیں رہا۔ گویا دریا موتی میں سما گیا اور اس کا اضطراب
محو ہو گیا۔ دل کی وسعت کون و مکاں کی وسعت سے زیادہ تسلیم کی جاتی ہے۔ پھر بھی جوشِ شوق میں آتا
وسعت ہے کہ وہ دل میں نہیں سما سکتا اور جب سما جاتا ہے تو اس میں ایسی ہی کمی ہو جاتی ہے جیسے دریا کے موتی
میں سمانے سے ہو سکتی ہے

[illegible] رقم) جواب۔ ستم زدہ (ف) مظلوم۔ مغلوب۔ بے چارہ۔ خامہ فرسا رقم) قلم گھسنے والا لکھنے والا۔
مفہوم:۔ یہ تو مجھے معلوم ہے کہ تو کہاں اور میرے خط کا جواب کہاں۔ یعنی تم سے مجھے اپنے خط کے جواب کی امید نہیں ہے مگر کیا کروں
خط لکھنے کے ذوق سے مجبور ہوں۔ اس لئے لکھے جاتا ہوں۔

[illegible]۔ دوام (ع) ہمیشگی۔ حنا (عث) مہندی۔

مفہوم: فرماتے ہیں کہ بہار کا اوّل تو وجود ہی نہیں، یعنی اتنی عارضی اور مختصر ہوتی ہے کہ اس پر ہونے کا اطلاق بھی نہیں کیا جا سکتا۔
لیکن اگر بہار کا وجود تسلیم کر لیا جائے تو وہ حنا لگے پاؤں کی مہندی سے زیادہ نہیں کہ اس سے مراد اس کا۔ وال کچھ دن کے لئے رنگین ہو
جاتا ہے۔ مگر حنا کی طرح یہ رنگینی دیرپا نہیں ہوتی، اسی لئے دنیا کا عیش ہمیشہ کلفتِ خاطر کا سبب ہوتا ہے۔ یعنی ذرا سی دیر کیلئے
عیش اور ہمیشہ کے لئے غم۔

کبھی صرفِ عشرتِ زود رو، کبھی وقفِ کلفتِ دیرپا — جو یہ کیفیت ہو حیات کی تو میں اُس حیات کو کیا کروں

۴۔ خندہ ہائے بیجا (ف) کثرت بے محل ہنسی۔

مفہوم: باغ کے پھول اور کلیاں شگفت و نمو کے جوش سے کھلتی ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمام باغ ہنس رہا ہے لیکن
چونکہ باغ کا یہ تبسم اور خندہ روی کسی سبب سے یا کسی کے حال پر نہیں ہوتی، اس لئے ایک غمگین اور افسردہ دل کی نگاہ میں اسے
خندۂ بے جا (یا خندہ ہائے بے جا) سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے فرماتے ہیں کہ میں فراقِ دوست میں غمگین ہوں مجھے سیرِ باغ
کی تکلیف نہ دو۔ تم سمجھتے ہو کہ سیر سے میرا دل شگفتہ ہو جائے گا اور میں غم فراق سے تسکین پا جاؤں گا لیکن حقیقت یہ ہے کہ
کہ جب پھول ہنس رہے ہوں گے، کلیاں چٹک رہی ہوں گی، تتلیاں ناچ رہی ہوں گی، فوارے رقصاں ہوں گے، جگنو چمک
رہے ہوں گے، بلبل نغمہ سرا ہو گی۔ غرض کہ تمام باغ ایک خندۂ بیجا کا محشر سا ہوا ہو گا پھر بھلا مجھے اس قدر خندۂ بیجا کی غم دوست
میں برداشت کہاں، میں تو اور بھی غمگین ہو جاؤں گا، اور کبھی دیوانہ ہو جاؤں گا۔ مجھے یہ شگفت بے محل اور خندۂ بیجا ہر معلوم ہوگا
اس لئے گذارش ہے کہ

غمِ فراق میں تکلیفِ سیرِ باغ نہ دو۔ الخ

۵۔ محرم (عت) راز دان۔ آشنائی۔ عرفان و آگہی۔ ہنوز (ف) اب بھی۔ اب تک۔ مژہ۔ بال کی جڑ۔ چشم بینا
(تث) روشن آنکھ۔ دیکھنے والی آنکھ۔

مفہوم: شعر کے دوسرے مصرع میں "اگرچہ" مقدر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگرچہ میرے بال بال میں ایک دیکھنے والی آنکھ
پوشیدہ ہے تاہم میں ابھی تک حسن کا محرم نہیں ہوں۔ یعنی مجھے عرفانِ حسن کما حقہٗ حاصل نہیں ہے۔ طالب پر جب کیفیتِ
استغراق طاری ہوتی ہے تو اس کے رونگٹے، اور ہر رُواں سے مطلوب کا نام جاری ہو جاتا ہے اور رُواں رُواں چشمِ شوق بن کر
تماشائے حسن میں مصروف ہو جاتا ہے۔ لیکن حسن اپنی شانِ اُلوہیت کے ساتھ اس قدر حجاب پسند ہے کہ ان آنکھوں سے
دیکھنے کے بعد بھی، اس کی ذات کا عرفان حاصل نہیں ہوتا اور طالب خود کو محرمِ حسن، محرمِ راز، محرمِ جمال، غرض کہ کسی درجے کا
محرم نہیں کہہ سکتا۔ چونکہ عرفانِ الٰہی کی منزل کا حال بھی یہی ہے، اس لئے "حسن" اور "خدا" میں کوئی فرق نہیں ہے۔ حسن



اپنی تمام قوتوں، لطافتوں اور سحر کاریوں کے ساتھ عینِ ذات ہے اور محرمیِ عرفانِ ذات ناممکنات سے، مَا عَرَفْنَاکَ حَقَّ مَعْرِفَتِکَ ۔ یہی وجہ ہے کہ ذات کے متعلق غور کرنے سے منع کیا گیا ہے ۔ لَا تَفَکَّرُوْا فِی الذَّاتِ مگر صفات میں غور و فکر کی اجازت ہے ۔ اس لئے کہ انسان خود بھی مجموعۂ صفات مع الذات ہے ۔ جیسے صفات میں غور کرے گا تو وَ تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہِ تَعَالٰی کی قوت اس میں پیدا ہوگی اور وہ عبودیت کی معراج حاصل کر سکے گا۔ لیکن ذات کی تلاش میں اپنی صفات سے بھی ہاتھ دھونے پڑیں گے اور پھر بھی اُس کا ملنا ناممکن ہے ۔ وہاں عرفان و محرمی کی گنجائش نہیں، عرفان کیونکر حاصل ہو ؟

دریا میں رہنے والی مچھلیاں اگر دریا کو نہ دیکھ سکیں اور نہ سمجھ سکیں تو حق بجانب ہیں ۔ گو دریا ہی اُن کی حیات کا باعث ہے ۔ دریا ہی اُن کی زندگی ہے ۔ وہ اپنی ہی زندگی میں تیر رہی ہیں اور سانس لے رہی ہیں ۔ مگر انہیں اس حیاتِ کبریٰ کا پتہ کیونکر مل سکتا ہے جو اُن پر طاری و ساری ہے ۔ وہ سیکڑوں برس دریا میں رہیں، لیکن دریا کی محرم نہیں ہو سکیں ۔ حالانکہ دریا سے اُن کو جتنی قربت ہے اُس سے زیادہ کسی کو حاصل ہو ہی نہیں سکتی ۔ یہی حال ہستیِ انسان کا ہے کہ وہ ذات کے سمندر میں ایک ناچیز حباب کی طرح بہا چلا جا رہا ہے ۔ بنتا ہے اور ٹوٹ جاتا ہے ۔ ٹوٹ جاتا ہے اور بنتا ہے ۔ مگر سمندر کی تہہ کو نہیں پہنچ سکتا ۔

"کرے ہے ہر بُنِ مُو کام چشمِ بینا کا"

ہر بُنِ مُو کیا، انسان مطلق حُسن میں محیط ہے ۔ پھر اُسے محرمیِ حُسن کس طرح حاصل ہو ؟

۶ ۔ حُسن کا ناز اور حُسن کی ادا ہی ایسے کرشمے اور جادو ہیں جو انسان سے دل مانگتے ہیں اور انسان مسحور ہو جاتا ہے کہ ناز و ادا سے مسحور ہو کر حُسن پر اپنا دل نثار کر دے ۔ مرزا غالب کہتے ہیں کہ اس سے پہلے کہ حسن اپنے ناز و ادا کی معرفت دل کا تقاضہ کرے، ہم نے حُسن کو اپنا دل دے دیا ۔ اس لئے کہ تقاضائے حُسن کی ہمیں تاب کہاں ۔ گرویدگیِ حُسن اس بات کی اجازت ہی نہیں دیتی کہ جب حُسن تقاضا کرے تو اُسے کوئی چیز دی جائے ۔ پھر دل جو صرف نذر کے قابل ہے اور صرف نذرِ حُسن کے لئے تخلیق ہوا ہے، بغیر تقاضا اُس کو دے دیا جائے تو انتہائے حسن بھی اور حُسن کی قدر شناسی ہے ۔ اس شعر میں "تقاضا" کا موجودہ محاورہ اردو کے خلاف ہے "تقاضے" کا ہونا چاہیئے ۔

۷ ۔ بمقدارِ حسرتِ دل (ف) دل کی حسرت کے برابر ۔ خرج و خریج (ف) جمع اور خرچ ۔

مفہوم : یہ نہ کہو کہ میں جو روتا ہوں تو اپنی حسرتِ دل کے برابر روتا ہوں ۔ یعنی جتنی حسرت ہے اُتنا روتا ہوں ۔ یہ بات نہیں ہے ۔ میرا دل دریا ہے ۔ اس میں آنسو بکثرت اور بے انتہا ہیں ۔ میں بمقدارِ حسرتِ دل نہیں روتا، کم روتا ہوں ۔ آنسوؤں کی پیداوار بہت ہے اور خرچ کم ہے ۔ اسے میں جانتا ہوں ۔ دریائے دل میری نگاہ میں ہے ۔ اپنے رونے کا اندازہ صرف مجھی کو ہے ۔

۸ ۔ کارفرما (فم) کام کرنے والا، فعّال ۔

مفہوم : یعنی جب آسمان مجھ پر کوئی ظلم کرتا ہے تو میں اُسے دیکھ کر اپنے دوست کو یاد کر لیتا ہوں ۔ کیونکہ آسمان کے ظلم میں دوست ہی کا اندازِ جفا کارفرما ہے ۔ اس لئے میں آسمان کو دیکھ کر اُسے یاد کر لیتا ہوں ۔ معمولی شعر ہے ۔

"جدید شرحِ دیوانِ غالب" میں سیماب کی بعض تشریحات بڑی مؤثر ہیں ۔ غالب کے اس شعر کو ؎

لے تو لوں سوتے میں اُس کے پاؤں کا بوسہ مگر
ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہو جائے گا

عام طور پر معمولی اور رکیک شعر کہا جاتا ہے ۔ بادی النظر میں یہ لگتا بھی ایسا ہی ہے، لیکن سیماب نے اس شعر کی شرح کچھ اس طرح کی ہے کہ شعر کی طرف دل کھنچنے لگتا ہے ۔ یہ غزل ۱۲۳ کا تیسرا شعر ہے ۔ فرماتے ہیں : (۳) شعر صاف ہے ۔ محبوب سو رہا ہے



عشقِ پاکباز اعتبارِ حسن کی روشنی میں وہاں موجود ہے۔ جو اپنی پاکبازی کا دعویٰ اپنے محبوب کے سامنے بایں الفاظ کر چکا ہے ؎

اہتمامِ شوق کر، اے بدگماں آ اور دیکھ   وہ ہوس کوشی کہاں جو دوسروں کے دل میں ہے

لیکن اب محبوب کے پاؤں اختیارِ نظر میں دیکھ کر، جو سوتے میں بے ترتیبی سے اور بھی زیادہ نظرکش ہو گئے ہیں اور جو اس وقت وضع احتیاط اور شرم و حیا کے قابو سے آزاد ہیں وہ چاہتا ہے کہ اپنا سر سارا اُن پر جھکا دے اور پائے ناز پر ایک بوسۂ احترام ثبت کر دے۔ مگر پھر سوچتا ہے کہ اگر میں نے ایسا کیا اور محبوب کی آنکھ کھل گئی تو وہ میرے ادعائے پاکبازی سے بدگمان ہو جائے گا کہ سوتے میں پاؤں کا بوسہ لینے سے کیا مقصد تھا؟

سیماب نے اپنی شرح میں نہ صرف اشعار کے قریبی اور بعیدی معنی ہی پر غور کیا ہے، بلکہ اکثر مقامات پر مرزا کے سہو و تجاوز و انحراف کی طرف بھی سنجیدگی سے اشارے کئے ہیں۔ جیسا کہ اوپر کے ایک شعر میں "تقاضا" اور "تقاضہ" کے متعلق اظہارِ خیال کیا ہے یا اسی غزل ۲۳ کے ذیل کے چوتھے شعر میں ؎

دل کو ہم صرفِ وفا سمجھے تھے کیا معلوم تھا   یعنی یہ پہلے ہی نذرِ امتحاں ہو جائے گا

اس شعر کے دوسرے مصرع میں بجائے کافِ بیانیہ کے "یعنی" استعمال کیا گیا ہے جو بے محل اور بے معنی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم تو سمجھتے تھے کہ دل وفا میں کام آئے گا، لیکن یہ کیا خبر تھی کہ وہ امتحانِ وفا ہی کی نذر ہو کر رہ جائے گا۔

غزل ۲۱ کا ساتواں شعر ؎

شورِ پندِ ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا   آپ سے کوئی پوچھے تم نے کیا مزا پایا

۷۔ شور (ف) غل۔ پند (ف) نصیحت

مفہوم۔ ناصح کی نصیحت نے ہمارے زخمِ دل پر نمک چھڑکا تو اس سے تو ہمیں ایک قسم کا مزہ بھی ملا لیکن کوئی ناصح سے پوچھے کہ حضرت آپ کو اس نمک پاشی اور پند تراشی سے کیا لذت حاصل ہوئی؟

"مزہ" جو ہائے مختفی سے ہے، اسے الف سے بدل کر "دوا" اور "مدعا" کا قافیہ بنا لینا اردو میں جائز ہے اس لئے کہ "ہ" ملفوظ نہیں اور "ز" کے اشباع سے صاف الف پیدا ہوتا ہے لیکن فارسی شعرا کا یہ مسلک نہیں ہے اور وہ ہائے مختفی کو حرفِ روی ہونے کے قابل نہیں سمجھتے۔

غزل ۵۷۔ چوتھا شعر ؎

دل تا جگر کہ ساحلِ دریائے خوں ہے اب ۴   اس رہگذر میں جلوۂ گل آگے گرد تھا

۴۔ اکثر نسخوں میں مصرعِ اولیٰ کے آخر میں "آب" لکھا ہوا ہے۔ میرے خیال میں یہ لفظ "اب" ہے، نہ کہ "آب"۔

مفہوم یعنی دل سے جگر تک جو ایک راستہ ہے پہلے اس میں ایسی بہار تھی کہ اس کے آگے جلوۂ گل بھی گرد تھا اور اب یہ حال ہے کہ وہی راستہ (دل سے جگر تک) دریائے خوں کا ساحل سا ہوا ہے۔ یعنی دل اور جگر سے خون کی موجیں ٹکرا رہی ہیں

خلاصۂ شعر یہ ہے کہ پہلے ہمارا دل شگفتہ اور پُربہار تھا۔ اب خوں گشتۂ غم کا رہے۔

غزل نمبر ۸ سے ؎

دہر میں نقشِ وفا وجہ تسلی نہ ہوا   تھا یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

اس کی شرح سے پہلے سیماب نے ایک نوٹ دیا ہے، لکھتے ہیں۔

اس غزل میں معنیٰ، عیسیٰ، تقویٰ ــــ تسلی اور راضی وغیرہ قوافی کے ساتھ نظم کئے گئے ہیں۔ یہ فارسی شعرائے متقدم



کا اتباع ہے۔ وہ لوگ عربی کے جس جس کلمہ میں "ی" دیکھتے ہیں اس کو کبھی "الف" اور کبھی "ی" کے ساتھ نظم کرنے میں مضائقہ نہیں سمجھتے۔ جیسے تمنّیٰ و تمنّا، تجلّیٰ و تجلّی۔ تسلّیٰ و تسلّی۔ ہیولیٰ و ہیولی وغیرہ۔ مگر فی زمانہ ایسے الفاظ کو "یائے معروف" کے ساتھ نظم کرنا خلافِ فصاحت سمجھا جاتا ہے۔ اس لئے اس کا ترک ہی اَولیٰ ہے۔

غزل نمبر ۱۱، پہلا شعر

سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ اُلفتِ ہستی ۔ عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

۱۔ ناگزیر (ف) ناچار و لاعلاج۔ ضرور۔ لابُد۔ ناگزیرِ اُلفتِ ہستی۔ مُراد ہے جان کو عزیز رکھنے پر مجبور ہونے سے۔ ناگزیر کے استعمال کی یہ صورت صرف فارسی میں جائز ہے، اُردو میں جائز نہیں۔ اُردو میں نہایت ضروری اور ناقابلِ گذاشت کے معنوں میں ناگزیر استعمال ہوتا ہے۔

مفہوم: میں سر سے پاؤں تک عشق کے ہاتھوں لکا ہوا بھی ہوں اور جینے پر بھی مجبور ہوں۔ میری وہ حالت ہے کہ جیسے کوئی بجلی کا پرستار بھی ہو اور جب وہ حاصل یعنی خرمن پر گر پڑے تو اُس سے افسردہ خاطر بھی ہو جائے۔ جب عشق کیا تو فکرِ زندگی کیا؟ اور جب برق کے پرستار ہو گئے تو پھر اُس کے فطری نتائج پر افسوس کرنا کیا معنی؟

غزل ۱۲

تھا خوابِ شوقِ ساقی رستخیز اندازہ تھا ۔ تا محیطِ بادہ صورت خانۂ خمیازہ تھا

کی شرح کرتے ہوئے شروع میں تحریر فرماتے ہیں۔

"مرزا غالب کی یہ غزل اُن کی اس طرزِ کلام کا مکمل نمونہ ہے جس نے مرزا کو بعض طبقوں میں دشوار پسند اور بعض میں مہمل گو مشہور کر دیا۔ اس قسم کے کلام کو کلامِ اُردو نہیں کہا جا سکتا۔ اس لئے کہ تمام تر فارسی اور عربی الفاظ کے مجموعے سے جو شعر ترتیب کیا جائے وہ یا تو فارسی ہو سکتا ہے یا عربی۔ اس غزل کے مطلع میں اگر "تھا" کی جگہ "بُود" لگا دیا جائے تو کیا مطلع کسی فارسی غزل کا مطلع نہ ہو جائے گا؟ یہ غالب کی خوش قسمتی ہے کہ آج ان کے ۶۳ برس بعد بھی اُن کے ایسے کلام کو شرحیں لکھ کر بامعنی ثابت کیا جا رہا ہے اور میرے خیال میں اس کی تحسین غالب کو نہیں بلکہ شارحینِ غالب کو ملنی چاہئیے۔ حالات بتا رہے ہیں کہ مرزا کا رجحان اُردو شاعری کی طرف تھا ہی نہیں۔ وہ تو یوں کہئیے کہ قلعۂ معلّٰی میں اُردو کا چرچا تھا۔ ذوق مرحوم بساطِ سخن پر تنہا یکّہ تاز تھے۔ بادشاہ کا مصاحب اگر اُردو میں خاموش رہتا تو ذوق مرحوم حریف رہ جاتے۔ اس لئے کچھ نہ کچھ اُردو میں کہنا پڑا، مگر فارسی سے بہت کم۔ اُردو دیوانِ غالب ضخیم فارسی دیوان کا ایک جزوِ مختصر کہا جا سکتا ہے اور مرزا کی طبعِ خداداد کے جوہر کا آئینہ۔ ان کا دیوانِ فارسی ہی تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ گو دیوانِ اُردو میں بھی بلند خیالی، فلسفہ اور معانی کی کمی نہیں لیکن اس میں فارسی کا پرتو بیش از بیش موجود ہے"۔

۱۔ رستخیز (ف) قیامت۔ ہنگامہ۔ شورش۔ دار و گیر۔ رستخیز انداز (قیامت آفریں) کو مرزا نے رستخیز اندازہ لکھ دیا ہے جس کے معنی بہ اندازۂ رستخیز لئے جا سکتے ہیں۔ محیط (ع م) (۱) احاطہ کرنے والا۔ گھیرنے والا (۲) احاطہ۔ گھیر۔ دائرے کا گول خط۔ خمیازہ (ف م) انگڑائی۔ مکافات۔ رنج۔ تکلیف۔ پریشانی۔ افسوس۔ محیطِ بادہ وہ خط ساغر جہاں تک شراب بھری ہوتی ہے۔

مفہوم: رات کو ساقی کے اشتیاق کا خمار قیامت اُٹھا رہا تھا۔ خطِ ساغر تک انگڑائیوں کا صورت خانہ نظر آتا تھا۔ یعنی شراب جو ساغر میں بالب بھری ہوئی تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ بھی اشتیاقِ ساقی میں انگڑائی لے رہی ہے۔

جدید شرحِ دیوانِ غالب کے یہ چند نمونے اُس کی علمی، فنی اور معنوی خوبیوں سے آشنا ہونے کے لئے کافی ہیں۔ شاید



ہو کوئی شعر ایسا ہو جو شرح کے بعد قاری کے لیے الجھن باقی رکھے یا مزید اُلجھ جائے۔ سیماب نے حتی الامکان اشعار کی شرح کو صاف اور سلیس انداز میں لکھا ہے۔ خود پوری طرح سمجھ کر دوسروں کو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ دوسرے شارحین سے جہاں اختلاف [illegible] اظہار بھی کر دیا ہے۔ غالب کا ایک شعر ہے ؎

عشرتِ قتل گہِ اہلِ تمنا مت پوچھ
عیدِ نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا

اس شعر کے سلسلے میں فرماتے ہیں ـــ جو لوگ شہادت کے تمنائی ہیں، مقتل میں اُن کی عشرت کا کیا پوچھنا ہے "تلوار کا عریاں ہونا گویا ان کے نظارے کی عید ہے۔"

بعض شارحین نے عیدِ نظارہ کو نظارۂ ماہِ عید سے تعبیر کر کے غالب کے عجزِ فکر کی طرف اشارہ کیا ہے۔ مولانا نظم طباطبائی فرماتے ہیں کہ لفظ ہلال تنگیِ وزن سے نہ آ سکا اور شعر کا مطلب ناتمام رہ گیا۔ آسی لکھنوی لکھتے ہیں کہ یہاں مصنف نظارۂ ہلالِ عید کہنا چاہتا تھا مگر معلوم نہیں کس وجہ سے نہ کہہ سکا ـــ وغیرہ وغیرہ۔ میرے خیال میں یہ اعتراض غلط ہے معمولی ذہن والا شاعر بھی اس مفہوم کو دوسرے مصرع میں بہ الفاظِ صاف پیدا کر سکتا تھا۔ یعنی اگر نظارۂ ہلالِ عید کہنا مقصود ہوتا تو مصرع یوں بنانے میں کوئی دقت نہ تھی ؎

عید کا چاند ہے شمشیر کا عریاں ہونا

لیکن غالب نے عیدِ نظارہ کہہ کر بلندیِ فکر کا ثبوت دیا ہے شمشیر کی عریانی سے نگاہ خیال میں جو چاند بس جاتا ہے اس کا اظہار لفظِ عید سے بخوبی ہو رہا ہے۔ علمِ کلام کی خصوصیت ہی یہ ہے کہ محاکات میں تفصیلات سے پرہیز کیا جائے اور سننے والے کا ذہن ایجاز و اختصار کے باوجود مفہوم کی تمام وسعتوں پر خود بخود محیط ہو سکے۔ عیدِ نظارہ کہنے کے بعد نہ تو شعر کا مطلب ناتمام رہتا ہے اور نہ ہلالِ عید کہنے کی ضرورت باقی رہتی ہے۔"

مضمون کی طوالت کے خوف سے اُن اختلافات کی مزید مثالیں نہیں دے رہا ہوں جو سیماب نے دوسرے شارحین سے کئے ہیں۔ یہ کافی مدلل اور فکری ہیں۔ ان سے جدید و قدیم اور وسیع و محدود ذہن کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ غالب کی وسعتِ فکر اور اس کی بلند علمی سطح، اس کے مزاج و محاکات کی روشنی میں یہ شرح لکھی گئی تھی۔ "شاعر" میں جدید شرح دیوانِ غالب کی اشاعت کا سلسلہ فروری ۳۱ء سے شروع ہو کر دسمبر ۱۹۳۶ء تک چلا اور چھ سال میں ردیف وار غالب کی ۱۴۸ مکمل اور نامکمل غزلوں کی شرح شائع ہوئی۔ اسے کافی مقبولیت حاصل ہوئی اور ایک عام تقاضا تھا کہ جلد مکمل شرح کتابی صورت میں شائع ہو۔ چنانچہ دسمبر ۳۷ء کے شاعر میں اعلان کیا گیا کہ

"اب جدید شرح دیوانِ غالب شاعر میں شائع نہ ہوگی۔ مکمل کلام کی شرح جلد کتابی صورت میں شائع کی جائیگی۔"

ردیف نون تک یہ سلسلہ آیا تھا۔ آخری غزل کا نمبر ۱۴۸ تھا اور وہ تھی ؎

آمدہ کیا چاک اُس گُل کی کہ گلشن میں نہیں
ہے گریباں ننگِ پیراہن جو دامن میں نہیں

افسوس کہ والد مرحوم علامہ سیماب اپنی گوناگوں مصروفیات کی بنا پر اس شرح کو جلد مکمل نہ کر سکے۔ انہوں نے بعد کی چند غزلوں کی شرح کر کے چھوڑ دی تھی۔ شرح کے یہ غیر مطبوعہ حصے میں نے محفوظ کر لئے تھے۔ ۱۹۴۶ء اور ۱۹۴۹ء کے شدید فسادات کے بعد جب میں ترکِ وطن کر کے مستقلاً بمبئی آیا تو میں سمجھتا ہوں کہ یا تو وہ غیر مطبوعہ حصے آگرہ ہی میں کہیں تلف ہو گئے یا پھر بمبئی آنے کے بعد ان چار ٹرنکوں لکڑی کے کمروں میں دیمک کی نذر ہو گئے جو میں نے وقتی ہاؤس بمبئی میں رکھوائے تھے ـــ چاہتا تھا کہ غالب کی صد سالہ برسی کے اس موقع پر ان ۱۴۸ غزلوں ہی کی شرح کتابی شکل میں شائع کر دی جائے جو میرے پاس محفوظ ہے لیکن ان مطبوعہ صفحات کا جائزہ لینے کے بعد معلوم ہوا کہ ان میں بھی درمیان کے کچھ صفحات کم ہیں اور بدقسمتی سے شاعر کے وہ چند فائل موجود نہیں ہیں، جن میں یہ صفحات ہو سکتے ہیں۔ تفہیمِ کلامِ غالب کے سلسلے میں آج بھی اس شرح کا اپنا ایک مقام ہے۔



غالب

بہ زبانِ دیگراں

ڈاکٹر دھرم ویر بھارتی

ترجمہ: ستارہ اصلی

غالب کی چند تصویریں

غالب کا نام آتے ہی من میں چند تصویریں ابھرتی ہیں! پتنگ بازوں کا جمگھٹ، چھتوں، چھجوں اور گلیوں میں سیکڑوں
۱۸ ویں صدی کا آگرہ۔ کاشمیری والے کٹڑے کے پاس اسد اللہ کی، ایک ہے راجہ
نگاہیں آسمان میں ساری پتنگیں چھوڑ کر دو پتنگوں پر جم گئی ہیں۔ پیچ لڑ رہے ہیں۔ ایک پتنگ ہے
بلوان سنگھ کی۔ فارسی شاعری کی گلیاں، دلّی کی گلیاں،
اسد اللہ خاں کی پتنگ اُبھار دی۔ جوانی کی گلیاں، عشق کی گلیاں، ڈرتے جھجکتے اس نے ہندی زبان
فارسی کی گلیوں میں اپنے اُستاد مُلّا عبد الصمد کی تعلیم کے کارن وہ بے خوف سر اٹھا کر چلتا تھا۔
کی گلیوں میں قدم رکھا یعنی وہ زبان جو ہند میں بولی جاتی تھی۔ کہیں دکھنی، کہیں ہندوی، کہیں ہندی، کہیں بھاکھا، کہیں اردو،
نام کئی، رسم الخط کئی اور زبان ایک۔ اس زبان میں ایک کشش تھی۔ ایک مٹھاس بھری سادگی تھی اور ہندی میں
فارسی میں اس نے دنیا بھر کا علم اور چند شاستر (عروض) اور فلسفہ پڑھا تھا، مگر اس
نکھر جو سکون ملتا تھا، وہ کچھ اور ہی تھا۔ روٹھا تھا، منا تھا، رو دیا تھا، پیار دیا تھا۔ گالیاں
اس نے پتنگ بازی کی تھی، دوستیاں کی تھیں، عداوتیں کی تھیں، یہ ہندی زبان اس کے دل کی زبان تھی۔
سنی تھیں، ٹھمریاں سنی تھیں، فقرے کسے تھے اور پیار کے مصری بھرے بول سنے تھے۔ اردو میں، ہندوی میں اس نے جب شاعری شروع کی
کہ اس وقت فارسی کا بول بالا تھا۔ دلّی کی گلیوں میں، اس زبان میں،
الجھاؤ کافی پیدا ہوا۔
کے بڑے بڑے شاعروں سے لڑ گئے۔
سینچ میں زندگی دوسری الجھنیں پیدا کر رہی تھی۔ گھریلو زندگی کی تلخیاں جو کر کڑواہٹ کے درجے تک پہنچ چکی تھیں،
ناکام عشق، مغل دربار میں تناؤ اور آخر میں پشتینی وظیفے کا بند ہو جانا۔ تنگ دستی سے عاجز آ کر طے کیا کہ کلکتہ جا کر فرنگی
حالت میں عرضی دیں۔ اس وقت نہ موٹریں تھیں نہ ریل گاڑیاں، نہ ناؤ، گھوڑے، بیل گاڑیاں اور پالکی ___ راستے میں لوٹ مار،
بیمار اور تھکے۔
اور دوسری تصویر ابھرتی ہے، بنارس کی ایک سہانی شام۔ مندروں میں آرتی ہو رہی ہے۔ گھنٹے بج رہے ہیں، سنکھوں
کی گونج پھیلی ہوئی ہے۔ چراغوں اور جھاڑ فانوسوں سے سجے بجرے گنگا میں دھیمے دھیمے تیر رہے ہیں اور کلکتہ جاتا ہوا ایک
تھکا ہوا مسافر گھاٹ کے کنارے بیٹھ کر اس پوتر نگری کو دیکھ رہا ہے۔ اس کے منہ سے بے ساختہ نکل پڑتا ہے
تعالی اللہ بنارس چشم بد دور (یا خدا بنارس کو بُری نظر نہ لگے)



"بہشت خرم و فردوس
یہ بنارس اپنی دلی سے بھی بہتر لگا جہاں
انہیں گنگا کی لہریاں بڑی مقدس آوازوں میں ملا رہی ہیں۔ یہ بنارس ان کے من میں اس قدر بس گیا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ کاش میں یہیں بس سکتا اور گنگا کی لہروں میں اپنے سارے گناہ دھولیتا۔

یہ شاعر مسافر غالب ہے۔ غالب کی یہ تصویر بار بار میرے من میں ابھرتی ہے کیونکہ یہ اس کے کاویہ ویکتتو (شاعرانہ شخصیت) کے ڈھکے چھپے پہلوؤں کو اجاگر کرتی ہے۔ بنارس کو دعائیں دیتا ہوا یہ شاعر ہندو نہیں ہے۔ تیلو کا فلسفہ اسے نہیں معلوم۔ اسے دیوی دیوتاؤں میں یقین نہیں مگر یہ شاعر مسلمان بھی نہیں ہے۔ وہ ان بت حالوں کو توڑنے اور بت پرستی کو کفر قرار دینے کی بات نہیں سوچتا۔ گنگا کو پوتر ندی ماننے اور اس کی لہروں میں اپنے گناہ دھونے کی بات اسے اپنی مذہبی کتابوں میں نہیں ملتی۔ یہ آدمی ایک دوسرے مذہب کا ماننے والا ہے۔ وہ مذہب ہے آدھیاتمک (روحانی) سُندرتا اور سامنجیہ (ہم آہنگی کا مذہب) اس کی رگوں میں ہندوستانی خون بہہ رہا ہے۔ ہزاروں سال کی تہذیبی پرمپرا (روایت) نے سُندرتا اور سامنجیہ (ہم آہنگی) کے جو معیار [illegible] کئے ہیں بنارس ان کا پرتیک (علامت) ہے اسی لئے اس کا دل بنارس میں رم جاتا ہے۔ یہ بنارس ہندوستان کا کعبہ ہے (صرف ہندوؤں کا نہیں)

"ہمہ ما کعبۂ ہندوستان است"

دلی اور کلکتہ کے بیچ ـــــ بنارس ایک دوسرے نظریئے سے بھی غالب کی تہذیبی شائستگی کی علامت ہے۔ دلی میں ایک پرانا شاہی سلسلہ دھیرے دھیرے مٹ رہا ہے۔ دیسی حکومت کے ڈھلتے چڑھاؤں کا شہر ہے دلی۔ کلکتہ میں ایک نئی سلطنت کا مرکز ہے۔ مغرب کے نئے خیال، نئی چال ڈھال، نیا رہن سہن، نیا ادب کلکتہ سے دھیرے دھیرے ہندوستان میں پھیل رہا ہے۔ غالب ان دونوں کے بیچ ہیں۔

پچھلے دنوں جشن غالب کے سلسلے میں بہت سے لوگوں نے بہت سی باتیں کہیں اور بہت سوں نے انہیں اس رنگ میں پیش کیا جیسے وہ کوئی بڑے سیاسی نیتا تھے جنہوں نے غدر میں بہادری دکھائی یا مذہبی ایکتا کا جھنڈا بلند کیا۔ ایسے تمام لوگ غالب پر وہ مصنوعی لبادے لادنا چاہتے ہیں جو سیاسی دنیا میں پرانے بے کار اور جھوٹے پڑ چکے ہیں۔ غالب کا راستہ سیاست کا، سماج سدھار کا، یہ مذہبی یا بھاشائی اندولنوں (لسانی تحریکوں) کا راستہ نہیں تھا۔ یہ راستے شاعر کے راستے ہوتے بھی نہیں۔ شاعر ایک خاص قسم کی ذہنیت کی زمین پر جیتا ہے جس میں جذباتی دردمندی اور حسیاتی لطیفیں زیادہ ہوتی ہیں۔ وہ وچاروں کی سطح پر بہت کچھ جانتا ہے اور سمجھتا ہے۔ مگر قبول صرف وہی کرتا ہے جو احساس سے ٹوپیلے کر اس کے پاس آئے۔ اسی معاملے میں غالب کھڑی بولی کے ہندی اور اردو دونوں میں سب سے پہلے سچے، گہرے اور بڑے شاعر تھے۔ میں برج یا اودھی کی بات نہیں کر رہا، لیکن کھڑی بولی میں اس لحاظ سے وہ اتہاس کے کرم (تاریخ کے ابواب) میں سب سے پہلے آتے ہیں۔

آپ نے ہندی کے مہان کوی نرالا کا نام سنا ہوگا۔ وہ اس سچی، کھری اور گہری کویتا کی کسوٹی تھے۔ سب کو بنا کسی رو رعایت کے کستے تھے۔ کلکتہ میں جن دنوں وہ کئی ساہتیک (ادبی) لڑائیاں لڑ رہے تھے اسی سمے انہوں نے اعلان کیا تھا کہ ہندوستانی زبانوں میں صرف تین کوی ہیں جن کو وشو کوی (آفاقی شاعر) کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔ رویندر ناتھ ٹھاکر، غالب اور تلسی داس۔ یہ تینوں ویدانت کی زمین پر کھڑے ہیں۔ بعد میں نرالا نے کہا تھا کہ رویندر ناتھ میں جذباتیت کی کچھ ایسی بہتات ہے جو نہ ہوتی تو اچھا تھا۔ اس لحاظ سے انہیں رویندر ناتھ کے مقابلے میں غالب اور تلسی ایک دوسرے کے زیادہ نزدیک لگے تھے۔ اپنے بہت بھاؤ وبھور (وجدانی) لمحوں میں نرالا تلسی کی گیتاولی کے پد گاتے تھے اور کبھی کبھی غالب کے چند اشعار، جن



شعر ان کو خاص طور سے پسند تھا ؎

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

لیکن میرے خیال میں ایک بات اور یاد رکھنی چاہئے۔ ویدانت یہ مان کر چلتا ہے کہ جیو آتما (ذی روح) اور پرماتما ایک ہیں۔ دونوں کا الگاؤ مصنوعی ہے، لیکن دونوں کا جز ایک ہے۔ ویسے بوند اور دریا دونوں مل کر ایک ہو جاتے ہیں اور یہی پونرتا یا تکمیل ہے لیکن یہ تکمیل اگر حاصل ہوتی ہوگی تو شاید یوگیوں کو حاصل ہوتی ہو۔ ہم نہیں جانتے۔ شاعر کی اہمیت اس بات میں ہے کہ وہ اس تمام زندگی کو جسے ویدانت مصنوعی بتاتا ہے اسے اصل سمجھ کر جیتا ہے۔ اس کی مٹھاس اور کڑواہٹ میں ہمیشہ مدیا مسرت پاتا رہتا ہے۔ اسے اس پورن (مستقل تکمیلی کیفیت) یا برہما کا احساس (شعور) تو ہوتا ہے مگر وہ اپنی اس ادھوری خوشیوں اور ادھوری پیڑاؤں والی زندگی کو نقلی ورن دے کر پرماتما یام سادھ کر اس سب کو بھول کر سکون نہیں پانا چاہتا۔ وہ اپنے ادھورے پن اور ٹوٹے پن کے دھوپ چھائیں رنگ میں زیادہ سکون حاصل کرتا ہے۔ برج بھاشا کی کویتا میں اس بات کو بڑی خوبصورتی سے کہا گیا ہے۔ ایک بار کرشن نے گوپیوں کے پاس اودھو کو بھیجا کہ وہ انہیں ویدانت سکھائیں اور بتائیں کہ ان کا سارا دُکھ جھوٹا ہے۔ من کے اندر جوگ سادھ کر وہ پرماتما کو دیکھ لیں اور دریا میں بوند کی طرح فنا ہو جائیں۔ اس پر گوپیوں نے انہیں جواب دیا تھا کہ دریا تو پہلے ہی سے اننت (لامحدود) ہے۔ اس کا کچھ نہ بگڑتا نہیں ہے مگر آپ ہمیں جو اُپدیش دے رہے ہیں اس سے بوند تباہ ہو جاتی ہے۔ بوند (گوپیاں) اپنی بوندتا کو کھونا نہیں چاہتیں۔ ساری تکلیف اور درد کے باوجود .....

گہری اور دل چھونے والی شاعری کا یہی راستہ ہے، بدھ ویدانت کا راستہ نہیں۔ اسی ناتے مجھے بہت بار سُور اور دوسرے کرشن بھگت کویوں کی شاعری تلسی کی شاعری سے زیادہ سچی اور گہری شاعری لگی ہے۔ میں تلسی کی عظمت پر سوالیہ نشان نہیں لگا رہا ہوں۔ صرف شاعری کے اور گہرے ــــ راستے (سطح) کی بات کر رہا ہوں اور یہاں میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس گہرائی میں غالب سُور کی زمین پر ہیں، تلسی کی زمین پر نہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ تصوف کے بڑے ودوان ہیں۔ جانتے ہیں کہ ؎

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

غم کی آن کچھ اور ہے اور اسی لئے وہ کہتے ہیں ؎

درد منت کش دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا، برا نہ ہوا

یہی چبھن ہے جو بار بار اُن کی شاعری میں اُبھر کر آتی ہے۔ یہ وہ تیر ہے جو چبھا تو ہے مگر پار نہیں ہوا۔ اگر پار ہو جاتا تو وہ شاید بقا یا فنا کے نزدیک پہنچ جاتے اور درد ختم ہو جاتا۔ مگر یہ تو شاعری کی منزل نہیں۔ اسی لئے وہ کہتے ہیں ؎

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

اور یہ آدھا چبھا ہوا تیر صرف سامانیہ پریم پرسنگ (عام محبت کی واردات) کا تیر نہیں ہے۔ یہ زندگی کی تمام کڑوی سچائیوں کا، صرف عشق کی مایوسی کا تیر نہیں۔

غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غمِ عشق گر نہ ہوتا، غمِ روزگار ہوتا

اس غمِ عشق اور غمِ روزگار نے غالب کو کہاں نہیں توڑا۔ ایک طرف وہ اس کو مغل دربار کی مصاحبی پر بھی طعنہ کستا اور اپنے شاعر کے سوابھمان (غرور) کو مصاحب کے سوابھیمان سے اونچا مانا۔ یہ کہا کہ ؎

ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

اور پھر بعد میں تنگ دستی سے عاجز آ کر بادشاہ کے لئے  سہرا لکھنا، وظیفہ قبول کرنا اور پھر اپنی اس ہار پر خود ہی اُداس جنگ کرنا ــــ

غالب وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا — وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

غالب کی شاعری کی جو گہری اُداسی اور ٹوٹن ہے وہ زندگی سے جوجھتے ہوئے مگر ہار کر ٹوٹتے ہوئے اور اپنی ہار اور ٹوٹن کو پہچانتے ہوئے شاعر کی آواز ہے۔ اُس اُجڑے پن اور اکڑے پن کی آواز جہاں ...

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے — دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

پھر اس ویرانی سے گھبرا کر کیا کیا نہیں ہوا، شراب، جوا، قرض، جیل ـــ زندگی کا وہ سنگھرش جہاں سب اچھا ٹوٹتا جاتا ہے اور بُرا جیتتا جاتا ہے ـــ

نے گلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز — میں ہوں اپنی شکست کی آواز

اور انتہا ہے اداسی کی کہ شکست کی آواز کے لئے بھی وہ شکرگذار ہے کہ کوئی آواز تو بچی ہے، ورنہ ـــ

بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن

یہی چیز ہے جو انہیں سچی، گہری اور ایمان دارانہ شاعری کی زمین پر کھڑا کرتی ہے۔ یہ صرف ایک سامانیہ گنہگار نہیں ہے، وہ ایک سنت ایک ولی نہیں ہے، ان دونوں کے بیچ کہیں ہے ـــ

یہ مسائلِ تصوف، یہ ترا بیان غالب — تجھے ہم ولی سمجھتے، جو نہ بادہ خوار ہوتا

اور اس بادہ خوار ولی شاعر کا اپنے خدا سے بھی جو رشتہ ہے وہ ایک دوسرے قسم کا رشتہ ہے۔ جہاں عزت بھی ہے اور برابری بھی۔ ایک طرف وہ شکایت کر سکتا ہے ـــ

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب — ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

اور اسی لئے اُن کی بندگی میں بھی ایسا ایک الگ طرز ہے۔ ایک الگ آن ہے ـــ

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم — اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

یہ بھاؤ بھومی (موضوعی زمین) تند صوف یا تند ویدانت کی بھاؤ بھومی نہیں تھی، یہ ایک دوسری وچار دھارا (نظریہ) کی بھاؤ بھومی تھی، جو ہندوستانی شاعری پر پچھلے چار پانچ سو سال سے چھائی ہوئی تھی جس نے ہندو اور مسلمان دونوں کو یکساں (متاثر) کیا تھا، وہ تھی "ویشنوتا" کی بھاؤ بھومی جہاں سنت میں بھی نہ صرف بندگی کی آزادی تھی بلکہ برابری کے آدھار پر اپنے خدا سے شکوہ شکایت کرنے کا پورا حق تھا۔ اس دھارا کے عظیم شاعر سُور نے ایک اور اپنے کو گنہگار کہا تھا "موسم کون کو رمل کھل کامی"۔ مگر جب آچاریہ ولبھ نے انہیں بتایا کہ ـــ سُور تم کوی ہو کر گھگھیاتے کیوں ہو۔ ایشور کو تمہارا سکھا ہے" تب انہوں نے کہا تھا ـــ

آجو ہوں ایک ٹک کری ٹری ہوں
کے ہم ہی کے تم ہی مادھو
اپن مرو سے لاری ہوں

ہندوستان کی اس اُدات (وسیع) روایت کی وراثت جانتے یا انجانے میں غالب کو ملی تھی۔ یہی وجہ ہے اُن کی شاعری کے اس انوکھے تیور کی۔ اسی تیور کو رحیم نے لیا تھا، رس کھان نے اپنایا تھا۔ اکبر کی بیگم تاج نے اپنایا تھا۔ تاج معلاتی تھی۔ اُس نے ہندوستانی کا رہن سہن اپنایا مگر رہی وہ معلاتی۔ لیکن آج بھی تیری ناتھ جی کی پوجا میں آرتی جب ہوتی ہے تو



جن میں کسی ہندوستت کے گیت نہیں گائے جاتے، تا کہ یہ گائے جاتے ہیں [illegible]
شولیہ وات (مقدس) مانی گئی ہے، جو تارکی پوجا سے پوتر ہوئی تھی۔

کیونکہ سچی شاعری کی زمین پر خدا یا مذہب یا دھرم یا بھگوان دھرم شاستروں (مذہبی کتب) میں بتائے گئے اصولوں کا محتاج نہیں ہوتا۔ اس زمین پر تو سچی شردھا (عقیدت) اور من کی ایمان داری ہی دھرم کا سادھن ہے۔ اسی کو غالب نے بہت دو ٹوک ڈھنگ سے کہا تھا —

وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے
مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

غالب کی ہمت پر یہ بحث اٹھی تھی کہ وہ شیعہ تھے یا سنّی۔ کون جانتا ہے کہ اگر کئی سو سال پہلے کی بات ہوتی تو کبیر ہی کی طرح نہیں بھلے کر کوئی یہ سوال اٹھا دیتا کہ وہ ایسے بادہ خوار لیکن مسلمان برہمن تھے، جس کے لئے اصل ایمان تھا وفاداری بشرطِ استواری۔ اور جو بت خانے میں مرے لیکن کعبے میں دفنائے جانے کے قابل ہیں۔

بات تو یہ ہے کہ سولھویں صدی کے بعد سے ہمارے یہاں تصوف اور بھگتی کی زمین پر جو ملی جلی تہذیب پیدا ہوئی تھی وہ ہر سیماؤں کو پار کر گئی تھی۔ اس سچی سنسکرتی میں انسان کو سب سے اونچا درجہ دیا گیا تھا۔ باقی سب چیزیں اس کے بعد آتی تھیں۔ اس بھاؤنا کو جن لوگوں نے اپنایا اور آگے بڑھایا وہ سبھی سچے معنوں میں ہمارے پُرکھے ہیں۔ خسرو ہوں یا نانک، کبیر ہوں یا تلسی، سور ہوں یا رس کھان، جائسی ہوں یا میرا، غالب ہوں یا بھارتیندو ہریش چندر۔ میں یہ ماننا چاہتا ہوں کہ جو ہندو خسرو، جائسی، رس کھان، کبیر، میر اور غالب کو اپنا پُرکھا نہیں مانتا، وہ تنگ دلی کا شکار ہے۔ جو مسلمان سور، کبیر، میرا، نانک اور بھارتیندو ہریش چندر کو اپنا پُرکھا نہیں مانتا، وہ ہندوستانی تہذیب کی اس دھارا سے اپنے آپ کو کاٹ کر الگ کر لیتا ہے۔

ایک خیال ضرور غالب کے سلسلے میں ابھر آتا ہے جو اس طرح اُدار (وسیع)، گہرا اور موَلِک (منفرد) تھا۔ کاش ہندوستان کی رنگا رنگ سانسکرتک (تہذیبی) زندگی کو اتنے نزدیک سے اتنے وِستار (پھیلاؤ) میں جان پایا ہوتا جتنا اس کے آگرے کے بعد نے جانا تھا، یا کاش وہ ہماری بول چال کی زبان کی نرمی اور اندرونی لے سے بھی اتنی ہی گہرا پریچت (واقف) ہوتا، جتنا میر تھے۔ لیکن یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ ان کا خاندان صرف دو ہی پیڑھیوں سے آکر بسا تھا اور اُن کی ساری شکشا دیکشا (تعلیم و تربیت) بھی فارسی ہی میں ہوتی رہی۔ وہ ایسے ورگ (طبقے) سے آئے تھے جہاں فارسی چھوڑ کر ہندی یا ریختہ میں لکھنا بھی اچھا نہیں مانا جاتا تھا۔ ان سیماؤں کے باوجود انہوں نے نہ صرف ریختہ میں لکھا، بلکہ جہاں بھی فارسی اور ان چیت (غیر ضروری) پربھاؤ (اثر) سے مُکت (آزاد) ہو کر انہوں نے محاورہ دار زبان اپنائی ہے، وہاں ان کا کوئی جواب نہیں ہے اور اس سادھی بھاشا میں اتنے بھاؤں بھاؤں کی ادائیگی ہی نے اُن کو ایک ایسا درجہ دیا، جو ان کے سم کالین (معاصرین) دوسرے شاعروں کو حاصل نہیں ہو پایا۔ جیوں جیوں عمر بیتی گئی تیوں تیوں ان کی یہ شیلی (طرز) اور بھی نکھرتی گئی اور بعد میں انہوں نے بالکل بات چیت کے لہجے میں جو مرم اسپرشی (دل چھونے والے) خط اپنے دوستوں کو لکھے ہیں وہ آج بھی کھڑی بولی گدیہ (نثر) کے نایاب نمونے ہیں۔

میرے خیال میں ایک شاعر کے لئے سب سے بڑی شردھانجلی یہی ہو سکتی ہے کہ اپنی تنگ دلی چاہے وہ مذہبی ہو یا بھاشا کی، اس سے ہٹ کر ہم اس کو ٹھیک ٹھیک سمجھیں اور وفاداری بشرطِ استواری کے جو معیار وہ قائم کر گیا ہے، انسان کے درد اور ویکتی (فرد) کی کوشش اور اندھیرے کے بیچ میں سحر ہونے تک شمع کے ہر رنگ میں جلنے کی جو تصویر وہ پیش کر گیا ہے، اس کے ہر رنگ کو پرکھیں اور اسے اپنے لکھنے میں اُبھاریں اور اس سے اپنی کویتا کی سرزمین اور اپنی بھاشا

(باقی صفحہ ۵۳۵ پر دیکھیے)

پروفیسر کیشو میشرام
ترجمہ : سُومن سیرکار

غالب اور مراٹھی قاری

بزرگ شاعر بادھو جولیکر کی "غزلانجلی" اور کسوماگرج کی "جیون لہری" جو کہ عمر خیام کی یاد کو تازہ کرتی ہے پھر بھی جس کے مطالعے سے قاری کو ایک قسم کی کمی کا احساس ہوتا ہے۔ دوسرے معنوں میں یہ کہ قاری مکمل طور پر مطمئن نہیں ہو پاتا۔ وہ ملمع ہی کچھ انوکھا اور اچھوتا سا ہوتا ہے جس کی تلاش اُسے لاحق ہو جاتی ہے۔ ہمدردانِ اُردو سے اکثر شاعروں کا، قوالی کی رنگینیوں اور غزلوں کے اچھوتے انداز کا ذکر سنا ہے۔ ان تمام چیزوں کا عکس مرزا غالب کے کلام میں نمایاں طور پر پایا جاتا ہے۔ اردو کا صاف اور دھیما لب ولہجہ، آسمانی گہرائیوں کی آواز اور زندگی کی صحیح عکاسیوں ساتھ ساتھ زندگی سے اٹوٹ رشتہ، پیار اُس کی چاہت، اُردو کے یہ تمام رنگ غالب کے کلام میں پائے جاتے ہیں۔ یعنی ایک اکیلا غالب ان تمام اصناف اور رنگوں پر حاوی ہے۔ اس لئے ہم غالب کو اُردو کا امام کہہ سکتے ہیں۔

غالب کی بہتّر سالہ زندگی میں جہاں انہیں سکھ اور چین کے چند لمحات میسّر آئے وہیں دوڑ دھوپ، مان اپمان، یہاں تک کہ انہیں مقدمے تک کی صعوبتیں جھیلنی پڑیں۔ اُن کی بھری پُری زندگی جو بنا اولاد کے گذری، اِس گہرے داغ کو بھی انہوں نے خاموشی سے اپنے سینے میں چھپا لیا۔ عام لوگوں کی طرح سکھوں اور دکھوں کو جھیلنے کے بعد ہی اُن کے اندر کے فن کار کا چہرہ نکھر آیا۔ غالب جو رندہ رہے وہ بھی اپنی ایک طرح کی مستی میں۔ جو مصیبتیں جھیلیں وہ بھی مخصوص انداز میں اور اسی لئے ان کی شاعری ان تجربات و حقائق کا سنگم بن کر امر ہو گئی ہے۔

عام سماج کے دل اور روح کو جانچنے اور پرکھنے کی قوت ہی غالب کی شاعری کا سب سے بڑا اور اہم باب ہے۔ سماج کے ہر باریک سے باریک پہلو پر اُن کی عمیق نظریں جہاں ہمیں حیرت و استعجاب میں ڈال دیتی ہیں، وہیں بیک وقت اُن کا مزاح سے تعلق بھی کسی کارنامے سے کم نہیں۔ ایسے نامساعد حالات میں ان کی مزاح کی قوت کا بیدار رہنا کسی معجزے سے کم نہیں۔ اپنی تخلیق تو نوں کے ساتھ ساتھ اپنے ذاتی اور بھی پہلوؤں کی طرف دیکھنے کا انداز بھی منفرد تھا۔ اس ضمن میں اُن کا یہ شعر ؎

ہوگا کوئی ایسا بھی کہ غالب کو نہ جانے
شاعر تو وہ اچھا ہے پہ بدنام بہت ہے

یہ روش اور یہ مخصوص انداز غالب کے سوائے کسی اور کا نہیں ہو سکتا۔

زندگی سے متعلق غالب کا نظریہ مختلف ہے اور اسی لئے وہ اچھوتا بھی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اُن کی شخصیت مختلف پہلوؤں کا منبع ہے۔ زندگی کے اتار چڑھاو کا سامنا اور مقابلہ کرتے وقت ان کے اندر کا فن کار اور انسان بیدار رہا ــــ اس لئے اُن کی بدحالی کے زمانے میں بھی ان کا پُرانا کس بل اپنی وضع پر قایم رہا ؎ اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا



خدا کے واسطے داد اس جنونِ شوق کی دینا — کہ اس کے در پہ پہنچتے ہیں نامہ بر سے ہم آگے

خدا کے واسطے سے بھی ہم لوٹ آئیں گے اگر ... یہ لطف عشق کے علاوہ آدھے مسلمان کا ذکر بھی مذہبی عقائد رکھنے والوں کے لئے ایک اہم بحث طلب ... آج بھی ایسی کہانیوں اور ناولوں میں ایسی روایات سے محبت کرنے والوں پر بغاوت کا الزام لگایا جاتا ہے۔ ایک اور جگہ اس کا اظہار انہوں نے یوں کیا ہے ؎

کہاں میخانے کا دروازہ غالبؔ اور کہاں واعظ — پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

پیشے کے اعتبار سے مذہبی لوگوں کا اپنے دین و مذہب کا پرچار اور ان کے اپنے اعمال میں فرق پایا جاتا ہے۔ لیکن سماج کبھی یہ جاننے کی کوشش نہیں کرتا کہ مذہب کہاں سے شروع ہو رہی ہے یا یہ رستی اور مذہبی کہاں سے آئے ہوئے ہیں۔ بس اس کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ جو کچھ کہیں، جس کسی بات کا اپدیش دیں، اسے خاموشی سے گوش گزار کر کے ان لوگوں پر پورا اعتماد رکھے۔ لوگ فن کار کو سمجھنے میں کوتاہی کیوں برتتے ہیں۔ یہ بھی غالبؔ کا ایک نظریہ اور ہمارے لئے ایک اہم سوال ہے!

ہر انسان کی کمزوری یہ ہے کہ وہ اپنے دکھوں کے ذخیرے کو لوگوں کے سامنے پیش کر کے ان سے ہمدردی کا مطالبہ کرتا ہے اور خود کے دل کا بوجھ اتارنے کی کوشش میں ملتاں نظر آتا ہے۔ لیکن غالبؔ اپنی جسمانی اور روحانی تکالیف، غم روزگار کی مصیبتوں کا کسی کو دار بنانے کے حق میں نہیں ہیں اسی لئے تو وہ کہتے ہیں ؎

پڑئیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار — اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

غالبؔ کے نزدیک دکھ ایک انمول شے ہے اور اسی لئے انہوں نے دل کھول کر اس پر لکھا بھی ہے۔ جب سے انسان کا وجود ہوا ہے اس وقت سے سچا ساتھی غم ہی ہے۔ اس ایک غم نے اس کا کبھی ساتھ نہیں چھوڑا۔ یہ کسی نہ کسی روپ میں سائے کی طرح اس کے ساتھ ساتھ رہتا ہے۔ محبت میں ناکامی کا غم، توہین کا غم، دکھ درد، اولاد کا غم، اپنی نگارشات سے متعلق لوگوں کی بے اعتنائی، پیر شخصیت و کردار کے ترازو میں تولتے ہوئے انسان کی عظمت اور بڑائی کے احساس کو غالبؔ ایک نیا روپ عطا کرتے ہیں ؎

غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی — کہ کرے تعزیتِ مہر و وفا میرے بعد

ان کی یہ فکر یقیناً اوروں سے مختلف اور منفرد ہے۔

تمنا، آرزو، امید و مایوسی کا ذکر بھی انہوں نے اس انداز سے کیا ہے کہ وہ دل میں گھر کر جاتا ہے۔ امید کے بل بوتے ہی پر انسان زندہ رہنے کی کوشش کرتا ہے، زندگی سے پیار کرنے پر مجبور ہوتا ہے لیکن غالبؔ اس نظریے کو یوں ادا کرتے ہیں ؎

کہتے ہیں جیتے ہیں امید پہ لوگ — ہم کو جینے کی بھی امید نہیں

فطری عناصر اور نیچرل چیزیں ہی ان کے دکھوں کی ہم حصہ دار ہیں یہاں تک کہ لہروں کی ترنگ میں اپنے دل کے آثار جیسا انہیں احساس ہوتا ہے ؎

لختِ جگر سے ہے رگِ ہر خار شاخِ گل — تا چند باغبانیِ صحرا کرے کوئی

ہر انسان اپنے اپنے دکھوں اور مصیبتوں کو جھیلتے اور ان کا مقابلہ کرتے کرتے عاجز آ گیا ہے۔ ایسی ستائی ہوئی دنیا کے سامنے میں اپنے غم کیونکر بیان کروں؟ ان کے سامنے اپنے دکھوں کا اظہار کر کے انہیں اور آزردہ بنانے کا ارادہ نہیں۔ اس لئے بھی کہ فن کار کا غم اوروں سے الگ ہوتا ہے اور پڑھنے والوں کو بہر صورت متاثر کرتا ہے۔

لوگوں کو ہے خورشیدِ جہاں تاب کا دھوکا — ہر روز دکھاتا ہوں میں اک داغِ نہاں اور

لیکن یہ رنگ یہ داغ اور بھی گہرے ہو جاتے ہیں جب وہ عشق و محبت کی ناکامی کا ذکر کرتے ہیں۔ عشق کی رنگینی و ناکامی کا جہاں جہاں انہوں نے اظہار کیا ہے وہاں قاری کو اپنی پسند کا شعر چننا ایک اہم اور مشکل مسئلہ بن گیا ہے ؎

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا — درد کی دوا پائی، درد بے دوا پایا



اس میدان میں آدمی جہاں محبت کو پایا ہے وہیں سب کچھ کھوتا بھی ہے۔ ہر انداز کے اور ممکنات کے رد و بدل اور محبوب سے بے رخی ہی میں محبت کی کامیابی کا راز نہاں ہے۔ یہ آگ ہمیشہ ہی قربانیوں کی مانگ کرتی رہتی ہے۔ مراٹھی کے رزمیہ شاعر تری وا۔ وا۔ یا شنکر نے ایک جگہ لکھا ہے "لگی ہوئی اس آگ کو سنبھالیں گے عمر بھر۔ اور محبت کی اس آگ کو عمر بھر سنبھالتے اور سینے سے لگائے رہے کے باوجود بھی اگر اس میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے تو وہ محبت امر ہو جاتی ہے۔ اس کے لئے پیار کا ایک ہی لمحہ کافی ہے جس پر موت کی ہزاروں برساتیں قربان ہیں۔" گو وہ اگرچہ کے اس خیال سے مراٹھی قاری واقف ہیں ہی، غالب کا یہ شعر بھی دیکھئے ؎

تو ہر گئی ہے مجھے آپ ؟ ہو لئے زندگی　　　یعنی تجھ سے تھی اسے ناسازگاری ہائے ہائے

محبت کا دوسرا نام انتظار ہے۔ لیکن اس لوٹ انتظار کے بعد بھی اگر وصال کی گھڑیاں میسر نہ آسکیں تو پھر رہے قسمت۔ انتظار کی یہ کیفیت بھی دیکھئے ؎

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا　　　اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

لیکن صرف عشق و محبت کا تذکرہ اور ناکامی کا المیہ ہی ان کی شاعری کا حصّہ نہیں ہے۔ انہوں نے سنجیدگی اور گہرائی سے زندگی کا مطالعہ کیا ہے اور آتما کی گہرائیوں کے ساتھ دوسری آتماؤں میں اتارا ہے۔ جس طرح مراٹھی کے بزرگ شاعر کیشو سُوت نے ایک جگہ یہ لکھ کر کہ "صرف صنعت سے نئے راگوں کی تخلیق کرنا فن کاروں کے سوائے کسی اور کے بس کا روگ نہیں" فن کاروں کے عظیم ہونے کا ثبوت بہم پہنچایا ہے، بالکل اسی طرح غالب کے تمام شعر بھی بارہا دوہرائے جانے کے قابل ہیں ؎

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا　　　ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

مراٹھی میں رزمیہ شاعری کی ابتدا کرنے والے تری وا۔ وا۔ یا شنکر نے بھی انہیں راستوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے ؎

آج میرا نام ہے اور فردا کا ہوں میں کل
کل کا میں فردا نہیں، نہ کل کا کل
کہہ نہیں سکتا کہاں اور کیسے رہوں گا میں
تصویر سے جب تمہیں دکھا کروں گا میں!

غالب غلامی میں رہ کر سکھ کی زندگی گذارنے سے آزادی کے دکھوں کو سینے سے لگانے کے قائل ہیں۔ غلام بن کر محفوظ زندگی گزارنا ان کا آدرش نہیں۔ آزادی کی پُرخطر زندگی کو اپنانا اُن کا اصول ہے۔

غالب نے جس طرح غم کو مختلف زاویوں سے دیکھا اور پرکھا ہے اُسی طرح خوشی پر بھی ان کی نظر طائرانہ نہیں ہے بھگوت گیتا کی یہ تعلیم کہ "غم و خوشی ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ ان کا ساتھ اٹوٹ ہے۔" اسی نظریہ کو غالب نے اپنا کر اپنی انفرادیت کو برقرار رکھا ہے۔ آج کی ظاہری خوشیاں سالہا سال سے برداشت کی ہوئی تکالیف کا رد عمل ہیں یا پھر ہنستی آنکھوں کے پیچھے غم کے سیلاب چھپے ہوئے ہیں

خلتے پائے خزاں ہے بہار اگر ہے یہی　　　دوام کلفت خاطر ہے عیش دنیا

صاف لب و لہجہ اور تجربے کی گہرائی ہی نے غالب کے تخلیقی سوتوں کو دل چھونے والی قوت دی ہے۔ "غزل" اُردو شاعری کی بڑی مشہور صنف اور اظہار کا وسیلہ و ذریعہ ہے۔ مراٹھی میں بھی غزلوں کی ابتدا ہوا اس کے لئے اہم کوشش مادھو راؤ پٹوردھن نے کی ہے اُن کی غزل ناکلی کے کچھ شعر آج بھی دل و دماغ کو تازگی بخشتے ہیں۔ مثال کے طور پر ؎ "کہوں کتنی دفعہ، کروں کتنی منت و مجبوری۔ کب تلک کہتا پھروں میں تمہارا، تم بھی ہو جاؤ میری"۔ یا "دُور ہی سے پی رہا ہوں خوبصورتی کے جام۔ اور پھر بھی



شاعر۔ جیبیٔ
کہتا رہا ہوں صحت کا ماتم
شری کرشن پوولے کی "آگی پراگ" اور بلبلا
پھول سے اٹ گئے خیابات کے سارے صدا

... دلوں کے ساز پر گیت گا ۔ پریت ہی کا گیت گا ہستی میں گا
داغ گہرے رکھ دل میں نہاں ۔ زندگی کی ناکامیوں کے گیت گا

گ۔ دی۔ ماڈگلکر کا یہ شعر
کیوں جلد سے اس طرح کچھ نہیں کہا تم نے
دنوں کے ساتھ کا کیا یہی تھا فیصلہ

بالی شیلکے ؎
بات لب پہ جو آئی، اُسے ادا کرو ۔ خواب کی اِس تعبیر کو ہاتھ سے جانے نہ دو
باتیں تھیں، سارے سپنے ہیں سب ولولے ۔ روئے دل آنسوؤں پھر ہنسی رہیں آنکھیں!
ہری۔ وا۔ وا۔ پاٹنکر۔
تم ریشمی زلفیں سنوارو اپنے ہاتھوں سے ۔ ابھی میں زندگی کے بے لاگ دھاگے یہاں ہیں
علاوہ کسوما گرج ۔ وا۔ را۔ کانت، وِندا کرندیکر نے بھی اِس زمین میں طبع آزمائی کی ہے ۔ شری سُرلیش بھٹ مراٹھی کے مشہور غزل گو ہیں ؎

یہ جو میرا وجود ایک لمحہ بن گیا
انگ انگ میرا کرب ہی میں سہہ گیا
ہستی کا خمار بھی دیکھئے ؎
ہوتا ہے آکاش گنگا میرے قدموں میں
پھر میں توڑتا ہے کبھی چرچ کہن
زمین کا دل ہلا دیتا ہے میرا وجود
تجھ سے ہیں گناہوں میں بھی میرے ثواب!

شری سیتھ د مادھو او گاڈ گی، را۔ کسی جوشی، شری پاد جوشی، دتھیا جو گڈ کھلے اور بارائی سُروے نے اردو کے شہ پاروں کو مراٹھی میں منتقل کر کے مراٹھی قاری کو ایک حد تک اردو کے نامور ادیبوں اور شاعروں سے متعارف کرانے کی ایک اہم ذمہ داری کو پورا کیا ہے ۔

سنسکرت ادب میں جس طرح کھوکھوتی نے "وقت کے لئے کوئی حصار نہیں اور زمیں کا کوئی اور نہ چھور" تحریر کر کے شاعری سے لاپروائی اور بے توجہی کا ثبوت دیا، غالب نے بھی اسی روش کو اپنا کر اپنے خیالات کا اظہار یوں کیا ہے۔

نہ ستائش کی تمنا، نہ صلے کی پروا　　گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

تاج محل اور جمنا کے کنارے بسے ہوئے آگرہ میں ۱۷۹۷-۱۲-۲۷ میں اس نادر اور سایہ دار درخت کا جنم ہوا اور اس سے دلی محبت اور لگاؤ رکھنے والوں کے لئے ایک لازوال پیغام اور کبھی ختم نہ ہونے والی ٹھنڈی چھاؤں کو جنم دے کر

(باقی صفحہ ۵۳۶ پر)

نارائن سُروے
ترجمہ سُوریہ سیوکار

"بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالبؔ"

میں پہلے مراٹھی کا ایک عام قاری ہوں اور اس کے بعد ادیب یا شاعر۔ اس حلقے کی تحریر کا قائل میں اس لئے ہوا ہوں، چونکہ غالبؔ کے کلام کا مطالعہ میں نے اپنے دل کی گہرائیوں کے ساتھ کیا ہے۔ کچھ تو دیوناگری لپی میں اور کچھ اپنی اس ٹوٹی پھوٹی اُردو میں جس پر بہتوں کو رشک ہوتا ہے۔ میں اپنے مطالعے کی روشنی میں یہ بات واضح طور سے کہہ سکتا ہوں کہ مراٹھی زبان کے مشہور شاعر کیسوسُوت کی طرح غالبؔ بھی مجھے اپنا ہی شاعر محسوس ہوا ہے اور میرے لئے یہ بات نہ صرف قابلِ تسکین ہے بلکہ قابلِ فخر بھی ہے۔ ایک عام قاری اور ادیب کے مابین جو اونچ نیچ کا فرق پایا جاتا ہے وہ بھی کسی سے ڈھکا چھپا نہیں۔ جب قاری کسی بھی شہ پارے کا مطالعہ کرتا ہے تو وہ اچھے بُرے تاثر کا دیانت داری اور خلوص سے اظہار کر دیتا ہے اور عمل اور ردِ عمل کا انتظار نہیں کرتا۔ اپنی پسند کا شعر ہو تو وہ حفظ کر لیتا ہے یا پھر اپنی ڈائری میں محفوظ کئے بنا نہیں رہتا۔ باوجود اس کے کہ ایک ادیب یا شاعر قدرے عجیب سا جانور ہوتا ہے۔ وہ فن کی جانچ کرتے وقت ایک قاری کی حیثیت ضرور رکھتا ہے۔ البتہ اس کے اندر کا تنقید نگار بھی بیدار رہتا ہے۔ اس عجیب سی خلقت کی خوبی بھی کسی عجوبے سے کم نہیں ہوتی۔ یہ کسی صاحبِ جائداد کے در پر سات بار سلام کرے گی۔ کسی بڑے افسر کے سامنے بار بار جھکتی نظر آئے گی۔ البتہ اپنے ہی وقت کے ہم عصر ادیب یا شاعر یا پھر کسی بزرگ ادیب پر کیچڑ اچھالنا یا پھر اس کے کلام میں صرف عیوب پر نظر رکھ کر صحیح تنقید کے بجائے صرف تنقیص کرنا اپنا اوّلین فرض سمجھتی ہے۔ یہ روایت صرف غالبؔ کے دور ہی میں زندہ نہیں رہی، یہ آج بھی ہمارے معاشرے اور ادب کا ایک حصہ ہے۔ مراٹھی ادب کی تاریخ بھی اس بات کی ضامن ہے۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ کچھ دانشوروں نے اس روش سے اپنے آپ کو بچائے رکھا۔ مثال کے طور پر میرؔ کی تعریف میں غالبؔ کا یہ شعر دیکھئے ؎

میرؔ کے شعر کا احوال کہوں کیا غالبؔ　　　جس کا دیوان کم از گلشنِ کشمیر نہیں

اس ضمن میں اور بھی لکھا جا سکتا ہے۔ مشاعروں میں جب کبھی کوئی بزرگ شاعر کھلے دل سے اپنے ہی ہم عصر شاعر کی تعریف کرتا ہے تو ... . خیر غالبؔ کا ایک اور شعر ملاحظہ فرمائیے۔

ریختے کے تمہیں استاد نہیں ہو غالبؔ　　　کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا

غالبؔ کی صد سالہ برسی کے موقع پر آج پھر ہم سو سال بعد اُن کے کردار و کلام کا جائزہ لینے پر تُلے ہوئے ہیں۔ لیکن تعجب اور فخر کی بات تو یہ ہے کہ آج سو سال بعد بھی اُن کے کلام سے تازہ پھولوں کی سی خوشبو آتی ہے۔ اس کا ہرا بھرا پن آج بھی بدستور قائم ہے۔ ایک ایک مصرع مثال بن کر رہ گیا ہے۔ جوں جوں ہم مطالعے میں غرق ہوتے ہیں، ایک نیا گ



اُبھر کر سامنے آتا ہے۔ غالب کے بعد بھی اُردو شاعری ساری ترقی کی راہوں پر گامزن ہے۔ بس اس کا سفر جاری ہے البتہ اس نے اپنی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے نئی راہوں کو بھی اپنایا ہے۔ آج کتنے شاعر، جن کے دل میں بھی غالب کی عظمت و بزرگی کا احساس زندہ ہے۔ فیض، جوش، سردار، جگر، فراق، قاسمی، جوش ملسیانی، مجروح، ساحر ایسے اور بھی کئی نام گنائے جاسکتے ہیں جو مختلف انداز اور نظریوں کے تحت اُردو شاعری کو مالا مال کر رہے ہیں۔ اِن کے دلوں میں بھی غالب کی یاد ابھی زندہ ہے اور انہوں نے کبھی اس عظیم المرتبت شاعر کی شان میں گستاخی کرنے کی جسارت نہیں کی، لیکن بحیثیت شاعر و ادیب آج میرے سامنے بھی کچھ سوالات ہیں، کچھ مسئلے ہیں۔ ہو سکتا ہے انہوں نے میرے سامنے اِس لئے سر اٹھایا ہو چونکہ میں غالب کو وقت کی نئی ترازو میں تولنے کی کوشش کر رہا ہوں یا پھر اس لئے کہ اُردو اور مراٹھی کی کئی چیزیں یکساں ہیں، ایک ہی حیثیت کی مالک ہیں۔ یا پھر یہ بھی ممکن ہے کہ جس دَور سے میں اور آپ اور ہمارا یہ ملک گزر رہا ہے اس نے انہوں نے مجھے اس انداز سے سوچنے اور لکھنے پر مجبور کیا ہو۔

سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی ۱ کیوں نہ فردوس میں دوزخ کو ملا لیں یارب

وعدہ اگر نہ کھائے تو ناچار کیا کرے ۲ جیسی پاس روزہ کھول کے کھانے کو کچھ ہو

کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد ۳ آگے ہے کسی عشق پہ رونا غالب

ہم کو جینے کی بھی اُمید نہیں ۴ کہتے ہیں جیتے ہیں اُمید پہ لوگ

ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے ۵ زندگی اپنی جب اس شکل سے گذری غالب

مندرجہ بالا اشعار ایک مخصوص قسم کی فضا اور تاثر پیدا کرتے ہیں جسے آجکل کی زبان میں فرسٹریشن Frustration کہا جائے گا۔ زندگی سے فرار، رُوحانی نا آسودگی، کرب اور بے چینی کا اظہار ان اشعار میں پایا جاتا ہے۔ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ یہی سب کچھ غالب کی شاعری ہے۔ ذہنی اور رُوحانی نا آسودگی کی طرفداری کرنے کے لئے ہاتھ میں کلہاڑی لئے پھرے، ہرے بھرے درخت کی اِکا دُکا سُوکھی شاخ کو توڑ کر لوگوں سے کہا جائے "دیکھئے یہی اس درخت کی آبرو ہے" میں اِس قسم کے گستاخانہ فعل و عمل سے کوسوں دُور ہوں۔ اور اگر اِس قسم کی کوئی ناجائز حرکت سرزد ہو بھی جائے تب بھی غالب کی عظمت پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ نئے سائنسی دَور میں بھی غالب کی شاعری بالکل اسی طرح سورج کی کرنوں کی مانند روشنی کے ہالے پھیلاتی رہے گی۔ تاریخ اس بات کی گواہ ہے اور سو سال بعد بھی ہماری نسلیں اِسی آب و تاب سے غالب اور اُن کے کلام پر اپنے خیالات کا اظہار کریں گی۔ تو آپ اب یہ ضرور پُوچھیں گے کہ میں کہنا کیا چاہتا ہوں۔ آدم بر سرِ مطلب کے مصداق اب اپنی بات پر آتا ہوں۔ غالب کا ایک اچھوتے انداز و موضوع کا شعر جو اپنے اندر تجربات کی کسک رکھتا ہے، میرے لئے ایک سوال بن گیا اور پھر اسی ایک سوال نے کئی اور سوالوں اور مسئلوں کو میرے سامنے لا کھڑا کیا۔۔۔ وہ شعر ہے۔

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

غالب کی آنکھوں نے جاگیردارانہ نظام دیکھا۔ نئے دَور کی تکالیف، مسائل اور دیگر لوازمات میں بھی کافی فرق ہے۔ غالب کو اپنے دَور کے بادشاہوں کی سرپرستی حاصل ہونے کے باوجود اُن کی پُوری زندگی فقیروں کی طرح گذری اور وہ پھر بھی آشاد قسمت، کہ اُن کے سات بچوں میں سے ایک بھی اپنی خاندانی روایات کو تازہ اور زندہ رکھنے کے لئے باقی نہ رہ سکا۔ اپنی زندگی ہی میں، اپنی آنکھوں کے سامنے اور اپنے ہاتھوں ان بالکوں کو دفن کرنا پڑا۔ اپنی تہتر سالہ زندگی میں سکھ کے لمحات نہیں کے برابر میسر آئے۔ جیون بھر کا دُکھ آنکھوں سے پیتے رہے۔ حضرت غالب "لکھ کر چلے گئے" اہلِ کرم دیکھتے ہیں۔



کی زبان بھی عجیب ہے۔ سلطنت تھی ہند میں جس کچھ ختم ہوگیا۔ بادشاہ رہے لو رنہ ہی بادشاہت! یہاں تک کہ بہادر شاہ ظفر بھی خالی ہاتھ ہوکر رنگون میں زمین کی آغوش میں ہمیشہ کے لئے چھپ گئے ۔۔۔
انگریزوں کا دور شروع [illegible] شہر دلّی کا حال غالب ہی کی زبان میں ملاحظہ فرمائیے ــــ

شہر دلّی کا ذرّہ ذرّہ خاک　　تشنہ خوں ہے، نمونہ زنداں کا
کوئی واں سے نہ آسکے یاں تک　　آدمی واں نہ جاسکے یاں کا

شاعر کی پرائیویٹ زندگی کی جانچ نئی تنقید کا اصول نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ شاعر کے کردار و شخصیت کی ترازو میں اُس کے فن کو تولنے سے فن کی رُوح مجروح ہو جاتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن یہ سارے دعوے اور اصول جھوٹے ہیں، یکسر غلط! ایسا کسی فن کار کے وجود میں آیا ہوا فن کم از کم آج تک میری آنکھوں کے سامنے نہیں آیا۔ جب کبھی کسی فن کار ــــ کسی انسان کا ذکر آتا ہے تو سکھ اور دُکھ اس کی زندگی کے بہر صورت ساجھے دار ہیں۔ دھیرے دھیرے یہی باتیں اُس کے فن کے ذریعے ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتی ہیں۔ گھاس ویرانے میں اُگتی ہے۔ دُوسرے معنوں میں گھاس کے لئے ویرانہ ہی ضروری ہے۔ زمین کی کشش ہی کی وجہ سے تو بادل، درخت یا تو توازن برقرار رکھتے ہوئے کھڑے رہتے ہیں یا پھر فضا میں تیرتے رہتے ہیں۔ یہی سائنس کا اصول ہے اور آج کی سائنس تو کافی ترقی کرگئی ہے، اسی لئے غالب سے غالب کی شاعری کسی صورت الگ نہیں کی جاسکتی۔ یہی اصول ہر ادیب و شاعر کے حق میں صحیح ثابت ہو سکتا ہے، یہ صحیح ثابت کیا جاسکتا ہے۔ غالب کا دَور مشینی دَور نہیں تھا۔ اُس وقت انگریزوں کی حکومت تھی۔ سامراج شاہی کا دَور نہیں تھا۔ اِس لئے عالمی جنگ کے امکانات اور خطرات نہیں تھے۔ آج یہ زمین جو ہمیں بالشت بھر محسوس ہوتی ہے اُس وقت بہت ہی وسیع تھی۔ طویل تھی۔ خود مرزا غالب کو کلکتہ جانے کے لئے مہینوں کی مسافت طے کرنی پڑی۔ لیکن آج کلکتہ جانے کے لئے صرف دو یا تین گھنٹے ہی کافی ہیں۔ بات یہیں تک محدود نہیں ہے۔ صبح دلّی میں چائے پیجئے۔ تاشقند میں بریک فاسٹ کیجئے اور دوپہر کا کھانا ماسکو میں۔ ۔۔ دنیا اتنی قریب آگئی ہے۔ مرزا غالب کی شاعری نے بھی ساری دنیا کو فتح کرلیا ہے۔ عبدالرحمٰن بجنوری کا قول کوئی نہیں بھول سکتا کہ ہندوستان میں صرف دو الہامی کتابیں ہیں۔ ایک وید اور دُوسرا دیوانِ غالب! شاعر کا تخلیقی سرمایہ ہی اِس کی اہمیت کا باعث بنتا ہے۔ البتہ ہر ایک کے لئے ایک حد متعین کی گئی ہے۔ غالب کی واحد ذات بھی اِس امر سے آزاد نہیں ہے۔ اس کے باوجود ان تمام باتوں کو مدّنظر رکھتے ہوئے اِس دَور کے ادیب کی حیثیت سے کچھ سوالات اپنے آپ سے پُوچھ رہا ہوں۔

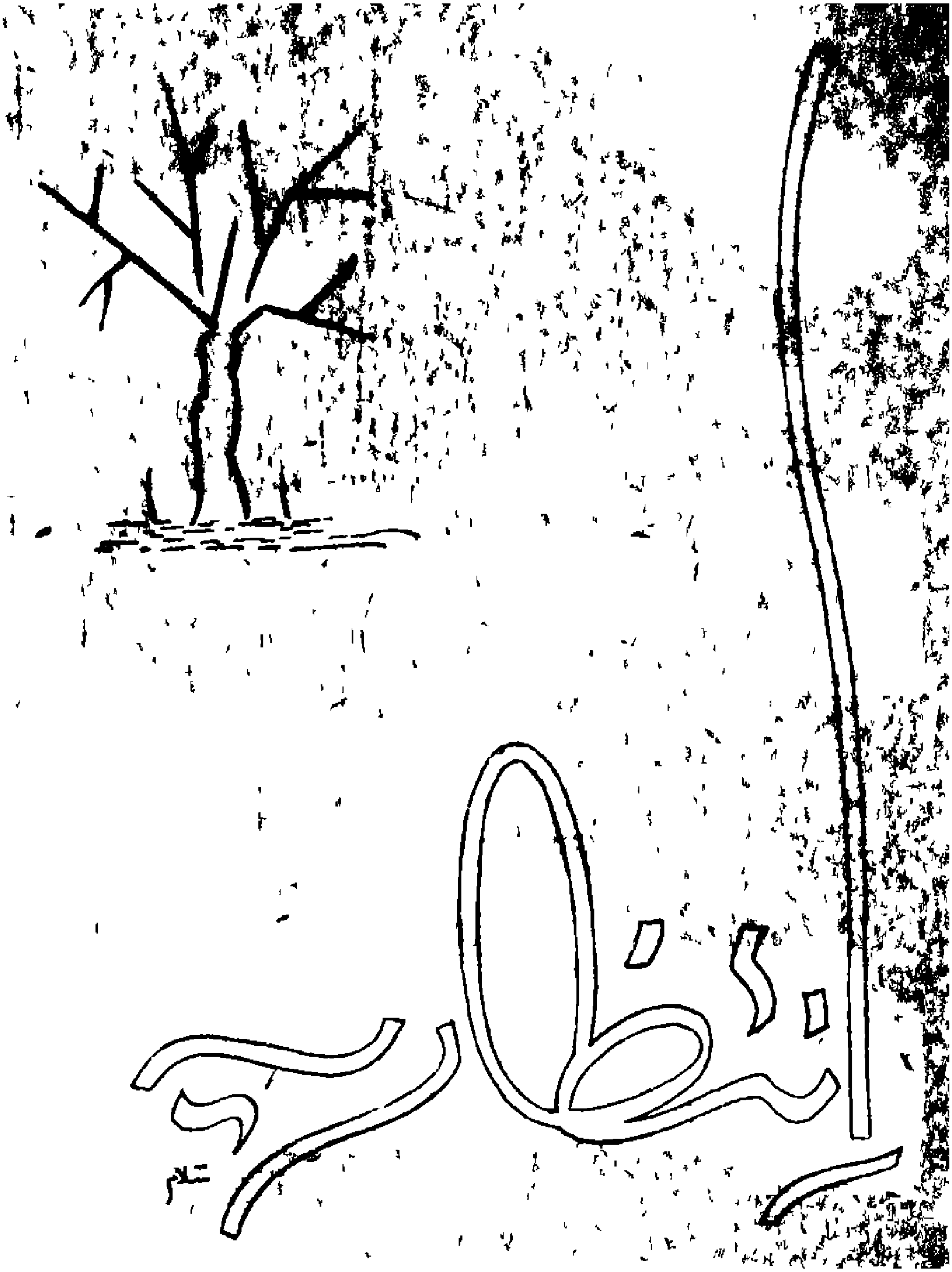
(۱) غالب کی مایوسی اور ناامیدی صرف اُنہیں تک محدود تھی یا اُس کی حیثیت عام تھی؟

مراٹھی کے مشہور شاعر کیشوسُت نے ایک جگہ لکھا تھا: "مُردہ اُستادوں کی چتا پر میری رُوح بھٹک رہی ہے"۔ اس المناکی کی اہمیت اور حیثیت کا اندازہ اُس دور کے لوگوں کو نہیں ہوا۔ غالباً یہ احساس اُس دور کی سب سے بڑی امانت ہے۔

(۲) غالب کی مایوسی اور ناامیدی کا جھکاؤ قدرت کی طرف ہے۔ یعنی دُوسرے معنوں میں "قسمت کی بات مالک کے ہاتھ" والا اُصول ہے۔ لیکن اس دَور میں جب کہ ہم مشینی دور کے انسان کہلاتے ہیں اور چاند پر کمندیں ڈال رہے ہیں۔ ایسے سائنسی اور مشینی دور میں بھی ہم اپنی قسمت کو قصوروار کیوں گردانتے ہیں؟ خصوصاً آج کا یا شاعر غالب سے بھی زیادہ مایوس اور بوکھلایا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ کیوں؟ وہ بار بار اپنی تنہائی کا رونا کیوں رو رہا ہے؟

(۳) غالب کے کلام میں کرب و بے چینی کے اظہار کے علاوہ پیار، محبت، ہجر، وصال، حرم، میخانہ، بُت خانہ، دین، مذہب، خوبصورتی کا ذکر سبھی کچھ پایا جاتا ہے لیکن آج کے نئے شاعر کے ہاتھ میں صرف ایک ہی سُر کیوں ہے؟ وہ صرف ایک ہی راگ الاپنے کا قائل کیوں ہوگیا ہے؟ یہ نئے وقت کی مانگ اور تقاضا ہے یا پھر اُس کا تخلیقی ذہن ماؤف ہوچکا ہے۔ اسکے

(باقی صفحہ ۵۳۶ پر)





اعجاز صدیقی

غالب

چمن میں شعر کے، تجھ سے کھلے نئے غنچے
تخیلات کی اک صبحِ رنگ و بو تو تھا

جلو میں اپنے، معانی کی کائنات لئے
غزل میں نقش گرِ جدت و نمو تو تھا

تکلفات کے پردے اٹھا دیئے تو نے
خود اپنی خلوت و جلوت کا حیلہ جو تو تھا

ہر ایک خواہشِ پنہاں پہ تیرا دم نکلا
جو آرزو تھی جنازہ، وہ آرزو تو تھا

رکا نہ بتکدہ و کعبہ و کلیسا میں
تلاشِ کفر تھا، ایماں کی جستجو تو تھا

کبھی سجائے ہوئے مہ رخوں سے بزمِ خیال
پری وشوں سے کبھی محوِ گفتگو تو تھا

رہی مشاہدۂ حق کی گفتگو پھر بھی!
ہزار غرقِ خم و بادۂ و سبو تو تھا

کسی سے ڈر نہ سکا۔ تو کسی سے دب نہ سکا
بلندِ خوفِ بد آموزیٔ عدو تو تھا

تری انا، ترے شعروں سے آشکارا ہے
تنک مزاج و تنک طبع و شعلہ خو تو تھا

رگِ غزل میں۔ دوڑا تھا تجھ سے پہلے جو
وہ گرم و تازہ و تیز و رواں لہو تو تھا

چھلک رہے ہیں تری طرز و فکر کے ایاغ
غزل کا بادۂ گلفامِ مشکبو تو تھا

وہ عہد جس میں تجھے دادِ فکر و فن، نہ ملی
اس اپنے عہد کی معراج و آبرو تو تھا

ہم اپنے وقت کا فنکار جانتے ہیں تجھے
کچھ اس سے بحث نہیں ہے ہیں، کبھو تو تھا

تھے یوں تو حافظ و بیدل بھی، میر و مومن بھی!
مگر اسد۔ مجھے کہنا یہ ہے کہ تو۔ تو تھا!



احتشام حسین

شاعری بادِ نفس اور نکہتِ گل

انسانی ذہن میں جو نمو کی قوت اور توسیع کی صلاحیت ہے وہ انفرادی طور پر اپنے کرشمے الگ الگ دکھاتی ہے۔ لیکن مخصوص عہد و شعور کی نشوونما کے لئے ایک سطح اور معیار فراہم کرتے ہیں۔ اس کی مدد سے فرد کے جوہر کی تشخیص بھی ہوتی ہے اور اس کے پیمانوں کی بلندی اور پستی کا اندازہ بھی لگایا جاتا ہے۔ مرزا غالب دہلی تھے جو وہ تھے اور وہ بھی جو انہیں اُن کے عہد کی خارجی اور داخلی کشمکش نے بنایا تھا اور چونکہ غالب ایک تخلیقی فن کار تھے اس لئے اُن کی پوری ہستی مع اپنی مختلف جہتوں کے اُن کے فن میں دیکھی جا سکتی ہے۔ لیکن دیکھنے کی اصل دشواری کے دو پہلو ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہم کیا دیکھنا چاہتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ہمارے دیکھنے کا انداز اور معیار کیا ہے۔ سو سال کا وقفہ گذر جانے نے اس کام کو اور دشوار بنا دیا ہے، کیونکہ علوم و فنون اور سماجی زندگی کی پیچیدگی نے مقاصد اور طریقِ کار کو بہت نئے روپ دے دیئے ہیں۔ آج کا انسان جذبات اور تصورات کی لاکھ بار آفرینی کر لے، لیکن وہ ۱۸۶۹ء کا انسان نہیں بن سکتا۔ قدیم شاعری کی ہر تعبیر، تفسیر اور تنقید کو انہیں حدود کے اندر دیکھنا چاہئے جو وقت کے شعور نے فراہم کی ہیں۔

علوم کا دائرہ جتنا وسیع ہوتا جاتا ہے اُسی قدر فنونِ لطیفہ اور خاص کر شاعری کی ماہیئت، حقیقت اور نوعیت پر بحث الجھتی جا رہی ہے۔ الجھن کا سبب یہ نہیں ہے کہ ہمارے علوم بالکل ناقص ہیں، بلکہ یہ ہے کہ ہم شعر و ادب سے مختلف مقاصد وابستہ کرتے ہیں اور منطقی نتیجوں سے گریز کرتے ہیں۔ مثلاً کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ شاعری صرف شاعری ہے، اُسے فلسفہ، نفسیات، تاریخ یا کسی اور علم سے وابستہ کرنا اُس کی لطافت کا خون کرنا ہے۔ اس لطافت میں "علمی کثافت" کی آمیزش مردودی ہی نہیں، شاعری کے مزاج سے لاعلمی کی دلیل بھی ہے۔ اس کے برعکس کچھ دوسرے لوگوں کا نقطۂ نظر یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ شاعری انسانی تجربہ اور افکار کا فنی بیان اور اظہار ہے۔ اسے کسی طرح احساس و خیال کے دوسرے دائروں سے خارج نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ احساس یا خیال قائم بالذات نہیں ہے، اس کا کوئی نہ کوئی خارجی محرک ضرور ہے اور اس خارجی محرک کی شکلیں نفسیاتی، فلسفیانہ اور تاریخی ہو سکتی ہیں۔ اس حقیقت کو سامنے رکھا جائے تو بڑے سے بڑے انفرادیت پسند یا منفرد شاعر کے کلام کی تشریح اور تفسیر اُس کے ان تجربوں ہی کی روشنی میں کی جا سکتی ہے جن کی بنیاد میں زندگی کی وہ حقیقتیں ہیں جنہیں اس نے دیکھا ہے، جن کا تجربہ اُسے خود ہوا ہے، حواس کے مشاہدے میں آئی ہیں یا جن کی بنیاد پر افکار و خیالات یہ ہے، جو اس کے ذہن میں ہیجان پیدا کرتے رہے ہیں۔ اگر اس کو تسلیم نہ کیا جائے تو شاعری کی روح اور شاعری کی معنویت تک رسائی حاصل کرنا ناممکن ہو جائے گا اور غالب جیسے بلند شاعر کے کلام کا بڑا حصہ صرف لفظوں کا کھیل نظر آئے گا، حالانکہ غالب کا شاعرانہ



قد اسی لیے دوسرے شاعروں کے مقابلے میں زیادہ بلند نظر آتا ہے کہ انہوں نے ان انسانی تجربات اور محسوسات کو اپنے فن میں قید کر لیا، جو جذباتی یا ذہنی تحریک پیدا کرتے ہیں۔ یہ تحریک اگر بالکل مبہم نہ ہو تو ہر حالت میں شعر کے مفہوم تک رسائی حاصل کرنے کے بعد ہی ہوتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ سخن فہمی کی اس بدعت کو موجودہ عہد کے اُن نقادوں نے رائج کیا ہے جو زندگی کے ہر مظہر کی تعبیر مادی نقطۂ نظر سے کرتے ہیں۔ وہ شعر کو شعری حیثیت سے نہیں، فکر اور فلسفے کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ لیکن ایسے لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ خود غالب نے معنی اور نفسِ مفہوم تک رسائی حاصل کرنے کو فن کا اصل جوہر قرار دیا تھا۔ شعر کے حسن اور اثر میں بہت سے عناصر کام کرتے ہیں، لیکن اسے محض الفاظ کی موسیقی، اس کے صوتی اثر، شعر کے طرزِ ادا، اس کی عروضی ترکیب اور اس کی حسیّ بندش میں نہیں تلاش کیا جا سکتا، بلکہ اس تاثیر کا سراغ اگر کہیں مل سکتا ہے تو اس اندرونی کیفیت میں جو ذہن میں حرکت پیدا کرتی ہے، جو شاعر سے ہمکلام ہونے کے لیے راستہ ہموار کرتی ہے۔ دوسرے عناصر اس تاثیر کے پیدا کرنے میں مدد کرتے ہیں، خود مکتفی نہیں ہیں۔ بہار کو آئینۂ چمن میں، حسن کو کسی حسین پیکر میں، رنگ کو کسی رنگین پھول میں، ذائقہ کو کسی لذیذ غذا میں دیکھا اور محسوس کیا جا سکتا ہے۔ آئینہ زنگار کا محتاج ہوتا ہے اور لفظ معنی کا۔ بے معنی لفظ آوازوں کا مجموعہ ہے، لفظ نہیں ہے کیونکہ معنی ہی لفظ کا تعین کرتا ہے۔

فہم کے اور خاص کر فنِ شعر کے مختلف نظریوں کی چھان بین ان حقائق کی روشنی میں کی جا سکتی ہے۔ جب الفاظ کو معنی سے متعلق کر کے دیکھا جائے گا تو معنی جس چیز کا اشارہ ہے اُسے بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہوگا۔ اپنے وسیع مفہوم میں اس کا مقصد یہ ہے کہ لفظ کا استعمال شاعر کا اصل مقصد نہیں ہوتا، وہ لفظ سے کسی حقیقت تک لے جانا چاہتا ہے، اس لئے جب تک الفاظ کی معنوی تہوں کو کھولا نہیں جائے گا، حقیقت تک رسائی مشکل ہی سے ہو سکے گی۔ غالب نے زندگی کو باہر سے بھی دیکھا اور اندر سے بھی۔ اس کے ظاہر کو بھی سمجھنے کی کوشش کی اور باطن کو بھی۔ انہوں نے عقل کو جذبے کی تربیت کشتی اور جذبے کو عقل کے تابع رکھنے کی ضرورت کا احساس بھی کیا۔ عرفانِ ذات اور عرفانِ صفات دونوں پر زور دیا، کیونکہ اسی طرح لالہ و گل و نسرین کے رنگوں کے امتیازی حسن کا احساس کیا جا سکتا ہے۔ یہ وہ عقلی طریقۂ کار تھا جو کم فنکاروں کے حصے میں آیا ہے اور جس کے حصے میں آ گیا ہے وہی عظیم ہے۔ اسی متوازن ذہنی اور وجدانی کیفیت نے غالب کو ان شعرا سے ممتاز کیا ہے جو جذبے اور فکر کے صحیح ربط سے واقف نہیں ہیں۔ جو تخیل کے کیمیاوی عمل پر ایمان نہیں رکھتے اور جو ذہن اور دل کی دنیا کو الگ الگ دیکھتے ہیں۔

اس بات کا اظہار تو بہت سے لوگ کرتے ہیں کہ زندگی ایک پیچیدہ اور مرکب حقیقت ہے، لیکن اس کا شعور بہت کم لوگوں کو ہے۔ سائنس اپنی ضروریات تحقیق کے لیے مختلف پہلوؤں کو تجرید کا رنگ دے کر مطالعہ کو محدود کر لیتی ہے۔ نقاد اپنے ذہن کو کسی مخصوص عنصر پر مرکوز کر کے زندگی کے کسی ایک پہلو کا مطالعہ کر سکتا ہے، لیکن فنکار کے سامنے زندگی اپنے تمام رابطوں کے ساتھ آتی ہے، یہاں تک کہ جز کو دیکھتے وقت بھی وہ کُل کو نظر انداز نہیں کرتا، بلکہ قطرے میں دجلہ دیکھ لیتا ہے۔ یہ بات شاعری کے اندر معنوی گہرائی اور تہہ داری پیدا کرتی ہے جو غالب کی بہت بڑی خصوصیت ہے اور جس کی طرف خواجہ حالی سے اس وقت تک اُن کے ہر سنجیدہ ناقد اور نقادوں نے اشارہ کیا ہے۔ معنی کی بات پھر آ گئی ہے تو یہ کہنا ضروری ہے کہ اسی سے ترسیل کا مسئلہ بھی وابستہ ہے۔ غالب لفظ کو معنی تک پہنچنے کا ایک وسیلہ سمجھتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ لفظ میں اتحاد ہوتا ہے۔ معنی اس میں حرکت پیدا کرتا ہے۔ اچھے ادیب اور شاعر جن کے پاس کچھ کہنے کو ہے نئے مفہوم اور نئے معنی کے لیے لفظ کو وسعت دیتے ہیں۔ اسے علامت بنا کر پیش کرتے ہیں۔ معنی متحرک ہے اور مختلف لوگوں کے ذہن میں اس کا مفہوم ان کے احساسِ حقیقت اور وسعتِ شعور سے متعین ہوتا ہے۔ اگر معنی کا شعور ہو جائے تو فنکار اسے لفظوں کے علاوہ رنگ میں، جسم کی حرکت میں، ساز کی آواز میں بھی پہچان سکتا ہے۔ معنی کا درد کس راگ میں درد بنتا ہے، مسرت کی کیفیت کس رنگ سے ظاہر ہوتی ہے، یہ وہی

شاعر مبین



شعر جان سکتا ہے جسے معنی کا شعور ہے۔ غالب کا ایک مشہور اور معنی خیز شعر ہے

وہی اک بات ہے جو یاں نفس واں نکہت گل ہے
چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا

موسم بہار میں چمن کا حسن تازگی اور لطافت سے رنگ اور نکہت سے، نور اور عطر بیزی سے جاگ اٹھتا ہے۔ اس کی معنوی روش رقص کرتی ہے۔ پتی پتی میں زندگی جاگ جاتی ہے۔ لہو دوڑتا نظر آتا ہے۔ فطرت میں جان پڑ جاتی ہے۔ پودے لہکتے ہیں۔ پھولوں سے مہک اڑتی ہے۔ چڑیاں چہچہاتی ہیں اور شاعر نغمہ سرائی کرتا ہے۔ غالب کا خیال ہے کہ شاعر کی رنگیں نوائی اور پھولوں کی نکہت بیزی دونوں میں ایک ہی روح کارفرما ہے۔ نمو کی جس تحریک سے انسان سانس لیتا ہے، پھول اسی سے یہ مہک پھیلاتا ہے۔ نظام کائنات میں اس طرح گہرا رابطہ پیدا ہوتا ہے اور سب مل کر ایک وسیع تر حقیقت کا احساس دلاتے ہیں جسے غالب جیسا اعلیٰ فن کار ہی دیکھ اور سمجھ سکتا تھا۔ فلسفہ اور تصوف کی زبان میں اسے مابعد الطبیعاتی یا وحدۃ الوجودی نقطۂ نظر کہا جائے گا۔ لیکن سائنسی مادیت کی روشنی میں قوت نمو کے اس جوش سے تعبیر کیا جائے گا جو حیاتیاتی اصول کے تحت [illegible] کی مختلف شکلوں میں مختلف پیرایوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ پیچیدہ زندگی کے اس گہرے ادراک اور اس تجریدی بصیرت نے غالب کو غالب بنایا۔ اس میں شک نہیں کہ اتنی عظیم الشان حقیقت کے اظہار کے لئے اس سے زیادہ بھرپور پیرایۂ بیان، اس سے زیادہ سوچا سمجھا انتخاب الفاظ، اس سے زیادہ صوتی حسن پیدا کرنا دوسرے شاعر کے لئے ممکن نہ ہوتا۔ لیکن کیا یہ بھی حقیقت نہیں ہے کہ معنی کی وسعت اور تہہ داری خیال کی گہرائی، تلازمۂ خیال کی معنی خیز پیوستگی کے بغیر الفاظ کا یکجا ہونا ممکن نہیں تھا۔

شاعرانہ تخلیق کے تمام طریق کار ہوتے ہیں اور ہو سکتے ہیں اور مختلف افتاد طبیعت اور احساس فن رکھنے والے مختلف طریقوں کے گرویدہ ہو سکتے ہیں، لیکن تنقیدی جائزہ لیا جائے تو ذوق سخن رکھنے والوں میں حسن معنی کے پرستار زیادہ اور رعایت لفظی پر جان دینے والے کم نکلیں گے۔ غالب بھی قافیہ پیمائی اور بے جا صنعت کاری سے متنفر تھے اور معنی آفرینی کو شاعری کا جوہر سمجھتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ قافیہ بعض صورتوں میں شاعری کا اہم جز ہے اور صناعی فن کا لازمی عنصر لیکن یہاں بھی اگر فن کار توازن کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دے تو وہ جوش تخلیق کے دائرے سے نکل کر میکانکی شعر سازی کی حدود میں داخل ہو جاتا ہے۔ غالب نے ابتدائی مشق کے سوا غالباً کبھی قافیے کو قافیے کے لئے اور رعایت لفظی کو رعایت لفظی [illegible] اختیار نہیں کیا۔ معنی اور صورت میں صورت کی اہمیت مسلم ہے، لیکن معنی کو نظر انداز کر کے نہیں۔ غالب صورت پرستی اور ہیئت پسندی کو دوسرے درجے پر رکھتے تھے۔ پہلے تو معنی تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرنا چاہئے اور وہ ہاتھ نہ لگے تو صورت سے تسکین حاصل کرنا چاہئے، یہ غالب کا واضح تصور فن تھا۔

گر بہ معنی نہ رسی، جلوۂ صورت چہ کم است
خم زلف و شکن طرف کلاہے دریاب

اور اسی خیال کو ایک اردو شعر میں یوں ادا کیا ہے

نہیں گر سر و برگ ادراک معنی
تماشائے نیرنگ صورت سلامت

یہی بلوغ نظری اور سخن فہمی کی فطری صورت نظر آتی ہے۔ نگاہ کی وہ بصیرت جو کثرت میں وحدت دیکھ سکتی تھی، محض ظاہر پر نہیں ٹھہر سکتی تھی۔ غالب بادِ نفس اور نکہت گل کو ایک ہی خارجی حقیقت کے دو ملتے جلتے محرکات کی شکل میں دیکھتے تھے۔ اس طرح شاعری بادِ نفس بھی تھی اور نکہت گل بھی۔ دونوں بہار زندگی کے اہم ترین عناصر پوشیدہ ہیں۔ بادِ نفس وجہ ابقا ہے اور نکہت گل لطف حیات۔ گویا غالب کے نقطۂ نظر سے شاعری حقائق زندگی سے روشناس بھی کرتی ہے اور کیفیات سے سرشار بھی بناتی ہے۔ رنگیں نوائی، [illegible] کا نتیجہ ہوتی ہے۔

[illegible] تک شاعری کی جتنی بھی تعریفیں اور تشریحیں [illegible] سے کی گئی ہیں [illegible] اور احساس مسرت دونوں کو [illegible]

امتیاز علی عرشی

مقدمۂ دیوانِ غالب فارسی
(مرتبۂ عرشی) کے چند اوراق

[برسوں سے غالب کے فارسی دیوان کی تصحیح و ترتیب کا کام پیشِ نظر ہے، تاکہ فارسی کلام کا صحیح متن بلحاظِ ترتیبِ تاریخی اہلِ ذوق تک پہنچایا جاسکے۔ مگر ابھی یہ کام دوسرے ضروری کاموں کی وجہ سے تکمیل کو نہیں پہنچا۔ نیز تین چار سال ہوئے، معلوم ہوا کہ جناب مالک رام کے سامنے بھی ترتیبِ کلامِ فارسی ہے۔ اِس لئے بھی فی الحال یہ کام ملتوی کر دیا گیا۔ اس کے مقدمے کے مباحث کا وہ حصہ، جس میں کلامِ فارسی کی تدوین و طباعت زیرِ بحث آئی ہے، شائع کیا جاتا ہے]

آغازِ فارسی گوئی

اگرچہ مرزا صاحب نے ابتدائے سنِ تمیز میں اُردو زبان میں سخن سرائی کی، لیکن وہ آغاز ہی سے نظم و نثرِ فارسی کے عاشق و مائل اور تتبعِ اصفہانی کے گھائل تھے[1]۔ اِس لئے ان کا ابتدائی اُردو کلام تخیل اور الفاظ دونوں میں فارسی کہلانے کا زیادہ مستحق ہے۔

بقولِ خود، وہ پچیس برس کی عمر تک بیدل، شوکت اور اسیر کی طرز پر ریختہ لکھتے رہے[2]۔ تمیز آنے پر طبیعت نے اس خارزار سے باہر نکلنے کی تدبیر سجھائی اور انھوں نے نظیری، عرفی وغیرہ جادو بیانانِ سخن کے کلام کا مطالعہ کر کے ان کی راہ پر گامزنی شروع کی۔ کلیات فارسی کے خاتمے میں فرماتے ہیں[3]:

"تا ہمدران تکاپو، بیش خراماں را بجستگی از روشِ بہ قدمی، کہ در من یافتند، مہر بجنبید، و دل از آزرم بدرد آمد۔ اندوہ آوارگیہائے من خوردند، و آموزگارانہ در من نگریستند۔ شیخ علی حزین بخندۂ زیرلبی، بیراہ رویہائے مرا در نظرم جلوہ گر ساخت، و زہر نگاہِ طالب آملی و برقِ چشمِ عرفی شیرازی مادۂ آن ہرزہ جنبش ہائے ناروا در پائے رہ پیمائے من سوخت۔ ظہوری بسرگرمی گیرائی نفس حرزے بیازو و توشۂ بکمرم بست، و نظیری لاابالی خرام، بہنجار خاصۂ خودم بجالش آورد۔"

لیکن واقعہ یہ ہے کہ مرزا صاحب اِس عمر سے پہلے ہی فارسی میں کہنے لگے تھے۔ چنانچہ خواجہ حالی نے اُن کی طالب علمی کا ایک واقعہ لکھا ہے کہ۔

۱؎ اُردوئے معلیٰ ص ۲۰۴ و عودِ ہندی ۱۲۵ ۔ ۲؎ عود ۱۵۹ ۔ ۳؎ کلیات فارسی نظم ص ۵۴۴ و پنج آہنگ ۶۸ ۔



"اُنھوں نے فارسی میں کچھ اشعار بطورِ غزل کے موزوں کئے تھے، جن کی ردیف میں "کہ چہ" بجائے "یعنی چہ" کے استعمال کیا تھا جب اُنھوں نے وہ اشعار اپنے استاد شیخ معظم کو سنائے تو اُنھوں نے کہا کہ یہ کیا مہمل ردیف اختیار کی ہے۔ ایسے بے معنی شعر کہنے سے کچھ فائدہ نہیں۔ مرزا یہ سُن کر خاموش ہو رہے۔ ایک روز ملّا ظہوری کے کلام میں ایک شعر ان کی نظر پڑ گیا جس کے آخر میں لفظ "کہ چہ" یعنی چہ کے معنی میں آیا تھا۔ وہ کتاب لے کر دوڑے ہوئے استاد کے پاس گئے اور وہ شعر دکھایا۔ شیخ معظم اس کو دیکھ کر حیران ہو گئے، اور مرزا سے کہا کہ تم کو فارسی زبان سے خداداد مناسبت ہے۔ تم ضرور فکرِ شعر کیا کرو اور کسی کے اعتراض کی کچھ پروا نہ کرو۔" [1]

مزید براں بھوپال کے قلمی دیوانِ اُردو کا آغاز ایک فارسی قصیدے سے ہوا ہے۔ چونکہ اُردو کہتے وقت بھی گویا فارسی ہی میں سوچتے اور لکھتے تھے اس لئے انھوں نے مذکورہ عمر کو پہنچ کر اس اختلافِ ذوق کی رہنمائی میں شاہدِ سخن کے چہرے سے اُردو زبان کا بھی پردہ بھی اُٹھا دیا اور یکسر فارسی میں کہنے لگے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے فارسی کلام میں تبدیل وغیرہ کے اثرات کم نظر آتے ہیں۔

نواب شمس الامراء کے نام ایک خط میں جو تقریباً ۱۸۵۲ء میں لکھا گیا تھا، مرزا صاحب نے دعویٰ کیا ہے کہ "کما بیش سی سال است کہ اندیشہ پارسی سگالست۔" [2] اس بنا پر ان کی باقاعدہ فارسی گوئی کا آغاز ۱۸۲۲ء (۱۲۳۸ھ) میں تسلیم کرنا پڑیگا۔

فارسی نظم کا کچھ حصہ گلِ رعنا کی شکل میں کلکتے کے اندر ہی مرتب ہو چکا تھا، مگر مکمل دیوان فارسی دیباچۂ دیوانِ اُردو کے بیان کے مطابق سفرِ کلکتہ تک غیر مرتب مسودے کی شکل میں تھا۔

"میخانۂ آرزو سر انجام"

[illegible] نے دیوانِ اردو کے دیباچے میں وعدہ کیا تھا کہ اس کام سے فارغ ہو کر دیوان فارسی مرتب کریں گے۔ کلکتے سے واپس آ کر انھوں نے سرمایۂ فارسی اکٹھا کرنا شروع کیا اور اس مجموعے کا نام "میخانۂ آرزو سر انجام" قرار دیا۔ عبدالحق خاں رکھوڑ نے پنج آہنگ کے دیباچے میں لکھا ہے۔ [3]

"در آغاز سال یک ہزار و دو صد و پنجاہ و یک ہجری، شمس الدین احمد خاں را بقضائے آسمانی آں پیش آمد کہ ہیچ آفریدہ مبیناد .... و بعد آں ہنگامہ دراں ہنگام ازجے پور بدہلی رسیدم ... دراں ایّام دیوان ریختہ کہ بعنوان مسمّیٰ بہ "میخانۂ آرزو سر انجام" است تازہ فراہم آمدہ و پیرایۂ اتمام پوشیدہ بود۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۵۱ھ (۱۸۳۵ء) کے بعد دیوان مرتب ہوا تھا۔

کلیاتِ فارسی کے شروع میں دیباچہ اور آخر میں تقریظ کے عنوان سے خاتمہ لکھا گیا ہے۔ خود تجوید کے بیان کے مطابق "میخانۂ آرزو سر انجام" ہی کا سرو پا ہیں۔ [4]

اس دیباچے میں مرزا صاحب فرماتے ہیں۔ [5]

اندیشہ نہ سنجد و گماں نسگالد کہ غالب از دانش بے بہرہ دستہ بستن ایں گلہائے خرز بہرہ، آہنگِ خود آرائی و انداز انگشت نمائی دارد۔ ملک خون گرمیِ ابرام والا سرادر ۔ امین الدین احمد خاں بہادر مرا بدیں کار داشتہ، و ہمتم را بہ پیبہ دوزیِ ایں کہن دلق گماشتہ است۔

تقریظ میں لکھتے ہیں: [6]

---

[1] یادگارِ غالب ۹۷۔ [2] پنج آہنگ ۱۷۴۔ [3] پنج آہنگ ۴۔ [4] کلیات فارسی ۱۸ مخطوطہ۔ [5] ایضاً ۲۸۰ و پنج آہنگ ۱۵۷۔



تا امروز کہ از ہجرت خاتم الانبیا علیہ التحیۃ الثنا یک ہزار و دو صد و پنجاہ و سہ سال گزشتہ
و در صد نگار طالع من ماندہ و حرامتش بیک آسمانی در مشاہدۂ آثار سال چہل و یکم است،
ہنوز شخص اندیشہ بہ جز ایں خام و لاطائل ایں خم است [illegible]

ان بیانوں سے واضح ہوتا ہے کہ مرزا صاحب نے اپنا فارسی دیوان نواب امین الدین احمد خاں بہادر والیٔ لوہارو کی فرمائش پر مرتب کیا اور ۱۲۵۳ھ (۱۸۳۷ء) میں جب کہ ان کی عمر کا اکتالیسواں سال شروع ہو چکا تھا، اس کو انجام تک پہنچایا۔ مرزا صاحب کی عمر کو مد نظر رکھ کر حساب لگایا جائے تو ترتیب دیوان سے فراغت رجب ۱۲۵۳ھ کے کچھ بعد ہو جانا چاہیے، کیونکہ اس ماہ و سال کی ۸ تاریخ سے ان کی عمر کا اکتالیسواں سال شروع ہوتا ہے۔

کتاب خانہ انجمن ترقی اردو کراچی میں ایک مخطوطہ دیوان محفوظ ہے۔ اس پر ایک مقالہ جناب مسلم ضیائی صاحب نے رسالۂ اردو جنوری ۱۹۶۸ء میں تحریر فرمایا ہے۔ اس نسخے کے ترقیمے میں بار شعبان ۱۲۵۲ھ تاریخ اختتام بتائی گئی ہے۔ اگر یہ تاریخ درست ہو تو مذکورہ بالا نسخہ دیوان فارسی کا قدیم ترین نسخہ تسلیم کیا جائے گا۔ مگر میری نظر میں یہ تاریخ بعد کو بڑھائی گئی ہے، کیونکہ خاتمہ کاتب ما تمام انجامید پر تمام ہو جاتا ہے، اس کے بعد تاریخ تحریر کا اضافہ بے جوڑ سا ہے۔ اس خیال کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ خود مسلم ضیائی صاحب نے فرمایا ہے کہ اس میں لارڈ آکلینڈ کی مدح والا وہ قصیدہ موجود ہے، جو اواخر دسمبر ۱۸۳۷ء مطابق اواخر رمضان ۱۲۵۳ھ میں لکھا گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ جو قصیدہ رمضان کے آخر میں تصنیف کیا گیا ہو، وہ ۱۰ شعبان کے لکھے ہوئے نسخے میں کیسے جگہ پا سکتا ہے۔

پنج آہنگ کے نسخۂ مطبوعہ ۱۸۵۳ء میں مذکورۂ قبل تقریظ کی جو نقل چھپی، اس میں فارسی قطعہ، مثنوی، قصیدہ، غزل اور رباعی کے اشعار کی مجموعی تعداد ۶ ہزار بتائی گئی ہے۔ لیکن کلیات فارسی کے قلمی نسخے (مخزونۂ رضا لائبریری نمبر ۱۱۴) میں یہ تعداد بڑھ کر ۶۶۷۲ ہو گئی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ترتیب کے وقت دیوان میں چھ ہزار ابیات تھے۔ جب پہلی طباعت کی نوبت آئی تو اس تعداد میں ۶۷۲ اشعار کا اضافہ ہو گیا لیکن اصولاً مرزا صاحب کو تاریخ تحریر کے خاتمے میں بھی تغیر کرنا چاہیے تھا، جیسا کہ مطبع نولکشور لکھنؤ میں دیوان کی طباعت کے وقت انھوں نے کیا ہے، مگر کسی وجہ سے ایسا نہ ہو سکا۔

"تدوین کلام"

مرزا صاحب نے ایک خط میں لکھا ہے کہ "میرا کلام کیا نظم، کیا نثر، کیا اردو، کیا فارسی کبھی کسی عہد میں میرے پاس فراہم نہیں ہوا"[1] لیکن واقعہ یہ ہے کہ ابتداءً خود انھوں نے ہی اپنا کلام جمع کیا ہے اور ان ہی کے مسودات سے دیوان ریختہ مرتب ہوا اور ان ہی سے "گل رعنا" کی ترتیب عمل میں آئی۔

اردو کلام کو بترتیب ردیف جمع کرنے کا کام ماہ صفر ۱۲۳۷ھ (آخر اکتوبر ۱۸۲۱ء) سے قبل اتمام کو پہنچ چکا تھا۔ جو نسخۂ حمیدیہ کی تاریخ کتابت ہے۔ آئندہ اسی نسخے میں کمی بیشی ہو کر موجودہ دیوان وجود میں آیا۔

جیسا کہ ابھی گذرا، فارسی نظم کا کچھ حصہ "گل رعنا" کی شکل میں کلکتہ کے اندر مرتب ہو چکا تھا مگر مکمل دیوان فارسی دیباچۂ دیوان اردو کے بیان کے مطابق سفر کلکتہ (۱۸۳۰ء) تک غیر مرتب مسودے کی شکل میں تھا۔

علی بخش خاں دیباچہ نگار پنج آہنگ کے مذکورۂ قبل اقتباس کے الفاظ "درآں ایام" اور "تازہ فراہم [illegible]" سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۵۱ھ (۱۸۳۵ء) مراد ہیں لیکن کتاب خانۂ رام پور کے قلمی نسخوں میں خود مرزا صاحب نے کلیات فارسی

---

[1] اردوئے معلیٰ: ۱۳۷



کے خاتمے کی تاریخ ۱۲۵۳ھ (۱۸۳۷ء) لکھی ہے۔ نیز مالک پور کے کتاب خانے کے قلمی نسخے میں بھی جس کی تاریخ کتابت ربیع الآخر ۱۲۵۴ھ ہے۔ یہی سنہ مذکور ہے، اس لئے اتمام کلیات کا سنہ یہی قرار پائیگا۔ بہرحال اُردو اور فارسی کلام کی جمع و ترتیب کا ابتدائی کام مرزا صاحب ہی کے ہاتھوں انجام کو پہنچا اور انہیں اپنے کلام کی اشاعت کے لئے دُوسروں سے مسودے یا بیاضیں مانگنا نہیں پڑے۔ مگر جب افکار و آلام کی کشمکش اور ناقدردانی، ابنائے زماں کی گیرودار نے انہیں ہمیشہ شکستہ خاطر کیا تو یہ کام نواب ضیاء الدین احمد خاں بہادر اور حسین مرزا صاحب وغیرہ نے اپنے ذمے لے لیا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے پہلے تک یہ مجموعے محفوظ تھے۔ چنانچہ جنوری ۱۸۵۷ء میں مرزا صاحب نے سید بدرالدین احمد کو لکھا ہے:[۱]

"آپ ہندی اور فارسی غزلیں مانگتے ہیں۔ فارسی غزل تو شاید ایک بھی نہیں کہی، ہاں ہندی غزلیں قلعے کے مشاعرے میں دو چار لکھی تھیں، مسودہ یا تو تمہارے دوست حسین مرزا صاحب کے پاس ہوں گی یا ضیاء الدین خاں صاحب کے پاس۔ میرے پاس کہاں؟ آدمی کو یہاں آنا تو قدغن نہیں کہ وہاں سے دیوان منگوا کر نقل اتروا کر بھیج دوں۔"

مئی ۱۸۵۷ء میں یہ سارا ذخیرہ لُٹ گیا اور مرزا صاحب اپنا کلام دیکھنے کو خود بھی ترسنے لگے۔ مہر کو بڑے رقت آمیز الفاظ میں لکھتے ہیں:[۲]

"میرا کلام میرے پاس کبھی نہیں رہا۔ ضیاء الدین احمد خاں اور حسین مرزا جمع کر لیتے تھے۔ جو میں نے کہا، انہوں نے لکھ لیا۔ اِن دونوں کے گھر لُٹ گئے۔ ہزاروں رُوپے کے کتاب خانے برباد ہوئے۔ اب میں اپنا کلام دیکھنے کو ترستا ہوں۔ کئی دن ہوئے کہ ایک فقیر کہ وہ خوش آواز بھی ہے اور زمزمہ پرداز بھی ہے، ایک غزل میری کہیں سے لکھوا لیا۔ اس نے وہ کاغذ مجھ کو دکھایا۔ یقین سمجھنا کہ مجھ کو رونا آیا۔"

دسمبر ۱۸۵۸ء میں منشی شیو نراین کو لکھتے ہیں:

"کیا کہوں تم سے؟ ضیاء الدین خاں جاگیردار لوہارو میرے نسبتی بھائی اور میرے شاگرد رشید ہیں۔ جو نظم و نثر میں نے کچھ لکھا، وہ انہوں نے لیا اور جمع کیا۔ چنانچہ کلیات فارسی چوں پچپن جزو اور پنج آہنگ اور مہر نیم روز اور دیوان ریختہ سب مل کر سو سوا سو جزو مطلا اور مذہب اور انگریزی اجری کی جلدیں الگ الگ، کوئی ڈیڑھ سو دو سو روپے کے صرف میں بنوائیں۔ میری خاطر جمع کہ کلام میرا سب یکجا فراہم ہے۔ پھر ایک شاہزادے نے تمام مجموعۂ نظم و نثر کی نقل لی۔ اب دو جگہ میرا کلام اکٹھا ہوا۔ کہاں سے یہ فتنہ پیدا ہوا اور شہر لُٹے، وہ دونوں جگہ کا کتب خانہ خوانِ یغما ہو گیا۔ ہر چند میں نے آدمی دوڑائے کہیں سے ان میں سے کوئی کتاب ہاتھ نہ آئی۔ وہ سب قلمی ہیں۔"

۱۸۵۷ء کی آگ بجھی تو مرزا صاحب کے دل کی افسردگی میں اضافہ ہو گیا اور وہ فن شاعری ہی سے نفرت کرنے لگے۔ اِس لئے دوبارہ کلام جمع کرنے کا خیال آیا تو انہوں نے صرف اتنا کیا کہ منشی شیو نراین کو محولہ بالا مکتوب کے آخر میں لکھا:

"غرض اس تحریر سے یہ ہے کہ قلمی فارسی کا کلیات، قلمی ہندی کا کلیات، قلمی پنج آہنگ، قلمی مہر نیم روز، اگر کہیں ان میں سے کوئی نسخہ بکتا ہوا آوے تو اس کو میرے واسطے خرید لینا اور مجھ کو اطلاع کرنا۔ میں قیمت بھیج کر منگوا لوں گا۔"

مگر ان لُٹے ہوئے نسخوں میں سے کوئی ایک بھی دوبارہ دستیاب نہیں ہوا۔ آخر مجبور ہو کر پھر ایک شاگرد ہی نے فراہمی کلام کا بیڑا

---

[۱] اردوئے معلّٰی ۲۵۹۔ عود ۱۰۸۔ خطوط ۱، ۳۰۶۔ [۲] اردوئے معلّٰی، ۳۶۲، خطوط، ۱، ۲۸۹۔ اس واقعے کو صاحب عالم مارہروی کے نام خطوں میں (اردوئے معلّٰی ۳۰۳، عود ۲۹) اور یوسف علی خاں عزیز کے نام کے خطوں میں بھی دہرایا گیا ہے۔ (اردوئے معلّٰی، ۳۰۶، عود ۹۵، خطوط ۱، ۱۷۵)



اُٹھایا۔ میرزا صاحب نے ان بزرگ کا نام نہیں لیا ہے۔ قاضی عبدالجلیل صاحب کو ۲۳ر فروری ۱۸۶۱ء کو لکھتے ہیں:
"یہ شہر بہت غارت زدہ ہے۔ نہ اشخاص باقی نہ امکنہ۔ کتاب فروشوں سے کہہ دوں گا، اگر میری نظم و نثر کے رسالوں میں سے کوئی رسالہ آجائیگا تو وہ مول لے کر خدمت میں بھیجدیا جائے گا۔ ... ہی تو ہے، نہ سنگ، نہ خشت۔ آہ ایک دوست کے پاس لبقیۃ الہبیب والعارۃ کچھ میرا کلام موجود ہے، اس ... پر غزل لکھوا کر بھیج دوں گا۔"

اسی سال ستمبر ۱۸۶۱ء (۱۱ر ربیع الاول ۱۲۷۸ھ) میں ذکا کو تحریر فرماتے ہیں:[1]

"بر آئینہ چوں پنج آہنگ و مہر نیمروز و دستنبو دارند، آنچہ اکنوں فرستم، ہماں مجموعۂ نظم پارسی تواند بود کہ جامع گرد آورد خود، بیگاہ نداشتم و شہریاں ہرچہ داشتند دراین رستخیز بموسہ آشوب بہ لغما رفت پس از تباہی این شہر آراستہ و فروشستن آں گرد برخاستہ۔ یکے از جاہمداں کہ نامہ نگار راز خویشاوند است گرد پرو بشمہ بر آمد تا چوں رندہ پارہ پارہ بہم دوختہ قریب بہ پنجاہ جزو فراد آورد۔"

یہ دوست جو جاہمد اور غالب کے خویشاوند تھے، نواب ضیاء الدین احمد خاں بہادر نیر ہیں، اس لئے کہ میرزا صاحب نے ستمبر ۱۸۶۲ء میں سید صدر الدین احمد کو لکھا ہے:[2]

"منشی نولکشور نے شہاب الدین خاں کو لکھ کر کلیاتِ فارسی جو ضیاء الدین خاں نے غدر کے بعد بڑی محنت سے جمع کیا تھا، منگا لیا اور چھاپنا شروع کیا۔ وہ پچاس جزو ہیں، یعنی کوئی مصرع میرا اس سے خارج نہیں۔"
لیکن معلوم ہوتا ہے کہ نیّر اور حسین میرزا کے علاوہ بھی بعض شاگردوں کے پاس میرزا صاحب کا مجموعۂ اشعارِ فارسی محفوظ تھا۔ چنانچہ تفضل حسین خاں کو لکھتے ہیں:[3]

"کیوں صاحب، بچا بھتیجا ہونا اور شاگردی و استادی سب برپانی پھر گیا؟ اگر کوئی ہزار پانسو کی چیز ہوتی اور میں تم سے مانگتا تو جانے تم کیا غضب ڈھاتے۔ میرا کلام خرید آٹھ دس روپے کی سو وہ بھی میں یہ نہیں کہتا کہ مجھ کو دے ڈالو، تم کو مبارک رہے، مجھ کو مستعار دے دو۔ میں اس کو دیکھ لوں، جو میرے پاس نہیں ہے اس کی نقل کر لوں پھر تم کو واپس بھیجدوں۔ اس طرح کی طلب پر نہ دینا دلیل اس بات کی ہے کہ مجھ کو جھوٹا جانتے ہو، میرا اعتبار نہیں یا یہ کہ مجھ کو آزار دینا اور ستانا مد نظر ہے۔ وہ کتاب ابھی میرے آدمی کو دے دو۔ واللہ باللہ ایمان میں سے جو میرے پاس نہیں ہے نقل کر کے تم کو بھیج دوں گا۔ اگر تم کو واپس نہ دوں تو مجھ پر لعنت اور اگر تم میری قسم کو نہ مانو اور کتاب حامل رقعہ کو نہ دو تو تم کو آفریں ہے۔"
اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تفضل حسین خاں کے پاس دیوانِ فارسی موجود تھا جسے انہوں نے آٹھ یا دس روپے میں خریدا تھا۔

نواب ضیاء الدین احمد خاں بہادر کے نام کے ایک مفصل خط سے معلوم ہوتا ہے کہ نواب شہاب الدین خاں بہادر کے پاس بھی ایک نسخہ تھا۔ فرماتے ہیں:[4]

"جناب قبلہ و کعبہ! آپ کو دیوان کے دینے میں تامل کیوں ہے؟ روز آپ کے مطالعے میں نہیں رہتا۔ بغیر اس کے دیکھے، آپ کا کھانا نہ ہضم ہوتا ہو یہ بھی نہیں۔ پھر کیوں نہیں دیتے؟ ایک جلد ہزار جلد بن جائے، میرا کلام شہرت پائے۔ میرا دل خوش ہو۔ تمہاری تعریف کا قصیدہ اہلِ عالم دیکھیں تمہارے بھائی کی تعریف کی ترسب کی نظر سے گزرے۔ اتنے فوائد کیا تھوڑے ہیں؟ رہا کتاب کے تلف ہونے کا اندیشہ، یہ خفقان ہے۔ کتاب کیوں تلف ہوگی؟ اچھا تم لڑ لیا

---

[1] پنج آہنگ ۲۴۷ و اردوئے معلیٰ: ۱۳۔ خطوط ۱، ۱۱۱۔ [2] اردوئے معلیٰ ۱۳۔ خطوط ۱، ۱۱۱۔ [3] اردوئے معلیٰ ۲۴۷۔ [4] ایضاً ۲۸۹۔



بھائی دہلی لکھنؤ کے عرض راہ میں ڈاک لٹ گئی تو میں تو ڈرا بسمل ڈاک رام پور جاؤں گا اور نواب ضیاء الدین مرحوم کے ہاتھ کا لکھا ہوا دیوان تم کو لا دوں گا۔ اگر یہ کہتے ہو کہ اب وہاں سے ... کہو گے کہ وہیں سے کیوں نہیں بھیجتے یا یہ لکھوں کہ نواب ضیاء الدین خاں صاحب ... کیا وہ نہیں کہہ سکتے کہ جب وہ تمہارے بھائی اور تمہارے شاگرد ہو کر نہیں دیتے تو میں آشنا ہو کر کیوں دوں۔ یہ کہتے ہو کہ بعض سے لے کر بھیجدو۔ وہ اگر نہ دیں تو میں کیا کروں، اور اگر دیں تو میرے کس کام کا؟ پہلے تو ناتمام تھا غیر ناقص، بعض بعض قصائد ان میں سے اوروں کے نام کر دیئے گئے ہیں اور اس میں اسی ممدوح سابق کے نام پر ہے۔ شہاب الدین خاں کا دیوان جو یوسف مرزا لے گیا ہے اس میں یہ دونوں قباحتیں موجود۔ تیسری یہ کہ سراسر غلط۔ ہر شعر غلط، ہر مصرع غلط ... تمہاری امداد کے بغیر انجام نہ پائے گا اور تمہارا کچھ نقصان نہیں۔ ہاں احتمال نقصان وہ بھی از روئے وسوسہ ... اس صورت میں تلافی کا تعین جیسا کہ اوپر لکھ آیا ہوں۔ بہر حال رضی ہو جاؤ بعد ... لکھو تو میں طالب کو اطلاع دوں اور مطلب اس کی جب دوبارہ ہو تو کتاب بھیجدوں۔ رحم و کرم کا طالب غالب

ان ... سے یہ امر بھی پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتا ہے کہ خود مرزا صاحب کے پاس بھی پورا فارسی کلام موجود تھا۔ لہذا مرزا صاحب نے ... میں یہ ارشاد کیا[1]

"بندہ پرور میرا کلام کیا نظم کیا نثر، کیا اردو کیا فارسی کبھی کسی عہد میں میرے پاس فراہم نہیں ہوا۔ دو چار دوستوں کا یہ التزام تھا کہ وہ مسودات مجھ سے لے کر جمع کر لیا کرتے تھے، سو ان کے لاکھوں روپے کے گھر لٹ گئے جس میں ہزاروں روپے کے کتاب خانے بھی گئے۔ اس میں وہ مجموعہ ہائے پریشاں بھی غارت ہوئے۔ میں خود اس قسمت کے واسطے خون در جگر ہوں۔ ہائے کیا چیز تھی!

- اری زبان کے روزمرہ استعاروں کی ایک مثال ہے جس کا مقصود صرف یہ ہے کہ مرزا صاحب کے پاس جو مجموعہ تھا، وہ ان کے تمام ذخیرۂ کلام کو جامع نہ تھا، اسی لئے کلیات فارسی کے نولکشوری ایڈیشن کی تیاری کے وقت انہیں اس کی تکمیل کی کوشش کرنا پڑی تھی۔ اس کے بعد جو کچھ کہا ہے اس کے متعلق جولائی ۱۸۶۵ء میں بیجر کو لکھا ہے۔

"اب میں نظم و نثر کا مسودہ نہیں رکھتا۔ دل اس دھن سے نفور ہے۔ دو ایک دوستوں کے پاس اس کی نقل ہے۔ ان کو اس وقت کہلا بھیجا ہے۔ اگر آج آ گیا تو کل اور اگر کل آیا تو پرسوں بھیج دوں گا۔ بھائی امین الدین خاں صاحب کے اصرار سے خسرو کی غزل پر ایک غزل لکھی ہے۔ علاء الدین خاں نے اس کی نقل ان کو بھیجدی۔ میں دیوان پر نہیں چڑھاتا، مسودہ بھیجتا ہوں۔ تقدیم و تاخیر ہندسوں کے مطابق ملحوظ رہے۔"[2]

اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ صرف آخر عمر میں مرزا صاحب نے مسودے رکھنا چھوڑ دیئے تھے ورنہ پہلے حتی الامکان اپنا کلام پاس بھی رکھتے تھے۔

... دیوان

جیسا کہ بیان ہو چکا، مرزا صاحب نے ۱۲۵۳ھ (۱۸۳۷ء) میں دیوان فارسی مرتب کر لیا تھا مگر اس کی طباعت کا انتظام عرصے تک نہیں ہو سکا تھا۔ آخر دہلی میں ان کے ایک مخصوص دوست نے چھاپہ خانہ قائم کر کے یہ ارادہ کیا کہ اس میں ... اردو اور دیوان غالب فارسی طبع کریں۔ اردو دیوان ۱۸۴۱ء میں چھپ گیا مگر فارسی دیوان کی طباعت بعض وجوہ

---

[1] اردوئے معلّیٰ ۱۲۷ - عود ۲۷ - [2] خوش قسمتی سے یہ نسخہ جس سے منشی نولکشور نے پریس کے لئے کاپی لکھوائی تھی، لاہور میں محفوظ تھا۔ وہاں سے رضا لائبریری منتقل ہو گیا ہے۔



ملتوی کر دی گئی۔ اس وجہ کے متعلق میرزا صاحب نے مسٹر جان جاکوب کو لکھا ہے[1]:

" ہم چنیں پنج آہنگ و دیوان فارسی کہ طرازش ہر یکے وابستہ بعزائم آمدن درخواست ہائے خریداران ست ہنگام خود پئے ہم بخدمت خواہد رسید"۔

دیوان ریختہ کا مطبع سید الاخبار میں انطباع اکتوبر ۱۸۴۱ء (شعبان ۱۲۵۷ھ) میں واقع ہوا ہے۔ اس بنا پر یہ خط اسی سنہ بلکہ اسی مہینے کا لکھا ہوا ہونا چاہئے۔

ستمبر ۱۸۶۳ء میں میرزا صاحب نے دیوان فارسی مطبوع کے بارے میں تحریر کیا ہے[2]:

" فارسی کا دیوان بیس برس کا عرصہ ہوا چھپا تھا۔ پھر نہیں چھپا"۔

اس خط سے دو باتیں لکھتی میں آتی ہیں۔ پہلی یہ کہ نولکشور پریس میں دیوان کے طبع ہونے سے قبل فارسی دیوان غالب صرف ایک بار چھپا تھا اور دوسری یہ کہ ۱۸۶۳ء میں اس طباعت پر بیس یا بائیس سال گزر چکے تھے۔ اس بیان کے لحاظ سے دیوان فارسی کی پہلی طباعت ۱۸۳۸ء یا ۱۸۴۳ء میں عمل میں آئی ہوگی۔ ان دونوں تخمینوں میں سے پہلا درست نہیں ہے، اس لئے کہ ابھی خود میرزا صاحب کے فارسی خط سے ثابت ہو چکا ہے کہ ۱۸۴۱ء تک دیوان فارسی طبع نہیں ہوا تھا۔ دوسرا تخمینہ اس بنا پر درست نہیں کہ فہرست کتاب خانہائے شاہان اودھ (ص ۴۱۰) میں ڈاکٹر اشپرنگر نے میرزا صاحب کے مطبوعہ دیوان فارسی کے ایک نسخے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ دہلی کے پتھر کے چھاپے خانے میں ۱۲۶۱ھ کو 8 × 5 سائز کے ۵۰۶ صفحوں پر چھپ کر شائع ہوا۔ چونکہ یہ ہجری سنہ عیسوی سال ۱۸۴۶ کے مطابق ہے لہٰذا ۱۸۴۳ء میں اس کا چھاپا جانا صحیح نہ ہوا۔

اگرچہ اشپرنگر نے مطبع کا نام نہیں لکھا ہے لیکن یہ امر یقینی ہے کہ میرزا صاحب کا کلیات نظم فارسی پہلی بار دہلی کے مطبع دارالسلام سے ۱۲۶۱ھ (مئی ۱۸۴۵ء) میں چھپ کر شائع ہوا تھا۔ اپریل ۱۸۵۳ء سے قبل یا بعد میرزا صاحب نے امین الدولہ آغا علی خاں ابن معتمد الدولہ آغا میر[3] نواب حشمت جنگ بہادر[4] اور نواب باندہ[5] کے خطوط میں جس ایڈیشن کا ذکر کیا ہے وہ یہی نسخہ مطبوعہ ۱۸۴۵ء ہے۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے برسوں پہلے یہ نسخہ کمیاب ہو گیا تھا۔ چنانچہ نواب علی بہادر باندہ کے نام محولہ بالا خط میں میرزا صاحب نے یہی لکھا ہے کہ:

" ہر چند ز تن فرماں، ہر دم پاسو سو گماشتم، رفتند و خستند دیوان فارسی و دیوان ریختہ فراچنگ نیامد"[6]

آج بھی یہ نسخہ عام طور پر نہیں ملتا۔ اس کا ایک نسخہ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صاحب (الہ آباد) کے پاس محفوظ ہے۔ ہاں کتاب خانہ عالیہ رامپور میں ایک قلمی نسخہ ہے جس کی تقریظ میں میرزا صاحب نے ۱۲۵۳ھ تاریخ اتمام لکھی ہے، اس میں صفحہ ۲۳ پر مسٹر جان جاکوب کے تعمیر کئے ہوئے کنوئیں کی تاریخ "چشمۂ فیض ایزدی" بھی پائی جاتی ہے جس سے ۱۸۳۹ء (۱۲۵۵ھ) مستخرج ہوتے ہیں۔ صفحہ ۱۵۷ سے ایک قصیدہ شروع ہوتا ہے جس کا عنوان ہے "در مدح جہاں پناہ امجد علی شاہ اورنگ نشین اودھ دام ملکہ"۔ امجد علی شاہ ۶ ربیع الثانی ۱۲۵۸ھ (۱۷ مئی ۱۸۴۲ء) کو تخت نشین ہوئے اور ۲۶ صفر ۱۲۶۳ھ کو فوت ہو گئے۔ اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ کتاب خانہ رامپور کا یہ قلمی نسخہ ۱۲۶۱ھ کے مطبوعہ نسخے کی نقل ہے، یا دونوں نسخے ایک ہی ... منتقل ہو گیا ہے

---

[1] کلیات نثر ۱۷۴۔ [2] اردوئے معلی ۱۳۰ و خطوط ۱/۱۱۱۔
[3] پنج آہنگ ۱۸۲۔ [4] ایضاً ۲۱۱۔ [5] ایضاً ۲۲۳۔



مسودہ سے منقول ہیں۔ اور تقریظ کے سنین ۱۲۵۲ھ میں ... کی طرح رد و بدل نہیں کیا گیا۔

شورش ۱۸۵۷ء کے بعد دیوان کے صرف دو مکمل نسخے تیار ہو سکے تھے، جن میں سے ایک نواب ضیاء الدین خاں بہادر نیر کے پاس تھا اور غالباً اس کی ... مارچ ۱۸۶۱ء میں میرزا صاحب نے اپنے شاگرد نواب یوسف علی خاں ناظم کو رام پور ارسال کردی تھی۔ اسی سال منشی نولکشور نے اس کی طباعت کا ارادہ کیا۔ میرزا صاحب نے ۱۷ محرم ۱۲۷۸ھ (۲۶ جولائی ۱۸۶۱ء) کو میر مہدی مجروح کو اس کی اطلاع ان الفاظ میں دی:

"کلیات نظم فارسی کے چھاپنے کی بھی تدبیر ہو رہی ہے۔ اگر ڈول بن گیا تو وہ بھی چھاپا جائے گا۔"

اوائل سنہ مذکور کو حبیب اللہ ذکا کو لکھا:

"ایک دو بند آخر کہ بہ سید انطباعش در آورند کہ درین صورت متاع فراوان و خواستاران یافتن آن آسان خواہد بود۔"

میرزا صاحب نے مطبع کے لئے نسخہ مہیا کرنے کی یہ تدبیر سوچی کہ تفضل حسین خاں سے ان کا نسخہ مستعار لے کر اپنے دیوان کی تکمیل کر لیں اور اسے لکھنؤ بھیج دیں۔ انہوں نے لیس و پیش کے بعد نسخہ دیا تو وہ ناقص و ناتمام نکلا۔ رام پور سے دیوان منگانا مناسب نہ تھا۔ آخر نواب ضیاء الدین احمد خاں بہادر کو ایک تحریری خط لکھ کر راضی کر لیا کہ وہ اپنا نسخہ لکھنؤ بھیج دیں، جیسا کہ پہلے بھی مذکور ہو چکا ہے۔ سید ...الدین احمد کو ستمبر ۱۸۶۲ء میں میرزا صاحب نے لکھا تھا:

"ہاں، سال گذشتہ میں منشی نولکشور نے شہاب الدین خاں کو لکھ کر کلیات فارسی جو ضیاء الدین خاں نے غدر کے بعد بڑی محنت سے جمع کیا تھا، وہ منگالیا اور چھاپنا شروع کیا۔ وہ پچاس جز ہیں۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسودہ براہ راست نواب شہاب الدین احمد خاں بہادر نے لکھنؤ بھیج دیا تھا اور ۱۸۶۲ء میں اس کی طباعت شروع ہوئی تھی۔

... ۱۸۶۳ء کو میرزا صاحب نے قدر بلگرامی کو ایک خط لکھا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں طباعت کا کام رک گیا تھا۔ چونکہ میرزا صاحب کو اس کی وجہ معلوم نہ تھی اس لئے انہیں تردد تھا۔ نیز یہاں سے کوئی قصیدہ اور تاریخ طباعت کلیات بھی ارسال کئے گئے تھے، ان کا حال بھی معلوم نہ ہو سکا تھا۔ نہ تصحیح وغیرہ کے متعلق کچھ پتا تھا۔ میرزا صاحب نے ان الفاظ میں اپنے مدعا کو ظاہر کیا:

"... صاحب سے میرا سلام کہیے اور یہ رقعہ ان کو پڑھا کر عرض کیجئے کہ غالب پوچھتا ہے کہ فارسی کے کلیات کا چھاپا ملتوی ہے یا جاری ہے۔ ملتوی ہے تو کب تک کھلے گا۔ جاری ہے تو تصحیح کس طور پر ہے۔ قصیدے اور تاریخ کلیات کا مطبع میں پتہ لگایا ہے یا نہیں؟ اگر وہ دونوں کاغذ گم ہو گئے ہوں تو مثنی بھیج دوں۔"

جواب میں جو کچھ لکھا گیا تھا اس کے بعض مطالب میرزا صاحب نے مجروح کو ۱۵ ذی قعدہ ۱۲۷۹ھ (۵ مئی ...) ... تاریخ کلیات وصول کرکے لکھے ہیں:

... ۲۸۔ ۲ اردوئے معلیٰ ۱۸۰، خطوط ۱/۲۷۲۔ ۳ کلیات نثر فارسی ۲۴۷۔ ۴ اردوئے معلیٰ ۲۴۷۔ ۵ ایضاً
ایضاً ۱۴۰، خطوط ۱/۱۱۱۔
۱/۱۱۱۔ ۶ اردوئے معلیٰ ۱۴۴، خطوط ۱/۲۷۶۔



کلیات کے چھپنے کی حقیقت سنو۔ ساٹھ کے چھاپے کئے تھے کہ مولوی ہادی علی مہتمم بیمار ہوگئے۔ کاپی نگار رحصتی اپنے گھر گیا۔ اب دیکھئے کب چھاپا شروع ہو۔ [illegible] ۱۸۶۳ء کو قدر کے خط میں جو لکھا ہے، بعض دوسرے مطالب پر اس سے روشنی پڑتی ہے — فرماتے ہیں:

"کلیات کے انطباع کی تاریخ میں کیونکر لکھوں؟ اہل مطبع کو حدامتی صاحب کے سایۂ عطوفت میں سلامت رکھے، کہہ لیں گے۔ چھاپا ۱۸۶۲ء میں شروع ہوا، ۱۸۶۳ء میں تمام ہوگا۔ مولوی ہادی علی صاحب کے مطبع میں آنے کا حال تم لکھو اور کلیات کے کاپی لگانے کے آنے کا بھی سال معلوم کرکے لکھو۔"

[illegible] تک کام جاری رہا۔ میرزا صاحب کی افسردہ طبیعت پر اس تاخیر کا اثر ہوا کہ پنجشنبہ ۱۹ جون ۱۸۶۲ء کو [illegible] علاء الدین احمد خان بہادر علائی کو لکھتے ہیں:[2]

"کلیات کے انطباع کا اختتام اپنی زیست میں مجھ کو نظر نہیں آتا۔"

[illegible] کے عرصے آئندہ سال کے ماہ جون تک کلیات فارسی کی طباعت کا کام میرزا صاحب کے موجودہ ذخیرۂ مکتوبات [illegible] ۱۱ جون ۱۸۶۳ء کو علائی کے نام ایک خط لکھا ہے، اس میں فرماتے ہیں:[3]

"[illegible] کے باب میں جو عرض کر چکا ہوں۔ مرہمایم کہ ہستیم دہماں خواہد بود۔ جب میں دس پندرہ جلدیں [illegible] لوں گا۔ ایک بھائی کو اور ایک تم کو ارمغاں بھیجوں گا۔ اگر بھائی کو جلدی ہے تو لکھنؤ میں اودھ اخبار کا مطبع مالک رام کے منشی نولکشور مشہور۔ جتنی جلدیں چاہیں لکھنؤ سے منگالیں۔ میں بہرحال دو جلدیں جس وقت موقع ہوگا، بھیج دوں گا۔"

[illegible] سے بظاہر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ۱۱ جون ۱۸۶۳ء سے قبل کلیات کا چھاپا ختم ہوگیا تھا۔ ۲۲ اگست کو مجروح کو لکھا ہے:[4]

"[illegible] کلیات فارسی کا چھپنا مجھ کو معلوم ہوا۔ میاں اس میں اغلاط بہت ہیں۔"

[illegible] معلوم ہوتا ہے کہ اگست میں کتاب چھپ کر اس کا ایک نسخہ براہ راست لکھنؤ سے میر مہدی مجروح کے پاس پہنچ چکا تھا۔ [illegible] میرزا صاحب کے پاس اس کا پہلا نسخہ علائی کے توسط سے ستمبر میں پہنچا۔ چنانچہ ۲ ستمبر ۱۸۶۳ء کو انہیں لکھتے ہیں:[5]

"[illegible] بابا، تمہارا پہلے خط اور پھر بتوسط برخوردار علی حسین خان مجلد کلیات فارسی پہنچی۔ حیرت ہے کہ جلد [illegible] قیمت کتاب اور چار آنے محصول ڈاک۔ والی الطباع میں آکر پانچ روپے قیمت اور پانچ آنے محصول [illegible] سو، وہاں سوا ہے۔ میرا حال نہیں اور تمہارا حال مجھے معلوم ہے۔

ایں ہم اندر عاشقی بالائے غم ہائے دگر

[illegible] کے پیٹے میں شاید نہ دے سکوں۔ تو مرسنہ حال میں پچاس روپے تمہارے پاس پہنچ جائیں گے۔"

میرزا صاحب نے یہ نسخہ سپہ سالار جنگ اوّل کی خدمت میں مولوی مویدالدین خان کے توسط سے روانہ کردیا۔ اس کے متعلق ۲۵ ستمبر ۱۸۶۳ء کو [illegible] کو لکھتے ہیں:[6]

"صاحب تاریخ انطباع کلیات خوب لکھی ہے، مگر ہزار حیف کہ بعد از اتمام انطباع پہنچی اور کتاب کی رونق افزا [illegible]

---

[1] خطوط ۱۹۸/۱۔ [2] اردوئے معلیٰ ۱۱۳ و خطوط ۳۴۰/۱۔ [3] ایضاً ۲۹۴ خطوط ۱۳۱/۱ [4] خطوط ۲۸۵/۱۔
[5] اردوئے معلیٰ ۳۰۶ [6] اردوئے معلیٰ ۳۹۔

غالب



منظور ہوئی۔ آپ سے یہ چاہتا ہوں کہ آپ مولوی صاحب سے ملیں اور اُن کو یہ خط اپنے نام کا دکھائیں اور میری طرف سے بعد سلام میرے کلیات کے پارسل کا ان کے پاس اور ان کے ذریعہ عنایت سے اس مجلد کا حضرت ملک رفعت نواب مختار الملک بہادر کی نظر سے گزرنے اور جو کچھ اس کے گزرنے کے بعد واقع ہو، دریافت کر کے لکھیں۔

مگر میرزا صاحب اس کے ایک سے زائد نسخے منگانا چاہتے تھے اور اس کام کا انجام روپے کے بغیر ممکن نہ تھا۔ حسنِ اتفاق سے منشی نولکشور دہلی آئے۔ میرزا صاحب اور اُن سے بات چیت میں یہ طے ہوا کہ میرزا صاحب ۲ نسخوں کی قیمت ۳ روپے ۴ آنے فی جلد کے حساب سے ادا کر کے منگا لیں۔ اس کے متعلق میرزا صاحب نے ۳ دسمبر ۱۸۶۳ء کو علائی کو لکھا ہے۔[1]

" شفیقِ مکرم و الطاف محتشم منشی نولکشور صاحب بسبیل ڈاک یہاں آئے۔ مجھ سے اور تمہارے چچا اور تمہارے بھائی شہاب الدین خاں سے ملے۔ خالق نے ان کو زہرہ کی صورت اور مشتری کی سیرت عطا کی ہے۔ گویا بجائے خود قران السعدین ہیں۔

تم سے میں نے کچھ نہ کہا تھا اور کلیات کے دس مجلد کی قیمت پچاس روپے مان لیے تھے۔ اب ان سے جو ذکر کیا تو انہوں نے پہلی قیمت مشتہرۂ اخبار لینی قبول کی۔ یعنی ۳ روپے ۴ آنے فی جلد۔ اس صورت میں دس مجلد کے ۳۲ روپے ۸ آنے میں دوں اور ۳۲ روپے ۸ آنے تم۔

بھئی ۶۵ روپے مطبع اودھ اخبار میں پہنچانے چاہئیں۔ میں دسمبر ماہ حال کی دسویں گیارہویں کو طالب ہونگا۔ کچھ ۳۲ (روپے) ۸ (آنے) علی حسین خاں کو دے دوں، کچھ لکھو بھیج دوں۔"

غالباً اس تصفیے کے بعد ہی سید صدر الدین احمد کو بھی لکھتے ہیں:[2]

" اب سنا ہے کہ وہ چھپ کر تمام ہو گیا ہے۔ روپے کی فکر میں ہوں۔ ہاتھ آجائے تو ۶۵ (روپے) بھیج کر بیس جلدیں منگالوں۔ جب آجائیں گی، ایک آپ کو بھیج دوں گا۔"

۱۴ دسمبر کو پھر ایک خط علائی کو لکھا ہے، جس میں اپنے حصے کی رقم ہنڈوی کے ذریعے ارسال کرنے کا وعدہ کیا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ:[3]

" نہ دن یاد ہے، نہ تاریخ، آج چوتھا، یا پانچواں، شاید بھول گیا ہوں یا پانچواں دن ہے کہ منشی نولکشور بسواری ڈاک لکھنؤ روانہ ہوئے۔ کل پہنچ گئے ہوں یا آج پہنچ جائیں۔ آج روز یکشنبہ ۱۴ دسمبر ہے۔"

ظاہر ہے کہ انہوں نے لکھنؤ پہنچ کر ہنڈوی کے ذریعے قیمت وصول کر لی ہوگی۔ تب کلیات کے نسخے بھیجے ہوں گے اور بعید نہیں کہ آغاز ۱۸۶۴ء میں یہ نسخے میرزا صاحب کو ملے ہوں۔

۳۰ مئی ۱۸۶۴ء کے ایک خط میں علائی کو لکھا ہے:[4]

" اے میری جان! مثنوی ابرِ گہربار کون سی مکرر تازہ تھی کہ میں تجھ کو بھیجتا۔ کلیات میں موجود ہے۔ مع ہذا شہاب الدین خاں نے بھیج دی، میں مکرر کیا بھیجتا۔"

سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تاریخ سے قبل ہی ان کے پاس کلیات کے نسخے پہنچ گئے تھے۔

اس ایڈیشن کے بعد میرزا صاحب کی حیات میں پھر کلیات فارسی کی طباعت کی نوبت نہیں آئی۔

---

[1] اردوئے معلیٰ ۴۰۵ و خطوط ۱/۳۵۴۔ [2] اردوئے معلیٰ ۱۳۰ و خطوط ۱/۱۱۱۔ [3] اردوئے معلیٰ ۴۳۳۔ [4] اردوئے معلیٰ ۴۲۷ و خطوط ۱/۳۵۸۔

ڈاکٹر گیان چند

نسخۂ عرشی : کچھ اشعار کی قرأتیں

نسخۂ عرشی طبع اول غالب کا کلیاتِ نظمِ اردو ہے۔ دوسری تمام ترتیبوں کے مقابلے میں یہ متن اشعار کو بہتر طریقہ سے پیش کرتا ہے۔ اس نسخے میں غالب کے تمام قلمرو کلام کو گنجینۂ معنی کے عنوان سے تحت جمع کر دیا گیا ہے۔ یہ مسئلہ ہے کہ اردو شاعری کے پورے ذخیرے میں غالب کا قلمرو دیوان سب سے دقیق اور معلق اشعار کا مجموعہ ہے۔ چونکہ ان اشعار کے مفہوم تک پہنچنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں اس لئے ان میں صحیح متن کا تعین بھی کسی قدر کٹھن ہے۔ عرشی صاحب کا بڑا احسان ہے کہ انہوں نے اشعار کے مصرعوں اور اجزا میں اوقاف کا استعمال بڑی فراخ دلی سے کیا ہے جس کی وجہ سے صحیح مفہوم کی طرف رسائی ہو جاتی ہے۔ ڈیڑھ ہزار سے اوپر کے اس دیوان میں تقریباً ہر جگہ عرشی صاحب کے اوقاف و اعراب کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ لیکن چند اشعار میں یہ شبہ ہوتا ہے کہ اوقاف یا اضافت مختلف مقامات پر لگائے جائیں تو معنی کی تفہیم میں سہولت ہوگی۔ دو چار جگہ قرأتِ لفظ پر بھی شبہ ہوتا ہے۔ ذیل میں ایسی ہی کچھ مثالیں درج کی جاتی ہیں۔

شروع میں شعر کے صفحے کا حوالہ درج ہے اس کے بعد نسخۂ عرشی کا متن۔ اس کے آگے میری مجوزہ ترمیم۔ دونوں متون درج کرنے کے بعد حسبِ ضرورت ترمیم کی سی شرح کی گئی ہے۔

نسخۂ عرشی کے اوقاف و اضافت	میری ترمیم
صفحہ ۴۔ جوشِ طوفانِ کرم، ساقیِ کوثر ساغر	
ہے فلک آئینہ، ایجادکفِ گوہربار	ہے فلک، آئینہ ایجادِ کفِ گوہربار

نسخۂ عرشی میں "ایجاد" بغیر اضافت ہے۔ میری رائے میں دوسرے مصرع کے معنی ہیں کہ نو آسمانوں نے حضرت علی کرم اللہ کے کفِ گوہربار کی آئینہ داری کے لئے آئینہ ایجاد کیا یعنی خود آئینہ بن گئے۔

نسخۂ عرشی کے اوقاف و اضافت	میری ترمیم
۸۔ کھینچتا ہوں کتنے پر صدرۂ دل سے مسطر	
نامہ، عنوانِ بیانِ دلِ آزردہ نہیں	نامہ عنوان، بیانِ دلِ آزردہ نہیں

اصل شعر میں شگفتگی کی فضا ہے۔ نامہ عنوان سے مراد عنوانِ نامہ ہے۔ خوشی کا ماحول ہے۔ میرے نامے کا عنوان یا آغاز دلِ آزردہ کا بیان نہیں بلکہ دلِ شگفتہ کا بیان ہے۔

نسخۂ عرشی کے اوقاف و اضافت	میری ترمیم
۱۲۔ بے دماغِ خجلت ہوں رشکِ امتحاں تا کے	
ایک، بیکسی، تجھ کو عالم آشنا پایا	ایک بیکسی، تجھ کو عالم آشنا پایا



عرشی صاحب نے دوسرے مصرع کا مخاطب سلمیٰ کو مانا ہے۔ میرے نزدیک محبوب سے خطاب کیا ہے۔
شعر کے معنی میں میرا خیال تھا کہ تو صرف مجھی کو عاشقِ صادق سمجھتا ہے، اس لئے صرف مجھی پر جفا
کر کے امتحان کرتا ہے۔ اب معلوم ہوا تو متعدد دوسرے عشاق کا بھی امتحان لے رہا ہے۔ میں ندامت کی
وجہ سے دماغ ہو گیا ہوا۔ غیروں کے امتحان کا رشک کہاں تک کروں۔ مجھ پر ایک بیکسی کا عالم ہے کہ تجھے دنیا بھر کے لوگ
آشنا ملا، یعنی تو نے ان کے عشق کو تسلیم کر لیا ہے۔

۔ جلوہ مایوس نہیں، دل نگرانی، غافل		جلوہ مایوس نہیں، دل نگرانی، غافل
چشمِ امید ہے، روزن تری دیواروں کا

میری رائے میں "دل نگرانی" کے معنی ہو سکتے ہیں "دل کی نگرانی کرنا" جو محبوب کا فعل ہو سکتا ہے۔ صحیح قرأت یہ ہے کہ محبوب کو نگرانی غافل کہا جائے۔ اے وہ شخص جو نگرانی میں کامل نہیں بلکہ غافل ہے۔ ہمارا دل تیرے جلوے کو دیکھنے سے مایوس نہیں۔

جان ہے مردمک میں، شوقِ رخسارِ فروزاں سے
سپندِ شعلہ، نادیدہ صفت، انداز جستن کا		سپندِ شعلہ نادیدہ صفت، انداز جستن کا

میری آنکھ کی پتلی میں روشن رخساروں کی دھن سے سپندِ شعلہ نادیدہ کی طرح آگے کو دوڑنے کا انداز ہے۔ سپندِ شعلہ نادیدہ یعنی وہ سپند جو ابھی شعلے سے واقف نہیں۔

جراکت، ہے حصولِ دعویٔ طاقت شکستن ہا
شرارِ سنگ، اندازِ چراغ از چشم جستن ہا		... اندازِ چراغ از چشم جستن ہا

نسخہ اور نسخۂ عرشی دونوں میں چراغ از چشم جستن لکھا ہے جو بے معنی ہے۔ فارسی کا محاورہ ہے، چراغ از چشم جستن کسی ضربِ شدید پڑنے تو آنکھوں کے آگے تارے سے ناچ جاتے ہیں۔ اسے چراغ از چشم جستن کہتے ہیں۔

دریا بساطِ دعوتِ سیلاب ہے اسدؔ		دریا، بساطِ دعوتِ سیلاب ہے اسدؔ،
ساغر بہ بارگاہِ دماغِ رسیدہ کھینچ

اگر "دریا بساط" کو ایک ترکیب مانا جائے تو شعر کی شرح ہوگی کہ دماغِ رسیدہ دعوتِ سیلاب کے لئے دریا بساط ہے۔ ساغر، دماغِ رسیدہ کی بارگاہ میں کھینچ۔ مجھے تسلیم ہے کہ شعر کے یہ معنی بھی صحیح ہو سکتے ہیں۔ لیکن میں ترجیح یوں دوں گا کہ "ہے" کا فاعل "دریا" کو مانا جائے۔ دریا دعوتِ سیلاب کے لئے بساط کا فریضہ سرانجام دے سکتا ہے۔ اس لئے بہت سے ساغر پینے والا دماغِ رسیدہ (مست دماغ جو دریا کی طرح ہے) کی بارگاہ میں حل کریں۔

۔ جوہرِ آئینہ، فکرِ سخن موئے دماغ		جوہرِ آئینۂ فکرِ سخن، موئے دماغ
عرضِ حسرت لیں را توئے تامل تا چند

دماغ نامرغوب شخص یا شے کو کہتے ہیں۔ باعتبارِ ہیئت بال اور جوہرِ آئینہ میں مماثلت ہوتی ہے۔ فکرِ سخن کے آئینے کا جوہر مجھے ناگوار ہے۔ چونکہ میں اشعار میں صرف مسرت کے مضامین پیش کرتا ہوں اور فکرِ سخن میں وہ مضامین غور و تامل کے بعد پیش کئے جاتے ہیں تو اگر رونا ہی ٹھہرا تو غور و خوض کے بعد کیوں رویا جائے۔ اس لئے مجھے فکرِ سخن ہی ناپسند ہے۔

۳۹۔ گلزارِ دمیدن، سرِ رستانِ رمیدن		گلزارِ دمیدن، سرِ رستانِ رمیدن
فرصت تپش و حوصلۂ نشو و نما ہیچ



یہ صورت موجودہ گلزار رمیدن اور شہرستانِ رمیدن کو الگ الگ اور ایک دوسرے سے بے تعلق طریقے پر پیش قرار دیا ہے۔ شاید ایسا نہیں۔ اگر پہلے مصرعے کے اجزا میں اضافت نہ ہو تو معنی ہوں گے کہ باغ کا پھولنا پھلنا اصل میں ایک شہرستان کا نگاہوں کے آگے سے گزر جانا ہے اور بس۔

۴۱۔ فسوں یکدلی ہے لذتِ بیدادِ دشمن پر
کہ وجدِ برق جوں پروانۂ بال افشاں ہے خرمن پر
کہ وجدِ برق، جوں پروانہ بال افشاں ہے خرمن پر

بیرقی دائرے میں بال افشاں کا تعلق پروانہ سے ہے، وجدِ برق سے نہیں۔ خرمن پر وجدِ برق اس طرح ہے جیسے شمع پر پروانہ بال افشاں ہو۔

۴۴۔ آئینۂ امتحاں، بدرِ تغافل، اسد
آئینۂ امتحاں، بدرِ تغافل اسد
شش جہت اسباب ہر وہم توکل ہوز

نسخۂ عرشی کے اوقاف کے مطابق پہلے مصرعے کے معنی ہوئے: "اے اسد، تو نے آئینۂ امتحاں کو بدرِ تغافل کیا ہوا ہے" یہی معنی عبدالباری آسی نے لکھے ہیں۔ میں آئینۂ امتحاں کی اصطلاح یا علامت سے واقف نہیں۔ میرے نزدیک پہلے مصرعے میں "بدرِ تغافل اسد کی صفت ہے۔" اسد جو کہ بدرِ تغافل ہے امتحاں کا آئینہ دار ہے۔ یعنی اسے دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ قدرت اس کا امتحان لے رہی ہے۔

۵۱۔ ہو جو بلبل پیرو فکرِ اسد
غنچۂ منقارِ گل ہو زیرِ بال
منقارِ گل

نسخۂ عرشی میں "گل" پر کوئی اعراب نہیں۔ بلبل اور غنچہ کے قرینے سے ظاہراً یہی معلوم ہوتا ہے کہ مرتب کے نزدیک یہ "گل" بمعنی پھول ہے۔ مجھے اس میں شبہہ ہے۔ فارسی محاورے میں "منقارِ گِل" زبان یعنی چیچہ کو کہتے ہیں۔ غنچۂ منقار مشہور تشبیہ ہے۔ منقار زیرِ بال کرنا سونے اور خاموش ہونے کے معنی میں آتا ہے۔ شعر کے معنی ہیں کہ اگر بلبل اسد کی فکر کی پیرو ہو تو غنچۂ زباں زیرِ بال کر کے خاموش ہو جائے گی اور غور و خوض میں کھو جائے گی۔

۵۷۔ برقِ بجانِ حوصلہ آتش فگن، اسد
برقِ بہ جانِ حوصلہ آتش فگن، اسد؟
اے دل فسردہ، طاقتِ ضبطِ فغاں نہیں
اے دل فسردہ! طاقتِ ضبطِ فغاں نہیں؟

دونوں مصرعے سوالیہ ہیں: "اے اسد کیا تیرے حوصلے کی جان پر کوئی بجلی آگ برسا رہی ہے؟ اے غمیں دل والے، کیا تجھ میں فغاں کے ضبط کرنے کی طاقت نہیں؟"

۵۸۔ ترے کوچے میں ہے مشاطۂ وا ماندگی، قاصد
پرِ پروازِ زلفِ ناز ہے ہدہد کے شانے میں
پرِ پرواز، زلفِ ناز ہے ہدہد کے شانے میں

خود نسخۂ عرشی سے معلوم ہوا کہ نسخۂ شیرانی میں زلفِ یار کی جگہ زلفِ ناز ہے اور یہی صحیح متن ہے۔ زلفِ باز غلط ہے۔ ہدہد کو شانہ سر بھی کہتے ہیں۔ یعنی ہدہد کی کلغی کو شانۂ ہدہد کہتے ہیں۔ شانہ کے معنی کنگھی کے بھی ہیں، اس لئے دوسرے مصرعے کے معنی ہوئے کہ شانۂ ہدہد میں پرِ پرواز، زلفِ ناز بن گیا ہے۔ جھکے ہوئے پر کی یہ آرائش ہوئی۔

۶۲۔ مرگِ شیریں ہو گئی تھی کوہکن کی فکر میں
مرگ شیریں (لغیرِ اضافت)
تھا حریرِ سنگ سے قطعِ کفن کی فکر میں

مرگ پر اضافت دی جائے تو یہ معنی ہوں گے کہ کوہکن بیستوں نہیں تراش رہا تھا، شیریں کا کفن تراش رہا تھا، کیونکہ اس کے افکار میں شیریں کی موت ہو چکی تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ تشریح ناقص ہے۔ معنی یہ ہیں کہ کوہکن کو تصور میں موت میٹھی اور خوشگوار



...تھی۔ وہ بیستوں تراش کر در اصل اپنے لئے نقش تراش رہا تھا کیونکہ عشق میں جان دینا اسے گوارا تھا۔

۔ بلغنت عطرِ گل، ہم آگہی محرومِ ملتے ہیں

چراغانِ تماشا چشم صد ناسور ملتے ہیں — چراغانِ تماشا چشم صد ناسور ملتے ہیں

ہم عطرِ گل تو کسی غفلت ہی کے عالم میں مَل لیتے ہوں تو مَل لیتے ہوں، ورنہ عام طور پر ہم سو ناسوروں کی آنکھ پر ہاتھ مَل لیتے ہیں۔ کون سی آنکھیں، جو چراغانِ تماشا ہیں۔ ناسور کے منھ پر ہاتھ مَلنے میں عطر مَلنے سے زیادہ کیفیت ہے۔

۔ فرصتِ یک چشمِ حیرت بستن جہت آغوش ہے — یک چشم حیرت (بغیر اضافت)

ہوں، سینہ آسا، وداعِ انجمن کی فکر میں

یک چشم حیرت یعنی تھوڑی سی حیرت۔ غالب مقدار کی قلت یا کثرت دکھانے کے لئے اسی قسم کے فقرے استعمال کرتے ہیں یک جہاں تا مَل رالو، یک گلستاں برگ ریو، یک بخت اوج، یک بیاباں دل بے تاب، یک جہاں چیں جبیں، یک ستر و حباب وغیرہ۔

۶۴۔ مجھ میں اور مجنوں میں وحشت، سازِ دعوا ہے اسد — مجھ میں اور مجنوں میں وحشت سازِ دعویٰ ہے اسد

برگِ برگِ بید ہے ناخن زدن کی فکر میں

ناخن زدن، دو آدمیوں کے بیچ جھگڑا کرا دینا۔ لسہ اعرشی کے مطابق "بید" کا "مبتدا" "وحشت" ہے۔ شعر کے معنی ہوئے "میرے اور مجنوں کے بیچ وحشت، سامانِ دعویٰ ہے۔ بید کا ہر پتہ مجھ میں اور مجنوں میں لڑائی کرانا چاہتا ہے۔" میری رائے میں "بید" کا مبتدا بیدِ مجنوں ہی ہے۔ اس طرح پہلے مصرع کے معنی ہوئے کہ بیدِ مجنوں مجھ میں اور مجنوں میں مقابلہ کر کے وحشت پیدا کیا چاہتی ہے۔ وحشت سازِ دعویٰ، دعویٰ مقابلہ یا ہوڑ کے ذریعے وحشت سازی کرنا۔

۶۵۔ ہے طلسمِ دہر میں، صد حشر پاداشِ عمل — ہے طلسمِ دہر میں صد حشر، پاداشِ عمل

آگہی، غافل! کہ ایک امروز بے فردا نہیں — آگہی غافل! کہ ایک امروز بے فردا نہیں

عرشی کے اوقاف کے مطابق شعر کے جزو اوّل کے معنی ہوں گے "اے غافل، طلسمِ دہر میں آگہی، صد حشر پاداشِ عمل ہے، یعنی آگہی حاصل کر کے اس کے زیر اثر عمل کرنے کی پاداش میں صد حشر بپا ہوتے ہیں۔" میری رائے میں "آگہی غافل" ایک ترکیب ہے۔ وہ شخص جو ہوشیاری کی طرف سے غافل ہے، یعنی اشیا کے انجام سے واقف نہیں۔ یہاں کوئی بھی کام کرنے کا نتیجہ ہے سو حشر بپا کرنا۔ اس لئے بہتر ہے کہ توکل اور بے عملی اختیار کر لو۔ طلسم میں یہ ہوتا ہی ہے کہ کچھ بھی کرو، ہزار فتنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

۶۶۔ ہوئی شرمِ سرد بازاری، ہے سیلِ خانماں — ہوئے شرمِ سرد بازاری، ہے سیلِ خانماں

اسد! نقصان میں مت اور صاحب سرمایہ تو — ہے اسد نقصان میں مت اور صاحب سرمایہ تو

عرشی میں اسد کے دونوں طرف اوقاف رہنے کے معنی یہ ہیں کہ شعر کا مخاطب اسد ہے، حالانکہ یہ ٹھیک نہیں۔ دوسرے مصرع میں یہ کہا ہے کہ اسد مفت میں نقصان اٹھا رہا ہے۔

پروازِ نقد، دامِ تماشائے جلوہ تھا — پرواز نقد، دامِ تماشائے جلوہ تھا

طاؤس نے یک آئینہ خانہ رکھا کرو

پہلے مصرع کے معنی ہیں کہ تماشائے جلوہ ہمائی کا دام طاؤس کی پرواز کو پر کھنے والا تھا۔ نقد کا تعلق ظاہرا پرواز سے ہے، دام

...پیدا کیا ہے میں نے، حیرت آزمائی میں



کہ جوہر آئینے کا ہر پلک ہے چشم حیراں کی				کہ جوہر آئینے کا، ہر پلک ہے چشم حیراں کی

دُوسرے مصرع کے معنی ہیں، چشم حیراں کی ہر پلک آئینے کا جوہر ہے۔ پلک اور جوہر کی مشابہت ظاہر ہے۔ پلک کا تعلق آئینے سے نہیں، چشم سے ہے، اِس لئے وقفے کا مقام "کا" کے بعد ہے۔

۹۔ چار دشت وحشت، سرمہ سا راستہ آیا

کہ چشم آبلہ میں طولِ میلِ راہِ مژگاں ہے				کہ چشمِ آبلہ میں طولِ میل راہ، مژگاں ہے

مستعد سلائی سے مشتبہ ہے۔ اِس سلائی کا طول چشم آبلہ میں پلک کا کام دے رہا ہے راہِ مژگاں کی سلائی کوئی معنی نہیں دیتی۔ ظاہر ہے کہ "راہ" کے بعد وقفہ ہونا چاہیئے۔

۸۲۔ دیوانگاں ہیں حامل رازِ نہانِ عشق

اے بے تمیز گنج کو پروانہ چاہیئے				دیوانہ چاہیئے

"پروانہ" غالباً کسی کے سہوِ ذہن کا نتیجہ ہے۔ یہاں "دیوانہ" ہونا چاہیئے۔

جو لستانِ غم چراغ خلوتِ دل تھا اسد

وصل میں وہ سوزِ شمع محفل تقریر ہے				وصل میں وہ سوز، شمع محفلِ تقریر ہے

شعر کے معنی ہیں میرا سوز ہجر میں دل میں شمع جلائے ہوئے تھا۔ وصل کی شب میں میں محبوب کے سامنے سوز ہجر کی بات چیت کر رہا ہوں۔ "سوز" میں اضافت لگائی جائے تو اُلجھن پیدا ہو جائے گی کہ شعر کس کے بارے میں ہے۔ ظاہرا محبوب کے بارے میں۔ پہلے مصرع کا مضمون تو درست ہو جائے گا، لیکن دُوسرے مصرع میں محبوب کو سوزِ شمع محفلِ تقریر کہنا اس قدر موزوں نہیں۔ اس لئے "سوز" کو بغیر اضافت مان کر "جو" کا مرجع قرار دیا جائے گا۔

۱۰۶۔ زلفِ سیہ، افعی نظر بد قلمی ہے				زلفِ سیہ، افعی نظر بد، قلمی ہے

ہر چند خطِ سبز و زمرد رقمی ہے

نسخۂ عرشی کے اوقاف کے مطابق ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زلف سیہ کے دو اوصاف بتائے گئے ہیں۔ "افعی نظر" اور "بد قلمی"۔ بد قلمی بے معنی فقرہ ہے۔ دراصل شعر کے معنی دُوسرے اوقاف سے واضح ہو جاتے ہیں جو یہ ہیں: "قلمی دھاریوں والی چادر کو کہتے ہیں۔ افعی کو زمرد دکھایا جائے تو افعی اندھا ہو جاتا ہے۔ چادر کی سبز دھاریاں زمرد کی تحریر کی طرح ہیں، لیکن افعی زلف کا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔ محبوب کی زلف سیہ افعی کی طرح ہے اور نظر کی اطر بد قلمی چادر کی طرح جو افعی کی نگہبان ہے سل۔ لئے گی، حالانکہ اس کی دھاریاں سبز اور زمرد رنگ کیوں نہ ہوں۔

۱۰۷۔ بسکہ سودائے خیالِ زلف وحشتناک ہے				بسکہ سودائے خیال، زلف، وحشت ناک ہے

تا دلِ شب، آبنوسی شانہ آسا، چاک ہے

"وحشت ناک" زلف کی صفت نہیں، خیال کی صفت ہے۔

۱۰۸۔ جنوں رسوائی وارستگی زنجیر بہتر ہے				جنوں، رسوائی وارستگی، زنجیر بہتر ہے

بقدرِ مصلحت دلبستگی تدبیر بہتر ہے				بقدرِ مصلحت دل بستگی، تدبیر بہتر ہے

نسخۂ عرشی میں دلبستگی چھپا ہے۔ لیکن اختلاف نسخ سے معلوم ہوا کہ نسخہ شیرانی میں یہاں دل بستگی کر دیا گیا ہے، بہتر ہے میرے اوقاف کے مطابق شعر کے معنی یہ ہیں۔ اے جنوں پیشہ، کیا میں عشق سے وارستگی کی بدنامی لے کر آ ہوں۔ تا قیامت میرے لئے عشق میں مقید رہنا بہتر ہے۔ بقدر مصلحت دل کو عشق میں لگائے رکھنا بہتر تدبیر ہے۔ مجھے معلوم ہوا کہ عرشی صاحب کے ذہن

ستمعو جب کی
میں کیا مفہوم تھا۔

۱۰۸۔ تمثالِ تماشا، اقبالِ تماشا
عجز عرقِ شرمِ لب آئینہ حیرانی



تمثال تماشا اقبال تماشا
عجز عرق شرمے اے آئینہ حیرانی

عرشی صاحب کے اوقاف کے مطابق شعر کے معنی ... آئینہ، مختلف مناظر کو دیکھ کر ان کا عکس قبول کرنا، طرح طرح کی تماشا کا اقبال۔ یہ تیرا شیوہ ہے۔ "تیری حیرانی عرقِ شرم ہے جو عاجزی کا معیار ہوتا ہے۔" میرے اوقاف سے معنی یہ ہوں گے "میں طرح طرح کی شکلوں کو دیکھتا ہوں، اقبال کی نمایش کرتا ہوں۔ انہیں دیکھ کر آئینے کی طرح حیران رہ جاتا ہوں۔ اے میری آئینہ دار حیرانی یہ دونوں شوق (شکلوں کو دیکھنا اور اقبال کی نمائش) ترتیم کے پسینے کا اظہار محض ہیں۔" اس طرح ... جاتے ہیں۔ مطلع ... سے مفہوم میں حصول رہ جاتا ہے۔

۱۰۹۔ پرواز تپش رنگ، گلزار ہمہ تنگی ‍ پرواز تپش رنگی، گلزار ہمہ تنگی
حسن ہوس دل میں لے روح پرفشانی

... گے اور تنگی کی یائے مجہول ایک کے معنی دیتی ہے لیکن ... تنگے ایسا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ یائے معروف سے ... تنگی پرواز تپش رنگی (تپش رنگ ہونے کی کیفیت) ہے اور باغ سب کا سب محض تنگی ہے۔

۱۱۰۔ بے تماشا نہیں جمعیت چشم بسمل
مژہ خالِ دو جہاں خوابِ پریشاں زدہ ہے ‍ مژہ تالِ دو جہاں خوابِ پریشاں زدہ ہے

نسخۂ عرشی کے متن میں خال (بمعنی تل) چھپا ہے۔ غلط نامے میں تصحیح کی گئی ہے کہ خال کو نال (بتشکون) بنا لیا جائے۔ مجھے اصرار ... نال ہونا چاہیے۔ نال کے معنی ہیں قلم کے بیچ کا ریشہ۔ اس کی مماثلت مژہ سے ہے۔ نال پریشاں زدہ ہو سکتی ہے خال کے لئے پریشاں زدگی اتنی برجستہ نہیں۔

۱۱۱۔ صفائے طبع ہے، جلوۂ نازِ سوختن
داغِ دلِ سیہ دلاں مردمِ چشمِ زاغ ہے ‍ ... چشم زاغ (بغیر اضافت)

چشم زاغ ایک فارسی محاورہ ہے جس کے معنی ہیں بے حیا شخص۔ یہاں چشم کی م ساکن ہے۔

... مندرجۂ بالا اشعار گنجینۂ معنیٰ کا طلسم ہیں۔ ان کی ایک سے زیادہ تشریحیں ممکن ہیں عرشی صاحب نے ... عرشی کے مطبوعہ اوقاف طے کرتے وقت کوئی مخصوص معنی مراد لئے ہوں گے۔ میں کوئی اور معنی قیاس کر رہا ہوں، اسلئے اوقاف کی ترتیب میں ترمیم چاہتا ہوں۔ ترمیم کی وجوہ میں نے اوپر درج کر دی ہیں۔ ان میں سے کوئی عرشی صاحب کو قبول ہو تو طبع ثانی میں اسے شاملِ متن فرمالیں۔

بقیہ صفحہ ۲۰۷۔ غالب کی چند تصویریں

کے محاورے کو گہرائی اور سادگی پر داں (دعلا) کریں۔ یہ نہیں کہ اس کو ایک سیاسی اندولن (تحریک) کا بہانہ بنائیں۔ ویسے جس کو جو چیز پیاری ہے وہ کسی بھی چیز کو اس کا بہانہ بنا سکتے ہیں۔ چاہے وہ بہار کا آکال ہو، یا غالب شتابدی کا جلسہ۔

(سمپادک جی کی ہدایت کے مطابق ترجمے میں ہندی اور سنسکرت کے بعض الفاظ جوں کے توں رہنے دیئے گئے ہیں اور قوسین میں ان کے اردو معنی دیدئے ہیں)

نما مخلص

بقیہ صفحہ ۴۹۲ ۔ دقائقِ غالب

۲۔ تھا وہ تنگ سے مراد ملا تھا وہ روپیہ جو انگریزوں سے ملتا تھا گویا غالب عیسائیوں کے نمک خوار تھے۔ یہ پنشن مے خواری کیلئے بہت تھوڑی پڑتی تھی۔ کہتے ہوئے لوتی میں لذت نہیں ملتی۔ عیسائیوں کا نمک شراب میں ملکر شراب کو سرکہ بنائے ہوئے ہے۔ شراب میں نمک ہو تو کیا لذت ملے گی۔ آخر اللہ کو منشی عرشی صاحب نے مجھے لکھ کر بھیجے، لیکن تھوڑی سی دقت یہ ہے کہ نسخۂ بھوپال کی تکمیل یعنی ۱۸۲۱ء تک

زلف سیہ افعی نظرِ بد قلمی ہے ــــ ہر چند خطِ سبز و زمرّد رقمی ہے

قلمی، چادر جیسی پر دھاریاں سی ہوتی ہیں۔ افعی کے دم سے چادر جل سکتی ہے۔ افعی کے سامنے زمرد کو کیا جائے تو روایتاً افعی اندھا ہو جاتا ہے۔ محبوب کی سیہ زلف افعی کی طرح ہے اور حریف کی نظرِ بد قلمی چادر کی طرح ہے۔ حالانکہ اس چادر پر سبز و زمرد دھاریاں رقم ہیں اور زمرد سے افعی اندھا ہو جاتا ہے اس کے باوجود نظرِ بد محض ایک چادر ہے جو حریف دمِ افعی نہیں ہو سکتی اور اس کے سانس سے جل جائے گی۔

وہم غفلت مگر احرامِ فسردن باندھے ــــ ورنہ ہر سنگ کے باطن میں شرر پنہاں ہے

احرام باندھنا، ارادہ کرنا، نیت کرنا۔ دو معنی ہو سکتے ہیں (۱) اگر کسی کو غفلت کیلئے یہ وہم ہو کہ وہ حسن سے غفلت کرتی ہے تو یہ صحیح نہیں۔ اس وہم کو افسردن کا لباس پہن لینا چاہیئے، یعنی لوگ حسن سے غافل نہیں بلکہ افسردہ ہیں جسطرح ہر پتھر میں چنگاری ہوتی ہے اسیطرح ہر دل میں عشق موجود ہے لیکن وہ افسردگی کیوجہ سے اسکا اظہار نہیں کرتے (۲) ہمیں محبوب کیطرف سے تغافل کا جو وہم ہے اب اس وہم کو افسردہ ہو کر ختم ہو جانا چاہیئے ہر پتھر کے دل میں چنگاری ہوتی ہے اسی طرح دل میں وہ آگ ہے کہ اثر ہو کر رہیگا اور تغافل جاتا رہے گا۔ آخر الذکر معنی موزوں تر ہیں۔

بقیہ صفحہ ۵۱۱ ’’غالب اور میرا قاری‘‘

پندرہ فروری ۱۸۶۹ء میں ہم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جدا ہو گیا غالب کی رواں دواں غزلوں کی ہستی گنگا سے آتما کو پوتر کرتے رہنے کے بعد عظیم تخیل کو ختم دینے والی زمین سے غالب ہی کے الفاظ میں ایک اہم سوال کا جواب طلب کرنے کی جسارت کروں گا۔

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم ــــ تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کئے

بقیہ صفحہ ۵۱۴ ۔ بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب

اظہار کا سارا سرمایہ ختم ہو چکا ہے یا پھر اس کی کوئی اور وجہ ہے؟

(۴) ہندوستان کی تمام تر زبانوں کی شاعری میں آجکل اسی ایک بحر کا زور ہے۔ بس چند گنے چنے شاعر ہی اس مرض میں مبتلا نہیں ہیں۔ FRUST-RATION کی طرف سے اب شاعری کا رخ SEX کی طرف جا رہا ہے۔ آجکی شاعری تو اب کوک شاستر کی زبان بھی بولنے لگی ہے۔ اب وہ نہیں اپنا نقطۂ عروج پر آ کر ختم ہو جائیگی یا پھر کوئی اور نیا راستہ اختیار کریگی؟ ان تمام سوالوں کے جوابات مجھے، آپکو، ہم سبھوں کو تلاش کرنے ہیں۔ ملک بھر میں بس یہی ایک شور پھونکا جا رہا ہے۔ میرے فن کے ناقد بھی مجھ سے اکثر انہیں سوالوں کے جوابات طلب کرتے ہیں۔ میں نے صرف احتیاطاً ان سوالوں کو آپ کے سامنے بھی رکھا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مسئلہ کا کوئی اکا دکا پہلو نظر سے پوشیدہ رہا ہو، لیکن ان تمام باتوں کا اظہار ضروری تھا اس لئے میں نے آپکے سامنے پیش کرنیکی جسارت کی ہے۔ غالب کے بیشمار احسانات ہم پر ہیں۔ ان احسانوں سے قطع نظر ان سوالوں کے جوابات اور ان مسئلوں کا حل ہمارا اولین فرض ہے۔ کم از کم سرِ دست ان مسئلوں پر سنجیدگی سے سوچنا ہی کافی ہوگا، ورنہ کبھی کسی روز میاں غالب حقہ تھامے اہلِ کرم اہلِ فن کی محفل میں یہ کہہ پھر سے وارد ہو جائیں گے کہ ـــ

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب ــــ تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

بقیہ صفحہ ۵۱۹ ’’شاعری ۔ بادِ نفس اور نکہتِ گل‘‘

جس کسی شکل میں اہمیت دی گئی ہے۔ انہیں شاعری کا مقصد قرار دیا جائے یا کسی اور لفظ سے تعبیر کیا جائے۔ آخری تجزیے میں شاعری ایک بامقصد اور بالارادہ عمل نظر آتی ہے۔ غالب کی شاعری کی ایک بڑی ہی نہیں، بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ فکر اور جذبہ دونوں کو تحریک میں لاتی ہے اور شاعر پر ایک بڑی ذمہ داری یہ ڈالتی ہے کہ اس کی نگاہ سطح سے ابھر کر نہ رہ جائے۔ شاعری محض لفظوں کا طلسم نہیں جان کا سودا ہے ـــ

جز جیرِ دار شنیخ کز دوران جاں نہ بود ــــ بریدہ باد سرِ ملے کز خویشتن نہ بود

اگر ہم غالب کو ثنائی کا رسماں گراں کی شاعری سے لطف حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اس کے فنی نقطۂ نظر کو غیر اہم قرار دے کر کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتے۔

نقش ہائے رن

SATHE

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انتخابِ کلامِ غالب (اردو)

منتخبہ اعجاز صدیقی

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا — کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا
کاو کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ — صبح کرنا شام کا، لانا ہے جوئے شیر کا
آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے — مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

○

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ — جب آنکھ کھل گئی، نہ زیاں تھا نہ سود تھا
تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن، اسدؔ — سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

○

کہتے ہو نہ دیں گے ہم، دل اگر پڑا پایا — دل کہاں کہ گم کیجے، ہم نے مدعا پایا
سادگی و پُرکاری، بیخودی و ہشیاری — حُسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا
غنچہ پھر لگا کھلنے، آج ہم نے اپنا دل — خُوں کیا ہوا دیکھا، گم کیا ہوا پایا

○

دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں — آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا
میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالبؔ کہ دل — دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دُنیا جل گیا

○

شوق، ہر رنگ رقیبِ سروساماں نکلا — قیس تصویر کے پردے میں بھی عُریاں نکلا
زخم نے داد نہ دی تنگیٔ دل کی یارب — تیر بھی سینۂ بسمل سے پرافشاں نکلا
بُوئے گُل، نالۂ دل، دُودِ چراغِ محفل — جو تری بزم سے نکلا، سو پریشاں نکلا

○

جاتی ہے کوئی کشمکش اندوہِ عشق کی ؟ — دل بھی اگر گیا تو وہی دل کا درد تھا
احباب چارہ سازیِ وحشت نہ کر سکے — زنداں میں بھی خیال، بیاباں نورد تھا
یہ نعشِ بے کفن، اسدِ خستہ جاں کی ہے — حق مغفرت کرے، عجب آزاد مرد تھا

○

بہ فیضِ بیدل، نومیدیِ جاوید آساں ہے — کشائش کو ہمارا عقدۂ مشکل پسند آیا

○

دہر میں نقشِ وفا، وجہِ تسلّی نہ ہوا — ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا
میں نے چاہا تھا، کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں — وہ ستمگر، مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا
کس سے، محرومیِ قسمت کی شکایت کیجے — ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں، سو وہ بھی نہ ہوا

○

ستائش گر ہے، زاہد اس قدر، جس باغِ رضواں کا — وہ اک گلدستہ ہے، ہم بیخودوں کے طاقِ نسیاں کا
مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی — ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے، خونِ گرم دہقاں کا
ہنوز، اک پرتوِ نقشِ خیالِ یار باقی ہے — دلِ افسردہ، گویا، حجرہ ہے یوسف کے زنداں کا
نظر میں ہے ہماری جادۂ راہِ فنا غالب — کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

○

محبت تھی چمن سے، لیکن اب یہ بے دماغی ہے — کہ موجِ بوئے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا

○

سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ الفتِ ہستی — عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا
بقدرِ ظرف ہے ساقی! خمارِ تشنہ کامی بھی — جو تو دریائے مے ہے، تو میں خمیازہ ہوں ساحل کا

○

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا — یاں ورنہ جو حجاب ہے، پردہ ہے ساز کا
رنگِ شکستہ، صبحِ بہارِ نظارہ ہے — یہ وقت ہے شگفتنِ گل ہائے ناز کا
تو اور سوئے غیر نظر ہائے تیز تیز! — میں اور دکھ تری مژہ ہائے دراز کا
کاوش کا دل کرے ہے تقاضا کہ ہے ہنوز — ناخن پہ قرض اس گرہِ نیم باز کا

○

گرچہ ہوں دیوانہ، پر کیوں دوست کا کھاؤں فریب، آستیں میں دشنہ پنہاں، ہاتھ میں نشتر کھلا
ہے خیالِ حُسن میں، حُسنِ عمل کا سا خیال خلد کا اِک در ہے میری گور کے اندر کھلا

○

وَاں، خود آرائی کو تھا موتی پرونے کا خیال یاں، ہجومِ اشک میں تارِ نگہ نایاب تھا
جلوۂ گُل نے کیا تھا واں چراغاں آب جُو یاں، رَواں مژگانِ چشمِ تر سے خُونِ ناب تھا
یاں نفس کرتا تھا روشن شمعِ بزمِ بیخودی جلوۂ گُل، واں، بساطِ صحبتِ احباب تھا
یاد کر وہ دِن کہ ہر اک حلقہ تیرے دام کا انتظارِ صید میں اک دیدۂ بے خواب تھا

○

اب مَیں ہُوں اور ماتمِ یک شہرِ آرزُو توڑا جو تُو نے آئینہ، تمثال دار تھا
گلیوں میں میری نعش کو کھینچے پھرو، کہ مَیں جاں دادۂ ہوائے سرِ رہگذار تھا

○

بس کہ دُشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا
گریہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانے کی در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا
عشرتِ قتل گہِ اہلِ تمنا، مت پوچھ عیدِ نظارہ ہے شمشیر کا عُریاں ہونا
کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ ہائے، اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا
حیف اُس چار گرہ کپڑے کی قسمت، غالبؔ! جس کی قسمت میں ہو، عاشق کا گریباں ہونا

○

دوست غمخواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا، زخم کے بھرنے تلک، ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا،
حضرتِ ناصح گر آئیں، دیدہ و دل فرشِ راہ کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائیں گے کیا،
گر کیا ناصح نے ہم کو قید، اچھا! یوں سہی یہ جُنونِ عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا،
خانہ زادِ زُلف ہیں، زنجیر سے بھاگیں گے کیوں، ہیں گرفتارِ وفا، زنداں سے گھبرائیں گے کیا،
ہے اب اِس معمورے میں قحطِ غمِ اُلفت اسدؔ ہم نے یہ مانا کہ دِلّی میں رہیں، کھائیں گے کیا،

○

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا اگر اور جیتے رہتے، یہی انتظار ہوتا
ترے وعدے پر جیے ہم، تو یہ جان، جھُوٹ جانا کہ خوشی سے مَر نہ جاتے، اگر اعتبار ہوتا

کوئی میرے دل سے پوچھے، ترے تیرِ نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی، جو جگر کے پار ہوتا؛
یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح،
کوئی چارہ ساز ہوتا، کوئی غم گسار ہوتا
رگِ سنگ سے ٹپکتا، وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو، یہ اگر شرار ہوتا
غم اگرچہ جاں گسل ہے، پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غمِ عشق گر نہ ہوتا، غمِ روزگار ہوتا
کہوں کس سے میں کہ کیا ہے، شبِ غم بری بلا ہے
مجھے کیا برا تھا مرنا، اگر ایک بار ہوتا
ہوئے مر کے ہم جو رسوا، ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا
یہ مسائلِ تصوف، یہ ترا بیان غالب!
تجھے ہم ولی سمجھتے، جو نہ بادہ خوار ہوتا

○

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا،
نوازش ہائے بے جا دیکھتا ہوں
شکایت ہائے رنگیں کا گلا کیا،
نگاہِ بے محابا چاہتا ہوں
تغافل ہائے تمکیں آزما کیا؛
فروغِ شعلۂ خس یک نفس ہے
ہوس کو پاسِ ناموسِ وفا کیا،
نفس موجِ محیطِ بیخودی ہے
تغافل ہائے ساقی کا گلا کیا،
دماغِ عطرِ پیراہن نہیں ہے
غمِ آوارگی ہائے صبا کیا؛
دلِ ہر قطرہ ہے سازِ "انا البحر"
ہم اس کے ہیں، ہمارا پوچھنا کیا،
محابا کیا ہے، میں ضامن، ادھر دیکھ
شہیدانِ نگہ کا خوں بہا کیا،
سن اے غارت گرِ جنسِ وفا، سن،
شکستِ قیمتِ دل کی صدا کیا،
بلائے جاں ہے غالب! اس کی ہر بات
عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا!

○

درخورِ قہر و غضب جب کوئی ہم سا نہ ہوا
پھر غلط کیا ہے کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا،
بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے، درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا
قطرے میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل
کھیل لڑکوں کا ہوا، دیدۂ بینا نہ ہوا
تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے، پہ تماشا نہ ہوا

○

وہی اک بات ہے، جو یاں نفس، واں نکہتِ گل ہے
چمن کا جلوہ باعث ہے، مری رنگیں نوائی کا

نہ دے نامے کو اتنا طول غالبؔ مختصر لکھ دے / کہ حسرت سنج ہوں عرضِ ستم ہائے جدائی کا

درد منت کشِ دوا نہ ہوا / میں نہ اچھا ہوا، بُرا نہ ہوا
جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو؟ / اک تماشا ہوا، گلا نہ ہوا
ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں، / تُو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا
ہے خبر گرم اُن کے آنے کی / آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا
کیا وہ نمرود کی خدائی تھی؟ / بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا
جان دی، دی ہوئی اُسی کی تھی / حق تو یوں ہے کہ حق ادا نہ ہوا
کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں، / آج غالبؔ غزل سرا نہ ہوا

یہ جانتا ہوں کہ تُو اور پاسخِ مکتوب، / مگر ستم زدہ ہوں، ذوقِ خامہ فرسا کا
نہ کہہ کہ گریہ بہ مقدارِ حسرتِ دل ہے / مری نگاہ میں ہے جمع و خرچ دریا کا

میں اور بزمِ مے سے یوں تشنہ کام آؤں / گر میں نے کی تھی توبہ، ساقی کو کیا ہوا تھا؟
درماندگی میں غالبؔ! کچھ بن پڑے تو جانوں / جب رشتہ بے گرہ تھا، ناخن گرہ کشا تھا

گھر ہمارا، جو نہ روتے بھی، تو ویراں ہوتا / بحر گر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا / ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا؟
ہوئی مدت کہ غالبؔ مر گیا، پر یاد آتا ہے / وہ ہر اک بات پر کہنا کہ "یوں ہوتا تو کیا ہوتا"

سو بار بندِ عشق سے آزاد ہم ہوئے / پر کیا کریں کہ دل ہی عدو ہے فراغ کا

شرحِ اسبابِ گرفتاریِ خاطر مت پوچھ / اِس قدر تنگ ہوا دل کہ میں زنداں سمجھا

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا — دل، جگر تشنۂ فریاد آیا
دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز — پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا
زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی — کیوں ترا راہ گزر یاد آیا
کوئی ویرانی سی ویرانی ہے — دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

○

ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا — آپ آتے تھے، مگر کوئی عناں گیر بھی تھا
تو مجھے بھول گیا ہو تو پتا بتلا دوں — کبھی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر بھی تھا
بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا — بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا
پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق — آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا
ریختے کے تمہیں استاد نہیں ہو غالبؔ — کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا

○

توفیق بہ اندازۂ ہمت ہے ازل سے — آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا
جب تک کہ نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالم — میں معتقدِ فتنۂ محشر نہ ہوا تھا
دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک — میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

○

عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا — جس دل پہ ناز تھا مجھے، وہ دل نہیں رہا
گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار — لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا
دل سے ہوائے کشتِ وفا مٹ گئی کہ واں — حاصل، سوائے حسرتِ حاصل، نہیں رہا

○

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا — بن گیا رقیب آخر، تھا جو رازداں اپنا
منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے — عرش سے اِدھر ہوتا، کاشکے، مکاں اپنا
دردِ دل لکھوں کب تک، جاؤں، ان کو دکھلا دوں — انگلیاں فگار اپنی، خامہ خونچکاں اپنا
تا کرے نہ غمازی، کر لیا ہے دشمن کو — دوست کی شکایت میں، ہم نے ہم زباں اپنا
ہم کہاں کے دانا تھے، کس ہنر میں یکتا تھے — بے سبب ہوا غالبؔ، دشمن آسماں اپنا

شرمندۂ معنیٔ نظر ہوں، مری قیمت یہ ہے　　کہ رہے چشمِ خریدار پہ احساں میرا
رخصتِ نالہ مجھے دے کہ مبادا ظالم　　ترے چہرے سے ہو ظاہر غمِ پنہاں میرا

○

رحمت اگر قبول کرے، کیا بعید ہے　　شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا

○

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں　　ہو رہے گا کچھ نہ کچھ، گھبرائیں کیا!
لاگ ہو تو اُس کو ہم سمجھیں لگاو　　جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا!
پُوچھتے ہیں وہ کہ "غالب کون ہے؟"　　کوئی بتلاؤ کہ "ہم بتلائیں کیا؟"

○

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی　　چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا
حریفِ جوششِ دریا نہیں خودداریِ ساحل　　جہاں ساقی ہو تُو، باطل ہے دعویٰ ہوشیاری کا

○

عشرتِ قطرہ ہے، دریا میں فنا ہو جانا　　درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا
اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم، اللہ اللہ!　　اِس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا
دل سے مٹنا تری انگشتِ حنائی کا خیال　　ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا
بخشے ہے جلوۂ گُل، ذوقِ تماشا غالب!　　چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہو جانا

○

چار موج اُٹھتی ہے طوفانِ طرب سے ہر سُو　　موجِ گُل، موجِ شفق، موجِ صبا، موجِ شراب
موجۂ گُل سے چراغاں ہے گزرگاہِ خیال　　ہے تصوّر میں زبس جلوہ نما موجِ شراب

○

اے دلِ ناعاقبت اندیش ضبطِ شوق کر　　کون لا سکتا ہے تابِ جلوۂ رُخسارِ دوست

○

نفس نہ انجمنِ آرزو سے باہر کھینچ　　اگر شراب نہیں، انتظارِ ساغر کھینچ

○

حُسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا، میرے بعد　　بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا، میرے بعد

منصبِ شیفتگی کے کوئی قابل نہ رہا
ہوئی معزولیِ انداز و ادا میرے بعد

شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق
ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی
کہ کرے تعزیتِ مہر و وفا میرے بعد

آئے ہے بیکسیِ عشق پہ رونا غالبؔ
کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد

○

کام اس سے آ پڑا ہے کہ جس کا جہان میں
لیوے نہ کوئی نام ستمگر کہے بغیر

مقصد ہے ناز و غمزہ، ولے گفتگو میں کام
چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

○

واحسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ
ہم کو حریصِ لذتِ آزار دیکھ کر

بک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ
لیکن عیارِ طبعِ خریدار دیکھ کر

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پُر خار دیکھ کر

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی، نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ، ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

سر پھوڑنا وہ غالبِؔ شوریدہ حال کا
یاد آگیا مجھے، تری دیوار دیکھ کر

○

مستِ تعلیمِ درسِ بے خودی ہوں اس زمانے سے
کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ دبستاں پہ

○

ہے بس کہ ہر اک اُن کے اشارے میں نشاں اور
کرتے ہیں محبت تو گزرتا ہے گماں اور

یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل اُن کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم، جب اُٹھیں گے
لے آئیں گے بازار سے جا کر دل و جاں اور

ہر چند سبک دست ہوئے بت شکنی میں
ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہے سنگِ گراں اور

ہے خونِ جگر جوش میں دل کھول کے روتا
ہوتے جو کئی دیدۂ خوں نابہ فشاں اور

مرتا ہوں اس آواز پہ ہر چند سر اڑ جائے
جلاد کو لیکن وہ کہے جائیں کہ "ہاں اور"

پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے
رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

لوگوں کو ہے خورشیدِ جہاں تاب کا دھوکا
ہر روز دکھاتا ہوں میں اک داغِ نہاں اور

ہیں اور بھی دنیا میں سخن ور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

ہم اور وہ بے سبب رنج، آشنا دشمن، کہ رکھتا ہے
شعاعِ مہر سے تہمت نگہ کی، چشمِ روزن پر

فنا کو سونپ، گر مشتاق ہے اپنی حقیقت کا
فروغِ طالعِ خاشاک ہے موقوف گلخن پر

اسد بسمل ہے کس انداز کا، قاتل سے کہتا ہے
"تو مشقِ ناز کر، خونِ دو عالم میری گردن پر"

جاتے ہوئے کہتے ہو، "قیامت کو ملیں گے"
کیا خوب، قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

حریفِ مطلبِ مشکل نہیں فسونِ نیاز
دعا قبول ہو یارب، کہ عمرِ خضر دراز

تاب لائے ہی بنے گی غالبؔ
واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

نے گلِ نغمہ ہوں، نہ پردۂ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز

تو اور آرائشِ خمِ کاکل
میں اور اندیشہ ہائے دور دراز

وہ بھی دن ہو کہ اُس ستم گر سے
ناز کھینچوں بجائے حسرتِ ناز

مجھ کو پوچھا تو کچھ غضب نہ ہوا
میں غریب اور تو غریب نواز

اسد اللہ خاں تمام ہوا
اے دریغا، وہ رندِ شاہد باز

آہ کو چاہیے اِک عمر، اثر ہونے تک
کون جیتا ہے، تری زلف کے سر ہونے تک

دامِ ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ
دیکھیں، کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

عاشقی صبر طلب اور تمنا بیتاب
دل کا کیا رنگ کروں، خونِ جگر ہونے تک

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے، لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم، تم کو خبر ہونے تک

پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

یک نظر بیش نہیں، فرصتِ ہستی، غافل
گرمیِ بزم ہے اِک رقصِ شرر ہونے تک

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج — شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

○

گر تجھ کو ہے یقینِ اجابت، دُعا نہ مانگ — یعنی بغیر یک دلِ بے مدّعا نہ مانگ
آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد — مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا! نہ مانگ

○

ہے کس قدر ہلاکِ فریبِ وفائے گُل — بُلبُل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گُل

○

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس — برق سے کرتے ہیں روشن، شمعِ ماتم خانہ ہم
محفلیں برہم کرے ہے گنجفہ بازِ خیال — ہیں ورق گردانیِ نیرنگِ یک بُت خانہ ہم

○

بہ نالہ حاصلِ دل بستگی فراہم کر — متاعِ خانۂ زنجیر، جز صدا، معلوم

○

مجھ کو دیارِ غیر میں مارا، وطن سے دُور — رکھ لی مرے خدا نے، مری بیکسی کی شرم

○

فرصتِ کاروبارِ شوق کسے — ذوقِ نظّارۂ جمال کہاں،
تھی وہ اِک شخص کے تصوّر سے — اب وہ رعنائیِ خیال کہاں
ایسا آساں نہیں لہو رونا! — دِل میں طاقت، جگر میں حال کہاں؟
فکرِ دُنیا میں سر کھپاتا ہوں — مَیں کہاں اور یہ وبال کہاں،
مُضمحل ہو گئے قویٰ، غالبؔ! — وہ عناصر میں اعتدال کہاں،

○

کی وفا ہم سے تو غیر اُس کو جفا کہتے ہیں — ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو بُرا کہتے ہیں
آج ہم اپنی پریشانیِ خاطر اُن سے — کہنے جاتے تو ہیں، پر دیکھیے کیا کہتے ہیں
اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ، انھیں کچھ نہ کہو — جو مے و نغمہ کو، اندوہ رُبا کہتے ہیں
ہے پرے سرحدِ اِدراک سے اپنا مسجود — قبلے کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

○

آبرو کیا خاک اُس گل کی کہ گلشن میں نہیں
ہے گریباں ننگِ پیراہن، جو دامن میں نہیں

رونقِ ہستی ہے عشقِ خانہ ویراں ساز سے
انجمن بے شمع ہے، گر برق خرمن میں نہیں

لے گئی ساقی کی نخوت، قلزم آشامی مری
موجِ مے کی آج رگ، مینا کی گردن میں نہیں

○

میں اور صد ہزار نوائے جگر خراش
تُو اور ایک وہ نہ شنیدن کہ کیا کہوں

ظالم! مرے گماں سے مجھے منفعل نہ چاہ
ہے ہے! خدا نہ کردہ، تجھے بے وفا کہوں

○

مہرباں ہو کے بلا لو مجھے، چاہو جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

○

ہم سے کھل جاؤ بوقتِ مے پرستی، ایک دن
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذرِ مستی، ایک دن

غرۂ اوجِ بنائے عالمِ امکاں نہ ہو
اِس بلندی کے نصیبوں میں ہے پستی، ایک دن

قرض کی پیتے تھے مے، لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی، ایک دن

نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل، غنیمت جانیے
بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی، ایک دن

○

ہم پر جفا سے، ترکِ وفا کا گماں نہیں
اک چھیڑ ہے، وگرنہ مُراد امتحاں نہیں

کس مُنہ سے شکر کیجیے، اِس لطفِ خاص کا
پُرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں

ہم کو ستم عزیز، ستم گر کو ہم عزیز
نامہرباں نہیں ہے، اگر مہرباں نہیں

جاں، مطربِ ترانۂ هَل مِن مَّزِید ہے
لب، پردہ سنجِ زمزمۂ الاماں نہیں

خنجر سے چیرِ سینہ، اگر دل نہ ہو دو نیم
دِل میں چھری چبھو، مژہ گر خونچکاں نہیں

ہے ننگِ سینہ دل اگر آتشکدہ نہ ہو
ہے عارِ دل نفس، اگر آذر فشاں نہیں

پاتا ہوں اِس سے داد کچھ اپنے کلام کی
رُوح القدس اگرچہ مرا ہم زباں نہیں

○

مانعِ دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں
ایک چکر ہے مرے پاؤں میں، زنجیر نہیں

شوق اُس دشت میں دوڑائے ہے مجھ کو کہ جہاں
جادہ غیر از نگہِ دیدۂ تصویر نہیں

رنجِ نومیدیِ جاوید، گوارا رہیو
خوش ہوں، گر نالہ زبونی کشِ تاثیر نہیں

جب کرم رخصتِ بیباکی و گستاخی دے — کوئی تقصیر بجز خجلتِ تقصیر نہیں
غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقولِ ناسخ — آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں

○

ہے تجلی تری سامانِ وجود — ذرہ بے پرتوِ خورشید نہیں

○

جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں — خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں
تماشا کر اے محوِ آئینہ داری — تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں
بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب — تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

○

کب سے ہوں، کیا بتاؤں، جہانِ خراب میں — شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں
تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر — آنے کا عہد کر گئے، آئے جو خواب میں
قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں — میں جانتا ہوں، جو وہ لکھیں گے جواب میں
مجھ تک کب اُن کی بزم میں آتا تھا دورِ جام — ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں
لاکھوں لگاؤ، ایک چرانا نگاہ کا — لاکھوں بناؤ، ایک بگڑنا عتاب میں
غالب چھٹی شراب، پر اب بھی کبھی کبھی — پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں

○

ہیں آج کیوں ذلیل، کہ کل تک نہ تھی پسند — گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں
رَو میں ہے رخشِ عمر، کہاں دیکھیے تھمے — نے ہاتھ باگ پر ہے، نہ پا ہے رکاب میں
اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے — حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں
آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز — پیشِ نظر ہے آئنہ دائم نقاب میں
ہے غیبِ غیب، جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود — ہیں خواب میں ہنوز، جو جاگے ہیں خواب میں
غالب ندیمِ دوست سے آتی ہے بوئے دوست — مشغولِ حق ہوں بندگیِ بوتراب میں

○

حیراں ہوں، دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں — مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں
چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں — ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں؟

جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار
اے کاش، جانتا نہ تری رہ گزر کو میں

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی، راہبر کو میں

اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس اہلِ دہر کا
سمجھا ہوں دل پذیر، متاعِ ہنر کو میں

○

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا، لیکن
ہم کو تقلیدِ تُنک ظرفیِ منصور نہیں

ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائی غالب
میرے دعوے پہ یہ حجت ہے کہ مشہور نہیں

○

عشق و مزدوریِ عشرت گہِ خسرو، کیا خوب
ہم کو تسلیم، نکو نامیِ فرہاد نہیں

کم نہیں وہ بھی خرابی میں، پہ وسعت معلوم
دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں

اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب
لطمۂ موج کم از سیلیِ استاد نہیں

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالب
تم کو بے مہریِ یارانِ وطن یاد نہیں

○

دونوں جہان دے کے، وہ سمجھے، یہ خوش رہا
یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

○

وہ آئیں گھر میں ہمارے، خدا کی قدرت ہے!
کبھی ہم اُن کو، کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

نظر لگے نہ کہیں اُس کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں؟

○

عالمیہائے معانی مت پوچھ
لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں

سادہ پُرکار ہیں خوباں، غالب!
ہم سے پیمانِ وفا باندھتے ہیں

○

زمانہ سخت کم آزار ہے بجانِ اسد
وگرنہ ہم تو توقع زیادہ رکھتے ہیں

○

کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل!
انسان ہوں، پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے؟
لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

سب کہاں، کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں

نیند اُس کی ہے، دماغ اُس کا ہے، راتیں اُس کی ہیں
تیری زُلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

میں چمن میں کیا گیا، گویا دبستاں کھل گیا
بُلبلیں سُن کر مِرے نالے غزل خواں ہو گئیں

واں گیا بھی مَیں تو اُن کی گالیوں کا کیا جواب
یاد تھیں جتنی دُعائیں صَرفِ درباں ہو گئیں

جاں فزا ہے بادہ، جس کے ہاتھ میں جام آ گیا
سب لکیریں ہاتھ کی، گویا رگِ جاں ہو گئیں

ہم مُوَحِّد ہیں، ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملّتیں جب مِٹ گئیں، اجزائے ایماں ہو گئیں

رنج سے خُوگر ہوا انساں تو مِٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

○

ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے
دُشوار تو یہی ہے کہ دُشوار بھی نہیں

شوریدگی کے ہاتھ سے ہے سر وبالِ دوش
صحرا میں، اے خدا! کوئی دیوار بھی نہیں

اِس سادگی پہ کون نہ مر جائے، اے خدا!
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

دیکھا اسدؔ کو خلوت و جلوت میں بارہا
دیوانہ گر نہیں ہے تو ہُشیار بھی نہیں

○

نہ جانوں نیک ہوں یا بد ہوں، پر صحبت مخالف ہے
جو گُل ہوں تو ہوں گلخن میں، جو خس ہوں تو ہوں گلشن میں

○

یہ کِس بہشت شمائل کی آمد آمد ہے؟
کہ غیرِ جلوۂ گُل رہگزر میں خاک نہیں

ہُوا ہوں عشق کی غارت گری سے شرمندہ
سوائے حسرتِ تعمیر، گھر میں خاک نہیں

ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے، اسدؔ!
کھلا کہ فائدہ عرضِ ہُنر میں خاک نہیں

○

دِل ہی تو ہے، نہ سنگ و خشت، درد سے بھر نہ آئے کیوں؟
روئیں گے ہم ہزار بار، کوئی ہمیں ستائے کیوں؟

دَیر نہیں، حرم نہیں، در نہیں، آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہگزر پہ ہم، کوئی ہمیں اُٹھائے کیوں؟

قیدِ حیات و بندِ غم، اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں؟

حُسن اور اُس پہ حُسنِ ظن، رہ گئی بُوالہوس کی شرم
اپنے پہ اعتماد ہے، غیر کو آزمائے کیوں؟

واں وہ غرورِ عِزّ و ناز، یاں یہ حجابِ پاسِ وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں، بزم میں وہ بُلائے کیوں؟

ہاں وہ نہیں خدا پرست، جاؤ وہ بے وفا سہی
جس کو ہو دین و دل عزیز، اُس کی گلی میں جائے کیوں؟

غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں ؛　　روئیے زار زار کیا، کیجیے ہائے ہائے کیوں ؛

میں نے کہا کہ "بزمِ ناز چاہیے غیر سے تہی"　　سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ "یوں"

بقدرِ حسرتِ دل، چاہیے ذوقِ معاصی بھی　　بھروں یک گوشۂ دامن، گر آبِ ہفت دریا ہو

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ　　دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

ہے مجھ کو تجھ سے تذکرۂ غیر کا گلہ　　ہر چند بر سبیلِ شکایت ہی کیوں نہ ہو
ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال　　ہم انجمن سمجھتے ہیں، خلوت ہی کیوں نہ ہو

وفاداری بشرطِ استواری اصلِ ایماں ہے　　مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو
نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا　　رہا کھٹکا نہ چوری کا، دعا دیتا ہوں رہزن کو

تم وہ نازک کہ خموشی کو فغاں کہتے ہو　　ہم وہ عاجز کہ تغافل بھی ستم ہے ہم کو

ابھرا ہوا نقاب میں ہے اُن کے ایک تار　　مرتا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو
جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید　　مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو
سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف، سب درست　　لیکن خدا کرے، وہ تری جلوہ گاہ ہو

ادب ہے اور یہی کشمکش، تو کیا کیجے ؛　　حیا ہے اور یہی گومگو، تو کیونکر ہو ؛
تمہیں کہو کہ گزارا صنم پرستوں کا ؛　　بتوں کی ہو اگر ایسی ہی خو، تو کیونکر ہو ؛
جسے نصیب ہو روزِ سیاہ میرا سا ؛　　وہ شخص دن نہ کہے رات کو، تو کیونکر ہو ؛

کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو ؛　　نہ ہو جب دل ہی سینے میں، تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو ؛

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے، ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں
سُبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

وفا کیسی، کہاں کا عشق، جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگدل، تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو؟

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم!
گری ہے جس پہ کل بجلی، وہ میرا آشیاں کیوں ہو

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالب
ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو

○

سیکھے ہیں مہ رُخوں کے لیے ہم مصوّری
تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیے

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے

ہے رنگِ لالہ و گل و نسریں جدا جدا
ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے

یا میرے زخمِ رشک کو رسوا نہ کیجیے
یا پردۂ تبسمِ پنہاں اُٹھائیے

○

بساطِ عجز میں تھا ایک دل، یک قطرہ خوں، وہ بھی
سو رہتا ہے بہ اندازِ چکیدن سرنگوں، وہ بھی

○

گھر میں تھا کیا کہ ترا غم اسے غارت کرتا
وہ جو رکھتے تھے ہم اِک حسرتِ تعمیر، سو ہے

○

ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے
پرتو سے آفتاب کے ذرّے میں جان ہے

○

خاک میں ناموسِ پیمانِ محبت مل گئی
اُٹھ گئی دنیا سے راہ و رسمِ یاری ہائے ہائے

گوش مہجورِ پیام و چشم محرومِ جمال
ایک دل، تس پر یہ ناامیدواری ہائے ہائے

○

سرگشتگی میں عالمِ ہستی سے یاس ہے
تسکیں کو دے نوید، کہ مرنے کی آس ہے

ہر اک مکاں کو ہے مکیں سے شرف، اسد
مجنوں جو مر گیا ہے، تو جنگل اداس ہے

○

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے
خوش ہوں کہ میری بات سمجھنا محال ہے

کس پردے میں ہے آئینہ پرداز اے خدا
رحمت کہ عذر خواہِ لبِ بے سوال ہے

ہے ہے! خدا نخواستہ وہ اور دشمنی
اے شوقِ منفعل! یہ تجھے کیا خیال ہے

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسدؔ
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

تم اپنے شکوے کی باتیں نہ کھود کھود کے پوچھو
حذر کرو مرے دل سے کہ اس میں آگ دبی ہے

نہ لائی شوخیِ اندیشہ تابِ رنجِ نومیدی
کفِ افسوس ملنا عہدِ تجدیدِ تمنا ہے

○

عشق مجھ کو نہیں، وحشت ہی سہی
میری وحشت، تری شہرت ہی سہی

قطع کیجے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے
غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی

اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو
آگہی گر نہیں، غفلت ہی سہی

ہم کوئی ترکِ وفا کرتے ہیں
نہ سہی عشق، مصیبت ہی سہی

کچھ تو دے، اے فلکِ ناانصاف
آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے
بے نیازی تری عادت ہی سہی

یار سے چھیڑ چلی جائے اسدؔ
گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

○

ڈھونڈے ہے اس مغنّیِ آتش نفس کو جی
جس کی صدا ہو جلوۂ برقِ فنا مجھے

مستانہ طے کروں ہوں رہِ وادیِ خیال
تا بازگشت سے نہ رہے مدعا مجھے

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

○

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالبؔ
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

○

رکھتا پھروں ہوں خرقہ و سجادہ رہنِ مے
مدت ہوئی ہے دعوتِ آب و ہوا کیے

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گرانمایہ کیا کیے

غالبؔ! تمہیں کہو کہ ملے گا جواب کیا
مانا کہ تم کہا کیے اور وہ سنا کیے

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آ جائے ہے
میں اُسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے
ہاتھ دھو دل سے، یہی گرمی گر اندیشے میں ہے
آبگینہ، تندیِ صہبا سے، پگھلا جائے ہے
غیر کو یا رب! وہ کیوں کر منعِ گستاخی کرے
گر حیا بھی اُس کو آتی ہے تو شرما جائے ہے
شوق کو یہ لت کہ ہر دم نالہ کھینچے جائیے
دل کی وہ حالت کہ دَم لینے سے گھبرا جائے ہے
سایہ میرا مجھ سے مثلِ دُود بھاگے ہے اسدؔ
پاس مجھ آتش بجاں کے کس سے ٹھہرا جائے ہے

○

کثرت آرائیِ وحدت ہے، پرستاریِ وہم
کر دیا کافر اِن اصنامِ خیالی نے مجھے
ہوسِ گُل کا تصوّر میں بھی کھٹکا نہ رہا
عجب آرام دیا بے پر و بالی نے مجھے

○

کارگاہِ ہستی میں، لالہ داغ ساماں ہے
برقِ خرمنِ راحت، خُونِ گرمِ دہقاں ہے
غنچہ تا شگفتنہا، برگِ عافیت معلوم!
باوجودِ دل جمعی خوابِ گُل، پریشاں ہے

○

اُگ رہا ہے درو دیوار سے سبزہ غالبؔ
ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

○

دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اُس نے کہا
مَیں نے یہ جانا کہ، گویا، یہ بھی میرے دل میں ہے
گرچہ ہے کس کس بُرائی سے، ولے با ایں ہمہ
ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اُس محفل میں ہے
بس، ہجومِ ناامیدی، خاک میں مل جائے گی
یہ جو اِک لذّت ہماری سعیِ بے حاصل میں ہے

○

دل سے تری نگاہ، جگر تک اُتر گئی
دونوں کو اِک ادا میں رضامند کر گئی
وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں،
اُٹھیے بس اب، کہ لذّتِ خوابِ سحر گئی
دیکھو تو دل فریبیِ اندازِ نقشِ پا،
موجِ خرامِ یار بھی کیا گُل کتر گئی
ہر بوالہوس نے حُسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی
نظّارے نے بھی کام کیا واں نقاب کا
مستی سے ہر نگہ ترے رُخ پر بکھر گئی
مارا زمانے نے اسداللہ خاں تمہیں
وہ وَلولے کہاں، وہ جوانی کدھر گئی

تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے — حورانِ خلد میں تری صورت مگر ملے
اپنی گلی میں مجھ کو نہ کر دفن بعدِ قتل — میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے
ساقی گری کی شرم کرو آج ورنہ ہم — ہر شب پیا ہی کرتے ہیں مے جس قدر ملے
تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم — میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے
لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں — جانا کہ اِک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے
اے ساکنانِ کوچۂ دلدار دیکھنا — تم کو کہیں جو غالبِ آشفتہ سر ملے

O

کوئی دن گر زندگانی اور ہے — اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے
ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام — ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

O

کوئی اُمید بر نہیں آتی — کوئی صورت نظر نہیں آتی
موت کا ایک دن معیّن ہے — نیند کیوں رات بھر نہیں آتی
آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی — اب کسی بات پر نہیں آتی
جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد — پر طبیعت اِدھر نہیں آتی
ہے کچھ ایسی ہی بات جو چُپ ہوں — ورنہ کیا بات کر نہیں آتی
ہم وہاں ہیں، جہاں سے ہم کو بھی — کچھ ہماری خبر نہیں آتی
مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی — موت آتی ہے، پر نہیں آتی
کعبہ کس مُنہ جاؤ گے غالب؟ — شرم تم کو مگر نہیں آتی

O

دلِ ناداں تجھے ہُوا کیا ہے؟ — آخر اس درد کی دوا کیا ہے؟
ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار — یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟
میں بھی مُنہ میں زبان رکھتا ہوں — کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے؟
جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود — پھر یہ ہنگامہ، اے خدا کیا ہے؟

ق

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں؟ — غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے؟

شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے، — نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہے؟
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں — ابر کیا چیز ہے، ہوا کیا ہے؟
ہم کو اُن سے وفا کی ہے اُمید — جو نہیں جانتے، وفا کیا ہے؟
ہاں بھلا کر، ترا بھلا ہوگا — اور درویش کی صدا کیا ہے؟
جان تم پر نثار کرتا ہوں — میں نہیں جانتا دعا کیا ہے؟

○

ہاں، اہلِ طلب! کون سُنے طعنۂ نایافت — دیکھا کہ وہ ملتا نہیں، اپنے ہی کو کھو آئے

○

پھر کچھ اِک دل کو بے قراری ہے — سینہ جویائے زخمِ کاری ہے
پھر جگر کھودنے لگا ناخن — آمدِ فصلِ لالہ کاری ہے
چشمِ دلّالِ جنسِ رسوائی — دل، خریدارِ ذوقِ خواری ہے
پھر اُسی بے وفا پہ مرتے ہیں — پھر وہی زندگی ہماری ہے
بے خودی بے سبب نہیں، غالبؔ! — کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

○

بے اعتدالیوں سے سُبک سب میں ہم ہوئے — جتنے زیادہ ہو گئے، اُتنے ہی کم ہوئے
پنہاں تھا دامِ سخت قریب آشیان کے — اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے
تیری وفا سے کیا ہو تلافی؟ کہ دہر میں — تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے
لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خوں چکاں — ہر چند اِس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

○

ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے — اِک شمع ہے دلیلِ سحر، سو خموش ہے
اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل — زنہار اگر تمہیں ہوسِ نائے و نوش ہے
دیکھو مجھے، جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو — میری سنو، جو گوشِ نصیحت نیوش ہے
ساقی بہ جلوہ، دشمنِ ایمان و آگہی — مُطرب بہ نغمہ، رہزنِ تمکین و ہوش ہے
یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط — دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے
لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ — یہ جنتِ نگاہ، وہ فردوسِ گوش ہے

یا صبح دم جو دیکھیے آ کر تو بزم میں
نے وہ سرور و سور، نہ جوش و خروش ہے

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے، سو وہ بھی خموش ہے

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالبؔ صریرِ خامہ، نوائے سروش ہے

○

آ، کہ مری جان کو قرار نہیں ہے
طاقتِ بیدادِ انتظار نہیں ہے

دیتے ہیں جنت، حیاتِ دہر کے بدلے
نشہ بہ اندازۂ خمار نہیں ہے

گریہ نکالے ہے تری بزم سے مجھ کو
ہائے کہ رونے پہ اختیار نہیں ہے

تو نے قسم میکشی کی کھائی ہے غالبؔ
تیری قسم کا کچھ اعتبار نہیں ہے

○

ہوں سراپا سازِ آہنگِ شکایت، کچھ نہ پوچھ
ہے یہی بہتر کہ لوگوں میں نہ چھیڑے تو مجھے

○

کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے یا رب
اک آبلہ پا وادیِ پُرخار میں آئے

غارت گرِ ناموس نہ ہو، گر ہوسِ زر
کیوں شاہدِ گل باغ سے بازار میں آئے

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے
جو لفظ کہ غالبؔ مرے اشعار میں آئے

○

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
ساغرِ جم سے مرا جامِ سفال اچھا ہے

بے طلب دیں، تو مزا اس میں سوا ملتا ہے
وہ گدا، جس کو نہ ہو خوئے سوال اچھا ہے

ان کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے
کام اچھا ہے وہ، جس کا کہ مآل اچھا ہے

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

○

ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی، نغمۂ شادی نہ سہی

○

عجب نشاط سے، جلاد کے چلے ہیں ہم، آگے
کہ اپنے سائے سے، سر پاؤں سے ہے دو قدم آگے

○

پُر ہوں میں شکوے سے یُوں، راگ سے جیسے باجا   اِک ذرا چھیڑیئے، پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے
رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف   آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

○

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ "تو کیا ہے"   تمہیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے
چپک رہا ہے بدن پر لہو سے پیراہن   ہماری جیب کو اب حاجتِ رفو کیا ہے
جلا ہے جسم جہاں، دل بھی جل گیا ہوگا   کریدتے ہو جو اب راکھ، جستجو کیا ہے
رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل   جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے
رہی نہ طاقتِ گفتار اور اگر ہو بھی   تو کس اُمید پہ کہیے کہ آرزو کیا ہے
ہُوا ہے شہ کا مصاحب، پھرے ہے اِتراتا   وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

○

قہر ہو یا بلا ہو، جو کچھ ہو   کاشکے تم مرے لیئے ہوتے
میری قسمت میں غم گر اتنا تھا   دِل بھی یا رب کئی دیئے ہوتے
آ ہی جاتا وہ راہ پر غالب   کوئی دن اور بھی جیئے ہوتے

○

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو   ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے
عشق نے غالب نکمّا کر دیا   ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

○

پھر اِس انداز سے بہار آئی   کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی
ہے ہَوا میں شراب کی تاثیر   بادہ نوشی ہے بادپیمائی

○

رہا آباد عالم، اہلِ ہمّت کے نہ ہونے سے   بھرے ہیں جس قدر جام و سبو، میخانہ خالی ہے

○

تُو وہ بدخُو کہ تحیّر کو تماشا جانے   غم وہ افسانہ کہ آشفتہ بیانی مانگے

○

اچھا ہے سرِ انگشتِ حنائی کا تصوّر   دِل میں نظر آتی تو ہے اِک بُوند لہو کی

چاک مت کر جیب بے ایامِ گل — کچھ اُدھر کا بھی اشارا چاہیے
دشمنی نے میری کھویا غیر کو — کس قدر دشمن ہے، دیکھا چاہیے
منحصر مرنے پہ ہو، جس کی اُمید — ناامیدی اس کی دیکھا چاہیے
چاہتے ہیں خوب رویوں کو، اسدؔ — آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

گردشِ ساغرِ صد جلوۂ رنگیں تجھ سے — آئینہ داریِ یک دیدۂ حیراں مجھ سے

نکتہ چیں ہے، غمِ دل اُس کو سُنائے نہ بنے — کیا بنے بات، جہاں بات بنائے نہ بنے
مَیں بُلاتا تو ہوں اُس کو، مگر اے جذبۂ دل — اُس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے
کر سکے کون، کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے — پردہ چھوڑا ہے وہ اُس نے کہ اُٹھائے نہ بنے
عشق پر زور نہیں، ہے یہ وہ آتش، غالبؔ — کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

پلادے اوک سے ساقی، جو ہم سے نفرت ہے — پیالہ گر نہیں دیتا، نہ دے، شراب تو دے

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے — نالہ پابندِ نَے نہیں ہے
ہر چند ہر ایک شے میں تو ہے — پر تجھ سی تو کوئی شے نہیں ہے
ہستی ہے، نہ کچھ عدم ہے، غالبؔ — آخر تو کیا ہے، "اے نہیں ہے؟"

ہے دلوں میں تغافل سے تیرے پیدا کی — وہ اِک نگہ کہ بظاہر نگاہ سے کم ہے

اُنھیں سوال پہ زعمِ جنوں ہے، کیوں لڑیے — ہمیں جواب سے قطعِ نظر ہے، کیا کہیے،
حسد سزائے کمالِ سخن ہے کیا کیجے — ستم بہائے متاعِ ہنر ہے کیا کہیے،

مرے غم خانے کی قسمت جب رقم ہونے لگی — لکھ دیا منجملۂ اسبابِ ویرانی مجھے
طبع ہے مشتاقِ لذت ہائے حسرت، کیا کروں — آرزو سے ہے شکستِ آرزو مطلب مجھے

قد و گیسو میں قیس و کوہکن کی آزمائش ہے — جہاں ہم ہیں، وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے
نہیں کچھ سُبحۂ و زنّار کے پھندے میں گیرائی — وفاداری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہے
رگ و پے میں جب اُترے زہرِ غم، تب دیکھیے کیا ہو — ابھی تو تلخیِ کام و دہن کی آزمائش ہے

سنبھلنے دے مجھے، اے ناامیدی، کیا قیامت ہے — کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے
قیامت ہے کہ ہووے، مدعی کا ہم سفر غالبؔ! — وہ کافر، جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے — ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے
گو ہاتھ کو جنبش نہیں، آنکھوں میں تو دم ہے — رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

پھر دیکھیے اندازِ گل افشانیِ گفتار — رکھ دے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے
نفرت کا گماں گزرے ہے، میں رشک سے گزرا — کیونکر کہوں "لو نام نہ اُن کا" مرے آگے
ایماں مجھے روکے ہے، جو کھینچے ہے مجھے کفر — کعبہ مرے پیچھے ہے، کلیسا مرے آگے
کہوں جو حال تو کہتے ہو "مدعا کہیے" — تمہیں کہو کہ جو تم یوں کہو تو کیا کہیے
وہ نیشتر سہی، پر دل میں جب اُتر جاوے — نگاہِ ناز کو پھر کیوں نہ آشنا کہیے
سفینہ جب کہ کنارے پہ آ لگا غالبؔ — خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہیے
پوچھے ہے کیا وجود و عدم اہلِ شوق کا — آپ اپنی آگ کے خس و خاشاک ہو گئے
کرنے گئے تھے اُس سے تغافل کا ہم گلہ — کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے
جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی — مشکل کہ تجھ سے راہِ سخن وا کرے کوئی
بیکاریِ جنوں کو ہے سر پیٹنے کا شغل — جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پھر کیا کرے کوئی
حسن فروغِ شمعِ سخن دور ہے اسدؔ — پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی — میرے دُکھ کی دوا کرے کوئی
روک لو گر غلط چلے کوئی — بخش دو، گر خطا کرے کوئی
کون ہے جو نہیں ہے حاجتمند — کس کی حاجت روا کرے کوئی
جب توقع ہی اٹھ گئی غالبؔ — کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

بہت سہی غمِ گیتی، شراب کم کیا ہے — غلامِ ساقیِ کوثر ہوں، مجھ کو غم کیا ہے
مدعا محوِ تماشائے شکستِ دل ہے — آئنہ خانے میں کوئی لیے جاتا ہے مجھے
ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے — بہت نکلے مرے ارماں، لیکن پھر بھی کم نکلے
ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی — وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغِ ستم نکلے
نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں، لیکن — بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے
محبت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا — اُسی کو دیکھ کر جیتے ہیں، جس کافر پہ دم نکلے
کہاں میخانے کا دروازہ، غالبؔ! اور کہاں واعظ — پر اتنا جانتے ہیں، کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے
سیہ آسا، تنگِ بال و پر ہے، یہ کنجِ قفس — از سرِ نو زندگی ہو، گر رہا ہو جائیے
دل و دیں نقد لا، ساقی سے گر سودا کیا چاہے — کہ اس بازار میں ساغر متاعِ دست گرداں ہے
چھڑکے ہے شبنم آئینۂ برگِ گل پر آب — اے عندلیب، وقتِ وداعِ بہار ہے

دل مت گنوا، خبر نہ سہی، سیر ہی سہی
اے بے دماغ! آئینہ تمثال دار ہے

آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے
ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

غالب، بُرا نہ مان، جو واعظ بُرا کہے
ایسا بھی ہے کوئی کہ سب اچھا کہیں جسے

اے پرتوِ خورشیدِ جہاں تاب! اِدھر بھی
سائے کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب! اگر اِن کردہ گناہوں کی سزا ہے

بیگانگیِ خلق سے بیدل نہ ہو، غالب!
کوئی نہیں تیرا، تو مری جان خدا ہے

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نا ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی

نے تیر کماں میں ہے، نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

ہیں اہلِ خرد کس روشِ خاص پہ نازاں
پابستگیِ رسمِ رہِ عام بہت ہے

ہوگا کوئی ایسا بھی کہ غالب کو نہ جانے؟
شاعر تو وہ اچھا ہے، پہ بدنام بہت ہے

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے
جوشِ قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے

کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو
عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کیے ہوئے

پھر وضعِ احتیاط سے رکنے لگا ہے دم
برسوں ہوئے ہیں چاک گریباں کیے ہوئے

پھر پرسشِ جراحتِ دل کو چلا ہے عشق
سامانِ صد ہزار نمکداں کیے ہوئے

پھر بھر رہا ہوں خامۂ مژگاں بہ خونِ دل
سازِ چمن طرازیِ داماں کیے ہوئے

دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے
پندار کا صنم کدہ ویراں کیے ہوئے

پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب
عرضِ متاعِ عقل و دل و جاں کیے ہوئے

دوڑے ہے پھر ہر ایک گل و لالہ پر خیال
صد گلستاں نگاہ کا ساماں کیے ہوئے

پھر چاہتا ہوں نامۂ دلدار کھولنا
جاں نذرِ دل فریبیِ عنواں کیے ہوئے

مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس
زلفِ سیاہ رخ پہ پریشاں کیے ہوئے

چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو
سرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کیے ہوئے

اِک نوبہارِ ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ
چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کیے ہوئے

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن
بیٹھے رہیں تصوّرِ جاناں کیے ہوئے

غالب ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے
بیٹھے ہیں ہم تہیّۂ طوفاں کیے ہوئے

ادائے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا
صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم[1]

انتخابِ کلامِ غالب (فارسی)

مُنتخبہ سکندر علی وجد

☆

اے بہ خلا و ملا خوئے تو ہنگامہ زا — با ہمہ در گفتگو بے ہمہ با ماجرا
شاہدِ حسنِ ترا در روشِ دلبری — طرۂ پُرخم صفات موئے میانِ ماسوا
دیدہ وران راکہ دید تو بیش فزون — از نگہِ تیز رو گشتہ نگہ توتیا
آب بہ بخشش ز در خوں سکندر ہدر[2] — جاں بہ پذیری ہیچ نقدِ خضر ناروا
بزمِ ترا شمع و گل خستگیِ بوتراب — سازِ ترا زیر و بم واقعۂ کربلا
نکبتیانِ ترا قافلہ بے آب و نان — نعمتیانِ ترا مائدہ بے اشتہا
گرمیِ شعرِ کسے کو بہ دل داشت شور — سوختہ در مغزِ خاک ریشۂ دار و گیا
مصرفِ زہرِ ستم دادہ سادِ قوام — سبز بُود جائے من در دہنِ اژدہا
کم ستم گریہ ام زان کہ بہ علمِ ازل — بودہ دریں جوئے آب گردشِ ہفت آسیا
سادہ ز علم و عمل مہرِ تو ورزیدہ ایم — مستیِ ما پایدار بادۂ ما ناشتا

خلد بہ غالب سپار زانکہ بدان روضہ در
نیک بود عندلیب خاصہ نوآئیں نوا

---

[1] در نسخۂ د عوض بسم اللہ، اسد اللہ الغالب نوشتہ است و در نسخۂ ن بسم اللہ نوشتہ است۔

[2] ہدر بہ معنی حلال۔ گویند کہ سکندر در تلاشِ آبِ حیات رفتہ بود و لے ناکامی دست داد۔ حضرت خضر علیہ السلام را حق تعالیٰ خلعتِ پیغمبری عطا فرمودہ و حیاتِ جاوید بخشیدہ است۔ بوتراب کنیت حضرت علیؓ۔ ناروا یعنی قبول نیست۔

[redacted]

خاموشی ما گشت بدآموز بتان را
زین بیش وگرنه اثرے بود فغان را

مست کشِ ناتشنه و فانیم که آخر
این شیوه عیان ساخت عیارِ دگران را

در طبع بهار این همه آشفتگی از چیست
گوئی که دل از بیم تو چون گشته خزان را

موئے که برون نامده باشد چه نماید
بیهوده در اندام تو جستیم میان را

طاقت هوس است به هنگامه طرف ستد
دادیم بدست غمت از بال عنان را

تا شاهد رازت به خموشی شده رسوا
چون پرده برخسار فروهشت بیان را

در مشربِ بیدادِ تو خونم مے ناب است
کز ذوق به خمیازه درافکنده کمان را

برطاقتیان فرخ و برعشرتیان سهل
ماراست شبِ آدینه ماهِ رمضان را

اشک بده ام بالِ تقاضا ز دو مصرع
تا مژدهٔ معراج دهم شمعِ بیان را

زینسان که فرو رفته بدل پیر و جوان را
مژگانِ تو جوهر بود آئینهٔ جان را

واداست سگِ کوے تو زین حق‌شناسی
در پاے تو می خواستم استاده دربان را

برتر شتم از تحمل قدرت جلوه فرو بار
تا خاک کند نو بر ازان پاے بستان را

اے خاکِ درت قبلهٔ جان و دلِ غالب
کز فیض تو پیرایهٔ هستی است جهان را

تا نام تو شیرینی جان داده به گفتن
در خویش فرو برده دل از مهر زبان را

بر امتِ تو دوزخِ جاوید حرام است
حاشا که شفاعت نکنی سوختگان را

آشنا پا نکشد خار ز رهبت دامنِ ما
گوئی این بود ازین پیش نه پیراهنِ ما

بیتو چون باده که در شیشه هم از شیشه جداست
سود آمیزشِ جان در تنِ ما با تنِ ما

سایهٔ وحشت به صحرا دمِ عیسیٰ دارد
اگر اندیشهٔ منزل نشود رهزنِ ما

تا رود شکوهٔ تیغِ ستم آسان از دل
عجب از رحم پریشان شد از شیونِ ما

دوست با کشتهٔ ما مهرِ نهان می ورزد
خود ز رشک است اگر دل بود ار دشمنِ ما

می پرد مور مگر جان به سلامت نبرد
تا چه برق است که شد بامزه خرمنِ ما

دعویٔ عشق ز ما کیست که باور نکند
می جهد خونِ دلِ ما ز رگِ گردنِ ما

سخنِ ما ز لطافت نپذیرد تحریر
نشود گرد نمایان ز رمِ توسنِ ما

طوطیان را بود هرزه جگرگون منقار
خورده خونِ جگر از رشکِ سخن گفتنِ ما

ما بنودیم بدین مرتبہ راضی غالب
شعر خود خواہشِ آن کرد کہ گردد فنِ ما

ز من گرت نبود باور انتظار بیا   بہانہ جوی مباش و ستیزہ کار بیا
بیک دو شیوہ ستم دل نمی‌شود خرسند   بہ مرگِ من کہ بسامانِ روزگار بیا
بہانہ جوست در الزامِ مدعی شوقت   یکے برغمِ دلِ ناامیدوار بیا
ہلاکِ شیوۂ تمکین مخواہ مستان را   عنان گسستہ‌تر از بادِ نوبہار بیا
ز ما گسستی و با دیگران گرو بستی   بیا کہ عہدِ وفا نیست استوار بیا
وداع و وصل جداگانہ لذتے دارد   ہزار بار برو، صد ہزار بار بیا
تو طفلِ سادہ دل و ہمنشیں بدآموزست   جنازہ گر نتوان دید بر مزار بیا
فریب خوردۂ نازم چہا نمی‌خواہم   یکے بہ پرسشِ جانِ امیدوار بیا
ز خوی تست نہادِ شکیب نازک تر   بیا کہ دست و دلم می‌رود ز کار بیا
رواجِ صومعہ ہستی‌ست زینہار مرو   متاعِ میکدہ مستی‌ست ہوشیار بیا
حصارِ عافیتے گر ہوس کنی غالب
چو ما بہ حلقۂ رندانِ خاکسار بیا

سوزد ز بسکہ تابِ جمالش نقاب را   دانم کہ درمیاں نپسندد حجاب را
پیراہن از کتان و دمادم ز سادگی   نفرین کند سپیدہ دمِ ماہتاب را
تا خود شبے بہ ہمدمی ما بسر برد   در چشمِ بختِ تیرہ رہا کرد خواب را
یارب دم نوید وعدۂ یار آمدن رسد   تا در وصالِ یاد دہد اضطراب را
در دل خورد بہ لابہ و از جاں مدارکند   در سینہ شکوۂ ستمِ بے حساب را
جرأت نگر کہ ہرزہ ز بیتم آمد سوال   گیرم ز بوسہ زان لبِ نازک جواب را
نازم فروغِ بادہ ز عکسِ جمالِ دوست   گوئی فشردہ اند بجام آفتاب را
سوزد جگر ز میش چو دارد بمیخان بہ لہو   ریزد ز آبگینہ بساغر سراب را
آتش دہم بہ بادہ و او ہر دم از تمیز   نوشد مے و ز جام فرو ریزد آب را
آسودہ باد خاطرِ غالب کہ خوے اوست
آمیختن بہ بادۂ صافی گلاب را

بادۂ مشکبوئے ما بید و کنار کشت ما — کوثر و سلسبیل ما طوبیٰ ما بہشت ما
بسکہ غم تو بودہ است تعبیہ در سرشت ما — نسخۂ فتنہ می برد چرخ ز سرنوشت ما
حسرت وصل ار چہ رو چون بخیال سر کنیم — ابر اگر بایستد بر لب جوست کشت ما
نور خرد ز آگہی جوہر بینش تن پدید کرد — حرف رقوم دوزخ ست نامیہ در بہشت ما
این ہمہ از عتاب تو ایمنی عدو چرا ست — اے بہ بدی ز ما خوشی خوئے تو سرنوشت ما
پردہ صد از لعین نشر ز بر سر صد ہزار خم — گر بہی در آفتاب بادہ چکد ز خشت ما
بے خطر از خودی برآ لب بہ انا الصنم کشا — شیوۂ گبر و دار نیست در کنش کنشت ما
بادہ اگر بود حرام بدلہ خلاف شرع نیست — دل بنہی بخوب ما طعنہ مزن بزشت ما

گفت بحکم حسرتی غالب خستہ این غزل
شاد ہیچ می شود طبع دعا سرشت ما

یار در عہد شبابم بکنار آمد و رفت — ہمچو عیدے کہ در ایام بہار آمد و رفت
تا نفس باختہ پیروی شیوۂ کیست — تند بادے کہ بتاراج غبار آمد و رفت
سبحہ گردان اثر پائے وجود سے خیال — ہرچہ گل کرد تو گوئی بشمار آمد و رفت
طالع بسمل ما بین کہ نماند از پے — پارۂ برار چون شکار آمد و رفت
شادی و غم ہمہ سرگشتہ ز ار یکدگر اند — روز بر روش بوداع شب تار آمد و رفت
ہرزہ مشتاب و پئے جادہ شناسان بردار — اے کہ در راہ سخن چون تو ہزار آمد و رفت
رقص تمثال سراپائے تو میسوا ست کشید — طرز رفتار ترا آئینہ دار آمد و رفت
ہلہ غافل ز بہاران چہ طمع داشتہ — گیر کامسال برنگینی یار آمد و رفت
بفریب اثر حوصلۂ قاتل صد بار — جان بہ پروانگی شمع مزار آمد و رفت

غالب این حرف ست نہ ہنجار برور
موج این بحر سکر بکنار آمد و رفت

از فرنگ آمدہ در شہر فراوان شدہ است — جرعہ را دیں عوض آرید سے ارزان شدہ است
چشم بد دور چہ جوش می تپم امشب کہ ز دور — نفس سوختہ در سینہ پریشان شدہ است
در دلش حرفی و در دیر و حرم بشناسی — تا چہ روداد کہ در راویہ پنہان شدہ است
لب گرد بیجود دیا خود شکر آبی دارد — تا چہ گفت ست کہ از گفتہ پشیمان شدہ است

داغم از موروِ نظر بازی شوخی به شکر
کش بود پویه بدان پاے که مژگان شده است

گفتم الله زمن شاد به مردن گردی
گفت دشوار که مُردن ہو آسان شده است

دُردِ روغن به چراغ و کدرے به ایاغ
تا خود از شب چه بجا ماند که مهمان شده است

شاهد و مے زمیان رفته و شادم به سخن
گشته ام سید دیں باغ که ویراں شده است

شهرتم گر بمثل مانده گر دد ببینی
که بر آں مائده خورشید نمکداں شده است

غالب آزرده سرو شنبست که از مستی قرب
هم بدان وحی که آزرده غزل خواں شده است

دل بُرد و حق آں ست که دلبر نتواں گفت
بیداد تواں دید و ستمگر نتواں گفت

در رزم گهش ناچخ و خنجر نتواں برد
در بزم گهش باده و ساغر نتواں گفت

از تشنگی ساعد و گردن نتواں جُست
زیبندگی یاره و زیور نتواں گفت

پیوسته دهد باده و ساقی نتواں خواند
همواره ترا شد بُت و آزر نتواں گفت

از حوصله یاری مطلب صاعقه تیز ست
پروانه شو اینجا ز سمندر نتواں گفت

هنگامه سر آمد چه زنی دم ز تظلم
گر خود ستمے رفت به محشر نتواں گفت

در گرم روی سایه و سرچشمه نجوئیم
با ما سخن از طوبیٰ و کوثر نتواں گفت

آں راز که در سینه نهان ست نه وعظ ست
بر دار تواں گفت و به منبر نتواں گفت

کارے عجب افتاد بدیں شیفته ما را
مومن نبود غالب و کافر نتواں گفت

چشمم از ابر اشکبار ترست
از عرق جبهه بهار ترست

گریه کرد از رقیب و زارم کشت
نگه از تیغ آبدار ترست

می برانگیزدش شکستن من
دشمن از دوست غمگسار ترست

دی مگر مست بوده کامروز
شرمم از شکوه ناگوار ترست

اے که جوئے تو بجز روے تو نیست
دیده از دل امیدوار ترست

نو بدولت رسیده را نگر ید
خطش از زلف مشکبار ترست

طفلی و تیر دلبری مشکنی
آه عهدے که استوار ترست

همه عجز و نیاز رے خواهند
زار تر هر که حق گزار ترست

خستہ از راہِ دور می آیم   یا ز تن پارۂ فگارترست
شکوہ از جورِ دوست نتوان کرد   بادۂ تند سازگارترست
میرسد گر بخویشتن نازد
غالب از خویش خاکسارترست

ظهورِ بخششِ حق را ذریعه بی سببی ست   وگرنه شرمِ گنه در شمارِ بی ادبی ست
دگر ز دار چه غم چون تسلسلی که منم   هنوز قصۂ علاج حرفِ زیرِ لبی ست
رموزِ دین نشناسم درست و معذورم   نهادِ من عجمی و طریقِ من عربی ست
نشاطِ جم طلب از آسمان نه شوکتِ جم   قدح مباش ز یاقوت باده گر عنبی ست
بالتفاتِ سرِ زم در آرزو چه نزاع   نشاطِ خاطرِ مفلس ز کیمیا طلبی ست
بود به طالعِ ما آفتاب تحت الارض   فروغِ صبحِ ازل در شرابِ نیم شبی ست
نه هم بپایگیِ راهدان بلا سے بود   خوشست گرمیِ تیغش خلافِ شرعِ نبی ست
هر آنچه در نگری جز به جنس مائل نیست   عیارِ بیکسیِ ما شرافتِ نسبی ست
کسیکه از تو فریبِ وفا خورد داند   که بیوفائیِ گل در شمارِ بوالعجبی ست
عبودیت بکشد اقتضاے خواهشِ کام   دعا بصیغۂ امرست و امر بے ادبی ست
میان غالب و واعظ نزاع شد ساقی
بیا و لابه که هیجانِ قوتِ عصبی ست

نشاطِ معنویان از شراب خانۂ تست   فسونِ بابلیان فصلے از فسانۂ تست
بجام و آئینہ حرفِ جم و سکندر چیست   که هر چه رفت بهر عهد در زمانۂ تست
فریبِ حسنِ بتان پیش کش اسیرِ توایم   اگر خط ست وگر خال دام و دانۂ تست
هم از احاطۂ تست اینکه در جهان مارا   قدم به بتکده سر بر آستانۂ تست
سپهر را تو بتاراج ما گماشته   نه هر چه دزد زما برد در خزانۂ تست
مرا چه جرم گر اندیشه آسمان پیماست   نه تیزگامیِ توسن ز تازیانۂ تست
کمان ز چرخ و خدنگ از بلا و بر ز قضا   خدنگ خوردۂ آن صیدگر نشانۂ تست
سپاسِ جودِ تو فرض ست آفرینش را   درین فریضه دوگیتی همان دوگانۂ تست
نوائے کہ بجز سخن گستران بیسی   مباش منکرِ غالب که در زمانۂ تست

گر دهم شرح عتابی که بدلها داری   دود از کارگه شیشه گران برخیزد

کشتهٔ دعوی پیدائی خویشیم همه   ولی گر پرده ازین راز نهان برخیزد

زینهار از تعب دوزخ جاوید مترس   خوش بهاریست کزو بیم خزان برخیزد

عمرها چرخ بگردد که جگر سوخته   چون من از دودهٔ آذرلسان برخیزد

گر دهم شرحِ ستم هائے عزیزاں غالب

رسم امید هما نا ز جهان برخیزد

گویم سخنی گرچه شنیدن نشناسد   صبحیست شبم را که دمیدن نشناسد

از بند چه نکشاید و از دام چه خیزد   ماییم و غزالی که رمیدن نشناسد

گوهر چه شکایت کند از بی سر و پائی   ماییم و سرشکی که چکیدن نشناسد

ساقی چه ستمگر بود و باده چه تندی   خون باد دماغی که رسیدن نشناسد

ما لذتِ دیدار ز پیغام گرفتیم   مشتاق نویدن ز شنیدن نشناسد

بی پرده شوار نار و مبندیش که ما را   چون آئینه چشمیست که دیدن نشناسد

مبسم چه ملا بر سرِ جیب و کفن آرد   دستی که به خنجر جامه دریدن نشناسد

پیوسته روان از مژه خون جگر ستم   رنگیست زخم را که پریدن نشناسد

ستوقم مئے گلگون بشبم میدمداشت   پیمانه ز ساقی طلبیدن نشناسد

با لذتِ اندوه تو در ساخته غالب

گوئی همه دل گشت و طپیدن نشناسد

نادان صنم من روشِ کار ندانند   رهرو که کند رحم سر از بار ندانند

بی دشنه و خنجر شود معتقدِ زخم   دلهائے عزیزاں نعم افگار ندانند

بر تشنه لب بادیه سوز و روش از مهر   اندوهِ جگر تشنهٔ دیدار ندانند

گویم سخن از رنج و راحت کندش طرح   روز سیه از سایهٔ دیوار ندانند

دل را بغم آتشکدهٔ زار نسنجد   دم را به تفِ ناله شرر بار ندانند

عنوان هوا داری احباب ببینند   پایانِ هوس هائے اغیار ندانند

دشوار بود مردن و دشوار تر از مرگ   آنست که من میرم و دشوار ندانند

دانم که ندانست و ندانم که غمِ من   خود کمتر از آنست که بسیار ندانند

از ناکسیِ خویش به مقدار عزیزم | در عربده خوارم کند و خوار نداند
گردم سرِ آوارهٔ آزادگیِ خویش | صد ره نهدم بند و گرفتار نداند
فصلے ز دلِ آشوبیِ درمان بسرائید | تا چند بخود پیچم و غمخوار نداند

پیمانه بر آن رند حرامست که غالب
در بیخودی اندازهٔ گفتار نداند

اگر بدل نخلد هرچه از نظر گذرد | زهے روانیِ عمرے که در سفر گذرد
به وصل لطف نه اندازهٔ تحمل کن | که مرگ تشنه بود آب چون ز سر گذرد
هلاک نالهٔ خویشم که در دلِ شبها | دود به عربده چندانکه از اثر گذرد
ازین اوریب نگاهان حذر که ناوکِ شان | بهر دلے که رسد راست از جگر گذرد
نفس ز آبله هائے دلم برآرد سر | چنانکه رشته درآمودن از گهر گذرد
حریفِ شوخیِ اجزائے نالہ نیست شرر | که آن برون جهد این رخنه در جگر گذرد
کند خدنگِ تو قطعِ خصومتِ من و غیر | مرا خود از دل و او را هم از نظر گذرد
ز شعله خسیِ دل زمزارِ ما چه عجب | که برق مرغِ هوا را ز بال و پَر گذرد
شکستِ ما بعدم نیز همچنان پیداست | بصورتِ شرر لیکن که از کمر گذرد
خوشا گلے که بفرقِ بلند بالا نیست | دمد ز شاخ و ازین شبر کاخ بر گذرد
دماغِ محرمیِ دل رسا مدان آسان نیست | چها که بر سرِ خار از ستیشه گر گذرد

حریفِ منتِ احبابِ نیستم غالب
خوشم که کارِ من از سعیِ چاره گر گذرد

نیست دستے که بما کاهشے از غم نرسد | نوبت سوختنِ ما به جهنم نرسد
دوری درد ز درمان نتواسی هشدار | کز تپیدن دل افگار بمرهم نرسد
مے به زهاد مکن عرض که این جوهرِ ناب | پیش این قوم بسوزابهٔ زمزم نرسد
خواجه فردوس بمیراث تمنا دارد | وای گر در روشِ نسل به آدم نرسد
صلہ و مزد مبینیش که در پرسشِ عام | لاله از داغ و گل از چاک بشبنم نرسد
بهره از سرنوشتیم نیست دماغم عالیست | باده گر خود بود از میکدهٔ جم نرسد
هرچه بینی بجهان حلقه ز ...ت | ... جا نه ... گر ازان وارد تا بهم نرسد

فرحالتِ بیدار گزیں را بگذر　　یکسان میرسد آنکس که بخود هم نرسد
هر کجا دستهٔ شوق تو عنانت بارد　　جز حرامنے سگ گرسنه ادهم نرسد
طوبیٔ فیض تو هر جا گل دیدار استاند　　جز لیسیده به پرسش گه مریم نرسد

سوزد از تابِ سموم دم گرمم غالب
دل گرمش تا رگی از افکنِ دمادم نرسد

چاک از جیبم بدامان میرود　　آنچه بر چاک از گریبان میرود
جوهر طبعم درخشان ست لیک　　روزم اندر ابر پنهان میرود
گر رود مشکل مرنج اے دل که کار　　جان رود از دست آسان میرود
جز سخن کفرے و ایمانے کجاست　　خود سخن در کفر و ایمان میرود
هر شمیمے را تماشاے در خورست　　بوے پیراهن به کنعان میرود
آید و از ذوقِ سپاسم گریست　　تا رود پیداست کے جان میرود
می رود اما یکے جامی برد　　می رود اما پریشان میرود
هر که میند در رهش گوید همی　　قبلهٔ آتش پرستان میرود
اوّل ماهست وار شرم تو ماه　　آخر شب از شبستان میرود
بگذر از دشمن دلش سخت است سخت　　آبروے تیر و پیکان میرود

کیست تا گوید بدان ایوان نشین
آنچه بر غالب ز دربان میرود

نومیدیٔ ما گردشِ ایّام ندارد　　روزی که سیه شد سحر و شام ندارد
بوسم لبِ دلدار گر بدنام نتوانم　　هرست و لم حوصلهٔ کام ندارد
معرست لطوفِ حرمِ دوست نسیمے　　کز نکهتِ گل جامهٔ احرام ندارد
هر ذرّهٔ عالم ز در رقصان هوائے ست　　دیوانگیٔ شوق سرانجام ندارد
زوق به بلا ده که دگر بیم بلا نیست　　مرغ قفسی کش نگسش دام ندارد
قاصد خبر آورد و همان خشک دماغم　　ظرف تدحش رشحهٔ پیغام ندارد
بلبل به چمن بنگر پروانه به محفل　　شوق ست که در وصل هم آرام ندارد
بوسے که ربایند بمستی ز لب یار　　عزست و لے لذّتِ دشنام ندارد

ہر رشحہ باندازۂ ہر حوصلہ ریزند
میخانۂ توفیق خم و جام ندارد

نقاب دار کہ آئین رہزنی دارد — جمال یوسفی و حرف بیہمی دارد
وفای غیر گرش دلستیں تست چہ غم — خوشم ز دوست کہ با دوست دشمنی دارد
چہ ذوق رہروی آنرا کہ خار خارے نیست — مرو بہ کعبہ اگر راہ ایمنی دارد
بلعل ہی من گرم بحث و شور مست — نگاہ تو بر مان تو ہم نفی دارد
بباده گر بودم میل شاہدم بنقاب — بحق چہ سنگ ز آلوده دامنی دارد
بیا و ریدگر اینجا بود زبان داے — غریب شہر سخن ہائے گفتنی دارد

مبارک ست رمق از رحیمی بود غالب
ضیائے تو بتر ما چشم روشنی دارد

صاحب دل ست وا سوز عشقم بسامان خوش نکرد — آشوب بیدا شنگ او اندوہ پنہاں خوش نکرد
درنامہ تا سو ختمش کز شہر ہیہات میسروم — دل بست ز مضمون ولے مانم بعنوان خوش نکرد
فرہاد ران شرمندگی کار دچوں در محشرم — گوبنداسک حرہ بہ کردست فرہاد خوش نکرد
عاشق لطف دلبراں خرجام بہ ہمدل بران — عاشق جام استی بدان گر دل بہجران خوش نکرد
شرع ار سلامت پیشگی عشق مجازی برتافت — زاہد بکنج صومعہ غوغائے سلطان خوش نکرد
ماهی میاو برلبے بدر نفس زند آورد را نگہ — ہرکس کرشہ صاحب نظر دیں بدگمان خوش نکرد

غالب زمن گمسگو بار وبدین ار رستی کراد
سرنوشت در دیوان غزل تا مصطفیٰ خان خوش نکرد

من نوقا مردم ورقیب بدر زد — بہ لیش انگبیں و نیر تیبر زد
در مکتس میں واعتماد نفوذ ستس — گر ہے انگمد ہم ترحم جگر زد
کیست در میخانہ کز خطوط شعاعی — مہر نعش دیدہ ہا بر در دل در زد
دعوی او را بود دلیل بدیہی — خندہ دیدان بما جس گہر زد
غیرت پروانہ ہم برور سارک — نالہ چہ آتش ببال مرغ سحر زد
لشکر ہوشم نزد برئے بہ سشاسی — عمرۂ ساقی بحث راہ لطف زد
رال تیت مارک چہ جای دعوی موست — دست دی و دلستہ کہ او بہ کمر زد

برگ طرب ساختیم و باده گرفتیم — هرچه ز طبع زمانه بیهده سر زد
شاخ چو بالد گر ارمغان گل آورد — تاک چه نازد اگر صلائے ثمر زد
کام نہ بخشیدہ گشت چه شماری
غالب مسکین بالتفات نیر زد

بیا و جوشش تمنائے دیدنم بنگر — چو اشک از سر مژگان چکیدنم بنگر
ز من بجرم تپیدن کناره می کردی — بیا بخاک من و آرمیدنم بنگر
گذشته کار من از رشک غیر شرمت باد — ببزم وصل تو خود را ندیدنم بنگر
شنیده ام که نه بینی و ناامید نیم — ندیدن تو شنیدم شنیدنم بنگر
رمید دانه و بالید و آشیان گم شد — در انتظار هما دام چیدنم بنگر
نیازمندی حسرت کشان نمیدانی — نگاهِ من شو و از دیده دیدنم بنگر
اگر هوائے تماشائے گلستان داری — بیا و عالم در خون تپیدنم بنگر
جفائے شانه که تارے گسسته زان سر زلف — ز رشک دست بدندان گزیدنم بنگر
بداد من نرسیدی ز درد جان دادم — بداد طرز تغافل رسیدنم بنگر
تواضعے نکنیم بے تواضعے غالب
بسائیه خم تیغش خمیدنم بنگر

اے ذوقِ نواسنجی بازم بخروش آور — غوغائے شبیخونی بر بنگهِ هوش آور
گر خود بجهد از سر از دیده فرو بارم — دل خون کن و آں خون را در سینه بجوش آور
هان همدم فرزانه دانی رهِ ویرانه — شمعے که نخواهد شد از باد خموش آور
شورابه این وادی تلخ است اگر رادی — از شهر بسوئے من سرچشمۂ نوش آور
دانم که زرے داری هر جا گذرے داری — مے گر ندهد سلطان از باده فروش آور
گر مغ بکده ریزد بر کف نه و راهی شو — ور شحنه سبو بخشد بردار و بدوش آور
ریحان دمد از مینا رامش چکد از قلقل — آں در رهِ چشم افگن این از پے گوش آور
گاهے بسبک دستی از باده ز خویشم بر — گاهے بسیه مستی از نغمه بهوش آور
غالب که بقایش باد همپائے تو گر ناید
بارے غزلے فردی زان موینه پوش آور

نه مرا دولتِ دنیا نه مرا اجرِ جمیل   نه چو نمرود توانا نه شکیبا چو خلیل
با رقیبان کفِ ساقی ز مئے ناب کریم   با غریبان لبِ جیحون بدمِ آب بخیل
تیغ و بازو به شب تیره در افگند براه   آنکه داده ست سراسیمگیِ صبحِ رحیل
هان و هان اے که بهم پاره بسیمیں ساعد   گر دمِ تیغ نه لیسے بزبانِ خونِ قتیل
بس کن از عربده تا چند ربائی نفسوس   از گدایانِ سر و از تارکِ شاهان اکلیل
تو نباشی دگرے کوے تو شود چپے   کے شدستیم به دل تشنگیِ حامد تعیل
ترس موقوف چه سد رشک نه لمی که دگر   دارم آهنگِ سپایش گری ربِّ جلیل
اے بسمارِ قضا دوخته چشمِ ابلیس   بدم گرمِ روان سوخته بالِ جبریل
باقوامِ حرمی خاطرِ موسیٰ بر طور   با خودم خستگیِ لشکرِ فرعون به سبیل
ز کمالِ تو در اندازه کمالِ تو محیط   ز وجودِ تو در اندیشه وجودِ تو دلیل
به کسی چاره لبِ خشک مسلمانے را   اے ترسا بچگان کرده مئے ناب سبیل

غالبِ سوخته جاں راچه بگفتار آری
بدیارے که ندانند نظیری ز قتیل

گفتم ز شادی میرم گفت اینت ارزاں در بغل   تنگم لسیدار ساد گی ور وصل جاناں در بغل
نازم خطر در رندگش داں ہر رہ دل لرریدلیش   پیچے ساری بر حسبِ دستے بدستاں در بغل
آه از سکِ پیرایه کا فرونِ شدستش تردامنی   تا خوی زدن داد ارحیا گردید عریاں در بغل
دانش همه در باخته خود را زمن نشناخته   رخ در کنارم ساخته از شرم پنہاں در بغل
تا پاس دار و خویش را مے در گریباں رخی   حسنی چو رعنی زان ملس گل رگ ریباں در بغل
گاهم به پہلو خفته خوش پسمی لب از حرف رخی   گاهم سار دماده سر سودی رخیداں در بغل
ما جرامده آمد صبح گه سد قبا لیتش بےگره   وا مدرطلب مستوره سته نکشوده عنواں در بغل
مے خورده در گلستاں سرا مستانه گشتی شو بشو   خود ساز اورا از وقد باغ و گلستاں در بغل
چوں غنچه دیدی در چمن گفتی به گلبن کت ز من   چوں رفته ناوک از جگر چوں مانده پیکاں در بغل

ہاں غالبِ خلوت نشیں بے چناں عیشے چنیں
جاسوس سلطاں در کمیں مطلوب سلطاں در بغل

دانم که بیرنگی ز تماشا برانگیزم   در بزمِ رنگ و بو نمطے دیگر انگیزم

در وعدہ اہلِ صومعہ ذوقِ نظارہ نیست
ما ہند را بہ مرمرہ از منظر افگنم

معشوقہ را ز نالہ بداں ساں کنم حزیں
کز لاغری بہ ساعدِ او زیور افگنم

ہنگامہ را بہ تحسیمِ جنوں برجگر زنم
اندیشہ را بہ ہوائے فسوں در سر افگنم

نخلم کہ ہم بجائے رطب طوطی آورم
ابرم کہ ہم بروئے زمیں گوہر افگنم

با خاریان ز شرحِ غمم کار از نفس
شہپر را برعشہ زیں جوہر افگنم

با دیریاں ز شکوہ سیداِ اہلِ دیں
مہرے ز خویشتن بدلِ کافر افگنم

منعم بہ کعبہ مرتبہ قربِ خاص داد
سجادہ گستری تو و من بستر افگنم

تا بادہ تلخ تر شود و سینہ ریش تر
بگدازم آبگینہ و در ساغر افگنم

ملکے ز گنجِ ذرہ بہ بینہ گشودہ ام
از غم کشم پیالہ و در کوثر افگنم

یاد باد آں روزگاراں کاعتبارے داشتم
آہ آتشناک و چشمِ اشکبارے داشتم

ترکتازِ مرمرِ شوقِ تو ام از جا ربود
ورنہ با خود پاسِ ناموسِ عیارے داشتم

جوں شد اجزائے زمانے در فشارِ بیخودی
رفت ایامے کہ من امسال و پارے داشتم

چوں بسر آمد بادہ از عمرِ واپس غم گرفت
ایں ہم کز خویشتن پرہیزِ بارے داشتم

جوے تو دانستم اکنوں بہرِ من زحمت مکش
دام بودم تا دلِ امیدوارے داشتم

دیگر از خویشتم خبر بود تکلف برطرف
ایں قدر دانم کہ غالب نام یارے داشتم

تا فصلے از حقیقتِ اشیا نوشتہ ایم
آفاق را مرادفِ عنقا نوشتہ ایم

ایمانِ عیب تفرقہ ہا رفت از ضمیر
زاسما گزشتہ ایم و مسمیٰ نوشتہ ایم

عنوانِ ما بنامہ اندوہ سادہ بود
سطرِ شکستِ رنگ بہ سیما نوشتہ ایم

ملزم فشانیِ مژہ از پہلوے دل است
ایں ابر را برات بدریا نوشتہ ایم

خاکے بروئے نامہ پیلتا بدہ ایم ما
رخصت بداں حریفِ خود آرا نوشتہ ایم

در ہیچ نسخہ معنیِ لفظے امید نیست
فرہنگِ نامہ ہائے تمنا نوشتہ ایم

آشفتہ و گرستہ تمنا و حسرت است
یک نامہ کے بود کہ بصد جا نوشتہ ایم

دارد رخت بحوالِ تما ساخطے زحسن
روشن سوادِ ایں ورق نانوشتہ ایم

رنگ شکستِ عرضِ سپاسِ بلائے تست — پیمان سپردهٔ غم و پیدا نوشته ایم
آشفته ایم بر سرِ خارے بجرمِ دل — قانونِ ما غبارِ صحرا نوشته ایم
کوبیت زعشقِ جبههٔ مایک قلم پرست — لختے سپاسِ بندگی یا نوشته ایم

غالب الف همان علمِ وحدت بود ست
ز لا چه بر فزود گر الا نوشته ایم

سوخت جگر تا کجا رنجِ چکیدن دهیم — رنگ شو اے خونِ گرم تا بپریدن دهیم
عرصهٔ شوقِ ترا مستِ تماشاییم ما — تن چو بریزد رهیم هم به تپیدن دهیم
جلوه غلط کرده اند زرخ نکهت تا به مهر — ذره و پروانه را مژدهٔ دیدن دهیم
سیرهٔ ما در عدم تشنهٔ برقِ بلاست — در رهِ سیلِ بهار سر ز دمیدن دهیم
وا که بمستی رهیم بر سر و دستارِ گل — تا مےِ گلفام را مزدِ رسیدن دهیم
بر اثرِ کوهکن ناله فرستاده ایم — تا جگرِ سنگ را ذوقِ دریدن دهیم
شیوهٔ تسلیمِ ما بوده تواضع طلب — در خمِ محرابِ تیغ تن بخمیدن دهیم

غالب از اوراقِ ما نقشِ ظهوری دمید
سرمهٔ حیرت کشیم دیده بدیدن دهیم

بیا که قاعدهٔ آسمان بگردانیم — قضا بگردشِ رطلِ گران بگردانیم
بگوشه‌ئ بنشینیم و در فراز کنیم — بکوچه بر سرِ ره پاسبان بگردانیم
اگر ز شحنه بود گیر و دار نندیشیم — وگر ز شاه رسد ارمغان بگردانیم
اگر کلیم شود همزبان سخن نکنیم — وگر خلیل شود میهمان بگردانیم
گل افگنیم و گلابی به رهگذر پاشیم — مے آوریم و قدح در میان بگردانیم
گهے بلابه سخن با ادا بیامیزیم — گهے ببوسه زبان در دهان بگردانیم
نهیم شرم بیک سوے و باهم آویزیم — بشوخیی که رخِ اختران بگردانیم
ز جوشِ سینه سحر را نفس فرو بندیم — بلاے گرمیِ روز از جهان بگردانیم
بوهمِ شب همه را در غلط بیندازیم — ز نیمه ره رمه را با شبان بگردانیم
بجنگ باج ستانانِ شاخسارے را — تهی سبد ز درِ گلستان بگردانیم
بصلح بال فشانانِ صبحگاهی را — ز شاخسار سوے آشیان بگردانیم

ز بس وصالِ تو باور نمی‌کند غالب
بیا که قاعدهٔ آسمان بگردانیم

ز بیمِ باغ و بہارِ جہان فشانان | غمِ خشم و خزانِ رازدانان
بصورت اوستادِ دل‌بریان | معنی تشنهٔ ناپیدا بیان
جمعی کوی ترا ادراک نشینان | حق سوی ترا از یاد خواهان
بلایت چهره با مشکین مویان | ادای چهره بر مارک میانان
غمت را بختیان زنار بندان | گلت را عهد لیبان سرخوانان
وصالت جان نوانا سازِ پیران | خیالت خاطر آشوبِ جوانان
غمِ دوزخ ہیبت را مدامی | گدازِ زهرهٔ آتش ربایان
مباحث یای لغزِ موشگافان | دہانت خشم بندِ نکته‌دانان
دل از داغت بساطِ گل‌فروشان | تن از رحمت رواے باغبانان
سگِ کوی ترا در کاسه کیسی | لبِ پُر دعوتِ شیرین دہانان
سرِ راه ترا در خاک روبے | نسیم رحیم گیسی ستانان
به نیتِ بانیٔ لطفِ تو امید | وی ہم چون بہارِ سختِ جانان
ببالد دستیِ عفو تو عصیان | زبون ہم چون نشستِ ناتوانان

ز ناحق کشتگان راضی بجانست
که غالب ہم یکے باشد از آنان

تا ز دیوانم که سرمستِ سخن خواهد شدن | این می از قحطِ خریداری کہن خواهد شدن
کوکبم را در عدم اوجِ قبولی بوده است | شہرتِ شعرم بگیتی بعدِ من خواهد شدن
مطرب از شعرم بہ پردہ که خواهد زد نوا | جا کہا اینا رقیبِ پیرہن خواهد شدن
از حرفم در مذاق ستہ جا خواهد گرفت | دستگاهِ بارِ شیخ و برہمن خواهد شدن
داشتی چندے که ہر بستل معنی یک قلم | جلوهٔ کلک در رقم دار و رسن خواهد شدن
خشم کو آمد دعوی کف خواهد گرفت | دستِ قتل مشاطهٔ زلفِ سخن خواهد شدن
شاہد مضمون که ایک تیری حال دلست | دوستا آوارهٔ کام و دہن خواهد شدن
تا دماد دل درین محفل که ہر با آمد الیست | شیونِ رنجِ فراقِ جان و تن خواهد شدن

ہم فروغ شمع ہستی تیرگی خواہد گزید　　ہم بساط بزم مستی پرشکن خواہد شدن
نقش را از جلوہ بارستن نفس خواہد گداخت　　نغمہ را از پردہ سازش کفن خواہد شدن
پردہ بار ازروے کار ہمدگر خواہد فتاد　　طوف گبر و مسلمان انجمن خواہد شدن

ورتہ ہر حرف غالب خندہ ام میخانۂ
تا ز دلوام کہ سرمست سخن خواہد شدن

دولت بہ غلط سود از سعی پشیماں شو　　کافر نتوانی شد ناچار مسلماں شو
از ہر رہ روان گشتن سالم نتوان گشتن　　جوئے رہ جاناں رو سیلے بہ بیاباں شو
ہم خانہ بتاناں ہم جلوہ فراواں بہ　　در کعبہ اقامت کن در بتکدہ مہماں شو
آوارہ معنی را بر سار دلستاں زن　　ہنگامۂ صورت را بازیچۂ طفلاں شو
افسانۂ شادی را یکسر خط نطلان کش　　عرنامۂ ماتم را آرایش عنواں شو
گر چرخ فلک گردی سر برخط فرماں بہ　　در گوے زمیں باشی دقف خم چوگاں شو
سرمایہ کرامت کن و انگاہ تعارت بر　　بر خرمن ما برقے بر مزرعہ باراں شو

جاں داد تم غالب خشنودی زودحس را
در بزم عزاے کش در لوحہ غزل خواں شو

ہمہ من عاشق داتم تشنہ ما پایا ہو　　ناظر حسن صفاتم تشنہ ناپایا ہو
موسیٰ وعصر تماشاے تجلی بر طور　　من بہ در بند جہاتم تشنہ ناپایا ہو
تیر برآتش رخشندۂ عشقم کہ بیکے ست　　دم میلاد و وفاتم تشنہ ناپایا ہو
ظلمت کم ہستیں روشنی طبع نگر　　چشمۂ آب حیاتم تشنہ ناپایا ہو
بن تحریر کن ماز دو من فارغ ازاں　　مرجع کلک و دواتم تشنہ ناپایا ہو
بہ در دوست ہمی بیہدہ نالم کہ مباد　　رنجد از صبر ثباتم تشنہ ناپایا ہو
پرورش خر بحورستی بیست ہما نادارق　　بر جگر دادہ براتم تشنہ ناپایا ہو
مجرم عالم ارواح بپاداش عمل　　حسنۂ قید حیاتم تشنہ ناپایا ہو
تکیہ بر مغفرت اوست نہ بر طاعت خویش　　تارک صوم وصلواتم تشنہ ناپایا ہو

غالبم تشنۂ لطف آب نہ ہم حرف حافظ
قائل ستار سباتم تشنہ ناپایا ہو

اے موجِ گل نویدِ تماشاے کیستی
انگارہ مثال سراپاے کیستی

بیہودہ نیست سعیِ صبا در دیارِ ما
اے بوے گل پیامِ تمناے کیستی

خوں گشتم از تو باغ و بہارِ کہ بودہٗ
کشتی مرا بہ غمزہ مسیحاے کیستی

یادش بخیر تا چہ قدر سر بودہٗ
اے طرفِ جوئبار چمن جاے کیستی

از خاکِ عشرتی کہ جنونے دمیدہٗ
اے داغِ لالہ نقشِ سویداے کیستی

نشنیدہ لذتے تو فرو میرود بدل
اے حرفِ محوِ لعلِ شکر خاے کیستی

با نوبہار ایں ہمہ سامانِ ناز نیست
فہرستِ کار خانہ یغماے کیستی

در شوخیِ تو چاشنیِ برق تاب نیست
بے پردہ صیدِ دامِ تپشہاے کیستی

از ہیچ نقشِ غیر نکوئی ندیدہٗ
اے دیدہ محوِ چہرۂ زیباے کیستی

با ہیچ کافر ایں ہمہ سختی نمی رود
اے شب بمرگِ من کہ تو فرداے کیستی

غالب لواے کلکِ تو دل می برد ز دست
تا پردہ سنجِ شیوۂ انشاے کیستی

دیدہ ور آنکہ تا نہد دل بہ شمارِ دلبری
در دلِ سنگ بنگرد رقصِ بتانِ آزری

بیشِ نتیجۂ ورع از مے و نغمہ یافتیم
زہرۂ ما بریں افق دادہ فروغِ مشتری

تا بود از لطف و قہر ہیچ بہانہ در میاں
شکرِ کرمت پارسا شکوہ شمرد سرسری

اے کہ بہیچ ذرہ را جز رہِ تو روے نیست
در طلبت تواں گرفت بادیہ را بہ رہبری

بسکہ بہ دینِ عاشقی غیرتِ غیر جاں گداشت
با تو خوشم کہ جز تو نیست روے بہر کہ آوری

رشکِ ملک چہ و چرا چوں بتو رہ نمی برد
بیہدہ در ہواے تو می پرد از سبک سری

حیف کہ من بخوی تیم در تو سخن رود کہ تو
اشک ندیدہ بشمری نالہ نشیدہ بشکری

گو تو اگر بہ من رسد خاکِ حرم ز پے ہمی
طہ بلے اگر ز من تو دبیر گشتہ رسے بری

دردِ ترا بوقتِ جنگ قاعدۂ تہمتنی
تکیہ مرا بزیرِ رنگ آئینہ سکندری

ریختہ ام از گدازِ دل در جگر آتشے چو سیل
غالب اگر دمِ سخن رہ بہ ضمیرِ من بری

از حسن مہان نقاب تاکے — این گنج درین خراب تاکے
این گوہر بی فروغ یارب — آلودہ خاک و آب تاکے
این راہرو مسالک قدس — وامانده خورد و خواب تاکے
جیتائی برق جز دمی نیست — ما و این ہمہ اضطراب تاکے
جان در طلب نجات تا چند — دل در تعب عذاب تاکے
پرسش ز تو بے حساب باید — غمہای مرا حساب تاکے

قطعہ

اے کہ در بزم شہنشاہ سخن رس گفتۂ — کے بہ تیرگوئی ملاں در شعر ہمسنگ منست
راست گفتی لیک میدانی کہ بود جائے طعن — کز ادائے ناکس دل گر لعبۂ چنگ منست
فارسی بین تا ببینی نقشہائے رنگ رنگ — بگذر از مجموعۂ اردو کہ بیرنگ منست
کے درخشد جوہر آئینہ تا باقیست زنگ — صیقل آئینہ ام این جوہر آن زنگ منست
حال من ویران ساز شکوہ بر مہر و وفاست — تا بہ بیداری بیرخاشش نوآہنگ منست
دوست بودی شکوہ سر کردم ولے جرم تو نیست — کاین ہمہ بیداد بر من از دل تنگ منست
بخت من ناساز و خوے دوستداران ناسازتر — تا چہ پیش آید کنون با بخت خود جنگ منست
دشمنی را ہمچنین شرطست و آن دانی کہ چیست — از تو نبود نغمہ در سازے کہ در چنگ منست
در سخن چون ہمرہان و ہمنوائے من نہ — چون دلت را ہیچ و تاب از رشک آہنگ منست
راست میگویم من و از راست سر نتوان کشید — ہرچہ در گفتار فخر تست آن ننگ منست

قطعہ

ساقی بزم آگہی روزے — داد نے ریخت در پیالۂ من
چون دماغم رسید زان صہبا — شدم از ترکتاز وہم ایمن
ہمدمان سرخوشی حریفانہ — بے محابا گرفتمش دامن
گفتم اے محرم سرائے سرور — از ادب دور نیست پرسیدن
اول از دعوی وجود بگو — گفت کفرست در طریقت من
گفتم آخر نمود اشیا چیست — گفت ہی ہی مگو ولے گفتن
گفتمش با مخالفان چہ کنم — گفت طرح سلاح صلح فگن

گفتم این سبب جاہ و منصب چیست؟ — گفتم دام فریب اہرمن
گفتمش چیست منشاء سفرم؟ — گفت جور و جفائے اہل وطن
گفتم اکنون بگو کہ دہلی چیست؟ — گفت جانست و این جہانش تن
گفتمش چیست این بنارس؟ گفت — شاہدے مست محو گل چیدن
گفتمش چون بود عظیم آباد؟ — گفت رنگین تر از فضائے چمن
گفتمش سلسبیل خوش باشد؟ — گفت خوشتر بباشد از سوہن
حال کلکتہ باز جستم گفت — باید اقلیم ہشتمیں گفتن
گفتم آدم بہم رسد در وے؟ — گفت از ہر دیار و از ہر فن
گفتم این جا چہ کار باید کرد؟ — گفت قطع نظر ز شعر و سخن
گفتم این ماہ پیکران چہ کس اند؟ — گفت خوبان کشور لندن
گفتم ایشان مگر دلے دارند؟ — گفت دارند لیکن از آہن

مثنوی چراغِ دیر

نفس با صور دمساز است امروز — خموشی محشر راز است امروز
رگ سنگم شرارے می نویسم — کف خاکم غبارے می نویسم
سخن را نازش مینو قماشی — ز گلہا تنگ شائستہائے کاشی
تعالی اللہ بنارس چشم بد دور — بہشت خرم و فردوس معمور
بنارس را کسے گفتا کہ چین است — ہنوز از گنگ چینش بر جبین است
تناسخ مشربان چون لب کشایند — بہ کیش خویش کاشی را ستایند
کہ ہر کس کاندران گلشن بمیرد — دگر پیوند جسمانی نگیرد
چمن سرمایۂ امید گردد — بمردن زندۂ جاوید گردد
زہے آسودگی بخش روانہا — کہ داغ جسم می شوید ز جانہا
شگفتے نیست از آب و ہوایش — کہ تنہا جان شود اندر فضایش
بیا اے غافل از کیفیت ناز — نگاہے بر پری زاد الستش انداز
ہمہ جانہائے بے تن کن تماشا — ندارد آب و خاک این جلوہ حاشا
نہاد شان چو بوئے گل گران نیست — ہمہ جانند جسمے درمیان نیست

خس و خارش گلستان ست گویی　　غبارش جوہر جان ست گویی

درین دیرینہ دیرستانِ نیرنگ　　بہارش ایمن ست از گردش رنگ

بود در عرض بال افشانی ناز　　خزانش صندل پیشانی ناز

بتسلیم ہوائے آن چمن زار　　ز موج گل بہاران بستہ زنار

سوادش پای تخت بت پرستان　　سراپایش زیارتگاہ مستان

عبادت خانۂ ناقوسیان ست　　ہمانا کعبۂ ہندوستان ست

بتانش را ہیولے شعلۂ طور　　سراپا نورِ ایزد چشم بد دور

میانہا نازک و دلہا توانا　　ز نادانی بکار خویش دانا

تبسم بسکہ در لبہا طبیعی ست　　دہن ہا رشکِ گل ہائے ربیعی ست

ادائے یک گلستان جلوہ سرشار　　خرامے صد قیامت فتنہ دربار

بہ لطف از موج گوہر نرم روتر　　بناز از خونِ عاشق گرم روتر

ز رنگین جلوہا غارت گرِ ہوش　　بہارِ بستر و نوروزِ آغوش

ز تابِ جلوۂ خویش آتش افروز　　بتانِ بت پرست و برہمن سوز

بسامانِ دو عالم گلستان رنگ　　ز تابِ رخ چراغانِ لبِ گنگ

رسانیدہ ادا از شست و شوئے　　بہر موجے نویدِ آبروئے

قیامت قامتان مژگان درازان　　ز مژگان بر صفِ دل نیزہ بازان

بہ تن سرمایۂ افزایشِ دل　　سراپا مژدۂ آسایشِ دل

بہ مستی موج را فرمودہ آرام　　ز لغزش آب را بخشیدہ اندام

فتادہ شورشے در قالب آب　　ز ماہی صد دلش در سینہ بیتاب

ز بس عرضِ تمنا می کند گنگ　　ز موج آغوشہا وا می کند گنگ

ز تابِ جلوہ ہا بیتاب گشتہ　　گہرہا در صدف ہا آب گشتہ

مگر گوئی بنارس شاہدے ہست　　ز گنگش صبح و شام آئینہ در دست

نیاز عکس روی آن پری چہر　　فلک در زر گرفت آئینہ از مہر

بنام ایزد زہے حسن و جمالش　　کہ در آئینہ می رقصد مثالش

بهارستان حسن لایزالی ست / به کشور را سمرور مثالی ست
به گنگش عکس تا پرتو فگن شد / بهارش خود لطیف خویشتن شد
چو در آئینه آبش نمودند / گره چشم رحم او روی ربودند
بیابان در بیابان لاله زارش / گلستان در گلستان نوبهارش
شبی رسیدم از روش بیابان / رگ دستها گردون راز دلی
که مینی نیکوئیها از جهان رفت / وفا و مهر و آزرم از میان رفت
رایمانها بجز نامی نمانده / تعبیر از دانه و دامی نمانده
پدر را تشنه خون پسر را / پسر را دشمن جان پدر را
برادر با برادر در ستیز است / رفاق از تس جهت رود در گریز است
بدین بی پردگی های علامت / چرا سدا می گردد قیامت
سمع صور تعویق از پی چیست / قیامت را عنان گیر چون کیست
سوی کاشی باندار اشارت / نبستم کرد گفتا این عمارت
که عقاب صانع را گوارا / که از هم ریزد این رنگین بهارا
بلند افتاده تمکین بهارش / پرد بر اوج او اندیشه بارش
الا ای عالمی ستار او ستاده / ز چشم یار داغ سار او ستاده
زحولیش و آشنا بیگانه گشته / جنون گل کرده و دیوانه گشته
چه محشر سرزد از آب و گل تو / در بعد از بود آه از دل تو
چه جوئی جلوه زین رنگین جمیها / بهشت خویش شوار خون شدیها
جو هست گر به نعمت خود تمام است / به کاشی تا انکاشان نیم گام است
چون بوی گل ز پیراهن برون آئی / به آزادی رسد تن برون آئی
مده از کف طریق معرفت را / سرت گردم نگهدار این جهت را
فرو ماندن بکاشی نارسائی است / خدا را این چه کافر ماجرائی است
اریں دعوی تا تشنی تهی لب را / نوال غمنامه دودی طلب را
بکاشی لحظه از کاشانه یاد آر / در این حسرت اران ویرانه یاد آر
دریغا در وطن وامانده چند / بحول دیده رونق را بدہ چند

هوس را پای در دامن شکسته   امید تو چشم از خویش بستہ
بشہر از بیکسی صحرا نشینان   ز غم آتش بدل جاگزینان
مگر کان تو مر را بہر آفریده   رسیماب در آتش آرمیده
همہ در خاک و خون افگندهٔ تو   بحکم بیکسی ہا بندهٔ تو
چو شمع از داغ دل آذرفشانان   ز مرہم عرض دعویٰ بے زبانان
سر و سرمایہ غارت کردهٔ تو   ز تو نالان ولے در پردهٔ تو
از آنا مت تغافل خوشنما نیست   بداغ ستمان ہوای گل روا نیست
گدائے بے جگر کاریست درپیش   بسامانی و لبہارے ست درویش
چو سیلابت شتابان میتوان رفت   بیابان در بیابان میتوان رفت
ترا امروز محسود بود باید   خرابے کو دو افزوں بود باید
تن آسانی ست راحت تا که ده   چو مینی رنج خود را نو نما ده
هوس را سر بیالینِ منا ده   نفس را از دل آتش زیر پا نه
دل از تابِ بلا گداز و خوں کن   روانش کار بکشاید خسوں کن
نفس تا خود فرو ستیند از پای   دمے از جاده پیمائی میاسائے
شرار آسا بتن آماده برخیز   بیفشاں دامن و آزاده برخیز
ز الا دم زن و تسلیم لا شو   بگو الله و برقِ ماسوا شو

خمسہ

"بر غزل مولانا قدسی قدس الله سرہ"

گیستم تا بخروش آورم از بے ادبی   قدسیان پیشِ تو در موقفِ حاجت طلبی
رفتہ از خویش بدیں زمزمۂ زیرِ لبی   مرحبا سید مکیؔ مدنی العربی
دل و جان باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

اے کہ روے تو دہد روشنی ایمانم   کافرم کافر اگر مہرِ منیرش خوانم
صورت خویش کشیدست مصور دانم   منِ بیدل بجمالِ تو عجب حیرانم
الله الله چہ جمال است بدیں بوالعجبی

اے گلِ تازہ کہ ریبِ چمنی آدم را   باعثِ رابطۂ جان و تنی آدم را

گوهر دریوزهٔ نسبت ز تو عیسی آدم را　　نسبتی نیست بذاتِ تو بنی آدم را
برتر از عالم و آدم تو چه عالی نسبی

ای لبت داده بسوی خلق ز خالق پیغام　　روح را لطفِ کلام تو کند شیرین کام
ابر فیضی که بود از اثرِ رحمتِ عام　　نخلِ بستانِ مدینه ز تو سرسبز مدام
زان شده شهرهٔ آفاق بشیرین رطبی

خواست چون ایزدِ دانا که بساطی از نور　　گسترد در همه آفاق چه نزدیک چه دور
حکمِ اصدارِ تو در ارض و سما یافت صدور　　ذاتِ پاکِ تو درین مُلکِ عرب کرد ظهور
زان سبب آمده قرآن بزبانِ عربی

وصفِ رخسارِ تو اگر در دلِ ادراک گذشت　　بهمین است که از دایرهٔ خاک گذشت
هم چنان شعله که گرم از خس و خاشاک گذشت　　شبِ معراج، عروجِ تو ز افلاک گذشت
بمقامی که رسیدی نرسد هیچ نبی

چه کنم چاره که بیوندِ نخستین گسلم　　من که جز چشمهٔ حیوان نبود آب و گلم
من که چون مهرِ درخشان بدمد نورِ دلم　　نسبتِ خود بسگت کردم و بس منفعلم
زانکه نسبت بسگِ کوی تو شد بی ادبی

دل ز غم مرده و غم برده ز ما صبر و ثبات　　غمگساری کن و بنمائی بما راهِ نجات
دادِ سوزِ جگرِ ما چه دهد سیل فرات　　ما همه تشنه لبانیم و توئی آبِ حیات
رحم فرما که ز حد می گذرد تشنه لبی

غالبِ غمزده را نیست درین غمزدگی　　جز به امیدِ ولای تو تمنای بهی
از تب و تابِ دلِ سوخته غافل نشوی　　سَیّدی اَنتَ حَبیبی و طبیبِ قَلبی
آمده سوی تو قدسی پئے درمان طلبی

رباعیات

غالب آزادهٔ موحد کیشم　　بر پاکیِ خویشتن گواه خویشم
گفتی بسخن بر رفتگان کس نرسد　　از باز پسین نکته گزاران پیشم

غالب بگهر ز دودهٔ زادشمم　　زان رو بصفای دمِ تیغست دمم
چون رفت سپهبدی ز دم چنگ بشعر　　شد تیرِ شکستهٔ نیاگان قلمم

غالب کی کہانی

بقیہ صفحہ ۲۶

لیکن یہ سب بزرگ غالب کی شخصیت کے مداح ہوتے ہوئے بھی اُن کے طرزِ سخن کے مداح نہ تھے۔ خود غالب کے ہمعصر الٰہی بخش معروف اور اُن کے اسرا ذوق کی محاورہ گوئی اور سلاستِ زبان کے قائل تھے۔ دلی کا لال قلعہ جو اقتدار کی آگ ڈھ دراصل تو کل جانے کے بعد بس شعر گوئی اور کھوکھلی نمود و نمائش اور تفریحوں کا ٹھکانا رہ گیا تھا ذوق کے سادہ زبان و بیان کو پسند کرتا تھا۔ سچ بات یہ ہے کہ جس زبان کو ہم اُردو ہندی کا بنیادی سرمایہ سمجھتے ہیں اور جو قوم کی زندہ زبان ہے وہ اس وقت غالب کے علاوہ شاہ نصیر اور ذوق ہی کے سینے میں آ گئی تھی غالب نہیں، ذوق اُس کی سند اور سند مانے گئے۔ مصطفےٰ خان شیفتہ، حکیم مومن خان کی نازک بیانی کے دلدادہ تھے۔ ادب کے عام شیدائیوں پر میر کا جادو چلا ہوا تھا اور فن و ادب کی وادی میں جتنے دھارے بہہ رہے تھے، اُن میں لبھاؤ، زبان کی چاشنی کے ساتھ لفظوں اور محاوروں کے کنارے لگے چلے جا رہے تھے اور لوگ زبان کے ساتھ درد و سوز کی بھی رسیلی لہر رکھتے تھے۔۔ لیکن رُخ سب کا سادگیِ بیان کی طرف تھا۔

گویا غالب کو صرف ذاتی وجاہت سنبھالنے ہی میں مشکلات کا سامنا نہیں ہوا بلکہ سخن گوئی کے میدان میں بھی اپنے طرز اور رجحان کی بے اثری نظر آئی۔

وقت کے جوش کو سامنے رکھ کے دیکھیے البتہ صاحب نظروں کا منہ ساز اور ناماننے شخصیتوں کا شور بے دنیا غالب کی شاعری کے حق میں امرت ثابت ہوا کیونکہ وہ طرزِ بیان میں اعتدال کی جانب آئے۔ ایسے کمزور اور جاندار اشعار میں تمیز کرنا سیکھا، زمانے کے مذاق کو جانا، اور ساتھ ساتھ یہ بھی کہ کہاں تک ہمیں زمانے کے ساتھ جانا ہے اور کہاں اُسے اپنے ساتھ لے جانا ہے۔ ادب شناسوں کی گرم بحثیں، ذی علم لوگوں کی مجلس اور ادب شناسوں کی کڑی نظر یا غالب کی شاعری اور پرکھ کے لئے پہلا مکتب ثابت ہوئیں [illegible] کہ کو وہ استادِ کامل میسر آ گیا جس کی شرط میر نے لگائی تھی۔ بعد میں جب کبھی وہ دست بُردِ زمانہ سے تنگ آئے ہیں اور صرف شاعری کے وسیلے سے کام چلتا نظر نہیں آتا تو ہاتھ ملنے لگتے ہیں ؎

اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس اہلِ دہر کا — سمجھا ہوں دلپذیر متاعِ ہنر کو میں

سو جو مزید نوا یا بہ شکیبا چو علیل

دیوانِ فارسی کے دیباچے میں اپنے کمالِ سخن کی داد دیتے ہوئے آخر میں یہ بھی لکھا ہے:

[illegible] ہمہ ازاں شاہد بازی ست یعنی ہوا پرستی و ہمہ دیگر توانگر ستائیست یعنی باد خوانی ۔ شادم از آزادگی کہ لبِ سخن بہ بہارِ عشق بازاں گرم ساز کردم و دوزخم از آزمندی کہ ورقے چند کردار دنیا طلبان در مدح اہلِ جہاں سیاہ کردم۔

زندگی بھر کی ذہنی کاوش پر یہ ریمارک کرنا کہ میرے سینے پر داغ ہے، میرا آدھا کلام امیروں کی مدح یعنی خرافات سے بھرا ہوا ہے، چاہے ہیں روح کا مبالغہ ضرور کہا جائے گا۔ کیونکہ فارسی کے گیارہ ہزار تین سو اور اُردو کے ۲ ہزار کچھ، اشعار میں ملا کر مشکل ڈیڑھ ہزار شعر مدح کے نکلتے ہیں جو دسویں حصے سے زیادہ نہیں۔ تاہم اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی شاعری کے اس حصے سے نامطمئن تھے اور دولت و ثروت یا امیرانہ حیثیت میسر نہ ہونے کی تلافی وہ سخن کے جواہرات سے کرنا چاہتے تھے۔ تمام عمر وہ خود کو درباری شاعر کرانے اور صاحبِ مرتبہ امیروں میں شامل رکھنے کے لئے سارے جتن کرتے رہے لیکن انہیں ہمیشہ اس کا احساس رہا کہ یہ کمی قصیدوں کے صلے، والیانِ ریاست کی سرپرستی اور گورنروں یا ملکہ وکٹوریہ کے نام قصیدوں سے پوری ہونے والی نہیں۔ مگر فکر ادب نے کا [illegible] نامے ہی اس کی تلافی کر سکتے ہیں

دانش و گنجینہ پنداری یکے ست — حق نہاں داد آنچہ پیدا خواستم



انہوں نے اپنے نام کی ایک مہر بھی بنوائی تھی، جس پر حضرت علیؓ کا یہ شعر کندہ تھا ؎

رضینا قسمۃ الجبار فینا　　لنا علم وللجہال مال

ایک خط میں لکھتے ہیں کہ میں پیدا ہوا تو صرف نقصان کا سودا رہ گیا تھا اور خرمن جل چکا تھا۔ بزرگوں کی طرح نہ بڑے صاحب تاج و تخت باقی رہے تھے نہ علم و ہنر کی میراث ملی تھی سوچا دنیا چھوڑ چھاڑ کر نکل جاؤں، لیکن ذوقِ سخن فطرت میں موجود تھا، اُس نے اپنی طرف کھینچ لیا اور یہ سمجھایا کہ

"آئینہ زدودن و صورت معنی بخود دل تیر کا رنمایاں ست نہ لشکری و دانش وری خود نیست، صوفی گری نگذارد و لسمن گستری روئے آر۔ ناگزیر بہم چیاں کردم و سفینہ در بحر شعر کہ سراب ست رواں کردم۔ قلم علم شد و تیر ناوک شکستہ آیا قلم۔"

اور پھر اس پر تحریر کرتے ہیں:

ما نبودیم بدیں مرتبہ راضی غالب　　شعر خود خواہش آں کرد کہ گردد فن ما

نوجوانی کا پر شور زمانہ اُن کی زندگی اور شاعری کی پہلی تجربہ گاہ تھا، جہاں مادی راحتیں بھی میسر تھیں اور شاعری میں دشوار سے دشوار طرزوں کی پیروی اور خود باریکیاں چھانٹنے کی چھوٹ تھی۔ لیکن جوانی میں قدم رکھتے رکھتے جو حالات میں شدت اور ماحول میں بزرگوں کی نظر سے سابقہ پڑا تو اس نے ان کی خود سری کی راہ روکی اور شکستہ دل کرنے کے بجائے مشاہدے اور فکر پر سان رکھی اور بیان کو وسعت بخشی۔

جوانی کے بیس سال

معلوم ہوتا ہے کہ غالب کے شعور نے عمر کے مقابلے میں ایسا سفر تیزی سے طے کیا کیوں کہ عام طور سے لوگ جن مشغلوں میں ایام جوانی بہلاتے ہیں غالب نوجوانی ہی میں اُن سے مل ملا کر اور اپنی شوخ بیانی کے لئے برگ و ساز لے کر گذر گئے۔ ۲۰ برس کی عمر کو پہنچتے پہنچتے انہیں فکرِ معاش نے گھیر لیا۔

اب تک ساڑھے سات سو روپے سالانہ چچا کی وراثت سے پنشن کے مل جاتے تھے۔ نواب احمد بخش خاں جنہوں نے یہ پنشن ادا کرنا اپنے ذمے لے رکھا تھا، اس رقم کے علاوہ بھی کچھ مدد کرتے رہتے تھے۔ ریاست الور سے کچھ نہ کچھ وصول ہو جایا کرتا تھا آگرہ سے ماں بھی سہارا دیتی رہتی تھیں۔ اب ہر طرف رکاوٹ پڑنی شروع ہوئی۔

۱۸۲۶ء میں نواب احمد بخش نے اپنے بڑے بیٹے شمس الدین احمد خاں کو فیروز پور جھرکہ کی ریاست کا والی و وارث بنا دیا اور خود گوشہ نشین ہو گئے۔ نئے وارث سے غالب اور ان کے دوستوں کے تعلقات خوش گوار نہ تھے۔ پنشن کی رقم وصول ہوتے رہنے میں انہیں خطرہ نظر آیا۔ پھر پانچ ہزار سالانہ کی پنشن میں جو دو ہزار سالانہ کے دوسرے شریک تھے، اُن کا انتقال ہو گیا اور غالب کو خیال آیا کہ اُن کا حق جو بچپن میں مارا گیا تھا، اب اس کی دادطلبی کا وقت آ گیا ہے۔ پنشن کے علاوہ باقی سہارے ٹوٹ رہے تھے۔ غالب کسی ریاست کی غیر ادبی ملازمت کرنا نہیں چاہتے تھے، اس لئے بھی پنشن کی رقم بڑھوانا اور اُسے اپنے ایک مخالف کے ہاتھ سے آزاد کرا لینا ضروری تھا۔

غالب کو دہلی میں رہتے پندرہ سال سے اُوپر ہو چکے تھے لیکن اُن کی معاش کا کوئی نیا ذریعہ نہیں نکلا تھا۔ وہ نکلتا بھی کہاں سے، یا قلعہ یا دیسی ریاستیں۔ انگریزوں کے نئے بندوبست کو ہندوستان کے آرٹ، آرٹسٹ اور تہذیبی ورثے سے ابھی تک کوئی دلچسپی نہ ہوئی تھی۔ ابھی تک پورا ملک صحیح معنوں میں زیر نگیں نہ آیا تھا اور کمپنی کے ظاہرا بندوبست کے پیچھے پیچھے ایک مخالف لہر بھی جاری تھی۔ دلی، یوپی کے بے روزگار مسلمان دستکار، بہار کے چھوٹے زمیندار اور بنگال کے مفلس کسان اس میں جسے



بعد میں وہابی تحریک کہا گیا، تن من سے شریک تھے۔ علمی یا مذہبی مرکز دلی میں ہونے کی وجہ سے انگریزوں کو کسی قدر پریشانی ضرور تھی لیکن اس سیاسی و معاشی تحریک میں مذہبی شدت نے اُن کا کام آسان کر دیا اور بالآخر اُس کا رخ پنجاب کی طرف پھیر دیا۔ غالب کے مربی فضل حق شروع سے اس کے مخالف تھے اور صدر الدین آزردہ، مومن اور کئی اہم اصحاب کے حامی تھے۔ غالب کا ذہن جس طرح تقلید کے خلاف تھا، اسی طرح مذہبی احیاء کو بھی گوارا نہ کرتا تھا۔ وہ اس تحریک سے اول تا آخر بیگانہ رہے۔ لیکن یہ ضرور جانتے تھے کہ جس زبان کا اب چلن ہونے والا ہے اور اقتدار جن ہاتھوں میں جا رہا ہے وہ قدیم تعلیم یافتہ اہل زبان اور اہل ادب کی سرپرستی نہیں کرنے والے، بلکہ ہندوستان کی بے قدری اور بے روزگاری بڑھتی جائے گی۔

اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جس زمانے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے گورنر جنرل لارڈ ایلن برا نے سرکاری رپورٹ میں یہ تجویز رکھی ہو کہ تاج محل کا سنگ مرمر اتار کر نیلام کر دیا جائے، وہاں نوجوان شاعر غالب کی شاعرانہ خدمات کی [illegible] ایلن برا کی مدح میں غالب کے اردو و فارسی قصائد موجود ہیں جن سے بہر حال کچھ حاصل نہ ہوا)

قلعہ بار بار لٹنے کے باوجود باقی تھا، لیکن قلعے کی اندر کی روایات بوسیدہ ہو چکی تھیں۔ مغل شہنشاہی کا ایک عظیم الشان جشن یہ بھی تھا کہ بادشاہ خود صاحب سیف و قلم ہوا کرتا تھا۔ شہسواری، تیر اندازی اور شمشیر زنی کے ساتھ ساتھ اس کو خوش خط لکھنے اور نظم میں ایک مقام پیدا کرنے اور ادب پر بصیرت حاصل کرنے کی بھی تعلیم دی جاتی تھی اور یہ شغل اس کے دم کے ساتھ جاری رہتا تھا۔ یہ سنت ہی چلن مغل صوبیداروں نے بھی اپنایا اور امراء دولت اور چھوٹے بڑے والیان ریاست کے ہاں بھی یہی رسم قائم ہوئی۔ چنانچہ دکن کے قطب شاہیوں اور اودھ کے بڑے نام بادشاہوں نے علمی، ادبی اور فنی حیثیت سے بعض اہم کارنامے چھوڑے ہیں۔

غالب کو جب [illegible] دامن گیر ہوئی، اُس زمانے تک یہ دستور باقی تھا اور صرف باقی نہیں بلکہ تلوار کے میان میں چلے جانے کی وجہ سے بادشاہوں اور والیان ریاست کو قلم کی نام وری حاصل کرنے اور لطفی فانوس روشن رکھنے کی اور زیادہ فرصت میسر آ گئی تھی۔

لیکن دلی کے لال قلعے کا ماحول کیا تھا۔ مشاعرے اب بھی ہوتے تھے۔ شہزادے اور امراء ان میں اپنا طرحی کلام سناتے تھے۔ غالب بھی ان میں کبھی کبھی اپنا کلام سنا آتے تھے لیکن وہ اُن کا میدان نہ تھا۔ بادشاہ اکبر شاہ ثانی ۔۔۔ جس کا ابھی تک سکہ [illegible] ہوتا تھا اور جو گورنر جنرل کو اپنے برابر کرسی دینے پر تیار نہ ہوا، خود شاعر نہ تھا، لیکن اس کے بیٹے بھتیجے سب شاعر تھے زبان کی شاعری کے دلدادہ۔ ایسے میں ظاہر ہے کہ منشی مزاج شیخ ابراہیم ذوق ہی کی قدر ہو سکتی تھی۔ چنانچہ اکبر شاہ ثانی کے ولی عہد سراج الدین ابو ظفر نے شاعرانہ معمول کے مطابق ذوق کو اپنا استاد بنا لیا تھا جس کے معنی تھے کہ ابو ظفر کی تخت نشینی کے بعد ذوق ہی درباری شاعری کے سرگروہ قرار پائے۔

دلی کے گلی کوچوں میں جو بولی جاتی تھی وہ بھی انہی شاعروں کو سر چڑھا سکتی تھی جو اس زبان، محاورے، بول چال رسالے کے خیالات کو نظم کا لباس پہنائیں۔ غالب کے مقابلے میں انہیں پسند کرنے والوں کی یہاں بھی گرم بازاری رہی۔

دلی کے نزدیک دوسرا بڑا دربار لکھنؤ کا تھا، جہاں غالب نے ربط پیدا کرنا چاہا اور اُن کو بعد میں چند ہزار کی رقم قسطوں میں ملی بھی ۔۔۔ لیکن حالت وہاں کی دگرگوں تھی اور غالب نے اودھ میں پہنچ کر پانچ مہینے کے قیام ہی سے اس کا اندازہ کر لیا کہ اب لکھنؤ پر بھی تکیہ نہیں کیا جا سکتا۔ لکھنؤ میں بادشاہ تک اس لئے رسائی نہ ہو سکی کہ وزیر اعظم آغا میر حضوری کی نذر میں اشرفی دوگنا دینے کو تیار نہ ہوئے۔ دلی اور لکھنؤ کے علاوہ حیدر آباد، رامپور، الور، بھوپال اور پٹیالہ کے دربار تھے، جہاں اُن کی رسائی ہو سکتی تھی لیکن اوّل تو دلی اور دلی والوں کا مخصوص علمی اور ادبی ماحول شعروں کے مذاق اور طبیعت کو راس آ گیا تھا، اُن سے چھوٹ کر



نہ چھوٹتا۔ دوسرے وہ ایسے مرکز سے اس لئے بھی ہٹنا چاہتے تھے کہ اس میں سبکی کا اندیشہ اور جیسے تیسے سنبھالی ہوئی وجاہت میں فرق آنے کا خطرہ تھا۔

اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ رہا کہ اُسی آبائی پنشن کو بڑھوایا جائے اور پنشن کو اپنے ایک عزیز جاگیردار کے ہاتھوں سے نکال کر انگریزی دفتر میں منتقل کرالیا جائے۔ جب اُمید کی آخری آماجگاہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ارباب اختیار ٹھہرے تو اُن کو خوش رکھنا اور ان کی سرکار دربار میں مقام حاصل کرنا مادّی حاجت روائی کے لئے لازم قرار پایا۔۔۔ مادّی حاجت روائی جس سے غالب کو کبھی نجات نہ ہوئی اور جس کا رونا وہ عمر بھر روتے رہے۔

آخر غالب ۱۸۲۶ء میں گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ کلکتہ انگریزوں کا سرکاری مرکز تھا اور ایک نئے تمدن، نئے رہن سہن اور نئے ضابطے کا ترجمان۔ راستے میں جا بجا ٹھہرتے ہوئے گھوڑے گاڑی پر مسافت طے کرتے ہوئے وہ کوئی ۱۹ مہینے بعد ۱۹ فروری ۱۸۲۸ء کو کلکتے پہنچے۔ غالب کو جس طرح خطوں میں سب طرف کے حالات کی ٹوہ رہتی تھی اُس سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ نہ صرف مقدمہ لڑ کر اور سفارش کرا کے پنشن کا معاملہ طے کرانے کلکتے گئے ہوں گے، بلکہ رنگ و بو کے اس نئے چمن کو دیکھنے کی آرزو بھی ضرور ہوگی۔

اس وقت کا کلکتہ اگرچہ ہندوستان کا صنعتی مرکز نہ تھا لیکن تجارتی اور انتظامی اعتبار سے مغربی طرز کا نمائندہ ہونے کے علاوہ سماجی اور ذہنی زندگی میں بھی نئے تجربوں کی آماجگاہ تھا۔ یہی زمانہ ہے جب دورِ حاضر میں ہندوستان کا سب سے پہلا لیڈر مہاراجہ رام موہن رائے سماجی منظر پر اُبھر چکا تھا۔ برہمو سماج کی تحریک چھڑ چکی تھی۔ فارسی میں جدید طرز کا اخبار نکلنے لگا تھا۔ مذہب اور معاشرت میں آزاد خیالی کی لہر پھیلنی شروع ہو گئی تھی اور جدید انگریزی علم و ادب اور صحافت کا چرچا ہونے سے قوم، قومی غلامی، قومی آزادی کا دُھندلا سا تصور پیدا ہو رہا تھا۔ لیکن اس کے باوجود فارسی زبان و ادب کی ہستی باقی تھی۔ اکثر انگریز عہدہ دار فارسی کی تعلیم حاصل کر کے آتے تھے اور خود بنگالیوں میں بھی فارسی اور انگریزی کو ساتھ ساتھ علمی حیثیت حاصل تھی۔ چنانچہ غالب کے خطوں اور تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کو کسی عہدیدار کے پاس جانے میں ترجمان کی ضرورت نہیں پڑی اور سرکاری اور غیر سرکاری طور پر ان کی جو مدارات ہوئی، اس نے بھی نئے مغربی ضابطے کی جانب اُن کو پر اُمید کیا اور انہوں نے نہ صرف کلکتے کے آموں کی، اس کے خوش گوار موسم کی، اور چہل پہل کی تعریفیں کیں بلکہ نئی تہذیب کی برکتوں کو اپنے دل و دماغ میں بسا لیا۔ وہ یہاں تک تیار تھے کہ بقول خود "اگر نوجوانی میں کلکتے آیا ہوتا اور شادی اور خانہ داری کی ذمہ داریاں سر پر نہ ہوتیں تو یہیں رہ جاتا۔" زندگی کے آنے والے ضابطے کے متعلق اور انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار کے بارے میں اُن کی رائے کچھ اس درجہ تہہ تک متاثر ہوئی تھی کہ وہ، زندگی بھر اس سے منکر نہ ہو سکے۔

کلکتے کے اس سفر سے مرزا کی مُراد تو بر نہ آئی، لیکن بصارت و بصیرت کو آنا ملا جس کا انہیں پہلے سے وہم و گمان بھی نہ رہا ہوگا اور قریب کے مشاہدے نے نئے نظام کے دونوں پہلو اُجاگر کر دیئے۔ وہم اور وسوسے سے پاک ہو کر وہ ساقی سے سوال جواب کرتے ہیں:

حالِ کلکتہ باز جستم و گفت — یادِ اقلیم ہفتمش گفتن
گفتم آدم بہم رسد در وے؟ — گفت از ہر دیار و از ہر فن
گفتم ایں جا چہ شغل سود دہد؟ — گفت از ہر کس ات رسید
گفتم ایں جا چہ کار باید کرد؟ — گفت قطعِ نظر ز شعر و سخن
گفتم ایں ماہ پیکراں چہ کس اند؟ — گفت خوبانِ کشورِ لندن

گفتم ایماں مگر دلے دارد؟ — گفت دارد لیکن از آہن

گفتم از شہر باد آمدہ ام — گفت بگریز و سر بسنگ مزن
گفتم اکنوں مرا چہ رسید اگفت — آتشیں برد عالم افسا ندن

اُمید و بیم کی یہ کیفیت، خوش فہمی اور مایوسی کی یہ دو رنگی جس سے غالب کو کلکتے کے سفر میں سفر کے مختلف مرحلوں میں واسطہ پڑا، گریزاں نہ تھی، غالب کی شخصیت اور اس کے خوابوں کی تعمیر میں فن کارانہ شکست و ریخت میں اس کیفیت کو بڑا دخل ہے اور بعد کی ساری زندگی اس تضاد سے زخمی اور زخموں سے گل رنگ ہے۔

مرزا غالب کو معمولی رنجشوں کے علاوہ دو بڑے ادبی یا علمی معرکے پیش آئے اور دونوں میں انہوں نے دوستوں سے زیادہ دشمن مول لئے اور دونوں کا سبب تھا نگاہ کی بلندی اور روشِ عام سے جدائی یا تقلید سے بیزاری۔ پہلا ادبی معرکہ کلکتے کے اہلِ علم و ادب کے ساتھ پیش آیا۔

کلکتے کے مدرسۂ عالیہ میں ایک مشاعرہ ہر مہینے ہوا کرتا تھا جس میں ہزاروں کی نشست ہوتی تھی اور یہاں فارسی، اردو اور انگریزی کے بڑے بڑے باکمال جمع ہوتے تھے۔ غالب نے بھی یہاں کئی غزلیں پڑھیں۔ مجمع میں کئی لوگوں نے مرزا کے بعض الفاظ و تراکیب کو غلط قرار دیا اور سند میں قتیل کا نام لیا کہ وہ اس طرح کی ترکیبوں کو غلط قرار دیتا ہے۔ مرزا کی عمر اگرچہ ابھی ۳۰ سال تھی، لیکن وہ فارسی گویانِ ہند کے آخری استاد قتیل کو اپنے برابر کا نہیں سمجھتے تھے۔ انہوں نے اس نام پر ناک بھوں چڑھائی، تو اہلِ ریش و دستار میں غصہ پھیل گیا اور چند روز کے اندر اندر کلکتے کے تمام علمی اور ادبی حلقوں میں مرزا بدنام ہو گئے کہ پیش رو شاعروں کو سند نہیں مانتے اور خود کو فارسی کا بڑا اُستاد سمجھتے ہیں۔ غالب کی طرف سے بھی اعتراضوں کے جواب کئی تیز زبانوں نے دیئے، مگر اِدھر اہلِ نظر کی اقلیت تھی اور اُدھر نقار خانے کی اکثریت۔ آخر غالب کو اسی میں خیریت نظر آئی کہ مصالحت کر لیں اور پوری توجہ اپنے اس معاشی مقصد کی جانب رکھیں، جس کی خاطر وہ وطن سے چلے تھے۔ چنانچہ انہوں نے ایک طویل مثنوی بادِ مخالف لکھی۔ اِس مثنوی میں اُنہوں نے معترضوں سے رحم کی التجا کی ہے اور کہا ہے کہ میں ادبی مباحثے سے نہیں ڈرتا، بلکہ اپنا وقت عزیز اور اپنے وطن دہلی کا نام برباد کرنے سے گھبراتا ہوں۔ اس لئے درخواست ہے کہ آپ میری گستاخی معاف کریں اور آپ جو قتیل جیسے شاعر کو فارسی کا استاد سمجھتے ہیں، چلئے وہی سہی ـــــ وہ سعدی کے برابر کا نہ سہی بہرحال مجھ جیسوں سے بہتر ہے۔ ویسے تو میں جن شعرا کو اپنا پیش رو سمجھتا ہوں، وہ ایران کے اہلِ ادب ہیں اور اسی لئے میری نظر میں قتیل وغیرہ نہیں پہنچتے ـــــ لیکن آپ کی خوشنودی کی خاطر میں مانے لیتا ہوں کہ وہی بے پناہ شاعر ہے۔ اس کا ادب بے مثل لغات کا انتخاب ہے اور زبان میں اس نے عجیب عجیب نکتے ایجاد کر دیئے ہیں ـــــ وغیرہ۔

مثنوی سے دلوں کی صفائی تو کیا ہونی تھی، البتہ اس کی دلی دلی چوٹیں اور تعریف کے پردے میں تضحیک غالب کی شعر گوئی کا ایک یادگار جز ہو کر رہ گئی۔

غالب کلکتے سے لوٹے تو بہت اُداس اور مقروض تھے۔ معمولی دل و دماغ کا آدمی اس اداسی میں دل تنگ ہو کر الگ بیٹھ رہتا، اس کی خواہش غالب پر بھی حاوی معلوم ہوتی ہے کیونکہ آئندہ کوئی بیس برس تک اُنہوں نے اُردو سے کنارہ کیا اور نظم و نثر میں فارسی کو جس کے مخاطب بہت کم تھے، اپنائے رکھا۔ خطوط بھی فارسی میں ہیں، اشعار بھی۔ اُردو میں صرف کبھی کبھار ـــــ وہ بھی بے دلی میں سوچے ہوئے مضامین لکھ کر اترن۔ لیکن معاملے کا دوسرا پہلو اہم ہے۔ غالب نے صاف دیکھ لیا کہ مغل شاہی کی جگہ ایک نئے قسم کی شاہی لینے والی ہے جس پر خاندانی امارت کا نہیں قاعدے قانون کا علم ہے۔ قصیدوں کا نہیں، قانونوں اور ضابطوں کا زمانہ آ رہا ہے۔ اس کے آئین بھی اور ہیں اور کارگزاری جانچنے کے طریقے بھی۔ آنے والے زمانے پر عقلیت کا اثر

دیکھا۔ اخباروں کی رسائی کا اندازہ کیا اور یہ کہ ایسے دور
حقیقتوں سے قریب اور لفظی پیچیدگی کے بجائے



میں جو طرز بیان پنپے گا وہ بیان آفرینی کے بجائے کھردری
سادگی کی طرف مائل ہوگا۔

واپسی کے کوئی ۸ برس بعد غالب نے اپنے تمام اردو کلام کا انتخاب کیا جو کسی قدر اصلاح کے ساتھ ۱۸۴۱ء میں چھپا۔ پھر فارسی کلام کے انتخاب اور اشاعت کا سامان کیا۔ خود اپنے فکر و فن کے نتیجے سے جو بے رحمانہ تنقیدی رتاؤ شاعر نے کیا ہے اور جس طرح ۲۵ برس کی عمر تک کے کلام سے صرف نمونے کے واسطے چند اشعار رکھ کر باقی کاٹ چھانٹ دیا ہے وہ ان کی بڑھتی ہوئی فن کارانہ بصیرت پر سب سے بڑا گواہ ہے۔ غالب کے ہاں تخلیقی عمل ہی تنقیدی عمل کس طرح بنتا گیا اور شاعر اپنے ذہن کی پرورش اور تربیت میں کیونکر بیدلی کے گنبد سے باہر نکلتا رہا، مادی مشکلات کے خاص انہی پندرہ سال میں نمایاں نظر آتا ہے۔

دیوان کی پہلی اشاعت سرسید کے بھائی کے پریس سے ہوئی تھی۔ اشاعت کے فوراً بعد (۱۸۴۷ء میں) انہی سرسید کے ساتھ (جنہیں وہ اپنا سعادت مند عزیز کہتے تھے) ایک ایسا واقعہ پیش آیا، جو غالب کے سوانح میں بہت فکر انگیز ہے۔ سید احمد خاں انیسویں صدی کے ہندوستان کے سماجی، ادبی اور علمی رہنما قرار پائے، ابتدا سے ایسے نہ تھے۔ شروع میں تو وہ بدعت، تیعیت یہاں تک کہ نظریۂ حرکت زمین کے مخالف اور مذہبی احیاء کے بدستور تھے۔ بڑی دیدہ ریزی سے آئین اکبری کی تصحیح کر کے، اسے شائع کرنے میں سرسید احمد کی تب تک کی مصروفیتوں کو دیکھا جا سکتا ہے۔ دہلی قدیم کے آثار اور شخصیتوں کی ایک یادگار، جس کے چوتھے باب میں غالب کا ذکر نہایت شاندار لفظوں میں کیا گیا ہے، آثار الصنادید کے نام سے تیار ہو چکی تھی اور مرزا سے داد بھی پا چکی تھی۔ خود مرزا اس نوجوان کے قدرداں تھے۔ لیکن جب سید نے چاہا کہ وہ آئین اکبری کی اشاعت کو سراہتے ہوئے تقریظ لکھ دیں تو غالب نے سرسید کے خلاف منشا تقریظ لکھی اور جتایا کہ تین سو برس پرانے آئین سے اب اگلی زندگی کا کام نہیں چلنے والا۔ قدامت پرستی جانے دو اور نئے آئین کو لبیک کہو۔ پچھلے آئین اس کے سامنے پرانی جنتری کی طرح بے مصرف ہو چکے ہیں۔ جو چیز اچھی ہے اس سے بہتر چیز بھی ہوتی رہی ہے۔ سر ہے تو تاج بھی ہوگا۔ قدرت کی عطا محسوس نہیں کر خود دیا تھا، دے چکی۔ کھجور کے اس درخت سے آج بھی تازہ تازہ کھجور ٹپکتے ہیں۔ مردہ پرستی کوئی اچھی بات نہیں خود سوچو کہ جو لکھا جا چکا، وہ بھی تو کھاد ہی تھی (اب اس سے بہتر کا دور آ رہا ہے)

پیش ایں آئیں کہ دارد روزگار | گشتہ آئین دگر تقویم پار
ہر خوشے را خوشتر سے ہم بودہ است | گر سرے ہست افسرے ہم بودہ است
مینا یاس را شمر بخیل | لوزمی ریزد رطب ہا را نخیل

مردہ پروردن مبارک کار نیست
خود بگو کاں نیز جز گفتار نیست

نظر میں تعاقب جذبہ نہیں، بلکہ ایک سوچا سمجھا رویہ پایا جاتا ہے اور یہ رائے کہ غالب اس وقت سے [illegible] رہے تھے، جب وہ [illegible] ایک [illegible] تھا جس میں انہوں نے آنکھیں کھولیں اور جس سے انہوں نے زندگی بھر اپنا واسطہ نبھانا چاہا۔ غالب [illegible] ہندوستان [illegible] [illegible] کو [illegible] ہ اندازہ کر رہے تھے۔ جب نئے آئین اور نئے انتظام کی جلو میں خوں ریزی اور اس بڑھتا جاتا تھا۔ خود غالب کو اپنی ذاتی زندگی میں اندھیرا نظر آ رہا تھا اور ان کے ہم عصر اس کے ماتمی تھے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ [illegible] ہندوستان، ایسٹ انڈیا کمپنی کے بجائے رفتہ رفتہ ایک [illegible] ملک بن چکا تھا، [illegible] غالب میں زندگی کی [illegible] کے بارے میں ایک ایکٹو نظر

پیدا ہو چلی تھی اور یہی انجلو نظر غالب کی فکر کا سب سے قیمتی ورثہ ہے جو بعد کی نسل کو ملا اور اس کی پوری قدر دانی ہوئی۔



خوابِ بے تعبیر

کلکتے سے واپسی کے بعد غالب کی بہت سی خوش فہمیاں جو انہیں اربابِ اقتدار سے رہی ہوں گی، کافور ہو چکی تھیں کہ اُن پر پے در پے کئی مصیبتیں ٹوٹ پڑیں۔ ان میں پہلی مصیبت قرض خواہوں کے ہجوم کی تھی، جس نے اُن کا گھر سے نکلنا بند کر دیا۔ دوسری مصیبت شہر میں ان کے خلاف بدگمانی اور عوام کے غصّے کی تھی جس سے ان کے غرورِ نفس کو صدمہ پہنچا اور تیسری مصیبت جیل کی جس نے طبقۂ امرا میں باعزت حیثیت کا طلسم توڑ دیا۔

عادات اور حالات کا توازن نہ ہونے سے اس زمانے کے عام شرفا کی طرح غالب کے مصارف بھی اُن کی آمدنی سے زیادہ رہتے تھے۔ جن کے پاس زمینیں اور جائدادیں تھیں، وہ ان پر ساہوکاروں سے قرض لے سکتے تھے لیکن غالب کے پاس خاندانی عزت اور اس آسرے کے سوا اور کیا تھا، جس پر قرض ملتا کہ عنقریب پنشن کا مقدمہ گورنر جنرل کے دفتر سے طے ہو جائے گا اور بہت بڑی رقم مل جائے گی، اسی امید پر کلکتے کے سفر اور قیام کے لئے بھی انہوں نے قرض لیا اور قرض کی رقم بڑھتی چلی گئی رقم تو نہ ملی لیکن قرض کی شرح چلتی رہی اور نتیجہ یہ ہوا کہ قرض خواہوں نے مایوس ہو کر عدالت سے رجوع کیا اور ڈگری حاصل کر لی۔ اسی [illegible] واقعے کی طرف اشارہ ہے:

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

غالب کے ذمے قرضہ بہت بڑا تھا، چالیس اور پچاس ہزار کے درمیان۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ بعض قرض خواہ خاموش ہو کر بیٹھ رہے اور صرف ایک مقدمے میں پانچ ہزار روپے کی ڈگری ہوئی۔ یہ فروری ۱۸۳۵ء کا واقعہ ہے۔ خود غالب کا بیان ہے کہ اس زمانے میں یہ دستور تھا کہ اگر مقروض کوئی صاحبِ حیثیت اور باوجاہت شخص ہوتا تو ڈگری کا روپیہ ادا نہ کر سکنے پر اُسے صرف اسی صورت میں گرفتار کیا جا سکتا تھا جب وہ اپنے مکان کی چار دیواری سے باہر ہو۔ پولس ایسے لوگوں کو گھر سے گرفتار نہیں کرتی تھی۔ غالب رقم ادا نہ کر سکے تو گھر میں نظر بند ہو کر بیٹھ رہے۔ رات گئے کبھی چھپ چھپا کر باہر نکلتے تھے ورنہ گھر ہی پر رہتے تھے

ایک تو غالب جیسے کثیر الاحباب اور بارسوخ آدمی کا یوں گھر پر بند ہو کر بیٹھ رہنا عذابِ جان، دوسرے ایک واقعہ اور ہو گیا۔ ان دنوں میں گورنر جنرل کی طرف سے انگریزی انتظام اور حکمتِ عملی کا جو نمائندہ یا پولیٹیکل ایجنٹ دلی میں رہتا تھا ـــ ولیم فریزر، اُسے کسی نے سڑک پر گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ ولیم فریزر سے نواب شمس الدین احمد خاں کی ذاتی عداوت تھی چنانچہ شبہہ ہوا کہ نواب شمس الدین احمد خاں نے یہ قتل کرایا ہے۔ اس قتل سے شہر میں بڑی سنسنی پھیلی۔ دلی کے عام لوگ ولیم فریزر کے قتل سے خوش اور شمس الدین احمد کی گرفتاری سے ناخوش ہوئے۔ اب چونکہ ایک طرف نواب سے مرزا کے تعلقات خراب تھے اور مقدمہ بازی چل رہی تھی اور دوسری طرف مقتول ولیم فریزر سے مرزا کے اتنے تعلقات تھے کہ وہ اسے اپنا "سرپرست" یا "مربی" لکھتے ہیں

مقدمے کی کامیابی کے سلسلے میں بھی اس سے بڑی اُمیدیں تھیں، اِس لئے لوگوں کو شبہہ ہوا کہ نواب کے خلاف عدالتی کارروائی میں غالب زیادہ شریک کار یا مخبر ضرور ہیں۔ دلی کے سٹی مجسٹریٹ سائمن فریزر سے بھی غالب کا ملنا جلنا تھا۔ وہ قتل کے مقدمے کی تفتیش کرتے کرتے اُن کے ہاں بھی بہت آنے جانے لگا اور بعض خطوں سے پتہ چلتا ہے کہ اُس نے مجرموں کا سُراغ لگانے میں غالب سے مشورے بھی ضرور لئے ہوں گے۔

کوئی راز چھپا نہیں رہتا۔ لوگوں کے غصّے کا وہ لاوا، جو انگریزوں کی معاشی لُوٹ اور سیاسی تسعیدہ گری کے خلاف اُبل رہا تھا، مقتول سے تعلقات، نواب سے دشمنی اور تفتیش کے دوران مجسٹریٹ سے میل جول کی بنا پر غالب تک اس کی چنگاریاں



پہنچیں اور انگریزوں کے ہاتھوں نواب شمس الدین احمد کو پھانسی کے پھندے تک پہنچا دینے والے گروپ کے ایک فرد کی حیثیت سے غالب بھی عوام میں معتوب ہو گئے۔ ایک رائے یہ تھی کہ ایسے خلاف افواہ عام عرصے اور بدگمانیاں سے غالب کا خوف باقی رہا

نواب شمس الدین کو اس الزام میں کہ قاتل ان کا خاص ملازم تھا اور ان کے ایما سے قتل ہوا، پھانسی ہو گئی اور فیروز پور جھرکہ کی ریاست اور خزانہ ضبط کر لیا گیا۔ اس سے متعلق پنشنیں اور وظیفے دہلی کلکٹری سے وابستہ ہو گئے۔ یوں غالب کے پانچ مطالبوں میں سے ایک خود بخود پورا ہو گیا۔ انگریزی دربار میں کرسی نشینی کا حق مل چکا تھا اور خلعت کا حق بعد میں مل گیا اور دربار میں سیدھے ہاتھ پر دسویں نمبر کی کرسی ان کے لئے طے ہوئی، جس پر وہ ہمیشہ خطوں میں اور یادداشتوں میں فخر کرتے رہے۔

تیسری بڑی مصیبت جو دربار میں کرسی کے حصول کے بعد غالب کو پیش آئی، وہ ان کا بار بار اخلاقی جرم میں ماخوذ ہونا تھا۔ شطرنج اور چوسر اس وقت کے خوش باش امیروں، زمینداروں کی خاص تفریح تھا اور ان کھیلوں کو بھی علم مجلسی میں شمار کیا جاتا تھا۔ غالب بھی بچپن سے اس کے دلدادہ تھے اور حسب معمول بازی بدکر چوسر کھیلا کرتے تھے۔ بازی بدنے سے یہ کھیل جوئے میں شمار ہوتا تھا اور جوا اخلاقی جرم میں۔ ۱۸۴۱ء میں مرزا کو بعض دوستوں کے ساتھ اپنے مکان پر جوا کھیلتے ہوئے گرفتار کر لیا گیا۔ عدالت نے سو روپے جرمانہ کیا اور عدم ادائیگی میں چار مہینے کی قید۔ مرزا نے جرمانہ ادا کر دیا اور سزا سے بچ گئے۔ لیکن سات سال بعد انہیں اسی جرم میں سزا ہو گئی۔ ان کے مکان پر شرط بدکر چوسر ہو رہی تھی اور بہت سے لوگ شریک تھے۔ یعنی ایک طرح سے غالب کا مکان جوا خانہ بن گیا تھا۔ پولیس نے چھاپہ مارا۔ مارپیٹ ہوئی اور گرفتاری عمل میں آئی۔ مرزا کو چھ مہینے قید بامشقت اور دو سو روپے جرمانہ ہوا۔

خاندانی رئیس اور درباری غالب کے لئے اس سے بڑھ کر کوئی ذلت نہیں ہو سکتی تھی۔ کئی امرا کی طرف سے سفارشیں ہوئیں، لیکن انگریزی انتظام تھا۔ مرزا کی سزا بحال رہی اور وہ تین مہینے کی جیل ہی میں اس قدر خستہ حال ہو گئے کہ سول سرجن کی سفارش پر رہا کر دیئے گئے۔

مالی مشکلات کے بعد یہ واقعہ سب سے بڑھ کر ایسی کاری ضرب تھا جس نے ان کے سارے فخر و غرور کو چور چور کر دیا اور انہوں نے دیکھا کہ معمولی سے اخلاقی جرم پر ان کی گرفت ہوئی تو عالی جاہ دوستوں کی ہمدردیاں اور سفارشیں کچھ کام نہ آئیں۔ یہاں تک کہ نوابین لوہارو کا خاندان جسے وہ اپنا خاندان سمجھتے تھے، صاف کترا گیا اور اخبارات میں جو غالب کی گرفتاری کی خبر چھپی اور اس میں لوہارو خاندان سے ان کی نسبت ظاہر کی گئی تو ان لوگوں کو یہ بھی ناگوار گزرا اور اس پر تردید کی معذرت چھپوائی گئی۔

اس دور کے سب سے بڑے نقاد اور خوش گو شاعر مصطفیٰ خاں شیفتہ کے علاوہ کسی نے گرفتاری اور قید کے زمانے میں مرزا کی دلجوئی اور مدد نہ کی اور ظاہر ہے کہ شیفتہ کی طرف سے یہ امداد رئیس زادے مرزا نوشہ کی نہیں بلکہ شاعر باکمال مرزا غالب کی قدردانی تھی۔ ناممکن تھا کہ مرزا کو خود اس کا احساس نہ ہوتا۔ عجب نہیں کہ یہ بھی ایک سبب ہو انہیں فارسی سخن گوئی سے عام فہم اردو شاعری اور خطوط نویسی کی طرف لانے کا اور منصب داری کی فکر سے زیادہ سخنوری میں منہمک رہنے کا۔

جیل میں غالب نے ۴۸ شعروں کی ایک طویل نظم ترکیب بند لکھی تھی جو ان کے کلیات میں شامل نہیں ہے، لیکن بعد میں خود شاعر نے "سند جیل" نام کے مختصر مجموعے میں شائع کرا دیا تھا۔ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ قید کی بامشقت زندگی پر اس سے زیادہ دلدوز، تیکھی اور پُراثر نظم فارسی زبان میں ناپید ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ خود غالب کو بھی اس نظم کے اپنے



بہترین کلام ہونے کا اندازہ ہے

درخرابی کہاں میکدہ بیاد ہم — در اسیری بہ سخن دعویٰ اعجاز کنم

بے مشقت بود بید لشعر آوریم — رود کے چند رسن تابی آواز کنم

برصریر قلم خویش بود مستیٔ من

مدرپی بدگراں می وسبکدستیٔ من

اس نظم میں پہلا بند اس شعر پر ختم ہوتا ہے :

گرچہ تو ہیچ گرفتاری جاویدم نیست — لیکن از دہر دگر خوشدلی [illegible]

اور تیسرے بند میں عالی جاہ عزیزوں کی بے رخی پر طنز ہے :

لسکر خوبیاں شدہ بیگانہ زبدنامیٔ من — عیر شگفت خورد گرم ناکامیٔ من

ترکیب بند ایک خاص ذہنی کیفیت کا آئینہ دار ہے اور یوں تمام ہوتا ہے۔

آں ماتم کہ بہر بزم زمن یاد آرید — دارم امید کہ در بزم سخن یاد آرید

(میں وہ تو نہیں ہوں کہ ہر محفل میں میرا ذکر ہو۔ البتہ اتنی امید باقی ہے کہ شعر کی محفلوں میں میری کمی محسوس کیجئے)

چند سال کی بے فکری۔

غالب جیل سے نکلے اور شرم اور رنج کے مارے کچھ گوشہ نشین سے ہوگئے۔ ان کا دل اُچاٹ ہوگیا تھا۔ اسی زمانے میں بعض ہمدردوں کی سفارش پر لال قلعے میں اُن کو باقاعدہ ملازمت مل گئی۔ اس وقت تک یہ طے ہو چکا تھا کہ سراج الدین بہادر شاہ ظفر تیموری خاندان کا آخری بادشاہ ہے۔ اس کے بعد مغل بادشاہی کا رہا سہا نام بھی ختم ہو جائے گا اور اس کے وارثوں کو قلعہ خالی کرکے شہر سے باہر بہت کم وظیفے پر بسر کرنا ہوگا۔ چلتے چلاتے بادشاہ نے سوچا کہ تیموری خاندان کے جاہ و جلال کی آخری یادگار تصنیف کی صورت میں محفوظ کرالے۔ اس کام کے لئے فارسی کے انشاپرداز اور مورخ کی تلاش تھی۔ غالب مورخ نہ تھے۔ چنانچہ یہ تدبیر اختیار کی گئی کہ بادشاہ کے چیف سکریٹری حکیم احسن اللہ خاں واقعات ترتیب دے کر غالب کے حوالے کر دیا کریں اور غالب ان کو اپنی فارسی انشاپردازی سے سجا کر تصنیفی قالب عطا کر دیا کریں۔

کچھ تعجب نہیں اگر غالب کو اس تعلق سے مالی آسائش ملنے کے علاوہ یہ امید بھی ہو کہ بادشاہ رہے نہ رہے، تاریخ رہ جائے گی اور اس میں شاہی خاندان کی ابتدا کا سراغ لگاتے ہوئے ایک یہ موقع بھی ہاتھ آئے گا کہ اپنے آباؤ اجداد کی تیمور کے بزرگوں سے ہمسری ثابت کر دی جائے۔ چنانچہ اس خاص پہلو سے غالب نے ایسا ہی کر لیا

جولائی ۱۸۵۰ء (۲۳ شعبان ۱۲۶۶ھ) کو غالب نے پچاس روپے مہینے پر یہ ذمہ داری سنبھال لی۔ شاہی خطابات کا دستور یہ تھا کہ مرتبے کے مطابق ایک یا دو یا تین خطاب ملا کرتے تھے ـــــــ غالب کو سہ مرلہ خطاب نجم الدولہ دبیر الملک، نظام جنگ عطا ہوا اور یہ اس درجے کا خطاب تھا جو خود بادشاہ کے استاد ذوق کو نصیب نہ تھا۔ اسکے علاوہ آخری دور کا نہایت گراں خلعت بھی دیا گیا جس کے معنی ہیں کہ رخصت ہوتی ہوئی شاہی کے آخری نمائندے نے جو خود بھی شاعر اور سخن فہم تھا، اُن کی انشاپردازی اور کج کلاہی کی قدر کی اور اس ۵۳ برس کی پختہ عمر میں کچھ مدت کیلئے انہیں روزمرہ کی مشکلات سے نجات ملی اور پنشن کے علاوہ کئی درباروں سے ان کی مالی امداد ہوتی رہی،

خود مرزا کی شاعری پر بھی اس درباری تعلق کا کافی اثر پڑا۔ اگرچہ اب تک وہ کئی بار شاہزادوں اور بادشاہ کو متوجہ کرنے کے لئے فارسی قصائد لکھ چکے تھے، منانے کی کوششیں کر چکے تھے، لیکن قلعے سے تعلق قائم ہو جانے کے بعد



انہوں نے کئی ایسے قصائد لکھے جن کا انداز بیان اور طرز تعمیر پہلے والے قصیدوں سے مختلف تھا۔ ان میں زبان صاف اور سلیس تھی، بیان کا چٹخارہ تھا اور مدح شاہ کا عنصر جو پہلے نہ ہونے کے برابر تھا، کافی نمایاں تھا۔ وہ اب کمپنی کے دست نگر بہادر شاہ ظفر کی تعریف اس زور و شور سے کر رہے تھے کہ فردوسی نے محمود غزنوی کی اور انوری نے ملک سنجر کی نہ کی ہوگی۔ اسی زمانے میں انہوں نے کافی قصیدے لکھے اور طرح بے طرح اردو میں زیادہ لکھنے لگے۔ وہ غزلیں جن کی وجہ سے غالب کو عوام میں مقبولیت حاصل ہوئی، جن میں خیالات کی صفائی اور زبان کی سادگی کے ساتھ لکھنے کی انبساط ہے خاص طور سے اسی زمانے کی پیداوار ہیں۔ وہ غزلیں جو آج گلیوں اور بازاروں میں گونجتی ہیں، جن کے اشعار عوام کے زبان زد ہو چکے ہیں گائی جاتی ہیں۔ وہ گویا غالب کے اترے ہوئے موتی ہیں جو انہوں نے ایسے ہاروں میں پرو دیئے تھے جن کا بازار میں رکھنا مقصود تھا۔

یہ ۵، ۶ برس کسی قدر آرام سے گزرے۔ پنشن کے ۷۵ روپے سالانہ، بادشاہ سے ۶۰۰ روپے سالانہ، شہزادہ ولیعہد میرزا فخرو ان کے شاگرد ہو گئے تھے، ان سے ۴۰۰ روپے سالانہ۔ ۱۸۵۴ء کے آخر آخر غالب اس کی بھی سبیل پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے کہ انہیں اودھ کے علم دوست اور فن کار بادشاہ واجد علی شاہ سے بندھی ہوئی رقم مل جایا کرے۔ چنانچہ وہاں سے بھی پانچ سو روپے سالانہ مقرر ہو گئے۔ ادھر ادھر کی ریاستوں اور قدر داں امیروں کی طرف سے بھی فتوح "بھیج جایا کرتی تھی بلکہ یہ سب کچے ٹھکانے تھے اور غالب کو جو درباروں کے رازداں اور بدلتے ہوئے حالات کے ناقص تھے، آگے کی طرف سے کھٹکا لگا ہوا تھا چنانچہ وہ اس تیزی سے ڈھلتی ہوئی عمر اور صحت کے ساتھ اپنے مستقبل کی حیثیت کا یکا بندوبست کر لینا چاہتے تھے اور اس کی خاطر انگریزی اقتدار کا خوش رکھنا اور گورنر جنرل کے دفتر میں مقام بنانا ضروری تھا۔

پنشن کے مقدمے کی پانچویں شق یہ تھی کہ مجھے انگریزی دربار سے خطاب، دربار اور خلعت سے نوازا جائے۔ ۱۸۲۶ء سے یہ کوشش جاری تھی اور اس کو سپھل کرنے کے لئے وہ دلی کے ریزیڈنٹ، سکریٹری، چیف سکریٹری اور گورنر جنرل تک کی تعریف میں قصیدے اور قطعے لکھ چکے تھے۔ ۱۸۵۶ء کے ختم ہوتے ہوتے برطانوی اقتدار سے خود کو منوانے کی کوششیں اور سنجیدہ ہو گئیں اور انہوں نے ملکۂ وکٹوریہ کی تعریف میں پُرزور قصیدہ لکھ کر لندن بھیجا جس کا سارا زور اپنی حاجت روائی پر تھا اور ساتھ میں ایک عرضی بھی تھی کہ بادشاہوں کی شاعر نوازی کے چلن کے مطابق مجھے بھی خطاب، خلعت اور پنشن سے نوازا جائے۔

اس قصیدے اور عرضی کی رسید ان کو ۱۸۵۷ء کے آغاز میں لندن سے مل گئی تھی اور نہ جانے کیسی کیسی امیدیں بندھ گئی تھیں کہ ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو شمالی ہند میں برطانوی اقتدار کے خلاف سلگتی ہوئی آگ بھڑک اٹھی۔

۱۸۵۷ء اور اس کے بعد :

دلی کا وہ ادبی حلقہ جس کو مرزا سے ذہنی اور قلبی بیر تھا، ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں پیش پیش رہا۔ مولوی محمد باقر ایڈیٹر اردو اخبار دہلی جنہوں نے ۱۸۴۷ء میں مرزا کی گرفتاری پر بغلیں بجائی تھیں اور کوتوال کی حمایت کی تھی۔ مئی ۱۸۵۷ء کی بغاوت کو برطانوی اقتدار کا خاتمہ اور مغل شہنشاہی کی بحالی سمجھ رہے تھے۔ پھر یہ کہ باغی فوج میں تنظیم کی کمی، سرشوری کی زیادتی اور ان انگریزوں کا قتل عام جن میں سے کوئی غالب کا دوست تھا، کوئی امیدگاہ تھا، کوئی قدرداں تھا، کوئی مربی تھا ــــ اور اس کے سوا یہ بھی کہ غالب کو نظر آ رہا تھا کہ آخر یہ بغاوت یا جنگ آزادی خود اپنی کمزوریوں کی بدولت ناکام ہونے والی ہے۔ چنانچہ انہوں نے در پردہ اپنے ایک دوست اور امیدگاہ والیٔ رام پور کو جو خفیہ خط لکھے اور سیاسی مشورے دیئے ان سے بھی پتہ چلتا ہے کہ غالب کو باغیوں سے ویسی ہمدردی نہ تھی جیسی ان کے طبقے کے سربرآوردہ لوگوں کو رہی۔ چنانچہ ہندوستانی تاریخ



کے اس عظیم الشان واقعے پر جو آنسو ہم ان کی تحریروں سے بہتے ہیں، ان میں غم تو ہے، آگ نہیں ہے۔ مرنے والوں سے چاہے وہ کالے ہوں یا گورے اور لٹنے والوں سے، چاہے وہ غریب ہوں یا امیر، اُن کو گہری ہمدردی ہے۔ ماتم سب کا ہے لیکن کسی فریق کی حمایت یا تائید بالاعلان نظر نہیں آتی۔ آبائی مذہب کی تبدیلی (سنی سے شیعہ ہو جانا) اور پھر عموماً مذہبی رسوم سے بے پروائی شمس الدین احمد کی پھانسی، انگریز سرپراہوں سے غالب کی دوستی، آئین اکبری کی اشاعت پر اُن کے تقریظ لکھ اور روش عام سے ہٹ کر چلنے کی طبیعت نے دلی کے عام لوگوں میں انہیں نکو تو بنا ہی رکھا تھا، اب اگر زبان کھولتے تو اور مصیبت آجاتی۔ ۸ ہزار فوج کے شہر میں داخل ہوتے ہی انہوں نے مفتی صدر الدین آزردہ کے ساتھ روزانہ دربار میں حاضری دینا شروع کر دیا اور اُس تدبر سے جسے بعد میں انہوں نے "بہ باطن بیگانہ، بظاہر آشنا" کہا ہے، جان اور آبرو بچائی۔ مئی ۱۸۵۷ء سے ۱۸۵۸ء کے آخر تک مرزا پر بہت سخت وقت گذرا۔ گھر کا قیمتی سامان انگریزی سپاہیوں کے ہاتھوں لٹ چکا تھا۔ قلعے کی آمدنی اور پنشن انتظام کے درہم برہم ہو جانے سے ختم ہو چکی تھی، صرف تین چار دوستوں (خصوصاً ہندو دوستوں) کی دست گیری سے کام چلتا رہا۔ بقول ان کے:

"... اس ناداری کے زمانے میں جس قدر کپڑا، اوڑھنا اور بچھونا گھر میں تھا سب بیچ بیچ کر کھا گیا۔ گویا اور لوگ روٹی کھاتے تھے اور میں کپڑا کھاتا تھا..."

چند بے سہارا لوگوں کے علاوہ پانچ چھ ملازم گھر پر تھے۔ وہ اس تنگی کے زمانے میں بھی ان کے دم کے ساتھ رہے اور جن کو وہ عام حالات میں مدد دیتے رہتے تھے، اب بھی ان سے بے تعلق نہ ہوئے۔

معاشی مصیبت ایک طرف۔ اب انگریزی انتظام بحال ہو جانے کے بعد (اکتوبر ۱۸۵۷ء) اُن پر یہ الزام لگا کہ بغاوت ہو جانے کے بعد جب قلعے میں بہادر شاہ نے دربار کیا (۱۸ جولائی ۱۸۵۷ء) تو مرزا غالب بھی درباریوں میں شریک تھے اور انہوں نے سکے پر کندہ کرانے کو یہ شعر کہہ کر دیا تھا ؎

زر زد سکہ کشور ستانی سراج الدین بہادر شاہ ثانی

غالب نے انگریز کمشنر کے سامنے صفائی پیش کی کہ محض غلط کہتا ہے۔

"... بادشاہ شاعر۔ بادشاہ کے بیٹے شاعر۔ بادشاہ کے نوکر شاعر۔ خدا جانے (سکہ) کس نے کہا۔ اخبار نویس نے میرا نام لکھ دیا۔"

اسی طرح غدر کے چار مہینوں کا جو روزنامچہ غالب نے "دستنبو" کے نام سے لکھا، اُس کو بغور دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں اُسے شائع کرانے اور گورنر جنرل اور ملکۂ وکٹوریہ کو نذر کے طور پر بھیجنے سے مقصد یہ تھا کہ اپنی طرف سے صفائی پیش کی جائے اور وہ بھی ایسے وقت جب اُن پر یہ الزام لگ چکا ہو کہ "تم غدر کے زمانے میں باغیوں سے اخلاص رکھتے تھے۔" اور اُن کے قریب قریب تمام سربرآوردہ دوست مصیبتوں اور بربادیوں کا شکار ہو چکے ہوں۔۔۔ یقین نہیں آتا کہ اگر غالب نے انگریزی فوج کی قتل و غارت گری اور لوٹ مار کے خلاف شعر یا نثر میں دل کا بخار نکالا ہوگا، تو اُسے بعد میں اشاعت کے لئے محفوظ کیا ہوگا۔ چنانچہ زمانۂ غدر میں ان کی ایسی تحریروں کو جو انہوں نے خود شائع کرائی ہیں، ہم غالب کی ذہنی کیفیت کا کلی ترجمان نہیں کہہ سکتے۔ البتہ ان میں جزوی صداقت ضرور ہے۔ مصلحتِ وقت سے وہ اس درجہ مجبور ہو گئے تھے کہ اشاعت سے پہلے انہوں نے اپنے روزنامچے دستنبو میں بھی کئی بار کاٹ چھانٹ کی ہے۔ اسلام سے پہلے کی وہ الوالفضلی فارسی عبارت لکھی ہے جسے داہنے بائیں موڑا جا سکے اور ملکۂ وکٹوریہ کے عام معافی کے اعلان پر ایسا قصیدہ لکھا ہے جو کسی دنیاوی ممدوح کی شان میں نہ لکھا تھا۔ اس قصیدے کو دستنبو کے ساتھ جوڑ دیا ہے۔ غدر کے فرو ہو جانے کے بعد ۱۸۶۱ء میں اُن کا



دیوان اُردو شائع ہوا تو اُس میں یہ قطعہ شامل نہ تھا جو ۱۸۵۷ء میں لکھا گیا ہے۔

بسکہ فعّال ما یرید ہے آج ‏ ‏ ہر سلحشور انگلستان کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے ‏ ‏ زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا
چوک جسکو کہیں وہ مقتل ہے ‏ ‏ گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہر دلی کا ذرہ ذرہ خاک ‏ ‏ تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا

جب تک کشت وخون ہوتا رہا، غالب اپنے بیان کے مطابق گھر بند کئے بیٹھے رہے۔ یہاں تک کہ ان کے بھائی کا انتقال ہوا تو وہ انہیں دفن کرنے بھی باہر نہ گئے۔ خانہ نشینی کے ان چار مہینوں کے علاوہ بعد کے گیارہ مہینوں کا حال انہوں نے لفظ بلفظ لکھا، لیکن اُسی قدر جتنا سننے میں آتا تھا یا خود ان پر اور ان کے عزیزوں، دوستوں پر گزرتا تھا — یا پھر اپنی سلامتی کے لئے لکھنا ضروری تھا —

ہندوستانی زبان کے علاقے کی قومی بغاوت سے غالب کی بیگانگی اور بغاوت کی ناکامی پر انگریز گورنروں اور افسروں کے سامنے اپنے رویّے کی صفائی دیتے پھرنا، بظاہر ایک ایسے شاعر کے لئے ناروا معلوم ہوتا ہے جو دربار شاہی کا منصب دار ہو اور اشرافیہ میں اعلیٰ مقام رکھنے کا آرزو مند ہو، جس کے کلام میں جابجا آزادی اور آزادہ روی کے دعاوی پائے جاتے ہوں اور جس نے بغاوت شروع ہونے تک بہادر شاہ ظفر اور واجد علی شاہ کی تعریف میں پے در پے فارسی قصائد لکھے ہوں اور حال تازہ کے دعوے کئے ہوں لیکن اس بہ باطن بیگانگی اور بظاہر آشنائی کے پیچھے جہاں یہ سوچنا پڑتا ہے کہ اقتدار ٹیمور کی وفاداریاں سو سال پہلے سے ٹوٹ چکی تھیں۔ غالب کے ددھیالی اور سسرالی خاندانوں میں یہی رسم چلی آرہی تھی وہاں اس حقیقت پر بھی نظر جاتی ہے کہ واقعہ چاہے کتنا ہی سخت کیوں نہ ہو وہ کسی وقت بھی ہوش و حواس سے بیگانہ اور اپنی طبعی سلامت روی سے بے بہرہ نہیں ہوئے

۱۸۵۷ء کے معرکے کی ناکامی کے بعد غالب کا زیادہ تر وقت اپنی بے گناہی ثابت کرنے، گورنر جنرل اور ملکہ وکٹوریہ کی تعریف میں قصیدے لکھنے اور بھجوانے میں گذرا۔ اُس زمانے میں انہوں نے دو نہایت پُرزور قصیدے لکھے ہیں جن میں مدح کے بجائے بدلتے ہوئے زمانے کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر کھلتا ہے اور غالب کا یہ دعویٰ برحق نظر آتا ہے کہ ان کا فنّی کمال فارسی قصیدوں میں موجود ہے۔ فکر معاش نے یہ راہ بھی سجھائی کہ دیسی ریاستوں میں جو انگریزوں کی سرپرستی سے مالامال ہیں، کچھ سلسلہ جنبانی کی جائے۔ چنانچہ پٹیالہ اور الور کے وفادار والیانِ ریاست کی خدمت میں قصیدے روانہ کئے اور جب ہاتھ کے ہاتھ کچھ ملتا نظر نہ آیا تو وہ ا[illegible] ریاست کی طرف متوجہ ہوئے جس سے ان کے ذاتی تعلقات تھے۔ رام پور کے والیٔ ریاست نواب یوسف علیخاں اُن کی شاگردی قبول کر چکے تھے اور ۵۷ء کے بعد کی خستہ حالی میں یہی ایک ٹھکانا تھا، جہاں سے غالب کو مدد ملتی رہی تھی۔ نواب رامپور نے ۱۸۵۹ء سے اُن کے سو روپے مہینہ مقرر کر دئے تھے۔ رام پور رہنے کی شرط پر دو سو روپے ماہوار، مگر ان کے سوانح میں یہ بات اہم ہے کہ اس پر بھی وہ وہاں رہ پڑنے کو تیار نہ تھے بلکہ اسی کے لئے کوشاں رہے کہ کم از کم ۶۲ روپے آٹھ آنے ماہوار جو غدر ۱۸۵۷ء سے پہلے پنشن کے ملتے تھے جاری ہو جائیں اور انگریزی دربار میں کرسی اور خلعت محفوظ رہے۔ جب برطانوی حکومت ہند اور گورنر جنرل کے جواب سے ان کی اُمیدیں کمزور ہو گئیں تب وہ جنوری ۱۸۶۰ء میں عارضی طور پر رام پور چلے گئے اور غالباً اس [illegible] کہ نواب رام پور کی کہنے سننے سے انگریزی پنشن اور دربار و اعزاز بحال ہو جائے گا۔

[illegible] سفارشوں اور تحقیقات سے کام چل گیا۔ ۱۸۶۰ء کے مئی مہینے میں اُن کو پچھلے ۳ برس کی [illegible] ساتھ مل گئی اور تھوڑا سا قرض کی ادائیگی میں نکل گیا [illegible] مارچ ۱۸۶۳ء میں ان کو دربار و خلعت کا ساتھ [illegible]



آخر کوئی سات برس کی کوششوں کے بعد واپس مل گیا اور اس کے بعد انہوں نے مطالبہ کیا کہ مجھے ملکۂ وکٹوریہ کا درباری شاعر مقرر کیا جائے گورنری دربار میں پہلے سے اونچی جگہ دی جائے اور میرا عدد ۷ ۵ ء کا روزنامچہ دستنبو سرکاری طور پر شائع کیا جائے غالب اس کے بعد ۱۲ سال اور زندہ رہے اور ان کے یہ مطالبے نہ پورے ہونے تھے، نہ ہوئے۔ البتہ اس تمام عرصے میں ریاست رامپور سے انکی مالی سرپرستی ہوتی رہی۔ مرزا کے طلب کرنے پر کسی بار علی اعصاب بڑی بڑی رقمیں ریاست سے ملتی رہیں اور نواب کا برتاؤ انکے ساتھ وہ تھا جو برابر کے دوستوں سے ہوتا ہے۔

آخری ادبی معرکہ۔ جسکی طرف ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں، ۱۸۵۷ء کی فرصت اور ورق گردانی کا نتیجہ ہے۔ مرزا کی اپنی کوئی لائبریری نہ تھی انکا حافظہ ہی کتب خانہ تھا کرایہ کی کتابوں سے یا دوستوں کی منگی ہوئی تحریروں میں سے جو پڑھ لیا وہ حافظے میں آ گیا۔ ۵۷ء کی خانہ نشینی کے دنوں میں انکے پاس لے دیکے بس دو تین کتابیں تھیں۔ پارسیوں کی قدیم کتاب دساتیر اور ہندوستان میں فارسی کی سب سے مقبول عام لغت برہان قاطع انہوں نے لغت پر غور کیا تو لغت نویسی کے اصول سے اسمیں کئی کمزوریاں نظر آئیں اور کئی لغات کے معنی سے اختلاف محسوس ہوا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے اعتراض حاشیے پر لکھ لیے اور یہ اعتراضات انکی طنز آمیز عبارت آرائی کے ساتھ قاطع برہان کے نام سے ۱۸۶۲ء میں شائع ہوئے۔ پھر بعد میں اس کا ایک اور اڈیشن درفش کاویانی کے نام سے نکلا۔ یوں تو یہ ایک مقبول عام فارسی لغت پر غالب کا تبصرہ تھا، لیکن چونکہ اسکی تہہ میں بھی انکا وہی نقطۂ نظر کام کر رہا تھا جو کلکتے کے شعرا میں ۳۰ برس پہلے ہنگامہ برپا کرنیکا سبب بن چکا تھا۔ دوبارہ اس پر مرزا کے خلاف ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ معاملہ تحقیق الفاظ اور تشریح محاورہ کا تھا اور مرزا کسی ہندوستانی فارسی دان کو اہل زبان کا درجہ اور فارسی زبان وبیان میں سند ماننے کو تیار نہ تھے بلکہ جسکی مادری زبان فارسی نہ ہو اور فارسی کے علم میں قول فیصل کا دعویٰ کرے اُسے حقارت سے دیکھتے تھے۔ چنانچہ ہندوستانی فارسی دانوں نے خود انکو بھی سند ماننے سے اور انکی تشریحوں کو علمی تحقیق کا درجہ دینے سے انکار کر دیا۔ غالب کی صحت جواب دے رہی تھی۔ عمر بھر کی ناکامیوں کی تھکن تھی (اپنے چراغ سحری ہونے کا یقین اور فارسی) زبان و ادب کے بارے میں اپنے عقیدے اور اپنے کمال کو آخری بار اہل علم سے تسلیم کرانے کی دھن۔ غرض وہ اس میدان میں پوری قوت سے اترے مرتے دم تک ہار نہیں مانی اور صلح کا ہاتھ نہیں بڑھایا۔ انکے مخالفین علما نے جو ذاتی حملوں سے بھرپور کتابچے شائع کرائے غالب نے بھی انکے مقابلے میں صف بندی کی۔ دوسروں سے کہہ کہہ کر جواب لکھوائے اور خود دوسروں کے نام سے جوابی کتابچے شائع کرائے، مثلاً "سوالات عبدالکریم" اور "لطائف غیبی"۔ اس کے جواب میں گالیوں بھرے خطوط ان کو روزانہ کی ڈاک میں ملتے رہے۔ لغت نگاری کے جدید سائنٹفک اصولوں سے دیکھا جائے تو اکثر و بیشتر غالب کی پوزیشن صحیح نظر آتی ہے لیکن تب تک یہ اصول بھی ناپید تھے اور غالب کی تائید میں ایسے مستند علما بھی نہیں اٹھے جنہیں برابر کے فارسی داں تسلیم کر لیتے اور لغت نویسی کے بارے میں غالب کے اسی رد عمل نے ان کے آخری امیدگاہ نواب رام پور (کلب علی خاں) کی بھی طبیعت مکدر کر دی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب تک جو سو روپے ماہانہ کی مستقل اور کئی ہزار کی غیر مستقل مدد رام پور سے دوستانہ طریق امداد پر مل جایا کرتی تھی اب اس کے جواز کے لئے انہیں جسمانی عارضوں کے باوجود شعر و سخن کی آخری للچھٹ تک لگا دینی پڑی اور اس طرح زندگی کا آخری دور غالب کے لیے تیر کو سبب خیر بنانے میں صرف ہوا۔

نواب رام پور کے منہ کا مزا بدلنے اور ان سے مالی برآری کے لئے مرزا کو مجبوراً تازہ اشعار اور قصائد سے تواضع کرنی پڑی اور مخالفین کی صفوں سے نمٹنے کے لئے دوستوں کو بے تکلفانہ خطوط، ان کے کلام پر اصلاح اور اُن کے تقاضوں پر سی گر فرمائشی فکر سخن کرنی پڑی جو خود مرزا کے بیمار اور تھکے ہوئے جسم کے لئے چاہے کتنی ہی بارگراں کیوں نہ ثابت ہوئی ہو لیکن ان کی عمر و تجربہ کے آخری دور کی مشق سخن اور انشاپردازی کا بہترین کرشمہ ہمارے ہاتھوں میں موجود رہے۔ غالب کے خطوط، جس کو اُردو نثر کا افق وسیع کرنا تھا، پہلی بار ۱۸۶۸ء اور ۱۸۶۹ء میں "عود ہندی" اور "اردوئے معلیٰ" کے نام سے غالب

(باقی صفحہ ۶۰۹ پر دیکھئے)

اس انجمن گُل میں

ڈاکٹر طہٰ انصاری — اُردو کے مشہور ادیب، مقرر، صحافی بمبئی یونیورسٹی میں روسی زبان کے پروفیسر۔ اسی سال یعنی ۱۹۶۸ء میں ماسکو یونیورسٹی نے "غالب کا ایک علمی مطالعہ" (روسی زبان میں) پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری دی۔

قاضی عبدالودود — اُردو کے نہایت مشہور و ممتاز محقق۔ ماہر غالبیات۔ ایک نکتہ رس ادیب۔ بار ایٹ لا۔

عبدالقادر سروری — حیدرآباد کے مشہور ادیب، متعدد تنقیدی کتابوں کے مصنف۔ جموں و کشمیر یونیورسٹی (سری نگر) میں شعبۂ اردو کے صدر۔

مولانا سعید احمد اکبرآبادی — انگریزی زبان کے ایم اے، دیوبند کے فارغ التحصیل، مُسلم یونیورسٹی علیگڑھ میں شعبۂ سُنی دینیات کے صدر۔ رسالہ "برہان" دہلی، کے ایڈیٹر۔ اسلامی ادب و تاریخ و فلسفہ پر متعدد کتابوں کے مصنف۔ لاجواب مقرر۔

(مولانا) شہاب مالیرکوٹلوی — غالب کے ہم وطن۔ ہر محمد خاں نام۔ اُردو کے ایک بزرگ اور معروف صاحبِ قلم۔ پُوری زندگی درس و تدریس میں گذری۔ عربی اور فارسی کے فاضل۔ بمبئی وطنِ ثانی ہے۔ سالہا سال سے قرآنِ مجید کا گہرا مطالعہ جاری۔

میکش اکبرآبادی — میر و نظیر و غالب کے اُجڑے ہوئے دیار (آگرہ) میں شعر و ادب کی اعلیٰ روایات کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔ شاعر و ادیب۔ ایک مشہور صوفی خاندان کے سجادہ نشین۔ میکدہ اور حرف تمنا — دو شعری مجموعے شائع ہو چکے۔ اردو کے مشہور "نقدِ اقبال" اُن کی مشہور کتاب ہے۔

ڈاکٹر مسیح الزماں — اُردو کے بہت اچھے ادیب۔ الہ آباد یونیورسٹی میں شعبۂ اُردو کے ممتاز پروفیسر۔

ڈاکٹر سُہیل بخاری — ماہرِ لسانیات۔ "اُردو داستانوں" پر قابلِ قدر کام کر چکے ہیں۔ اکبرآباد سے خصوصی نسبت۔ سرگودھا (پاکستان) میں پروفیسر ہیں۔ کئی کتابوں کے مصنف۔

ڈاکٹر سلام سندیلوی — پختہ مشق ادیب و شاعر۔ شعر و ادب پر گہری نگاہ۔ کئی شعری مجموعے چھپ چکے ہیں۔ گورکھپور یونیورسٹی میں اُردو کے اُستاد ہیں۔

(مولانا) ماہر القادری — اُردو کے پسندیدہ و مقبول شاعر۔ غزل سے رندی و سرمستی آشکار اور کردار میں اسلامی شعائر کی جھلک۔ نظم و نثر دونوں پر قدرت۔ ماہنامۂ "فاران" کراچی (پاکستان) کے مدیر۔ کئی کتابوں کے مصنف۔ فن پر گہری نگاہ۔

ڈاکٹر ابو محمد سحر — منشی امیر مینائی لکھنوی پر قابل قدر کام کر چکے ہیں۔ اچھے شاعر۔ اچھے محقق و ادیب۔ حال ہی میں نسخۂ حمیدیہ پر کام کیا ہے۔ حمیدیہ کالج بھوپال کے پروفیسر۔

عصمت جاوید — بہترین تنقیدی شعور رکھتے ہیں۔ اگر لکھتے رہیں تو اُردو کے اچھے نقادوں میں شمار ہو۔ شاعر بھی اچھے ہیں۔ گورنمنٹ کالج اورنگ آباد میں اُردو کے اُستاد ہیں۔

ڈاکٹر مُغنی تبسم — نئی نسل کے اچھے اور ذہین ادیب۔ عثمانیہ یونیورسٹی (حیدرآباد) میں لیکچرر ہیں۔ تنقید کے بنیادی مسائل پر بہت اچھا کام کیا ہے۔

ناظر سیتاپوری — اُردو کے جانے پہچانے قلم کار ہیں۔ عرصۂ دراز سے تحقیقی کاموں میں مصروف۔ کئی کتابوں کے مصنف۔ سیتاپور میں مُستقل قیام۔

شناس نامہ

ڈاکٹر فرمان فتحپوری — مولانا نیاز فتحپوری کے حرم کے دستِ راست۔ خود اچھے ادیب۔ "نگار پاکستان" کے مدیرِ اعلیٰ۔ کراچی یونیورسٹی میں اُردو کے اُستاد۔

ڈاکٹر سید حامد حسین — عرصے سے اُردو میں اچھے مضامین لکھ رہے ہیں۔ بھوپال میں انگریزی ادبیات کے اُستاد ہیں۔ نسخۂ حمیدیہ پر حال ہی میں ڈاکٹر ابو محمد سحر کے ساتھ کام کیا ہے۔

خوش سرحدی — پنڈت گوبند داس خوش سرحدی بڑے کہنہ مشق شاعر ہیں۔ ترنگاری میں بھی مہارت۔ کہتے ہیں، لیکن نثر کم لکھتے ہیں۔ فرید آباد (ہریانہ) میں قیام ہے۔ نئے فرید آباد کی صورت گری اور لاکھوں پٹھانوں کی آبادکاری خوش سرحدی ہی کی رہینِ منت ہے۔ لیڈری اور شاعری دونوں سے شغف ہے۔

سید منظور الحسن برکاتی — ریاست ٹونک کے آخری دور کے تنہا ادیب۔ تحقیق کا خاص ذوق رکھتے ہیں۔ ان کے مضامین قدر کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔

عطا محمد شعلہ — اُردو کے معروف اور دیرینہ قلم کاروں میں سے ہیں۔ اچھے شاعر بھی ہیں۔ اٹاوہ (یوپی) میں ڈپٹی کلکٹر ہیں۔

ذکاء الدین شایاں — مسلم یونیورسٹی علیگڑھ میں ریسرچ اسکالر۔ ایک ہونہار نوجوان شاعر و ادیب۔

عبد القوی دسنوی — بمبئی میں تکمیل تعلیم کے بعد کئی سال سے سیفیہ ڈگری کالج بھوپال کے شعبۂ اُردو میں پروفیسر ہیں۔ اچھا لکھتے ہیں۔ اُردو کے لئے بہت کام کر رہے ہیں۔ حال ہی میں ان کی کتاب "اقبال اور بھوپال" شائع ہو چکی ہے۔

مولانا حیرت بہوڑی — مولوی عبدالحق کے زمانے سے اب تک اُردو زبان کے لئے اپنی ہڈیاں پیس رہے ہیں۔ سالہا سال انجمن ترقی اُردو ہند کے نائب معتمد رہے۔ غالب اکیڈمی بنارس۔ مرقعِ غالب۔ غالب انسائیکلوپیڈیا میر اکیڈیمی، سب میں مولانا حیرت کا ہاتھ ہے۔

سید مبارک علی — جالون (یوپی) کے رہنے والے سنٹرل ریلوے بمبئی میں ملازم۔ پہلے ایک مضمون "غالب علم الاعداد کی روشنی میں" لکھا تھا، جو پسند کیا گیا۔ اب غالب کا عروضی جائزہ لیا ہے۔ شعر بھی کہتے ہیں۔ انگریزی، اُردو اور فارسی کا اچھا مذاق رکھتے ہیں۔

سید محفوظ الحسن — گو معروف نہیں ہیں، لیکن اچھا لکھتے ہیں۔ پٹنہ یونیورسٹی سے اُردو میں ایم اے (فرسٹ کلاس) کیا۔ اورنگ آباد (گیا) بہار میں مقیم ہیں۔

سید علی نصاحسینی — کرائسٹ چرچ کالج کانپور میں اُردو کے لیکچرر ہیں۔ ادبی و تنقیدی مضامین لکھتے ہیں۔ شعر بھی کہتے ہیں۔

مولانا امتیاز علی عرشی — اُردو کے بلند پایہ محقق۔ بڑے ماہرِ غالب شناس۔ رضا لائبریری رام پور کے نگراں۔ دیوانِ غالب کو تاریخی و تحقیقی انداز سے مرتب کرنے والے بزرگ۔ کئی دوسری کتابوں کے مصنف۔

ڈاکٹر وزیر آغا — نئی نسل کے بے حد ذہین نقاد اور شاعر۔ نظم و نثر کے کئی مجموعوں کے مصنف۔ سرگودھا (پاکستان) میں قیام ہے۔ "اوراق" کے مدیرِ اعلیٰ۔

کرامت علی کرامت — راونشا کالج (اڑیسہ) میں سائنس کے پروفیسر۔ نئی نسل کے بہت اچھے اُردو تنقید نگار ہیں۔ شاعر بھی ہیں۔ دوماہی شاخسار (کٹک) کے مدیر۔

بشر نواز — نئی نسل کے تنقیدی شعور رکھنے والے اچھے شاعر۔ اورنگ آباد (مہاراشٹر) کے سماجی حلقوں میں مقبول۔

نامی انصاری — خوش فکر نوجوان شاعر۔ نثر بھی اچھی لکھتے ہیں۔ کانپور میں قیام ہے۔

ندا فاضلی — نئی نسل میں معتبر دلی والے کے شاعر۔ اُردو کے علاوہ ہندی اور انگریزی زبان و ادب پر بھی عبور۔ بہت اچھی نثر لکھتے ہیں۔

منان طرزی — حافظ عبدالمنان طرزی بی اے آنرز، ایم اے۔ اچھے شاعر اور باشعور مقالہ نگار۔ لہریا سرائے (بہار) میں قیام ہے۔

فضیل جعفری	گورنمنٹ کالج اورنگ آباد (مہاراشٹر) میں انگریزی کے اُستاد۔ نئی نسل کے اہم شاعر اور تنقید نگار۔
رشید الدین	دارالترجمہ حیدرآباد میں مترجم ہیں۔ کافی عرصے سے علمی و ادبی مضامین لکھ رہے ہیں۔
خواجہ تمیم الدین	اُردو کے ایم اے اور ایک اچھے اسکالر۔ اورنگ آباد (مہاراشٹر) میں قیام ہے۔
حامد اللہ ندوی	عرصے تک انجمن اسلام اُردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی میں کام کرتے رہے۔ اب گاندھی میموریل ریسرچ سینٹر میں ہیں۔
مناظر عاشق ہرگانوی	نوجوان قلم کار۔ اُردو کے سب ہی رسائل میں لکھتے ہیں اور ہر موضوع پر لکھنے کی قدرت رکھتے ہیں۔
شمیم کرہانی	اُردو کے نامور شعرا میں شمار ہوتا ہے۔ نظم و غزل دونوں میں اپنا الگ انداز رکھتے ہیں۔ استاد پیشہ ہیں۔ دہلی میں مقیم
احسان دانش	استادانہ درجہ رکھتے ہیں۔ اپنے وقت کے مشہور و مقبول شاعر۔ متعدد شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ لاہور میں قیام ہے۔
رئیس فروغ	پاکستان کے مشہور نوجوان شاعر۔ کراچی میں قیام ہے۔
صبا فتح آبادی	مہر لال سونی صبا فتح آبادی، مشہور و کہنہ مشق شاعر۔ کئی شعری مجموعے چھپ چکے ہیں۔ دررد ٹیکس کے افسر ہیں، اور چند سال سے بمبئی میں مقیم۔
کرشن موہن	تبسم تبسم، دل نادان اور عرفان تین شعری مجموعے اُردو دنیا کو دے چکے ہیں۔ اردو شاعری میں کافی تجربے کئے ہیں۔
ستار اٹاوی	بڑے خوش فکر و خوش انداز غزل گو۔ کہنہ مشق۔ ہندی زبان و ادب سے بھی واقف۔ اُردو میں ایم اے۔ اسلامیہ انٹر کالج اٹاوہ میں لیکچرر۔ مجموعۂ کلام چھپ چکا ہے۔
قمر اقبال	جدید نسل کے اچھے شاعر۔ نظم و غزل دونوں لکھتے ہیں۔ رسائل میں خوب چھپتے ہیں۔
سرشتی پٹیالوی	پنجاب کے شعلہ نفس شاعر ہیں۔ طنز اور بے باکی اُن کا حصّہ ہے۔ چنڈی گڑھ میں ایک بڑی کمپنی انچارج ہیں اور پنجاب کی ادبی و شعری سرگرمیوں میں پیش پیش۔ ہندی اور اردو میں کلام کے دو مجموعے چھپ چکے ہیں۔
شفیق کوثر	اردو کے کہن سال و پختہ مشق شاعر۔ غزلوں کا مجموعہ شائع ہونے والا ہے۔ عرصے سے لاہور میں مقیم ہیں۔
وزیری پانی پتی	پاکستان کے شاعر۔ "نگار پاکستان" کراچی کے نائب مُدیر۔
اویس احمد دوراں	اُردو کے بہت اچھے نوجوان شاعر۔ ایم اے (اُردو) کلکتہ ڈوک میں ملازم۔ شعر و ادب کا اعلیٰ ذوق رکھتے ہیں۔
تسنیم فاروقی	لکھنؤ کے خوش فکر شاعر۔ حالت پر ایک ریڈیائی ڈرامہ بھی لکھا ہے۔
حسیم اکمل قادری	شاہجہاں پور (یوپی) کے بہت اچھا کہنے والے شاعر۔ اُردو زبان و ادب کی مقامی سرگرمیوں میں کھل کر حصّہ لیتے ہیں۔
مفتون کوثری	کوئٹہ (بلوچستان) کے پختہ مشق شاعر۔ بہت سے نثری مضامین بھی رسائل میں لکھے ہیں۔ کوئٹہ کے ادبی حلقوں میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔
اختر بستوی	بستی (یوپی) کے نوجوان لکھنے والے سنجیدہ اور مزاحیہ دونوں قسم کے مضامین لکھ لیتے ہیں۔ شعر بھی کہتے ہیں۔ ایم اے ہیں اور مقامی کالج میں لیکچرر۔
محمد عبد القادر ادیب	(بنگلور (میسور) کے نمایاں لوگوں میں سے ہیں۔ ایل ایل بی ہیں اور وکالت کرتے ہیں۔ منجھے ہوئے شاعر ہیں۔
شیورام دیو لکر	مراٹھی زبان کے نئے شاعروں میں اہم مقام کے مالک۔ بمبئی میں قیام ہے۔
ماجد الباقری	پاکستان کے نوجوان شاعر۔ راولپنڈی میں مقیم ہیں۔
بدیع الزماں خاور	اُردو کے مشہور نوجوان شاعر۔ سریں گوکن سے تعلق رکھتے ہیں۔ مراٹھی پر بھی عبور ہے۔ نظموں کا مجموعہ "امراؤتی" زیر ترتیب و طبع ہے۔
ظہیر کشمیری	پاکستان کے خوش فکر شاعر۔ اقبال اکیڈمی راولپنڈی کے ڈائریکٹر۔ اسحاق ملک۔ حیدرآباد کے نوجوان شاعر۔
خالد شمائل	اُردو کے نوجوان نظم نگار شاعر۔ "سنگ" نظموں کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ عزیز احمد وری، اندور کے نوجوان شاعر۔

صالحہ عابد حسین — اردو کی مشہور و معروف خاتون افسانہ و ناول نگار۔ پچھلے دنوں ان کا ناول "یادوں کے چراغ" شائع ہو کر مقبول ہو چکا ہے۔

ڈاکٹر میمونہ دلوی — ڈاکٹر عبدالستار دلوی کی اہلیہ محترمہ ہیں۔ بہترین ادبی و تنقیدی شعور رکھتی ہیں۔ اسمٰعیل یوسف کالج بمبئی میں پروفیسر تھیں۔

شفیقہ فرحت — گرلز کالج بھوپال میں صدر شعبۂ اردو ہیں۔ بہت اچھا لکھتی ہیں۔ ادبی مضامین کے علاوہ طنزیہ و مزاحیہ خاکے بھی لکھے ہیں۔

رئیسہ شافی — آجکل اردو کی لیکچرر ہیں۔ سیماب کی نظمیہ شاعری پر ڈاکٹریٹ کیلئے اپنا تحقیقی مقالہ آگرہ یونیورسٹی کو دے چکی ہیں۔ اچھے مضامین لکھتی ہیں۔

عفت موہانی — موہان (یوپی) وطن۔ حیدرآباد وطن ثانی۔ عمرانیات کی ایم اے ہیں۔ اچھے افسانے لکھتی ہیں اور وہ معیاری رسائل میں چھپتے ہیں۔

شمیم صادقہ — پٹنہ میں رہتی ہیں، ایم اے کیا ہے۔ نئی لکھنے والی ہیں۔ افسانے اور مضامین لکھتی ہیں اور اچھا لکھتی ہیں۔

رفیعہ شبنم عابدی — پہلے رفیعہ شبنم منیری کے نام سے لکھتی تھیں۔ ایم اے ہیں اور ایک مقامی ہائی اسکول میں پڑھاتی ہیں۔

کنہیا لال کپور — مشہور ہی نہیں، بلکہ اردو کے گنے چنے طنز و مزاح نگار۔ اب لکھنا کم کر دیا ہے مگر جب بھی لکھتے ہیں تو حق ادا کر دیتے ہیں۔

یوسف ناظم — مشہور طنز و مزاح نگار۔ لکھنے کا بالکل الگ ڈھنگ ہے۔ مزاحیہ مضامین کا دوسرا مجموعہ شائع ہونے والا ہے۔ (اسسٹنٹ لیبر کمشنر بمبئی)

فکر تونسوی — بہت جانا پہچانا نام۔ انکا طنز و مزاح مقبول عوام و خواص۔ روزنامہ ملاپ دہلی میں کام کرتے ہیں۔ روزنامہ [illegible]

اعجاز رشید مرزا — دہلوی ہیں۔ ڈپٹی نذیر احمد کے خاندان سے تعلق ہے۔ عرصے سے کلکتے میں مقیم ہیں۔ کم لکھتے ہیں مگر خوب لکھتے ہیں۔

بھارت چند کھنہ — حیدرآباد کے مشہور مزاح نگار۔ ان کی تحریریں پسند کی جاتی ہیں۔ (آئی اے ایس)

نجم عرفانی — نثر و نظم دونوں لکھتے ہیں۔ گورکھپور یونیورسٹی میں اردو نثر پر تحقیقی کام کر رہے ہیں۔

مالک رام — مشہور و ممتاز ادیب، محقق، غالب شناس۔ اردو کی گنی چنی شخصیتوں میں سے ایک ہیں۔ کئی کتابوں کے مصنف۔

ڈاکٹر حامدی کاشمیری — اچھے شاعر، اچھے افسانہ نگار۔ کشمیر یونیورسٹی میں انگریزی کے پروفیسر۔ جموں و کشمیر اکیڈیمی نے انکے ناول "بلندیوں کے خواب" پر ایوارڈ دیا ہے۔

اظہر افسر — اردو کے مستقل ڈرامہ نگار۔ بے شمار ریڈیائی ڈرامے لکھ چکے ہیں۔ "سانولی" انکے ڈراموں کا مجموعہ ہے۔ آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد میں ہیں۔

منجو قمر — اسٹیج ڈراما سے گہری وابستگی رکھتے ہیں۔ انکا ڈرامہ بہادر شاہ ظفر شائع ہو کر مقبول ہو چکا ہے۔ حیدرآباد کے رہنے والے ہیں۔

ابراہیم یوسف — اردو کے مختصر ڈرامہ نگاروں میں ایک اہم نام۔ انکے اسٹیج ڈراموں کو تاریخ اردو فراموش نہیں کر سکتی۔ [illegible] ہائر سکنڈری اسکول کے پرنسپل۔

عمیق حنفی — نئی نسل کے تنقیدی شعور رکھنے والے مشہور شاعر۔ نثر بھی خوب لکھتے ہیں۔ آل انڈیا ریڈیو اندور میں پروگرام ایگزیکٹیو ہیں۔

سید وقار حسین — اندور کی ایک ادبی شخصیت ـــ تسنیم حنفی: نوجوان ادیب و شاعر۔ کریمہ ڈگری کالج میں اردو کے استاد۔

ڈاکٹر محمد حسن — مشہور ادیب و نقاد و ڈرامہ نگار۔ دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں ریڈر ہیں۔ ان کا متوازن انداز فکر و تحریر پسند کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر قمر رئیس — اردو کے نوجوان ادیب۔ پریم چند پر کافی کام کیا ہے۔ دہلی یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے استاد ہیں۔ تلاش و توازن کے مصنف۔

ڈاکٹر شارب ردولوی — اردو کے اچھے ادیبوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ دیال سنگھ کالج دہلی میں لیکچرر ہیں۔ انکی نئی کتاب جدید اردو تنقید شائع ہوئی ہے۔

شہاب جعفری — نئے شعراء میں اہم مقام کے حامل ہیں۔ کلام کا مجموعہ "سورج کا شہر" شائع ہو چکا ہے۔ خالصہ کالج دہلی میں اردو کے استاد ہیں۔

احمر لاری — گورکھپور یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں لیکچرر ہیں۔ حسرت موہانی پر اپنا تحقیقی مقالہ یونیورسٹی میں داخل کر چکے ہیں۔

ڈاکٹر گیان چند — اردو کی ایک اہم شخصیت۔ مثنوی پر گرانقدر کام کیا ہے۔ نقد و تحقیق میں اچھی نظر رکھتے ہیں۔ صدر شعبۂ اردو جموں و کشمیر یونیورسٹی۔

اعجاز صدیقی — ڈرتا ہے "آئینے سے کہ ... ہے" (غالب)

ڈاکٹر دھرم ویر بھارتی — مشہور ہندی رسالہ "دھرم یگ" بمبئی کے ایڈیٹر۔ ادیب، شاعر، افسانہ نگار، نقاد، یوپی کے رہنے والے، دل چال کی [illegible]

نارائن سروے — مراٹھی کے مشہور ترقی پسند ادیب و شاعر۔ انکے دوسرے مجموعۂ کلام "ماجھے ودیاپیٹھ" پر حکومت مہاراشٹر نے انعام و ایوارڈ دیا۔

کیشو میشرام — مراٹھی زبان کے مشہور تنقید نگار اور شاعر ہیں۔ مہاراشٹر ودیالیہ کالج بمبئی میں مراٹھی کے لیکچرار ہیں۔

دنو بیرکار — مراٹھی ادب کو اردو میں منتقل کر کے اپنا ایک مقام بنا چکے ہیں۔ حال ہی میں انکی ترجمہ شدہ مراٹھی کہانیوں کی کتاب [illegible] بمبئی سے چھپی ہے۔

احتشام حسین — چوٹی کے نقاد، مشہور و ممتاز ترقی پسند ادیب۔ الہ آباد یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے صدر۔ کئی کتابوں کے مصنف۔



غالب

نام	ناشر یا مطبع	سنہ	صفحات
	دیوانِ اردو		
دیوان غالب	مطبع دارالسلام دہلی	۱۸۴۷ء	
دیوان غالب	نولکشور پریس لکھنؤ	۱۸۶۳ء	۱۰۳
دیوان غالب	نولکشور پریس لکھنؤ	۱۸۷۷ء	۱۰۳
دیوان غالب	نولکشور پریس (بار چہارم)	۱۸۷۷ء	؟
دیوان غالب	مطبع نظامی کانپور	۱۸۶۱ء	۱۰۴
دیوان غالب	مطبع میسور پریس دہلی	۱۸۸۲ء	۷۲
دیوان غالب	نولکشور لکھنؤ	۱۸۸۳ء	۱۰۳
دیوان غالب	مطبع نامی لکھنؤ	۱۸۸۷ء	۵۴
دیوان غالب	مطبع منشی نولکشور کانپور	۱۸۸۷ء	؟
دیوان غالب	مطبع نامی لکھنؤ	۱۹۰۱ء	۷۲
دیوان غالب	مطبع منشی نولکشور	۱۹۰۳ء	۱۰۴
دیوان غالب	مفید عام پریس لاہور	۱۹۰۵ء	۱۰۳
دیوان غالب	مفید عام پریس لاہور	۱۹۱۲ء	۱۰۴
دیوان غالب	مطبع مجیدی کانپور	۱۹۱۴ء	۱۲۰
دیوان غالب	مطبع نامی لکھنؤ	۱۹۱۴ء	۱۱۶
دیوان غالب	مطبع منشی نولکشور	۱۹۱۴	۱۰۴
دیوان غالب	مفید پریس لاہور	۱۹۱۹ء	۱۲۲
دیوان غالب	گلزار محمدی اسٹیم پریس لاہور	۱۹۱۹ء	۲۵۲
دیوان غالب (نسخۂ حمیدیہ)	مفید عام اسٹیم پریس آگرہ	۱۹۲۱ء	۳۴۲+۱۴۵
دیوان غالب (نسخۂ حمیدیہ)	مفید عام اسٹیم پریس آگرہ	۱۹۲۱ء	۳۴۲+۲۴
دیوان غالب	مطبع مجیدی کانپور	۱۹۲۲ء	۶۰
دیوان غالب	فیروز پرنٹنگ ورکس لاہور	۱۹۲۳ء	[illegible]
دیوان غالب	نظامی پریس بدایوں	۱۹۲۳ء	۲۴+۱۴۰
دیوان غالب	نولکشور پریس لکھنؤ	۱۹۲۵ء	۱۵۶
دیوان غالب	مطبع مجیدی کانپور	۱۹۲۶ء	[illegible]
دیوان غالب	(مرقع چغتائی) لاہور	۱۹۲۸ء	
دیوان غالب مصور (مرقع چغتائی)	اورینٹل آرٹ پرنٹنگ پریس لاہور	۱۹۲۸ء	
دیوان غالب	نامی پریس لکھنؤ	۱۹۳۴ء	۱۲۸
دیوان غالب مصور (نقشِ چغتائی)	جہانگیر بک کلب چابک سواراں، لاہور	۱۹۳۵ء	؟
دیوان غالب عکسی	لیبل آرٹ پریس دہلی	۱۳۵۵ھ ۱۹۳۶ء	۱۴۷
دیوان غالب	تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور	۱۹۳۸ء	۳۱۲
دیوان غالب	تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور	۱۹۳۸ء	۳۱۲ (چھوٹا سائز)
دیوان غالب تاج ایڈیشن	تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور	۱۹۳۸ء	
دیوان غالب	مطبع منشی نولکشور لکھنؤ	۱۹۴۳ء	۱۶۰
دیوان غالب	مطبع منشی نولکشور لکھنؤ	۱۹۴۴ء	[illegible]
دیوان غالب	نیشنل پریس الہ آباد	۱۹۴۶ء	[illegible]
دیوان غالب	مطبع منشی نولکشور لکھنؤ	۱۹۴۷ء	[illegible]
دیوان غالب	مطبع منشی تیجکمار لکھنؤ	۱۹۵۱ء	[illegible]
دیوان غالب	راجہ رام کمار پریس لکھنؤ	۱۹۵۲ء	۱۵۸
دیوان غالب	نیشنل پریس الہ آباد	۱۹۵۵ء	۱۲۸
دیوان غالب	آزاد کتاب گھر کلاں محل دہلی	۱۹۵۷ء	۳۵۹
دیوان غالب	راجہ رام کمار پریس لکھنؤ	۱۹۵۷ء	۱۵۸

نام	مطبع یا ناشر	سنہ	صفحات
دیوان غالب	اسرار کریمی پریس الہ آباد	۱۹۵۸ء	۲۷۲
دیوان غالب	یونین پریس دہلی	۱۹۵۸ء	۲۳۷
دیوان غالب مصور عکسی	مکتبہ شاہراہ جدید پریس دہلی	۱۹۵۸ء	[illegible]
دیوان غالب اردو ہندی	ہندوستانی بک ٹرسٹ بمبئی	۱۹۵۸ء	۳۷۱+۸۱
دیوان غالب نسخہ عرشی	انجمن ترقی اردو (ہند) علیگڑھ	۱۹۵۸ء	۹۳۲
دیوان غالب	مطبوعہ تیج کمار پریس لکھنؤ	۱۹۵۹ء	۱۶۰
دیوان غالب	راجہ رام کمار پریس لکھنؤ	۱۹۶ء	۱۵۸
دیوان غالب	نیشنل فائن پرنٹنگ پریس [illegible]	۱۹۶۰ء	۱۶۰
دیوان غالب	مشورہ بک ڈپو دہلی	۱۹۶۰ء	۱۴۸
دیوان غالب	مشورہ بک ڈپو دہلی	۱۹۶۱ء	۱۴۳
مرقع غالب	لکشمی پرنٹنگ پریس دہلی	۱۹۶۶ء	۱۴۴+۱۹۲
دیوان غالب عکسی	آزاد بک ڈپو دہلی	؟	۱۴۷
دیوان غالب	ابوالعلائی اسٹیم پریس آگرہ	۱۹۲۵ء	۱۹۰
دیوان غالب	ابوالعلائی پریس، آگرہ		۵۶ تک
دیوان غالب	مطبع فاروقی دہلی		۹۶
غالب (ہندی)	معیار کو پرنٹنگ ورکس لکھنؤ		۱۶۰
دیوان غالب	پاپولر بک ایجنسی امرتسر		۱۲۸
دیوان غالب	تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور		۳۱۲
دیوان غالب	تعلیمی پریس لاہور		۱۵۸
دیوان غالب	مہالکشمی پریس دہلی		۸۸
دیوان غالب	دلیپ سیوک پریس دہلی		۱۴۷
[illegible]	بمبئی پریس آگرہ		۷۲
دیوان غالب	اسرار کریمی پریس الہ آباد		۱۶۰
دیوان غالب	علمی پرنٹنگ پریس لاہور		۹۶
دیوان غالب	شیخ ظفر محمد اینڈ سنز لاہور		۱۱۲
دیوان غالب	فرید اینڈ کو یونین پریس دہلی		[illegible]
دیوان غالب	مطبع قیومی کانپور		[illegible]
دیوان غالب	مرغوب ایجنسی لاہور		۳۳۲

نام	مطبع یا ناشر	سنہ	صفحات
دیوان غالب	نیو تاج آفس دہلی		[illegible]
دیوان غالب	جہانگیر بک ڈپو		
دیوان غالب	مطبع مجیدی کانپور		
اشعار غالب	نیشنل پریس الہ آباد	۱۹۴۴ء	[illegible]
ارمغان غالب منتخب نظم	مرکنٹائل پریس لاہور		[illegible]
انتخاب دیوان غالب	رئیس المطابع کانپور	۱۹۲۹ء	۱۸۹
انتخاب غالب	مطبع قیمہ بمبئی	۱۹۴۲ء	۳۴۴
انتخاب غالب	اردو اکیڈمی سندھ کراچی	۱۹۵۷ء	[illegible]
انتخاب دیوان غالب	مسلم ایجوکیشنل پریس علیگڑھ		۱۸۰
باقیات غالب	نسیم بک ڈپو لکھنؤ	۱۹۶ء	۱۹۴
درس غالب	حجازی پریس لاہور	۱۹۳۸ء	۱۹۹
غالب و مومن	اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد	۱۳۶ھ	۸۸
دیوان غالب	مطبع آفتاب پریس	۱۳۴۵ھ / ۱۹۲۷ء	۲۷۹
دیوان غالب	آزاد کتاب گھر دہلی		۲۳۹
غالب کے سوا سو شعر	مکتبہ نظامیہ بھوپال	۱۹۴۵ء	
غالب کے سو شعر	یونین پرنٹنگ پریس دہلی	۱۹۵۹ء	۳۲
غالب کے سو شعر	مرتبہ محمود علی جامعی	(تقطیع خورد)	۲۷
غالب کے بہترین سو شعر	ناشر سعید کتاب خانہ بمبئی	"	[illegible]

TRANSLATION INTO BENGALI — TEN GEMS FROM GHALIB
BY RAJA RAO DHIRENDRA — NARAY ROY SIZE 7 × 5

نام	مطبع یا ناشر	سنہ	صفحات
انتخاب کلام غالب	انوار المطابع لکھنؤ	؟	[illegible]
انتخاب غالب	فوٹو آرٹ پریس لاہور	؟	۳۲

کلیات نظم فارسی

نام	مطبع یا ناشر	سنہ	صفحات
کلیات غالب (نظم)	مطبع دارالسلام شاہجہان آباد	۱۸۴۵ء	۳+۵ ۲
کلیات غالب (فارسی)	مطبع منشی نولکشور لکھنؤ	۱۸۶۳ء	۵۶۲
کلیات غالب (فارسی نظم)	مطبع نولکشور لکھنؤ (بار دوم)	۱۸۷۲ء	۵۵۶

نام	مطبع یا ناشر	سنہ	صفحات
کلیات غالب (فارسی نظم)	مطبع نولکشور لکھنؤ	۱۹۲۴ء	۵۲۴
کلیات غالب (فارسی ـ نظم)	مطبع نولکشور لکھنؤ	۱۹۲۳ء	۵۲۴
کلیات غالب (فارسی ـ نظم)	مطبع نولکشور لکھنؤ	۱۹۲۵ء	۵۲۰
باغ دو در	اورینٹل کالج میگزین لاہور	۱۹۶۰-۶۱ء	۱۸۸
سبد چین	مکتبۂ جامعہ نئی دہلی	۱۹۳۸ء	۸۰
دعای صباح	مطبع نولکشور		۲۶
دعای صباح	نظامی پریس بدایوں	۱۹۵ء	۱۱
[illegible]	صفدر پریس		۴۰

کلیات نثر غالب (فارسی)

نام	مطبع یا ناشر	سنہ	صفحات
کلیات نثر غالب	مطبع منشی نولکشور	۱۸۶۸ء	۲۱۲
کلیات نثر غالب	مطبع منشی نولکشور	۱۸۷۱ء / ۱۲۸۸ھ	۴۱۷
کلیات نثر غالب	مطبع منشی نولکشور	۱۸۷۲ء	۵۵۶
کلیات نثر غالب	مطبع منشی نولکشور کانپور	۱۸۷۵ء	۴۱۳
کلیات نثر غالب	مطبع منشی نولکشور	۱۸۸۴ء	۴۱۷
کلیات نثر غالب	مطبع منشی نولکشور	۱۸۸۸ء	۴۱۷
دستنبو	مطبع مفید خلائق آگرہ	۱۸۵۸ء	۸۰
[illegible]	مطبع لٹریری سوسائٹی بریلی	۱۸۷۱ء	۶۱
مہر نیمروز	فخر المطابع	۱۲۷۱ھ / ۱۸۵۵ء	۱۱۶
مہر نیمروز	فخر المطابع	۱۲۷۱ھ	۱۱۸
مہر نیمروز	مطبع نولکشور لکھنؤ	۱۹۱۵ء	۱۶۳
مہر نیمروز	روشنی پرنٹنگ ورکس لاہور	۱۹۲۵ء	۱۳۲
پنج آہنگ	(قلمی)	سائز ۱۱×۶½	
پنج آہنگ	مطبع دار السلام دہلی	۱۸۵۳ء	۴۴

قاطع برہان و قضیۂ برہان

نام	مطبع یا ناشر	سنہ	صفحات
قاطع برہان ـ (درفش کاویانی)	اکمل المطابع دہلی	۱۸۸۱ء	۱۵۴
قاطع برہان ـ درفش کاویانی	اکمل المطابع دہلی	۱۸۸۲ء	۱۵۴
(قاطع برہان) (درفش کاویانی)	(قلمی)		
قاطع برہان	مطبع نولکشور	۱۲۷۸ھ / ۱۸۶۱ء	۹۸
دافع ہذیان	اکمل المطابع دہلی	۱۲۸۱ھ / ۱۸۶۴ء	۲۸
ساطع برہان	مطبع ہاشمی	۱۲۸۰ھ / ۱۸۶۳ء	۱۷۴
قاطع القاطع	مطبع مصطفائی	۱۲۸۳ھ / ۱۸۶۶ء	۲۶۰
لطائف غیبی	اکمل المطابع دہلی	۱۲۸۱ھ / ۱۸۶۴ء	۹۲
محرق قاطع برہان	مطبع احمدی دہلی	۱۲۸ھ / ۱۸۶۳ء	[illegible]
مؤید برہان	مطبع مظہر العجائب کلکتہ	۱۲۸۲ھ / ۱۸۶۵ء	۴۷۵
نامۂ غالب			۱۶

خطوط غالب

نام	مطبع یا ناشر	سنہ	صفحات
اردوی معلی	اکمل المطابع دہلی	۱۸۶۹ء	۴۱۴
اردوی معلی	اکمل المطابع دہلی	۹۸۹۱	۳۹۲
اردوی معلی اول دوم	مطبع مجتبائی دہلی	۱۸۹۹ء	۳۴۷ + ۵۱
اردوی معلی اول دوم	مطبع نامی مجتبائی دہلی	۱۸۹۹ء	۳۸۴ + ۶۴
اردوی معلی اول دوم	مطبع مفید عام آگرہ	۱۹۱۴ء	۳۴۴ + ۳
اردوی معلی اول دوم	انوار المطابع لکھنؤ	۱۹۲۲ء	۲۵۶ + ۴۳
اردوی معلی اول	مطبع فاروقی دہلی	۱۹۰۸ء	۶۴
اردوی معلی اول	مطبع فاروقی دہلی		۳۴۴ + ۵۶
اردوی معلی اول دوم	مطبع مجیدی کانپور	۱۹۲۲ء	۳۸۴
اردوی معلی اول دوم	مطبع مجیدی کانپور	۱۹۲۲ء	۳۷۰
اردوی معلی	مطبع مجیدی کانپور	۱۹۲۲ء	۱۱۲
عود ہندی	مطبع مجتبائی میرٹھ	۱۲۸۵ھ / ۱۸۶۷	۱۸۸
عود ہندی	مطبع نادری دہلی	۱۸۷۹ء / ۱۲۹۵ھ	۱۸۸

نام	مطبع یا ناشر	سنہ	صفحات
محمود ہندی	مطبع نولکشور	۱۸۸۶ء	۱۸۲
محمود ہندی	مطبع نولکشور کانپور	۱۳۰۴ھ / ۱۸۸۷ء	۱۸۲
محمود ہندی	مطبع نولکشور کانپور	۱۹ ء	۱۸۲
محمود ہندی	مطبع مسلم یونیورسٹی		
	انسٹی ٹیوٹ علی گڈھ	۱۹۲۴ء	۱۸۶
محمود ہندی	مطبع نولکشور	۱۹۲۵ء	۱۸۴
[illegible]	مطبع مسلم یونیورسٹی علیگڈھ	۱۹۲ ء	۱۸۶
[illegible]	عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور		۱۹۹
محمود ہندی	مطبع کریمی لاہور		۱۸۷
[illegible]	نیشنل پریس الہ آباد	۱۹۲۸ء	۳۱۸
محمود ہندی	نیشنل پریس الہ آباد	۱۹۲۹ء	۳۱۹
محمود ہندی	منشی نولکشور لکھنو	۱۹۳۱ء	۲۶۸
محمود ہندی	راجہ رام کمار پریس لکھنو	۱۹	۲۶۸
محمود ہندی	مطبع انوار احمدی الہ آباد	۱۹۲۴ء	
محمود ہندی،	کوآپریٹیو کیپیٹل پرنٹنگ پریس لاہور		۲۵۴
[illegible]	مطبع منشی نولکشور کانپور		
مکاتیب غالب	مطبع قیمہ بمبئی	۱۹۳۷ء	۱۸۳
مکاتیب غالب	مطبع سرکاری ریاست رامپور	۱۹۴۳ء	۱۱۶+۲۲۹+۴۸
مکاتیب غالب	ناظر ترقی پریس	۱۹۴۵ء	۱۹۲+۲۲۸
(اول ودوم)			
مکاتیب غالب	(طبع چہارم) صفحہ ۴۴، ۲۵-۱۱۸		۲۰۵
مکاتیب غالب	(بار ششم)	۱۹۴۹ء	۲۵۴
خطوط غالب پہلی جلد	ہندوستانی پریس الہ آباد	۱۹۴۱ء	۴۰۷
خطوط غالب			
(حصہ اول ودوم)	مطبوعہ پاکستان ٹائمز پریس		۴۲۶+۳۶۱
خطوط غالب	مطبوعہ علمی پرنٹنگ پریس لاہور		۶۵۶
(حصہ اول ودوم)			
خطوط غالب	سرفراز قومی پریس لکھنو	۱۹۶۲ء	۴۴۷
ادبی خطوط غالب	نظامی پریس لکھنو	۱۹۲۹ء	۳۴

نام	مطبع یا ناشر	سنہ	صفحات
ادبی خطوط غالب	انوار المطابع لکھنو	۱۹۳۸ء	۳۵
رقعات غالب	دین محمد الیکٹرک پریس لاہور	۱۹۳۷ء	۱۲۸
انتخاب خطوط غالب	الشا پریس لاہور	۱۹۵۲ء	۱۹۲
غالب کے خطوط	سیکو آفسٹ پریس دہلی	۱۹۶۱ء	۱۴
مکاتیب الغالب	مسلم یونیورسٹی پریس علیگڈھ		۲۲۸
ضمیمہ مکاتیب غالب	کوآپریٹیو کیپیٹل پرنٹنگ پریس لاہور		۵۲
انشائی نوچشم	مطبع نظامی کانپور	۱۸۸۱ء	
انشائی اردو	مطبع مفید عام لاہور	۱۸۸۹ء	۵۲
انشائی اردو	سرکاری مطبع لاہور	۱۸۸ ء	۵۴
رقعات غالب	وزیر ہند اسٹیم پریس امرتسر	۱۹۱۴ء	۵۸
نادر خطوط غالب	حاتمی پریس لکھنو	۱۹۳۹ء	۶۲
نادرات غالب	مشہور پریس کراچی	۱۹۴۹ء	۱۸۰-۱۶
انتخاب غالب	دین محمدی پریس لاہور		۴۸
مرقع ادب	عثمانی پریس لکھنو		۱۷

متفرق تصانیف

نام	مطبع یا ناشر	سنہ	صفحات
قادر نامہ	مطبع نظامی کانپور	۱۸۸ء / ۱۲۹۵ھ	۱۲
قادر نامہ	مطبع فیض محمدی لکھنو	۱۸۹۲ء	۱۲
قادر نامہ	ہلالی اسٹیم پریس ساڈھورہ	۱۹ ۷ء	۱۶
قادر نامہ	الوالعلائی الیکٹرک پریس	۱۹۲۷ء	۱۶
قادر نامہ	فیروز پرنٹنگ ورکس لاہور		۸
قادر نامہ	مطبع جان جہاں دہلی		۸
قادر نامہ	مطبع قیومی کانپور	۱۳۳۰ء	۱۶
متفرقات غالب	ہندوستانی پریس رامپور	۱۹۴۷ء	۱۸۵

احوالِ غالب

آثار غالب۔ شیخ محمد اکرام ناشر تاج آفس بمبئی۔ ۳۷۶

احوالِ غالب، مختار الدین آرزو۔ دہلی پرنٹنگ ورکس دہلی ۱۹۵۳ء۔ ۲۹۰

حکیم فرزانہ، شیخ محمد اکرام۔ فیروز پرنٹنگ ورکس لاہور۔ ۱۹۵۷ء ۳۲۴

نام	مصنف اور مطبع	سنہ	صفحات

حیاتِ غالب، شیخ محمد اکرام۔ فیروز سنس لاہور ۳۴۷

حیاتِ غالب علم الدین سالک و آغا سید احمد دین محمدی پریس لاہور۔ ۸۰

حیاتِ غالب، سید محمد مرزا موج۔ نگارستان پریس لکھنؤ سنہ ۱۸۹۹ء۔ ۳۲

ذکرِ غالب، مالک رام۔ جید برقی پریس دہلی۔ سنہ ۱۹۳۸ء۔

ذکرِ غالب، مالک رام۔ جید برقی پریس دہلی۔ بار دوم۔ سنہ ۱۹۵۰ء۔ ۲۳۲

ذکرِ غالب، مالک رام۔ یونین پرنٹنگ پریس دہلی۔ بار سوم۔ سنہ ۱۹۵۵ء ۲۸۴

ذکرِ غالب مالک رام۔ کوہِ نور پرنٹنگ پریس دہلی۔ بار چہارم سنہ ۱۹۶۴ء ۳۶۵

روحِ کلامِ غالب ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور۔ مکتبہ ابراہیمیہ مشین
پریس حیدرآباد۔ سنہ ۱۹۳۹ء۔ صفحات ۱۷۵

سرگذشتِ غالب، سید محی الدین قادری زور۔ مکتبہ ابراہیمیہ مشین
پریس حیدرآباد۔ سنہ ۱۹۳۹ء۔ ۶۴

سرگذشتِ غالب، میرزا محمد عسکری۔ عزیزی پریس آگرہ سنہ ۱۹۴۲ء۔ ۹۶

غالب، غلام رسول مہر۔ مسلم پرنٹنگ پریس لاہور سنہ ۱۹۳۶ء۔ ۳۷۹

غالب غلام رسول مہر۔ عوامی پریس لاہور۔ دوسرا ایڈیشن۔ ۴۸۳

غالب۔ غلام رسول مہر۔ عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور ناشر شیخ مبارک علی
طبع چہارم۔ سنہ ۱۹۴۶ء۔ ۴۸۔

غالب نامہ، شیخ محمد اکرام۔ مرکنٹائل پریس لاہور۔ ناشر قومی کتب خانہ
لاہور۔ سنہ ۱۹۳۶ء۔ صفحہ ۴۱۵ ۲۲۳

غالب نامہ شیخ محمد اکرام۔ مرکنٹائل پریس لاہور۔ ناشر تاج کمپنی لمیٹڈ
لاہور۔ سنہ ۱۹۳۹ء۔

غالب نامہ شیخ محمد اکرام۔ چوتھا ایڈیشن۔ تاج آفس بمبئی۔ صفحہ ۴۱۴

مقامِ غالب سید مبارز الدین رفعت۔ سب رس کتاب گھر حیدرآباد ۱۰

نکاتِ غالب، نظامی پریس بدایوں۔ ۶۸

یادگارِ غالب خواجہ الطاف حسین حالی۔ نامی پریس کانپور۔
پہلا ایڈیشن۔ ۴۴۰

یادگارِ غالب، خواجہ الطاف حسین حالی۔ مطبع کریمی لاہور
سنہ ۱۹۲۷ء ۴۵۴

یادگارِ غالب، خواجہ الطاف حسین حالی۔ مطبع کریمی لاہور سنہ ۱۹۳ء صفحہ ۳۹۲

یادگارِ غالب، خواجہ الطاف حسین حالی۔ عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور

نام	مصنف اور مطبع	سنہ	صفحات

۱۹۳۲ء ۱۷۶

یادگارِ غالب، خواجہ الطاف حسین حالی شاہی پریس الٰہ آباد سنہ ۱۹۳۶ء ۴۱۰ ۲

یادگارِ غالب، خواجہ الطاف حسین حالی۔ شاہی پریس الٰہ آباد۔
سنہ ۱۹۵۸ء سنہ ۱۹۵۹ء ۴۱۰ ۳۹۲

یادگارِ غالب، خواجہ الطاف حسین حالی مطبع فیض عام علی گڑھ

یادگارِ غالب، خواجہ الطاف حسین حالی مطبع مسلم یونیورسٹی علیگڑھ صفحہ ۳۹۲

آبِ حیات، محمد حسین آزاد۔ وکٹوریہ پریس لاہور سنہ ۱۸۸۳ء طبع ثانی صفحہ ۵۶۴

آبِ حیات محمد حسین آزاد۔ مطبع کریمی لاہور۔ طبع یازدہم۔ صفحہ ۵۵۹

آثار الصنادید، سرسید احمد خاں۔ مطبع نولکشور لکھنؤ سنہ ۱۸۷۶ء
ص ۹۸، ۲۲، ۳۲، ۱۳۲۔

غالب کا روزنامچہ، حسن نظامی نورجہاں آرٹ پریس دہلی سنہ ۱۹۴۴ء

شرحِ کلامِ غالب

شرحِ کلامِ غالب عبدالباری آسی۔ صدیق بکڈپو لکھنؤ بار دوم۔

شرحِ کلامِ غالب، عبدالباری آسی۔ اشاعت علوم پریس لکھنؤ
صفحہ ۳۱۸

مطالعۂ غالب، اثر لکھنوی سرفراز قومی پریس لکھنؤ سنہ ۱۹۵۲ء
صفحہ ۱۱۲

دیوانِ غالب مع شرح و سوانح احسان دانش۔ فاروقی پریس
دہلی۔ تیسرا ایڈیشن۔ صفحہ ۴۱۶

جانِ غالب (انتخاب و شرح دیوان) العام اللہ خاں العام
تاج کمپنی لاہور۔ صفحہ ۹۶

بیانِ غالب، آغا محمد باقر۔ آزاد بک ڈپو امرتسر۔ صفحہ ۶۴۸

بیانِ غالب، شرح دیوان غالب عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور
بار چہارم سنہ ۱۹۴۶ء۔ صفحہ ۶۰۸

بیانِ غالب عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور سنہ ۱۹۴۷ء۔ صفحہ ۶۴۸

بیانِ غالب شرح دیوان غالب لاہور۔ بار پنجم سنہ ۱۹۵۴ء صفحہ ۶۴۸

مرآۃ الغالب، بیخود دہلوی۔ محبوب المطابع دہلی۔ صفحہ ۳۴۵

مرآۃ الغالب بیخود دہلوی۔ تاج پریس کلکتہ۔ طبع چہارم

دیوان غالب مع شرح، جوش ملسیانی۔ مرکنٹائل پریس دہلی
بار اول۔ صفحہ ۲۲۵

دیوان غالب مع شرح، آتما رام اینڈ سنز دہلی ۱۹۵۱ء
بار سوم۔ صفحہ ۲۲۵

شرح دیوان غالب، چشتی۔ عشرت پبلشنگ ہاؤس لاہور
۱۹۵۹ء۔ صفحہ ۸۵۲

... مع دیوان غالب، حسرت موہانی۔ اردو پریس
علی گڈھ ۱۹۱۱ء۔ طبع سوم۔ صفحہ ۱۵۸

شرح دیوان غالب مع دیوان غالب، الناظر پریس لکھنؤ
۱۹۱۶ء۔ صفحہ ۱۴۶

مطالب الغالب۔ شرح دیوان غالب: مولانا سہا۔
۔ صفحہ ۳۹۹

مطالب الغالب: دین محمدی اسٹیم پریس لاہور ۱۹۲۳ء
صفحہ ۳۹۹

... غالب، سید شہاب الدین مصطفےٰ۔ نیشنل فائن آرٹ
پرنٹنگ پریس حیدرآباد ۱۹۵۶ء۔ صفحہ ۴۶۴

روح المطالب فی شرح دیوان غالب، شاداں بلگرامی۔
مظفر پرنٹرز لاہور ۱۹۶۷ء۔ صفحہ ۶۱۹

فرہنگ غالب، امتیاز علی خاں عرشی۔ ناظم پریس رام پور
۱۹۴۷ء صفحہ ۲۹۷

... کلیات اردو میرزا غالب دہلوی، شوکت میرٹھی۔ مطبع شحنۂ ہند
۱۳۱۷ھ۔ صفحہ ۱۴۶

... سید حیدر علی طباطبائی۔ مطبع مفید الاسلام
حیدرآباد۔ ۱۳۱۸ھ صفحہ ۲۲۸

شرح دیوان غالب۔ نول المطابع لکھنؤ۔ بار چہارم۔ صفحہ ۳۶۸

تشریح کلام غالب، طباطبائی۔ ۳۴۸

دیوان غالب مع شرح و مقدمہ ڈاکٹر قاضی سعید الدین احمد۔
مسلم یونیورسٹی پریس علیگڈھ ۱۹۲۶ء۔ صفحہ ۴۸۵

روح کلام غالب المعروف بہ تفسیر کلام غالب۔ مرزا ظفر بیگ۔
نظامی پریس بدایوں۔ ۱۹۳۵ء۔ صفحہ ۲۵۲
(باقی آئندہ شمارہ میں)

بقیہ صفحہ ۹۹ سے غالب کی کہانی

کی آخری سانسوں کے ساتھ چھپ کر تیار ہوئے۔ اہل ذوق کی طلب ... مرزا کی مرضی کے برخلاف انہیں جمع کیا جانے لگا تو خود بھی ہاتھ بٹانے پر آمادہ ہو گئے۔ اور یوں وہ دولت بے بہا محفوظ ہو گئی جو عین ممکن تھا کہ سیکڑوں غیر مطبوعہ اشعار کی طرح ضائع ہو جاتی۔

... ویں صدی کا یہ عظیم مفکر شاعر۔ جو ہندوستان میں فارسی شاعری کی پانچ صدیوں کی وراثت کا بار اپنے شانوں پر اٹھائے ... تھا اور جس نے اپنا بہترین اردو حصہ دانستہ اور نادانستہ ... پرگل کوچوں میں ابھرتی ہوئی زبان اردو کے سپرد کر دیا تھا ... اور روحانی مصائب سے نڈھال ہر وقت اپنی موت کی پیشین گوئیاں اور آرزوئیں کرتا رہا۔ بالآخر اس کی ایک پیشین گوئی صحیح ... اور وہ ۱۸۶۹ء کی ۱۵ فروری کو یہ اطمینان اور حسرت لے کر دنیا سے کوچ کر گیا کہ ؎

اوراق زمانہ در نوشتیم و گزشت
در فن سخن نگار گشتیم و گزشت
بے بود دولے ما سر پیری غالب
زاں پیر یہ ما کام گرسنیم و گزشت

بیان ملکیت و جملہ تفصیلات شاعر بمبئی فارم ۴ رول ۸

۱۔ مقام اشاعت: بمبئی ۲۔ وقفۂ اشاعت: ماہانہ
۳۔ پرنٹر: اعجاز صدیقی
۴۔ پبلشر۔ اعجاز صدیقی ۵۔ قومیت: ہندستانی
۶۔ ایڈیٹر: اعجاز صدیقی۔ مہندر ناتھ
۷۔ قومیت: ہندوستانی
۸۔ پتہ: ۱۲۰۔ دیاتھو بلڈنگ، تیسرا مرلہ، فاکلینڈ روڈ بمبئی ۴
۹۔ ملکیت: اعجاز صدیقی

میں اعجاز صدیقی اعلان کرتا ہوں کہ مندرجۂ بالا تفصیلات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں۔
۲۸ فروری ۱۹۶۹ء ۲۸ فروری ۱۹۶۹ء (دستخط) اعجاز صدیقی

پرنٹر پبلشر اور مالک اعجاز صدیقی نے یونیورسل فائن آرٹ پریس ۲۳ تورو جی اسٹریٹ ٹھاکر دوار بمبئی ۲ میں چھپوا کر وہیں سے شائع کیا۔

“The Heights To Which Can Soar The Wings Of Thought”

So sang Iqbal of the Greatness of

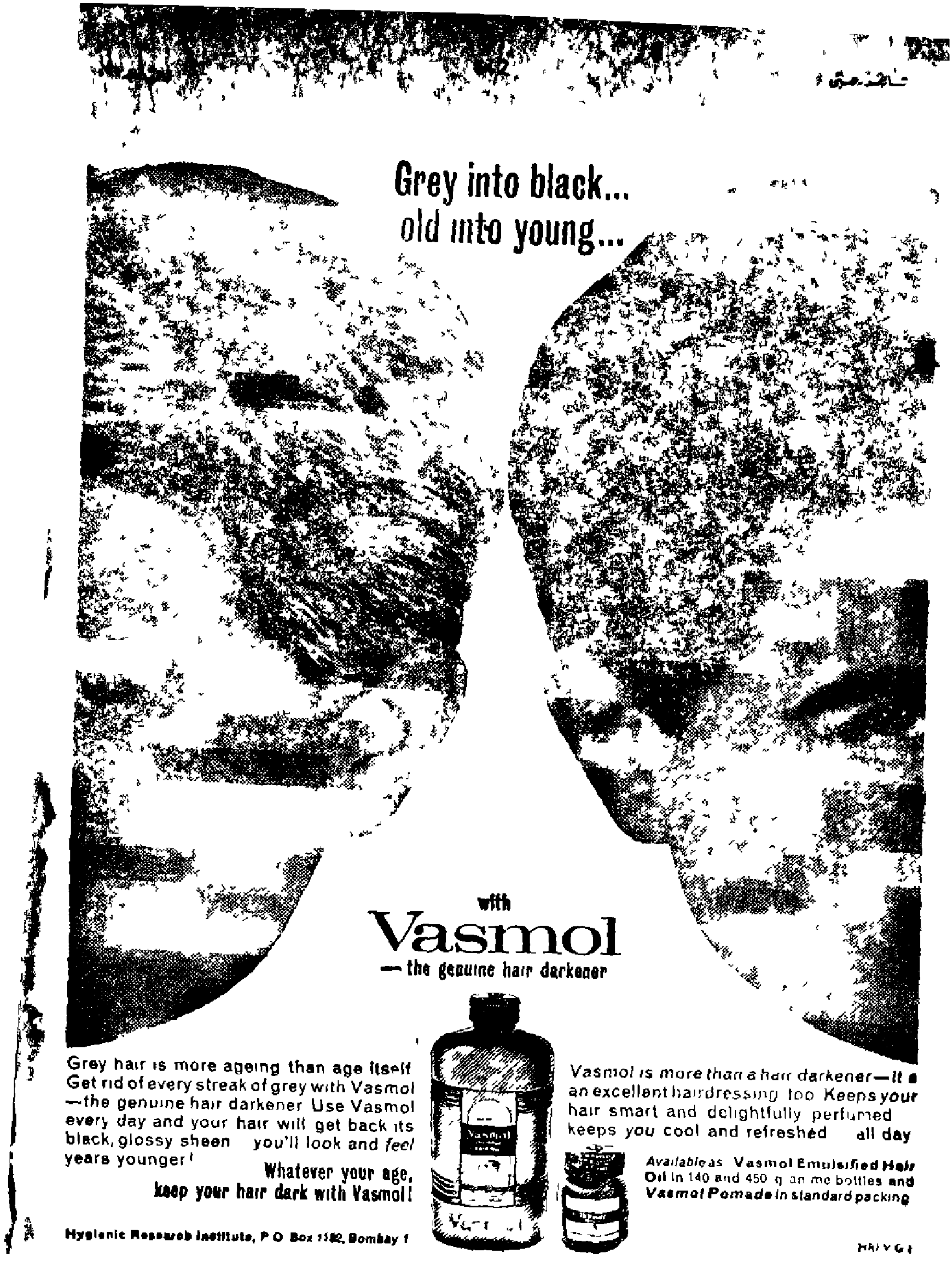
Ghalib



We join a whole world of admirers in celebrating the Centenary of the Immortal Urdu poet, Mirza Ghalib. In commemoration of the Centenary we are happy to release a special Eagle flask-Model "Ghalib"—a vacuum flask of great beauty and rare distinction.

EAGLE VACUUM BOTTLE MFG. CO. PVT. LTD.

144/46, SHERIFF DEVJI STREET, BOMBAY 3.


Grey into black...
old into young...
with
Vasmol
— the genuine hair darkener
Grey hair is more ageing than age itself Get rid of every streak of grey with Vasmol —the genuine hair darkener Use Vasmol every day and your hair will get back its black, glossy sheen you'll look and feel years younger!
Whatever your age,
keep your hair dark with Vasmol!
Vasmol is more than a hair darkener—it is an excellent hairdressing too Keeps your hair smart and delightfully perfumed keeps you cool and refreshed all day
Available as Vasmol Emulsified Hair Oil in 140 and 450 q an mc bottles and Vasmol Pomade in standard packing
Hygienic Research Institute, P O Box 1182, Bombay 1
HRI VG 1

KASHMIR ABOUNDS IN HOLIDAY

Pleasures in Every Season

Enchanting Summer, the beauty of Spring, the happy disorder of Autumn and the fascinating Winter offer a colourful holiday to the young and old in the beautiful Vale of Kashmir

Her unrivalled scenic grandeur, beautiful lakes, colourful gardens and historical monuments are always there to welcome you

Kashmir offers excellant facilities for acquatic sports-swimming, diving and surf riding Trout Fishing - known all over the world small and big game

Gulmarg - the meadow of flowers provides the least expensive game of golf on the 8,700 ft high Golf Course, acknowledged to be among the world's best and also some of finest Skiing Slopes in the world

Issued by the Director of Tourism, Jammu and Kashmir Govt , Srinagar

For details please contact

1 Director of Tourism

Jammu and Kashmir Govt Srinagar (Kashmir)

2 Tourist Office

Jammu and Kashmir Govt 129, Mahatma Gandhi Road, Fort, Bombay-1

3 Tourist Office

Jammu and Kashmir Govt 5, Prithviraj Road New Delhi